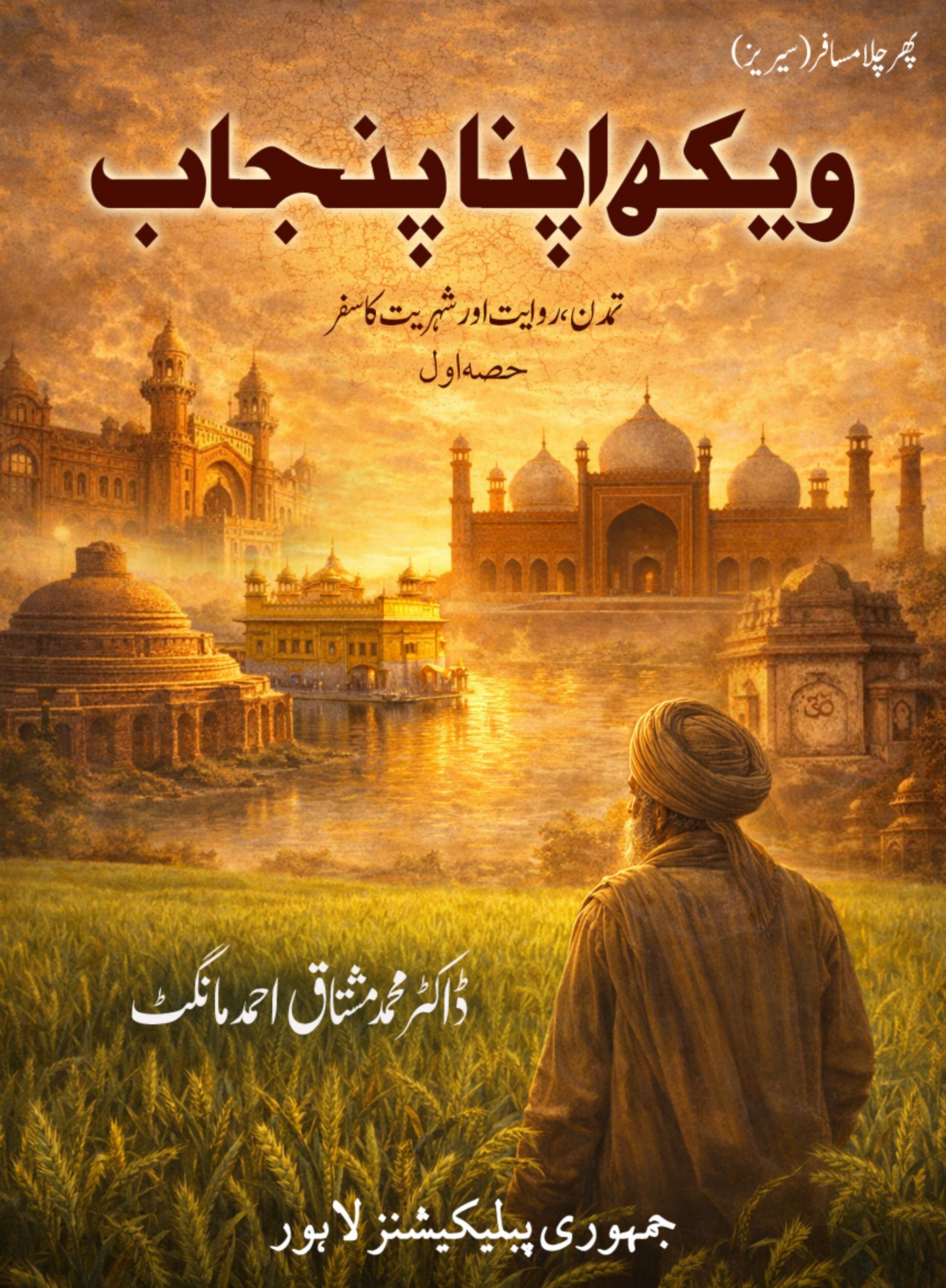

پھر چلا مسافر (سیریز)
ویکھو اپنا پنجاب
تمدن، روایت اور شہریت کا سفر
حصہ اول
ڈاکٹر محمد مشتاق احمد مانگٹ
جمہوری پبلیکیشنز لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

دیکھا اپنا پنجاب (حصہ اوّل)

پھر چلا مسافر (سیریز)

پھر چلا مسافر (سیریز)

ویکھ اپنا پنجاب

تمدن، روایت اور شہریت کا سفر

(حصہ اول)

ڈاکٹر محمد مشتاق احمد مانگٹ

جمہوری پبلیکیشنز

Independent & Progressive Books

● نام کتاب: پھر چلا مسافر، دیکھا اپنا پنجاب، حصہ اوّل

● مصنف: ڈاکٹر محمد مشتاق احمد مانگٹ ● سرورق: مصباح سرفراز

● اشاعت: 2025ء ● ناشر: جمہوری پبلیکیشنز لاہور

اہتمام: فرخ سہیل گوئندی

اس کتاب کی تمام تر فروخت غزالی ایجوکیشن فاؤنڈیشن کے تعلیمی منصوبوں میں خرچ کی جائے گی تاکہ پاکستان کے محروم اور نادار بچوں کو معیاری تعلیم، سہولیات اور بہتر مواقع فراہم کیے جاسکیں۔ قیمت:-/2000 روپے

کتاب کے حصول کا طریقہ:-/2000 روپے غزالی ایجوکیشن فاؤنڈیشن کے بینک اکاؤنٹ میں جمع کرائیں۔ کم یا زیادہ آپ پر منحصر ہے۔

Bank Account: Title: Ghazali Education Foundation

Account Number: 02060100676606

IBAN: PK65MEZN0002060100676606

SWIFT CODE: MEZNPKKAGRD

Bank: Meezan Bank, Akbar Chowk, Lahore, Pakistan.

www.Ghazalifoundation.org

بینک رسید/اسکرین شاٹ ہمارے WhatsApp نمبر +92 324 8451217 پر ارسال کریں یا اس ای میل mushtaq.mangat@gmail.com پر بھیج دیں۔

آپ کو کتاب بلا کسی اضافی کوریئر چارج کے فراہم کر دی جائے گی۔

=======✵=======

یہ کتاب ای بک (E-book) کی شکل میں انٹرنیٹ پر رکھی گئی ہے۔ آپ اسے ڈاؤن لوڈ (Download) کر سکتے ہیں اور کسی کو بھی دے سکتے ہیں۔ اس بات کی آپ کو مکمل اجازت ہے۔ یہ کتاب درج ذیل ویب سائٹس پر موجود ہے۔ اگر ڈاؤن لوڈ کرنے میں کوئی دقت ہو، تو آپ ہمیں ای میل بھیج کر بھی منگوا سکتے ہیں۔

http://taawun.org.pk/downloads www.archive.org www.scribd.com

Follow us at facebook

JUMHOORI PUBLICATIONS
2 Aiwan-e-Tijarat Road, Lahore-Pakistan.
Tel # 042-36314140 042-36283098
E-mail: info@jumhooripublications.com
www.jumhooripublications.com

انتساب!

اپنی شریکِ حیات، محترمہ صفیہ مشتاق کے نام

جن کی محبت، خلوص، وفا اور مستقل حوصلہ افزائی میری زندگی کا سرمایہ ہے۔ جنھوں نے ہر مشکل گھڑی میں نہ صرف میرا ساتھ دیا، بلکہ میری فکری، علمی اور ذاتی ترقی کے ہر مرحلے میں میرے لیے ایک روشنی کا مینار بنیں۔ میں ان کی قربانیوں، صبر، اور محبت کا ہمیشہ مقروض رہوں گا۔ مصطفیٰ زیدی کی ایک نظم کا سہارا لیتے ہوئے:ـ

تیرے کرم نے ، مجھے کر لیا قبول مگر
میرے جنوں سے ، محبت کا حق ادا نہ ہوا
تیرے غموں نے ، میرے ہر نشاط کو سمجھا
میرا نشاط ، تیرے غم سے آشنا نہ ہوا
کہاں کہاں نہ ، میرے پاؤں لڑکھڑائے مگر
تیرا ثبات عجب تھا ، کہ حادثہ نہ ہوا
تیرے دکھوں نے پکارا ، تو میں قریب نہ تھا
میرے غموں نے صَدا دی ، تو فاصلہ نہ ہوا
ہزار دَشنہ و خنجر تھے ، میرے لہجے میں
تیری زباں پہ کبھی ، حرفِ ناروا نہ ہوا
ہزار شمعوں کا بنتا رہا ، میں پروانہ
کسی کا گھر تیرے دِل میں ، میرے سِوا نہ ہوا
میری سیاہیٔ دامن کو ، دیکھنے پر بھی
تیرے سفید دوپٹوں کا ، دِل بُرا نہ ہوا

فہرست

حرفِ آغاز

میری ہمیشہ سے خواہش رہی ہے کہ میں جہاں بھی جاؤں، اس علاقے کی تاریخ، جغرافیہ، اور وہاں کے لوگوں کے رہن سہن کے بارے میں معلومات حاصل کروں۔ ہر نئے سفر کے دوران، میں نے محسوس کیا کہ یہ معلومات صرف میرے لیے نہیں بلکہ دوسروں کے لیے بھی بے حد قیمتی اور مفید ہیں۔ اس لیے میں نے تحریر کا سہارا لینے کا فیصلہ کیا تاکہ میں اپنے ان تجربات کو دوسروں تک پہنچا سکوں۔ میں نے متحدہ پنجاب (ہریانہ، چڑھدا پنجاب، لہندا پنجاب) کے بیشتر بڑے شہروں، خاص طور پر ضلعی صدر مقامات کا دورہ کیا ہے، اور ان علاقوں میں جو کچھ دیکھا، سنا، اور سمجھا، وہ میں آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ اس سے پہلے میں بھارت، سندھ، بلوچستان، خیبر پختونخوا، افغانستان، اور گلگت بلتستان میں کیے گئے اسفار کے بارے میں سفرنامے جن میں تاریخ، جغرافیہ، معیشت اور معاشرت کو بیان کیا گیا ہے، لکھ چکا ہوں۔ امید ہے کہ سابقہ تحریروں کی طرح یہ تحریر بھی آپ کو دلچسپ اور معلوماتی لگے گی۔

زیرِ نظر کتاب کا پہلا حصہ آپ کے مطالعے کے لیے پیش ہے، جس میں پنجاب کی صدیوں پر محیط تاریخ اور تہذیبی ارتقا کا جامع بیان کیا گیا ہے۔ کتاب کے دوسرے حصے میں متحدہ پنجاب کے تمام اہم اور نسبتاً کم معروف شہروں کا مفصل احوال قلمبند کیا گیا ہے۔ اس حصے میں قاری کو بھارتی پنجاب، بشمول ہریانہ، کے بارے میں بھی دلچسپ اور معلومات افزا مواد فراہم کیا گیا ہے۔

اس کتاب کے دونوں حصوں میں ''پنجاب'' سے مراد وہ تاریخی و تہذیبی وحدت ہے جسے ہم ''متحدہ پنجاب'' کے نام سے جانتے ہیں۔ اس کی حدود میں موجودہ ہندوستانی ریاستیں ہریانہ، مشرقی پنجاب (چڑھدا پنجاب)، پاکستانی پنجاب (لہندا پنجاب)، ہماچل پردیش، اور ہزارہ کا

علاقہ شامل ہیں۔ بعض مؤرخین اور محققین کے مطابق پنجاب کی جغرافیائی حدود دریائے جمنا سے لے کر پشاور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ راقم نے دہلی کے ایک ریستوران کی دیوار پر بنا ہوا ایسا ہی نقشہ بھی مشاہدہ کیا ہے، جو اس تاریخی تصور کی تائید کرتا ہے۔

میری تحقیق اور فہم کے مطابق پنجاب کی حدود جمنا سے لے کر دریائے اٹک تک پھیلی ہوئی تھیں۔ شمال میں یہ خطہ ہمالیہ کے دامن تک، اور جنوب میں صحرائے راجستھان تک وسیع تھا۔ اگرچہ وقت کے ساتھ ساتھ، انتظامی تقسیمات کے باعث، اس کی جغرافیائی شناخت میں نمایاں تبدیلیاں آتی رہیں۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہدِ حکومت میں پنجاب کی حدود دریائے ستلج کے مغرب تک محدود تھیں۔ بعد ازاں انگریزوں نے سب سے پہلے دہلی کو پنجاب سے جدا کیا، ہماچل پردیش کا کچھ حصہ شامل کیا، اور صوبہ سرحد کی تشکیل کے وقت ہزارہ کو پنجاب سے الگ کر دیا۔ تقسیمِ ہند کے بعد پنجاب دو حصوں میں تقسیم ہو گیا، اور بھارت نے اس کے کچھ علاقوں کو ''ہریانہ'' کا نام دیا۔

اس کتاب میں جن خطوں کو ''پنجاب'' کے نام سے بیان کیا گیا ہے، ان میں وہ تمام علاقے شامل ہیں جن کی تہذیبی و لسانی بنیاد مشترک ہے۔ یہاں بولی جانے والی زبان، برادریوں کی ساخت، معاشرتی رواج، رہن سہن، اور زرعی نظام میں حیرت انگیز حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔ یہ وہی علاقہ ہے جہاں سات دریا بہتے ہیں، زرخیز میدانی علاقے واقع ہیں، اور ایک جیسے موسم اور پیداوار پائی جاتی ہے۔ یہی وہ عوامل ہیں جنھوں نے اس خطے کو ایک الگ تمدنی شناخت عطا کی۔ مختلف ادوار میں اسے گوناگوں ناموں سے پکارا گیا، لیکن ''پنجاب'' کا نام نسبتاً نیا ہے، جو تقریباً پانچ سو سال یا اس سے کچھ زیادہ عرصہ قبل رائج ہوا۔ اسی نام سے منسوب ''پنجابی'' زبان وجود میں آئی۔

اسی وحدت کی بنیاد پر اس کتاب میں ان تمام تاریخی واقعات، ثقافتی عوامل، اور سماجی تبدیلیوں کا احاطہ کیا گیا ہے جو اس خطے میں وقوع پذیر ہوئے اور جنھوں نے پنجاب کے معاشرے پر دیرپا اثرات مرتب کیے۔ میرے نزدیک یہی وہ حقیقی پنجاب ہے، جو ہم سب کا مشترکہ تہذیبی ورثہ ہے۔ یہی وہ پنجاب ہے کہ جب یہاں امن قائم ہوتا ہے، تو پورے شمالی ہند

میں امن کی فضا قائم ہوتی ہے، اور جب یہ ترقی کرتا ہے، تو پورے خطے میں خوشحالی آتی ہے۔

اسی پنجاب میں واقع ہڑپہ وہ مقام ہے جہاں سے دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں سے ایک کے آثار ملتے ہیں۔ یہی وہ سرزمین ہے جہاں ہندومت اور بدھ مت کی جڑیں مضبوط ہوئیں، سکھ دھرم کی بنیاد رکھی گئی، اسلام کی ابتدائی روشنی پہنچی، اور جسے برطانوی راج نے سب سے آخر میں اپنے زیرِ نگیں بنایا۔ اسی پنجاب سے نوآبادیاتی اقتدار کے خلاف آزادی کی تحریکوں نے جنم لیا۔ آج بھی یہی پنجاب، پاکستان اور بھارت دونوں کی زرعی ضروریات کو پورا کرتا ہے، اور ان دونوں ممالک کی افواج میں اسی خطے کے لوگ بڑی تعداد میں شامل ہیں۔

یہاں بدھ مت کے کئی اہم مراکز بھی موجود ہیں۔ یہیں سے اردو زبان کی جڑیں بھی پھوٹی ہیں، جو آج کے دور میں پاکستان اور ہندوستان کی ایک اہم زبان ہے۔ تاریخی اعتبار سے، پنجاب مغرب سے آنے والے حملہ آوروں کا پہلا نشانہ بنتا رہا۔ سکندرِ اعظم کا لشکر بھی یہاں آیا اور اسی جگہ سے واپس لوٹا۔ ایران کے حملہ آوروں نے بھی اس علاقے پر حکومت کی، اور وسطی ایشیاء کے منگولوں نے بھی یہاں اپنی فتوحات کے نشان چھوڑے۔ مغل سلطنت نے بھی یہاں ایک شاندار دور گزارا، جہاں فنونِ لطیفہ، ادب اور ثقافت کی ترقی ہوئی۔

انگریزوں نے جنوبی ہندوستان سے اپنی حکومت کا آغاز کیا اور پنجاب تک پہنچے، جہاں انھوں نے اپنی حکومت قائم کی۔ برطانوی راج کے دوران پنجاب برطانوی ہندوستان کا حصہ بن گیا، اور اس عرصے میں دنیا کا ایک بڑا نہری نظام بنایا گیا، جس نے اسے زراعت کے لیے ایک مفید اور خوشحال علاقے میں تبدیل کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

میں نے اس کتاب کے ذریعے اسی "پنجاب" کو دکھانے کی کوشش کی ہے، جسے وقت اور سیاست نے تقسیم کیا، اور جس کے کئی پہلوؤں کو تاریخ میں نظرانداز کیا گیا۔

اسی لیے اس کتاب کا عنوان ہے:

دیکھ اپنا پنجاب!

پنجاب ہمیشہ سے ثقافت، سیاست، سیاحت، علم و ہنر، ادب، اور تجارت کا مرکز رہا ہے۔

یہاں کی زمین نے کئی عظیم شخصیات کو جنم دیا، جنھوں نے اپنی فکری وثقافتی وراثت کے ذریعے دنیا کو متاثر کیا۔ آج بھی پنجاب کی سرزمین اپنی تاریخی روایات، مہمان نوازی اور ثقافتی تنوع کے ساتھ زندہ ہے، جو اس علاقے کی اصل خوبصورتی کو اجاگر کرتی ہے۔

ہندوستان کی آزادی کے بعد پنجاب کو بھارت اور پاکستان کے درمیان تقسیم کیا گیا، جس نے تاریخ کی سب سے بڑی نقل مکانی کی راہ ہموار کی۔ اس تقسیم کے نتیجے میں لاکھوں لوگ اپنی جانیں گنوا بیٹھے، اور ایک کروڑ سے زائد افراد کو اپنا گھر بار چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا۔ یہ واقعتاً ایک دلخراش واقعہ تھا، جس نے نہ صرف انسانی زندگیوں کو متاثر کیا بلکہ دونوں ممالک کے معاشرتی ڈھانچے میں بھی بڑی تبدیلیاں لایا۔

پنجاب کی تقسیم نے خطے کی آبادی اور ثقافتی منظرنامے کو بے حد متاثر کیا۔ صدیوں سے قائم بھائی چارے کی فضا ناگوار صورت حال میں بدل گئی، اور دو قوموں کے درمیان دشمنی کی دیواریں کھڑی ہو گئیں۔ مشرقی پنجاب میں ہریانہ بھی شامل تھا، جو بعد میں ایک علیحدہ صوبہ بنا دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی مشرقی پنجاب میں سکھ علیحدگی پسندی کی تحریک کا آغاز ہوا، جس نے مزید تنازعات کو جنم دیا۔

پنجاب اپنی ایک جداگانہ، جاندار ثقافت کے لیے جانا جاتا ہے۔ یہاں کی موسیقی، خاص طور پر بھنگڑا، اور روایتی رقص، جیسے کہ گدا، نے دنیا بھر میں اپنی پہچان بنائی ہے۔ یہاں کا صوفیانہ کلام بھی اپنا ایک الگ مقام رکھتا ہے، جو محبت اور انسانیت کا پیغام دیتا ہے۔ پنجاب کے تہوار، جیسے بیساکھی، لوہڑی، اور دیوالی، نہ صرف مقامی لوگوں بلکہ دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ یہ تہوار نہ صرف خوشی کا اظہار کرتے ہیں بلکہ یہاں کے ثقافتی ورثے کی بھی عکاسی کرتے ہیں۔

اس خطے میں ادب اور فنون کے میدان میں بامِ عروج تک پہنچانے والے کئی عظیم افراد نے جنم لیا۔ شاعر، مصنف، فنکار، اور موسیقار، سب نے اپنی محنت اور تخلیق کے ذریعے پنجاب کی ثقافتی شناخت کو مضبوط کیا۔ آج بھی پنجاب کی سرزمین ان کی یادوں سے بھری پڑی ہے، اور یہ ایک زندہ مثال ہے کہ ثقافت کیسے مختلف چیلنجز کے باوجود پھل پھول سکتی ہے۔

تقسیم ہند کے نتیجے میں پنجاب بھی دو حصوں میں تقسیم ہو گیا: چڑھدا پنجاب، جو بھارت کے

حصے میں آیا، اور لہندا پنجاب، جو پاکستان کے حصے میں آیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ دونوں حصوں کو ہی پنجاب کہا جاتا ہے، جو اس خطے کی گہرائی اور تاریخی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔ لہندا پنجاب کا صدر مقام لاہور ہے، جسے پاکستان کا دل بھی کہا جاتا ہے، جبکہ چڑھدا پنجاب کا صدر مقام چندی گڑھ ہے، جو جدید ترقی اور شہری طرز زندگی کی مثال ہے۔

لاہور نہ صرف ثقافتی بلکہ سیاسی لحاظ سے بھی ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ یہ شہر کئی دہائیوں سے پاکستان کی سیاست کا مرکز رہا ہے، جہاں اہم سیاسی فیصلے اور سرگرمیاں وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ، پنجاب میں صدیوں پرانے شہر آباد ہیں، جو اس علاقے کے تاریخی ورثے کا عکاس ہیں۔ مغرب سے آنے والے حملہ آور اور صوفیا کرام بھی اسی راستے سے ہو کر ہندوستان کے دیگر علاقوں میں جاتے تھے، جس نے اس خطے کو ایک اہم ثقافتی اور تجارتی گزرگاہ بنا دیا۔

پنجاب کی سرزمین نہ صرف اپنی زرخیزی اور جغرافیائی تنوع کے لیے مشہور ہے بلکہ اس کی تہذیبی ساخت، زبانوں کی رنگارنگی، مہمان نوازی، روایات اور رسومات نے اسے برصغیر میں ایک منفرد ثقافتی شناخت عطا کی ہے۔ اس خطے کی تاریخ کا ہر گوشہ ماضی کی گہرائیوں سے ابھرنے والی ایک داستان سناتا ہے، جو اہلِ پنجاب کے سماجی، ثقافتی اور معاشی رویّوں کی ترجمانی کرتا ہے۔

تاریخی اعتبار سے مغربی پنجاب، جو دریائے جہلم کے مشرقی کنارے سے لے کر دریائے ستلج تک پھیلا ہوا ہے، ایک وسیع اور تاریخی طور پر اہم علاقہ ہے جو ماضی میں چار بڑے ''بار'' (برّان) میں منقسم تھا۔ یہ تقسیم نہ صرف جغرافیائی بنیاد پر کی گئی تھی بلکہ ہر بار اپنی مخصوص زرعی، ماحولیاتی اور تمدنی خصوصیات کے باعث پہچانا جاتا تھا۔

کرانہ بار: دریائے جہلم کے مشرقی کنارے سے دریائے چناب کے مغربی کنارے تک کا علاقہ۔

سندل بار: دریائے چناب اور دریائے راوی کے درمیانی خطہ۔

گنجی بار: دریائے راوی اور دریائے ستلج کے درمیان واقع علاقہ۔

نیلی بار: دریائے ستلج کے دونوں کناروں پر واقع زرخیز میدان، جو اپنی نیلگوں مٹی کے باعث اس نام سے موسوم ہوا۔

یہ تمام بار علاقے محض جغرافیائی اکائیاں نہیں تھے بلکہ پنجاب کی قدیم دیہی معیشت، مالداری، زمین داری، اور ثقافتی زندگی کے مرکز تھے۔ ان علاقوں کی زبان، لوک ادب، رہن سہن، اور معیشت نے ایک ہم آہنگ مگر متنوع تہذیبی نظام تشکیل دیا، جو آج بھی پنجابی شناخت کا ایک لازمی حصہ ہے۔

آپ کو پنجاب بارے مزید جاننے کے لیے اس کتاب کو پڑھنا پڑے گا، جہاں آپ کو پنجاب کی تہذیب، تاریخ، اور ثقافتی ورثے کے مزید دلچسپ پہلوؤں کا پتا چلے گا۔ یہ سفر آپ کو پنجاب کی روحانی اور ثقافتی گہرائیوں میں لے جائے گا، جہاں آپ ماضی کی عظمت اور موجودہ دور کی ترقی کا مشاہدہ کر سکیں گے۔

یہ سفرنامہ کئی حصوں (کتابوں) پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں، میں نے پنجاب کی تاریخ پر روشنی ڈالی ہے۔ اس میں پنجاب کی تقسیم سے پہلے کے دور کی مذہبی روایات، یہاں سے شروع ہونے والی تحریکوں، علاقے کے مشہور افراد، غیر ملکی حملوں، اور مقامی ثقافت و تہذیب کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ یہ حصہ تاریخی تناظر میں پنجاب کے ارتقا کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

دوسرے حصوں میں، میں نے پنجاب کے مختلف شہروں اور قصبوں میں سفر کے دوران جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا، اسے بیان کیا ہے۔ اس سفرنامے میں میں نے اپنی ذاتی رائے کو دور رکھنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے تاکہ قاری کو ایک غیر جانبدارانہ تجربہ فراہم کیا جا سکے۔ سفر کے دوران، میں نے اردگرد جو کچھ دیکھا، معاشی و سماجی حالات کو سمجھنے کی کوشش کی، لوگوں کی زندگیوں اور روزمرہ کے مشاغل کا مشاہدہ کیا، اور وہاں پیش آنے والے حیرت انگیز واقعات کو اپنی تحریر میں سمیٹا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ، اس علاقے کی تاریخ اور جغرافیہ کا بھی ذکر کیا گیا ہے، تاکہ قاری کو ایک جامع اور دلچسپ تصور مل سکے۔ میری کوشش ہے کہ یہ سفرنامہ نہ صرف معلوماتی ہو بلکہ آپ کو پنجاب کی ثقافت، تاریخ، اور لوگوں کے بارے میں بھی ایک نیا زاویہ نظر فراہم کرے۔

یہاں میں ایک اہم نکتہ قارئین کے سامنے رکھنا ضروری سمجھتا ہوں۔ برصغیر میں مسلمان حکمرانی (712-1857) کے دوران لکھی گئی تاریخی کتب، جن میں معاصر مورخین، بعض مغل

بادشاہوں کی خودنوشتیں (جیسے تزک بابری و تزک جہانگیری) اور درباری مورخین کی تصانیف شامل ہیں، تاریخ کا ایک بڑا ماخذ سمجھی جاتی ہیں۔ ان کتب کی دستیابی ہمیں ایک وسیع تاریخی ذخیرہ فراہم کرتی ہے، تاہم یہ امر قابل غور ہے کہ ان میں سے بیشتر کتب روایتی اندازِ تحریر کی حامل ہیں، جہاں واقعات کو صرف بیان کیا گیا ہے اور ان پر وسیع تجزیاتی اصولوں کے تحت بحث نہیں کی گئی۔

اس کے برعکس، جدید تاریخ نویسی میں علمی اور استدلالی (سائنٹفک) طرز کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے، جہاں محض واقعات کے بیان پر اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ ان کے اسباب، اثرات اور پس منظر پر بھی غور کیا جاتا ہے۔ انگریز اور ہندو مورخین نے اسی تجزیاتی اسلوب کو اپنایا، جس کی وجہ سے آج کے طالب علم کو ایک علمی چیلنج درپیش ہے۔ چونکہ ان مورخین کی تحریریں مخصوص فکری اور نظریاتی بنیادوں پر استوار ہیں، لہٰذا ان میں مسلمانوں کی حکمرانی کے بارے میں بعض اوقات تعصب اور جانبداری کا عنصر نمایاں ہوتا ہے۔ یہ رویہ موجودہ دور کے مسلم مؤرخین کو ایک دفاعی پوزیشن میں لے آتا ہے، جہاں انھیں نہ صرف اپنی تاریخ کے تحفظ بلکہ اس کے غیر جانبدارانہ تجزیے کی بھی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

اس کتاب میں، میں نے تاریخی واقعات کا تجزیہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے، تاہم ذاتی رائے دینے سے اجتناب کیا ہے، تاکہ قاری خود نتائج اخذ کر سکے۔ میری کوشش رہی ہے کہ تاریخ کو محض جذباتی یا نظریاتی بنیادوں پر پرکھنے کے بجائے اسے ایک غیر جانبدار اور علمی زاویے سے دیکھا جائے، تاکہ سچائی اور معروضیت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔

آپ کا اس سفرنامے کو پڑھنا میرے لیے بے حد خوشی کا باعث ہے۔ اس موقع پر، میں اس امید کا اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کو ان صفحات میں دلچسپ معلومات اور کئی ان سنی باتیں جاننے کا موقع ملے گا۔ اگر آپ پنجاب کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں یا محض دلچسپ تاریخ تک رسائی حاصل کرنا چاہتے ہیں، تو مجھے یقین ہے کہ یہاں ہر ایک کے لیے کچھ نہ کچھ لوازمہ ضرور موجود ہے۔

میں نے اس سفرنامے میں ہندوستان خاص طور پر پنجاب کی تاریخ لکھتے ہوئے دو ذرائع سے

سب سے زیادہ معلومات حاصل کی ہیں۔ ان میں ایک انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا ہے اور دوسرا
History of India

جسے کئی لوگوں نے لکھا ہے، اس کی نو جلدیں ہیں۔ یہ تمام جلدیں
https://www.ibiblio.org [1]

پر موجود ہیں۔ اس کے علاوہ بھی کئی کتابوں سے مدد لی ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ ہر بات کسی قابلِ بھروسہ ماخذ سے لی جائے اور اس کا مناسب حوالہ بھی دیا جائے۔ اگر پھر بھی آپ کوئی کمی دیکھیں تو ضرور آگاہ کریں۔ پیشگی شکریہ۔

میری خواہش ہے کہ آپ اس سفرنامے سے اتنا ہی لطف اندوز ہوں جتنا میں نے اسے تخلیق کرتے ہوئے محسوس کیا ہے۔ یہ کتاب نہ صرف معلوماتی ہے بلکہ اس میں محبت اور محنت کی کہانی بھی ہے، جو میں نے اپنے دل کی گہرائیوں سے آپ تک پہنچائی ہے۔ آپ کی آراء اور تجاویز میرے لیے انتہائی اہم ہیں۔ میں ان کا خیر مقدم کروں گا تاکہ اس کتاب کے مواد اور انداز کو بہتر طور پر پیش کر سکوں اور اسے مزید مفید اور دلچسپ بنا سکوں۔ آپ کی رائے میرے لیے ایک قیمتی رہنمائی کا ذریعہ ہوگی۔

آخر میں، میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نے اس سفر کا حصہ بننے کا انتخاب کیا۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ کی زندگی میں یہ صفحات ایک نیا رنگ بھرنے کا سبب بنیں۔

آپ کا مخلص
ڈاکٹر محمد مشتاق احمد مانگٹ، لاہور

جولائی، 2025ء

---

[1] Home to one of the largest collections of collection on the Internet, ibiblio.org is an online public library with freely available software and information, for topics such as music, literature, art, history, science, politics, and cultural studies. in between 12 million to 16 million worldwide transactions per day, it is a resource used frequently by audience of all interest and background

ایک وضاحت اور گزارش

عرضِ مؤلف

یہ کتاب برصغیر کے تاریخی و مذہبی پس منظر کا ایک غیر جانب دار اور تحقیق پر مبنی مطالعہ ہے، جس میں مختلف اقوام، مذاہب اور معاشرتی طبقات کے کردار کو دیانت داری کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میری یہ کاوش خالصتاً علمی و تحقیقی مقصد کے تحت کی گئی ہے تا کہ قارئین برصغیر کی پیچیدہ تاریخی ساخت اور مذہبی تنوع کو بہتر طور پر سمجھ سکیں۔

میں نے پوری سچائی اور خلوصِ نیت کے ساتھ اس امر کا التزام کیا ہے کہ کسی فرد، مذہب، فرقے یا قوم کی دل آزاری نہ ہو۔ زبان کو حتی المقدور سادہ، شائستہ اور باوقار رکھا گیا ہے تا کہ تمام طبقات کے قارئین تک یہ بات بآسانی اور بغیر کسی تلخی کے پہنچ سکے۔ تاہم، اگر کسی مقام پر کوئی لفظ یا جملہ غیر ارادی طور پر کسی کے لیے باعثِ تکلیف بنے تو میں پیشگی معذرت خواہ ہوں۔

میری نیت نہ کسی شخصیت یا جماعت پر تنقید ہے، نہ کسی کی توہین، بلکہ صرف تاریخی شعور کی بیداری اور علمی خدمت پیشِ نظر رہی ہے۔ اگر کسی جگہ کوئی غلطی، سہو یا علمی خامی رہ گئی ہو تو قارئینِ کرام سے مؤدبانہ گزارش ہے کہ مطلع فرما کر اصلاح کا موقع عنایت کریں۔ آپ کی رہنمائی میرے لیے باعثِ اعزاز و انبساط ہوگی۔

یہ کتاب میری کئی برسوں کی محنت، مطالعہ، مشاہدے اور فکری وابستگی کا نچوڑ ہے۔ میں نے تاریخ کے نازک اور حساس موضوعات کو پوری احتیاط، دیانت اور علمی ایمانداری کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ میری یہ بھی کوشش رہی ہے کہ ہر بات سادہ، متوازن اور محبت بھری

زبان میں کہی جائے تا کہ کسی بھی گروہ کے جذبات کو ٹھیس نہ پہنچے۔

میں نے تاریخ کے اوراق کو گویا ایک لالٹین کی روشنی میں آپ کے سامنے رکھنے کی کوشش کی ہے۔ کیا درست ہے اور کیا نہیں، اس کا فیصلہ میں قارئین کے فہم وشعور پر چھوڑتا ہوں۔ میری سعی یہی رہی ہے کہ حقائق کو ممکنہ حد تک غیر جانب دارانہ انداز میں بیان کروں، بغیر کسی تعصب یا جذباتی وابستگی کے۔

ے رکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

United Punjab During British Period



From the *Imperial Gazetteer of India*, Hunter, William Wilson, Sir, (1840-1900) Cotton, James Sutherland,(1847-1918) ed. Burn, Richard

پنجاب کا جغرافیائی دائرہ: تاریخی ارتقاء اور علاقائی تشکیل

پنجاب کی تاریخ لکھنے سے پہلے میں پنجاب کے جغرافیے کے بارے میں چند بنیادی معلومات آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ یہ بات ہم سب کے علم میں ہے کہ قدیم زمانے میں جب آبادی بہت کم تھی، کسی بھی علاقے کی سرحد کا تعین کرنا ایک مشکل کام تھا۔ یہ واضح نہیں تھا کہ کون سا صوبہ کہاں سے شروع ہوتا ہے اور کہاں ختم ہوتا ہے۔ اس وقت کوئی باقاعدہ حد بندی موجود نہیں تھی، اور اکثر لوگوں کو ان حدود کا علم نہیں ہوتا تھا۔

ہندوستان میں سب سے پہلے صوبوں کی باقاعدہ تقسیم مغل بادشاہ اکبر کے دور میں ملتی ہے۔ اس سے پہلے، بابر اور ہمایوں کے دور میں، مغل شمالی ہندوستان کے ایک محدود علاقے پر قبضہ کر پائے تھے، جس کی وجہ سے وہ صوبوں کا نظام وضع نہ کر سکے۔ مغلیہ سلطنت کی توسیع اور استحکام کا کام اکبر کے دور میں ہوا، جب اس نے اپنی انتظامی اصلاحات کے ذریعے صوبوں کی تشکیل کی۔ اکبر کے دور میں، صوبوں کی حد بندی واضح طور پر سامنے آتی ہے۔ اکبر نامہ میں پہلی بار صوبوں کے نام اور ان کے حدود اربعہ کی تفصیلات موجود ہیں، جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ اس وقت انتظامی ڈھانچے میں بہتری لائی گئی تھی۔ یہ اصلاحات نہ صرف صوبائی حکومت کو مستحکم کرتی تھیں بلکہ خطے کی تاریخ کی تفہیم میں بھی اہم کردار ادا کرتی تھیں۔ یہ جغرافیائی پس منظر پنجاب کی تاریخ کو سمجھنے میں مدد فراہم کرتا ہے، کیونکہ یہ بتاتا ہے کہ کس طرح مختلف حکمرانوں نے علاقے کی سرحدوں کو متعین کیا اور اس کی ترقی میں کیا کردار ادا کیا۔ اکبر سے پہلے مختلف علاقوں میں مقامی خودمختار ریاستیں تھیں جن کی حد بندی تو ضرور ہوگی لیکن آبادی کم ہونے کی بناء پر کوئی واضح حد بندی کا نشان نہیں ملتا۔

آردھندورائے (Andherendu Ray) نے ایک طویل مضمون بعنوان

Geography of Early Historical Punjab لکھا ہے، جس سے مجھے پنجاب کے جغرافیے کے بارے میں بہت سی قیمتی معلومات حاصل ہوئیں [1]۔ اس مضمون میں رائے نے نہ صرف پنجاب کی جغرافیائی خصوصیات کا تفصیلی تجزیہ کیا ہے بلکہ اس کے تاریخی پس منظر، ثقافتی اثرات، اور علاقے کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ رائے کے مطابق، پنجاب کی زمین کی ساخت، دریاؤں کا نظام، اور موسمی حالات نے اس کی تاریخ اور ترقی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس نے یہ بھی وضاحت کی ہے کہ کس طرح مختلف دور کے حکمرانوں نے اس خطے کی سرحدوں کو متعین کیا اور یہاں کی معیشت اور ثقافت کو متاثر کیا۔ اس مضمون کے ذریعے، میں نے پنجاب کے جغرافیائی پہلوؤں کو بہتر طور پر سمجھنے کا موقع پایا ہے، جو اس علاقے کی تاریخ میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ آردھندو رائے کی یہ تحقیق نہ صرف علمی اعتبار سے اہم ہے بلکہ یہ قاری کو پنجاب کی جغرافیائی شناخت کے بارے میں بھی آگاہی فراہم کرتی ہے۔

رائے لکھتے ہیں پنجاب، شمال میں ہمالیہ اور جنوب میں راجپوتانہ ریگستان کے درمیان گھرا ہوا ہے ایک سیلابی مٹی کا زرخیز وسیع وعریض میدان ہے، جس میں کئی ندیاں اور دریا بہتے ہیں، جن کے نام کچھ اس طرح سے ہیں؛ ستلج، بیاس، راوی، چناب اور جہلم۔ رائے یہ بھی لکھتے ہیں کہ ہندوستان کی ابتدائی تاریخ بارے کوئی بات پورے یقین سے کہنا مشکل ہے۔ اس موضوع پر مختلف اسکالرز کی طرف سے اس بات کی کھوج لگانے کی کوشش کی جاری ہے کہ پنجاب کی ابتداء کب ہوئی؟ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ تین ہزار سال قبل مسیح سے پندرہ سو سال قبل مسیح تک کا دور پنجاب کا ابتدائی دور ہے۔ یہ وہ دور ہے جب آریاؤں نے پنجاب کا رخ کیا۔ اس بات کی تصدیق وہ پنجاب میں پائے جانے والے آثارِ قدیمہ، شہروں، دستکاری کی مہارت، لوہے کی ٹیکنالوجی اور سکے کے آغاز سے کرتے ہیں۔ رائے تاریخ کے لحاظ سے پنجاب کو موریا، ہند-یونانی، ساکوں سے لے کر پہلی صدی عیسوی میں کشانوں، کنشک کا دور، گپتا چوتھی صدی عیسوی میں منظر پر نمودار

[1] Chatra Ramai Pandit Mahavidyalaya Chatra, Bankura, West Bengal.
http//:giss.org/jsps_vol_24/ardhendu_ray.pdf

ہوئے، اور پھر ہنوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

رائے کے مطابق پنجاب کے انتہائی شمال مشرقی حصوں میں، جو شمال مغرب سے جنوب مشرق

India in Akbar Era

Charles Joppen-Historical Atlas of India, by Charles Joppen

(London: Longmans, Green & Co, 1907)



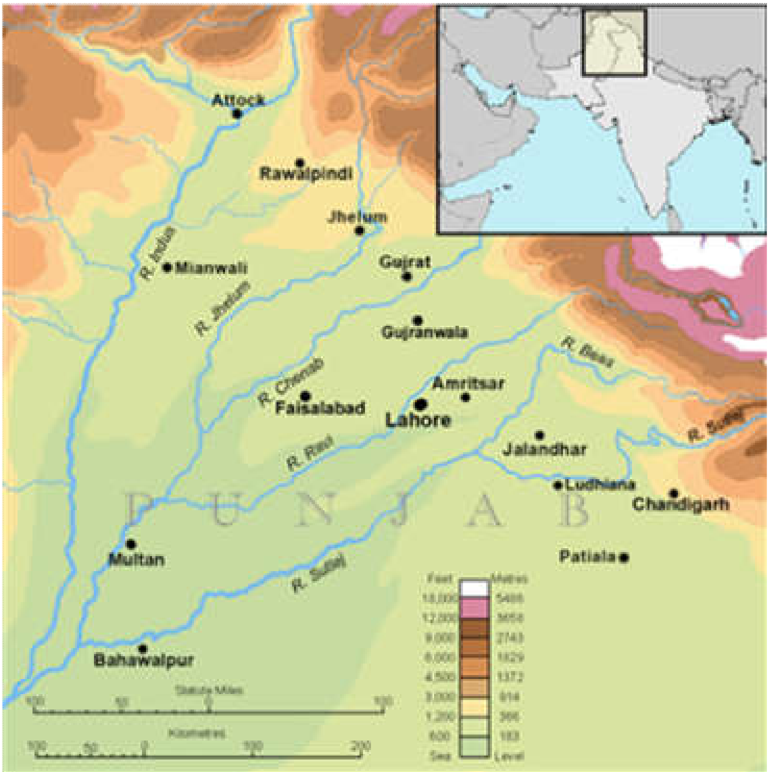
تک چلتے ہیں، شیولک پہاڑیاں ہیں۔ یہ سلسلہ شمال میں دریائے راوی سے لے کر جنوب میں چندی گڑھ کے قریب دریائے گھاگرہ تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کی لمبائی، تقریباً 280 کلومیٹر ہے۔

انسائیکلو پیڈیا آف بر ٹانیکا کے مطابق شیوالک رینج جسے سیوا لک رینج بھی کہا جاتا ہے، (Siwalik Range) شمالی برصغیر پاک و ہند کا ذیلی ہمالیائی سلسلہ ہے۔ یہ مشرق میں سکم ریاست سے شروع ہو کر، شمال مشرقی ہندوستان، نیپال سے ہوتا ہوا، شمال مغربی ہندوستان اور شمالی پاکستان تک سولہ سو کلومیٹر سے بھی زیادہ علاقے تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کی چوڑائی کئی جگہوں

پرسولہ کلومیٹر سے قریب ہے۔اس کی اوسط بلندی تین سے چار ہزار فٹ ہے۔شیوا لک سنسکرت کا ایک لفظ ہے جس کا مطلب ہے شیوا سے تعلق’’۔اگر آپ اسے نقشے میں دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ دریائے راوی اور گھا گرہ کے درمیان دریائے بیاس اور ستلج سے شیولک کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ خطہ موجودہ اضلاع گرداس پور، ہوشیار پور اور روپ نگر کے مشرقی حصوں میں پھیلا ہوا ہے۔ پاکستان میں یہ پہاڑی سلسلہ ہزارہ کے علاقے میں داخل ہوتا ہے اور پشاور تک جاتا ہے۔

انھی شیوا لک پہاڑیوں کے جنوب مغرب میں پنجاب کا عظیم میدانی علاقہ واقع ہے۔اس

Punjab Topography

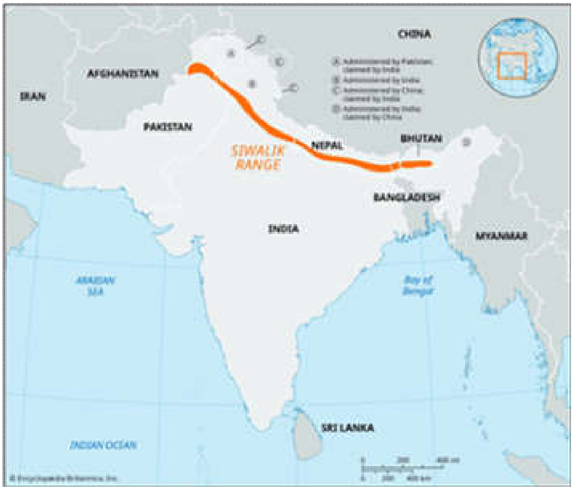


Source:By Apuldram-Own work, CC BY-SA 3.0,
https://:commons.wikimedia.org/w/index.php?curid=25050504

علاقے میں سینکڑوں میٹر کی گہرائی تک پہاڑوں سے بہہ کر آنے والی مٹی موجود ہے، جس نے اس خطے کو بے حد زرخیز بنایا۔ اسی میدان میں کئی ندیاں اور دریا بہہ رہے ہیں۔ یہ ضرور ہوا ہے کہ پنجاب کے بیشتر دریا اپنے راستے بدلتے رہے ہیں۔ ایک طرف پنجاب کے میدانی علاقوں میں پانی کے ذخائر تھے تو دوسری طرف پہاڑیوں کے قریب بجری اور ریت ایک بڑی تعداد میں پائی جاتی تھی۔ پنجاب کا بیشتر حصہ سطح سمندر سے کوئی ایک ہزار فٹ کی بلندی سے بھی کم ہے جس کی وجہ سے یہاں ایک بہترین نہری نظام وضع کرنے میں مدد ملی۔

رائے کے کہنے کے مطابق تاریخ سے یہ پتا چلتا ہے کہ موریا، ہند-یونانی، اور ساکوں نے پنجاب پر طاقت کے زور پر اپنا قبضہ جما لیا۔ ان کے بعد پہلی صدی عیسوی میں کشانوں نے ساکوں کی جگہ لے لی اور کنشک کے ماتحت (اور کنشک سے بھی پہلے)، اور اس طرح پنجاب ایک ایسی سلطنت کا حصہ بن گیا جو شمالی ہندوستان کے ایک بڑے علاقوں پر پھیلی ہوئی تھی۔ پھر وہ وقت بھی آیا جب گپتا چوتھی صدی عیسوی میں منظر پر نمودار ہوتے ہیں۔ ان کے بعد ہن آن پہنچے۔

Siwalik Hills



Siwalik Hills

ttps//:cdn.britannica.com/55/241455-050-E9DC9584/Locator-map-Siwalik-Range.jpg

ہندوستان لفظ کا پس منظر

میں نے اس بات کی تلاش میں کافی وقت صرف کیا کہ یہ جان سکوں کہ لفظ ہندوستان کب استعمال ہونا شروع ہوا اور اسے کس نے شروع کیا؟ یاد رہے کہ اس وقت برِصغیر کا وہ حصہ جسے انگلش میں انڈیا کہا جاتا ہے کا سرکاری نام بھارت ہے، ہندوستان نہیں۔ میں اس کتاب میں ہندوستان کا لفظ اس خطے کے لیے استعمال کر رہا ہوں، جس میں اب بھارت، بنگلہ دیش اور پاکستان واقع ہیں۔

رائے کا یہ کہنا ہے کہ رگ وید ایک قدیم کتاب ہے، جس سے قدیم ہندوستان کے جغرافیے بارے کافی معلومات موجود ہیں۔ اس کتاب میں دریاؤں کے بارے میں بھی لکھا ہوا ملتا ہے۔ رگ وید کے مطابق پنجاب میں سب سے اہم دریا دریائے سندھ تھا۔ اسی کتاب سے یہ بھی جاننے کو ملتا ہے کہ اس علاقے کو سپتا سندھاوا (اویستا میں ہفت ہندو) یا سات دریاؤں کی سرزمین بھی کہا جاتا تھا۔[1]

رائے نے لکھا ہے کہ لفظ ہندستان کی ابتدا فارسی میں ہند سے ہوتی ہے جو ایرانی بادشاہ، شاہ پور اول (272-241 عیسوی) کے نقشِ رستم میں درج ہے۔ یہ بھی جاننے کی بات ہے کہ یہ اصطلاح صرف وادی سندھ کی نچلی جگہ کو ظاہر کرتی تھی۔ یونانی اسے انڈیا اور چینی اس کے لیے شین ٹو کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ یہ بات انھوں نے رانا بیر چکرواتی کے حوالے سے کہی ہے)اس سے مجھے یہ معلوم ہوا کہ یہ لفظ ہندو سے نہیں بنا یعنی ہندوستان نہیں تھا، بلکہ ہندستان ہے۔ میرا بھی یہ خیال تھا کہ

---

[1] Ranabir Chakravarti, Appendix, in N.R. Ray et.al.,eds. A Sourcebook of Indian Civilization, Orient Longman, New Delhi, 2000, pp, 553-55 Hemchandra Raychaudhuri, Studies in Indian Antiquities, 80- pp.78, Caldutta,Caldutta University



ہندولوگوں کی وجہ سے یہ ہندوستان ہے جب کہ اصل میں یہ نام فارسی کا ہے،جس کا مطلب ہندستان، یعنی جہاں ہندردریا بہتا تھا، جسے قدیم رگ وید میں سندھ کہا گیا ہے۔بقول رگھوپتی سہائے:

؎سر زمینِ ہند پر اقوامِ عالم کے فراق
قافلے بستے گئے ہندوستاں بنتا گیا

رائے کے کہنے کے مطابق پنجاب کا نام،جس کا مطلب ہے پانچ دریا، یہ لفظ سنسکرت میں پنجند (پانچ دریاؤں کی سرزمین) کی شکل میں ملتا ہے۔مہابھارت سے یہ بھی جاننے کو ملتا ہے کہ پانچ دریا جو اس زمین کو سیراب کرتے تھے ان کے نام کچھ یوں تھے: شتادرو (ستلج)، وپاشا (بیاس)،ایراوتی یااراوتی (راوی)، چندربھاگا (چناب)اور وِتاستہ (جہلم) کے ساتھ مل کر چھٹا سندھو یعنی سندھ) یہاں رہنے والے لوگوں کو وہیکا یا بہیکا (Vāhikā or Bāhikā) کہا جاتا تھااور اکثر پاچناڈا (Pañchanada) بھی کہا جاتا تھا۔ان کے تین مشہور قبیلے تھے:

and Madra-ratta Ārtika (Ja)

یہ قبائل پنجاب کے مختلف حصوں میں آباد تھے۔ واہکا کا اصل وطن موجودہ امرتسر اور کپورتھلہ کے اضلاع میں دریائے بیاس کا کنارہ تھا۔اگروال کے مطابق پانچویں یا چوتھی صدی قبل مسیح میں ایک مشہور سکالر پینینی نے سندھ اور ستلج کے درمیانی علاقے کو واہکا یا بہیکا کا

نام دیا ہے۔[1] کہا جاتا ہے کہ وہیکا کی اصطلاح گنگا کے طاس کے لوگ ستلج سے مغرب کی جانب آباد لوگوں کے لیے استعمال کی جاتی تھی۔ اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے، کہ پنجاب کے موجودہ علاقے کو وہیکا کا نام بھی دیا گیا تھا۔ ان سب کو دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ پنجاب کی مشرقی حد دریائے جمنا تھی۔ جمنا سے مشرق کے علاقے کبھی بھی پنجاب کا حصہ نہیں رہے۔ شمال میں ہمالیہ اس کی سرحد تھی، مغرب میں دریائے سندھ اور جنوب اور جنوب مغرب میں اراولی پہاڑیاں اور صحرائے تھر اس کی حد تھی۔

جغرافیہ کی تاریخ کی ابتداء آٹھ ہزار قبل مسیح سے جانی جاتی ہے۔ ان پچھلے دس ہزار سالوں میں پنجاب میں کوئی بڑی جغرافیائی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ البتہ یہ ضرور ہوا ہے کہ دریاؤں نے راستے ضرور تبدیل کیے ہیں۔ (کہتے ہیں کہ کبھی دریائے راوی لاہور میں واقع شاہی قلعے کے ساتھ بہتا تھا، اب یہ قلعے سے کافی دور بہہ رہا ہے)۔ لیکن ایک عرصے سے کوئی بڑی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔

اگروال کے مطابق پنجاب میں چار ہزار سال قبل مسیح انسانی بستیاں بننا شروع ہوئیں۔ اس کا ثبوت بہاولپور ضلع سے ملنے والے آثارِ قدیمہ ہیں جو کوئی تین سے چار ہزار سال قبل مسیح کے دور کے ہیں۔ ان میں سے اکثر دریائے ہاکڑہ (جسے ہاکرہ بھی کہتے ہیں) کے کنارے آباد تھیں۔ ہاکڑہ تہذیب بارے ایک مضمون پڑھنے کو ملا جسے ملک شہباز علی نے لکھا ہے۔[2] ان کے مطابق پانچ یا چھ ہزار سال قبل مسیح میں جب ہڑپہ، میسوپوٹیمیا کے ساتھ ساتھ کئی اور تہذیبیں پھل پھول رہی تھیں، اسی دور میں وادی ہاکڑہ کی تہذیب بھی ایک نمایاں حیثیت رکھتی تھی۔ یہاں پر آباد لوگ دریائے ہاکڑہ کے کنارے پر آباد تھے۔ اب یہ دریا سوکھ کر ماضی کا حصہ بن چکا ہے اور اسی وجہ سے اسے گم شدہ دریا بھی کہا جاتا ہے۔ ہاکڑہ تہذیب کا مرکز موجودہ ریاست بہاولپور، چولستان، تھر اور راجستھان کے کچھ علاقوں پر مشتمل تھا۔ اس تہذیب کا سب سے بڑا مرکز بہاولپور کے

---

[1] https://punjab.global.ucsb.edu/sites/default/files/sitefiles/journals/volume11/nol/2_grewal.pdf ڈائریکٹر انڈین انسٹیٹیوٹ آف ایڈوانس اسٹڈیز شملہ

[2] https://www.humsub.com.pk/509489/malik-shahbaz-ali-12/

قریب گنویری والا کا شہر کہا جاتا ہے۔ تاریخ کے لحاظ سے یہ شہر ہڑپہ اور موہنجوداڑو کا ہمعصر شہر تھا۔ اس کا محلِ وقوع بھی ان دونوں شہروں کے درمیان واقع تھا۔ اب اس کے آثار بھی نہیں ملتے۔

حال ہی میں چولستان میں اور بھی کئی مقامات، کھنڈرات اور قدیم قلعے دریافت ہو چکے ہیں، جن سے یہ پتا چلتا ہے کہ وادی ہاکڑہ کی یہ تہذیب دریائے ہاکڑہ کی گزرگاہ پر ہی قائم تھی۔ یہاں زیرزمین پانی کی موجودگی سے بھی اس دریا کی گزرگاہ ثابت ہوتی ہے۔ جدید آلات کی مدد سے بھی دریا کی گزرگاہ پر زیرزمین سوکھے ہوئے ہاکڑہ کا بیڈ موجود ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہاکڑہ ہی سرسوتی دریا تھا۔ سرسوتی ہندو میتھالوجی میں ایک مقدس دریا ہے جو صدیوں پہلے موجود تھا۔ [1]

❁❁❁

---

[1] Ancient Pakistan-An Archaeological History: Volume IV: Harappan. By Mukhtar Ahmed

برصغیر میں انتظامی اکائیوں کی تشکیل

صوبہ اور ضلع کے نظام کی ابتداء

چترا لیکھا کے مطابق جب ڈچ، فرانسیسی اور انگریز پہلی بار ہندوستان میں تجارت کی غرض سے آئے تو اس ہندوستان کے اکثر علاقے مغل سلطنت کے زیرِ اثر تھے۔ اکبر کے دور میں ایک بہترین نظم و نسق کی خاطر مغلیہ سلطنت کو کئی صوبوں میں تقسیم کیا گیا۔ آغاز میں کوئی بارہ صوبے تھے۔ ہر صوبے پر ایک صوبیدار متعین ہوتا تھا، جسے انگریزوں نے گورنر کا نام دیا جو اب تک استعمال ہو رہا ہے۔ اس بات کی تصدیق آئین اکبری (اکبر نامہ) سے بھی ہوتی ہے جسے ابوالفضل نے تحریر کیا ہے۔ اس فہرست میں کہیں بھی پنجاب کا لفظ نہیں ہے۔ پنجاب کے علاقے میں واقع تین بڑے شہروں کے نام پر اس علاقے میں تین صوبے تھے؛ دہلی، ملتان اور لاہور۔ بعد میں ان صوبوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔ شاہ جہاں کے دور میں ان کی تعداد کوئی بیس تک پہنچ گئی۔ اورنگزیب عالمگیر کے دور میں اس میں مزید اضافہ ہوا اور ان کی تعداد 23 ہو گئی۔ اس دور میں مغلیہ سلطنت کا رقبہ اپنی انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ اورنگزیب عالمگیر کی وفات کے بعد مغل سلطنت کا زوال شروع ہوتا ہے اور اس کے کئی صوبے داروں نے آزادی کا اعلان کیا۔

ہندوستان برصغیر میں صوبوں کے ساتھ ساتھ اضلاع اور تحصیلوں کی بھی حد بندی کا کام انگریزوں کے دور میں شروع ہوا۔ یاد رہے کہ اس دور میں ہندوستان دو حصوں میں تقسیم تھا۔ ایک وہ علاقہ جسے انگریزوں نے بزورِ طاقت حاصل کیا تھا، اسے برٹش انڈیا کہا جاتا ہے۔ یہ علاقے مکمل طور پر انگریزوں کے قبضے میں تھے اور یہاں ان ہی کا قانون چلتا تھا۔ دوسرے وہ علاقے تھے جو کسی مقامی شخص کی سربراہی میں ایک ریاست کی شکل میں تھے۔ ریاستوں کی تعداد میں کمی بیشی ہوتی رہی۔ ان

کی تعداد ساڑھے پانچ سو سے چھ سو کے درمیان رہی ہے اور ان کا رقبہ ہندوستان کے کل رقبے کے نصف کے قریب تھا۔ ہر ریاست کے پاس ایک مخصوص علاقہ ہوتا تھا۔ اور اس کی حد بندی کی کوئی نہ کوئی نشانی بھی ہوتی تھی۔ زیادہ تر قدرتی طور پر تقسیم شدہ علاقے ہی ایک دوسرے کے علاقے گنے جاتے تھے۔ جیسے ریاستوں کے درمیان میں واقع دریا ایک سرحد کا کام کرتا تھا یا کوئی بڑا پہاڑ ایک ریاست کو دوسری ریاست سے جدا کرتا تھا۔ رنجیت سنگھ کی حکومت مشرق میں دریائے ستلج تک تھی۔ اس طرح کی تقسیم دنیا بھر میں رائج تھی۔ اس کی ایک مثال دنیا بھر میں براعظموں کی تقسیم ہے۔

براعظم آسٹریلیا ایک الگ تھلگ ملک ہے اسی طرح سے براعظم امریکہ بھی باقی دنیا سے کٹا ہوا ہے۔ البتہ براعظم یورپ اور ایشیا الگ بھی ہیں اور کچھ مقامات پر ایک دوسرے سے ملتے بھی ہیں اور کئی ممالک مثال کے طور پر روس اور ترکی ایسے ملک ہیں جو یورپ اور ایشیا دونوں میں پائے جاتے۔ (یہاں میں یہ بات پھر واضح کر دوں کہ میں پنجاب کا لفظ ایک متحدہ پنجاب کے لیے استعمال کر رہا ہوں، اس میں ہریانہ بھی شامل ہے۔ جب مجھے بھارتی یا پاکستانی پنجاب کی بات کرنا ہوگی تو مشرقی یا مغربی پنجاب کا لفظ استعمال کروں گا)۔ کیا پنجاب کا حدود اربعہ شروع دن سے ایسا تھا یا اس میں بعد میں تبدیلی ہوتی رہی ہے۔ یہ وہ موضوع ہے جس پر میں بات کرنا چاہتا ہوں۔

پنجاب کے جغرافیے بارے جے ایس اگروال نے ایک بہت ہی کارآمد کتاب لکھی ہے۔ [1] اس کا عنوان ہے؛

Historical Geography of the Punjab

اس کتاب میں انھوں نے پنجاب کے جغرافیے کے متعلق تفصیل سے لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ عام طور پر کسی بھی علاقے کے جغرافیے کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے؛ زمینی حالات یعنی اس علاقے میں پائے جانے والے دریا، پہاڑ، میدان، جنگلات وغیرہ، اسے زمینی جغرافیہ کہا جا سکتا ہے۔ دوسرے وہاں کی تہذیب وتمدن، مذہب، کلچر، زبان وغیرہ، اسے ہم ثقافتی جغرافیہ کہہ سکتے ہیں۔ دونوں کا آپس میں گہرا تعلق ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔

---

[1] by J.S. Grewal, *Historical Geography of the Punjab*

پنجاب کا حدود اربعہ
سیاسی، انتظامی اور لسانی و نسلی تقسیم

تاریخ سے یہ پتا چلتا ہے کہ جس خطے کو پنجاب کہا جاتا تھا، اس کا حدود اربعہ کیا تھا، اس بارے مؤرخین اور دیگر سماجی سائنس دانوں میں اتفاق رائے نہیں ہے۔تاریخ نویسوں نے سیاسی بندوبست کو ہی پنجاب کا حدود اربعہ قرار دیا ہے۔یہ سیاسی و انتظامی یونٹ وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے رہے ہیں۔مثال کے طور پر سولھویں صدی کے دوران مغل دور کا پنجاب انیسویں صدی کے آخر میں برطانوی دور کے پنجاب سے بے حد مختلف ہے۔اس کے بعد تقسیم ہند کے موقع پر اس میں مزید تبدیلی آئی۔پھر یہ بات بھی پتا چلتی ہے کہ بھارت میں اس کے بعد بھی پنجاب کی تقسیم ہوئی (ایک 1947 میں، دوسری 1956 میں اور تیسری 1966 میں)۔اس مرتبہ تقسیم کی بنیاد ایک دفعہ پھر سیاسی اور انتظامی تھی۔اب کسے پنجاب کہا جائے؛ ہریانہ کو، مشرقی پنجاب کو، مغربی پنجاب کو یا پھر ہماچل پردیش کو؟ اسی طرح پاکستان میں پنجاب کی مزید تقسیم کی بات کی جاتی ہے گو کہ ابھی تک ایسا نہیں ہوا۔

اگروال مزید لکھتے ہیں کہ اکبر کے زمانے سے پہلے، کچھ دوسری اصطلاحات مقامی یا علاقائی شناخت کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔ان میں سب سے رگ وید میں لکھی ہوئی سپت سندھو ہے جسے فارسی پنجاب کی طرح سات دریاؤں کی سرزمین سے تعبیر کیا گیا ہے۔ان میں سب سے اہم دریائے سندھ تھی جسے سندھو (دریا) کہا جاتا ہے۔اس لیے امکان ہے کہ باقی چھ دریا اس کے معاون دریا تھے۔ان میں سے پانچ تقریباً یقینی طور پر جہلم، چناب، راوی، بیاس اور ستلج تھے، یہ

سب رگ وید میں نمایاں ہیں۔ یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ 'پنجاب' کی اصطلاح کے استعمال نے ایک بڑی غلط فہمی پیدا کی ہے۔ ان اضلاع کا مطلب پانچ پانی لیا جاتا ہے جو درست بھی ہے (یہ ایک فارسی کی اصطلاح ہے پنج آب)۔ اس وقت بھی اس علاقے میں چھ دریا بہتے تھے۔

اکبر کے دور میں پنجاب نام کا کوئی صوبہ نہیں تھا بلکہ اس علاقے میں موجود تین بڑے شہروں کے نام سے اس علاقے کا انتظام کیا جاتا تھا: ملتان، لاہور اور دہلی۔ میں نے تزکِ جہانگیری میں پڑھا ہے کہ اس نے صوبہ پنجاب کا گورنر مقرر کیا تھا۔ اس سے یہ مراد لیا جا سکتا ہے کہ اکبر کے دور کے بعد شہروں کے نام کی بجائے پنجاب کا لفظ استعمال کیا جانے لگا۔ نام تو ضرور استعمال کیا گیا مگر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس کی حدود کیا تھیں؟

اس سے میں یہ بات اخذ کر سکتا ہوں کہ پہلی مرتبہ جہانگیر کے دور حکومت میں صوبہ پنجاب کا لفظ استعمال کیا گیا۔ اس سے پہلے مجھے صوبہ پنجاب کے لفظ کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ پھر جب انیسویں صدی کے اوائل میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنی ریاست قائم کی تو اس نے اپنے آپ کو پنجاب کا حاکم قرار دیا۔ اس کی ریاست میں کشمیر، منکیرہ اور ملتان، اٹک اور پشاور تک کے علاقے شامل تھے، ان سب کے مجموعے کا نام پنجاب تھا۔

دہلی صوبہ بارے ایک پی ایچ ڈی کا مقالہ دیکھنے کو ملا، جسے ابھا سنگھ نے علی گڑھ یونیورسٹی کے لیے لکھا۔ اس مقالے کا عنوان ہے؛

SUBA OF DELHI UNDER THE MUGHALS, 1580-1719

اس مقالے کے مطابق، مغل دور سے پہلے لودھی دور میں مختلف علاقوں کے لیے سرکار کا لفظ استعمال ہوتا تھا۔ مغلوں نے کئی سرکاروں کو ملا کر ایک صوبہ بنایا۔

دہلی صوبہ کے اندر پانچ سرکاریں شامل تھیں جن کے نام کچھ یوں ہیں؛ سرہند، دہلی، حصار، فیروزہ اور سمبل۔ یہ بھی جاننے کے قابل بات ہے کہ ان سرکاروں کی بھی کوئی بہت واضح حدود متعین نہیں تھی، ایک علاقے کا نام ہی تھا۔ اس دور میں آبادی بھی بہت کم تھی اور بعد میں ان میں کمی بیشی بھی ہوتی رہی ہے۔ اکبر نامہ کے مطابق یہ یہی پانچ سرکاریں دہلی صوبے میں

شامل تھیں بعد میں کئی اور سرکار جیسے ریواڑی وغیرہ بھی اس میں شامل کی گئیں۔ دہلی صوبہ مشرق میں اودھ، مغرب میں لدھیانہ، شمال میں ہمالیہ سلسلے تک اور جنوب میں آگرہ اور اجمیر تک پھیلا ہوا تھا۔ آئین اکبری کے مطابق دہلی صوبے میں 8 سرکاریں تھیں اور 232 محل تھے۔ یہ تبدیلیاں اورنگزیب عالمگیر کے دور میں بھی ہوئیں۔ بعد میں جب درانی سلطنت کا اس علاقے پر قبضہ ہوا اور مغل سلطنت کا خاتمہ ہوا تو اس میں مزید کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ درانی سلطنت کے زوال کے بعد سکھ دور میں کئی اہم تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ اسی دور میں انگریزوں نے اس علاقے میں کئی تبدیلیاں کی۔

رائے کے مطابق سیوالک پہاڑوں کے دامن میں پنجاب کا آخری قصبہ پٹھانکوٹ ہے۔ یہ بات کافی وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ہڑپہ کے لوگ شیوالک پہاڑوں تک پہنچ گئے تھے۔ اکبر کے زمانے سے پہلے، کچھ دوسری اصطلاحات مقامی یا علاقائی شناخت کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔ ان میں سب سے قدیم رگ وید ک (ہندوؤں کی قدیم مذہبی کتاب) میں درج 'سپت سندھو ہے یعنی سات دریاؤں کی سرزمین'۔ ان میں سب سے اہم دریائے سندھ ہے، جسے سندھو (دریا) بھی کہا جاتا ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ باقی چھ دریا اس کے معاون دریا تھے۔ وہ کون سے چھ دریا تھے، یہ کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ ان میں پانچ دریا؛ جہلم، چناب، راوی، بیاس اور ستلج تو یقینی طور پر تھے، ساتواں کون سا تھا؟ اس بارے اگروال بھی کوئی یقینی بات نہیں بتا سکے۔ ان کے مطابق ساتواں دریا، مشرقی افغانستان سے آنے والا دریائے کابل بھی ہو سکتا ہے، جو دریائے سندھ کا سب سے اہم معاون دریا ہے۔ ایک افسانوی دریا، دریائے سرسوتی بھی ہو سکتا ہے، دریائے گھگر (گھاگرا) کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ بھی ان سات دریاؤں بھی ہو سکتا ہے۔

برٹش دور میں شائع ہونے والے نقشے کے مطابق مغل دور میں صوبہ لاہور کے مشرق میں دہلی واقع تھا، مغرب میں صوبہ کابل، شمال میں کشمیر اور جنوب میں ملتان۔ مشرق میں اس کی حد جالندھر تک تھی، شمال میں جموں، راجور، مغرب میں اس کی حد دریائے سندھ تک تھی اور اٹک اس

میں شامل تھا۔ جنوب میں فیروز پور، ملتان، خوشاب تک اس کی سرحد تھی۔

انگریزوں نے پنجاب صوبہ کی مغلوں کے بنائے صوبے کے برعکس نئے سرے سے اس کی حدود کو مقرر کیا۔ پنجاب کے اس حصے کی تقسیم کی گئی جو برٹش انڈیا کا حصہ تھا۔ وہ علاقے جو مقامی ریاستوں کے تحت تھے ان کا اپنا اپنا نظام تھا۔ موجودہ پنجاب کی حدود انگریزوں نے رکھی تھیں جس کے مشرق میں دہلی اس کی سرحد تھی اور مغربی حد اٹک تھی۔

کیا یہی وہ علاقہ ہے جسے ہم پنجاب کہتے ہیں یا اس میں کچھ اور علاقے بھی جو پنجاب سے نکال کر ایک دوسرے علاقوں میں شامل کیے جیسے پشاور، ہزارہ، ڈیرہ اسماعیل خان اور شاید کئی اور علاقے بھی؟

یہ جاننے کے لیے کہ پنجاب کی حدود انگریزوں کی تقسیم سے پہلے کہاں تک تھیں، انگریزوں سے پہلے اگر ہم مغل دور کو دیکھیں تو ان کی سب سے بڑی کتاب اکبر نامہ ہے جس میں کوئی 12 صوبوں کا ذکر ہوا ہے۔ ان صوبوں میں کسی بھی صوبے کا نام پنجاب نہیں ہے۔ بلکہ ان کے نام شہروں کے نام پر ہیں جیسے لاہور، کابل، ملتان وغیرہ۔ لیکن کسی بھی جگہ پر پنجاب کو الگ سے بیان نہیں کیا گیا۔

اگر آپ پنجاب کے نقشے پر غور کریں تو آپ یہ جان پائیں گے کہ اس کے شمال مشرق میں اور شمال مغرب میں پہاڑ موجود ہیں اور ان کے قدموں میں کئی شہر بھی آباد ہیں۔ اگر ہم پشاور سے چل کر دریائے سندھ کے پاس اٹک کو دیکھیں۔ اٹک سطح سمندر سے چھ سو فٹ کی بلندی پر ہے۔ جب کہ اٹک کے بعد اس کے اوپر والے حصے تین ہزار فٹ کی بلندی پر ہیں۔ ایسے ہی اٹک کے بعد ٹیکسلا، ہری پور اور ایبٹ آباد، ہمالیہ کے دامن میں واقع ہیں۔ ان کے ساتھ ہی پہاڑی علاقے بھی شروع ہو جاتے ہیں۔ ایبٹ آباد کے بعد مانسہرہ۔ اسی طرح سے اگر ہم راولپنڈی آئیں تو یہ سطح سمندر سے کوئی بارہ سو فٹ بلندی پر واقع ہے۔ اس کے ساتھ ہی اگر ہم دیکھیں تو مری کی پہاڑیاں شروع ہوتی ہیں جو چھ ہزار فٹ بلند ہیں۔ اگر ہم اور تھوڑا سا مشرق کی طرف چلیں ہمیں

میر پور اور جہلم، پہاڑوں کے دامن میں نظر آتے ہیں۔اسی طرح سے گجرات کے بعد اگر آپ لاہور کو بھی دیکھیں۔لاہور پہاڑوں سے بہت دور نہیں ہے اور سیالکوٹ تو بالکل جموں کی پہاڑیوں کے پاس ہے۔اسی طرح سے اگر آپ چلتے ہوئے نیچے تک چلے جائیں تو آپ دیکھیں گے کہ چندی گڑھ بھی سمندر سے بارہ سوفٹ بلند ہے۔یہ بھی پہاڑیوں کے دامن میں ہے اور چندی گڑھ کے بعد بھی اگر آپ آگے چلے جائیں تو آپ یہ دیکھیں گے دہلی آتا ہے۔دہلی بھی پہاڑوں کے دامن میں ہے۔اس کے بعد ڈیرہ دون،شملہ اور کئی اور قصبے ملیں گے جو پہاڑوں پر واقع ہیں۔ دہلی کے اندر بھی بے شمار چھوٹی پہاڑیاں موجود ہیں۔

اگر آپ پشاور سے مغرب کی طرف دیکھیں تو آپ کو کوہاٹ کا پہاڑی علاقہ ملے گا۔اس کے بعد وزیرستان کا علاقہ۔جنوب کی طرف ڈیرہ اسماعیل خان سے گزرتے ہوئے آپ کوہِ سلیمان کے علاقے میں آجاتے ہیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ نقشے کو دیکھیں تو پنجاب کے شمال مغرب اور شمال میں تینوں اطراف میں پہاڑی سلسلے موجود ہیں۔ان کے درمیان میں ایک بہت بڑا میدانی علاقہ موجود ہے جس کے اندر کئی مشہور شہر آباد ہیں۔اس طرح سے آپ کہہ سکتے ہیں دہلی سے لے کر پشاور تک،شمال میں شیوالک کی پہاڑیوں سے لے کر چولستان اور راجستھان تک ایک وسیع میدانی علاقہ موجود ہے جسے پنجاب کے نام سے جانا جاتا ہے۔کیا پشاور پنجاب کا کبھی حصہ تھا یا نہیں؟ اس پر کافی کچھ لکھا جا چکا ہے۔میرے خیال میں شاید ایک قلیل مدت کے لیے انتظامی ضرورت کے تحت پشاور، پنجاب کا حصہ رہا ہو۔لسانی و معاشرتی زبان کے نقطۂ نظر سے اٹک ہی سرحد بنتی ہے۔

کیا پشاور،کوہاٹ،ڈیرہ جات کبھی پنجاب کا حصہ تھے؟

مجھے جناب امجد وڑائچ نے برطانوی دور کا ایک نقشہ بھیجا ہے جس میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ پنجاب کی مغربی سرحد پشاور کے پار تھی،شمال مغرب میں یہ سوات سے ملتا تھا،جنوب مغرب میں کوہاٹ سمیت ٹانک اور ڈیرہ جات بھی اس میں شامل تھے۔جو میں نے مشاہدہ کیا اس کے مطابق پنجاب کی وحدت کی بنیاد لسانی،جغرافیائی،قبائلی،تاریخی ہے۔جب میں اٹک کے پار کے علاقوں

کو دیکھتا ہوں تو مجھے اس میں کچھ بھی اٹک سے پہلے کے علاقوں سے مشترک ملتا نظر نہیں آتا۔ امجد صاحب کا یہ کہنا کہ اٹک کے پار پشاور تک، کوہاٹ سمیت ان علاقوں میں ہندکو زبان بولی جاتی تھی، جس کی وجہ سے یہ علاقے پنجاب ہی کا حصہ تھے۔

جب میں نے معروف محقق اور ادیب جناب امجد وڑائچ صاحب کی اس رائے کو مزید جاننے اور سمجھنے کی کوشش کی کہ ہندکو زبان پشاور، کوہاٹ، بنوں، اور دیگر خیبر پختونخوا کے شہروں میں رائج ہے، تو مجھے ایک نہایت دلچسپ اور قابلِ توجہ حقیقت کا ادراک ہوا، جو شاید قارئین کے لیے بھی باعثِ دلچسپی ہو۔

یہ بات مشاہدے میں آئی کہ ہندکو زبان بنیادی طور پر شہری مراکز تک محدود ہے جیسے پشاور، کوہاٹ یا ڈیرہ اسماعیل خان کا اندرون شہر۔ تاہم، ان شہروں سے باہر دیہی علاقوں میں ہندکو کی موجودگی برائے نام ہے۔ مثال کے طور پر، درہ آدم خیل کے بعد دیہی علاقوں میں ہندکو بولنے والے افراد خال خال ہی پائے جاتے ہیں۔ اس عدمِ رواج کی ایک ممکنہ وجہ برطانوی دور کی انتظامی اور فوجی پالیسیوں سے جڑی ہوئی ہے۔

جب انگریزوں نے راولپنڈی، کوئٹہ اور دیگر اہم مقامات پر چھاؤنیاں قائم کیں، تو ان کے ساتھ مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے مزدور، ہنرمند، اور تاجر بھی ان مراکز میں آئے۔ ان چھاؤنیوں کی ضروریات جیسے خوراک، رہائش، اور خدمات کو پورا کرنے کے لیے مقامی و غیر مقامی افراد کو روزگار ملا، جن میں ایک بڑی تعداد ہندکو بولنے والوں کی بھی تھی۔ بعد ازاں جب انگریز بلوچستان کی جانب بڑھے اور کوئٹہ میں چھاؤنی قائم کی، تو وہی تربیت یافتہ افراد اور اہلِ حرفہ ان کے ساتھ کوئٹہ چلے گئے۔ اسی تناظر میں دیکھا جائے تو آج بھی کوئٹہ شہر میں ہندکو اور پنجابی بولنے والوں کی ایک قابلِ ذکر آبادی موجود ہے۔ اگرچہ لہجے میں فرق پایا جاتا ہے، مگر بنیادی زبان کی ساخت و مفہوم مشترک ہے۔ پشاور، کوہاٹ، اور بنوں جیسے شہروں میں ہندکو بولنے والے آج بھی موجود ہیں، لیکن یہ زبان زیادہ تر شہری مراکز تک محدود ہے، جبکہ مضافات میں پشتو غالب ہے۔ میں نے اپنے دوست اعجاز محبوب سے جن کے دادا بیسویں صدی کے آغاز میں ہزارہ سے کوئٹہ

ملازمت یا کاروبار کے لیے آئے تھے، اس کی وجہ دریافت کی تو انھوں نے بتایا کہ اس کی وجہ یہاں پر انگریزوں کی چھاونی کا ہونا تھا۔ اس طرح ایک بڑی تعداد میں لاہور سے گئے ہوئے لوگ بھی اسی دور میں کوئٹہ گئے۔ مجھے ایک اور صاحب سے کوئٹہ میں ملنے کا موقع ملا جن کا تعلق لاہور کی بٹ برادری سے تھا۔ انھوں نے بتایا کہ ان کے والد کی پیدائش کوئٹہ کی ہے۔ ان کے دادا یہاں آئے تھے۔

یہ دعویٰ کہ خیبر پختونخوا کے ان علاقوں میں ہندکو کے موجود ہونے کی بنیاد پر انھیں پنجاب کا تاریخی حصہ سمجھا جائے، علمی اور جغرافیائی بنیادوں پر کمزور نظر آتا ہے۔ زبان کسی خطے کی شناخت کا ایک پہلو ضرور ہو سکتی ہے، مگر وہ واحد معیار نہیں بن سکتی، خاص طور پر جب سیاسی، انتظامی اور جغرافیائی حدود اس سے متصادم ہوں۔

اسی طرح ایک اور مثال ڈیرہ اسماعیل خان کی ہے جہاں ایک بڑی تعداد میں سرائیکی بولنے والے آباد ہیں۔ اگر صرف زبان کو بنیاد بنایا جائے، تو سرائیکی بولنے والے علاقوں کو پنجاب کا حصہ تسلیم کرنا پڑے گا، حالانکہ یہ علاقے دریائے سندھ کے اس پار واقع ہیں، جو تاریخی طور پر پنجاب اور سندھ کی ایک قدرتی سرحد رہی ہے۔ اگرچہ تونسہ شریف جیسے مقامات اس تقسیم کی استثنا ہیں، جہاں دریا کے پار بھی پنجاب کا جغرافیہ پھیلتا ہے، تاہم یہ مخصوص حالات کی پیداوار ہیں۔

مزید برآں، بلوچستان کے علاقے نصیرآباد میں بھی سرائیکی بولنے والوں کی ایک قابلِ ذکر تعداد موجود ہے۔ سابق وزیرِ اعظم جناب ظفر اللہ خان جمالی کی وفات پر جب میں وہاں گیا، تو مشاہدہ کیا کہ بہت سے مقامی افراد سرائیکی بولتے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ لوگ ہجرت کر کے وہاں بسے ہوں، لیکن ان کی موجودگی کو بنیاد بنا کر ان علاقوں کو پنجاب کا حصہ قرار دینا قرینِ قیاس نہیں۔

اس تمام بحث کا حاصل یہ ہے کہ زبان کی بنیاد پر علاقائی وابستگی کا تعین کرنا ہمیشہ درست نہیں ہوتا۔ پنجاب کی تاریخی حدود مشرق میں دریائے جمنا، مغرب میں دریائے سندھ (اٹک تک)، شمال میں مری، ہزارہ اور جہلم کے علاقوں، اور جنوب میں راجستھان، چولستان اور تھر کے ریگزاروں تک محیط رہی ہیں۔

یہ بات بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ قدیم ادوار میں جب آبادی کم اور شہریت کی شکل محدود تھی، تب علاقوں کی باقاعدہ نشان دہی اور سرحدوں کی تعین موجودہ طرز پر ممکن نہ تھی۔ چنانچہ کئی بار یہ تاثر ابھرتا ہے کہ فلاں علاقہ پنجاب یا سندھ کا حصہ تھا، حالانکہ وہ ''حاشیے'' پر واقع ہونے کی وجہ سے ثقافتی یا لسانی دوہری شناخت رکھتا تھا۔

میری ذاتی تحقیق اور مشاہدے کی بنیاد پر میری یہ رائے ہے کہ پشاور، کوہاٹ، بنوں، اور ڈیرہ جات کے بیشتر مغربی علاقے کبھی بھی پنجاب کا حصہ نہیں رہے۔ البتہ ہزارہ، ایبٹ آباد، ہری پور، اور مانسہرہ کا مشرقی خطہ تاریخی طور پر پنجاب سے وابستہ رہا ہے۔ بالائی علاقوں، مثلاً ناران اور کاغان میں آج بھی ایسے افراد ملتے ہیں جو ایسی زبانیں بولتے ہیں جو ایک پنجابی بولنے والے کو بآسانی سمجھ آتی ہیں۔ یہی صورتِ حال ہریانہ، گجرات کے پہاڑی اور سرائیکی لہجوں کے متعلق بھی ہے، جن میں لسانی ربط موجود ہے اور یہ پنجاب کی ثقافتی اکائی کا حصہ ہیں۔

آخر میں، یہ وضاحت ضروری ہے کہ یہ تمام مشاہدات میری ذاتی تحقیق، سفر، اور غور و فکر پر مبنی ہیں۔ کسی دوسرے مؤرخ یا محقق کی مختلف رائے ہوسکتی ہے، اور میں اس کا احترام کرتا ہوں۔ تاہم، میری کتاب کی ترتیب اور استدلال انھی مشاہدات پر استوار ہے، اس لیے یہی میرے لیے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔

آبادیاتی تشکیل وابتدائی آباد کاری پنجاب
ایک تاریخی جائزہ

پنجاب میں آباد کاری کب شروع ہوئی؟ اس بارے بھی کوئی حتمی بات نہیں کہی جاسکتی۔ ہندوستان میں لوگ کہاں سے آ کر آباد ہوئے؟ یہ بھی ایک دلچسپ بحث ہے کہ کیا آج کا جنوبی ہندوستان بھی قدیم ہندوستان کا حصہ تھا یا وہ ہمیشہ سے ایک الگ ملک رہا ہے؟ یہ وہ موضوع ہیں جن کے بارے کوئی حتمی بات نہیں کی جاسکتی۔

میں نے جو مطالعہ کیا ہے کہ اس کی روشنی میں، میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں، کہ جنوبی ہندوستان، بنگال، بلوچستان کے مغربی حصے، جنوبی حصہ، دریائے سندھ کا مغربی حصہ یعنی اٹک کے پاراور ہمالیہ کے پاس تبت کا علاقہ کبھی بھی جغرافیائی،تہذیبی،تمدنی،سیاسی اورزبان کے تناظر میں ہندوستان کا حصہ نہیں رہے سوائے اس دور کے جب شمالی ہندوستان کے حکمرانوں نے ان علاقوں پر طاقت کے زور پر قبضہ کیا۔ جو بہت ہی مختصر ہے۔ البتہ یہ بات بھی ظاہر ہے کہ یہ تمام علاقے ایک ہی خطے میں موجود ہیں۔ ان سب کے درمیان کوئی ایسی قدرتی تقسیم نظر نہیں آتی، جو ان سب کو جغرافیائی طور پر الگ کرتی ہو، جیسے دریا، سمندر، پہاڑ وغیرہ۔ البتہ زبان، تہذیب و تمدن، رنگ ونسل کے علاوہ کئی اور وجوہات کی بناء پر یہ کہا جاسکتا ہے، کہ یہ سب خطے الگ الگ تھے، سیاسی طور پراوراپنے تمدن کے اعتبار سے بھی۔

ہندوستان کا لفظ برصغیر جسے جنوب مشرقی ایشیا بھی کہا جاتا ہے، کے مرکزی اورشمالی حصے کے لیے بولا جاتا ہوگا۔ میرے علم کے مطابق صرف برٹش دور میں آج کے تینوں مما لک: بھارت،

بنگلہ دیش اور پاکستان ایک مرکزی حکومت کے تحت تھے۔ اس میں بھی نصف کے قریب ایسے علاقے تھے، جہاں مقامی ریاستیں تھیں، جن پر مقامی لوگ ہی حکومت کرتے تھے۔ مغل دور میں دکن ان کے قبضے میں تھا اور وہ بھی کچھ عرصے کے لیے، لیکن اس سے نیچے بحرِ ہند کی طرف ان کا کوئی اثر نہیں تھا۔ تاریخ میں بیان کی گئی کئی ایسی باتوں کی نفی ڈی این اے ٹیسٹنگ سے ہو رہی ہے جنھیں ہم صدیوں سے درست سمجھتے آ رہے تھے۔ اس موضوع پر بحث جاری ہے۔ ابھی تک کسی حتمی نتیجے پر مؤرخ نہیں پہنچے۔ اس کتاب کا موضوع پنجاب تک ہی محدود ہے، اس لیے میں اسی موضوع پر بات کروں گا۔

پنجاب کی قدیم آبادی: آثارِ قدیمہ، لسانیات اور ثقافت کی روشنی میں

سید محمد لطیف کی کتاب پنجاب کی تاریخ کے مطابق پنجاب میں آبادکاری کا آغاز تین ہزار سے لے کر پندرہ سو قبل مسیح میں ہوتا ہے۔ سید محمد لطیف کے مطابق پنجاب میں قدرتی طور پر ایک خوب صورت ماحول میسر تھا، جو ہر کسی کے لیے بے حد کشش رکھتا تھا۔ اس کی وجہ یہاں پر وسیع و عریض میدان، سرسبز وادیاں، بڑی مقدار میں پانی، بہترین موسم جو نہ بہت سخت گرم اور نہ بہت سخت سرد، کا ہونا تھا۔ ان سب نے شمال مغرب سے آنے والے آریاؤں کو، جو ایک سخت سرد علاقے سے آئے تھے، یہاں آباد ہونے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ سید محمد لطیف نے اس بارے کافی تفصیل سے لکھا ہے، جو میرے اس سفرنامے کا موضوع نہیں ہے، لیکن ایک مختصر احوال جو میں ان کی کتاب سے جان سکا وہ ضرور پیش خدمت ہے۔

سید محمد لطیف کے مطابق آریاؤں سے پہلے بھی یہاں پر لوگ آباد تھے، لیکن وہ بہت زیادہ ترقی یافتہ نہیں تھے۔ اس وقت ابھی زراعت کا کام بھی پورے طور سے شروع نہیں ہوا تھا۔ یہ لوگ قبیلوں کی شکل میں آباد تھے۔ ان کی زبان اور رہن سہن بھی کافی غیر مہذب تھا۔ یہ لوگ خانہ بدوشی کی زندگی گزار رہے تھے۔ اسی دور میں یہاں پر لوہے کا استعمال بھی شروع ہوا اور اس کے ساتھ ساتھ کئی اور صنعتوں نے بھی جنم لیا، جیسے ظروف سازی اور زیورات بنانے کا کام۔ سید محمد لطیف

ہیروڈوڈٹس کا حوالہ دیتے ہوئے بھی یہ بات بتاتے ہیں کہ ہندوستان کے مقامی باشندے کچی مچھلی اور کچے گوشت پر گزارا کرتے تھے۔ ان کے گھر بھی بہت کمزور ہوتے تھے۔[1]

یہ وہ دور تھا جب مقامی لوگ ایک طرح سے جنگلوں میں سادہ زندگی گزارتے تھے۔ اس کے بعد شمال مغرب سے ایک بڑی تعداد میں لوگ آنا شروع ہوئے، جو مقامی لوگوں سے بدرجہا بہتر تعلیم و ہنر رکھتے تھے۔ ان لوگوں نے یہاں کے لوگوں کی اچھی تعلیم و تربیت کی، انھیں بیل کو ہل کے لیے استعمال کرنا سکھایا، جس سے زراعت کو ترقی ملی، سر پر رکھنے کے لیے پگڑیوں کا استعمال شروع کیا، اچھے گھر بننے شروع ہوئے وغیرہ وغیرہ۔ انھی لوگوں نے یہاں کے مقامی باشندوں کو دیوتاؤں کی پرستش کرنا بھی سکھائی۔ قدیم ہندوستانی باشندوں کی رنگت کافی سیاہ تھی اور وہ اپنے قد کاٹھ کی وجہ سے افریقیوں سے ملتے جلتے تھے۔ ایک رپورٹ کے مطابق 1872ء میں ہندوستان میں ان قدیم باشندوں کی تعداد کوئی بیس لاکھ تھی۔ ان میں سے دس لاکھ تو صرف پنجاب میں رہتے تھے۔ انھیں اس وقت بھی نچلی ذات کے لوگوں میں شمار کیا جاتا تھا۔

میں یہاں پر اپنے کچھ ذاتی تجربات بھی آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔

تقسیم ہند کے بعد ہم لوگ ریاست پٹیالہ کے شہر سرہند سے نقل مکانی کر کے (یہ ایک جبری نقل مکانی تھی) ٹوبہ ٹیک سنگھ میں آباد ہوئے تھے۔ ہندوستان میں ہماری زرعی زمین کے بدلے سکھیکی سے جلالپور بھٹیاں (ضلع حافظ آباد، تحصیل پنڈی بھٹیاں) جانے والی سڑک پر واقع ایک گاؤں، مدروڑ میں ہمیں زمین الاٹ ہوئی۔ یہ گاؤں سکھیکی سے کوئی پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ میرے دادا مرحوم نے 1950ء کے قریب یہاں پر کاشت کاری شروع کی۔ ان کے ساتھ ان کے دو بھائی بھی تھے۔ مجھے بچپن میں، اس کے بعد اپنے کالج کے دور میں ایک مدت تک اس گاؤں میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ یہ دور 1970ء سے لے کر 1978ء تک کا ہے۔ میں گرمیوں کی

---

[1] ہیرودوت (Herodotus) جسے عام طور پر ہیرودوتس بھی لکھا جاتا ہے (قدیم یونانی: Ἡρόδοτος) ایک قدیم یونانی مؤرخ تھے، جنھیں ابوالتاریخ یعنی تاریخ کا باپ بھی کہا جاتا ہے۔ ان کی وفات 425 قبل مسیح میں ہوئی تھی۔

چھٹیاں اپنے داداجان کے پاس گزارتا تھا۔اس طرح اُس گاؤں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔

اس گاؤں میں مہاجروں کے دو گھر تھے، باقی سب لوگ وہیں کے مقامی لوگ تھے۔ہمیں بتایا گیا تھا کہ یہاں پر ایک ہندو کا گھر تھا،جس کے پاس ایک بڑی زمین تھی۔اس خاندان کے سربراہ کو تقسیم ہند کے موقع پر قتل کر دیا گیا تھا اور باقی لوگ جو اس کے خاندان سے تھے، بھارت چلے گئے تھے۔اس کی زمین ہمارے خاندان کو الاٹ ہوئی۔

اس گاؤں میں ہمارے ہمسائے میں ایک خاندان رہتا تھا، جسے مسلم شیخ کہا جاتا تھا۔اور اسی گاؤں میں ایک بڑا خاندان آباد تھا جنھیں مصلی کہا جاتا تھا۔ دونوں میں فرق ہے۔ ان کا ہمارے ہاں آنا جانا بھی تھا۔اس گاؤں میں خانہ بدوش جنھیں ہم پکھی باز کہتے تھے،کبھی کبھی آتے تھے۔ مجھے ان لوگوں کو دیکھنے کا بھی موقع ملا اور ان کے ساتھ وقت بھی گزارا۔ وہ ہمارے کھیتوں میں بھی کام کرتے تھے۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ وہ لوگ زبان وہی بولتے تھے،جیسی اس گاؤں کے لوگ بولتے تھے۔ ہماری پنجابی، دریائے چناب کے کنارے رہنے والوں کی پنجابی سے مختلف تھی۔ہم ریاست پٹیالہ کے لہجے میں پنجابی بولتے تھے۔لیکن یہ لوگ باقی گاؤں کے لوگوں سے بہت مختلف تھے۔ پکھی باز لوگ بہت اونچے قد کاٹھ والے تھے اور شکل وصورت بھی باقی لوگوں سے مختلف تھی، رنگت بھی کافی گہری ہوتی تھی۔ مجھے آج یہ کتاب لکھتے ہوئے محسوس ہو رہا ہے کہ وہ لوگ باقی گاؤں کے لوگوں سے بے حد مختلف تھے۔گاؤں میں اگر کوئی دوسو گھر ہوں گے تو ان میں سے چار پانچ گھروں میں وہ لوگ رہائش پذیر تھے۔ ان کی تعداد چار فیصد سے زائد نہیں تھی۔لیکن وہ لوگ اپنی شکل وصورت کے اعتبار سے دوسرے لوگوں سے بہت مختلف تھے۔

اسی طرح سے مجھے یہ بھی یاد ہے ہمارے بچپن میں ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ریلوے سٹیشن کے پاس ایک جگہ تھی (اب تو وہاں پر ایک آبادی بن گئی ہے)، اس وقت اسے ہڈا روڑی کہتے تھے (ہڈی سے ہڈا روڑی) وہاں بھی جو لوگ رہتے تھے وہ شکل وصورت میں باقی شہر کے لوگوں سے بے حد مختلف تھے۔ یہ لوگ مردار جانور اکٹھے کرتے تھے اور ان کی ہڈیوں کو فروخت کرتے

تھے۔ جب بھی شہر میں کوئی جانور بیمار ہو جاتا یا مر جاتا تو یہ لوگ اسے اٹھا کر لاتے اور مردہ جانور کا جب گوشت پرندے کھا جاتے، تو وہ اس کی ہڈیاں فروخت کرتے تھے۔ اس جگہ بڑی بدبو آتی تھی۔ یہ لوگ بھی شہر کے لوگوں سے شکل وصورت کے اعتبار سے بے حد مختلف تھے۔

اسی طرح سے میں نے دیکھا کہ ایک دفعہ سرگودھا میں کھدائی کا کام شروع ہوا، تو جو لوگ کھدائی کرنے آئے، ان کے قد کاٹھ بھی بہت بڑے تھے۔ ان کی شکل وصورت بھی مقامی لوگوں سے مختلف تھی۔ اسی طرح ہمارے ہاں اوڈ آتے تھے (جواب بھی آتے ہیں) جن کے پاس ایک بڑی تعداد میں اونٹ ہوتے تھے۔ ان کے مردوں اور عورتوں کا لباس بھی کافی مختلف ہوتا ہے۔ یہ لوگ بھی مقامی لوگوں سے کافی مختلف ہوتے ہیں۔

ہمارے شہر ٹوبہ ٹیک سنگھ میں کچھ لوگ آتے تھے، جنھیں ہم بازی گر کہتے تھے۔ وہ سڑک پر ایک رسی پکڑ کر کھڑے ہوتے تھے اور ان کے بچے اونچی چھلانگ لگاتے تھے۔ اسی طرح سے وہ بانس پر بچوں کھڑا کر کے بھی تماشے کرتے تھے، وہ بھی مقامی لوگ نہیں لگتے تھے۔ شاید اب بھی دور دراز دیہات میں ایسے لوگ پائے جاتے ہوں۔

یہ سب جان کر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ معاشرتی تقسیم یعنی مقامی لوگوں کو دبانا اور باہر سے آنے والے لوگوں کی بالادستی کا آغاز صدیوں قبل ہو گیا تھا، ابھی بھی یہ سلسلہ چل رہا ہے۔ اب بھی میں جب گاؤں جاتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ قدیم لوگ کافی ترقی کر رہے ہیں اور وہ آہستہ آہستہ معاشرے کا ایک حصہ بنتے جا رہے ہیں۔ یہ لوگ اب ہنر بھی سیکھ رہے ہیں، جس کی وجہ سے یہ لوگ ایک خوشحال زندگی گزارنے لگ گئے ہیں۔ اب وہ پہلے والی کیفیت نہیں ہے جو 1970ء میں، میں نے دیکھی تھی۔ یہ میرے ذاتی تاثرات تھے جو میں نے آپ کے سامنے رکھے۔

سید محمد لطیف کے مطابق ان قدیم باشندوں نے پنجاب میں اپنی کوئی نشانیاں نہیں چھوڑیں اور نہ ہی ان کی شہری آبادیاں ملتی ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ شمال مغرب سے آریاؤں نے جب حملہ کیا، تو یہاں پر آباد لوگوں کو جو کمزور تھے، کو جنوب مشرق کی طرف دھکیل دیا۔ ان میں سے کچھ یہیں رہ بھی گئے، جنھیں آریاؤں نے ایک طرح سے اپنا غلام بنا لیا۔ ان سے انھوں نے چھوٹے چھوٹے

کام لینے شروع کیے۔ یہ لوگ ایک طرح سے نیچ ذات کے لوگ بن کر رہ گئے۔

جو قدیم لوگ آریاؤں کی آمد کے بعد پنجاب میں رہ گئے، انھیں کئی ناموں سے جانا جاتا ہے جیسے سائیسی، چمار، چوہڑے، اوڈ، پکھی باس، مداری، میراثی، مصلی وغیرہ۔ سندھ میں انھیں کئی اور ناموں سے پکارا جانے لگا۔ یہ لوگ زیادہ تر خانہ بدوش تھے اور جنگلوں میں رہتے تھے۔ جانوروں کا شکار کر کے اپنی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اکثر تاریخ دانوں کا خیال ہے کہ یہی لوگ یہاں کے قدیم باسی تھے۔ سید محمد لطیف کے مطابق عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ ہمالیہ کے پہاڑوں کے دامن میں پنجاب سے مغربی بنگال تک پھیلے ہوئے تھے۔ ان کی آبادی پنجاب کے مغرب میں واقع پہاڑوں میں نہیں ملتی۔ اس کی وجہ یہی ہوسکتی ہے کہ پنجاب کے شمال کا بہترین موسم ان کی بود و باش کے لیے نہایت ہی موزوں تھا۔ دوسری بات یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اس علاقے میں پانی بھی کافی بڑی مقدار میں ملتا تھا اور موسم بھی خوشگوار تھا۔

ایک بڑی تعداد میں مقامی باشندے جنوبی ہند کی جانب ہجرت کر گئے۔ محققین کے مطابق ممکن ہے کہ یہی وہ اقوام ہوں جنھیں ''دراوڑ'' (Dravidian) کہا جاتا ہے۔ دراوڑ برصغیر کی قدیم ترین اقوام میں شمار ہوتے ہیں، اور ان کا ذکر تاریخ، آثارِ قدیمہ، لسانیات اور بشریات کے مختلف علمی مطالعوں میں کیا گیا ہے۔

اکثر مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ دراوڑی اقوام برصغیر کی ان اولین تہذیب یافتہ آبادیوں میں شامل تھیں، جنھوں نے سندھ، پنجاب، گجرات، دکن اور جنوبی ہندوستان کے مختلف علاقوں میں ایک متمدن طرزِ زندگی کی بنیاد رکھی۔ ماہرینِ آثارِ قدیمہ کے مطابق، دراوڑ ممکنہ طور پر وادیٔ سندھ کی تہذیب (Indus Valley Civilization) کے ابتدائی باسی تھے، جنھوں نے موئن جودڑو، ہڑپہ اور دیگر مقامات پر شہری تمدن کے آثار چھوڑے۔

لسانی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ دراوڑی زبانیں آج بھی جنوبی بھارت میں رائج ہیں، جن میں تامل، تیلگو، کنڑ اور ملیالم شامل ہیں۔ بعض ماہرین کا یہ بھی خیال ہے کہ دراوڑی اقوام ابتدا میں شمالی ہندوستان، خصوصاً پنجاب اور سندھ، میں آباد تھیں، لیکن آریاؤں کی

آمد کے بعد جنوبی ہند کی طرف منتقل ہو گئیں۔ تاہم، وہ افراد جو نقل مکانی نہ کر سکے، انھیں رفتہ رفتہ شمالی ہندوستانی سماج میں کمتر طبقات میں شمار کیا جانے لگا، اور وہ معاشرتی طور پر محروم اور پسماندہ گروہوں میں شامل ہو گئے۔

بشریاتی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ دراوڑ نسب کے افراد کی جسمانی ساخت، جلد کی رنگت اور زبان آریائی نسل سے مختلف تھی۔ یہی لسانی اور جسمانی امتیازات بعد ازاں ہندو مذہب کے ذات پات کے نظام کی بنیاد بنے۔ اگرچہ یہ نظریہ متعدد محققین کی طرف سے تسلیم شدہ ہے، تاہم اس کی تائید میں موجود شواہد مفروضاتی نوعیت کے ہیں اور ان کے ثبوت قطعی نہیں ہیں۔

کئی محققین کا یہ بھی ماننا ہے کہ ویدوں میں ''داس'' اور ''دسیو'' جیسے الفاظ جو آریاؤں کے دشمنوں کے لیے استعمال کیے گئے، غالباً انھی دراوڑی اقوام کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

آریا نہ صرف عسکری طاقت میں برتر تھے بلکہ علم وفنون میں بھی مقامی اقوام سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ چنانچہ ان کی آمد کے ساتھ ہی وہ مقامی حاکم بن گئے اور مقامی باشندوں کو ایک کمتر، غلامانہ اور محروم حیثیت میں زندگی گزارنے پر مجبور کیا۔ یہی لوگ ان کی خدمت پر مامور رہے۔

اسی عہد میں برصغیر میں یورپ کی طرح پتھر، کانسی اور بعد ازاں لوہے کے اوزار تیار کیے جانے لگے۔ بعد ازاں ہونے والی جنگوں میں پتھر کے ہتھیاروں کے استعمال کے شواہد بھی ملتے ہیں۔ ایسے متعدد ہتھیار آج کلکتہ کے عجائب گھر میں محفوظ ہیں۔

پنجاب نام کی ابتدا

اس موضوع پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ جو کچھ میں جان سکا، اس کے مطابق پنجاب انسانی آبادی کے لحاظ سے دنیا کا نہایت قدیم خطہ مانا جاتا ہے۔ آثارِ قدیمہ کے مطابق قدیم پتھر کے زمانے سے یہاں انسان آباد تھا، جو جنگلی زندگی بسر کرتا تھا اور پتھر کے اوزاروں سے شکار کھیلتا تھا۔ اس کا وہ دور، جس کے بارے میں کچھ معلومات دستیاب ہیں، آریاؤں کی آمد کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ اسی دور میں رِگ وید تصنیف کی گئی۔ اُس وقت اس علاقے کو ''سپت سندھو'' کہا

جاتا تھا۔سپت کے معنی سات اور سندھو کے معنی دریا کے ہیں۔ان سات دریاؤں میں سے پانچ: جہلم، چناب، راوی، ستلج اور بیاس ہیں، جبکہ چھٹے اور ساتویں دریا کے بارے میں اختلافِ رائے پایا جاتا ہے۔اس کے بعد اس خطے کا نام ''پنج ند'' بھی تاریخ کی کتابوں میں ملتا ہے، جس کے معنی ''پانچ ندیاں'' یا ''پانچ دریا'' ہیں۔''پنجاب'' کو ''پنج ند'' کا فارسی ترجمہ سمجھا جاسکتا ہے۔

''پنج ند'' کا ذکر مہا بھارت کے علاوہ کئی دیگر کتابوں میں بھی ملتا ہے۔ بہاولپور کے نزدیک ایک مقام کو بھی ''پنجند'' کہا جاتا ہے، جہاں پنجاب کے پانچ دریا آپس میں ملتے ہیں۔یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب کے بعض علاقوں کے لیے ''آریہ وَرت''، ''بہلیک'' یا ''وہیک'' کے نام بھی تاریخ میں استعمال ہوئے ہیں۔ممکن ہے یہ اس وجہ سے ہو کہ ''بہلیک'' یا ''وہیک'' پنجاب کا کوئی قدیم قبیلہ تھا، اور قبیلوں کے ناموں کی نسبت سے بھی بعض مخصوص علاقوں کو نام دیے گئے ہوں۔کوروؤں اور پانڈوؤں کی لڑائیوں کے ذکر کے دوران بعض لوگ اسے ''پنچال'' بھی کہتے ہیں۔

یونانی مؤرخین کی کتابوں میں اس خطے کو ''پینٹا پوتامیہ''(Pentapotamia) کے نام سے یاد کیا گیا ہے، جس کا مطلب بھی ''پانچ دریاؤں کی سرزمین'' ہے۔مشہور چینی سیاح ہیون سانگ نے ساتویں صدی عیسوی میں ہندوستان کے سفر کے دوران پنجاب کے ایک مختلف نام کا ذکر کیا ہے۔سنسکرت کی بعض کتابوں میں اسے ''پنج امبو'' کہا گیا ہے، جس کا مطلب بھی ''پانچ پانیوں کی سرزمین'' ہے۔

اکثر لوگوں کا ماننا ہے کہ پہلی مرتبہ مغل بادشاہ اکبر کے عہد میں اس سرزمین کو ''پنجاب'' کے نام سے جانا گیا۔اس کے بعد اس کے تمام سابقہ نام ماند پڑ گئے، اور اس کا نیا فارسی نام ''پنجاب'' ہی آج تک برقرار رہے۔میرا وچار یہ ہے کہ پنجاب کا نام غزنوی کے بعد کسی دور میں شروع ہوا۔سب سے پہلے کس نے اسے پنجاب کا نام دیا، اس بارے کوئی حتمی بات کہنا مشکل ہے۔

❀ ❀ ❀

پنجابی، اردو، ہندوستانی زبانیں
ایک ہی دریا میں بہتے پانی کی مختلف دھاریں

پنجاب کے بارے میں لکھتے ہوئے، اس میں سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان، جسے صوبے کے نام کی مناسبت سے ''پنجابی'' کہا جاتا ہے، پر کچھ اظہارِ خیال کرنا چاہتا ہوں۔ یاد رہے کہ میری مادری زبان پنجابی ہے، اور ہمارا تعلق سرہند ریاست پٹیالہ سے ہے، اس لیے ہمارا لہجہ بھی مشرقی پنجاب میں بولے جانے والے پٹیالہ لہجے کا ہے۔ تقسیمِ پنجاب کے بعد ہم ٹوبہ ٹیک سنگھ میں آ بسے، اور اس کے بعد ایک طویل عرصے سے لاہور میں مقیم ہیں، جس کے باعث ہم اپنے خاندانی لہجے سے آہستہ آہستہ دور ہوتے جا رہے ہیں۔

انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا پر پنجابی زبان کے بارے میں ایک طویل مضمون موجود ہے۔ ذیل میں اس مضمون کا خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے:

پنجابی، ہند-آریائی زبانوں میں سے ایک مانی جاتی ہے۔ اس کا شمار برصغیر کی سب سے زیادہ بولی جانے والی زبانوں میں ہوتا ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اکیسویں صدی کے آغاز میں بھارت میں پنجابی بولنے والوں کی تعداد تقریباً تین کروڑ تھی۔ یہ بھارتی ریاست پنجاب کی سرکاری زبان ہے اور بھارتی آئین میں تسلیم شدہ زبانوں میں شامل ہے۔ پاکستان میں تقریباً سات کروڑ افراد پنجابی بولتے ہیں، جن میں اکثریت صوبۂ پنجاب میں مقیم ہے۔ خیبر پختونخوا کے کچھ اضلاع میں بھی سرائیکی زبان بولی جاتی ہے، جسے بعض حلقے پنجابی زبان ہی کا ایک حصہ قرار دیتے ہیں، جب کہ کچھ لوگ سرائیکی کو ایک الگ زبان مانتے ہیں۔

پنجابی بولنے والوں کی ایک بڑی تعداد دنیا کے مختلف حصوں میں بھی موجود ہے، خاص طور

پر کینیڈا اور برطانیہ میں، جہاں یہ بالترتیب تیسری اور چوتھی بڑی لسانی اقلیت ہے۔ اس کے علاوہ، امریکہ کے بعض علاقوں میں بھی پنجابی بولنے والوں کی خاصی تعداد پائی جاتی ہے۔ بھارت میں پنجابی کو گورمکھی رسم الخط میں لکھا جاتا ہے، جو سکھ مذہب سے خاص تعلق رکھتا ہے۔ یہ رسم الخط ہند-آریائی رسم الخط سے مشابہ ضرور ہے، لیکن ہندی کے لیے استعمال ہونے والے دیوناگری سے خاصا مختلف ہے۔ دوسری جانب، پاکستان میں پنجابی کو اردو رسم الخط میں لکھا جاتا ہے، جو دائیں سے بائیں لکھا جاتا ہے، اور حالیہ برسوں میں اسے ''شاہ مکھی'' کا نام بھی دیا گیا ہے۔ یوں پنجابی دنیا کی ان چند زبانوں میں سے ایک ہے، جو دو بالکل مختلف اور ایک دوسرے سے غیر مانوس رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں۔

ایک محتاط اندازے کے مطابق پنجابی بولنے والوں کی تعداد دس کروڑ سے زائد ہے، لیکن اسے ایک معیاری زبان میں ڈھالنے کی کوئی سنجیدہ کوشش دیکھنے میں نہیں آتی۔ اس کی بڑی وجہ سرکاری سطح پر زبان کی عدمِ شناخت، اور مسلم، ہندو، اور سکھ برادریوں کی مختلف ثقافتی ترجیحات ہیں۔ البتہ چڑھدا پنجاب میں اسے ایک سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا ہے۔ میرے علم کے مطابق پہلی مرتبہ کسی ریاست نے پنجابی زبان کو سرکاری سرپرستی میں لیا ہے۔ مغلیہ دور میں فارسی اور پھر برطانوی دور میں اردو کو سرکاری زبان کے طور پر فروغ دیا گیا، جس کے نتیجے میں پنجابی زبان کو وہ مقام نہ مل سکا جس کی وہ مستحق تھی۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ جب پنجاب میں پہلی مرتبہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی صورت میں ایک مقامی پنجابی حکمران برسرِ اقتدار آیا، تب بھی اس کے دربار کی سرکاری زبان پنجابی نہیں بلکہ فارسی تھی۔ اگرچہ غیر رسمی گفتگو، خصوصاً نجی محافل اور ذاتی روابط میں پنجابی زبان استعمال کی جاتی تھی، تاہم ریاستی، عدالتی اور علمی معاملات میں فارسی ہی کو برتری حاصل رہی۔ یہ صورتِ حال اس امر کی غماز ہے کہ اُس عہد میں، حتیٰ کہ ایک پنجابی حکمران کی موجودگی میں بھی، پنجابی زبان کو علمی و ریاستی حیثیت کے لیے موزوں نہیں سمجھا جاتا تھا، اور اسے نسبتاً کمتر درجہ حاصل تھا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں پنجابی زبان کو رسمی و علمی مقام حاصل نہ ہو سکا۔ آج بھی

مغربی پنجاب میں ایسی ہی صورت حال کا سامنا ہے۔ میں خود مغربی پنجاب میں مقیم ہوں اور ذاتی مشاہدے کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ یہاں کے تعلیمی ادارے، عدالتیں، اسمبلی، اور دیگر سرکاری دفاتر تمام تر دفتری و تدریسی کارروائی اردو اور انگریزی زبانوں میں انجام دیتے ہیں۔حتیٰ کہ دینی مدارس میں بھی ذریعہ تعلیم اردو ہے، جب کہ پنجابی زبان کو صرف غیر رسمی یا گھریلو سطح تک محدود رکھا گیا ہے۔ نتیجتاً، پنجابی زبان میں ادبی، سائنسی، تاریخی یا سیاسی نوعیت کی کوئی معیاری علمی کتاب دستیاب نہیں، جو اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ پنجابی کو وہ علمی، ثقافتی اور ادارہ جاتی وقعت حاصل نہیں جو اردو یا انگریزی زبان کو حاصل ہے۔اس کے برعکس، مشرقی پنجاب (بھارت) میں پنجابی زبان کی صورت حال نسبتاً بہتر ہے، جس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ وہاں اسے آئینی طور پر سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے، جس نے اسے تعلیمی، دفتری اور ادبی سطح پر مستحکم بنیادیں فراہم کی ہیں۔

البتہ یہ بات درست ہے کہ تقسیم پنجاب کے بعد مشرقی پنجاب کی سرکاری زبان پنجابی ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ سکھوں کی مذہبی کتاب گرو گرنتھ صاحب پنجابی زبان میں ہے اور اسے گورمکھی رسم الخط میں لکھا گیا ہے۔ یہ بات بھی دیکھی گئی ہے کہ مسلمانوں نے اردو، ہندوؤں نے ہندی (خصوصاً شمالی ہندوستان میں)، اور سکھوں نے خاص طور پر پنجابی زبان کو اپنایا۔اس طرح یہ تینوں زبانیں مذہبی شناختوں سے جُڑ گئیں۔ گورمکھی رسم الخط کو پہلی بار 1604ء میں سکھ مقدس کتاب آدی گرنتھ کی کتابت کے لیے استعمال کیا گیا، اور بعد ازاں سکھ مصنفین نے جدید پنجابی کو بطور معیاری زبان فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔سکھ سیاسی قیادت نے 1966ء میں، اگرچہ محدود حد تک، پنجابی کو سرکاری زبان کا درجہ دلانے میں کامیابی حاصل کی۔

یہاں میں اس بات کا ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ ہم یہ جان سکیں کہ برطانوی دور سے پہلے کس زبان میں تعلیم کا سلسلہ جاری تھا۔

❋ ❋ ❋

برطانوی دور میں پنجاب اور ہریانہ میں زبانوں کی پالیسی
ایک تحقیقی جائزہ

برصغیر پر برطانوی تسلط کے بعد انگریزوں کی نوآبادیاتی حکمتِ عملی میں زبانوں کی پالیسی کو مرکزی حیثیت حاصل رہی۔ یہاں ہندوستان بھر کی پالیسی کے بجائے صرف پنجاب اور موجودہ ہریانہ کے تناظر میں برطانوی زبان پالیسی کا جائزہ پیش کیا جائے گا، کیونکہ اس پالیسی نے نہ صرف انتظامی ڈھانچے کو متاثر کیا بلکہ ان علاقوں کی ثقافتی اور لسانی شناخت پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے۔ اسے ہم بجا طور پر ایک نئے لسانی و انتظامی دور کا آغاز کہہ سکتے ہیں۔

1849ء تک پنجاب میں فارسی زبان کو سرکاری و عدالتی حیثیت حاصل تھی، جو مغلیہ سلطنت اور سکھ حکمرانی کے اثرات کا نتیجہ تھی۔ تاہم، پنجاب پر قبضے کے بعد انگریزوں نے 1854ء میں فارسی کی جگہ اردو کو سرکاری و عدالتی زبان قرار دیا۔ اردو، جو نستعلیق رسم الخط میں لکھی جاتی ہے، اس وقت مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں میں یکساں طور پر سمجھی جاتی تھی، چنانچہ اس تبدیلی کو نسبتاً آسانی سے قبول کیا گیا۔ جنوبی پنجاب جو پنجاب کا ایک قدیم ثقافتی و تاریخی مرکز تھا، وہاں بھی برطانوی حکمتِ عملی کے تحت اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا۔ چونکہ جنوبی پنجاب کے عوام پہلے ہی اردو اور سرائیکی سے مانوس تھے، اس لیے یہ فیصلہ مقامی سطح پر مزاحمت کے بغیر نافذ ہو گیا۔

اردو کو پنجاب میں سرکاری زبان کے طور پر رائج کرنے کے پس منظر میں متعدد عوامل کارفرما تھے۔ ایک اہم سبب یہ تھا کہ اس سے قبل برطانوی حکومت نے یوپی، سی پی، اور دہلی جیسے شمالی ہند کے علاقوں میں اردو کو عدالتی و تعلیمی زبان کے طور پر اختیار کر رکھا تھا۔ چنانچہ نوآبادیاتی حکام اردو

سے نہ صرف مانوس تھے بلکہ اسے ایک کارآمد انتظامی ذریعہ بھی تصور کرتے تھے۔ پنجاب کی فتح کے بعد جب انگریزوں نے یہاں کے انتظامی ڈھانچے کو منظم کیا تو بڑی تعداد میں ایسے افراد کو سرکاری ملازمتوں اور تعلیمی اداروں میں تعینات کیا گیا جن کا تعلق دہلی، لکھنؤ اور دیگر اردو بولنے والے علاقوں سے تھا۔ ان افراد کی مادری زبان اردو تھی، اور انھوں نے پنجاب میں ایک نئی شہری و لسانی اشرافیہ کی بنیاد رکھی۔

اس اشرافیہ کے مقابلے میں پنجاب کی مقامی پنجابی بولنے والی اکثریت، جو عموماً ناخواندہ تھی، لسانی ناآشنائی کی وجہ سے سرکاری نظام میں پیچھے رہ گئی۔ چنانچہ پنجابی زبان بتدریج سرکاری، عدالتی اور تعلیمی میدانوں سے باہر نکلتی چلی گئی، جبکہ اردو کو برتری حاصل رہی۔ یہی وجہ ہے کہ پنجابی بولنے والی آبادی، معاشی اور تعلیمی ترقی کی غرض سے، اردو سیکھنے اور اپنانے کی طرف مائل ہوئی۔ حتیٰ کہ موجودہ دور میں بھی، سرکاری اور تدریسی سطح پر اردو کو پنجابی پر فوقیت حاصل ہے، جو استعماری دور کی لسانی پالیسیوں کا تسلسل معلوم ہوتا ہے۔

اردو ایک مخلوط زبان تھی جو ہندی، پنجابی، فارسی اور عربی کے الفاظ پر مشتمل تھی، اور اس دور میں علمی و ادبی ترقی کا بھی مرکز بنی۔ مغلیہ سلطنت کے آخری دور میں اردو کو شاعری اور نثر کے ذریعے فروغ حاصل ہوا۔

برطانوی دور میں شمالی ہندوستان میں متعدد زبانیں مروج تھیں۔ ان میں سے کچھ کے نام اس طرح سے ہیں۔

عربی: مذہبی و دینی علوم کے لیے مخصوص؛
فارسی: انتظامی، علمی و ادبی زبان؛
اردو: نئی ابھرتی ہوئی تعلیمی و رابطے کی زبان؛
ہندی: سنسکرت سے ماخوذ، ہندو مذہبی رسومات کی زبان؛
ہندوستانی: عوامی بول چال کی مخلوط زبان؛
پنجابی: علاقائی زبان، مختلف لہجوں کے ساتھ۔

موجودہ ہریانہ اس وقت متحدہ پنجاب کا حصہ تھا۔ انگریزوں نے وہاں بھی اردو کو سرکاری اور عدالتی زبان مقرر کیا، اگرچہ عوامی سطح پر ہریانوی اور ہندی نما بولیاں بولی جاتی تھیں۔ تاہم، اسکولوں اور کالجوں میں اردو کو تدریسی زبان کے طور پر متعارف کروایا گیا، اور پنجاب اردو نصاب کی تیاری میں مرکزی کردار ادا کرتا رہا۔ تقسیم ہند کے بعد ہریانہ نے ایک الگ ریاست کی حیثیت اختیار کی، اور ریاستی حکومت نے اردو کی جگہ ہندی (دیوناگری رسم الخط میں) کو اپنی سرکاری زبان قرار دے دیا۔ یوں ہندی تعلیمی اور دفتری نظام پر غالب آ گئی۔

تاریخی مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو نے متحدہ پنجاب میں ایک مشترکہ لسانی شناخت فراہم کی۔ تاہم، تقسیم کے بعد زبان، ثقافت اور رسم الخط کی بنیاد پر خطے میں لسانی تفریق پیدا ہو گئی۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخی پنجاب کے تین حصوں میں تین مختلف زبانیں رائج ہیں:

ہریانہ میں ہندی،
چڑھدا (مشرقی) پنجاب میں پنجابی (گورمکھی رسم الخط میں)
لہندا (مغربی) پنجاب میں اردو۔

اس تبدیلی کے نتیجے میں نہ صرف پنجاب کی لسانی وحدت متاثر ہوئی بلکہ اس کی ثقافتی ہم آہنگی بھی متاثر ہوئی۔ ہریانہ میں اردو کا تعلیمی اور دفتری استعمال تقریباً ختم ہو چکا ہے، جب کہ پاکستان میں اردو بدستور سرکاری زبان ہے اور بھارت کے مشرقی پنجاب میں پنجابی زبان رائج ہے۔

پنجابی کی معیاری شکل کا تعین

لسانی، ادبی اور سماجی تناظر میں ایک مطالعہ

کون سی پنجابی زبان معیاری سمجھی جائے؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔ عمومی طور پر کہا جاتا ہے کہ بھارتی پنجابی، جو گورمکھی میں لکھی جاتی ہے، آج کل معیاری پنجابی کے طور پر تسلیم کی جاتی ہے۔ اگرچہ پنجابی، اردو اور ہندی کے درمیان خاصی مماثلت ہے، ایک زبان بولنے والا شخص دوسری زبان کو سمجھ تو سکتا ہے، مگر لازمی نہیں کہ روانی سے بول بھی سکے۔

میرے مشاہدے میں آیا ہے کہ اگر قدیم ہندی، دیہاتی پنجابی اور خالص اردو میں بات کی جائے تو سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر میں عام عوام میں رائج ہندی، اردو، اور پنجابی میں گفتگو کروں تو کوئی خاص مسئلہ پیش نہیں آتا۔ البتہ اہلِ علم یا قدیم کتابوں میں استعمال ہونے والی زبان آج کے دور سے خاصی مختلف ہے۔ میں ہندی فلمیں بخوبی سمجھ لیتا ہوں، لیکن ٹی وی پر پڑھی جانے والی ہندی تقریباً پچاس فیصد ہی سمجھ میں آتی ہے۔

مشرقی پنجاب کے برعکس پاکستان میں اردو کی تاریخی ترجیح نے پنجابی کو سرکاری سطح پر وہ مقام حاصل کرنے سے روکے رکھا جس کی وہ مستحق ہے۔ مغربی پنجاب میں پنجابی زبان پر اردو کے گہرے اثرات بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس تناظر میں یہ سمجھنا ضروری ہے کہ پاکستان کا پنجاب بھارتی پنجاب کے مقابلے میں رقبے اور لسانی تنوع میں وسیع اور مختلف ہے۔ یہی تنوع بعض اوقات پنجابی زبان کے حامیوں کو جنوبی اضلاع میں سرائیکی حامیوں کی مخالفت کا سامنا کراتا ہے، جو اپنی زبان کو پنجابی سے جدا حیثیت دینا چاہتے ہیں۔

سکندر سنگھ کا ایک مضمون The Origin Theories of Punjabi Language: Context of Historiography of Punjabi Language پڑھنے کو ملا۔[1]

سکندر سنگھ کے مطابق پنجابی زبان کی ابتدا سے متعلق مختلف، متضاد اور متنازعہ نظریات موجود ہیں۔ آریائی اور قبل از آریائی نظریات کے درمیان واضح تضاد پایا جاتا ہے، جس کی بنیاد اکثر لسانی کے بجائے سیاسی یا فرقہ وارانہ ہوتی ہے۔ پنجابی زبان کی تاریخ پر لکھی گئی بعض تحریروں کی وجہ سے پنجاب کے علاوہ دیگر علاقوں میں بھی لسانی تنازعات جنم لیتے رہے ہیں۔

سکندر کے مطابق پنجابی زبان کی ابتدا سے متعلق چار مکاتبِ فکر پائے جاتے ہیں:

1- آریائی نظریہ
2- اسلامی حملوں کے بعد لسانی اختلاط سے وجود میں آنے والا نظریہ
3- قبل از آریائی نظریہ
4- فطری و مقامی نظریہ، جو انسان اور ثقافت کے ساتھ از خود سرزمینِ پنجاب میں وجود میں آیا

آریائی نظریے کے تحت بعض لوگ یہ مانتے ہیں کہ پنجابی، ویدی سنسکرت سے پراکرت اور اپ بھرنشا کے ذریعے ارتقا پائی۔ کچھ کا دعویٰ ہے کہ ویدی سنسکرت خود پنجاب کی کسی پراکرت سے نکلی، جبکہ بعض ویدی سنسکرت کو پنجابی کی قدیم ترین شکل مانتے ہیں۔ تاہم، پنجابی زبان کے سیاق وسباق میں یہ نظریہ لسانی وثقافتی دلائل کی بنیاد پر کمزور نظر آتا ہے۔

کچھ محققین کا یہ بھی خیال ہے کہ پنجابی اسلامی حملوں کے بعد لسانی اختلاط سے پیدا ہوئی، خصوصاً مغربی پنجاب میں۔ تاہم اس حوالے سے کوئی مضبوط دلیل موجود نہیں۔ جدید تحقیق کے مطابق پنجابی کوئی مرکب زبان نہیں بلکہ ایک مستقل ومکمل زبان ہے، جس نے دیگر زبانوں کے عناصر کو جذب کیا ہے۔

---

[1] https://www.researchgate.net/publication/353680383_The_Origin_Theories_of_Punjab_Language_Skindar_Singh

قبل از آریائی نظریے کے ماننے والے آریائی نظریے کو مغربی ماہرین کی سیاسی سازش قرار دیتے ہیں۔ان کے مطابق پنجابی کی بنیادی ساخت آریائی زبانوں سے بھی زیادہ قدیم ہے، اور اس کا تعلق ہڑپہ تہذیب سے جوڑا جاتا ہے۔لیکن چونکہ ہڑپہ رسم الخط ابھی تک مکمل طور پر سمجھا نہیں جاسکا، اس لیے یہ نظریہ بھی یقینی طور پر قبول نہیں کیا جاسکتا۔

چوتھا نظریہ کہتا ہے کہ پنجابی زبان فطری ومقامی انداز میں ابھری۔یہ نظریہ نسبتاً غیر سیاسی اور پنجابی دوست ہے، اور پنجابی کی قدامت کو کسی خارجی ماخذ سے جوڑنے کے رجحان کو چیلنج کرتا ہے۔

میرے خیال میں جن لوگوں نے پنجابی کو اخذ شدہ زبان قرار دیا ہے، انھوں نے اس کی مقامی حیثیت کو نظر انداز کیا ہے۔اکثر تحقیق سنسکرت کے حامی یا مخالفین کے تناظر میں لکھی گئی ہے۔بعض لوگ شعوری یا غیر شعوری طور پر پنجابی زبان کی اہمیت کم کر کے اردو کو غالب زبان تسلیم کروانے کی کوشش کرتے ہیں۔

تقسیم سے قبل پنجابی زبان ہندو-مسلم لسانی منصوبہ بندی سے متاثر ہوئی، اور بعد از تقسیم دونوں ممالک کی قومی زبانوں کی پالیسیوں نے پنجابی کی ترقی میں رکاوٹ ڈالی۔اس کے نتیجے میں پنجابی زبان بھارت میں ہندی اور پاکستان میں اردو کے زیرِ اثر رہی۔بعض محققین نے یہاں تک کہا کہ پنجابی اور اردو میں ماں بیٹی کا رشتہ ہے، جو درحقیقت سنسکرت کی بالا دستی کو جواز دینے کی کوشش تھی۔یہی رویہ پنجاب کے معاشروں میں لسانی کشیدگی کا باعث بن رہا ہے۔اسلامی اور پاکستانی محققین نے بھی بعض اوقات پنجابی کو اردو کی تابع زبان کے طور پر پیش کیا، اور یہی وجہ ہے کہ آج تک پنجابی زبان اور شمالی ہند کی دیگر زبانوں کی ابتدا کے بارے میں کوئی حتمی نظریہ قائم نہیں ہوسکا۔

مشتاق صوفی نے ممتاز مؤرخ ڈاکٹر اشتیاق احمد کے پنجابی بارے بیانات کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔[1] ڈاکٹر اشتیاق احمد جیسے سنجیدہ مؤرخ اور محقق کی جانب سے یہ بیان کہ ''پنجابی زبان کبھی ریاستی زبان نہیں رہی اور ہندو شاہی خاندان کے راجا جے پال کے دور میں سنسکرت اور پراکرت زبانیں سرکاری و مذہبی امور کے لیے استعمال ہوتی تھیں'' ایک ایسا دعویٰ ہے جو

---

[1] https://www.dawn.com.news/1740588

مزید تحقیق و تجزیے کا متقاضی ہے۔

اس دعوے کے پس منظر میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ ''پراکرت'' زبان اس دور میں کس شکل میں رائج تھی؟ تاریخی لسانیات کے مطابق، پراکرت دراصل عوام الناس کی زبان تھی، جو سنسکرت کے برعکس عوامی بولی کے طور پر ترقی کرتی رہی۔ برصغیر کے ہر علاقے میں پراکرت کی مختلف علاقائی شکلیں رائج تھیں۔ پنجاب میں یہ ''اپ بھرنش'' (Apabhramsha) کہلاتی تھی، جو ''پشاچی'' (Paisachi) زبان سے ارتقا پذیر ہوئی۔ جدید پنجابی انھی زبانوں کی ارتقائی صورت ہے۔ چنانچہ اگر اس دور میں اپ بھرنش یا پشاچی سرکاری یا مذہبی امور میں استعمال ہو رہی تھیں، تو اس کا مطلب یہی ہے کہ پنجابی کی ابتدائی صورت کو بالواسطہ طور پر ریاستی سطح پر تسلیم کیا جا چکا تھا۔ لٰہذا یہ کہنا کہ پنجابی کبھی ریاستی زبان نہیں رہی، ایک تاریخی ولسانی تضاد پر مبنی موقف ہے۔

اسی طرح ڈاکٹر اشتیاق کا یہ بیان کہ ''گرو انگد نے گورمکھی رسم الخط ایجاد کیا، اور پنجابی زبان مذہبی شناخت بن گئی'' بھی تاریخی حقائق سے مطابقت نہیں رکھتا۔ معروف محقق جی ایس سدھو کے مطابق گورمکھی رسم الخط دراصل ''لندا'' رسم الخط سے اخذ شدہ ہے، جو پنجابی کے تاجر اور ساہوکار اکاؤنٹس کے لیے استعمال کرتے تھے۔ سردار جی بی سنگھ کی تحقیق کے مطابق گورمکھی کے تمام حروفِ تہجی گرو نانک (1469ء) کے زمانے سے قبل ہی مکمل ہو چکے تھے۔ اس بنا پر یہ کہنا کہ گرو انگد نے گورمکھی ''ایجاد'' کیا، ایک مبالغہ آمیز دعویٰ ہے۔ علاوہ ازیں، فارسی رسم الخط کو دراصل عربی رسم الخط سے ماخوذ تصور کیا جاتا ہے، جو ایرانی تمدن میں ضم ہو چکا تھا۔

میں یہاں یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ سکھوں نے اسے ایک باقاعدہ ترتیب دی جس کے نتیجے میں یہ ایک مکمل زبان کا درجہ حاصل کر پائی۔

ڈاکٹر اشتیاق کے اس بیان پر بھی تنقید کی گئی ہے کہ ''برطانوی دور میں پنجابی کو دبانے کی کوئی سازش نہیں تھی''۔ اس مؤقف سے اختلاف کرتے ہوئے، معروف محقق ڈاکٹر طارق رحمان کی کتب Selected Documents : *Language and Education* 1780-2003 اور *Language and Politics in Pakistan* کا حوالہ دیا جاتا ہے، جن میں

نوآبادیاتی حکام کی جانب سے پنجابی زبان کے خلاف برتی جانے والی پالیسیوں کے واضح شواہد موجود ہیں۔

مثال کے طور پر، ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن پنجاب ایک خط میں لکھتا ہے:

''پنجابی محض اردو کی ایک بولی ہے، اور مختلف علاقوں میں اس کے لہجے مختلف ہیں۔ یہ صرف گورمکھی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے، جو ناگری کا بگڑا ہوا روپ ہے۔ اس کا اپنا کوئی ادب موجود نہیں۔''

یہ بیان محض غلط فہمی نہیں بلکہ دانستہ علمی تحقیر کا اظہار ہے، کیونکہ تاریخی شواہد کے مطابق پنجابی میں دسویں صدی عیسوی سے باقاعدہ ادبی روایت موجود ہے، جب کہ اردو جیسی زبانیں اس وقت وجود میں بھی نہیں آئی تھیں۔ پنجابی زبان نے دیوناگری، لنڈا، مہاجنی، عربی اور گورمکھی سمیت کئی رسم الخط استعمال کیے، اور اس کا تحریری ذخیرہ انگریزی ادب سے بھی پہلے وجود میں آ چکا تھا۔

یہ بیان علمی لحاظ سے یکسر ناقابلِ قبول ہے، کیونکہ یہ اس حقیقت کو نظرانداز کرتا ہے کہ پنجابی ایک مکمل زبان ہے، اور اس کی جڑیں ان زبانوں میں پیوستہ ہیں جو ہندی سے بہت پہلے وجود میں آ چکی تھیں۔

شاہپور کے ڈپٹی کمشنر جے ولسن کی ایک تحریر اس نوآبادیاتی تضاد کو بخوبی بے نقاب کرتی ہے:

''تعلیم زیادہ تر ایک ایسی زبان میں دی جاتی ہے جو عوام کے لیے اجنبی ہے۔ ایک عام پنجابی دیہاتی لڑکے کے لیے اردو اسی طرح اجنبی ہے جیسے ایک انگریز دیہاتی کے لیے فرانسیسی۔ بچے کو وہ زبان سکھائی جاتی ہے جو وہ بولتا نہیں بلکہ وہ زبان جس کے کئی الفاظ کا مطلب اسے تب سمجھ آتا ہے جب وہ پنجابی میں ترجمہ کیا جاتا ہے۔''

مزید برآں، دہلی کے کمشنر نے حکومت پنجاب کو لکھا:

''گورمکھی رسم الخط کی، جو پنجابی کی تحریری شکل ہے، بحالی کوئی دانشمندانہ سیاسی فیصلہ نہ ہوگا۔''

ان تمام شواہد کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ برطانوی راج نے پنجابی زبان کے

خلاف ایک منظم، دانستہ اور نظریاتی سازش کے تحت اسے تعلیمی، انتظامی اور علمی سطح پر دبا کر رکھا۔ اس رویے میں علمی تکبر کے ساتھ ساتھ مقامی ثقافتی شناخت سے خوف بھی کارفرما تھا۔

پنجابی زبان کی سرکاری، مذہبی اور ادبی حیثیت کو نظر انداز کرنا یا اس کے تاریخی پس منظر کو محض ایک ''بولی'' تک محدود کرنا، ایک ناقص اور غیر تحقیقی دعویٰ ہے۔ نوآبادیاتی دور میں پنجابی زبان کی مخالفت ایک واضح سیاسی حکمت عملی تھی جس کے تحت مقامی زبان، ثقافت اور شعور کو مسخ کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس پس منظر میں، محققین خصوصاً ڈاکٹر اشتیاق احمد جیسے دانشوروں سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ پنجابی زبان کی تاریخی جہتوں پر مزید گہرائی سے غور کریں، تاکہ اس کی اصل قدر و قیمت کو علمی سطح پر اجاگر کیا جا سکے۔

میرے ذاتی تجربات بھی اس روایت کی تائید کرتے ہیں۔ سرگودھا میں میرے ننھیال میں شادی بیاہ کی تقریبات کے دوران کچھ لوگ پرانے قصے اور لوک کہانیاں نغماتی انداز میں پیش کرتے تھے۔ یہ زبانی روایت پنجابی ادب کی اس قدیم روایت کی گواہ ہے جو کتابی شکل سے پہلے موجود تھی اور نسل در نسل منتقل ہوتی رہی۔

ایک گروہ کا یہ بھی کہنا ہے کہ پنجابی زبان ایک نہایت قدیم زبان ہے اور اس کی جڑیں سنسکرت زبان سے ملتی ہیں۔ سولہویں صدی کے بعد خاص طور پر مغلیہ دورِ حکومت میں جب فارسی اور عربی کا چلن عام ہوا تو اس کے گہرے اثرات کی بدولت پنجابی زبان میں ان زبانوں کے کثیر تعداد میں الفاظ شامل ہوئے، جس سے اس کی لغوی وسعت میں اضافہ ہوا۔ میں نے بھی اس بات کا مشاہدہ کیا ہے کہ اگر کوئی ڈھیٹھ پنجابی زبان بولے، وہ مشرقی پنجاب کے سکھ ہوں یا ہمارے وسطی پنجاب کے دیہاتی ہوں، اسے سمجھنا مشکل ہوتا ہے۔ مگر وہ پنجابی زبان جو ہم شہروں میں بولتے اور اردو بھی جانتے ہیں، سے بہت حد تک مختلف ہوتی ہے۔ اسی طرح جب پنجابی کو سکھ مذہب کی عبادتی زبان کا درجہ حاصل ہوا تو اس میں کئی اور الفاظ بھی شامل ہو گئے جو سنسکرت سے لیے گئے محسوس ہوتے ہیں۔ جبکہ جو پنجابی زبان مسلمان صوفیاء نے استعمال کی اس میں عربی اور فارسی کی آمیزش نظر آتی ہے۔ اس کی مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ میں بابا گرو نانک کی شاعری

(بانیوں) کو مکمل سمجھ نہیں سکتا جبکہ میں بابا فرید کی شاعری کو مکمل سمجھ لیتا ہوں اس لیے کہ میرا تعلق دیہات سے ہے۔ جبکہ وہ فرد جو پنجاب کے کسی بھی بڑے شہر میں رہا ہو، اس کے لیے بابا فرید کو سمجھنا مشکل ہوتا ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ زبان وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے۔

شاہ مکھی (جو فارسی-عربی رسم الخط پر مبنی ہے) کو پنجابی مسلمان استعمال کرتے ہیں، چونکہ عربی اسلام کی مذہبی زبان سمجھی جاتی ہے۔ گرمکھی ایک منفرد رسم الخط ہے جو زیادہ تر سکھ اور ہندو برادریوں میں رائج ہے۔ یہ دونوں رسم الخط اپنے اپنے ممالک، پاکستان اور بھارت، میں سرکاری سطح پر تسلیم شدہ ہیں۔ ابھی تک اس بات پر اتفاق مشکل ہے کہ پنجابی کے کل کتنے لہجے یا بولیاں ہیں، کیونکہ یہ صرف بولنے والوں کی تعداد پر نہیں بلکہ ان کی نسلی وثقافتی لسانی شناخت پر بھی منحصر ہے۔ میں لاہور میں ایک عرصے سے رہائش پذیر ہوں۔ لاہور کے اردگرد دیہات کی پنجابی زبان اندرون شہر کی پنجابی زبان سے مختلف ہے۔ ایک فرد دونوں زبانیں سمجھ تو سکتا ہے، مگر ایک ہی وقت میں بول نہیں سکتا۔

یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ پنجابی زبان کو شہری علاقوں میں سماجی پستی اور غیر تعلیم یافتہ ہونے کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ اکثر اسے ''بازاری'' یا ''بدلحاظ'' زبان کہا جاتا ہے، محض اس کے صوتی انداز کی بنیاد پر۔ یہ منفی تاثر اس حقیقت سے بھی جڑا ہوا ہے کہ پاکستانی تعلیمی نظام میں پنجابی زبان کو کوئی اہم مقام حاصل نہیں۔ اردو اور انگریزی کو قومی وحدت کے نام پر ادارہ جاتی تعلیم میں ترجیح دی گئی ہے، جب کہ پنجابی جیسی مقامی زبانوں کو پسِ پشت ڈال دیا گیا ہے۔ یہ تمام عوامل مل کر پنجابی زبان کو نہ صرف سماجی و تعلیمی میدانوں میں کمزور کر رہے ہیں، بلکہ اس کی بین النسلی منتقلی کو بھی شدید نقصان پہنچا رہے ہیں۔

انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا کے مطابق پنجابی ادب یعنی پنجابی زبان میں تخلیق کیا گیا نثری وشعری سرمایہ برصغیر کی دیگر علاقائی زبانوں کے مقابلے میں نسبتاً بعد میں تحریری شکل میں سامنے نظر آتا ہے۔ اس کی قدیم ترین کتابوں میں پہلے سکھ گرو، بابا نانک (1469–1539) کی تعلیمات، دراصل خالص پنجابی کے بجائے قدیم ہندی (Old Hindi) میں شمار ہوتے

ہیں۔ میں نے بھی اس کا مطالعہ کیا ہے۔ اس میں استعمال کیے گئے الفاظ پنجابی زبان سے کافی مختلف ہیں۔ جس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ بابا صاحب نے اس وقت کی رائج زبان میں ہی اپنی تعلیمات بیان کی ہیں۔ جس سے میں یہ نتیجہ اخذ کرتا ہوں کہ اس وقت عام لوگ بھی وہی زبان استعمال کرتے تھے جو بابا صاحب نے کی اور جو موجودہ پنجابی زبان سے مختلف ہے اور قدیم ہندی زبان کے قریب ہے۔ میں نے کئی سکھ سکالرز کی تقاریر سنی ہیں، وہ بھی کئی مشکل الفاظ استعمال کرتے ہیں جو ہندی میں مستعمل ہیں۔

یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ پنجابی زبان میں شناخت ہونے والا پہلا اہم تحریری کام ''جنم ساکھی'' ہے، جو 16 ویں صدی میں بھائی بالا نے گرونانک کی سوانح حیات کے طور پر قلمبند کیا۔ اس کے بعد 1604ء میں پانچویں سکھ گرو گروارجن دیو نے گرونانک، گروانگد، گروامرداس، گرو رام داس اور دیگر صوفیانہ شعرا کی نظموں کو یکجا کر کے پنجاب کی سب سے مشہور مذہبی کتاب ''آدی گرنتھ'' (پہلی کتاب) ترتیب دی۔

اسی طرح 1616ء سے 1666ء کے درمیان ایک مصنف عبداللہ نے ایک ضخیم تصنیف ''بارہ انوا'' (یعنی ''بارہ ابواب'') کے عنوان سے لکھی، جو اسلامی عقائد پر مبنی 9,000 اشعار پر مشتمل ہے۔ پنجابی ادب میں قرونِ وسطیٰ کے دوران سب سے زیادہ اثر صوفی اسلام نے ڈالا۔ پنجابی زبان کسی بھی دور میں دربار کی زبان نہیں رہی اسی لیے اس میں خوشامدانہ پن دیکھنے کو نہیں ملتی۔ دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں سکھ حضرات نے پنجابی زبان کو کتابی شکل میں ڈھالا، وہیں مسلمان صوفی شاعروں نے بھی اسے اپنایا اور اپنی بات اسی زبان میں کہی جو آج اس دور میں بولی جانے والی پنجابی زبان سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔

ایک اور فرق دونوں میں نظر آتا ہے وہ ہے طرزِ تحریر۔ یاد رہے کہ گرمکھی طرزِ تحریر بابا گرو نانک کے بعد سولہویں صدی کے اوائل میں ہوئی، اور اسے سکھ مذہب کے بانی بابا گرونانک (1469-1539) کے بعد پانچویں سکھ گرو گروارجن دیو (1563-1606) کے دور میں باقاعدہ طور پر رائج کیا گیا۔ یہ رسم الخط سکھوں کی مقدس کتاب ''آدی گرنتھ'' (بعد میں ''گرو گرنتھ

صاحب)'' کی تحریر کے لیے استعمال ہوا اور اسی بنیاد پر اس کی ترویج ہوئی۔ لفظ ''گرمکھی'' کا مطلب: ''گرمکھی'' کا مطلب ہے ''گرو کے منہ سے'' یعنی وہ زبان یا تحریر جو گرو کی تعلیمات سے ماخوذ ہو۔ جبکہ دوسری طرف ہمیں کئی مسلمان صوفیاء کا کلام ملتا ہے جو پنجابی زبان میں ہے۔ جیسے شیخ فرید شکر گنج (1175-1266)، شاہ حسین (1538-1600)، سلطان باہو (1629-1690)، شاہ شرف (1659-1725) علی حیدر (1690-1785)۔ اسی طرح کچھ لوگوں نے کلاسیکی لوک داستانیں (قصے) بھی پنجابی زبان میں لکھیں جن میں عشقیہ و رزمیہ داستانوں کا بھی اہم کردار رہا ہے، جن میں لوک ہیروز اور عاشق و معشوق کی کہانیاں بیان کی جاتی ہیں۔ مشہور قصوں میں شامل ہیں ہیر رانجھا از وارث شاہ (1725-1795)، سسی پنوں اور سوہنی مہینوال از ہاشم (1752-1832)۔ یہ داستانیں زیادہ تر زبانی روایت کے ذریعے منتقل ہوئیں، جس کی وجہ سے ان کی تاریخ کا تعین مشکل ہے۔

انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا میں بیان کیا گیا ہے کہ جدید پنجابی ادب کا آغاز تقریباً 1860ء کے بعد ہوا۔ اس دور میں شاعری کے متعدد رجحانات نمایاں ہوئے، جیسے: روایتی داستانی شاعری، صوفیانہ کلام، رومانوی شاعری، قوم پرستانہ اور طنزیہ شاعری، تجرباتی شاعری وغیرہ۔ اس دور کے مشہور شعراء میں بھائی ویر سنگھ (انیسویں صدی)، پُران سنگھ، دھنی رام چترک، امرتا پریتم، بابا بلونت، موہن سنگھ، شیو کمار بٹالوی کے علاوہ بھی کئی۔

یہاں اس بات کا تذکرہ ضروری ہے کہ اردو کے وہ عظیم شعراء جن کی مادری زبان پنجابی تھی، نے بھی کم ہی پنجابی میں لکھا ہے۔ انھوں نے بھی اردو کو ہی ترجیح دی ہے۔ جس سے مجھے تو یہ لگتا ہے کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ پنجابی زبان ایک عامی زبان ہے۔ پنجاب میں قائم کسی بھی مدرسے میں پنجابی زبان میں تعلیم نہیں دی جاتی۔ میں نے کوئی بھی اسلام بارے علمی کتاب نہیں دیکھی جو پنجابی زبان میں لکھی ہوئی ہو۔

اگر میں پنجابی زبان کی تاریخ کو دو حصوں میں تقسیم کروں تو مناسب رہے گا۔ ایک دور سکھ دھرم سے پہلے کا ہے جب پنجابی زبان عام لوگوں کی زبان تھی۔ اس دور میں بھی ہندوؤں کی علمی

کتابیں سنسکرت میں ملتی ہیں۔ جبکہ اسلام بارے کتابیں فارسی اور عربی میں بعد میں اردو میں لکھی ہوئی ملتی ہیں۔ دوسرے دور میں سکھوں نے اپنی الگ شناخت کی خاطر اپنا ایک طرزِ تحریر ایجاد کیا اور اپنی مذہبی کتابیں اس میں لکھیں۔ اس کے بعد جب یہ زبان پنجاب کی سرکاری زبان بن گئی تو اس زبان میں سائنسی کتب بھی لکھنے کا رواج ہوا۔

یہ سب جان کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کی ایک قدیم خطے کی عام لوگوں کی زبان پنجابی ہے مگر اسے پہلے سکھ گروؤں اور مسلمان صوفیاء نے کتابی شکل دی۔

مشرقی پنجاب میں اسے پہلی بار ایک سرکاری زبان کا درجہ ملا۔ جس کے بعد پنجابی زبان میں تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ مغربی پنجاب میں سے کبھی بھی سرکاری سرپرستی نہیں ملی۔ اس میں تخلیق کیا جانے والا ادب زیادہ تر مذہبی راہنماؤں نے کیا جو پہلے زبانی تھا پھر اسے کتابی شکل دی گئی۔ بعد میں اس زبان میں لوک داستانیں لکھی جانے لگیں۔ اب موجودہ دور میں اس زبان میں فلمیں، ڈرامے لکھے جانے لگے۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ مشرقی پنجاب میں بہت حد تک پنجابی زبان میں اخبار، ٹی وی اور ریڈیو چینل کام کر رہے ہیں۔ مغربی پنجاب میں پنجابی زبان میں ادبی اور علمی کام نہ ہونے کے برابر ہے۔

یہ بات بھی درست ہے کہ آج کے دور میں پنجابی موسیقی اور ثقافت آج دنیا بھر میں بے حد مقبول ہے۔ بھنگڑا موسیقی اور رقص امریکہ اور دیگر کئی مما لک میں ایک جاندار ثقافتی مظہر کے طور پر ابھر چکے ہیں۔ پنجابی ایک سمے سے بھارتی فلم انڈسٹری کا ایک اہم حصہ رہی ہے۔ پنجابی پوپ اور لوک گیت بھارت اور پاکستان دونوں میں بے حد مقبول ہیں۔ پنجابی ادب بھی دن بدن مقبول ہو رہا ہے، اور جنوبی ایشیا کے علاوہ مغربی مما لک میں بھی بہت سے طلبہ اسے سیکھنے میں دلچسپی لے رہے ہیں، مگر اس کے مقابلے میں دوسری زبانیں خاص طور پر ہندی اور اردو نے بے حد ترقی کی ہے۔ پنجاب میں ان لوگوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے جن کی مادری زبان اردو ہے۔ ان میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو تقسیم پنجاب کے بعد دہلی کے قرب و جوار سے ہجرت کر کے مغربی پنجاب میں آ کر آباد ہوئے۔

اب تک جو کچھ میں نے بیان کیا ہے اسے سامنے رکھ کر میں درجِ ذیل نتیجے پر پہنچا ہوں۔

پنجابی زبان کی تاریخ ایک لسانی ارتقا اور ثقافتی اثرات کی داستان ہے، جو قدیم پراکرت زبانوں سے شروع ہو کر ساتویں سے دسویں صدی عیسوی کے دوران''اپ بھرنش'' (Apabhramsha) مرحلے سے گزرتے ہوئے اپنے موجودہ مقام تک پہنچی ہے۔ قدیم روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ابتدائی تحریری بنیادیں ناتھ یوگی دور میں رکھی گئیں، جنھوں نے زبان کے ادبی ڈھانچے کو مستحکم کیا۔ البتہ مغلیہ دور میں فارسی اور عربی زبانوں سے روابط نے پنجابی کو متعدد الفاظ عطا کیے، جس سے اس کی لغت مزید وسیع اور گہری ہوگئی۔ سکھ مذہب کی عبادات کی زبان ہونے کی حیثیت سے پنجابی کو خطے میں خصوصی ثقافتی اہمیت حاصل ہوئی۔

اگر ہم تفصیل میں جائیں تو کہا جا سکتا ہے کہ پنجابی زبان کی جڑیں پراکرت زبانوں میں ہیں، جو سنسکرت سے تقریباً 600 قبل مسیح وجود میں آئیں۔ ان میں پیشاچی پراکرت بھی شامل تھی، جو بعدازاں پنجابی میں ڈھل گئی۔ اپ بھرنش'' کا دور (ساتویں تا دسویں صدی) پنجابی زبان کی تشکیل کا ایک اہم مرحلہ ہے، جب یہ زبان اپ بھرنش کی ایک شکل کے طور پر سامنے آئی، جو پراکرت کی ایک عام فہم اور بگڑی ہوئی صورت تھی۔ یہ مرحلہ پراکرت اور علاقائی زبانوں کے درمیان ایک لسانی پل تھا، تاہم ابھی تک پنجابی کو تحریری شکل نہیں دی گئی تھی۔

اس کے بعد ناتھ یوگی دور (نویں تا چودھویں صدی) آتا ہے، جب پنجابی زبان کی ابتدائی تحریری شکلیں ناتھ یوگی تحریک سے منسلک نظر آتی ہیں۔ اس دور کی تحریریں زبان کی صرف ونحو، ذخیرہ الفاظ اور شاعرانہ آہنگ کی عکاسی کرتی ہیں۔ ناتھ یوگی تحریک ایک ہندو مذہبی، فکری اور روحانی تحریک تھی جس نے برصغیر کی ثقافت، زبان اور ادب پر گہرا اثر ڈالا، خاص طور پر نویں سے چودھویں صدی کے درمیان۔ یہ تحریک بنیادی طور پر یوگ، تپسیا (ریاضت) اور گیان (روحانی علم) پر زور دیتی تھی۔ ناتھ یوگی سنتوں کی تعلیمات اور شاعری نے پنجابی زبان کی ابتدائی ادبی روایت کی بنیاد رکھی۔ اسی دور میں مسلمان صوفیا بھی میدان میں آئے اور پنجابی زبان کو اپنا ذریعہ اظہار بنایا۔

پھر جب مسلمان فاتحین ہندوستان میں آئے تو ان کے ساتھ فارسی اور عربی زبانوں کے الفاظ بھی پنجابی میں شامل ہوئے، جنھوں نے زبان کے انداز، ساخت اور لغت کو نکھارا۔ پنجابی زبان کو سکھ دھرم کے باعث بھی فروغ حاصل ہوا۔ اسے سکھ مذہب کی عبادتی زبان ہونے کا اعزاز حاصل ہے، کیونکہ سکھ ازم کے بانی مقامی پنجابی بولنے والے تھے۔ اس سے زبان کو خطے میں گہری ثقافتی جڑیں ملیں۔ آج بھی پنجابی، سکھ برادری کی غالب زبان ہے۔

پنجابی رسم الخط:

پنجابی زبان دو مختلف رسم الخطوں میں لکھی جاتی ہے:

شاہ مکھی (فارسی-عربی بنیاد پر): اسے پنجاب کے مسلمان استعمال کرتے ہیں۔

گرمکھی (ایک منفرد رسم الخط): سکھ اور بعض ہندو برادریوں میں رائج ہے۔

پنجابی زبان کے علاقائی لہجے: لسانی تنوع کا تجزیاتی جائزہ

پنجابی زبان میں مختلف لہجے پائے جاتے ہیں، جن سے اکثر بولنے والے کے علاقے یا شہر کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ ان لہجوں میں الفاظ، تلفظ، جملوں کی ساخت اور بعض اوقات معنی میں بھی فرق پایا جاتا ہے۔ ماہرین لسانیات عمومی طور پر درج ذیل بڑے لہجوں کو تسلیم کرتے ہیں:

ماجھی (Majhi): علاقہ: لاہور، شیخوپورہ، گوجرانوالہ، قصور، امرتسر، فیروزپور

خصوصیت: ''معیاری پنجابی'' مانا جاتا ہے؛ زیادہ تر ادب، ذرائع ابلاغ اور رسمی مواقع پر یہی لہجہ استعمال ہوتا ہے۔

مالوی (Malwai): علاقہ: بھارتی پنجاب کا مالوہ علاقہ (بھٹینڈہ، مانسا، فرید کوٹ، سنگرور)

خصوصیت: نرم تلفظ، منفرد الفاظ، اور مخصوص گیتیہ انداز۔

دوآبی (Doabi): علاقہ: ستلج اور بیاس دریا کے درمیان (جالندھر، ہوشیار پور، کپورتھلہ)

پوٹھوہاری (Pothwari): علاقہ: راولپنڈی، جہلم، چکوال، مری، کشمیر کا کچھ حصہ

خصوصیت: اس میں ہندکو، پہاڑی اور کشمیری زبانوں کے اثرات نمایاں ہیں۔ بعض ماہرین اسے الگ زبان بھی کہتے ہیں۔

ریاستی/ڈوگری (Dogri): علاقہ: جموں کا خطہ

خصوصیت: بعض ماہرین اسے پنجابی کی شاخ اور بعض الگ زبان تصور کرتے ہیں، مگر پنجابی سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔

شاہپوری/جھنگوی: علاقہ: جھنگ، چنیوٹ، سرگودھا، خوشاب

خصوصیت: لغت اور تلفظ کا جداگانہ انداز، لوک شاعری اور قوالی میں کثرت سے استعمال ہوتا ہے۔

چنوٹی/رچینی: علاقہ: چنیوٹ، فیصل آباد، ٹوبہ ٹیک سنگھ

خصوصیت: مجھی اور شاہپوری کے درمیانی لہجے کا مرکب ہے۔

ملتانوی/لہندا (Lahnda): علاقہ: جنوبی پنجاب (ملتان، مظفرگڑھ، ڈی جی خان، بہاولپور)

خصوصیت: پنجابی کے مغربی لہجوں کا مجموعی نام، لغت اور جملوں کی ساخت کافی مختلف۔

سرائیکی (متنازع): علاقہ: جنوبی پنجاب

خصوصیت: بعض ماہرین اسے پنجابی کا لہجہ، جب کہ اکثر اسے ایک علیحدہ زبان تصور کرتے ہیں۔

پنجابی زبان کا موجودہ منظرنامہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ بیسویں صدی میں پنجابی ادب، تعلیم اور صحافت میں فروغ حاصل ہوا، خاص طور پر بھارت میں، جہاں یہ پنجاب کی سرکاری زبان بن گئی۔ آج کے دن پنجابی بولنے والوں کی تعداد دس کروڑ سے بھی زائد ہے۔ یہ ایک مسلسل ترقی پذیر زبان ہے۔ تاہم یہ حقیقت بھی روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ مشرقی اور مغربی پنجاب دونوں میں نئی نسل پنجابی زبان سے دور اور ہندی، اردو، اور انگریزی کے قریب ہوتی جا رہی ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ آنے والے برسوں میں عام لوگ بھی پنجابی بولنا کم کر دیں گے۔ میری یا

میرے بعد آنے والی نسل شاید آخری نسل ہو جو پنجابی زبان میں بات چیت کو ترجیح دے۔ البتہ پنجابی فلموں، گانوں، اور موسیقی کے ذریعے یہ زبان زندہ رہے گی اور یہی ہماری تہذیب اور شناخت کی ضمانت بھی ہے۔

آخر میں، میں اس امر پر زور دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اب وقت آ چکا ہے کہ پنجابی زبان کو صرف روزمرہ بول چال، عوامی میلوں ٹھیلوں یا غیر رسمی مواقع تک محدود رکھنے کے بجائے، اسے سنجیدہ علمی، ادبی، سائنسی اور مذہبی کتب کی تخلیق و ترویج کے لیے بھی استعمال کیا جائے، تاکہ یہ زبان علمی ارتقا کی راہ پر گامزن ہو سکے اور اپنی ثقافتی و فکری میراث کو مؤثر طور پر آئندہ نسلوں تک منتقل کر سکے۔

❁ ❁ ❁

پنجاب اور بیرونی حملہ آور

جی آیاں نوں کہا یا جنگ کی... حقیقت کیا ہے؟

اگر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ پنجاب نے ہمیشہ حملہ آوروں کو خوش آمدید کہا، تو اسے تاریخ کا از سرِ نو مطالعہ کرنا چاہیے۔ سکندر اعظم سے لے کر انگریزوں تک، پنجاب نے ہر بیرونی حملہ آور کا عسکری یا عوامی مزاحمت کے ذریعے مقابلہ کیا۔ اگرچہ بعض حملہ آوروں نے عارضی طور پر علاقے پر قبضہ کرلیا، مگر پنجاب نے انھیں مستقل حکمرانی کا موقع نہیں دیا۔

پنجاب کی تاریخی شناخت پر بات کرتے ہوئے، یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ بعض افراد سکھوں اور ہندوؤں کو پنجابی تسلیم کرنے میں تامل کا مظاہرہ کرتے ہیں، اور ان کے نزدیک صرف پنجاب میں بسنے والے مسلمان ہی ''پنجابی'' کہلانے کے مستحق ہیں۔ اگرچہ اس تصور کی تاریخی جڑیں موجود ہیں، لیکن یہ ایک محدود نقطۂ نظر ہے۔ یہ حقیقت اپنی جگہ درست ہے کہ محمود غزنوی سے لے کر احمد شاہ ابدالی تک، بیشتر حملہ آور مسلمان تھے، اور اس وجہ سے ان حملہ آوروں کے خلاف مقامی مسلم آبادی کی جانب سے مزاحمت نسبتاً کم دکھائی دیتی ہے۔ تاہم، یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ پنجاب کے عوام نے مجموعی طور پر ان خارجی قوتوں کی حمایت کی۔

تاریخی شواہد اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ جب بھی کوئی بیرونی قوت پنجاب پر قابض ہوئی، تو پنجابی عوام نے، خواہ ان کا مذہب کچھ بھی ہو، ان کے خلاف بھرپور مزاحمت کی۔ اس مزاحمتی روایت کی متعدد مثالیں ملتی ہیں: دُلا بھٹی، جس نے مغل شہنشاہ اکبر کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا؛ رائے احمد خان کھرل، جو انگریز استعماری طاقت کے خلاف علمبردارِ آزادی بن کر ابھرا؛ اور بھگت

سنگھ، جس نے برطانوی سامراج کے خلاف انقلابی جدوجہد کی۔ یہ محض انفرادی کردار نہیں بلکہ ایک اجتماعی مزاحمتی روایت کا حصہ ہیں، جس میں پنجابی شناخت اور آزادی کی تڑپ نمایاں ہے۔

اس تسلسل کو سمجھنے کے لیے امجد وڑائچ کی تحقیقی کتاب پنجاب کٹھہرے میں نہایت اہمیت کی حامل ہے، جس میں انھوں نے پنجابیوں کی سیاسی وسماجی بغاوتوں کی تفصیل پیش کی ہے۔ یہ کتاب نہ صرف پنجابی مزاحمتی شعور کو دستاویزی شکل دیتی ہے بلکہ اس خطے کی آزادی پسند فکری روایت کو بھی اجاگر کرتی ہے۔

پروفیسر عزیز الدین احمد کی کتاب پنجاب اور بیرونی حملہ آور میں اس تصور کو چیلنج کیا گیا ہے کہ بیرونی حملہ آوروں کا پنجاب پر قبضہ مقامی باشندوں کے لیے مفید تھا اور یہ کہ اہلِ پنجاب نے انھیں خوش آمدید کہا۔ مصنف کے مطابق حقیقت اس کے برعکس ہے۔ ان حملوں کے نتیجے میں پنجاب میں لوٹ مار، وسائل کی چوری، اور قتل وغارت کا بازار گرم ہوا، جبکہ سب سے بڑا نقصان یہاں کی مقامی تہذیب اور تمدن کی تباہی کی صورت میں سامنے آیا۔

مزید برآں، جب ہم اپنی درسی کتب کا مطالعہ کرتے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ ان حملہ آوروں کو اکثر ہیرو کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، جو تاریخی حقائق کے منافی ہے۔ پروفیسر عزیز الدین احمد اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ان حملہ آوروں نے پنجاب کی مقامی آبادی کو بارہا تباہی سے دوچار کیا اور ان کی خوشحال بستیوں کو نیست ونابود کر دیا۔ ان حملہ آوروں کا اصل مقصد اسلام کی تبلیغ نہیں تھا بلکہ ذاتی مفادات اور دولت کا حصول تھا۔ اسلام کی حقیقی اشاعت صوفیائے کرام کے ذریعے ہوئی، جنھوں نے محبت، رواداری اور انسان دوستی کا پیغام عام کیا۔

پنجاب نے ہمیشہ آزادی، خودمختاری اور مزاحمت کی علامت کے طور پر تاریخ میں اپنا مقام برقرار رکھا ہے۔ اس حقیقت کو سمجھنا اور تسلیم کرنا تاریخ فہمی کے لیے نہایت ضروری ہے۔ میں نے تین صدیاں قبل مسیح سے لے کر برطانوی دور تک ایک اجمالی جائزہ لیا ہے۔ جس سے مزاحمت کی تاریخی روایت درج ذیل شخصیات اور ادوار میں واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہے:

1- **راجہ پورس سکندر اعظم کے خلاف مزاحمت:** سکندر اعظم کے پنجاب پر حملے کے دوران،

راجہ پورس نے اپنے علاقے کی غیر متزلزل دفاع کی، جس کی تفصیل ''ہڈسپاس'' [Hydaspes] کی جنگ میں ملتی ہے۔

2- **چندر گپت موریہ سکندر کے جرنیلوں کے خلاف لڑائی:** سکندر کی فوجوں سے لڑائی کے دوران، چندر گپت موریہ نے نہ صرف اپنے علاقے کا دفاع کیا بلکہ سکندر کے جرنیلوں کے خلاف مزاحمت کو بھی کامیابی سے جاری رکھا۔

3- **راجہ جے پال اور آنند پال، محمود غزنوی کے خلاف مزاحمت:** جے پال نے غزنوی کا مقابلہ کیا۔ اسے شکست ہوئی۔ جس کے بعد اس کے بیٹے آنند پال نے اپنے والد کی شکست کا بدلہ لینے کے لیے فوجی تیاری کی اور محمود غزنوی کے خلاف ایک نئی جنگ کا آغاز کیا۔ 1008ء میں واہند کے قریب ہونے والی بڑی جنگ میں مختلف راجپوت راجاؤں نے آنند پال کا ساتھ دیا، مگر یہ اتحاد شکست سے دو چار ہوا۔

4- **ملک ایاز، غزنوی کے گورنر کے خلاف عوامی بغاوتیں:** خاص طور پر لاہور، ملتان اور سیالکوٹ کے زمینداروں کی بغاوتیں اہم تھیں، جنھوں نے غزنوی سلطنت کے حکام کے خلاف مزاحمت کی۔

5- **ہندوشاہی خاندان کی مزاحمت:** ہندوشاہی خاندان کے بچ جانے والے عناصر نے مقامی سطح پر محمود غزنوی اور اس کے گورنروں بشمول ایاز کے اقتدار کو تسلیم نہیں کیا، اور چھوٹی چھوٹی بغاوتوں کی صورت میں مسلسل مزاحمت کی۔

6- **شہاب الدین غوری کے حملے:** شہاب الدین غوری نے 1175ء میں ملتان کے اسماعیلیوں (یہ بھی بیرونی حملہ آور ہی تھے) کے خلاف حملہ کیا اور وہاں کامیابی حاصل کی۔ 1178ء میں اس نے گجرات پر بھی حملہ کیا، مگر اسے راجہ بیم دیو دوم کے ہاتھوں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ 1186ء میں لاہور پر غوری کا حملہ اس وقت کے غزنوی حکمران خسرو ملک کی حکومت کے خلاف تھا، اور اس میں پنجابی عوام کی براہِ راست مداخلت نہیں تھی۔

7- **پرتھوی راج چوہان اور گھکڑوں کی مزاحمت:** شہاب الدین غوری کے خلاف پرتھوی راج چوہان نے دو جنگیں لڑیں، جن کا مقام پنجاب کے ایک شہر کرنال کے قریب تھا۔ گھکڑوں نے بھی غوری کے خلاف مزاحمت کی، اور انھی کے ہاتھوں غوری کا قتل ہوا، جس کا مقبرہ جہلم کے قریب واقع ہے۔

8- **کھوکھروں کی بغاوت (1206):** محمد غوری کی وفات کے بعد، کھوکھر قبائل نے ترک حکمرانوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا، جسے قطب الدین ایبک نے سختی سے کچلا۔ یہ بغاوت شمالی پنجاب میں پیش آئی تھی۔

9- راجپوت سردار، جو جنوبی پنجاب کے مختلف علاقوں جیسے ملتان، ڈیرہ غازی خان، اور بہاولپور کے قریب مقیم تھے، اپنے قلعوں اور علاقوں میں خودمختار حیثیت رکھتے تھے۔ علاء الدین خلجی کی توسیع پسند پالیسی کے تحت جب دہلی کی فوجیں ان علاقوں میں آئیں، تو راجپوتوں نے سخت مزاحمت کا سامنا کیا۔

10- علاء الدین خلجی نے ان علاقوں پر فوجی چڑھائیاں کیں، اور کئی راجپوت قلعوں کو زبردست لڑائیوں کے بعد فتح کیا۔ مقامی روایات کے مطابق ان مزاحمتوں میں خاص طور پر چولستان کے قلعے دار اور ٹھنڈے صحرائی علاقوں کے راجپوت جنگجو شامل تھے، جنھوں نے قافلوں کو لوٹنے اور سلطنت کی عملداری کو چیلنج کرنے کی کوشش کی۔ ان مزاحمتوں کے دوران، ان راجپوت سرداروں نے علاقے کی خودمختاری کے دفاع کے لیے



عسکری حکمت عملیوں کا استعمال کیا اور دہلی کی سلطنت کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کا مقابلہ کیا۔

11- چودھویں صدی کے آخر میں تغلق سلطنت کی کمزوری نے کئی مقامی طاقتوں کو ابھرنے کا موقع دیا۔ اس دور میں ملتان میں مستقل طور پر مقامی خودمختار حکومت قائم ہوئی، جبکہ دیپالپور، سرائے سدھو اور شورکوٹ جیسے علاقوں کے سردار دہلی کی عملداری سے باہر ہو گئے اور اپنی آزادی کی کوششوں میں کامیاب ہوئے۔

12- اس عرصے کے دوران، سیالکوٹ کا ایک اہم پنجابی مسلمان سردار جسرت کھوکھر (1442-1375ء) نے 1410 سے 1442 تک پنجاب کے مختلف حصوں پر حکمرانی کی۔ جسرت نے امیر تیمور کی فوج کا مقابلہ کیا اور گرفتار بھی ہوئے، لیکن وہ ہتھیار ڈالنے کو تیار نہ تھے۔ سیالکوٹ ان کا دارالخلافہ تھا، جہاں سے انھوں نے اپنے جنگی آپریشنز کی قیادت کی۔

13- جسرت کھوکھر نے سید حکومت کے خلاف بغاوت کی قیادت کی اور جالندھر پر قبضہ کیا، اس کے بعد انھوں نے سرہند کا محاصرہ بھی کیا۔ اس محاصرے کے دوران اسلام خان لودھی نے مزاحمت کی، جس کے بعد اسلام خان نے سلطان مبارک شاہ سے مدد طلب کی، جس پر سلطان نے فوجی کارروائی کی اور بغاوت کو دبانے کی کوشش کی۔ یہ واقعات اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ پنجاب کے مقامی سرداروں اور طاقتوں نے ہر دور میں سلطنتوں کے بڑھتے ہوئے اثرات کا مقابلہ کیا اور اپنی خودمختاری اور علاقے کی حفاظت کے لیے جدوجہد کی۔ اس موضوع پر ڈاکٹر مظہر عباس کا مضمون پڑھنے کے لائق ہے۔[1]

14- **بابر اور افغان قبائل کے خلاف مزاحمت:** جب بابر کابل سے ہندوستان کی جانب بڑھا، تو پنجاب کے مغربی حصے میں افغان قبیلے، خاص طور پر لودھی خاندان کے حامی افغان، اس کے راستے میں حائل ہوئے۔ ملتان، دیپال پور اور لاہور جیسے علاقے افغان سرداروں کے زیر اثر تھے، جو ابراہیم لودھی کے وفادار تھے۔ ان سرداروں نے بابر کی افواج کا مقابلہ

---

[1] ttps://www.thenews.com.pk/tns/detail/996257-unrecorded-resistance

کرنے کی کوشش کی، تاہم بابر نے اپنے منظم توپخانے اور ترک و مغل سواروں کی مدد سے ان کی مزاحمت کو شکست دی۔ اس دوران لاہور کا حاکم داؤد لودھی تھا، جو ابراہیم لودھی کا وفادار اور سخت مزاحمت کرنے والا شخص تھا۔

15- **اکبر کے دور میں سکھ تحریک کی نشوونما:** اکبر کے دور میں بابا گرونانک کے بعد سکھ مت ایک روحانی تحریک کے طور پر ابھرا۔ اگرچہ اکبر نے سکھوں کے ساتھ رواداری اختیار کی، لیکن یہ تحریک بعد کے ادوار میں مغل اقتدار کے خلاف سماجی اور مذہبی بنیاد فراہم کرنے لگی۔ گرو نانک کی تعلیمات نے اکبر کے دور میں پھیلنا شروع کیا اور پنجاب میں عوامی شعور کو بیدار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اگرچہ اکبر نے سکھوں کے ساتھ مفاہمت کی، مگر سکھوں کی بڑھتی ہوئی طاقت نے مغلوں کے اقتدار کو ایک چیلنج فراہم کیا۔

16- **مقامی راجوں کی مزاحمت:** اکبر کی ''سب سے فتح''(Subah System) کے نفاذ کے بعد پنجاب کو مختلف صوبوں میں تقسیم کیا گیا۔ اس کے باوجود کئی مقامی راجے اور جاگیردار اپنی خودمختاری کو برقرار رکھنے کے لیے مزاحمت کرتے رہے۔ جھنگ، مانسہ، سیالکوٹ اور گجرات کے کچھ مقامی قبائل نے وقفے وقفے سے مغل حکومت کے خلاف مزاحمت کی، جو ایک طویل عرصے تک جاری رہی۔

17- **دلہ بھٹی اور مغل حکومت کے خلاف مزاحمت:** دُلا بھٹی، جو پنجاب کے معروف راجپوت قبیلے بھٹیوں سے تعلق رکھتے تھے، مغلوں کے خلاف مزاحمت کی ایک اہم علامت بنے۔ ان کے آباؤاجداد، ساندل بھٹی اور فرید بھٹی نے مغلوں کے ابتدائی دور سے ہی مغل اقتدار کے خلاف جنگ کی تھی۔ دُلا بھٹی کے والد اور دادا کو اکبر کے حکم پر قتل کیا گیا کیونکہ وہ مغل حکومت کے تابع ہونے سے انکار کرتے تھے۔

18- **گرو ارجن دیو اور سکھوں کی عسکری مزاحمت:** گرو ارجن دیو کو، جو پانچویں سکھ گرو تھے، نے 1606ء میں جہانگیر کے حکم پر لاہور میں قتل کیا گیا۔ اس کے بعد سکھوں نے نہ صرف مذہبی

مزاحمت، بلکہ عسکری مزاحمت بھی اپنائی۔ گرو ہرگوبند نے سکھوں کو جنگی تربیت دی اور ''اکال تخت'' کی بنیاد رکھی۔ اس کے بعد انھوں نے مغلوں کے خلاف مختلف معرکوں میں حصہ لیا، جن میں امرتسر، لاہور اور گرداسپور کے علاقے شامل تھے۔

19- **شاہجہان کے دور میں مزاحمت:** شاہجہان کے دور میں بھی پنجاب میں مختلف مزاحمتیں جاری رہیں۔ سکھوں کی تحریک، مقامی افغان اور راجپوت سرداروں کی بغاوتوں نے مغل سلطنت کے اقتدار کو چیلنج کیا، اگرچہ یہ مزاحمت زیادہ تر مقامی سطح تک محدود رہی۔ تاہم، ان مزاحمتوں نے بعد میں سکھوں کی مکمل بغاوتوں کے لیے راہ ہموار کی، جس نے مغل سلطنت کے خلاف اپنی طاقتور تحریک کا آغاز کیا۔ مجموعی طور پر، ان مزاحمتوں نے پنجاب میں ایک مضبوط سیاسی اور عسکری مرکز کی تشکیل کی بنیاد رکھی، جو بعد میں مغلیہ سلطنت کے لیے ایک اہم چیلنج بن گیا۔

20- شاہ جہاں کے دور حکومت میں پنجاب کے علاقے میں مغل خاندان کے خلاف مزاحمت بنیادی طور پر سکھ برادری سے پیدا ہوئی، جس کی قیادت گرو ہرگوبند نے کی، اور بعد میں بندہ سنگھ بہادر نے کی۔ اگرچہ دیگر گروہوں جیسے جاٹ اور راجپوت کے ساتھ تنازعات بھی موجود تھے، سکھ بغاوتیں خاص طور پر اہم تھیں اور ان کا کردار خطے میں مغلوں کی حکومت کے زوال میں فیصلہ کن تھا۔

21- شاہ عالمگیر کے دور میں پنجاب میں ہونے والی مزاحمت نے مغلیہ سلطنت کے لیے ایک سنگین چیلنج فراہم کیا۔ سکھوں کی مزاحمت، مقامی سرداروں کی بغاوتیں، افغان سرداروں کی جنگیں اور مذہبی پالیسیوں کے خلاف مذہبی مزاحمت نے مغل حکمرانی کو کمزور کر دیا۔ اس کے علاوہ، جاٹوں کی تحریک اور بعد میں بندہ سنگھ بہادر کی قیادت میں سکھوں کی بڑی مزاحمت نے مغلیہ سلطنت کے خاتمے کی راہ ہموار کی۔

22- شاہ عالمگیر کی حکمرانی میں پنجاب میں بڑھتی ہوئی مزاحمت نے یہ ثابت کیا کہ مقامی قوتیں اور فرقہ وارانہ تنازعات مغلیہ سلطنت کے استحکام کے لیے ایک مسلسل خطرہ بنے ہوئے

تھے۔ عالمگیر خاندان (اورنگ زیب اور اس کے جانشینوں) کے خلاف پنجاب کے علاقے سے خاص طور پر سکھ برادری کی طرف سے ایک خاص مزاحمت دیکھی گئی۔ یہ مزاحمت اورنگ زیب کی مذہبی پالیسیوں کی وجہ سے ہوئی، جن میں جزیہ ٹیکس کا دوبارہ نفاذ شامل تھا، جس نے ہندوؤں کو غصہ دلایا اور گرو گوبند سنگھ جیسے رہنماؤں کے زیر اثر سکھوں کی بغاوتوں کو جنم دیا۔

23- اس کے بعد ایک سو سال تک مغلوں اور ابدالیوں کے خلاف سکھوں کی جنگوں کا احوال تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ان حملوں میں نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملے بھی شامل ہیں۔ غیر ملکی حملہ آوروں اور حکمرانوں کے خلاف سکھوں کی جنگوں کو محض مذہبی نقطہ نظر سے نہیں دیکھا جانا چاہیے، بلکہ ان کی جنگوں کو ایک پنجابی نقطہ نظر سے بھی سمجھنا ضروری ہے۔ سکھ جو ہر لحاظ سے پنجابی تھے، انھوں نے مغلوں اور ابدالیوں کے خلاف ایک سو سال تک جنگ کی اور آخر کار وہ مغلوں کو زیر کرنے اور ابدالی کو پنجاب سے نکالنے میں کامیاب ہوئے۔ اس جنگ میں ایک بڑی تعداد میں سکھوں کا قتل عام کیا گیا اور ان کے گروؤں کو بھی شہید کیا گیا۔ اس سب کے باوجود سکھوں نے مغلوں اور ابدالیوں کے خلاف اپنی جنگ جاری رکھی۔

24- امجد وڑائچ کے بقول چند نامور مسلمانوں نے چج دوآب خصوصاً گجرات کے علاقے میں ابدالی کی لوٹ مار کے خلاف شدید مزاحمت کی۔ چودھری غلام محمد خان عرف غلاماں وڑائچ نے اس مزاحمتی تحریک کی قیادت کی اور اپنے چچا چودھری سبحان کی موت کے بعد ابدالیوں کی لوٹ مار کے خلاف اتنی کامیاب مزاحمت کی کہ ابدالی کے لیے چج دوآب کو پار کر کے لاہور تک پہنچنا ناممکن ہوگیا، اور اس نے 1769ء میں اپنے نویں حملے کے دوران پھالیہ کے قریب جو کالیاں سے بغیر لڑے ناکام واپس کابل جانے پر مجبور ہوگیا۔

25- جب انگریزوں نے ہندوستان کے بیشتر حصے پر قبضہ کرنے کے بعد پنجاب کا رخ کیا، تو انھیں یہاں بھی سکھوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی وفات تک انگریز ستلج کے

مشرقی حصے تک محدود رہے۔ تاہم جب انھوں نے ستلج کے مغربی علاقے اور لاہور پر قبضہ کرنے کی کوشش کی، تو انھیں سکھوں کے ساتھ شدید لڑائی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس بار سکھوں نے ایک مرتبہ پھر بدیشی حملہ آور کے خلاف جنگ میں حصہ لیا۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ اس وقت کے پنجاب میں ایک کثیر تعداد میں عام مسلمانوں نے انگریزوں کے خلاف جنگ کی، تاہم وہ نواب یا جاگیردار جو سکھوں سے تنگ تھے، نے جنگوں میں سکھوں کا ساتھ نہیں دیا۔ اس کے باوجود کئی مسلمان سردار انگریزوں کے خلاف جنگ میں شریک تھے۔ تاہم، ان جنگوں کے نتیجے میں پنجابی ہار گئے اور پنجاب پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔

26- اینگلو-سکھ جنگیں، جو درحقیقت اینگلو- پنجاب جنگیں تھیں، انیسویں صدی کے وسط میں برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی اور سکھ سلطنت کے درمیان لڑی جانے والی دو تنازعات کا ایک سلسلہ تھا۔ پہلی اینگلو سکھ جنگ (1846-1845ء) سکھوں کے دریائے ستلج کو عبور کرنے سے شروع ہوئی، جس کے نتیجے میں لڑائیوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا اور معاہدہ لاہور پر دستخط ہوئے، جس نے سکھ سلطنت کو کمزور کر دیا۔ دوسری اینگلو سکھ جنگ (1849-1848ء) سکھ سلطنت میں مزید بدامنی اور بغاوت کی وجہ سے شروع ہوئی، جس کے نتیجے میں بالآخر انگریزوں نے پنجاب کا الحاق کر لیا۔

27- جب انگریزوں نے سکھوں کو شکست دے کر پنجاب پر قبضہ کیا، تو اس کے بعد بھی پنجاب میں برطانوی استعمار کے خلاف مزاحمت ایک طویل، خونریز اور غیر معمولی باب ہے، جس میں نہ صرف سکھ حکمرانوں، صوفی رہنماؤں اور مجاہدین بلکہ عام دیہاتیوں اور کسانوں تک نے حصہ لیا۔ اس مزاحمت میں فوجی، سیاسی، مذہبی اور کسان تحریکوں نے برطانوی اقتدار کو چیلنج کیا۔ ان میں سے چند اہم تحریکوں کا ذکر یوں کیا جا سکتا ہے جیسے پگڑی سنبھال جٹا تحریک (1907) سب سے زیادہ مقبول ہوئی۔ یہ تحریک برطانوی زمین داری قوانین، خاص طور پر کالونائزیشن بل کے خلاف کسانوں کی ایک زبردست تحریک تھی۔ اس تحریک کی قیادت اجیت سنگھ (بھگت سنگھ کے چچا) نے کی، جن کے ساتھ سیف الدین کچلو اور لالہ

لاجپت رائے بھی سرگرم تھے۔ پنجاب بھر میں جلسے، جلوس اور مظاہرے شروع ہو گئے اور انقلابی اشعار اور پنجابی گیت مقبول ہوئے۔

28- اسی عرصے میں غدر پارٹی کی بنیاد رکھی گئی، جس کا مقصد برطانوی راج کا خاتمہ اور مسلح انقلاب تھا۔ سیکڑوں غدری وطن واپس آئے اور انھیں پکڑ کر پھانسیاں یا عمر قید دی گئی۔

29- بھگت سنگھ بھی اسی تحریک کا حصہ تھا، جسے 1931ء میں لاہور میں پھانسی دی گئی اور اس کے بعد وہ پنجاب کا انقلابی ہیرو بن گیا۔

30- پنجاب میں کانگریس، مسلم لیگ، مجلس احرار، اور خاکسار تحریک نے مختلف زاویوں سے برطانوی راج کے خلاف جدوجہد کی۔ علامہ اقبال نے سیاسی بیداری کے ذریعے پنجاب میں فکری انقلاب برپا کیا۔

31- مولانا ظفر علی خان، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، اور دیگر علماء نے برطانوی نظام تعلیم و قانون کی مخالفت کی۔ تحریک پاکستان کا مرکز بھی بالآخر پنجاب ہی بنا، اور لاہور میں 1940ء میں قرارداد پاکستان منظور ہوئی۔

اب تک جو میں نے بیان کیا ہے، اس کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ پنجاب نے سکندر سے لے کر برطانوی سامراج تک ہر حملہ آور کا اپنی بساط کے مطابق مقابلہ کیا ہے۔ ہر دور میں مزاحمت، جدوجہد، اور قربانی کی بے شمار مثالیں قائم کی گئیں۔ سکندر کا مقابلہ صرف راجہ پورس نے نہیں کیا تھا، بلکہ دریائے چناب اور ستلج کے درمیان آباد قبائل بھی پیش پیش تھے۔ انھوں نے سکندر کی فوج کو جنوبی پنجاب میں، خاص طور پر موجودہ ملتان کے علاقے میں، سخت مزاحمت فراہم کی۔ ملتان کی لڑائی میں سکندر خود زخمی ہوا اور اسے ایک تیر لگا جو اس کی موت کا سبب بنا۔

سگالا کے راجہ (راجہ ابھیسار) اور دیگر راجے جیسے راجہ امبھی نے مختلف رویے اپنائے۔ کچھ نے سکندر سے اتحاد کیا، جبکہ کچھ نے پس پردہ مخالفت کی۔ سکندر کی فوج کو کئی شہروں میں برہمنوں کی مزاحمت کا سامنا بھی کرنا پڑا، جو عوام کو بغاوت پر اکساتے تھے۔ یونانی مؤرخین نے لکھا کہ سکندر نے کئی برہمن رہنماؤں کو پھانسی دی۔ سکندر کی جنگی مہارت کے باوجود، پنجاب کے

راجاؤں اور قبائل نے اس کے خلاف دلیرانہ مزاحمت کی، اور خاص طور پر راجہ پورس کی جدوجہد آج بھی غیر ملکی حملہ آور کے خلاف پنجابی غیرت کی ایک عظیم علامت سمجھی جاتی ہے۔

اگر میں یہ کہوں کہ راجہ پورس کی فوج میں شامل چھکڑوں سے لے کر جے پالا کے نیزوں، پنجاب کے کسانوں، سکھوں کی تلوار سے لے کر بھگت سنگھ کے بم تک، اور کسانوں کی آواز سے لے کر صوفیوں کی دعا تک، پنجاب کی سرزمین ہمیشہ آزادی کے لیے لڑنے والے بہادر لوگوں کا مسکن رہی ہے، تو یہ بات بے جا نہ ہوگی کہ پنجاب نے ہمیشہ بدیشی حکمرانوں، خواہ وہ مغرب سے آئے یا مشرق سے، ان کے خلاف جدوجہد کی اور آزادی کی قیمت ادا کی۔

غیر ملکی یلغار کے باوجود پنجاب میں تہذیبی، معاشرتی اور مذہبی اقدار کا تسلسل ایک تاریخی و تجزیاتی مطالعہ:

غیر ملکی حملوں کے باوجود پنجاب میں معاشرتی، سماجی اور مذہبی اقدار کی حفاظت ایک اہم موضوع ہے۔ ہندوستان پر حملہ آور قوموں کو پانچ بڑے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

یورپی، وسطی ایشیاء سے آنے والے ترک (مغل)، ایرانی، پختون اور عرب: ہر قوم نے جہاں بھی اپنی ریاست قائم کی، وہاں کی معاشرت، سماج، مذہب اور رہن سہن پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ کیا پنجاب میں بھی ایسا ہی ہوا؟ میں یہاں اس کا تجزیہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔

یہ ایک نہایت اہم اور فکری موضوع ہے۔ میری تحقیق اور مشاہدات کے مطابق، پنجاب نے صدیوں پر محیط غیر ملکی حملوں کے باوجود اپنی معاشرتی، سماجی، اور مذہبی اقدار کو ایک حد تک محفوظ رکھا۔ پنجاب کی سرزمین پر یونانیوں سے لے کر ترکوں، منگولوں، مغلوں، افغانوں اور انگریزوں تک مختلف حملہ آوروں نے قدم رکھا، لیکن اس خطے کی ثقافت، عقیدہ، زبان، مہمان نوازی، اور صوفیانہ روح ہمیشہ زندہ رہی۔ یہ سب کیسے ممکن ہوا؟ اور یہ بھی کہ پنجاب نے ہر حملہ آور کو کس طرح خوش آمدید کہا، اس کا جواب اس بات میں مضمر ہے کہ پنجاب کی زمین نے ہمیشہ اپنی اقدار کو برقرار رکھا۔

میں نے پچھلے صفحات میں تئیس سو سال کی تاریخ کا تجزیہ کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ ہر دور میں اہلِ پنجاب نے غیر ملکی حملہ آوروں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا ہے۔اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ پنجاب نے سماجی تبدیلیوں کے میدان میں بھی مزاحمت کی ہے، اور اس کی جھلک آج بھی ہمیں دیکھنے کو ملتی ہے۔

ہر حملہ آور نے پنجاب پر عسکری، سیاسی اور ثقافتی تسلط کی کوشش کی، لیکن مقامی روایتیں، زبان، مذہب، اور رسوم و رواج ختم نہ ہو سکے۔پنجاب میں آج بھی پنجابی معاشرہ کنبے، گاؤں، اور برادری پر مبنی ہے، جو حملوں کے دوران ایک دوسرے کا سہارا بنتا رہا۔ چودھری، نمبردار، اور پنچائتیں مقامی فیصلے کرتی تھیں، جس سے سماجی ڈھانچہ برقرار رہا۔

پنجابی معاشرہ ہر دور میں مہمان نواز اور عزت دار رہا۔''روٹی تے وساہ'' کی رسم آج بھی قائم ہے، اور حملوں کے باوجود کنبے و قبیلے ایک دوسرے کے محافظ بنے رہے۔پنچائتی نظام نے عدل و مشورے کی روایت کو زندہ رکھا، اور زمیندارانہ سماج میں زمین عزت اور شناخت کی علامت بنی رہی۔'' پگڑی سنبھال'' جیسے محاورے اور اقدار ہر دور میں موجود رہے۔میلوں، تہواروں اور رسومات کا تسلسل جیسے بیساکھی، لوہڑی، عرس، عید، اور ہولی ہر حملہ آور دور میں منائے جاتے رہے، جو اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ پنجاب نے اپنی سماجی روایات کو امن کے دور میں بھی اور جنگ کی حالت میں بھی زندہ رکھا۔

پنجابی زبان اور لوک ادب کی بقا بھی ایک اہم کارنامہ ہے۔حملہ آور اکثر فارسی، عربی، انگریزی یا دیگر زبانیں لائے، مگر پنجابی زبان عوام میں زندہ رہی۔لوک داستانیں جیسے''ہیر رانجھا''، ''سسی پنوں''، اور''مرزا صاحباں'' نے محبت، غیرت، قربانی اور مزاحمت کے جذبات کو زندہ رکھا۔پنجابی شاعری نے عوامی جذبات کو نسل در نسل منتقل کیا۔

مذہبی و روحانی اقدار کی حفاظت میں بھی پنجابی معاشرہ پیش پیش رہا ہے، چاہے وہ بدھ مت سے متعلق ہو، یا ہندو دھرم سے، سکھ مت یا اسلام سے۔اس لیے ہر سلسلے کے روحانی پیشواؤں نے اہم کردار ادا کیا، خاص طور پر مسلمان صوفیائے کرام کا کردار بے حد اہم رہا۔ بابا

فریدؒ، سلطان باہوؒ، وارث شاہؒ کے علاوہ کئی اورصوفیوں اورشعرا نے پنجابی زبان میں محبت، رواداری، اورتوحید کا پیغام دیا۔صوفیا کی خانقاہیں، مزاراورمیلوں نے مذہب کوعوامی رنگ دیا جوغیرملکی اثرات سے محفوظ رہا۔باباگرونانک نےسکھ دھرم کی بنیادرکھی اورسکھوں نے اپنی مذہبی کتاب بھی مقامی زبان یعنی پنجابی زبان میں لکھی۔

مذہبی اقدار کومٹانے کی کوششوں کے باوجود پنجابی مسلمان، سکھ، ہندوسب نے اپنی عبادات، روایات اورتہوارزندہ رکھے۔مساجد، گردوارے اورمندرحملوں کے باوجوددوبارہ تعمیرہوتے رہے۔زبان، لوک ادب اورثقافت کاتحفظ کرنے کی کوشش ہمیشہ جاری رہی۔حملہ آوروں نے فارسی، عربی، انگریزی نافذکی، مگرپنجابی زبان گلیوں، درباروں، میلوں اورگیتوں میں زندہ رہی۔''ہیر رانجھا''،''مرزا صاحباں''،''سسی پنوں''جیسی داستانوں نے پنجابی جذبات، محبت، غیرت، اورمزاحمت کوزندہ رکھا۔پنجابی پہناوا، کھانے، گیت، اورشادی بیاہ کی رسومات یہ سب حملہ آورثقافتوں کے باوجودقائم رہیں۔

اس سب کانتیجہ یہ نکلا کہ پنجاب کی روح زندہ رہی۔ پنجاب پر حملے ہوتے رہے، تخت بدلتے رہے، مگر پنجاب کی عوامی روح – لوک ورثہ، صوفی عقیدہ، محبت، برادری، اور بہادری کبھی شکست نہ کھاسکی۔حملہ آوروں کی سختیوں کے باوجودعبادت گاہیں، مذہبی کتب اورتعلیم کا تسلسل قائم رہا۔پنجاب پرحملہ آوروں نے قبضہ توکیا، لیکن پنجاب کی روح پرقابونہ پاسکے۔صوفی فکر، پنجابی زبان، خاندانی نظام، مذہبی روایات اورسماجی اقدار نے صدیوں تک حملہ آورثقافتوں کے مقابلے میں اپنی شناخت کو برقراررکھا۔آج بھی اگرہم پنجابی معاشرے کودیکھیں توہمیں ان تاریخی اقدارکی جھلک واضح نظرآتی ہے۔

''پنجاب ایک دل ہے، جوہرزخم پرنئی جان پاتا ہے۔''

میرے نزدیک پنجاب ایک منفردخطہ ہےجس کی خصوصیات اپنی نوعیت میں بے مثال ہیں۔پنجاب زرخیز ہے- یہاں کی زمینیں نہ صرف اناج سے بھرپور ہیں بلکہ زراعت کے حوالے

سے یہ خطہ ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ یہ پیار بھرا ہے۔لوک داستانوں کا یہ خطہ نہ صرف کہانیوں کا خزانہ ہے بلکہ انسانی جذبوں اور محبت کی گہرائیوں کو بھی اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ پنجاب روحانی ہے۔ یہاں صوفیائے کرام کی سرزمین ہے جہاں روحانیت کی روشنی ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔ یہ جرات مند ہے۔حملہ آوروں کے سامنے ہمیشہ سینہ سپر ہو کر پنجاب نے اپنی آزادی اور وقار کی حفاظت کی ہے۔ پنجاب ثقافتی طور پر بھی انتہائی اہم ہے- یہاں کی زبان، لباس، میلوں اور بولی کی خوبصورتی اپنے اندر ایک منفرد طرزِ حیات کو پیش کرتی ہے۔

پنجابیوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر آنے والے کو مہمان سمجھتے ہیں، اسے ضرورت مند جان کر اپنے سینے سے لگاتے ہیں اور عزت دیتے ہیں۔اس غیر مشروط استقبال کی وجہ سے پنجابیوں میں تعصب کی جگہ نہیں بن پاتی۔تاہم، یہی خصوصیت بعض اوقات ان کے مخالفین کے نزدیک پنجاب کی بزدلی سمجھی جاتی ہے۔ حالانکہ حقیقت میں یہی پنجابی معاشرت کی اعلیٰ اقدار کی عکاسی کرتی ہے۔آج بھی پنجاب کے مختلف حصوں میں دوسرے صوبوں سے لوگ آ کر آباد ہیں، اور یہاں انھیں سکون اور امن میسر آتا ہے۔اس خطے میں کوئی بھی شخص کسی کے شناختی کارڈ کی بنا پر اس پر حملہ نہیں کرتا۔

غالب کے اشعار میں جو درد اور حقیقت کی گہرائی ہے، وہ پنجاب کی روح کی عکاسی کرتی ہے:

؎وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں

یہ مصرعہ اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ پنجاب کا ہر فرد اپنی زمین، اپنی اقدار اور اپنی شناخت کے لیے لڑتا ہے۔اس خطے کے لوگ اپنی مہمان نوازی اور رواداری کے باوجود جب مشکل وقت آتا ہے، تو وہ اپنی سرزمین اور اپنی قوم کے لیے کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کرتے۔ [1]

چانڈیو انور عزیز نے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ پنجاب نے ہر حملے کے خلاف شدید مزاحمت کی ہے، ایک طویل مضمون لکھا ہے، جس کا عنوان ہے:

[1] https://www.humsub.com.pk/434967/chandio-anwar-aziz-48/

''پنجاب کا دانشور اگر مزاحمت نہیں کرتا تو 'واریں' کون لکھتا ہے؟''

''واریں'' پنجابی زبان کا ایک لفظ ہے، جس کا مطلب جنگوں کی داستانیں ہیں۔ یعنی جنگوں کے بارے میں جو شاعری کی جاتی ہے، اسے ''واریں'' کہا جاتا ہے۔

چانڈیو انور عزیز نے بڑی تفصیل سے یہ بیان کیا ہے کہ ''وار'' پنجابی شاعری کی ایک طاقتور صنف ہے، جو پنجابی دھرتی کے ہیروز کی بہادری کو زندہ رکھتی ہے۔ میلوں اور بیٹھکوں میں وار سنانے والوں کو عزت دی جاتی ہے۔ یوسف پنجابی کے مطابق ''وار'' ہمیں اپنے قومی ہیروز سے جوڑتی ہے، مگر تقسیم کے بعد اس صنف پر خاطر خواہ کام نہیں ہو سکا۔ اردو کو ریاستی سرپرستی حاصل ہونے کے باعث پنجابی زبان کو نقصان پہنچا۔

عزیز کے بقول پروفیسر جمیل پال کہتے ہیں کہ تاریخی واریں آج بھی زندہ ہیں، مگر نئی واروں کی تخلیق کم ہو گئی ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ پنجابی زبان کو تعلیم کا باقاعدہ حصہ نہیں بنایا گیا، جس کے نتیجے میں پنجابی صحافت اور ادبی سرگرمیوں کو زوال کا سامنا کرنا پڑا۔ اصل مسئلہ مزاحمت کی صورت یا صنف کا نہیں، بلکہ مزاحمت کے احساس کا ہے۔ چونکہ پنجاب کا دانشور طبقہ ریاستی مفادات سے وابستہ رہا ہے، اس لیے وہ اجتماعی ناانصافی کا مکمل ادراک حاصل نہ کر سکا۔ تاہم، اب سیاسی تبدیلیاں اور ناانصافیاں پنجاب میں شعور پیدا کر رہی ہیں۔ یہ امید کی جا رہی ہے کہ پنجاب اپنا تاریخی، ثقافتی اور سیاسی شعور دوبارہ حاصل کرے گا۔

جہاں تک میری تحقیق اور مطالعے کا تعلق ہے، یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ایک منظم فکری اور نظریاتی حکمتِ عملی کے تحت پنجاب کی مزاحمتی تاریخ اور اس کے مقامی ہیروز کو اجتماعی شعور سے محو کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس کا ایک اہم سبب یہ رہا کہ جن مسلم حملہ آوروں کے خلاف پنجاب کے عوام نے تاریخی مزاحمت کی، وہی شخصیات بعد ازاں ریاستی بیانیے میں ''اسلامی ہیروز'' کے طور پر پیش کی گئیں۔ چنانچہ جب ریاستِ پاکستان احمد شاہ ابدالی جیسے حملہ آور کو قومی ہیرو قرار دیتی ہے، اور اُس کے نام پر عسکری ساز و سامان (مثلاً میزائل) منسوب کیے جاتے ہیں، تو یہ کیسے ممکن ہے کہ انھی حملہ آوروں کے خلاف صف آرا مقامی پنجابی

قوتوں کو مزاحمتی ہیرو کے طور پر تسلیم کیا جائے؟

اس فکری تضاد کو برقرار رکھنے کے لیے ایک منفی تاثر پیدا کیا گیا، جس کے تحت پنجابی عوام کو غیر سیاسی، بے عمل اور خارجی حملہ آوروں کے استقبال کرنے والے کے طور پر پیش کیا جاتا رہا۔ ایسی روایات- جیسے پنجابی صرف ''لسّی پی کر سونے والے'' ہیں- مقامی مزاحمتی شعور کو مٹانے کی شعوری کوششوں کا حصہ بنیں۔

تاہم، تاریخی شواہد اس کے برعکس گواہی دیتے ہیں کہ پنجاب نے ہمیشہ بیرونی تسلط کے خلاف کسی نہ کسی شکل میں مزاحمت کی ہے-خواہ وہ عسکری میدان میں ہو، سیاسی جدوجہد کی صورت میں یا ادبی اظہار کے قالب میں۔ آج بھی پنجاب کا مزاحمتی شعور زندہ ہے، اور آنے والے وقتوں میں بھی اس کا تسلسل قائم رہنے کی توقع کی جاسکتی ہے۔

پنجابی شناخت کے احیا کی کوششوں کو کسی تعصب یا قوم پرستانہ زاویے سے دیکھنا علمی و تہذیبی انصاف کے منافی ہے۔ درحقیقت، پنجابی شناخت کا احیا نہ صرف پنجاب کی ثقافتی اور تاریخی خودی کو بحال کرنے کا ذریعہ بنے گا، بلکہ پاکستان میں بسنے والی دیگر لسانی، نسلی اور علاقائی اکائیوں کو بھی اپنی شناخت کے اظہار اور تحفظ کا موقع فراہم کرے گا۔ اس رجحان سے نہ صرف مقامی زبانوں کے بقا اور فروغ کی راہیں ہموار ہوں گی، بلکہ ایک کثیر الثقافتی، باشعور اور تکثیری سماج کی تشکیل بھی ممکن ہو سکے گی۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ پاکستان میں ایک منصفانہ، جمہوری اور ثقافتی طور پر ہم آہنگ معاشرے کی بنیاد، پنجاب سمیت تمام اکائیوں کے ادبی، لسانی اور سیاسی شعور کے فروغ سے ہی ممکن ہے، جو قومی سطح پر ایک متوازن اور پائیدار ہم آہنگی کا ضامن بن سکتا ہے۔

اس موضوع پر ایک نہایت عمدہ تحقیق جناب عزیز احمد صاحب نے کی ہے، جسے انھوں نے ایک کتاب کی صورت میں شائع کیا ہے۔ وہ اپنی کتاب پنجاب اور بیرونی حملہ آور میں پنجاب کی تاریخ میں آریاؤں کی آمد سے لے کر انگریزوں کے تسلط تک بیرونی حملوں اور ان کے خلاف مقامی آبادی کی مزاحمتی تحریکوں کا ایک مربوط اور متوازن جائزہ پیش کرتے ہیں۔ یہ

کتاب نہ صرف پنجاب کی سیاسی اور عسکری تاریخ کا احاطہ کرتی ہے بلکہ اس خطے کی لسانی، تہذیبی اور سماجی تشکیل کے مراحل کو بھی علمی انداز میں بیان کرتی ہے۔

ان کا یہ موقف ہے کہ پنجاب مختلف قبائل، ذاتوں اور برادریوں میں بٹا ہوا خطہ رہا ہے، تاہم اس کی لسانی ہم آہنگی ہمیشہ نمایاں رہی، جو نہ صرف اس خطے کی شناخت کا ایک اہم پہلو بنی بلکہ بیرونی حملہ آوروں کے مقابل ایک فطری وحدت کا محرک بھی ثابت ہوئی۔ ان کے مطابق یونانی، منگول، ترک، ایرانی، ہن اور افغان اقوام کی زبانیں مقامی آبادی کے لیے اجنبی تھیں، جب کہ پنجاب کے باسی ایک دوسرے کی زبان بآسانی سمجھ سکتے تھے۔

انھوں نے یہ بات بھی لکھی ہے کہ مغل دور سے (میرے خیال میں غزنوی دور سے) قبل یہاں کے لوگ اپنی زبان کو ''پنجابی'' نہیں کہتے تھے، بلکہ اپنی شناخت قبائلی اور خاندانی نسبتوں جیسے گکھڑ، نیازی اور بھٹی کے حوالے سے کرتے تھے۔ یہی وہ دور تھا جب ''پنجاب'' کے نام کا اطلاق پہلی مرتبہ ہوا اور اسی عہد میں اس خطے کی زبان کو ''پنجابی'' کہا جانے لگا۔ عزیز احمد کے نزدیک یہ قومیتی شناخت جو ذات اور قبیلے سے بالاتر ہے۔ ایک نسبتاً جدید رجحان ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ''پنجاب'' جو ایک فارسی لفظ ہے، کی ابتدائی حیثیت اس وقت قائم ہوئی جب یہاں پہلی بار ایک فارسی بولنے والا، یعنی محمود غزنوی، وارد ہوا۔

یہ بات بھی اہم ہے کہ مختلف ادوار میں پنجاب کا جغرافیہ بدلتا رہا ہے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سلطنت میں پنجاب کی جغرافیائی حدود موجودہ تصور سے مختلف تھیں۔ ستلج کے پار کا علاقہ انگریزوں کے قبضے میں تھا، جب کہ جنوبی پنجاب کا بیشتر حصہ سرحدی صوبے میں شامل تھا۔ برطانوی راج میں، جب 1901ء میں نیا صوبہ 'سرحد' قائم کیا گیا، تو پنجاب کی حدود مزید سکڑ گئیں، اور 1947ء میں یہ صوبہ مذہبی بنیادوں پر تقسیم ہو گیا۔

عزیز احمد یہ بھی لکھتے ہیں کہ یہ دعویٰ کہ برطانوی قبضہ پنجاب اور بالخصوص مسلمانوں کے لیے فائدہ مند ثابت ہوا، درست نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ پنجاب نے ہمیشہ حملہ آوروں کے خلاف مزاحمت کی، اور حملہ آوروں کی حمایت کا تاثر یونینسٹ پارٹی کے زیر اثر دانشوروں کے ذریعے پھیلایا

گیا تا کہ پنجاب کو باقی ہندوستان کے مقابلے میں ''غیر محب وطن'' کے طور پر پیش کیا جا سکے۔

اپنی بات کے حق میں انھوں نے مختلف ادوار میں کی گئی مزاحمت کا تجزیہ کرتے ہوئے ''دراوڑی باشندوں'' کو اس سرزمین کے ابتدائی مزاحمت کاروں کے طور پر پیش کیا ہے، جن کا ذکر ویدی ادب میں بھی ملتا ہے۔ اس کے بعد سکندرِ اعظم کے حملے کے خلاف مقامی لوگوں کی مزاحمت کا ذکر کیا گیا ہے، جس کے نتیجے میں سکندر دریائے بیاس سے آگے بڑھنے سے قاصر رہا۔

وہ اپنی تحقیق اس نکتے پر ختم کرتے ہیں کہ تمام بیرونی حملہ آوروں کے حملے یکساں طور پر لالچ، وسائل کی لوٹ مار اور جنگی تسلط کے محرکات کے تحت تھے خواہ وہ یونانی ہوں یا مسلمان فاتحین۔ وہ محمود غزنوی، شہاب الدین غوری، امیر تیمور اور احمد شاہ ابدالی جیسے شخصیات کے حملوں کو اسلامی تبلیغ کی بجائے سیاسی و معاشی مفادات کے تناظر میں بیان کرتے ہیں۔ محمود غزنوی کی متعدد مہمات کا تجزیہ کرتے ہوئے مصنف کہتے ہیں کہ اگر واقعی مذہبی مقصد کارفرما ہوتا، تو وہ تبلیغی وفود یا ادارے بھیجتا، جس کا کوئی ثبوت تاریخ میں موجود نہیں۔

اسی طرح، شہاب الدین غوری کی جانب سے لاہور پر حملے کو وہ غزنوی وغوری رقابت کا شاخسانہ قرار دیتے ہیں، نہ کہ اسلامی فتوحات کا حصہ۔ امیر تیمور کی خودنوشت تزکِ تیموری کے حوالے سے بھی وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ اس نے حملے سے قبل برصغیر کی دولت کا تفصیلی جائزہ لیا اور جنگ کو محض مذہبی رنگ دیا۔

کتاب میں احمد شاہ ابدالی کے حملوں کو بھی پنجاب کی مقامی مزاحمتی قوتوں کی کمزوری کی وجہ قرار دیا گیا ہے، جس کے بعد انگریزوں کو برصغیر میں استحکام کا موقع ملا۔ مصنف کا استدلال ہے کہ افغانستان، وسطی ایشیا اور خراسان سے آنے والے حکمرانوں کے لائے ہوئے تہذیبی عناصر اکثر اسلامی اقدار سے ہم آہنگ نہیں تھے، کیونکہ ان اقوام نے اسلام کو محض سیاسی حکمت عملی کے طور پر اختیار کیا تھا۔

کتاب کے آخری ابواب میں عزیز احمد نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کو پنجاب کی وحدت کی علامت اور بھگت سنگھ جیسے مجاہدینِ آزادی کو برطانوی سامراج کے خلاف مزاحمت کا استعارہ قرار دیا ہے۔

ان کے نزدیک پنجاب کی مزاحمتی تاریخ کو صرف مذہبی بیانیے میں قید کرنا تاریخی بددیانتی ہے۔

عزیز احمد کی یہ کتاب تاریخی شعور، ثقافتی فہم اور تنقیدی بصیرت کے امتزاج سے عبارت ہے۔ انھوں نے ایک پیچیدہ اور متنازع موضوع کو سادہ، رواں اور مربوط اسلوب میں پیش کرتے ہوئے کئی رائج تصورات کو چیلنج کیا ہے۔ درجنوں متفرق کتابوں، تحقیقی مقالوں اور تاریخی مآخذ سے اخذ کردہ نکات کو انھوں نے مربوط انداز میں یکجا کر کے پنجاب کی تاریخ اور شناخت کو ایک نئی تعبیر دی ہے۔

ان کی اس کتاب سے کئی لوگوں نے اختلاف بھی کیا ہے۔ یہ ایک اہلِ علم کا نقطۂ نظر تھا، جو میں نے آپ کے سامنے پیش کیا۔ میں بھی ان کی کئی باتوں سے اتفاق کرتا ہوں۔

مسلم فتوحات اور زبان و مذہب کے اثرات: برصغیر کا ایک تنقیدی جائزہ

تاریخی مشاہدات سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ جب عرب مسلمان افریقہ کے مختلف علاقوں میں داخل ہوئے تو ان کے اثر سے وہاں کی زبان و ثقافت میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ عربوں کی موجودگی نے نہ صرف مذہبی بلکہ لسانی سطح پر بھی تبدیلی پیدا کی، جس کے نتیجے میں کئی علاقوں میں مقامی زبانوں کی جگہ عربی یا اس سے متاثرہ زبانوں نے لے لی۔ اسی طرح جب ایرانی طاقتیں وسط ایشیا پر قابض ہوئیں، تو انھوں نے فارسی زبان کو نہ صرف بطورِ سرکاری زبان اپنایا بلکہ اسے ایک علمی و ادبی وسیلہ بنا دیا۔ انگریزوں نے امریکہ، آسٹریلیا اور متعدد دیگر مقامات پر مقامی زبانوں کو بتدریج مٹا کر انگریزی کو غالب زبان کے طور پر رائج کیا، اور فرانسیسی نوآبادیاتی نظام نے بھی افریقی ممالک میں فرانسیسی کو سرکاری زبان کا درجہ دیا۔

یہ تمام مثالیں اس امر کی غماز ہیں کہ فاتح اقوام نے اپنی زبان اور ثقافت کو تسلط کے ایک اہم ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔ تاہم، برعکس اس کے، برصغیر میں مسلمانوں کی آمد کے باوجود ایسی کوئی ہمہ گیر لسانی یا مذہبی تبدیلی وقوع پذیر نہ ہو سکی۔

1881ء کی مردم شماری کے مطابق برصغیر (موجودہ بھارت، پاکستان اور بنگلہ دیش) کی مجموعی آبادی تقریباً 25.3 کروڑ تھی، جس میں 75 فیصد یعنی تقریباً 18 کروڑ ہندو، 5 کروڑ مسلمان اور باقی دیگر مذاہب کے پیروکار شامل تھے۔ تقسیمِ ہند سے قبل 1941ء کی مردم شماری کے

مطابق مجموعی آبادی 38.6 کروڑ تک جا پہنچی تھی، جس میں 25 کروڑ ہندو (66 فیصد) اور 9 کروڑ کے قریب مسلمان (24 فیصد) تھے۔ اگر ہم پاکستان اور بنگلہ دیش کو علیحدہ شمار کریں، تو معلوم ہوتا ہے کہ بھارت میں مسلمانوں کی آبادی کل کا صرف 15 فیصد تھی، جب کہ پنجاب میں مسلمان اکثریت میں (54 فیصد) موجود تھے۔

یہ اعداد و شمار اس حقیقت کی نشان دہی کرتے ہیں کہ 712ء سے 1857ء تک کے طویل عرصے میں، جب کہ برصغیر پر مختلف مسلم حکومتیں قائم رہیں، مسلمانوں کی مجموعی آبادی کبھی بھی ایک چوتھائی سے زیادہ نہ ہو سکی۔ اگرچہ ان کا تسلط دہلی جیسے اہم شہروں پر طویل عرصہ قائم رہا، مگر وہاں بھی مسلمان کل آبادی کا 10 فیصد سے زائد نہ ہو سکے۔

اگر ہم مسلمانوں کی فتوحات کو دیگر خطوں (ایران، وسط ایشیا، افریقہ) سے موازنہ کریں، تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان علاقوں میں اکثریتی آبادی نے اسلام قبول کیا، جب کہ برصغیر میں ایسا نہ ہو سکا۔ اس کی بنیادی وجہ یہاں کے قدیم مذاہب، خصوصاً ہندو اور بدھ مت کی جڑیں اور عوامی وابستگی تھی، جنھیں نہ صرف حکومتی سرپرستی حاصل تھی بلکہ ان سے ایک ہمہ گیر ثقافتی نظام بھی وابستہ تھا۔

علاوہ ازیں، برصغیر پر حملہ آور ہونے والے اکثر مسلم حکمرانوں کا بنیادی مقصد مذہبی تبلیغ نہیں بلکہ سیاسی و عسکری توسیع تھا۔ اسلام کی اشاعت کا اصل سہرا ان صوفیائے کرام کے سر جاتا ہے جنھوں نے محبت، رواداری، انسان دوستی اور خدمتِ خلق کے ذریعے دلوں کو فتح کیا۔ یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ان صوفی بزرگوں کو مسلم حکمرانوں کی سرپرستی حاصل رہی، جس سے ان کی دعوتی کاوشوں کو تقویت ملی۔

پنجاب کے عظیم دانشور

اسلامی وصوفی علماء، ادبی وتاریخی اسکالرز، پنجابی شاعری وفلسفہ، جدید دور کے ماہرین تعلیم وسائنسدان

جب میں نے اس موضوع پر کچھ جاننے کی کوشش کی تو مجھے ایک طویل فہرست ملی جس میں ان عظیم دانشوروں کے نام تھے جن کا تعلق پنجاب سے تھا۔ ان میں سے چند کے نام کچھ یوں ہیں۔ ان کا تفصیلی تعارف اس کتاب میں ممکن نہیں ہے۔

پنجاب کے قدیم دور (قبل از اسلام وقبل ازسکھ مت) کے عظیم علماء ومفکرین

1- **پنڈت تاکش (Taxila کے استاد) تقریباً چھٹی صدی قبل مسیح:** تاکش شالہ (Taxila) دنیا کی قدیم ترین جامعات میں شامل تھی، جہاں سنسکرت، وید، فلسفہ، منطق، طب اور ہتھیار سازی پڑھائی جاتی تھی۔ تاکشلا کے کئی استاد بدھ، یونانی اور ایرانی طلبہ کو تعلیم دیتے تھے۔

2- **آچاریہ چانکیہ (کوٹلیہ) 350 قبل مسیح:** ٹیکسلا کے مشہور اسکالر، فلسفی، اور معلم۔ ''ارتھ شاستر'' کے مصنف، جس میں معیشت، ریاست، سیاست اور جنگی حکمت عملی پر بحث ہے۔ موریہ سلطنت کے بانی چندرگپت موریہ کے مشیر۔

3- **پنیہ سہتا (Puniyasei) بدھ مت عالم:** ٹیکسلا اور شمالی پنجاب میں بدھ تعلیمات کے اہم مبلغ۔ ان کا ذکر بدھ مت کے ابتدائی متون میں آتا ہے۔

4- **ناغارجن (Nāgārjuna) دوسری صدی عیسوی:** اگرچہ ان کا اصل تعلق دکن سے بتایا جاتا ہے، لیکن ان کا علمی کام ٹیکسلا اور گندھارا خطے میں بھی پھیلا۔ ''مدھیا مک'' فلسفے کے بانی،

مہایان بدھ مت کے سب سے بڑے فلسفی۔

5- پانینی (Panini) تقریباً 600-500 قبل مسیح: شاہ پور (شمال مغربی پنجاب) سے تعلق۔ ''اشٹادھیایی'' نامی سنسکرت گرامر کی مشہور کتاب کے مصنف۔ دنیا کا پہلا مکمل گرامر سسٹم تیار کیا آج بھی لسانیات میں ان کا ذکر ہوتا ہے۔

6- بھرت منی (Bharata Muni) تیسری صدی قبل مسیح (نٹیا شاستر کے مصنف): اگرچہ ان کا مقام متنازع ہے، لیکن ان کے کام ''نٹیا شاستر'' نے پنجاب میں کلاسیکی رقص، موسیقی اور تھیٹر کو متاثر کیا۔ ٹیکسلا اور گندھارا میں ان کی تعلیمات رائج تھیں۔

7- بدھ بھکشو آریادیو (Aryadeva) تیسری صدی عیسوی: ناگارجن کے شاگرد، گندھارا خطے میں مہایان بدھ مت کے فلسفہ دان۔ منطق اور بودھی دھرم پر مبنی کتب کے مصنف۔

8- گریکو- بدھ مت فلسفی (Greco-Buddhist Thinkers) دوسری ق-م تا 9، دوسری صدی عیسوی: یونانی اور بدھ فکری اثرات کا امتزاج جو پنجاب کے گندھارا خطے میں پایا جاتا ہے (مثلاً پشاور، ٹیکسلا، راولپنڈی)۔ فنون، مجسمہ سازی، اور فکر میں ان کا اہم کردار رہا۔

9- شیلادتی (Shiladitya) ساتویں صدی عیسوی: ہن ریاستوں کے زوال کے بعد پنجاب میں حکمران۔ بدھ مت اور برہمن تعلیمات کو سرکاری سرپرستی دی۔

10- حضرت بابا فرید الدین گنج شکر (1266-1173ء): پنجابی زبان کے اولین صوفی شاعر۔ ان کے اشعار ''گرنتھ صاحب'' میں بھی شامل ہیں

11- حضرت میاں میر (1635-1550ء): قادری سلسلے کے صوفی بزرگ۔ سکھوں کے پانچویں گرو، گرو ارجن دیو کے کہنے پر دربار صاحب کی بنیاد رکھی۔

12- مولانا ثناء اللہ امرتسری (1948-1868ء): اہل حدیث مکتب فکر کے ممتاز عالم۔ مرزا غلام احمد قادیانی کے سخت مخالف اور مناظروں میں شہرت یافتہ۔

13- مولانا عبید اللہ سندھی (1944-1872ء): دیوبند مکتب فکر کے عالم، تحریکِ خلافت اور ریڈیکل اسلامی سوچ کے حامل۔

14-ڈاکٹر محمد اقبال (1877-1938): فلسفی شاعر، مفکر پاکستان، سیالکوٹ سے تعلق۔ ان کی شاعری اور فکر نے برصغیر کی سیاست و تہذیب پر گہرا اثر ڈالا۔

15-خوشونت سنگھ (1915-2014ء): اردو و انگریزی ادیب، مورخ اور صحافی۔ کتاب *Train to Pakistan* اور *History of Sikhs* کے مصنف۔

16-فیض احمد فیض: اردو کے ایک عظیم اور انقلابی شاعر

17-ڈاکٹر اشتیاق احمد (پ- 1947): ممتاز سیاسی سائنسدان، لاہور سے تعلق۔ مشہور کتاب: ''پنجاب کا بٹوارہ: ایک المیہ، ہزار داستانیں''

18-بابا گرونانک دیو جی (1469-1539ء): سکھ مت کے بانی اور فلسفی شاعر۔ محبت، مساوات اور وحدانیت کا پرچار کیا۔

9-وارث شاہ (1722-1798ء):

''ہیر وارث شاہ'' کے خالق، پنجابی زبان کا شاہکار۔ انسانی جذبات، عشق مجازی اور اخلاقی تعلیمات پر مبنی شاعری۔

10- بلھے شاہ (1680-1757ء): صوفی شاعر جنھوں نے عشقِ حقیقی، مذہبی روایات اور معاشرتی ناانصافیوں پر لکھا۔

19-ڈاکٹر عبدالسلام (1926-1996ء): نوبل انعام یافتہ ماہر طبیعیات، جھنگ سے تعلق۔ نظریۂ برقی کمزور تعامل (Electroweak Theory) کے بانی۔

20-ڈاکٹر طارق رحمان: زبان و ادب کے معروف محقق، اردو، پنجابی اور لسانیات پر تحقیقی کام۔

21-پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد: بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے بانی فیکلٹی ڈین۔ اسلامی فکر، بین المذاہب مکالمہ، اور فلسفے کے ماہر۔

22-پروفیسر ہربند سنگھ (1921-1998ء): سکھ ازم کے عظیم اسکالر اور ''انسائیکلو پیڈیا آف سکھزم'' کے ایڈیٹر۔

23-بھائی گرداس (1551-1636ء): سکھ مت کے اولین مصنفین میں شامل، ''واراں'' کے

مصنف، جنھیں گرنتھ صاحب کا کلیدی تشریح نگار مانا جاتا ہے۔

24-گیانی گیان سنگھ (1921-1822ء): سکھ مورخ، ''تواریخِ گوروخالصہ'' اور ''پنڈت پرکاش'' کے مصنف۔

25-ڈاکٹر کرتار سنگھ دگل: سکھ تاریخ، پنجابی ادب اور سوانح نگاری میں نمایاں مقام۔

26-پروفیسر گوپی چند نارنگ (1931ء-2022ء): اردو ادب کے عظیم نقاد، ادبی نظریات اور ساختیات پر اہم کام۔

27-شاہ حسین (1599-1538ء): پنجابی صوفی شاعر، ''کافی'' طرز کے بانیوں میں شمار۔

28-پیر مہر علی شاہ (1959-1837ء): صوفی اسکالر، علم الکلام، تفسیر، اور ردِ قادیانیت میں ممتاز۔

29-امرتا پریتم: میری سب سے پسندیدہ شاعرہ

معزز قارئین! یہ ایک طویل فہرست ہے۔ یہاں سب کا ذکر ممکن نہیں۔ کچھ کا ذکر کرنے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ باقی لوگ غیر اہم ہیں۔ ان چند لوگوں کے نام صرف نمونے کے طور پر دیے گئے ہیں۔ اسی طرح بے شمار کاروباری، سیاسی، سماجی شخصیات کا ذکر بھی کیا جا سکتا ہے۔

پنجاب کی قدیم سرزمین علم و حکمت، فلسفے اور تہذیب کی آماجگاہ رہی ہے۔ ٹیکسلا یونیورسٹی جیسے مراکز تعلیمی دنیا میں اولین شمار ہوتے ہیں۔ یہاں پانینی جیسے لسانی ماہر، چانکیہ جیسے سیاسی مفکر، اور بدھ فلسفی پیدا ہوئے جن کا اثر نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کے علمی و تہذیبی شعور پر بھی پڑا۔ اس سے پنجاب کے بارے میں یہ تاثر کہ یہ میلے ٹھیلے کی ایک قوم ہے، درست نہیں ہے۔ اس تاثر کو دور کرنا ہر پنجابی کا فرض ہے۔

❁ ❁ ❁

برصغیر میں آریاؤں کی آمد
ایک تاریخی ولسانیاتی جائزہ

یہ بات بھی اہم ہے کہ ہندوستان میں آریاؤں کی آمد کا سلسلہ ایک عرصے تک جاری رہا۔ یہ لوگ کسی ایک علاقے سے تعلق نہیں رکھتے تھے اور نہ ہی کسی ایک جگہ آ کر آباد ہوئے۔ اس لیے یہ بات بھی قرین قیاس ہے کہ آریاؤں کے بھی کئی گروہ بن گئے ہوں گے۔ ان ہی کی وجہ سے ہندوستان میں ہندومت کی بنیاد ی۔ قدیم باشندے اپنے طرز زندگی میں فاتحین سے بہت مختلف تھے۔ ہندو دھرم کے آنے کے بعد یہاں پر ذات پات کی بات کو بہت بڑھایا گیا۔ اس کی تفصیل کئی کتابوں میں ملتی ہے۔ اس بارے اس سے زیادہ تفصیل میری اس کتاب کے موضوع سے کافی ہٹ کر ہے۔ البتہ میں مختصر ذکر ضروری سمجھتا ہوں، تاکہ ہم پنجاب کی موجودہ صورتِ حال کو ایک اچھے انداز سے جان سکیں۔

آریاؤں نے ہندوکش کو عبور کیا اور پنجاب تک آ پہنچے۔ آریا کا مطلب محترم یا حکمران ہوتا ہے۔ وہ زراعت پیشہ لوگ تھے ان کا رابطہ ایران سے بھی ہوا۔ اسی طرح ایک لفظ یونانی بھی بولتے تھے۔ یہ لوگ سندھ اور پنجاب کے علاقوں تک ہی محدود رہے۔ آریاؤں کی مقدس کتاب میں سندھ کا بھی ذکر ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب یہ لوگ ہندوکش سے آگے آئے، تو یہ سب سے پہلے سندھ اور پنجاب کے علاقے میں پہنچے۔ جہاں پر دریا بہتے تھے، آب و ہوا مناسب تھی، زمین زرخیز تھی۔ اور سب سے بڑھ کر مقامی لوگ مزاحمت کے قابل نہیں تھے۔ آریا کس دور میں ہندوستان میں داخل ہوئے؟ اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ایک خیال ہے کہ یہ لوگ بنی اسرائیل کے دور میں یہاں آئے۔ ان کا دور 1500 سے لے کر چار ہزار سال قبل مسیح

تک کا مانا جاتا ہے۔ڈاکٹر ولسن نے اپنی کتاب میں یہ دور تین ہزار سال قبل مسیح کا لکھا ہے۔

مختلف لوگوں کی آراء جاننے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ کوئی دو ہزار سال قبل مسیح سے زائد عرصہ ہوا ہوگا، جب یہ لوگ شمال۔مغرب سے گروہوں کی شکل میں آتے رہے۔ یہ سلسلہ ایک ہزار قبل مسیح تک جاری رہا۔اس دوران ان لوگوں نے ہندوستان میں اپنی ایک مضبوط حکومت بھی قائم کی۔اس طرح اس کے بعد شمال سے آنے والوں کے لیے مزاحمت بھی کرنے لگے۔اس کے بعد یہ سلسلہ رکا تو نہیں لیکن بہت کم ہو گیا۔اس کے بعد اکا دکا لوگ ہی آتے ہوں گے۔

اگروال یہ بھی بتاتے ہیں کہ ہڑپہ دور کی بستیاں پنجاب کے میدانی علاقوں میں ایک وسیع علاقے میں پھیلی ہوئی تھیں۔لیکن ان کے اثرات ہمالیہ کے دامن تک ہی تھے۔ہڑپہ تہذیب کے آثار ہمالیہ کے پار نہیں گئے۔اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ پنجاب کی سرحد ہمالیہ کے پہاڑ تھے۔ اسی علاقے میں واقع جموں، ہشیار پور، گرداس پور، شملہ اور سیالکوٹ اس کے آخری شہر تھے۔ پھر وہ وقت بھی آیا جب کسی وجہ سے یہ آبادیاں ختم ہو گئیں۔غالباً یہ دو ہزار سال قبل مسیح کی بات ہے۔

اس کے بعد ایک مرتبہ پھر آبادکاری کا دور شروع ہوتا ہے۔میرے خیال میں یہ کوئی ایک ہزار قبل مسیح کی بات ہو سکتی ہے۔تین صدیاں قبل مسیح سکندر پنجاب پر حملہ کرتا ہے۔اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے، کہ اُس وقت یہاں ایک باقاعدہ نظام دوبارہ سے جنم لے چکا تھا۔اسی دور میں بڑی تعداد میں کاشت شدہ فصلوں کے نشان ملتے ہیں۔پنجاب میں گندم کے علاوہ چاول کی کاشت ہونے لگی۔اس عرصے کے دوران اوزار بھی بننے شروع ہو گئے تھے،لوہا بھی مل رہا تھا۔

اگروال کے کہنے کے مطابق کوئی ایک ہزار سال قبل مسیح میں ستلج اور اس کے اردگرد کے علاقوں میں انسانی بستیوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔دوسری طرف پنجاب کے جنوبی علاقے خشک سالی کی وجہ سے ویران ہوتے گئے۔اسی لیے اس کے بعد پنجاب کے شمال میں، ستلج اور جمنا کے دوآبہ میں آبادی بڑھنے لگی۔یہی وہ دور ہو سکتا ہے جب گنگا کے طاس میں ہند آریوں کی نقل و حرکت میں اضافہ دیکھنے کو ملتا ہے اور مغربی پنجاب میں ایرانیوں کی آمدورفت میں تیزی آتی ہے۔ اس دور کی سب سے اہم بات پنجاب میں آریوں کا آباد ہونا تھا۔

اگروال کا یہ بھی کہنا ہے کہ آریاؤں کی آمد کے بعد سیاسی، معاشرتی، ثقافتی تبدیلیوں کی بڑی وجہ مختلف گروہوں میں روابط اور نقل مکانی ہے۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ وادی سندھ کے لوگوں کی رنگت سیاہ ہوتی تھی۔ ان کے نین نقش بھی افریقی لوگوں کی طرح تھے۔ جبکہ آریاؤں کی رنگت سفید تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی اہم ہے، کہ ایک دوسرا فرق جو جسمانی فرق سے بھی زیادہ اہم تھا، اس کا تعلق زبان اور مذہبی عقائد اور طرزِ زندگی سے تھا۔ آریہ لفظ کسی نسل کے لیے نہیں بولا جاتا تھا۔ یہ درحقیقت شمال مغرب سے آنے والے لوگوں کی ایک ثقافتی پہچان تھی۔ ان کا تعلق وسطی ایشیاء اور یورپ کے مختلف خطوں سے تھا۔ اس لیے قوی امکان ہے کہ یہ لوگ نسلی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہوں۔

اگروال کا یہ بھی کہنا ہے، کہ یہ تصور کرنا ناممکن ہے کہ مقامی لوگ جو غیر آریا تھے، مکمل طور پر ختم ہو گئے یا پنجاب سے چلے گئے تھے۔ اس بات کا قوی امکان سمجھا جاتا ہے، کہ مقامی لوگوں کی اکثریت کو ماتحت سماجی مقام دیا گیا تھا اور معاشرے کے سرکردہ لوگ آریاؤں کے ساتھی بن گئے۔ وہ ان کے ساتھ گھل مل گئے اور ان کی طرح اشرافیہ کا حصہ بن گئے۔ اس سوچ کی بنیاد پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ معاشرتی تقسیم (برہمن، چھتری (کھتری)، ویش اور شودر) کی بنیاد بھی اسی دور میں پڑی۔ یہ بھی تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ پنجاب میں آبادی کی وجہ سے نئے اور پرانے عناصر کے سماجی انضمام کے نتیجے میں ایک ڈھیلا ڈھانچہ معاشرتی نظام بھی وضع ہوا۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ گیارھویں صدی میں ترکوں (محمود غزنوی) کی آمد سے کہیں پہلے جب یونانی، شکا، کشان اور ہن پنجاب میں آئے، تو ان میں کئی پنجاب میں ہی بس گئے۔ اس طرح ان لوگوں نے پنجاب کو اپنا دیس بنا لیا۔ اس کے بعد آنے والے ترکوں، افغانوں، عربوں اور فارسیوں کی ایک بڑی تعداد نے پنجاب کو اپنا گھر بنا لیا۔ آج بھی پنجاب میں یہ لوگ ایک بڑی تعداد میں آباد ہیں۔ اسی دور میں جاٹ اور گجر پنجاب میں آتے ہیں۔ میرے علم کے مطابق ان کی آمد سندھ، تھر، راجستھان کی طرف سے تھی۔ انھوں نے جب پنجاب میں زراعت کو بڑھتے دیکھا، تو وہ بھی پنجاب چلے آئے۔ پچھلے پانچ سو سالوں کے دوران نئے لوگوں کی نقل مکانی پہلے کے مقابلے چھوٹے پیمانے پر ہوئی ہے۔

آریائی اور غیر آریائی لوگوں نے مل کر پنجاب میں زراعت کی ترقی میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ اسی عرصے میں کنویں تعمیر کیے گئے اور ان سے پانی نکالنے کا نظام وضع ہوا۔ اسی عرصے میں بیلوں کی مدد سے کنویں سے پانی نکالنے کے لیے پہیے کی مدد لی گئی۔ اس وجہ سے اس وقت پنجاب کے وہ علاقے بھی جہاں دریا یا چشمے نہیں تھے، آباد ہونے لگے۔ جیسے ہی زراعت پروان چڑھنا شروع ہوئی، گندم اور چاول کی پیداوار میں اضافہ ہونے لگا۔ مویشیوں کے چرنے کے لیے چراگاہوں کا وجود عمل میں آتا ہے۔ زراعت کی دیگر ضروریات پوری کرنے لے لیے کئی پیشے بھی سامنے آتے ہیں، جیسے کمہار، بڑھئی، جولاہے اور تاجر وغیرہ، جو براہ راست یا بالواسطہ طور پر زرعی سرگرمیوں سے جڑے ہوئے تھے۔ اس طرح سب سے پہلے ہمالیہ کے ساتھ کی پٹی، جو گھنے پودوں سے ڈھکی ہوئی تھی، آباد ہوئی۔ اس میں ایک طرف جہاں ہندآریاؤں کی آمد کا کردار ہے، وہیں اس علاقے میں معتدل موسم اور زیرِ زمین میٹھے پانی کی دستیابی نے بھی ایک اہم کردار ادا کیا۔

آریا لوگ بہت بڑے بڑے محلات میں رہتے تھے، اعلیٰ ترقی یافتہ زندگی گزارتے تھے، سونے اور ہیرے جواہرات کے زیورات پہنتے تھے، ایک طرح کا بادشاہی نظام تھا۔ بادشاہ کا حرم کافی وسیع ہوتا تھا اور اس کی بیویوں کی تعداد بھی بہت زیادہ ہوتی تھی۔ ہر راجے کی اپنی فوج ہوتی تھی۔ یہ بھی ایک اہم بات ہے کہ زراعت سے وابستہ لوگوں کو جنگوں کے لیے نہیں لے جایا جاتا تھا ۔کاشتکاروں کو تنگ نہیں کیا جاتا تھا کیونکہ یہ ایک مقدس پیشہ سمجھا جاتا تھا، انھیں ہر طرح سے محفوظ رکھا جاتا تھا۔ معاشرے میں کچھ لوگ حکمران بنے اور کچھ ان کے ماتحت۔ غالباً اُسی وقت یہاں پر ایک معاشرتی تفریق شروع ہوئی، جو آج تک جاری ہے۔ اس وقت ایک طرف آریا تھے جو جنگجو تھے اور جو ایک اعلیٰ درجے کی زندگی گزارتے تھے، دوسری طرف مقامی لوگ تھے جو ان کا حقہ گرم کرتے تھے، ان کے کھیتوں میں ہل چلاتے تھے، ان کے لیے جوتے بناتے تھے اور بھی بہت کچھ۔ آج بھی یہ سلسلہ اسی طرح سے جاری ہے۔

❀❀❀

پنجاب میں بدھ مت اور موہنجودڑو کے اثرات

کیا پنجاب کی تہذیب اور تمدن پر موہنجودڑو یا سندھ کی ثقافت اور تہذیب کے اثرات ہیں؟ یہ ایک اہم موضوع ہے جس پر کئی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ میں نے جس قدر مطالعہ کیا تو میرا یہ احساس ہے کہ دونوں خطے یعنی سندھ اور پنجاب کے درمیان باہمی تعلق نہ صرف صدیوں پر محیط ہے بلکہ بے حد گہرا بھی ہے۔ اس موضوع پر چند گزارشات آپ کی خدمت میں پیش ہیں۔

تاریخ سے یہ تو پتا چلتا ہے کہ سندھ کے باسی ایک خاص مذہب پر عمل کرتے تھے اور ایک ایسی زبان استعمال کرتے تھے جس کے بارے میں مورخین اور ماہرین آثار قدیمہ کا کہنا ہے کہ یہ ابھی بھی ناقابلِ فہم ہے۔ اب تک صرف قیاس آرائیاں ہی کی گئی ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ اہلِ سندھ کے عقائد اور ان کا طرزِ عمل ہند آریاؤں سے کافی حد تک مختلف تھا۔ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ ہند آریاؤں کے ہاں ہر وید میں متعدد دیوتاؤں اور دیویوں کا حوالہ ملتا ہے۔ اپنے دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے قربانی کی رسم کو ہند آریاؤں کی مذہبی عبادت میں ایک مرکزی مقام حاصل تھا، جبکہ موہنجودڑو میں کوئی بھی بت، مندر یا عبادت گاہ نہیں ملتی۔

اس بارے میں نے ڈاکٹر اعجاز علی کی تحقیق پڑھی۔ وہ کہتے ہیں کہ ہندوستان میں تین طرح کے لوگوں کے ڈی این اے ملتے ہیں؛ جنوبی ہندوستان (جس کا تعلق افریقہ سے تھا)، ایرانی اور آریہ۔ انھوں نے موہنجودڑو سے ملنے والی ایک لاش کے ڈی این اے کے ٹیسٹ سے یہ بات ثابت کی ہے کہ موہنجودڑو کے لوگوں کے ڈی این اے میں جنوبی ہندوستان اور ایرانی لوگوں سے مماثلت ملتی ہے۔ جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان کا تعلق آریہ نسل سے نہیں ہے۔

جب کسی آسمانی آفت کی وجہ سے سندھ سے پنجاب کی طرف نقل مکانی شروع ہوئی، تو اس

کے نتیجے میں سندھ اور آریائی لوگوں کے درمیان نئے تعلقات اور ایک نئی تہذیب کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ نقل مکانی نہ صرف جغرافیائی تبدیلیوں کا باعث بنی بلکہ اس نے ثقافتی، سماجی اور مذہبی سطح پر بھی نئے رجحانات کو جنم دیا۔ یہ اس دور کی بات کی ہے، جب بدھ مت کے عروج کا زمانہ تھا۔ بدھ مت کی تعلیمات نے ہندوستان میں ایک بڑی تبدیلی کا آغاز کیا اور یہ صرف مقامی لوگوں تک ہی محدود نہیں رہی، بلکہ کئی بیرونی ممالک کے بادشاہوں نے بھی بدھ مت کو اپنانا شروع کیا۔ خاص طور پر جب عوام کی بڑی تعداد بدھ مت کی پیروکار تھی، تو یہ بادشاہوں کے لیے معاشرتی استحکام کا حصہ بننے کا ایک ذریعہ تھا۔ بدھ مت کو اپنانے کی وجہ محض مذہب نہیں تھی، بلکہ ایک سماجی نظام کے طور پر اس کے اصولوں اور تعلیمات نے لوگوں میں مساوات، محبت، اور ہمدردی کی روح پیدا کی تھی۔ اس کا اثر ہندوستان کے مختلف حصوں کے ساتھ ساتھ، ہندوستان سے باہر بھی محسوس کیا گیا۔

بدھ مت کے ماننے والے بادشاہوں نے پنجاب میں بدھ مت کے فن اور فن تعمیر کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ پنجاب میں بدھ مت کے آثار، جیسے کہ اسٹوپا (Stupa)، مٹھ (Monasteries)، اور دیگر بدھ مت کی عمارات کی مثالیں اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ بدھ مت کی تعلیمات نے یہاں کے ثقافتی منظرنامے پر گہرے اثرات مرتب کیے تھے۔ اس دور کے بادشاہوں نے بدھ مت کو نہ صرف مذہب کے طور پر تسلیم کیا بلکہ اس کی ثقافت اور فنون کو بھی ترقی دی۔

پنجاب میں بدھ مت کے اثرات کا عروج اور اس کے فنون کا ارتقاء اس بات کا غماز ہے کہ مذہب اور ثقافت کے امتزاج نے اس خطے میں ترقی کی نئی راہیں کھولیں۔ آج بھی ہم اس دور کے آثار کو دیکھ سکتے ہیں، جو ہمیں اس بات کی یاددہانی کراتے ہیں کہ ہر تہذیب کا اپنا کردار ہوتا ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ بدلتا اور نیا رنگ اختیار کرتا ہے۔

اس موضوع پر D. C. AHIR نے ایک نہایت ہی مفید کتاب لکھی ہے۔[1] میں اس کتاب سے جو جان سکا وہ پیشِ خدمت ہے۔

---

[1] *Buddhism in the Punjab, Haryana and Himachael Pradesh*, BUDDHIST WORLD PRESS

اس کتاب میں پنجاب، ہریانہ، اور ہماچل پردیش کے علاقوں میں بدھ مت کے اثرات اور اس کی ترقی کو بہت اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔ بدھ مت کی تعلیمات نے کیسے لوگوں کے ذہنوں میں ایک نئی سوچ کو جنم دیا اور اس نے مذہبی، ثقافتی اور سماجی زندگی میں کس طرح تبدیلیاں کیں یہ ایک اہم موضوع ہے، جس پر کئی لوگوں نے بات کی ہے۔

بدھ بادشاہوں، سنتوں، علماء، اور شاعروں نے پنجاب کی ثقافت پر جو اثرات ڈالے، یہ ان کی مخصوص خدمات، فنون لطیفہ، اور فکری بصیرت کی صورت میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ان کی تحریریں، فلسفے، اور فنی تخلیقات نے ایک بڑے پیمانے پر لوگوں تک بدھ مت کے پیغام کو پھیلایا۔ کئی حملہ آوروں کے نتیجے میں بدھ مت کو زوال کا سامنا کرنا پڑا۔ بدھ مت کی تباہی میں اہم کردار کرنے والوں میں گپتا، غزنوی، غوری، مغل اور افغان سرِ فہرست ہیں۔ بدھ مت کی موجودگی نے پنجاب کی ثقافت کو ایک نئے رنگ میں ڈھالا۔ بدھ مت کے اثرات ہندومت اور دیگر ثقافتوں پر بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ پنجاب کی نسبت ہماچل پردیش کے علاقوں میں بدھ مت کے پیروکار ایک بڑی تعداد میں موجود ہیں۔

پنجاب میں بدھ مت خود مہاتما بدھ کے ذریعے آیا تھا (483-563 BCE or 480 BCE)۔ بدھا کے انتقال کے تین سو سال بعد بھی پنجاب میں بدھ مت کے ماننے والوں کی ایک کثیر تعداد آباد تھی۔ اس کے بعد کوئی ایک ہزار سال تک بدھ مت اس خطے کے لوگوں کا غالب مذہب رہا ہے۔ یہ وہ دور ہے جب بدھ مت کے علماء سنت،، شاعروں اور فلسفیوں کی ایک بڑی تعداد نے پنجاب کی ثقافتی ترقی میں ایک ہم کردار ادا کیا۔ اسی دور کے لکھے ہوئے واقعات جیسے مشہور غیر روایتی پالی بدھ مت کا کام، ملندا پنہا (بادشاہ ملندا کے سوالات)، یونانی بادشاہ ملندا یا مینینڈر اور قابل احترام بھیکھو ناگا سینا کے درمیان مکالمے، (جو دوسری صدی قبل مسیح میں پنجاب کے سیالکوٹ میں ہوا تھا) اس بات کا ثبوت ہیں کہ کبھی بدھ مت یہاں کے خاص و عام کا مذہب تھا۔

بدھ مت اور بادشاہ

تاریخ سے یہ بھی جاننے کو ملتا ہے کہ ہندوستانی بدھ مت کی سیاسی تاریخ میں چار بادشاہوں،

یعنی اشوک (تیسری صدی قبل مسیح)، ملندا (دوسری صدی قبل مسیح)، کنشک (پہلی صدی عیسوی) اور ہرشا (ساتویں صدی عیسوی) نے بدھ مت کو اپنایا اور اسے ہندوستان میں ایک وسیع علاقے تک پہنچانے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان چار بادشاہوں میں تین کا تعلق پنجاب سے تھا، پنجاب میں ہی یہ پروان چڑھے، اور چوتھے، یعنی اشوک اعظم نے بھی مگدھ کے تخت پر بیٹھنے سے پہلے پنجاب میں وقت گزارا تھا۔ ٹیکسلا (تیکشلا) میں کچھ عرصہ مور یہ حکمران بھی رہے۔ اس طرح ان بادشاہوں کی سرپرستی میں ہندوستان میں ہر جگہ بدھ مت کے آثار ملتے ہیں۔ بدھ مت پنجاب میں ساتویں صدی عیسوی کے آخر تک کافی پھل پھول رہا تھا۔ اس کے بعد ہندوستان پر بیرونی حملوں (سندھ پر عرب اور شمالی پنجاب پر افغانوں اور وسطی ایشیا کے حملہ آوروں) کی وجہ سے یہاں پر رونما ہونے والی سیاسی اور مذہبی ہلچل کی وجہ سے جہاں ہندو مت مغرب سے شمال کی طرف منتقل ہوا، وہیں بدھ مت بھی پنجاب کے میدانی علاقوں میں گم ہو گیا۔ مگر پہاڑی علاقوں میں بیرونی حملوں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا اور وہاں آج بھی بدھ مت کے ماننے والے ایک مناسب تعداد میں بستے ہیں۔

گوتم بدھ جو اب مہاتما بدھ کے نام سے جانے جاتے ہیں، چھٹی صدی قبل مسیح میں ساکیوں کے دارالحکومت کپیلا وستو کے قریب لومبینی میں اس علاقے کے بادشاہ سدھوڈن اور ملکہ مہامایا کے ہاں پیدا ہوا تھا، جو اب نیپال کا حصہ ہے۔ وہ ایک عیش وعشرت، خوبصورت زندگی گزار رہا تھا۔ جیسے ہی وہ بڑا ہوا، اسے دھیرے دھیرے اپنے اردگرد کے ماحول سے تنگی محسوس ہونے لگی۔ جب اس کی عمر 29 سال تھی، اس نے انسانی مصائب کے مسئلے کا حل تلاش کرنے کا ارادہ کر لیا تھا اور اپنے اکلوتے بیٹے، محل اور عیش وآرام کی زندگی چھوڑنے اور سچ کی تلاش کرنے گھر سے نکل گیا۔ اس طرح سے اس نے ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھی۔

تاریخ بتاتی ہے کہ اگلے 45 سالوں تک، مہاتما بدھ یعنی گوتم بدھ مسلسل سفر میں رہے۔ وہ شہر شہر، اور گاؤں گاؤں، محبت اور ہمدردی کے اپنے پیغام کی تبلیغ کرتے رہے۔ ان کی تبلیغ کا مرکزی

نقطہ مساوات اور انسانی وقار تھا۔انھوں نے کسی گروہ یا طبقے کو کسی دوسرے پر ترجیح نہیں دی۔وہ ذات، رنگ،عقیدہ اور حیثیت سے قطع نظر تمام لوگوں کو اپنے ساتھ ملاتے رہے۔ان کی جماعت میں امیر اور غریب، اعلیٰ اور مقدس سب شامل تھے۔وہ زیادہ تر شمال مشرقی ہندوستان تک محدود رہے۔اس کے علاوہ بھی وہ ہندوستان کے کئی علاقوں میں گئے۔اسی دوارن وہ پنجاب بھی آئے۔ ان کی وجہ سے ہی یہاں گندھارا تہذیب نے جنم لیا۔

اسی موضوع پر ایک طویل مقالہ Vishal Sood نے *BUDDHISM IN PUNJAB* کے نام سے لکھا۔[1] ان کی تحقیق کے مطابق ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ جس قدر بدھ مت ہندوستان سے باہر مختلف مما لک میں پھیلا، اس کے مقابلے میں نیپال اور ہندوستان میں، جہاں سے یہ شروع ہوا، اس کا اثر کم ہے۔ ہندوستان میں یہ اب بھی مقبول ہے اور ہندوستان کی کچھ شمالی ریاستوں میں ایک مقبول مذہب کے طور پر جانا جاتا ہے۔ بدھ مت کی جڑیں شمالی ہندوستان کی کچھ ریاستوں، ریاست جموں و کشمیر، ہماچل پردیش، بہار اور اتر پردیش میں ہیں۔ بدھ مت شمالی ہندوستان سے شروع ہوا اور پھر یہ ہندوستان کے مختلف حصوں سے نکل کر دنیا بھر میں پھیل گیا۔شمالی ہندوستان کی ریاستیں قدیم ہندوستان میں بدھ مت کا اہم مرکز تھیں۔ بدھ مت کے زیادہ تر اہم واقعات بدھ کی زندگی کے دوران اور ان کی موت کے بعد شمالی ہندوستان کے علاقے میں ہی رونما ہوئے۔

یہ بات بھی وشل سود نے لکھی ہے کہ پنجاب دراصل ایک بدھ ریاست تھی،جس پر بدھ مت کے پیروکار حکمران تھے۔ پنجاب میں بدھ مت کی تاریخ کئی ہزار سال پرانی ہے، جب بدھ نے پنجاب کا دورہ کیا اور کرو میں اپنا خطبہ دیا جو پنجاب کا ایک گاؤں تھا۔اس طرح تاریخی ریکارڈ کے مطابق بدھ مت سب سے پہلے پنجاب میں خود بدھا نے پھیلایا تھا۔ پنجاب پر بہت سے بدھ بادشاہوں نے بھی حکومت کی اور پنجاب کے بہت سے قصبے اور شہر بدھ مت کے اہم مرکز بن گئے۔لدھیانہ کے ضلع سمرالہ کی تحصیل میں سنگھول کے مقام پر پائے جانے والے آثارِقدیمہ نے

[1] Serials Publications *Man in India*, 96(4):951-962©

قدیم دور میں پنجاب میں بدھ مت کی موجودگی ثابت کی ہے۔ اس خطے میں کھدائی کی گئی سب سے اہم نوادرات اسٹوپا تھے۔ سٹوپا کی کھدائی 1985ء میں محکمہ آثار قدیمہ نے کی تھی۔

پنجاب میں بدھ مت کی تاریخ ہمیں ہمیشہ کتابوں کے ذریعے بتائی گئی ہے۔ سنگھول میں کھدائی سے قبل اس ریاست میں بدھ مت کے ماضی کے وجود پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔ اس جگہ کی دریافت اور کھدائی نے ریاست پنجاب میں بدھ مت کے پھیلاؤ اور بقا کے بارے میں مطالعہ کرنے میں کافی مدد کی ہے۔ اس نے پنجاب میں بدھ مت کے وجود کے مطالعہ کا دائرہ بھی وسیع کر دیا ہے۔

ہندو مت سے پہلے بھی پنجاب میں بدھ مت موجود تھا اور اس وقت بھی یہ دوسرے مذاہب کے ساتھ موجود ہے۔ مختلف کتابوں، جرائد، مضامین اور رپورٹس کے مطالعے سے ہمیں پنجاب میں بدھ مت اور دنیا کے مختلف کونوں میں بدھ مت کے پھیلاؤ کے حوالے سے بہت سی معلومات ملی ہیں۔ سنگھول اور روپڑ کے آثار قدیمہ کے مقامات کی دریافت پنجاب میں بدھ مذہب کے وجود کی اصلیت کو ثابت کرتی ہے۔

میرے خیال میں یہ وہ دور ہے جب پنجاب پھر سے آباد ہوا۔ اسی عرصے میں شہر آباد ہوتے ہیں۔ لکھنے پڑھنے کا رواج شروع ہوتا ہے۔ ہمالیہ کے قدموں میں سندھ ساگر دوآب میں ٹیکسلا (تکشیلا) جیسے شہر کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ اس شہر کی تعمیر میں سڑکوں کے نیٹ ورک، نکاسی آب کے نظام اور پیشہ ورانہ شعبوں میں ترقی جیسے کام ہونے شروع ہوئے۔ اسی عرصے میں سیالکوٹ جو چناب کے بالائی رچنا دوآب میں واقع ہے، کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ جالندھر دوآب میں جالندھر شہر بستا ہے۔ جمنا کے دائیں کنارے پر اندرا پرستھ تھا۔ دریائے سندھ کے اس پار گندھارا کی راجدھانی پشکلاوتی تھی۔ یقینی طور پر ان کے علاوہ اور بھی شہر اور قصبے آباد کیے گئے ہوں گے۔ یہی وہ دور ہے جب گنگا کے طاس کو ہندوستان کے شمال مغرب سے ملانے والی سڑک بنتی ہے۔ یہ سڑک کابل سے لے کر گنگا تک ہمالیہ پہاڑوں کے پاس سے گزرتی ہے۔ شاہراہِ ریشم کی بنیاد بھی اسی دور میں پڑتی ہے۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اب کی بار آبادی پنجاب کے بالائی علاقے میں ہوتی ہے۔ پنجاب کا جنوب پہلے کی طرح آباد نہیں رہا۔ اس کی بڑی وجہ اس علاقے کی آب وہوا

اور زمین کا زراعت کے لیے مفید نہ ہونا تھا۔ اس کا ذکر یوآن چوانگ نے بھی کیا ہے جو ساتویں صدی کے اوائل میں پنجاب سے گزرا تھا۔

بدھ مت اور پنجاب میں زرعی وثقافتی ترقی

بدھ مت کے عروج کے دور میں زراعت میں اضافی پیداوار کی وجہ سے ہندوستان کی مغربی اور وسطی ایشیا کے ساتھ شاہراہِ ریشم کی وجہ سے رابطے کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ جس کے نتیجے میں ہندوستان کا وسطی ایشیا اور چین سے رابطہ ہوتا ہے۔ یہ بات بھی اسی دور کی ہے کہ یہاں براہمی رسم الخط کی ابتداء ہوتی ہے جسے پنجاب میں موریا (اسے موریہ بھی لکھا جاتا ہے) خاندان کے دورِ حکومت میں رواج ملا۔ چندر گپت موریہ کے پوتے اشوک نے بدھ مت کی ترویج کی خاطر ہندوستان بھر میں کتبے لکھوائے، جو آج بھی ملتے ہیں۔

یہ بھی ایک اہم بات ہے کہ اشوک نے جو نوشتہ جات تیار کروائے ان میں مختلف علاقوں میں مختلف رسم الخط استعمال کیا گیا تھا۔ ہندوستان کے جنوب میں پائے جانے والے نوشتہ جات پر مختلف رسم الخط ہے، جبکہ پنجاب میں دوسرا رسم الخط ملتا ہے۔ میں نے مانسہرہ میں اس دور کی پتھروں پر لکھی گئی تحریر دیکھی ہے، جسے پڑھنے کی اب تک کوشش کی جارہی ہے۔ اسی طرح کی تحریریں مانسہرہ سے اوپر گلگت کے علاقے میں بھی پائی جاتی ہیں۔ اس سے یہ بات تو ثابت ہے کہ اس دور میں پنجاب میں پڑھنے لکھنے کا رواج شروع ہو چکا تھا۔ یہ کوئی تین سے چار صدیاں قبل مسیح کی بات سمجھی جاسکتی ہے۔ اشوک جسے اشوکہ بھی لکھا جاتا ہے کی وفات 232 قبل مسیح میں ہوتی ہے۔ جبکہ چندر گپت موریہ کا دور 295 قبل مسیح کا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ قبل مسیح کے پہلے ہزار میں پنجاب میں آبادکاری کا سلسلہ اس کے شمال میں تیزی سے بڑھا۔ جبکہ اس کے جنوبی علاقے اس قدر تیزی سے ترقی نہ کر سکے۔

اسی دور میں یہ دیکھا جاسکتا ہے کے پنجاب کے شمالی علاقوں میں، جہاں کئی دریا بہتے تھے، کی وجہ سے بہت سے مقامات پر زراعت کا کام شروع ہوا۔ اگر آپ پنجاب میں بہتے ہوئے

دریاؤں کے نقشے کو دیکھیں تو آپ کو یہ علم ہوگا کہ گنگا کے بعد جمنا سے لے کر اٹک تک، سات دریا بہتے نظر آتے ہیں، جس میں جمنا شامل نہیں ہے۔گنگا کے بعد جمنا جس کے کنارے دہلی واقع ہے، اس کے بعد لدھیانہ کے پاس سے گزرتا ہوا دریائے ستلج، جالندھر اور امرتسر کے درمیان سے گزرنے والا دریائے بیاس، جو جالندھر سے نیچے جا کر آپس میں مل جاتے ہیں۔اس کے بعد دریائے راوی جس کے کنارے لاہور آباد ہے۔اس کے بعد گجرات کے پاس دریائے چناب اور جہلم کے پاس دریائے جہلم۔اٹک کے مقام پر دریائے سندھ میں دریائے کابل آن ملتا ہے۔سب سے پہلے بیاس اور ستلج اکٹھے ہوتے ہیں اور ستلج دریا بنتا ہے۔اس کے بعد جہلم اور چناب دونوں جھنگ کے پاس ملتے ہیں اور پھر راوی بھی ملتان کے قریب جا کر ان دونوں دریاؤں سے مل جاتا ہے اور بہاولپور کے قریب جا کر ستلج بھی مل جاتا ہے۔اس کے بعد راوی (بیاس اور ستلج سمیت) چناب (جہلم سمیت) سندھ (کابل سمیت) تینوں دریا بہاولپور سے کچھ آگے جا کر آپس میں مل جاتے ہیں۔کابل پہلے ہی اٹک کے مقام پر سندھ سے مل چکا ہوتا ہے۔اس طرح پنج ند کے مقام پر یہ سات دریا (بیاس، ستلج، راوی، چناب، جہلم، سندھ اور کابل) آپس میں ملتے ہیں۔اس جگہ کا نام پنجنند ہے یعنی پانچ ندیاں۔اس کے بعد اس دریا کو دریائے سندھ کہا جاتا ہے۔پھر یہ دریا (دریائے سندھ) کئی سو میل کا سفر کر کے بحیرہ عرب میں جا گرتا ہے۔اس لیے میں پنجنند کے مقام کو تین نند کہنا زیادہ مناسب سمجھتا ہوں یا پھر ست نند۔

اور اگر آپ پنجاب کے نقشے کو دیکھیں تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جہاں پانی تھا، وہیں آبادی ہوئی۔یہ دریا ایک دوسرے کے کافی قریب بہتے تھے۔ان کے درمیانی علاقے کو دوآب کہا جاتا تھا۔زمین بھی بے حد زرخیز تھی، پانی بھی دستیاب تھا۔اس لیے جب پہلے ایک ہزار سال عیسوی میں ہڑپہ اور موہن جو دڑو کی تہذیبوں کے خاتمے کے بعد شمالی پنجاب کے دہلی سے لے کر اٹک تک، شمال میں پہاڑی علاقوں کے سلسلوں سے لے کر یعنی مانسہرہ راولپنڈی اور دہلی سے نیچے جنوب میں تھر سے پہلے علاقوں میں تیزی سے جہاں پر آبادکاری ہوئی۔میرے خیال میں

یہیں سے پنجاب کی تہذیب کا آغاز ہوتا ہے۔

دوسرے ہزار سال میں پنجاب میں آبپاشی کے ذرائع میں بہتری آئی۔ اسی دور میں یہاں کنوؤں کی مدد سے خاص طور پر دریائے چناب اور دریائے جمنا کے درمیان آبپاشی میں بے حد سہولت ہوئی (میرے آباؤ اجداد اسی علاقے سے تعلق رکھتے تھے۔ ہم ریاست پٹیالہ کے شہر سرہند میں رہتے تھے۔ ہمارے بزرگ بھی بیلوں کی مدد سے کنوؤں سے پانی نکال کر آبپاشی کا کام کرتے تھے، بعد میں اس علاقے میں سرہند نہر تعمیر کی گئی تھی)۔ انھی علاقوں میں تغلق دور میں بھی نہری نظام ترتیب دیا گیا تھا۔ انگریزوں کے دور میں پنجاب میں ایک بہترین نہری نظام کی بنیاد رکھی گئی۔ اگروال کے مطابق سترھویں صدی میں، شاہ جہاں نے بھی شمالی پنجاب میں نہر جمنا تعمیر کی تھی۔

❁ ❁ ❁

زمانہ قدیم میں پنجاب میں سیاسی بیداری اور مختلف ریاستوں کی ابتداء

پنجاب میں انسانی آبادکاری کا آغاز قبل مسیح کے زمانے میں ہوا، اور اس کے ساتھ ہی یہاں ایک ابتدائی سیاسی نظام بھی وضع ہونا شروع ہوا۔ اسی دور میں ایک مضبوط تہذیب وتمدن کی بنیاد رکھی گئی اور متعدد ریاستیں معرضِ وجود میں آئیں۔ انھی ابتدائی ریاستی نظم ونسق کے تناظر میں ہمیں ٹیکسلا کا ذکر بھی ملتا ہے، جو اس زمانے کا ایک اہم شہر تھا۔ معروف قدیم مفکر پانینی نے سندھ اور ستلج کے درمیان واقع کئی ریاستوں کا تذکرہ کیا ہے، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ پنجاب میں سیاسی و تمدنی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔

یہ وہی دور ہے جب ایران کی اخمینی (Achaemenid) سلطنت سے تعلق رکھنے والے حملہ آور پنجاب میں داخل ہوئے۔ ان حملوں کے نتیجے میں یہاں موجود کئی ریاستیں ختم ہو گئیں۔ بعد ازاں، 326 قبل مسیح میں سکندر اعظم کے حملے نے بھی مقامی ریاستی نظم کو شدید نقصان پہنچایا۔

اسی تاریخی تناظر میں پنجاب اور فارس کے درمیان رابطے کو تقویت ملی، جس کے باعث ٹیکسلا جیسے شہر کو نیا عروج حاصل ہوا۔ سکندر کے حملے کے بعد ہی، بلکہ اسی زمانے میں، برصغیر میں موریہ سلطنت کا قیام عمل میں آیا، جس نے ایک وسیع وعریض علاقہ اپنے زیرِ تسلط لیا۔ گندھارا (موجودہ شمالی پنجاب) اور سندھ کے قریبی علاقے بھی اس سلطنت کا حصہ بنے۔ اشوک اعظم کے دور میں، جو موریہ سلطنت کا عہدِ عروج تھا (تیسری صدی قبل مسیح)، پنجاب اس سلطنت کے مغربی صوبے کا اہم خطہ بن چکا تھا۔

اس وقت ٹیکسلا صوبائی دارالحکومت تھا، جو ایک عظیم شاہراہ کے ذریعے مشرق میں پاٹلی پترا (موجودہ پٹنہ) سے منسلک تھا، اور مغرب میں ایران و بحیرہ روم کی دنیا تک رسائی رکھتا تھا۔ یہ شاہراہ صرف تجارتی ہی نہیں، بلکہ عسکری مقاصد کے لیے بھی بے حد اہم تھی۔ اسی کے کنارے پنجاب کے متعدد اہم شہر آباد تھے، جن میں پشاور، نوشہرہ، چارسدہ، اٹک، ٹیکسلا، راولپنڈی، جہلم، گجرات، لاہور، امرتسر، جالندھر، لدھیانہ، پانی پت اور دہلی شامل تھے۔ یہ شاہراہ آج بھی ''گرینڈ ٹرنک روڈ (جی ٹی روڈ)'' کے نام سے معروف ہے۔آج بھی پنجاب کی آبادی کا زیادہ تر حصہ اس تاریخی شاہراہ کے اطراف میں آباد ہے۔جنوبی پنجاب میں نمایاں آبادکاری اس وقت ممکن ہوئی جب انگریزوں کے دور میں جدید نہری نظام وضع کیا گیا۔ اس سے قبل، زیریں پنجاب کا بیشتر حصہ غیر آباد یا کم آبادی والا تھا، جبکہ بالائی پنجاب آبادی کا مرکز رہا۔

پنجاب کے آبادیاتی توازن پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ ایک ہزار سال کے دوران آبادی کا جھکاؤ شمالی (بالائی) علاقوں کی طرف رہا ہے۔جنوبی پنجاب کی آبادکاری کے لیے آبی وسائل کا انتظام رفتہ رفتہ کیا گیا، اور بیسویں صدی میں انگریز حکومت نے مصنوعی نہری نظام کے ذریعے جنوبی علاقوں کو قابلِ کاشت بنایا۔

برطانوی دورِ حکومت میں ایک نیا تجربہ کیا گیا، جس میں ایک دریا کا پانی دوسرے دریا میں منتقل کر کے نئی نہریں بنائی گئیں، جس سے ویران علاقے آباد ہونے لگے۔ سندھ طاس معاہدے کے بعد جب پاکستان کے مشرقی علاقوں کو پانی کی قلت کا سامنا ہوا، خاص طور پر راوی اور ستلج کا پانی بھارت کے حصے میں جانے کے بعد، تو بہاولنگر جیسے اضلاع شدید متاثر ہوئے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے دریائے جہلم اور چناب کا پانی متاثرہ علاقوں تک پہنچایا گیا۔

اس ضمن میں اپر جہلم کینال قابلِ ذکر ہے، جو منگلا ڈیم سے نکل کر ضلع میرپور (آزاد کشمیر) اور ضلع گجرات سے گزرتی ہوئی، ضلع منڈی بہاؤالدین میں رسول بیراج کے قریب دریائے چناب میں شامل ہوتی ہے۔ اسی طرح ہیڈ قادرآباد سے ہیڈ بلوکی تک ایک اور نہر بنائی گئی، اور پھر ہیڈ بلوکی سے مزید نہریں نکال کر مغربی پنجاب کے جنوب مشرقی علاقوں کو سیراب کیا گیا۔ ان

اقدامات کے باعث جنوبی پنجاب میں آبادکاری میں تیزی آئی، لیکن آج بھی شمالی پنجاب کے علاقوں کی آبادی، جنوبی علاقوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ گھنی ہے۔

ہندوؤں کی مقدس کتابیں: رامائن، مہابھارت اور بھگوت گیتا

ہندوؤں کی مقدس کتابیں رامائن، مہابھارت اور بھگوت گیتا کا تعلق شمالی ہندوستان سے ہے۔ ان کتابوں میں بیان کردہ کئی واقعات پنجاب میں وقوع پذیر ہوئے۔ اسی لیے میں نے پنجاب میں ہونے والے ان واقعات کے تناظر میں ان کتابوں کا ذکر کرنا مناسب سمجھا۔ آگے چل کر میں کئی اور تحریکوں کا بھی ذکر کروں گا جن کا آغاز پنجاب سے ہوا، جیسا کہ سکھ مذہب۔

رامائن ایک ضخیم کتاب ہے، جس میں تقریباً چوبیس ہزار اشعار (اشلوک) شامل ہیں۔ یہ کتاب سنسکرت زبان میں لکھی گئی ہے۔ اس میں شہزادہ رام، اس کی بیوی سیتا، اور اس کے وفادار ساتھی ہنومان کی زندگی کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کا بنیادی تصور ''دھرم'' (یعنی فرض، سچائی، انصاف)، عقیدت، اور نیکی و بدی کے درمیان کشمکش کے گرد گھومتا ہے۔

اس کتاب کے پانچ اہم کردار ہیں:

رام– مرکزی کردار، جسے دیوتا وشنو کا اوتار سمجھا جاتا ہے۔

سیتا– رام کی عقیدت مند بیوی، جسے راون نے اغوا کر لیا تھا۔

لکشمن– رام کا چھوٹا بھائی، جو جلاوطنی میں اس کے ساتھ جاتا ہے۔

ہنومان– بندر دیوتا اور رام کا مخلص بھکت، جو اپنی طاقت اور وفاداری کے لیے مشہور ہے۔

راون– لنکا کا دس سروں والا شیطان بادشاہ۔

کہانی کی ابتدا ایودھیا کے بادشاہ دشرتھ کے ہاں رام کی پیدائش سے ہوتی ہے۔ رام اور سیتا کی شادی ہوتی ہے اور وہ خوشی سے رہتے ہیں، لیکن ایک محل کی سازش کے باعث رام کو جلاوطنی اختیار کرنا پڑتی ہے۔ دورانِ جلاوطنی سیتا کو راون اغوا کر لیتا ہے، جسے واپس لانے کے لیے ایک عظیم جنگ لڑی جاتی ہے۔ جنگ کے اختتام پر راون شکست کھاتا ہے۔

اس کتاب میں تین اہم موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہے:

دھرم (فرض/صداقت)

عقیدت اور محبت

اچھائی بمقابلہ برائی

رامائن نہ صرف ہندوؤں کی ایک مذہبی رہنما کتاب ہے بلکہ قدیم ہندوستانی معاشرت کی سماجی و اخلاقی اقدار کی عکاسی بھی کرتی ہے۔ اس کے کردار آج بھی ہندو ثقافت میں بہادری، قربانی اور اخلاقی دیانت کی علامت سمجھے جاتے ہیں۔

اسی دور کی ایک اور مشہور کتاب مہابھارت ہے، جس میں ایک عظیم جنگ کا احوال بیان کیا گیا ہے۔ یہ ہندو ادب کی دو بڑی مہا کاویوں میں سے ایک ہے (دوسری رامائن ہے)۔ مہابھارت صرف ایک کہانی نہیں بلکہ ہندو مذہب، رسوم، عقائد، وفاداری، محبت، بہادری، ثقافت اور فلسفے کا ایک ہمہ گیر بیانیہ ہے۔ مہابھارت کو دنیا کی طویل ترین داستان سمجھا جاتا ہے، جس میں ایک لاکھ اشلوک (اشعار یا اقوال) شامل ہیں اور اسے اٹھارہ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس کے اہم کرداروں میں ایک طرف پانڈو (پانچ بھائی) اور دوسری طرف کورو (سو بھائی) شامل ہیں۔ ان دونوں کے درمیان کروکشیتر کی عظیم جنگ لڑی گئی، جو تخت و تاج کے حصول کی کشمکش پر مبنی تھی۔

مہابھارت کی کہانی ایک ہی خاندان کی دو شاخوں پانڈو اور کورو کے گرد گھومتی ہے، جو آپس میں رشتہ دار تھے لیکن اقتدار کی لڑائی میں مدِ مقابل آ گئے۔ اس کتاب میں کئی چھوٹی چھوٹی کہانیاں، فلسفیانہ گفتگو اور انسانی جذبات کی گہرائی موجود ہے۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ یہ کتاب چوتھی صدی قبل مسیح یا اس سے پہلے تحریر کی گئی تھی۔ [1]

اسی کتاب میں بھگوت گیتا شامل ہے، جو کروکشیتر کی جنگ کے آغاز سے قبل پانڈو اور کورو کے درمیان جذباتی اور اخلاقی کشمکش پر مبنی مکالمہ ہے۔ اس میں ارجن (پانڈو شہزادہ) اور اس کے رتھ بان کرشن جی کے درمیان ایک اہم گفتگو شامل ہے۔

[1] https://www.worldhistory.org/Mahabharata

جنگ سے قبل ارجن جب اپنی فوج کے سامنے دشمن کی صف میں اپنے قریبی رشتہ داروں کو کھڑا دیکھتا ہے تو وہ جذباتی ہوکر لڑنے سے انکار کر دیتا ہے۔ کرشن جی اسے سمجھاتے ہیں کہ ظلم کے خلاف لڑنا دھرم ہے، اور فرض میں کوتاہی نہیں کی جا سکتی۔ یہ طویل مکالمہ بھگوت گیتا کے نام سے مشہور ہے۔

بھگوت گیتا کے چند اہم موضوعات درج ذیل ہیں:

دھرم (فرض/صداقت)

انصاف اور بدلہ

قسمت بمقابلہ آزاد ارادہ

جنگ کی اخلاقی نوعیت

فلسفیانہ بصیرت

بھگوت گیتا مہابھارت کا نہایت اہم جز ہے، اور ہندو دھرم کا فلسفیانہ اور روحانی بیانیہ ہے۔ یہ افراد کو اخلاقی اور روحانی الجھنوں سے نکلنے میں رہنمائی فراہم کرتی ہے۔ اس میں ہندو مذہب کے تین بڑے نظریات پر زور دیا گیا ہے:

بھکتی (عقیدت)

جنان (علم)

کرما (عمل)

مہاتما گاندھی نے کہا تھا: ''جب تک بھگوت گیتا ہے، تب تک ہندو دھرم باقی ہے۔''

بھگوت گیتا نے ہندوستانی ثقافت، فن، ادب اور فلسفے پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ یہ صرف ایک مذہبی کتاب نہیں بلکہ انسانی تجربات، اخلاقیات اور جذبات کا جامع بیان ہے۔ اسی لیے اسے عالمی ادب میں ایک لازوال کلاسک کا درجہ حاصل ہے۔ [1]

---

[1] بھگوت گیتا کا اردو ترجمہ روشن لال نے کیا ہے، جسے فکشن ہاؤس نے شائع کیا ہے
https://books.kitabosunnat.com/Books_Bata/6110/Bhagavad-Gita.pdf

یہ عظیم جنگ کیشتر میں لڑی گئی، جو پنجاب کا ایک تاریخی علاقہ ہے۔ یہ مقام کرنال اور انبالہ کے درمیان دہلی سے تقریباً ڈیڑھ سو کلومیٹر کے فاصلے پر ہریانہ صوبے میں واقع ہے۔

پنجاب میں بدھ مت کے عروج کا تاریخی وتہذیبی مطالعہ

ہندوستان بھر میں بدھ مت دور کے بے شمار آثار ملتے ہیں۔ کبھی یہ مذہب پنجاب کا سب سے بڑا اور غالب مذہب تھا۔ پھر ایسا کیا ہوا کہ یہ مذہب تقریباً ختم ہو گیا اور اس کی جگہ ہندو مت نے لے لی؟ اس پہلو کو سمجھے بغیر پنجاب کی تاریخ کو مکمل طور پر سمجھنا ممکن نہیں۔

یہ ایک خوشگوار اتفاق ہے کہ مجھے دنیا کے مختلف حصوں میں بدھ مت کے آثار دیکھنے کا موقع ملا۔ افغانستان میں بامیان کے مجسمے، گلگت اور مانسہرہ میں اشوک کے دور کے کتبے، نیپال میں بدھ اسٹوپے، برما میں بدھ مت کی نشانیاں، سری لنکا میں بدھ کے مجسمے، تھائی لینڈ میں بدھ مت کے آثار، مدراس میں بدھ مت کی باقیات، میانوالی کے قریب بدھ مت کے مندر، اور چین کے کئی شہروں میں بدھ مندروں سمیت دنیا کے مختلف علاقوں میں بدھ مت کی موجودگی دیکھی۔

یہ سب بیان کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ایک وقت تھا جب بدھ مت ہندوستان کے ساتھ ساتھ افغانستان میں بھی پھیلا ہوا تھا، اور خاص طور پر پنجاب میں واقع ٹیکسلا اس کی ایک عظیم درسگاہ تھی۔ لیکن آج بدھ مت کے پیروکار ہندوستان میں بہت کم رہ گئے ہیں، اور پنجاب میں تو یہ مذہب تقریباً ناپید ہو چکا ہے۔ اس عظیم مذہبی اور سماجی تبدیلی کا مختصر احوال درج ذیل ہے۔

پنجاب میں بدھ مت کے زوال اور ہندو مت کے احیاء کا تاریخی جائزہ

اس سے پہلے کہ میں پنجاب میں ہندو مت اور بدھ مت کی تاریخ پر بات کروں، یہ مناسب ہوگا کہ ان دونوں مذاہب کے درمیان فرق پر روشنی ڈالی جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض لوگ بدھ مت کو ہندو مت ہی کی ایک شاخ یا اس کی اصل سے پھوٹا ہوا مذہب سمجھتے ہیں۔

میرے خیال میں یہی وہ نکتہ ہے جس کی بنا پر جب ہندو مت کمزور ہوا، اور کئی بڑے بادشاہوں نے بدھ مت اختیار کر لیا، تو بدھ مت کو زبردست عروج حاصل ہوا۔ پھر ایک وقت آیا

کہ ہندومت نے دوبارہ سیاسی اور سماجی طاقت حاصل کی، اور بدھ مت کو ہندوستان، خاص طور پر شمالی ہندوستان (جس میں پنجاب بھی شامل تھا) میں زوال کا سامنا کرنا پڑا۔ البتہ بدھ مت کا یہ زوال صرف ہندوستان تک محدود رہا؛ جاپان، چین، کوریا، تھائی لینڈ، برما اور دیگر ممالک میں آج بھی بدھ مت ایک غالب مذہب کی حیثیت رکھتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا پنجاب اور ہندوستان سے بدھ مت کے زوال کا سبب محض ہندومت تھا؟ ان صفحات میں ہم اسی اہم سوال کا تحقیقی اور تاریخی جائزہ لیں گے۔

اس موضوع پر منگلہ اور دھرم ویر کی ایک کتاب *Buddhism vs Hinduism: A Comparative Study* دستیاب ہے، جس میں اس موضوع پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ ہندومت اور بدھ مت کے درمیان فرق کو سمجھنے کے لیے ان کے تاریخی ماخذ، بنیادی عقائد، رسومات، صحیفوں، اور سماجی مضمرات جیسے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ اسی حوالے سے ایک اور اہم کتاب *Hinduism and Buddhism* بھی میرے مطالعے میں آئی، جسے انندا کینٹیش کوماراسوامی (Ananda Kentish Coomaraswamy) نے تحریر کیا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر محققین کی تحریریں پڑھنے کے بعد جو کچھ سمجھ سکا، اس کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔

برہمنیت، جسے آج کل ہندومت کہا جاتا ہے، دنیا کے قدیم ترین مذاہب میں شمار ہوتی ہے۔ بعض آرا کے مطابق بدھ مت کی ابتدا بھی ہندومت سے ہوئی۔ بدھ، جنھیں بعد میں مہاتما بدھ کے نام سے جانا گیا، ایک ہندو شہزادے تھے جو ایک دن دنیاوی زندگی ترک کر کے سچ کی تلاش میں نکلے۔ ان کی تعلیمات بعد میں بدھ مت کے نام سے معروف ہوئیں۔ بدھ مت اور ہندومت کے درمیان متعدد مماثلتیں موجود ہیں۔ دونوں کرما، تناسخ، اور عدم تشدد (اہنسا) کے اصولوں پر یقین رکھتے ہیں۔ تاہم، ان کے درمیان ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ ہندومت ایک خالق خدا پر ایمان رکھتا ہے، جبکہ بدھ مت میں خالق خدا کا تصور موجود نہیں۔ یہی وہ نمایاں فرق ہے جو ان دونوں مذاہب کو فکری طور پر جدا کرتا ہے۔

تاریخی طور پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ مہاتما بدھ چھٹی صدی قبل مسیح میں قدیم ہندوستانی معاشرت کے تناظر میں اصلاحی تحریک کے بانی کے طور پر ابھرے۔ان کی تحریک کا آغاز اُس وقت کی ویدک یا برہمنی روایات کے خلاف ردِعمل کے طور پر ہوا، جو اس وقت برصغیر میں غالب تھیں۔مہاتما بدھ کی پیدائش اور پرورش بھی ہندو معاشرے میں ہوئی تھی۔ہندومت کسی ایک بانی یا مقدس کتاب سے منسوب نہیں بلکہ ایک طویل ارتقائی عمل کا نتیجہ ہے۔

ابتدائی دور میں بدھ مت اور ہندومت کا ثقافتی و مذہبی پس منظر مشترک تھا۔دونوں مذاہب قدیم ہندوستانی تہذیب کی آغوش میں پروان چڑھے اوران کے درمیان قریبی روابط موجود تھے۔بدھ مت کی مقبولیت نے اس وقت کے مروجہ برہمنی مذہبی خیالات کو چیلنج کیا اور ایک متبادل فکری و اخلاقی نظام پیش کیا۔کئی بادشاہوں نے بدھ مت کو اختیار کیا، جس سے اس کی ترویج کو فروغ ملا۔وقت کے ساتھ بدھ مت اور ہندومت میں نظریاتی فاصلے پیدا ہونے لگے۔بدھ مت نے ویدوں کی بالادستی، ذات پات کے نظام، اور آتمان (ابداعی روح) جیسے تصورات کو مسترد کیا اور ذہنی تبدیلی اور نروان کے حصول کو اہمیت دی۔اس کے برعکس ہندو مت نے موکش (نجات) کے حصول کے لیے دھرم کی ادائیگی اور مختلف یوگاؤں (کرما یوگا، بھکتی یوگا، جنایوگا) کو اپنانے پر زور دیا۔

باوجود اختلافات کے، بعض ادوار میں ہندو اور بدھ معاشرے باہم جُڑے بھی نظر آتے ہیں۔بعض ہندو حکمرانوں نے بدھ مت کی سرپرستی کی، اور بہت سے ہندو فلسفی بدھ مت کے نظریات سے متاثر بھی ہوئے۔مختلف علاقوں میں دونوں مذاہب کے ماننے والے ایک ساتھ رہتے رہے، اور کئی تہذیبی و مذہبی رسومات میں اشتراک بھی نظر آتا ہے۔کچھ مؤرخین کا خیال ہے کہ ''ہندوازم'' ایک نسبتاً جدید اصطلاح ہے، جو متنوع مذہبی روایات اور فکری دھاروں کو یکجا کرنے کی ایک کوشش ہے۔اس نقطۂ نظر کے مطابق ہندومت اور ویدک مذہب کے درمیان ایک ارتقائی تسلسل موجود ہے، جس کے تحت ویدک مذہب رفتہ رفتہ ہندومت میں ڈھل گیا۔

میری رائے میں بدھ مت کی ابتدا جزوی طور پر ویدک یا برہمنی مذہب کے ردِعمل میں

ہوئی، جو اس وقت برصغیر کا غالب مذہب تھا۔ بدھ مت نے برہمنی اقدار کو چیلنج کرتے ہوئے ایک نئی فکری روایت کو جنم دیا، جسے برہمنوں نے بھی کسی حد تک قبول کیا۔ اگر ہم سکھ مت کی مثال لیں تو واضح ہوگا کہ سکھ مذہب کے بانی گرونانک بھی ایک ہندو خاندان میں پیدا ہوئے تھے اور انھوں نے ایک نئی فکر کی بنیاد رکھی جو ہندو مت سے مختلف تھی، اگرچہ اس میں کئی مشترک عناصر بھی پائے جاتے ہیں۔

بدھ مت کی تاریخ کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بدھ مت، ہندو مت، اور جین مت کے نظریاتی ماخذ مشترک تھے، تاہم ان کے درمیان جداگانہ شناخت بھی موجود رہی۔ ان تینوں مذاہب کا آغاز ایک ہی جغرافیائی خطے سے اور تقریباً ایک ہی دور میں ہوا۔ یہ مذاہب اگرچہ اسلام، عیسائیت اور یہودیت سے مختلف تھے، لیکن باہم فکری رشتہ رکھتے تھے۔

آخر میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ہندو مت اور ویدک مذہب کے درمیان تعلق پر محققین کے مختلف آرا موجود ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ ہندو مت ویدک مذہب ہی کا تسلسل ہے، جبکہ کچھ اس کو ایک علیحدہ مذہب سمجھتے ہیں۔ بہرحال، ہندو مت، بدھ مت، اور جین مت تینوں کا تعلق قدیم ویدک روایات سے کسی نہ کسی شکل میں ضرور ملتا ہے، جو ان کے تاریخی و فکری اشتراک کو ظاہر کرتا ہے۔

آریائی اقوام کا مذہبی و ثقافتی اثر اور ہندو مذہب کی ارتقائی تشکیل

آریاؤں کے آنے کی وجہ سے یہاں کی زبان میں یونانی، لاطینی اور دیگر کئی زبانوں کے الفاظ بھی شامل ہوئے، جو آج بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس کا تجربہ مجھے خود بھی ہوا ہے۔ میں اپنی تعلیم کے سلسلے میں چیک ریپبلک میں رہا ہوں۔ چیک زبان کے کئی الفاظ ہماری پنجابی زبان سے مشابہت رکھتے تھے، جیسے: گھی، روزنامہ، دادا، دن وغیرہ۔ اسی دور میں وید بھی لکھے گئے۔ ان میں سب سے مشہور رِگ وید ہے (’رِگ‘ کا مطلب نظم یا شاعری ہے اور ’وید‘ کا مطلب جاننا یا علم ہے)۔ اس کا لغوی مفہوم ’’علم کا سرچشمہ‘‘ ہے۔ ہندوؤں کے نزدیک یہ سب سے اعلیٰ اور نہایت

مقدس کتاب مانی جاتی ہے۔

میرا یہ احساس ہے کہ بیشتر مؤرخین نے سب سے زیادہ اعتبار رِگ وید ہی پر کیا ہے۔ آریاؤں کو ابتدا میں شہری زندگی پسند نہیں تھی۔ وہ قبائلی انداز میں آباد تھے۔ بعد میں انھوں نے شہر بسانے شروع کیے، علم و ہنر کی طرف متوجہ ہوئے، جنگی ساز وسامان تیار کرنے لگے، موسم کے مطابق گھروں کی تعمیر کی، ریاستی بندوبست پر بھی توجہ دی، نہریں کھودیں اور کپڑا بننے سمیت کئی صنعتوں کو اپنایا۔

اسی دور میں یہاں کے مقامی باشندوں کو نیچ ذات کا درجہ دیا گیا اور معاشرے میں ذات پات کے نظام کی بنیاد رکھی گئی۔ ذات پات کی تقسیم کا آغاز کسب یا پیشے کی بنیاد پر ہوا۔ کسی کو خدمت کے لیے چُنا گیا، کسی کو جنگ وجدل کے لیے، اور کچھ کو مذہبی اختیارات یا گدی پر بٹھایا گیا۔ سید محمد لطیف نے اس دور کی تہذیب وتمدن پر نہایت تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، جو خاصی دلچسپ ہے۔ انھوں نے آریاؤں کے شادی بیاہ کے طریقہ کار، کھانے پینے کے انداز اور رہن سہن کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔ اسی دور میں رامائن اور مہا بھارت جیسی دو عظیم داستانوں نے جنم لیا۔ رامائن تقریباً ایک ہزار سال قبل مسیح کے زمانے میں لکھی گئی تھی۔

❀ ❀ ❀

پنجاب کے حکمران
پانچ سو سال قبل مسیح سے راجہ پورس تک

پنجاب کی تاریخ ایک ایسی داستان ہے جو مختلف تہذیبوں، اقوام اور حکمرانوں کے اثرات کی عکاسی کرتی ہے۔ یہ سرزمین متعدد عظیم تہذیبوں کا سنگم رہی ہے، اور اس کی تاریخ میں سکندر اعظم، راجہ پورس، ہندو شاہی خاندان اور دیگر حملہ آوروں کی کہانیاں شامل ہیں۔ یہ تاریخی واقعات نہ صرف پنجاب کی شناخت کو تشکیل دیتے ہیں بلکہ جنوبی ایشیا کی تاریخ میں بھی کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ پنجاب کی تاریخ میں بے شمار واقعات اور حکمرانوں کی داستانیں ملتی ہیں، جو مختلف ادوار میں وقوع پذیر ہوئیں۔ ان کی تفصیلی وضاحت اس خطے کی گہرائی سے سمجھ بوجھ میں معاون ثابت ہوسکتی ہے۔ چنانچہ اگر آپ اس موضوع میں مزید دلچسپی رکھتے ہیں، تو مخصوص خاندانوں، تہذیبوں اور تاریخی واقعات پر توجہ مرکوز کرنا ایک جامع تاریخی تصویر پیش کرے گا۔

میں اس سفرنامے میں چوتھی صدی قبل مسیح سے لے کر بیسویں صدی تک کے تقریباً چوبیس سو سالہ تاریخی سفر کا ایک مختصر خاکہ پیش کر رہا ہوں، جو یقیناً قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث ہوگا۔

چوتھی صدی قبل مسیح کے دوران، پنجاب کی سرزمین مختلف طاقتور سلطنتوں کے زیرِ اثر رہی۔ مصر، یونان اور ایران کے بادشاہوں نے یہاں تجارتی مفادات اور سیاسی غلبے کی خاطر اپنی موجودگی قائم کی۔ ان کی آمد کی وجوہات میں تجارتی راستوں پر کنٹرول، زرعی وسائل اور علاقائی اثر و رسوخ شامل تھے۔ وہ یہاں کب آئے، کیوں آئے اور کتنی مدت قیام کیا، اس بارے میں تاریخی شواہد بہت کم دستیاب ہیں۔ تاہم، یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی دور میں یہ اقوام اس خطے پر حکومت کرتی رہیں۔ بلوچوں، پنجابیوں اور پختونوں کا ڈی این اے اس بات کا ثبوت ہیں

کہ کبھی یہاں ایرانی پر آئے تھے۔

پنجاب کی قدیم تاریخ کا نسبتاً مستند اور معتبر آغاز راجہ پورس کے دور سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد سے لے کر تقسیمِ پنجاب تک کی تاریخ خاصی حد تک محفوظ ہے۔ چنانچہ اس سے پہلے کے ادوار کی تفصیلات یہاں بیان نہیں کی جا رہیں۔ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ سکندر اعظم کے بعد سے لے کر ہندو شاہی خاندان کے زوال تک، اس خطے پر کئی حملہ آور آئے جن کے بارے میں مختلف مستند اور غیر مستند آراء ملتی ہیں۔ اسی ہزار سالہ عرصے میں حکومت کرنے والے چند اہم خاندانوں کا ذکر میں یہاں اختصار کے ساتھ کروں گا، تاکہ تحریر غیر ضروری طوالت سے بچی رہے اور قاری کے لیے بوجھل نہ ہو۔

اس تحریر کی تیاری کے دوران کئی کتابوں اور مضامین سے استفادہ کیا گیا، جن میں Upinder Singh کی کتاب

A History of Ancient and Early Medieval India: From the Stone Age to the 12th Century(PB)

قابل ذکر ہے۔ اس کے علاوہ ایک مفید ویب سائٹ

https//:infinitylearn.com/surge/study-materials/English/history /know-who-all-ruled-india

سے بھی اہم معلومات حاصل ہوئیں۔

یہاں میں ایک وضاحت ضروری سمجھتا ہوں: ہندوستان ایک وسیع و عریض خطہ رہا ہے، اس لیے اکثر ایسا ہوا کہ ایک ہی دور میں اس کے مختلف حصوں پر مختلف حکمرانوں کی حکومت قائم تھی۔ مثلاً ایک ہی وقت میں جنوبی ہند پر انگریزوں کی عملداری، وسطی ہند میں نظام کی حکومت، مخصوص علاقوں پر مراٹھوں کا غلبہ، دہلی میں مغلوں کی حکمرانی، اور پنجاب میں ابدالی خاندان کا اقتدار؛ یہ سب ایک ہی تاریخی دور میں موجود تھے۔

چنانچہ جب میں اس سفر نامے میں کسی ایک خاندان کی حکومت کا ذکر کروں گا، تو ممکن ہے کہ اسی دور میں کسی دوسرے علاقے میں کوئی اور حکمران برسرِ اقتدار رہا ہو۔ اس وضاحت کا مقصد

قارئین کو کسی تاریخی مغالطے سے بچانا ہے۔

شمالی برِصغیر میں چھٹی اور پانچویں صدی قبل مسیح کے سیاسی و تہذیبی حالات کا تحقیقی جائزہ:

تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ پانچویں صدی قبل مسیح میں ہریانکا خاندان (Haryanka Dynasty) نے شمالی ہندوستان کے ایک وسیع علاقے پر مشتمل ریاست قائم کی۔ان کی حکومت میں موجودہ بہار، جھارکھنڈ، مغربی بنگال، اڑیسہ، بنگلہ دیش اور نیپال کے بعض علاقے شامل تھے۔ ان تفصیلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ پنجاب اس ریاست کا حصہ نہیں تھا۔

اس ریاست کا صدر مقام مگدھ تھا، جو اب پاٹلی پترا کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ہریانکا خاندان کا ایک معروف بادشاہ بمبیسارا تھا۔ یہ خاندان پہلے سے حکمران برہدرتھ خاندان (Barhadrath Dynasty) کو شکست دے کر اقتدار میں آیا، جسے بریہدرت (Brihadratha) نے قائم کیا تھا۔

ہریانکا خاندان کا ابتدائی دارالحکومت راجگیر تھا۔اس خاندان کا سب سے طاقتور بادشاہ اجاتشترو تھا، جو بمبیسارا کا بیٹا تھا۔تاریخ کی روایت کے مطابق، اجاتشترو نے اپنے والد بمبیسارا کو قید کرلیا اور بزورِطاقت مگدھ کے تخت پر بیٹھ گیا۔اس کے بعد، اجاتشترو نے اپنی سلطنت کی حدود کو وسعت دی اور کوسل اور کاشی سمیت کئی چھوٹی ریاستوں کو فتح کرلیا۔

اجاتشترو کے دورِحکومت میں مگدھ شمالی ہندوستان کی سب سے طاقتور ریاست بن چکی تھی۔ناگاداسا کا ہریانکا خاندان کا آخری حکمران تھا۔میرے خیال میں یہ وہ دور ہوسکتا ہے جب ہریانکا خاندان نے پنجاب پر جزوی یا مکمل حکمرانی کی ہو۔ یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ یہ لوگ مقامی باشندے تھے، باہر سے حملہ آور نہیں آئے تھے، جس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ ان کی حکومت مشرقی ہندوستان اور بنگال جیسے علاقوں تک محدود رہی۔

یہ سوال بھی اہم ہے کہ آیا یہ لوگ آریہ (Aryan) تھے یا ہندوستان کے قدیم مقامی باشندے؟ بدقسمتی سے، مجھے اس سوال کا کوئی واضح جواب نہیں مل سکا۔

شیشونا گا خاندان (Shishunaga Dynasty)

544 قبل مسیح تا 413 قبل مسیح

ہر ینکا خاندان کا خاتمہ اس کے ایک قابلِ بھروسہ فرد، شیشونا گا، نے کیا اور شیشونا گا خاندان کے دورِ حکومت کی بنیاد رکھی۔ اس نے ہر ینکا خاندان کے خلاف عوام کو بغاوت پر اکسایا اور اس کی قیادت کی، جس کے نتیجے میں اس نے مگدھ کے تخت پر قبضہ کر لیا اور پاٹلی پترا کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ اس کے دور میں سندھ، کراچی، لاہور، ہرات، ملتان، قندھار، ویلور کے علاوہ راجستھان کے

موجودہ جے پور تک اس کی سلطنت کا حصہ بنے۔ میرا خیال ہے کہ یہ پہلی بار تھا کہ ایک سلطنت کے قبضے میں افغانستان کے جنوبی اور مغربی علاقے بھی شامل تھے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ عمومی رائے کہ ہندوستانی لوگوں نے کبھی بیرونی حملے نہیں کیے، درست نہیں ہے۔ شیشونا گا سلطنت کی توسیع نے ثابت کیا کہ ہندوستانی طاقتیں بھی خارجہ مہمات میں سرگرم رہی ہیں۔ آخرکار، شیشونا گا سلطنت کا خاتمہ نندا خاندان کے عروج کے ساتھ ہوا، جو ہندوستان کی تاریخ میں ایک اہم تبدیلی کی علامت تھی۔

اس سے میں یہ نتیجہ اخذ کرتا ہوں کہ جو بات عام طور پر کہی جاتی ہے کہ ہندوستانی لوگوں نے بیرونِ ملک حملے نہیں کیے، وہ درست نہیں ہے۔ یہ کئی مرتبہ ہوا ہے۔

نندا خاندان: 345 قبل مسیح تا 321 قبل مسیح

ایک سو سال سے زیادہ عرصے تک شیشونا گا خاندان ایک وسیع خطے پر حکومت کرتا رہا۔ اس

کے بعد نندا خاندان کا دور شروع ہوتا ہے، جنھوں نے شیشوناگا کے علاوہ کئی دوسری ریاستوں کو بھی شکست دی، جیسے کوروس، کالنگ وغیرہ۔ انھوں نے اپنی سلطنت کو مزید وسیع کیا اور اس بار ہندوستان کے جنوبی علاقے بھی اس سلطنت میں شامل ہو گئے۔ پنجاب تو پہلے ہی ان کی راجدھانی کے علاقے میں شامل تھا۔ مہاپدمہ نندا کے نو بیٹوں میں سے ایک نندا سلطنت کا آخری حکمران تھا، جس کے پاس ایک طاقتور فوج تھی۔ اس فوج میں مضبوط گھڑسوار، ہاتھی اور پیادہ فوجی شامل تھے۔ دھن نند، نندا خاندان کا آخری شہنشاہ تھا جسے چندرگپت موریہ نے شکست دی اور اس نے موریہ سلطنت قائم کی۔ موریہ سلطنت تقریباً تین صدیوں تک قائم رہی، جس کا عروج اشوک اعظم کے دور میں تھا، اور بعد میں اسے زوال کا سامنا کرنا پڑا۔

راجہ پورس: پنجاب کا حکمران جس نے سکندر سے جنگ کی

راجہ پورس (جسے پارس بھی لکھا جاتا ہے) 326 قبل مسیح میں ہندوستان کے شمالی علاقے، جن میں پنجاب سرِ فہرست تھا، کا ایک بہادر حکمران تھا۔ راجہ پورس کی ریاست جہلم اور چناب کے دریاؤں کے درمیان واقع تھی۔ اس کی شہرت کی اصل وجہ سکندر کے حملے کے وقت اس سے جنگ کرنا تھا۔ اس کی ریاست وسطی ایشیا، فارس اور برصغیر پاک و ہند کے سنگم پر واقع تھی، جس کی وجہ سے اسے خاص اہمیت حاصل تھی۔ اس علاقے میں کئی ہندوستانی قبائل بھی شامل تھے۔ یہ علاقہ انتہائی زرخیز تھا اور یہاں کے لوگ بے حد خوشحال تھے۔ یاد رہے کہ یہ دور آریاؤں کی آمد کے بعد کا ہے۔

راجہ پورس کے دورِ حکومت میں سکندر اعظم نے فارس اور وسطی ایشیا کا بیشتر حصہ فتح کرنے کے بعد دریائے سندھ کو عبور کیا اور برصغیر پاک و ہند میں اپنے حملے کا آغاز کیا۔ اس کا مقصد اپنی سلطنت کو بڑھانا اور پنجاب کے علاقے کی سلطنتوں کا سامنا کرنا تھا۔ ٹیکسلا کے حکمرانوں نے سکندر کا ساتھ دیا، جبکہ راجہ پورس نے اس کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

راجہ پورس، جو ایک طاقتور بادشاہ تھا، ایک بڑی اور اچھی طرح سے لیس فوج کی قیادت بھی

کر رہا تھا۔ پورس کے پاس ایک مضبوط فوج تھی، جس میں جنگی ہاتھی، پیادہ، گھڑسوار دستے اور رتھ شامل تھے۔سکندر کے ساتھ جنگ دریائے جہلم کے قریب ہوئی، جہاں پورس نے سکندر کی پیش قدمی روکنے کی کوشش کی۔ میں نے جو کتابیں پڑھی ہیں، ان کے مطابق یہ جنگ منگلا کے قریب ہوئی۔ کچھ کا کہنا ہے کہ یہ جنگ میانی تحصیل بھل وال کے قریب ہوئی۔ دونوں مقامات کے درمیان کافی فاصلہ ہے۔واللہ اعلم باالصواب

راجہ پورس کے پاس بڑی تعداد میں جنگی ہاتھی ہونے کے باوجود سکندر کی اچھی تربیت یافتہ افواج کی حکمت عملیوں کا مقابلہ کرنے سے قاصر تھا۔ مقدونیہ کی فوج، جس میں اعلیٰ گھڑسوار، تیر انداز اور بھاری پیادہ شامل تھے، نے اس جنگ میں برتری حاصل کی۔ راجہ پورس کی شکست کے باوجود، اس کی بہادری اور جنگ میں عمدہ سلوک نے اسے سکندر کی طرف سے بہت عزت سے نوازا گیا۔ جب پورس کو گرفتار کیا گیا تو سکندر، جو اس کی ہمت اور قیادت سے متاثر ہوا، اس سے پوچھا کہ وہ کیسا سلوک چاہتا ہے۔تاریخی واقعات کے مطابق، پورس نے مشہور ایک سطری جواب دیا:

''میرے ساتھ ایک بادشاہ کی طرح سلوک کرو۔''

جو اس کے وقار اور عزت کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس پر سکندر نے اپنے حسنِ سلوک سے متاثر ہو کر نہ صرف پورس کو آزاد کر دیا بلکہ اسے اپنی سلطنت برقرار رکھنے کی اجازت بھی دی۔ اس کے بعد سکندر جنوبی پنجاب کی طرف بڑھا۔ اس کی حکومت کا زمانہ 323 قبل مسیح سے 316 قبل مسیح مانا جاتا ہے۔

❀ ❀ ❀

عہدِ سکندر کے بعد پنجاب کے حکمرانوں کی تاریخی وسیاسی تشکیل

Harynaka Dynsaty



Photo Credit:
http://bkumarauthor.wordpress.com/2023/03/16/dynasty-haryanka/

اگروال یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ سکندر کے حملے کے بعد، دوسری صدی قبل مسیح میں یونان کے ایک بادشاہ نے بھی ، جسے بدھ مت کی کتابوں میں ''ملیندا'' کے نام سے جانا جاتا ہے، پنجاب پر حکومت کی، اوراس کی سلطنت دریائے راوی تک پھیلی ہوئی تھی۔ حال ہی میں متھرا (جسے میتھورا بھی کہا جاتا ہے، جو بھارت کا ایک اہم شہر ہے) سے یونانی سکے دریافت ہوئے ہیں، جو اس بات کا ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ یہاں کبھی یونانیوں کی حکومت قائم تھی۔ بعد ازاں، اس علاقے پر کشانوں نے بھی اقتدار قائم کیا۔ پنجاب، جس میں اُس وقت شمالی ہندوستان کا بڑا حصہ شامل تھا، ایک ایسی وسیع سلطنت کا حصہ بن گیا جو افغانستان اور وسطی ایشیا تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس سلطنت کا دارالحکومت پشکلاوتی (چارسدہ کا قدیم نام) تھا، جو پشاور کے قریب واقع ہے۔ مجھے اس شہر کو بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔

تاریخی شواہد سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تیسری صدی عیسوی میں ساسانی سلطنت کے

بادشاہ، یعنی فارس کے بادشاہ اردشیر نے بھی یہاں حکومت کی۔ اس کے دور کی متعدد نشانیاں ٹکسال، فنِ تعمیر کی نئی جہتوں، اور بدھ مت کے فروغ کی صورت میں آج بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔اس کے بعد کئی صدیوں تک پنجاب مختلف حکمرانوں کے زیرِ اقتدار رہا۔تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ پانچویں صدی عیسوی میں پنجاب پر ہنوں نے قبضہ کرلیا، اوران کے بادشاہ کا نام تورمان تھا۔اس خاندان کے زوال کے بعد، ساتویں صدی کے اوائل میں ہرش خاندان نے دریائے بیاس تک اپنا اثرورسوخ قائم کیا۔

ایک وقت ایسا بھی آیا جب کشمیر کے بادشاہوں نے پنجاب کے شمالی علاقوں، جو کشمیر سے متصل تھے، پر بھی اپنا تسلط قائم کرلیا۔ان کے بعد نویں اور دسویں صدی میں پنجاب کے شمال مغرب میں ایک شاہی خاندان برسرِ اقتدار رہا۔یہ وہ دور تھا جب ہمیں پنجاب کی ایک واضح جغرافیائی اور سیاسی تقسیم دکھائی دیتی ہے۔ جمنا اور ستلج کے درمیانی علاقے تورمان کے قبضے میں تھے۔جنوبی پنجاب (ملتان تک) پر عربوں نے حکومت قائم کی۔شمال میں جموں اور کانگڑہ کی ریاستیں وجود میں آئیں، اوردوردراز پہاڑی علاقوں میں چمبہ اورکولو نے اپنے قدم جما لیے تھے۔

یوں، تقریباً ایک ہزار سال کے عرصے میں پنجاب میں مختلف ریاستیں قائم ہوتی رہیں۔اس دوران مختلف قبائل کی نقل مکانی بھی ہوتی رہی، اور نئے علاقے آباد ہوئے۔اُس وقت تک مسلمان صرف سندھ کے راستے ملتان تک پہنچے تھے۔ابھی مسلمان کابل سے ہوکر ہندوستان کی سرحد تک نہیں پہنچے تھے۔بلوچستان کے علاقے بھی اُس وقت تک مقامی اقوام ہی کے زیر اثر تھے۔

موریہ سلطنت: برصغیر کی پہلی عظیم مرکزی حکومت (321ق،م،184ق،م)

سکندرِ اعظم نے 326 قبل مسیح میں ہندوستان پر حملہ کیا۔اس کے حملے کے کچھ سال بعد، چندرگپت موریہ نے چانکیہ (کوٹلیہ) کی مدد سے 322 قبل مسیح میں مگدھ میں موریہ سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اس نے اپنی سلطنت کو پانچ ملین مربع کلومیٹر سے زائد رقبے تک وسعت دی، جو موجودہ بھارت، پاکستان اور بنگلہ دیش کے مجموعی رقبے سے بھی زیادہ ہے (جن کا مشترکہ رقبہ

تقریباً چار ملین مربع کلومیٹر ہے)۔اس طرح 316 قبل مسیح میں موریہ سلطنت دنیا کی سب سے بڑی سلطنتوں میں شمار ہونے لگی۔ چندر گپت موریہ کا پوتا اشوک اعظم، موریہ خاندان کا سب سے طاقتور بادشاہ تھا، جس نے تقریباً پورے برصغیر پر قبضہ کرلیا، حتیٰ کہ اس کی سلطنت موجودہ آسام، بلوچستان، افغانستان اور بنگلہ دیش تک پھیلی ہوئی تھی۔ پنجاب بھی اسی سلطنت کا حصہ تھا۔

اشوک نے اپنے ابتدائی دورِ حکومت میں کئی جنگیں لڑیں، جن میں ایک مشہور جنگ کلنگ کی تھی۔اس جنگ میں ہونے والی تباہی اور بھاری جانی نقصان نے اشوک کو گہرا صدمہ پہنچایا۔اسی تجربے کے نتیجے میں اس نے عدم تشدد کی راہ اختیار کی اور بدھ مت قبول کرلیا۔اشوک کا بدھ مت اختیار کرنا برصغیر میں اس مذہب کے فروغ کا اہم سبب بنا۔اس نے تقریباً 36 سال حکومت کی، اوراس کے بعد بھی موریہ سلطنت مزید 56 سال تک قائم رہی۔

موریہ خاندان کا آخری حکمران برہدرتھ تھا، جسے اس کے ہی سپہ سالار پشیا متر شونگا نے قتل کر دیا اور یوں موریہ سلطنت کا اختتام ہوا۔بعض تاریخی روایات کے مطابق چندر گپت موریہ کی سلطنت میں مکمل مرکزیت کا فقدان تھا، اور کئی بااثر وخودمختار ریاستیں بھی سلطنت کا جز تھیں۔ چندر گپت کی سلطنت جنوبی ایشیا کے بیشتر حصوں پر محیط تھی۔اس کی مشرقی سرحد موجودہ بنگال سے شروع ہوکر مغرب میں افغانستان تک اور شمال میں ہمالیہ سے لے کر جنوب میں دکن کے کئی علاقوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے دور میں بدھ مت، جین مت، ویدک اور برہمنی مذاہب نے ترقی پائی۔

آج بھی چندر گپت موریہ کو ہندوستان کا قومی ہیرو مانا جاتا ہے، کیونکہ وہ پہلا حکمران تھا جس نے برصغیر کے بیشتر حصے کو ایک متحد حکومت کے تحت لایا۔

باختر (Bactria): وسطی ایشیا میں ایک تہذیبی وتاریخی ریاست کا ارتقاء

موریہ سلطنت طویل عرصے تک قائم رہی، تاہم بالآخر وہی ہوا جو ہر عظیم سلطنت کے ساتھ ہوتا آیا ہے- یعنی زوال۔موریہ سلطنت کا خاتمہ باختر کے حکمرانوں کے ہاتھوں ہوا۔ باختر قدیم دور کی ایک اہم اور طاقتور ریاست تھی، جو ہندوکش کے پہاڑوں اورآمو دریا (قدیم آکسس

دریا) کے درمیان واقع تھی۔ یہ خطہ موجودہ افغانستان، ازبکستان اور تاجکستان کے شمالی علاقوں پر مشتمل تھا۔ باختر نے تاریخ میں متعدد تہذیبوں کو پروان چڑھایا اور مختلف اقوام کی تاریخ میں اس کا کردار نمایاں رہا۔

باختر کا دارالحکومت بکترا (قدیم نام: زریاسپا، موجودہ بلخ، افغانستان) تھا، جسے ''ام البلاد'' یعنی ''شہروں کی ماں'' بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ایک امیر اور تہذیبی اعتبار سے ترقی یافتہ ریاست تھی، جس کے آثارِ قدیمہ اس کی شان وشوکت کی گواہی دیتے ہیں (مجھے دو مرتبہ بلخ جانے کا موقع ملا ہے)۔ انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا کے مطابق یہ ریاست تقریباً 600 قبل مسیح سے 600 عیسوی تک ایک طاقتور سیاسی و ثقافتی اکائی کے طور پر موجود رہی۔ یہی ریاست بعد ازاں ہندوستان پر حملہ آور ہوئی اور تقریباً دو صدیوں تک شمالی ہندوستان جس میں پنجاب بھی شامل تھا پر حکومت کی۔

سکندر اعظم نے بھی باختر پر حملہ کیا تھا۔ اس سے پہلے ایرانیوں نے اس علاقے پر قبضہ جمایا تھا۔ سکندر کی فتح کے بعد یہاں یونانی ثقافت کا گہرا اثر دیکھنے میں آیا، جس کے نتیجے میں مقامی آبادی اور یونانی فاتحین کے مابین میل جول سے ایک نئی تہذیب نے جنم لیا، جسے ''یونانی-باختری تہذیب'' کہا جاتا ہے۔ جب ان حکمرانوں نے شمالی ہندوستان پر حکومت قائم کی، تو انھیں ''Indo-Greek Kingdom'' کے نام سے جانا گیا۔

ان کے دور میں بدھ مت کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ شمالی افغانستان، بامیان، اور گردونواح میں بدھ مت کے متعدد سٹوپے اور مذہبی آثار اسی یونانی اثرات کے مرہون منت ہیں۔ یہ علاقہ بدھ مت کے پھیلاؤ کا ایک اہم مرکز بن گیا۔ بعد ازاں ان کا زوال ساسانی سلطنت اور بعد میں مسلمانوں کے ہاتھوں ہوا۔

یہاں باختر کی مکمل تاریخ بیان کرنا مقصود نہیں، بلکہ یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ موریہ سلطنت کے بعد جو حکمران پنجاب پر مسلط ہوئے، ان کا تعلق شمالی افغانستان اور وسطی ایشیا سے تھا، اور وہ بھی بدھ مت کے پیروکار تھے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس دور میں بدھ مت ایک

غالب مذہب تھا۔ نہ تو عیسائیت کا ظہور ہوا تھا، اور نہ ہی ہندومت ان علاقوں تک پہنچا تھا۔

یہ دور یونانی تاریخ میں ''Hellenistic Period'' کے نام سے جانا جاتا ہے، جو سکندر اعظم کے عہد سے شروع ہو کر 30 قبل مسیح میں ملکہ کلیوپیٹرا ہفتم کی وفات تک جاری رہا۔ اس کے بعد رومیوں نے اس سلطنت کا خاتمہ کر کے رومن سلطنت کی بنیاد رکھی۔ جب باختر کی ریاست ختم ہوئی، تو ہندوستان میں ان کا اقتدار بھی اختتام کو پہنچا۔

میرے خیال میں Indo-Greek Kingdom ، جسے میں ہندوستان میں ''یونانی حکمرانی'' کہوں گا، پنجاب کی تاریخ کا ایک سنہری دور تھا، لیکن بدقسمتی سے ہندوستانی تاریخ میں اس کا ذکر نہایت محدود ملتا ہے۔ جب میں نے ان حکمرانوں کے بارے میں مطالعہ کیا، تو معلوم ہوا کہ ان کے دور میں پنجاب کی تہذیب، معیشت اور معاشرت اپنے عروج پر تھی۔ میں اس سنہری عہد کی چند اہم خصوصیات قارئین کے سامنے ضرور رکھنا چاہوں گا تاکہ یہ معلوم کیا جا سکے کہ یونانی اثرات نے پنجاب کی تہذیب و تمدن کو کس طرح متاثر کیا اور اس میں کون سی نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

ہند-یونانی سلاطین: برِّصغیر میں یونانی اثرات کا مطالعہ

ہندوستان میں ''ہند-یونانی حکمرانوں'' سے متعلق انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا میں ایک جامع تفصیل موجود ہے، جس کا خلاصہ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

ڈیمیٹریس (Demetrius)، جس نے 167 تا 139 قبل مسیح حکومت کی، ایک باختری حکمران تھا جس نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ اس نے ابتدا میں پنجاب اور بعد ازاں وادئ سندھ سمیت شمال مغربی ہندوستان پر قبضہ کر کے ہند-یونانی حکمرانی کی بنیاد رکھی۔ اس کے حملوں کے نتیجے میں موریہ سلطنت کا خاتمہ ہوا۔ ڈیمیٹریس کے دور میں ہندوستان میں ایسے سکے جاری کیے گئے جو شکل و ساخت میں یونانی سکوں سے مشابہت رکھتے تھے۔

ان ہند-یونانی حکمرانوں میں سب سے معروف شخصیت مینینڈر (Menander) ہے، جسے ''ملندا'' بھی کہا جاتا ہے۔ اس نے 155 تا 130 قبل مسیح حکومت کی۔ مینینڈر کا بدھ فلسفی ناگاسینا کے ساتھ مکالمہ، تاریخ کے نمایاں علمی و مذہبی واقعات میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس مکالمے

کے بعد مینینڈر نے بدھ مت اختیار کیا اور اس کی ترویج میں نمایاں کردار ادا کیا۔ یوں اس نے وہ مشن جاری رکھا جو موریہ خاندان کے زیر قیادت شروع ہوا تھا۔ اس دور میں ہندو مت بہت کم دکھائی دیتا ہے۔

مینینڈر نے گندھارا اور پنجاب کو اپنا مرکزِ اقتدار بنایا۔ بعض مؤرخین کے مطابق اس نے وادیٔ گنگا کو بھی فتح کیا، تاہم اسے اپنی سلطنت میں مکمل طور پر شامل نہ کرسکا۔ اس کے عہد کے سکوں کی دریافت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں شمالی ہندوستان ایک ترقی یافتہ اور خوشحال علاقہ تھا۔

بعدازاں، باختر (Bactria) میں ایک بڑی سیاسی تبدیلی واقع ہوئی۔ ایک نئے خاندان نے اقتدار سنبھالا، اور انھوں نے اصل باختری روایت سے ہٹ کر گندھارا میں دلچسپی لینا شروع کردی۔ بالآخر انھوں نے کابل اور ٹیکسلا کو اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔ اس عبوری دور میں کئی دیگر اقوام نے بھی ہندوستان پر حملے کیے۔ ان میں قابل ذکر ساکا (Scythians) تھے، جنھوں نے شمالی ہندوستان، بشمول پنجاب، پر حکمرانی قائم کی۔

ساکا خاندان جنھیں ہند۔سِتھیائی بھی کہا جاتا ہے (200 قبل مسیح - 400 عیسوی): ساکا (Indo-Scythians،Saka Dynasty) ایک وسطی ایشیائی خانہ بدوش قبیلہ تھا، جنھوں نے حملہ کرکے شمال مغربی ہندوستان میں سکونت اختیار کی۔ یہ قبائل ایران و قازقستان کے علاقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ساکا خاندان کا پہلا حکمران ماؤس (یا موگا) تھا، جس نے ٹیکسلا کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ اس کے بعد ازیس اول اور ازیس دوم نے اپنی سلطنت کو پنجاب تک وسعت دی۔ ساکا حکمرانوں کو ''ساکاسترَاپ'' بھی کہا جاتا تھا۔ متھرا کے ساکاسترَاپ کے دور میں قابل ذکر ترقی دیکھنے میں آئی۔

ساکا سلطنت نہ صرف شمالی بلکہ جنوبی ہندوستان تک پھیل گئی، جس میں گجرات، کاٹھیاواڑ اور مہاراشٹر شامل تھے۔ ان کی حکمرانی تقریباً پانچ سو سال تک قائم رہی۔ ایک مضمون جو ویب سائٹ www.mapsofindia.com پر دستیاب ہے، کے مطابق ساکا دراصل ایرانی نژاد سیتھیائی قبائل کا ایک حصہ تھے جو قازقستان سے ہجرت کرکے مختلف ادوار میں بکٹریا، آراکوشیا،

سوغدیانا، گندھارا اور بالآخر ہندوستان پہنچے۔ ساکا بنیادی طور پر چرواہے تھے اور ان کی معیشت خانہ بدوشی پر مبنی تھی۔

ساکا قبائل نے مقامی حکمرانوں کو شکست دے کر کشمیر، پنجاب، گجرات، مہاراشٹر اور راجستھان پر قبضہ کیا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ وسطی ایشیا میں وبا کے باعث چینی علاقے سے حملہ آور قبائل کے دباؤ نے ساکاؤں کو ہندوستان کی طرف ہجرت پر مجبور کیا۔ یہ دوسرے غیر ملکی حکمران تھے جنھوں نے وسطی ایشیا سے آکر پنجاب پر حکومت کی، جب کہ اس سے قبل مگدھ کے موریہ حکمران یہاں قابض تھے۔ ساکا کا پہلا اہم حکمران موگا تھا، جس نے گندھارا کو اپنا سیاسی مرکز بنایا اور شمال مغربی ہندوستان کے اکثر علاقوں کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔

تاریخ میں ساکاؤں کے بارے میں مختلف آراء ملتی ہیں۔ کچھ مؤرخین کا خیال ہے کہ ان کا مرکزی گروہ مشرقی ایران اور سیستان کی طرف چلا گیا اور پارتھیائی سلطنت میں ضم ہو گیا۔ بعض مورخین کے مطابق ساکاؤں کے دو بڑے گروہ ہندوستان میں داخل ہوئے: ایک کشمیر کے راستے اور دوسرا درۂ بولان سے مشرقی ایران کے راستے۔ کچھ قبائل درۂ خیبر سے گندھارا اور پنجاب میں داخل ہوئے۔

ہندوستانی مہاکاوی ''مہابھارت'' میں بھی ساکاؤں کا ذکر موجود ہے، جنھیں ''سکادویپا'' میں آباد بتایا گیا ہے جو قدیم ہندوستان کے شمال مغرب کا ایک خطہ تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہند-ساکا حکمرانوں کو ہندوستانی تاریخ میں نسبتاً کم اہمیت دی گئی ہے۔ بعض آراء کے مطابق وہ مکمل طور پر فاتح نہیں تھے بلکہ مقامی تہذیب میں مدغم ہو چکے تھے۔

یونانی مؤرخ ہیروڈوٹس کے مطابق، ساکا قبائل دریائے گنگا تک کے علاقے پر سیاسی اثر و رسوخ رکھتے تھے۔ بعد ازاں انڈو-ساکا قبائل نے راجپوت اور موریہ خاندانوں کی طرح شمالی برصغیر کے مختلف علاقوں میں اپنا تسلط قائم کیا۔ ان کے دور میں بڑی تعداد میں تانبے اور چاندی کے سکے جاری کیے گئے، جن پر ہندو اور بدھ مت دیوتاؤں کی تصویریں کندہ تھیں۔ ان

میں سے بعض حکمرانوں نے ''مہاراجہ مہاتما'' کا لقب اختیار کیا، جس سے ان کے بدھ مت سے تعلق کا عندیہ ملتا ہے۔

تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ ساکا قبائل نے گندھارا کے بیشتر حصوں پر قبضہ کیا، تاہم مشرقی پنجاب میں موجود ہند-یونانی سلطنت کو مکمل طور پر مغلوب نہ کر سکے۔ اس طرح ایک عرصے تک ساکا اور ہند-یونانی سلطنتیں ساتھ ساتھ موجود رہیں۔

ساکا حملوں کے بعد ہندوستان اور ایران کے درمیان تجارتی روابط میں اضافہ ہوا۔ اسی عرصے میں موریہ دور کے فنون میں ایرانی و فارسی اثرات نمایاں ہونے لگے۔ بعض محققین کا کہنا ہے کہ مغربی ہندوستان میں موجود کئی برادریاں جیسے لوہار، جاٹ، آہیر، راجپوت، گجر اور ترکھان ساکا یا ان کے متعلقہ قبائل کی اولاد ہیں۔ ان برادریوں کا قدیم تاریخی متون میں ذکر نہیں ملتا، جو اس مفروضے کو تقویت دیتا ہے۔

بعض الفاظ جیسے ''گجرات'' (خزر سے ماخوذ)، ''سوراشٹر'' (سورج پوجا کرنے والا)، ''جاٹ'' (گتائے سے)، ''ٹھاکر'' (تخاریان سے)، اور ''سیسودیا'' (ساسانیوں سے) ساکائی/سیتھیائی ماخذات کے حامل بتائے جاتے ہیں۔ پھر وہ وقت بھی آیا جب جنوبی ہندوستان کے شہنشاہ گوتمی پتر ستکارنی نے ساکاؤں کو شکست دی اور شمال مغربی ہندوستان میں ان کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا۔

کشان سلطنت (30 سے 230 عیسوی) وسطی ایشیا کے حملہ آور: انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا کے مطابق کوشان خاندان (جسے کشان بھی لکھا جاتا ہے) کا تعلق یوزی (Yuezhi) قبائل سے تھا۔ یوزی خانہ بدوش قبائل کا ذکر پہلی بار چینی تواریخ میں اس وقت ملتا ہے جب وہ دوسری صدی قبل مسیح کے آغاز میں شمال مغربی چین کے صوبہ گانسو کے مغربی حصے میں آباد تھے۔ ان قبائل نے پہلی تین عیسوی صدیوں کے دوران شمالی برصغیر (جس میں پنجاب سب سے اہم خطہ تھا)، افغانستان اور وسطی ایشیا کے بعض حصوں پر حکومت کی۔ یوزی قبائل نے دوسری صدی قبل مسیح میں باختر (Bactria) کو فتح کیا اور ملک کو پانچ سرداروں میں تقسیم کر دیا، جن میں

سے ایک سردار کا نام کوشان (گوشوانگ) تھا۔

کوشان خاندان کو اپنے وقت کی چار بڑی یوریشیائی طاقتوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ (دیگر تین: چین، روم اور پارتھیا)۔ کشانوں نے وسطی ایشیا اور چین میں بدھ مت کے فروغ، مہایان بدھ مت کی ترویج اور گندھارا اور متھرا کے فنونِ لطیفہ کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ انھی کے دور میں پنجاب کے دور دراز علاقوں تک بدھ مت کی تعلیمات عام ہوئیں۔ کوشان قوم تجارت میں مہارت رکھتی تھی۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ رواداری، مذہبی ہم آہنگی اور فنونِ لطیفہ کے فروغ میں دیگر اقوام سے کہیں آگے تھے۔ تاہم، جب ایران میں ساسانی خاندان اور شمالی ہندوستان میں مقامی طاقتیں ابھریں تو کشان سلطنت کو زوال آنا شروع ہوا۔

چندر گپت موریہ، چندر گپت اول، اور چندر گپت دوم۔ ہندوستان کی تاریخ کی تین اہم شخصیات: ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ تین اہم شخصیات۔ چندر گپت موریہ، چندر گپت اول، اور چندر گپت دوم بار ہا سامنے آتی ہیں۔ ان کے ناموں میں مماثلت کے باعث بعض اوقات الجھن پیدا ہوتی ہے۔ مجھے بھی ان کے درمیان فرق سمجھنے میں کچھ وقت لگا۔ یاد رکھنا ضروری ہے کہ ان تینوں شخصیات کا دور اور کارنامے ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہیں۔

چندر گپت موریہ (340- 297 قبل مسیح): چندر گپت موریہ، موریہ سلطنت کا بانی تھا۔ اس کا تفصیلی ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ اس نے نندا خاندان کا تختہ الٹ کر قدیم ہندوستان میں سب سے بڑی سلطنت قائم کی۔ اسی کے دور میں ہندوستان کے بیشتر حصے متحد ہوئے۔ وہ اپنی فوجی صلاحیت اور انتظامی مہارت کے باعث تاریخ میں ممتاز مقام رکھتا ہے۔ اس کے دور میں ہندوستان میں مرکزی حکومت کا باقاعدہ آغاز ہوا۔

اس کے سب سے اہم مشیروں میں چانکیہ (کوٹیلیہ) شامل تھا، جو ایک عظیم فلسفی اور دانشمند تھا۔ چندر گپت موریہ کے بعد اس کا پوتا اشوکا حکمران بنا، جس کے دور میں موریہ سلطنت نے بے مثال عروج حاصل کیا۔

چندر گپت اول (320- 335 عیسوی): چندر گپت اول کو گپتا سلطنت کا بانی سمجھا جاتا ہے۔اس کے دور کو ہندوستان کا سنہری دور کہا جاتا ہے کیونکہ فنون، سائنس، ادب اور فلسفے میں زبردست ترقی ہوئی۔اس نے شمالی ہندوستان کو متحد کر کے ایک وسیع سلطنت قائم کی۔اس دور میں ریاضی، فلکیات، طب، فلسفہ اور ہندو ثقافت کو فروغ ملا۔اس سے قبل بدھ مت کا غلبہ تھا، لیکن چندر گپت اول کے دور سے ہندومت نے دوبارہ فروغ پانا شروع کیا۔

چندر گپت دوم (415 - 375 عیسوی): چندر گپت دوم، جسے وکرمادتیہ بھی کہا جاتا ہے، گپتا سلطنت کا عظیم حکمران اور سمندر گپت کا بیٹا تھا۔اس کے دور میں فنون اور ادب کی سرپرستی عروج پر پہنچی۔اس نے ساکا حکمرانوں کو شکست دے کر اپنی سلطنت کو مغرب تک وسیع کیا۔اس کے دربار میں کئی عظیم اسکالرز، شاعروں اور فنکاروں نے جنم لیا، جن میں کالی داس جیسے شاعر شامل تھے۔اس کے دور کو بھی گپتا سلطنت کا عہدِ زریں (Golden Age) کہا جاتا ہے۔

گپتا دورِ حکومت

ہندوستان کا سنہری دور- وہ دور جس میں مہابھارت بھی ترتیب دی گئی (320 سے 455 عیسوی تک): کُشان ریاست کے کمزور ہو جانے کے بعد گپتا خاندان کا دور شروع ہوتا ہے۔ چوتھی صدی کے آغاز سے ہی ہندوستان کی تاریخ میں ایک بار پھر بہتری آنے لگی۔اس بار پاٹلی پترا (موجودہ پٹنہ) یا اس کے آس پاس کے ایک مقامی راجہ، جس کا مشہور نام چندر گپت تھا، نے گپتا راج کی بنیاد رکھی۔انسائیکلو پیڈیا آف برِٹانیکا میں اس بارے میں کافی تفصیل ملتی ہے، جس کا خلاصہ پیشِ خدمت ہے:

گپتا خاندان کا آغاز شمال مشرقی ہندوستان میں مگدھ (موجودہ بہار) کی ریاست کے حکمران کے طور پر ہوا۔بعد ازاں، انھوں نے چوتھی صدی عیسوی کے اوائل سے لے کر چھٹی صدی عیسوی کے وسط تک شمالی، وسطی اور مغربی ہندوستان کے ایک بڑے حصے پر حکومت کی۔مؤرخین گپتا دور کو ہندوستان کا ''کلاسیکی'' یا ''سنہری'' دور قرار دیتے ہیں۔گپتا دور میں ہندوستانی ادب،

فنونِ لطیفہ، فنِ تعمیر اور فلسفے کو بامِ عروج حاصل ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اسی دور میں ریاضی میں اعشاریہ کے نظام کی ابتداء ہوئی، مہابھارت میں اہم اضافے کیے گئے، جبکہ آرٹ، فلکیات، ریاضی اور دھات کاری کے علوم میں بھی نمایاں ترقی ہوئی۔

گپتا دور میں پہلی بار ہندوستان کو انتظامی طور پر صوبوں میں تقسیم کیا گیا، اور ہر صوبہ چھوٹی اکائیوں میں منقسم تھا، جنھیں پردیش یا وشایا کہا جاتا تھا۔ ان صوبوں پر اعلیٰ شاہی افسران یا شاہی خاندان کے افراد کو مقرر کیا جاتا تھا۔ گپتا دور کے میونسپل بورڈز کی تشکیل سے اختیارات کے ایک غیر مرکزی نظام کا بھی پتا چلتا ہے۔

میں نے اس بات کی تصدیق انسائیکلوپیڈیا آف برِٹانیکا کے علاوہ دیگر ذرائع سے بھی کی ہے۔ میری سمجھ کے مطابق اس دور یعنی چوتھی صدی عیسوی میں، جب یورپ میں ابھی ترقی کے آثار نظر نہیں آرہے تھے، ہندوستان میں ایک منظم صوبائی، ضلعی اور بلدیاتی نظام قائم ہو چکا تھا۔

یہ بھی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ چندر گپت کے بیٹے، سمندر گپت (375-353 عیسوی) نے گپتا سلطنت میں توسیع کی خاطر ایک مہم کا آغاز کیا اور اسے اپنے دور کی جنوبی ایشیا کی سب سے بڑی سلطنت کی شکل دی۔ کہا جاتا ہے کہ اس سے بڑی سلطنت ہندوستان میں اس سے پہلے کبھی نہیں تھی۔ ایک طرف اس کی حکومت جنوبی ہندوستان میں موجودہ تامل ناڈو کی ریاست کانچی پورم تک پھیل چکی تھی، اور دوسری طرف مغربی ہندوستان میں واقع موجودہ پنجاب اور راجستھان کی ریاستوں کو بھی فتح کر لیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ ہمالیہ کی سرحد کے ساتھ واقع کئی ریاستیں، جن میں موجودہ آسام اور نیپال شامل تھے، سمندر گپت کے زیرِ نگیں تھیں۔

اسی دور میں اس کے کئی غیر ملکی حکمرانوں سے بھی تعلقات قائم ہوئے، جن میں سری لنکا شامل تھا۔ اس نے سونے کے نئے سکے جاری کیے اور گھوڑوں کی قربانی کی قدیم ویدک رسم (اشوَمیدھ یگیہ) کا انعقاد کر کے اپنی فتوحات کا جشن منایا۔ یہ رسم صرف طاقتور حکمرانوں کو ادا کرنے کی اجازت تھی اور اس کا مقصد اپنی بالادستی کا اظہار کرنا ہوتا تھا۔

دہلی میں واقع مسجد قوت الاسلام کے احاطے میں ایک مشہور لوہے کا ستون نصب ہے، جس کا وزن چھ ٹن سے زائد ہے۔ یہ ستون خالص لوہے سے تیار کیا گیا ہے۔ (مجھے یہ ستون دو مرتبہ دیکھنے کا موقع ملا ہے۔) تاریخ بتاتی ہے کہ یہ ستون چندر گپت دوم نے اپنے دورِ حکومت کے اختتام پر تیار کروایا تھا اور اسے اپنے محبوب دیوتا وشنو کے نام پر وقف کیا تھا۔

میں نے تاریخ سے جو سمجھا، اس کے مطابق گپتا بادشاہوں نے اپنے دورِ عروج میں فوجی، عدالتی، اور مالیاتی امور کے لیے وزراء کی سربراہی میں ایک منظم انتظامی ڈھانچہ قائم کر رکھا تھا۔ اس دور میں مختلف علاقوں میں گورنر مقرر کیے گئے، صوبوں کو اضلاع میں تقسیم کیا گیا، اور زمین کی پیمائش و ٹیکس نظام کے لیے ایک تفصیلی نظام رائج تھا۔ شہری علاقوں میں تاجروں اور کاریگروں کی علیحدہ انتظامی تنظیمیں قائم کی گئیں۔

میری فہم کے مطابق، گپتا دور جنوبی ایشیا کی ثقافت کا سنہری دور تھا۔ اگرچہ اکثر گپتا بادشاہوں نے شمالی ہندوستان کے تمام علاقوں پر حکومت نہیں کی، اور نہ ہی وہ کبھی مکمل طور پر جنوبی ہندوستان پر قابض ہوئے، تاہم ان کے دور میں جاری کیے گئے سکے، ان پر کندہ تحریریں اور تصاویر اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ گپتا خاندان فنونِ لطیفہ کا نہ صرف قدر دان تھا بلکہ اس کا سرپرست بھی تھا۔ کئی گپتا بادشاہ خود ماہر موسیقار تھے۔

گپتا حکمرانوں نے مختلف مذاہب کی سرپرستی بھی کی۔ ہندو، بدھ مت اور جین عقائد کے مذہبی اداروں کو فیاضی سے مالی امداد دی گئی۔ نالندہ کی بدھ یونیورسٹی، جو موجودہ بہار کی ریاست میں واقع ہے، اسی دور میں علم کا ایک عالمی شہرت یافتہ مرکز بن گئی۔ بی بی سی نے نالندہ یونیورسٹی کے بارے میں ایک طویل مضمون بھی شائع کیا ہے۔

اس کی چند لائنیں میں یہاں نقل کر رہا ہوں۔ [1]

''انڈیا کے 'بودھ گیا' قصبے، جس کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں گوتم

---

[1] https://www.bbc.com/urdu/articles/cx89g0zj8440

بدھ نے معرفت حاصل کی تھی، میں رات گزارنے کے بعد میں اس صبح نالندہ کے لیے روانہ ہو گیا۔ یہ وہ یونیورسٹی ہے جس کی سرخ رنگ کی اینٹوں کے کھنڈرات ابھی تک قدیم دنیا کے سب سے بڑے علمی مراکز میں سے ایک ہیں۔

یہ یونیورسٹی پانچویں صدی عیسوی 427 میں قائم کی گئی تھی اور اس کا شمار دنیا کی قدیم ترین یونیورسٹیوں میں ہوتا ہے۔

یورپ کی آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹی سے بھی پانچ سو سال قبل انڈیا کی شمال مشرقی ریاست بہار کی نالندہ یونیورسٹی تعلیم کا ایک اہم اور عالمی مرکز ہوا کرتی تھی۔''

یہ مضمون واقعی قابلِ مطالعہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آج سے تقریباً سولہ سو سال قبل، جب یورپ میں کوئی بھی یونیورسٹی قائم نہیں ہوئی تھی، ہندوستان میں کئی بڑی جامعات موجود تھیں۔ بعد میں ایسا کیا ہوا کہ ہندوستان علمی ترقی میں یورپ سے پیچھے رہ گیا؟ اس موضوع پر میں ضرور کبھی نہ کبھی تفصیل سے کچھ لکھوں گا۔

گپتا خاندان کی حکمرانی کے آخری دور میں ہندومت نے دوبارہ زور پکڑنا شروع کیا۔ پھر وہ وقت بھی آیا جب سنسکرت کو اعلیٰ ادبی مقام حاصل ہوا، اور اس بنا پر یہ زبان شمالی ہندوستان کی واحد غالب ادبی زبان بن گئی۔ اسی دور میں بدھ مت کا زوال شروع ہوا اور سنسکرت کا دائرۂ اثر پھیلنے لگا۔ نتیجتاً، گپتا دور کے اختتام تک بدھ مت کی طاقت ہندوستانی سرزمین پر تقریباً ختم ہو چکی تھی، اور ہندوستان بی چند مقامی استثناؤں کے ساتھ دوبارہ برہمنوں کی سرزمین بن گیا۔

یوں، تقریباً ایک ہزار سال تک ہندوستان اور اس کے آس پاس کے خطوں میں ایک مقبول مذہب رہنے کے بعد، بدھ مت ایک اقلیتی مذہب میں تبدیل ہو گیا۔

ہن، ایک خانہ بدوش حملہ آور اور شمالی ہندوستان کے پانچویں صدی حاکم

ہن کب ہندوستان میں آئے اور انھوں نے کیا کیا کارنامے سرانجام دیے، یہ ایک طویل اور دلچسپ داستان ہے۔ ان کی تفصیل The Gupta Empire and - Chapter 12

the White Huns میں موجود ہے، اس سے میں جو جان سکا وہ پیش کر رہا ہوں۔ اس کے علاوہ محمد بن نوید کا ایک مضمون بھی پڑھنے کو ملا، جس میں بے حد مفید معلومات درج ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر کئی تحریروں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔[1]

ان حملہ آوروں کو ہیفھتھال (Hephthalites) بھی کہا جاتا ہے، کیونکہ ان کے تین اہم بادشاہوں کے ناموں میں "ہیفھتھال" کا لفظ شامل تھا۔ تاہم، عام طور پر انھیں "ہن"، "ہُنا" یا "ہُنز" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ خانہ بدوش قوم منگولیا سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ اپنے وطن سے نکل کر یورپ سمیت ہندوستان کی سمت بڑھنے لگے۔ ایک وقت وہ بھی آیا جب ان کی سلطنت فارس کی سرحد سے لے کر وسطی ایشیا تک پھیل چکی تھی۔

میں نے جو کچھ مطالعے سے جانا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کوئی اہم واقعہ ضرور ایسا پیش آیا ہوگا، جس کی وجہ سے یہ قوم اپنے آبائی وطن کو چھوڑ کر مشرق اور مغرب کی طرف ہجرت پر مجبور ہوئی۔ ان کا ایک گروہ مغرب میں واقع رومی سلطنت کی طرف روانہ ہوا، جبکہ دوسرا وسطی ایشیا میں مختلف ریاستوں کو روندتا ہوا ہندوستان کی طرف بڑھا۔ انھیں "سفید ہن" (White Huns) بھی کہا جاتا ہے۔ ان سے پہلے کشان قبائل بھی ہندوستان پر حملہ کر چکے تھے، اور تقریباً سو سال بعد ہن حملہ آور ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ قوم دنیا کی سب سے جنگجو اقوام میں شمار کی جاتی تھی۔ ان کی پہچان ان کی بربریت، ظلم اور تباہ کاریوں سے تھی۔ انھوں نے شمالی ہندوستان پر دو بار حملے کیے، جن کے اثرات دیرپا اور تباہ کن ثابت ہوئے۔

ہنوں کا ہندوستان پر پہلا بڑا حملہ: 458ء

ہنوں نے پہلی مرتبہ اس وقت ہندوستان پر حملہ کیا جب گپتا خاندان برصغیر کے ایک بڑے حصے پر حکمرانی کر رہا تھا۔ گپتا شہنشاہ سمندر گپت کی وفات کے بعد، مغربی ہندوستان میں گپتا

[1] https://www.ibiblio.org/britishraj/jackson2/chapter12.html
/(https://www.worldhistory.org/White_Huns_(Hephthalites

سلطنت کا کنٹرول تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ اسی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، ہنوں کی مسلح افواج نے گپتا سلطنت پر حملہ کیا اور جموں، کشمیر، ہماچل، راجستھان، پنجاب اور مالوہ کے کئی اہم علاقوں پر قابض ہو گئیں۔ یوں ہنوں نے شمالی ہندوستان کے متعدد حصوں میں اپنی سلطنت قائم کر لی۔ اس وقت تورَمانا سفید ہنوں کا سردار تھا۔

اسی زمانے (پانچویں صدی عیسوی) میں گپتا سلطنت گنگا کے طاس پر قابض تھی، جبکہ کشان خاندان نے سندھ کے کنارے واقع علاقوں پر قبضہ جما رکھا تھا۔ ہنوں نے شمالی ہندوستان پر حملے سے قبل کابل میں کشانوں کو شکست دی اور طورخم کے راستے برصغیر میں داخل ہوئے۔ یہ وہی معروف راستہ تھا جس سے پہلے بھی متعدد حملہ آور داخل ہو چکے تھے۔ ان کا پہلا پڑاؤ پنجاب میں ہوا۔ گپتا سلطنت اپنی شمال مغربی سرحد کی مؤثر حفاظت میں ناکام رہی، جس کے نتیجے میں ہنوں کے لیے گنگا کی وادی تک، جو گپتا سلطنت کا مرکزی علاقہ تھا، پہنچنا آسان ہو گیا۔ تاہم، کچھ ہی عرصے بعد گپتا حکمران سکندر گپت نے ایک فیصلہ کن جنگ میں ہنوں کو عبرتناک شکست دی۔

ہنوں کا ہندوستان پر دوسرا حملہ: 470ء

پہلی شکست کے بعد ہن واپس چلے گئے اور ایک مناسب وقت کے انتظار میں رہے۔ جب 470ء میں گپتا حکمران سکندر گپت کا انتقال ہوا، اُس وقت ہنوں کا سردار ہناس مہرکولا تھا (جسے میہرگولا یا ''انڈین اٹیلا'' بھی کہا جاتا ہے)۔ وہ تورَمانا کا بیٹا اور جانشین تھا۔ اسے ایک نہایت ظالم اور تباہ کن حکمران سمجھا جاتا ہے۔ ہن، مہرکولا کی قیادت میں دوبارہ ہندوستان پر حملہ آور ہوئے اور اس بار وہ کامیاب بھی ہوئے، کیونکہ اب انھیں روکنے والا کوئی نہ تھا۔ گپتا سلطنت کافی کمزور ہو چکی تھی۔ مہرکولا نے اپنی راجدھانی کے طور پر ساکل (موجودہ سیالکوٹ) کو منتخب کیا۔ لیکن کچھ عرصے بعد اُسے دو ہندوستانی حکمرانوں، مالوا کے یسودھرمن اور بعد کے گپتا خاندان کے نرسمہا گپت بالادتیہ نے یکے بعد دیگرے شکست دی۔ یوں ہنوں کا دوسرا دورِ حکومت بھی اختتام کو پہنچا۔ میرے خیال میں ہن کوئی منظم قوم نہ تھی؛ وہ خانہ بدوش تھے اور جنگ وجدل ان کا شعار تھا۔

ہنوں کے حملوں کی تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ تورَمانا پہلا سفید ہن بادشاہ تھا، جس نے پنجاب، راجپوتانہ، کشمیر، دوآب اور مالوا کے کچھ علاقوں کو فتح کیا۔ اس کے بعد، اُس نے پنجاب میں اپنی حکومت مستحکم کر کے ہندوستان کے اندرونی علاقوں پر قبضے کی کوشش کی۔ اُس نے کئی مقامی بادشاہوں اور سرداروں کو شکست دی اور مہاراجہ دھیراجہ (Maharajadhiraja) کا لقب اختیار کیا۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ہنوں کے حملوں کے وقت گپتا سلطنت کے بعض صوبائی گورنر ہنوں کی فوج میں شامل ہو گئے تھے، جس کے باعث ہنوں کو شمالی ہندوستان پر قبضہ کرنے میں مزید آسانی ہوئی۔

تورَمانا کے دور کے سکے اور کتبے ستلج اور جمنا کے درمیانی علاقوں سے برآمد ہوئے ہیں، جن سے اُن کے بارے میں جاننے میں کافی مدد ملی ہے۔ تاہم، یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ خانہ بدوش ہن زیادہ عرصے تک اقتدار میں نہ رہ سکے اور سکندر گپت کے ہاتھوں شکست کھا کر واپس چلے گئے۔ اسی زمانے میں، تورَمانا کا بیٹا مہرکولا اس کا جانشین بنا، جس نے گنگا کے کنارے واقع ہر شہر اور قصبے میں گھس کر تباہی مچائی۔ دارالحکومت پاٹلی پترا (موجودہ پٹنہ) ایک معمولی گاؤں میں تبدیل ہو گیا۔ ہنوں نے بدھ مت کے پیروکاروں پر سخت مظالم کیے، تمام خانقاہوں کو تباہ کر دیا اور گپتا سلطنت کا مکمل خاتمہ کر دیا۔ جب ہنوں کا ظلم حد سے بڑھ گیا، تو ایک عظیم جنگ میں مہرکولا کو یسودھرمن اور نرسمہا گپت بالادتیہ کے ہاتھوں شکست ہوئی، جس کے بعد اُسے ہمیشہ کے لیے ہندوستان چھوڑنا پڑا۔ اس کے ساتھ ہی ہنوں کے دور کا خاتمہ ہو گیا۔

ہنوں کے حملوں نے ہندوستانی تاریخ پر دور رس اثرات مرتب کیے۔ انھوں نے سب سے پہلے گپتا سلطنت کے تسلط کو ختم کیا اور ان کے حامی جاگیرداروں کو مٹا دیا۔ گپتا سلطنت کے زوال کے بعد شمالی ہندوستان میں چھوٹی چھوٹی ریاستیں ابھرنے لگیں۔ ہنوں کی وجہ سے ہندوستان اور رومی سلطنت کے درمیان تجارتی تعلقات بھی متاثر ہوئے، جس سے شمالی ہندوستان کی معیشت کو شدید نقصان پہنچا۔ اسی دور میں پاٹلی پترا جیسے اقتصادی اور ثقافتی شہر اپنی عظمت کھو بیٹھے۔ تاہم، اس تباہی کا ایک پہلو مثبت بھی تھا: شمالی ہندوستان کے لوگوں کے جنوب مشرقی ایشیا اور چین کے

ساتھ تجارتی تعلقات میں قابلِ ذکر اضافہ ہوا۔

ہنوں کے حملوں کے نتیجے میں نہ صرف مقامی آبادی بلکہ دیگر نسلوں کے لوگ بھی ہندوستان میں آباد ہوئے، جس سے ایک مخلوط معاشرہ وجود میں آیا۔ ان کے بعد بھی متعدد قبائل شمال مغرب کے راستے ہندوستان میں داخل ہوئے، جیسے کہ وسطی ایشیائی قبائل؛ ان میں سے کچھ شمالی ہندوستان میں بس گئے اور کچھ جنوب ومغرب کی جانب بڑھ گئے۔ پہلی بار، ہندوستانی تہذیب کو ہنوں کی جنگجویانہ (مارشل) ثقافت سے سامنا کرنا پڑا۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ شمالی ہندوستان میں آباد گُجر اور کچھ راجپوت خاندان ہنوں ہی کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ وَاللہُ أَعلَمُ بِالصَّوَاب۔

❁ ❁ ❁

زوالِ گپتا کے بعد پنجاب اور شمالی ہندوستان کا سیاسی منظر نامہ

(چھٹی صدی تا دسویں صدی عیسوی)

میں نے یہ جاننے کے لیے کہ گپتا سلطنت کے زوال کے بعد شمالی ہندوستان، خاص طور پر پنجاب میں کون حکمران بنا، کافی کوشش کی۔ مجھے جو بات سمجھ میں آئی، اس کے مطابق گپتا دور کے بعد ہندوستان کی وحدت بھی پارہ پارہ ہوگئی۔ کئی چھوٹی بڑی ریاستیں وجود میں آئیں، جن میں سے کچھ تو جنوب میں واقع تھیں، کچھ شمالی ہندوستان میں، جن میں پنجاب شامل نہیں تھا، اور کچھ ایسی بھی تھیں جن کا مرکز پشاور تھا۔ اس سفر نامے میں میں ان ہی حکمرانوں کا ذکر کروں گا، جو پنجاب سے متعلق ہیں۔ باقی ریاستوں کا ایک مختصر ذکر صرف اس لیے کیا جا رہا ہے تاکہ ہمیں پنجاب کی تاریخ سمجھنے میں آسانی ہو۔

جب پانچویں صدی کے آخر میں گپتا سلطنت بکھرنا شروع ہوگئی تو اس کی جگہ لینے کے لیے گپتا دربار کے کئی سرکردہ لوگوں نے سر اٹھانا شروع کیا، اور پانچ بڑی طاقتیں شمالی ہندوستان میں ابھر کر سامنے آئیں۔ یہ کوئی مضبوط ریاستیں نہیں تھیں، اس لیے ان کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ملتیں اور نہ ہی ان کے کوئی گہرے اثرات شمالی ہندوستان کے معاشرے پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان کے آخری دور میں ہن، جو وسطی ایشیا کی ایک جنگجو نسل تھی، ہندوستان پر حملہ آور ہوئے۔ وہ سکندر گپتا کے دور میں آئے مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ البتہ ہنوں نے شمالی ہندوستان کے کچھ حصوں پر تقریباً تیس سال کی ایک مختصر مدت تک قبضہ کیے رکھا۔ اس طرح شمالی ہندوستان میں ہنوں کی کچھ حد تک بالادستی قائم ہوئی۔ تورامانا ان کا ایک نمایاں حکمران تھا۔

مکھاریوں (موخاریوں) کا دورِ حکومت

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مطابق گپتا سلطنت کی تباہی میں مکھاریوں (جنھیں

موخاری بھی لکھا جاتا ہے) کا بھی کردار رہا، جو قنوج کے آس پاس، مغربی اتر پردیش کے باسی تھے۔ وہ گپتا دور میں بڑی بڑی جاگیروں کے مالک تھے۔ انھوں نے مگدھ کا کچھ حصہ بھی فتح کیا۔ رفتہ رفتہ انھوں نے بعد کے گپتا خاندان کو کمزور کیا اور گپتا حکمران مالوا کی طرف نقل مکانی پر مجبور ہو گئے۔

قنوج، گنگا کے مغربی کنارے پر، علی گڑھ سے لکھنؤ جانے والی سڑک پر کانپور کے قریب ایک قدیم شہر ہے۔ مکھاریوں کی ریاست میں زیادہ تر موجودہ اتر پردیش کے علاقے شامل تھے۔ یہ بھی درست ہے کہ مگدھ (جو اب جنوبی بہار میں واقع ہے) کے کچھ علاقوں پر بھی ان کا قبضہ تھا۔ تاریخ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ساتویں صدی کے آغاز میں گپتوں نے ان علاقوں کو دوبارہ فتح کر لیا تھا۔

مکھاریوں کے دور میں قنوج کی اہمیت اور خوشحالی میں بے حد اضافہ ہوا۔ تاریخ سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ وردھنا خاندان کے شہنشاہ ہرش وردھن (606ء تا 647ء) کے دور میں قنوج شمالی ہندوستان کا سب سے بڑا شہر بن گیا تھا، جسے ہرش نے اپنا دارالحکومت بنایا۔ یہ بات بھی اسی دور کی ہے جب معروف چینی سیاح ہیوان سانگ (Xuanzang) نے ہرش وردھن کے دور حکومت میں ہندوستان کا دورہ کیا، اور قنوج کا بے حد خوب صورت الفاظ میں ذکر کیا ہے۔[۱]

پسپا بھوتی خاندان (Puspabhuti dynasty) جس کا ایک مشہور راجہ رشا (ہرشا وردھن) بھی تھا۔

انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا کے مطابق پسپا بھوتی خاندان نے تھانیسر کو اپنا صدر مقام بنا کر ایک چھوٹی سی ریاست قائم کی۔ ارن کمار کے مطابق Sthanisvara جسے بعد میں تھانیشور یا تھانیسر بھی کہا جاتا ہے، کسی دور میں پسپا بھوتی خاندان کا صدر مقام تھا۔ تھانیسر، ہریانہ کے ضلع کروکشیتر میں ایک تاریخی شہر اور ہندوؤں کی ایک اہم زیارت گاہ ہے۔[۲] اس کا دہلی سے

---

[۱] Tripathi, *History of Kanauj* , p. 192

[۲] Arun, *The Political History of Northern India*:Post *Gupta Period*
http//:proceeding.conferenceworld.in/ASES-2018/32.pdf,Kumar

فاصلہ تقریباً 160 کلومیٹر ہے اور یہ دہلی کے شمال مغرب میں واقع ہے۔ کہا جاتا ہے کہ تھانیسر کے علاقے میں پسپا بھوتی خاندان گپتا دور سے ہی آباد تھا اور گپتا سلطنت کے زوال کے بعد اس خاندان نے اپنی ریاست کا اعلان کر دیا۔

پہلا پسپا بھوتی شہنشاہ پربھاکر وردھن ساتویں صدی عیسوی کے اوائل میں تھانیسر کا حکمران تھا۔ ان کے بعد ان کے بیٹے راجیہ وردھن اور ہرشا بھی راجہ بنے۔ پھر وہ وقت بھی آیا جب اس خاندان نے گپتوں سے الگ ہونے والی کئی ریاستوں کو شکست دے کر شمالی ہندوستان کے بیشتر حصوں پر ایک وسیع ریاست کی بنیاد رکھی۔

ارن کمار مزید لکھتے ہیں کہ اس خاندان کے پہلے تین حکمرانوں یعنی نارا وردھن، راجیہ وردھن اوّل اور آدتیہ وردھن نے ''مہاراجہ'' کا لقب اختیار کیا۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ یہ حکمران ابتدا میں گپتا کے ماتحت جاگیردار تھے۔ انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا کے مطابق ہرشا (ہرشا وردھن) 606ء میں تخت پر بیٹھا اور اس نے 41 سال حکومت کی۔ یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ سنسکرت کی سب سے بڑی تاریخی سوانح عمری ''ہرشکریت'' (ہرشا کے اعمال) ایک شخص بانا نے لکھی تھی، جو ہرشا وردھن کے دربار سے منسلک ایک مشہور مصنف تھا۔

میرے علم کے مطابق شمالی ہندوستان کا یہ پہلا ہندو حکمران تھا جس کی تحریریں موجود ہیں۔ اگرچہ ہرشا ایک بڑی ریاست بنانے میں کامیاب نہیں ہوا، لیکن اس نے شمالی ہندوستان کے ایک ممتاز حکمران کے طور پر شہرت حاصل کی۔ انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا کے مطابق وہ تین سنسکرت ڈراموں کا مصنف بھی تھا: ''رتناول''، ''پریادرشیکا''، اور ''ناگنند''۔ اس کی بعض تحریروں سے بدھ مت فکر میں دلچسپی کے آثار بھی ملتے ہیں۔ اس کے دور میں چین کے تانگ شہنشاہ تائیز ونگ نے ہرشا کے دربار میں اپنے سفارت کار بھیجے تھے، جس سے دونوں ممالک کے درمیان قریبی تعلقات کا ثبوت ملتا ہے۔ شنکر گوپال نے ہرشا کی سوانح عمری لکھی ہے۔[1] ان کے مطابق چھٹی صدی

[1] Shankar Goyal (2006). Harsha, a multidisciplinary political study. Kusumanjali. p.122

عیسوی کے وسط میں جب گپتا سلطنت زوال پذیر ہوئی تو شمالی ہندوستان کئی خودمختار ریاستوں میں تقسیم ہو گیا۔

میں اب تک جو جان سکا ہوں، اس کے مطابق گپتا خاندان کے دور میں پنجاب پر ان کا قبضہ تھا اور ان کا مرکز مگدھ تھا۔ پربھاکر وردھن (ہرشا کا والد) پہلا پنجاب سے تعلق رکھنے والا ہندو جاگیردار تھا جس نے تھانیسر، جو اس وقت پنجاب کا ایک شہر تھا، کو بنیاد بنا کر اپنی ریاست کی بنیاد رکھی۔ اس سے پہلے جو بھی پنجاب کے حکمران بنے، ان کا تعلق یا تو مشرقی یا وسطی ہندوستان سے تھا یا وہ وسطی ایشیا، یونان اور ایران سے آئے ہوئے تھے۔

پربھاکر وردھن نے اپنی طاقت بڑھانے کے لیے اپنی ہمسایہ ریاستوں کے خلاف جنگیں کیں اور خاص طور پر ہن قوم کو مکمل طور پر شمالی ہندوستان سے نکالنے میں کامیاب ہوئے، جو اس وقت ایک اہم چیلنج تھا۔ میرے خیال میں اس خاندان کی ریاست قائم ہونے کے بعد ہندوستان کی تاریخ میں سیاسی طاقت کا توازن تبدیل ہونے لگا۔ اب ایک نئی طاقت پنجاب میں ابھر رہی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسی دور سے پنجاب پر پنجاب سے تعلق رکھنے والے افراد کی حکمرانی کا سلسلہ شروع ہوا۔

پربھاکر وردھن کے انتقال کے بعد ان کے بڑے بیٹے راجیہ وردھن نے حکومت سنبھالی، جبکہ چھوٹے بھائی ہرش نے بھی بعد میں اہم کردار ادا کیا۔ ہرش نے اپنے بھائی کی وراثت کو آگے بڑھایا اور ایک مضبوط سلطنت قائم کی، جو ہندوستان کی تاریخ میں ایک اہم دور شمار ہوتی ہے۔ یہ دور اس بات کا ثبوت ہے کہ ہندوستان میں حکومتی ڈھانچے میں تبدیلیاں اور جاگیرداری نظام کے استحکام کا تعلق کس طرح سیاسی طاقت کی جدوجہد سے تھا۔

ہرشا نے اکتالیس سال تک حکمرانی کی اور اس دور میں جالندھر (پنجاب میں)، کشمیر، نیپال، ولابھی، گجرات، مالوا، سندھ، سرحدی صوبے، آسام، متحدہ صوبے، بہار، بنگال، اڑیسہ، وسطی ہندوستان اور راجپوتانہ جیسے کئی علاقے براہِ راست اس کے تحت تھے۔ ہرشا کوشش کے باوجود دکن یا جنوبی ہندوستان پر قبضہ نہ کر سکا۔ ہرشا کی ایک اہم خوبی یہ تھی کہ وہ لوگوں سے براہِ راست رابطہ رکھنے کے لیے اکثر سفر میں رہتا تھا۔ باوجود انتظامی فرائض کے، وہ کئی ڈرامے لکھنے میں بھی کامیاب

رہا۔اس نے ایک شاندار دربار قائم رکھا تھا جہاں فلسفی، شاعر اور ڈرامہ نگار موجود رہتے تھے۔
ہرشا ابتدا میں شیو کا عقیدت مند تھا۔کہا جاتا ہے کہ بعد میں وین سانگ کی تبلیغ کے نتیجے میں اس نے بدھ مت اختیار کرلیا(میرے خیال میں وہ بدھ مت سے متاثر ضرور تھا)۔وہ تمام مذاہب کی یکساں سرپرستی کرتا تھا۔اس کے دور میں ریاست کی طرف سے لوگوں اور جانوروں کے لیے مفت ہسپتال چلائے جاتے تھے۔اس نے کئی آرام گاہیں (دھرم شالہ) بھی تعمیر کروائیں جہاں مسافروں اور غریبوں کو مفت کھانا اور رہائش ملتی تھی۔ہرشا کے بارے میں جو کچھ جاننے کو ملا، وہ سب حیران کن ہے۔میں کوشش کروں گا کہ اس کے بارے میں الگ سے بھی لکھوں۔

راجپوت حکمرانی

شمالی ہندوستان میں ریاستی تشکیل اور سیاسی اقتدار کا جائزہ

میں نے پچھلے صفحات میں یہ بیان کیا ہے کہ گپتا دور کے بعد ہندوستان میں کئی ریاستیں وجود میں آئیں اور ایک متحد ہندوستان کا تصور ختم ہو گیا۔ مگر ہرشا نے کسی حد تک شمالی ہندوستان میں ایک وسیع علاقے پر حکومت قائم کر کے متحدہ شمالی ہندوستان کو کسی نہ کسی شکل میں برقرار رکھا۔ جیسے ہی ہرشا کی موت واقع ہوئی، شمالی ہندوستان کا یہ سیاسی اتحاد بھی ختم ہو گیا۔ مختلف علاقوں میں کئی چھوٹی بڑی ریاستیں وجود میں آ گئیں۔ اس افراتفری کا سب سے زیادہ فائدہ راجپوتوں نے اٹھایا۔ وہ قنوج پر کنٹرول کے لیے باہم برسرِ پیکار ہوئے اور اس سیاسی کشمکش کے دور میں ہرشا کی سلطنت کے کھنڈرات پر اپنی اپنی ریاستیں قائم کر لیں۔

اس حوالے سے ایک طویل مضمون P Bhaskar Reddy نے اپنی کتاب *Outlines of Indian History* میں Major Dynasties of North India (647-1200) CE کے عنوان سے تحریر کیا ہے۔

میرے خیال میں یہ کتاب ہندوستان کی تاریخ کو سمجھنے کے لیے سب سے مفید کتابوں میں سے ایک ہے۔[1] اس مضمون سے حاصل کردہ علم پیشِ خدمت ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ میں حوالہ تو ضرور دیتا ہوں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ جو کچھ لکھتا ہوں، اس کی تصدیق دیگر کئی معتبر ذرائع سے بھی کرتا ہوں۔ تاہم، پھر بھی غلطی کا احتمال باقی رہتا ہے، جس کی اصلاح کے لیے میں آپ کی

---

[1] http://ebooks.inflibnet.ac.in/icp01/chapter/major-dynasties-/of-north-india-647-1200-ce

رہنمائی کا منتظر رہتا ہوں۔

راجپوت دور کا آغاز اور مسلمان حملہ آور

P Bhaskar Reddy کی فراہم کردہ معلومات ہندوستان کی تاریخ کے ایک نہایت اہم دور کی عکاسی کرتی ہیں، جسے ''راجپوت دور'' کہا جاتا ہے۔ یہ دور ہرشا کی وفات کے بعد شروع ہوتا ہے اور بارہویں صدی میں مسلمانوں کی فتح تک جاری رہتا ہے۔ راجپوت دور میں ہندو مذہب اور ثقافت کے تحفظ میں راجپوتوں نے اہم کردار ادا کیا۔ یہ دور سیاسی، سماجی، اقتصادی اور مذہبی تبدیلیوں کا گواہ رہا۔

ساتویں صدی کے وسط سے لے کر بارہویں صدی کے آخر تک کا وقت دو بڑے مراحل میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

پہلا مرحلہ (آٹھویں سے دسویں صدی): اس مرحلے میں تین بڑی ریاستیں ابھرتی ہیں:

- ✓ راشٹرکوٹ (مغربی دکن)
- ✓ پرتھیہار (مالوا اور گجرات)
- ✓ پال (بنگال)

(The Rashtrakutas of Western Deccan, the Pratiharas of Malwa and Gujarat, and the Palas of Bengal)

ان تینوں طاقتوں کے درمیان مسلسل جنگیں جاری رہیں۔ اس طرح شمالی ہندوستان کے ساتھ ساتھ دکن، گجرات، اور بنگال بھی میدانِ جنگ بنے رہے، جس کے نتیجے میں قنوج، گجرات، اور مالوا سیاسی کشمکش کے مرکز بن گئے۔ ان طاقتوں کے باہمی تنازعات نے ہندوستان کی سیاسی، معاشی اور سماجی ساخت کو بری طرح متاثر کیا اور علاقائی طاقتوں کے عروج وزوال کا باعث بھی بنے۔

دوسرا مرحلہ: راجپوت دور کے دوسرے مرحلے میں جب مسلمان طاقتیں ابھرنے لگیں، تو یہ سوال اہم ہوگیا کہ راجپوتوں کی جنگی مہارت اور شجاعت کے باوجود مسلمان حملہ آور کیسے کامیاب ہوئے؟

گیارہویں اور بارہویں صدی میں، جب محمود غزنوی اور بعدازاں محمد غوری نے ہندوستان پر حملے کیے، تو راجپوتوں کے درمیان اندرونی اختلافات اور باہمی کشمکش ان حملوں کا مؤثر جواب دینے میں سب سے بڑی رکاوٹ بنی۔ اگرچہ شمالی ہندوستان میں کئی طاقتور راجپوت ریاستیں موجود تھیں، لیکن وہ اکثر ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتی تھیں۔ یہی باہمی نفاق اور سیاسی کمزوری مسلمانوں کی کامیابی کا بنیادی سبب بنا۔ جب مسلمان حکمرانوں نے حملہ کیا، تو مقامی ریاستیں نہ صرف دفاعی لحاظ سے تیار نہ تھیں بلکہ آپس میں بھی متحد نہ ہو سکیں۔ یہی کمزوری ان کی شکست کا سبب بنی۔

Kannauj State



Photo Credit: University of Texas map library–India Political map 2001

یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ اس دور میں راجپوتوں کی ثقافت، شجاعت اور عزتِ نفس نمایاں خصوصیات تھیں۔ تاہم ان کی حکمرانی کے دوران کئی سماجی اور مذہبی تبدیلیاں بھی رونما ہوئیں۔ مسلمانوں کی آمد نے ہندوستانی ثقافت پر گہرے اثرات مرتب کیے، جس کے نتیجے میں نئے سماجی اور مذہبی تجربات وجود میں آئے۔

راجپوت دور ہندوستان کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے، جو جنگ، سیاست، اور ثقافتی تحفظ کی داستانوں سے بھرا ہوا ہے۔ اس دور میں راجپوتوں نے اپنے طور پر ایک تاریخی کردار ادا کیا، لیکن ان کی باہمی چپقلشیں بالآخر ان کی کمزوری اور مسلم فتوحات کی راہ ہموار کرنے کا سبب بنیں۔ یہ وہ دور تھا جب عوام ذات پات کے نظام سے شدید طور پر پریشان تھے، اور ایسے حالات میں وہ ایک نجات دہندہ کی تلاش میں تھے۔ یہ ایک نہایت اہم نکتہ ہے، کیونکہ عوام کی غیر مطمئن حالت اور سیاسی عدم استحکام نے راجپوتوں کے لیے مزید مشکلات پیدا کیں۔ جب مسلمان حملہ آور شمالی ہندوستان میں داخل ہوئے تو انھیں عوام کی جانب سے کسی بڑی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا، کیونکہ لوگوں نے اپنی اجتماعی مشکلات کے تناظر میں کوئی منظم اور متحد ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔

یہ تمام عوامل اس امر کی وضاحت کرتے ہیں کہ راجپوتوں کی شجاعت اور جنگی مہارت کے باوجود مسلمان حکمران کس طرح کامیاب ہوئے۔ یہ ایک پیچیدہ دور تھا، جس میں سیاسی، سماجی اور ثقافتی تبدیلیاں ایک دوسرے سے گہری طور پر جڑی ہوئی تھیں۔ اگرچہ راجپوتوں کی شجاعت تاریخ میں نمایاں مقام رکھتی ہے، لیکن ان کی باہمی تقسیم اور اندرونی کمزوری نے انھیں مؤثر دفاعی محاذ قائم کرنے سے روک دیا۔

راجپوت: لفظ کی تاریخ

راجپوتوں کی اصل کے حوالے سے تاریخی آراء اور نظریات نہایت متنوع اور دلچسپ ہیں۔ یہ موضوع ہندوستان کی تاریخ و تمدن کو سمجھنے کے لیے کلیدی اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ راجپوت صرف ایک فوجی قوت ہی نہیں تھے بلکہ ان کی ثقافت اور روایات نے بھی ہندوستانی تاریخ پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ باشکر ریڈی کے مطابق ''راجپوت'' (راج پُتر/ راج پوترا) کی اصطلاح

بارہویں صدی تک مختلف قبیلوں یا بعض مخصوص خاندانوں کے لیے ایک اجتماعی لقب کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ یہ اصطلاح بالعموم کھشتریوں کے ایک مخصوص طبقے کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال کی جاتی تھی، جو اپنی شجاعت، جنگی مہارت اور حکمرانی کے لیے معروف تھے۔

اگنیکول کے نظریے کے مطابق راجپوتوں کی اصل آگ کے ایک دیوتا سے منسوب کی جاتی ہے، جس میں یہ تصور موجود ہے کہ یہ جنگجو قبیلے آگ سے جنم لینے والے ہیں اور ان کی بہادری، قربانی اور سخت محنت ان کی اصل پہچان ہے۔ اس نظریے کے مطابق پرتیہار، چالوکیہ، پرمار، اور چوہان جیسے قبیلے راجپوتوں کے اجداد شمار کیے جاتے ہیں، جنھوں نے ہندوستانی تاریخ میں نمایاں کردار ادا کیا۔

ایک بڑی تعداد میں مؤرخین کا یہ خیال بھی پایا جاتا ہے کہ راجپوتوں کی تشکیل میں غیر ملکی حملہ آوروں کا بھی کردار رہا۔ ان کے مطابق، مختلف حملہ آور قبائل کو ہندوستانی معاشرے میں بتدریج جذب کیا گیا، اور ان سے نئے قبیلے وجود میں آئے۔ اس نظریے کے مطابق راجپوت درحقیقت ایک مخلوط النسل قوم تھے، جن کی شناخت مختلف نسلوں، تہذیبوں، اور ثقافتی اثرات سے بنی۔

مورخ V.A۔ Smith نے یہ رائے پیش کی کہ راجپوت مختلف نسلوں اور قبائل کے امتزاج سے تشکیل پائے۔ ان کے مطابق پرتھیہار، پرمار، چوہان، اور چالوکیہ جیسے قبیلے بنیادی طور پر غیر ملکی نسل سے تعلق رکھتے تھے، جبکہ دکن کے راشٹرکوٹ، راجپوتانہ کے راٹھور، گجرات کے سولنکی، اور بنڈیل کھنڈ کے چندیلا خاندان آریائی کھشتریا نسل سے منسلک کیے جاتے ہیں جو قدیم ہندوستانی ثقافت کا تسلسل تھے۔ راجپوتوں کی تشکیل میں شامل مختلف نسلوں، ثقافتوں، اور قبائل کی آمیزش اس امر کی غماز ہے کہ ہندوستان کی تاریخ کس قدر متنوع اور پیچیدہ رہی ہے۔ یہ سب عوامل مل کر راجپوتوں کو ایک منفرد تہذیبی اور تاریخی شناخت عطا کرتے ہیں۔

❀❀❀

گُجر پر تیہار خاندان

(The Gurjara Pratiharas یا The Pratiharas of Kanauj)

گُجر پر تیہار خاندان، جسے گورجارا پر تیہار بھی کہا جاتا ہے، نے شمالی ہندوستان کے ایک بڑے حصے پر حکمرانی کی۔ انھیں The Pratiharas of Kanauj اور The Gurjara Pratiharas کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ باشکر ریڈی کے مطابق گورجارا پر تیہار، راجپوت حکمرانوں میں سب سے قدیم خاندانوں میں سے ایک تھا۔[1] انھوں نے راجپوتانہ میں جودھ پور کے آس پاس کے علاقے میں، ہری چندر نامی ایک برہمن کی قیادت میں اپنی ریاست کی بنیاد رکھی۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ وہ رامائن میں مذکور شمسی نسل کے کھشتری لکشمن (رام کے بھائی) کی نسل سے تعلق رکھتے تھے، جبکہ بعض مورخین کے مطابق یہ خاندان غیر ملکی گُجرا قبیلے کی ایک شاخ تھا، جس کے ہن قوم سے قریبی روابط تھے۔

یہ لوگ چھٹی صدی عیسوی کے ابتدائی برسوں میں شمالی ہندوستان میں داخل ہوئے اور بعد ازاں جنوبی راجپوتانہ میں ایک وسیع سلطنت قائم کی، جس کا دارالحکومت بھیمل تھا۔ وہ ہرش وردھن (ہرشا) کے دورِ حکومت میں ایک خود مختار طاقت کے طور پر ابھرے (یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ہرش کے اتحادی رہے ہوں)۔ ہرشا کی وفات کے بعد آٹھویں صدی کے اوائل میں انھوں نے قنوج پر قبضہ کرلیا۔

اس خاندان کا پہلا عظیم حکمران ناگ بھٹ اول تھا، جس نے 725ء سے 740ء تک

---

[1] https://ebooks.inflibnet.ac.in/icp01/chapter/major-/dynasties-of-north-india-647-1200-ce

حکومت کی۔ اس نے سندھ پر قابض عربوں کے خلاف کامیاب جنگیں لڑیں۔ ناگ بھٹ کا اثر و رسوخ مالوہ، راجپوتانہ اور گجرات کے بعض حصوں تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کی راجدھانی اجین تھی، جو وسطی ہندوستان کے مالوہ علاقے میں دریائے کشپرا کے مشرقی کنارے پر واقع ایک قدیم شہر ہے، جو آج مدھیہ پردیش کی ریاست کا حصہ ہے۔ اجین ان چار مقدس مقامات میں شامل ہے جہاں کمبھ میلہ (جسے سمہستھ میلہ بھی کہا جاتا ہے) منعقد ہوتا ہے، اور جہاں ہر بار ایک بڑی تعداد میں ہندو یاتری شریک ہوتے ہیں۔

ناگ بھٹ کے بعد دیوراج، وتسراج اور ناگ بھٹ دوم نے سلطنت کو مزید وسعت دی۔ ان کا اقتدار سندھ، دکن اور کلنگا تک پھیل گیا۔ انھوں نے بنگال کی طرف پیش قدمی کی اور بنگال کے بادشاہ دھرم پال کو بھی شکست دی۔ تاہم ایک جنگ میں شکست کے بعد پال خاندان کی بالادستی دوبارہ قائم ہوگئی، جس کے نتیجے میں پرتیہاروں کی طاقت کمزور پڑ گئی اور رفتہ رفتہ ان کا اقتدار تاریخ کا حصہ بن گیا۔

اس کے بعد ایک نیا دور شروع ہوتا ہے جب ناگ بھٹ کا پوتا مہر بھوج، جسے بھوج راجہ اول کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، اقتدار میں آتا ہے۔ وہ ایک کامیاب حکمران ثابت ہوا، جس نے 840ء سے 890ء تک تقریباً پچاس برس حکومت کی۔ میرے علم کے مطابق، اس دور میں شمالی، وسطی اور مشرقی ہندوستان کے وسیع علاقوں پر ایک مضبوط حکمران کی حکمرانی قائم ہوئی۔ یہ شمالی ہندوستان کے پہلے بڑے حکمرانوں میں سے تھے جنھوں نے سندھ پر قابض عربوں کے خلاف مؤثر مزاحمت کی۔ ان کامیاب جنگوں کے نتیجے میں تقریباً ایک صدی بعد سندھ پر عربوں کی حکمرانی کا خاتمہ ہوا۔

اسی دور میں جہاں قنوج ان کے قبضے میں تھا، وہیں مگدھ اور شمالی بنگال پر بھی ان کا تسلط قائم تھا۔ تاریخی حوالوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ایک بادشاہ مہندر پال اول نے علم و ادب کی سرپرستی کی، اور اس کے دربار میں معروف شاعر راج شیکھر موجود تھے، جنھوں نے کئی معروف کتابیں تصنیف کیں۔ یہ بات مسلم ہے کہ بھوج کی بادشاہی میں امن، استحکام

اور ثقافتی ترقی دیکھی گئی۔

ان کے بارے میں پڑھ کر جو میں نے سمجھا، اس کے مطابق گورجارا پرتیہار خاندان کی تاریخ ایک متنوع اور شاندار بہادری، فوجی مہارت، اور شرافت کی آئینہ دار ہے، جو ہندوستانی تاریخ میں ایک نمایاں مقام رکھتی ہے۔ ان کے حکمرانوں نے نہ صرف اپنی سلطنت کو مضبوط کیا بلکہ ثقافت، علم، اور سیاست کے میدانوں میں بھی قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ راجپوتوں کی یہ ثقافت آج بھی ہندوستان کی تاریخ کے ایک روشن باب کے طور پر دیکھی جاتی ہے، اور راجپوت آج بھی اس پر فخر کرتے ہیں۔

گورجارا پرتیہار کا زوال

مہندر پال کی وفات کے بعد، ایک طویل عرصہ تک حکمرانی کرنے والی پرتیہار سلطنت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اس بار، کئی اطراف سے ان پر حملے شروع ہو جاتے ہیں۔ ایک بڑا حملہ مہپال کے دورِ حکومت میں راشٹرکوٹ بادشاہ اندرا سوم نے کیا۔ یہ بادشاہ کون تھا؟ یہ بات جاننے کے قابل ہے، اور اس کا ایک مختصر تذکرہ قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث ہوگا۔

انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا کے مطابق راشٹرکوٹ ایک ہندو خاندان تھا، جس کا تعلق مہاراشٹر سے تھا۔ انھوں نے تقریباً 755ء سے 975ء تک دکن اور شمالی ہندوستان کے ایک بڑے حصے پر حکمرانی کی۔ مؤرخین کا خیال ہے کہ غالباً ان کا تعلق دراوڑ نسل سے تھا، اور یہ لوگ کنڑا زبان بولتے تھے، ساتھ ہی شمالی دکن کی زبانوں سے بھی واقف تھے۔ راشٹرکوٹوں نے چالوکیہ سمیت کئی ریاستوں کو شکست دی، اور بعد ازاں دکن کے ایک وسیع علاقے پر قابض ہو کر ہندوستان کی ایک بڑی قوت بن گئے۔ ان کی حکومت مالوا (مغربی ہندوستان) سے لے کر جنوب مشرق میں کانچی (کانچی پورم) تک پھیلی ہوئی تھی۔ انسائیکلوپیڈیا میں یہ بھی ذکر ہے کہ ایک مسلمان سیاح نے راشٹرکوٹ بادشاہ کو دنیا کے چار عظیم ترین حکمرانوں میں شمار کیا۔ باقی تین حکمرانوں میں مسلمان بادشاہ، بازنطینی شہنشاہ، اور چین کا بادشاہ شامل تھے۔

راشٹرکوٹوں کا ایک اہم حکمران کرشنا دوم تھا، جس نے 878ء میں گجرات پر دوبارہ قبضہ کیا۔

اس کے بعد اندرا سوم، جو 914ء میں تخت نشین ہوا، نے قنوج پر قبضہ کرلیا اور راشٹر کوٹ اقتدار کو عروج تک پہنچا دیا۔ اس کے نتیجے میں گورجارا پر تیہاروں کا زوال مکمل ہو گیا۔ جیسا کہ ہمیشہ تاریخ میں ہوتا آیا ہے، جاگیردار سرداروں اور صوبائی گورنروں نے آہستہ آہستہ آزادی کا دعویٰ کرنا شروع کر دیا۔ گورجارا پر تیہار سلطنت بکھر گئی اور صرف قنوج اور اس کے گردونواح تک محدود ہو کر رہ گئی۔

پر تیہاروں کے زوال کے بعد کئی چھوٹی بڑی ریاستیں وجود میں آئیں، جن میں یہ قابلِ ذکر ہیں:

- ✓ چالوکیہ آف انہلواڑہ
- ✓ چندیلا آف بندیل کھنڈ
- ✓ پارمارا آف مالوا
- ✓ چوہان آف سکمبری
- ✓ گہوار آف جنوبی راجپوتانہ
- ✓ چیڈی آف دہلا

اب تک جو کچھ میں نے جانا ہے، اس سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ گورجارا پر تیہاروں کی تباہی ان طاقتوں کے ہاتھوں ہوئی جو وسطی اور جنوبی ہندوستان سے آئی تھیں، مگر انھوں نے شمالی ہندوستان میں اپنی مستقل حکومت قائم نہیں کی۔ ان کی طاقت کا مرکز مہاراشٹر رہا۔ انھوں نے ایک عظیم سلطنت کو ختم کیا، جس کے نتیجے میں کئی چھوٹی ریاستیں وجود میں آئیں۔ یہ ریاستیں اس قابل نہیں تھیں کہ محمود غزنوی کا مقابلہ کر سکتیں، اور حملہ آور بھی اپنے علاقے واپس لوٹ گئے۔

گورجارا پر تیہار سلطنت کو آخری ضرب محمود غزنوی نے لگائی، جس نے 1019ء میں قنوج پر حملہ کر کے اسے فتح کرلیا۔ پر تیہاروں کے جانشین، جیسے ترلوچن پالا اور نسپالا، 11ویں صدی کے آخر تک موجود رہے۔ بالآخر 1090ء میں ایک اور راجپوت خاندان نے، جسے راٹھور یا گہوار کہا جاتا ہے، قنوج کو فتح کیا۔ اس کے ساتھ ہی پر تیہاروں کا عظیم راجپوت خاندان تاریخ کے سیاسی منظرنامے سے غائب ہو گیا۔

میں ان چھوٹی ریاستوں کی تفصیل بیان نہیں کرنا چاہتا، کیونکہ یہ میرے اس سفرنامے کے دائرہ کار سے باہر ہے۔ البتہ جو کچھ جان پایا، اُس کے مطابق اُس دور میں شمالی ہندوستان میں کئی ریاستیں قائم تھیں۔ ایک ریاست اٹک کے پار بھی تھی، جسے ہندوشاہی خاندان کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہی ہندوشاہی خاندان تھا جس نے محمود غزنوی کا مقابلہ کیا۔ میں اس خاندان کا مختصر تذکرہ کرنا چاہتا ہوں، کیونکہ ہندوشاہی کے خاتمے کے بعد ہی محمود غزنوی شمالی ہندوستان، خاص طور پر پنجاب، پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوا۔ باشکر ریڈی نے درج ذیل فہرست ان ریاستوں کی دی ہے جو گورجارا پر تیہار کے بعد وجود میں آئیں۔ میں ان کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے افراد کو ان کی تفصیل ضرور پڑھنی چاہیے۔ اس فہرست سے یہ بات مزید واضح ہوجاتی ہے کہ ان ریاستوں کے باہمی تنازعات کی وجہ سے یہ کسی بھی حملہ آور کو روکنے کے قابل نہیں تھیں۔ یہی بات محمود غزنوی کے حق میں جاتی تھی۔

اب تک جو میں نے راجپوت ریاستوں کے بارے میں جانا ہے، اس کا خلاصہ کچھ یوں ہے:

راجپوتوں کی تاریخ کا نمایاں دور ہرش وردھن (ہرشا) کی موت (647 عیسوی) سے لے کر مسلمانوں کی سلطنت کے قیام (1192 عیسوی) تک کا شمار کیا جاسکتا ہے۔ اس عرصے میں راجپوتوں نے شمالی ہندوستان کی سیاسی اور ثقافتی تاریخ پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ انھوں نے اس دوران طاقتور علاقائی سلطنتیں قائم کیں۔ ان کی طاقت کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ انھوں نے مقامی حکمرانی کی بنیاد پر علاقائی حکومتیں تشکیل دیں، جیسے کہ چوہان، جو دہلی اور آگرہ کے گردونواح میں حکمرانی کرتے تھے (یہی چوہان تھے جنھوں نے دہلی کے قریب محمد غوری کا مقابلہ کیا تھا)، پرتیہار جنھوں نے قنوج کو اپنا مرکز بنایا، اور سسکھیہ جو راجستھان کے مختلف علاقوں پر قابض تھے۔

راجپوت اپنی فوجی مہارت اور شجاعت کے لیے ہمیشہ سے معروف رہے ہیں۔ ان کے پاس عمدہ جنگجو اور مؤثر جنگی حکمت عملی تھی، جس کی بدولت انھوں نے کئی معرکوں میں کامیابیاں

حاصل کیں۔ لیکن ان تمام خوبیوں کے باوجود ان میں اتحاد کی شدید کمی تھی، جس کے باعث وہ اکثر مشترکہ دشمن کے خلاف یکجا ہو کر لڑنے میں ناکام رہے۔ ان کی مختلف ریاستیں ایک دوسرے کے ساتھ باہمی جھگڑوں میں الجھی رہیں، جس نے انھیں بیرونی حملہ آوروں کے سامنے کمزور کر دیا۔

راجپوتوں کی سیاست میں موروثی بادشاہت کا تسلسل نمایاں خصوصیت کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے، جس کے تحت طاقتور خاندان نسل در نسل حکومت کرتے رہے۔ ان کی حکومتوں میں جاگیرداری نظام بھی قائم تھا، جس کے تحت جاگیرداروں کو وفاداری کے عوض زمینیں دی جاتیں، جو بعد ازاں مقامی سطح پر طاقت کا ذریعہ بنیں۔ میرے علم کے مطابق یہ نظام پہلی مرتبہ راجپوتوں کے دور میں واضح طور پر سامنے آیا۔

راجپوت حکمرانوں نے اپنی طاقت کو اپنے دھرم سے وابستہ رکھا اور اسے بھگوان کی طرف سے عطا کردہ انعام سمجھتے تھے، یعنی وہ اپنی حکمرانی کو خدا کی مرضی سے تعبیر کرتے تھے۔ باوجود اس کے کہ ان کا دور جنگ وجدل کا دور تھا، انھوں نے ثقافتی میدان میں بھی بھرپور کردار ادا کیا۔ ان کی شجاعت، وفاداری، اور جنگی ثقافت نے ان کی روایات کو جلا بخشی۔ وہ فنونِ لطیفہ، موسیقی، اور ادب کے بڑے سرپرست تھے۔

یہ بات بھی اہم ہے کہ اگرچہ راجپوتوں نے بہت کچھ حاصل کیا، ان کے حصے میں کئی ناکامیاں بھی آئیں۔ سب سے بڑی ناکامی اجتماعی اتحاد کے فقدان کی صورت میں تھی۔ دشمنوں کے خلاف متحد نہ ہو سکنے کی وجہ سے وہ بار بار شکست کا شکار ہوئے۔ یہی عدمِ اتحاد بعد میں آنے والے مسلمان حملہ آوروں اور وسطی ہندوستان سے اٹھنے والے راشٹرکوٹا کے خلاف ان کی ناکامی کی وجہ بنی، جس نے ان کے سیاسی اثر و رسوخ کو شدید متاثر کیا اور ان کی ریاستوں میں عدمِ استحکام پیدا کر دیا۔

راجپوتوں کا دور شمالی ہندوستان کی تاریخ میں ایک اہم باب کی حیثیت رکھتا ہے، جو اپنی سیاسی طاقت، ثقافت، اور روایات کے ذریعے اس خطے کی شناخت بنا۔ اگرچہ اس دور میں سیاسی

انارکی اور خلفشار بھی موجود رہا، لیکن شجاعت، علم دوستی، اور ثقافت سے ان کی وابستگی نے انھیں تاریخ میں ایک نمایاں مقام عطا کیا۔ راجپوتوں کا دور آج بھی ہندوستانی ثقافت، فنونِ لطیفہ، اور تاریخ میں اپنی انفرادی پہچان رکھتا ہے۔ ان کے دور کی باقیات آج بھی شمالی ہندوستان کے مختلف علاقوں میں دیکھی جاسکتی ہیں، جو ان کی علم دوستی، فنونِ لطیفہ کے فروغ، عوامی فلاح و بہبود، اور ہندو دھرم کی ترویج کی گواہ ہیں۔ راجپوتوں کی بہادری کی زندہ مثالیں ان کی جنگوں، تاریخی مقامات، اور رزمیہ داستانوں میں آج بھی محفوظ ہیں، جو یہ ثابت کرتی ہیں کہ انھوں نے اپنی ثقافت اور روایات کی حفاظت کے لیے کتنی بڑی قربانیاں دیں۔

یہ دور نہ صرف سیاسی اور عسکری لحاظ سے اہم تھا، بلکہ اس نے سماجی اور ثقافتی میدان میں بھی بڑی تبدیلیاں لائیں، جن کی جھلک ہمیں آج بھی نظر آتی ہے۔ راجپوتوں کی طاقت، وفاداری، اور ثقافتی ورثے نے شمالی ہندوستان کی تاریخ کو ایک الگ پہچان عطا کی، جو آنے والی نسلوں کے لیے بھی ایک سبق ہے۔

❁ ❁ ❁

ملتان کی پیش از اسلامی تاریخ

عربوں کی آمد سے قبل کا سیاسی و مذہبی منظر نامہ

میں نے اس بات کی کھوج لگانے میں خاصا وقت صرف کیا کہ یہ جان سکوں کہ جنوبی پنجاب (جسے میں سہولت کے لیے ملتان کے نام سے لکھوں گا) پر عرب مسلمانوں کا قبضہ کب ہوا، اس وقت یہاں کون سا ہندو راجہ حکومت کر رہا تھا، اور اس زمانے میں شمالی ہندوستان کے دیگر علاقوں پر کس کا راج تھا۔ جو کچھ میں جان سکا، وہ پیشِ خدمت ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

آٹھویں صدی عیسوی (711ء) سے لے کر دسویں صدی کے آخری سال (1000ء) تک کا درمیانی دور شمالی ہندوستان کے وسطی اور مغربی حصوں میں ایک بڑی تبدیلی کا زمانہ مانا جاتا ہے۔ اس سے پہلے ان علاقوں پر ہندو مذہب کے ماننے والے حکمرانوں کی حکومت تھی۔ کوئی مرکزی حکومت موجود نہیں تھی، بلکہ شمالی ہندوستان میں کئی خودمختار ریاستیں قائم تھیں۔ اسی طرح سندھ میں دو عرب ریاستیں قائم ہو چکی تھیں: ایک ملتان میں اور دوسری منصورہ میں۔ (بعض روایات کے مطابق مکران کے ساحل کے قریب ایک تیسری عرب ریاست بھی موجود تھی۔) ہندوستان کی مغربی سرحد پر ہندو شاہی سلطنت واقع تھی، جو پنجاب سے لے کر کابل تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا دارالحکومت وائے ہند (موجودہ اٹک خورد) تھا۔ جے پال اور اس کا بیٹا آنند پال اس کے نمایاں حکمران تھے۔

اسی دور میں کشمیر میں ایک خودمختار ریاست قائم تھی جس پر لوہارا خاندان کی حکومت تھی، اور ان کے ہندو شاہیوں کے ساتھ خاندانی تعلقات بھی تھے۔ قنوج پر راجیہ پال کی حکومت تھی، جو گُرجَر پرتیہار خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اسی طرح کئی دیگر آزاد ریاستیں بھی موجود تھیں، جیسے

بنگال میں پال خاندان، مالوہ میں پرمارا خاندان، گجرات میں سولنکی خاندان، اور بندیل کھنڈ میں چنڈیلا خاندان۔ اس کے علاوہ جنوبی ہندوستان میں بھی کئی طاقتور ریاستیں قائم تھیں۔

ان تمام معلومات سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ چوتھی صدی عیسوی سے قبل ان علاقوں پر بدھ مت کا غلبہ تھا، اور آٹھویں صدی تک ہندومت کو غلبہ حاصل ہو چکا تھا۔ ہندوستان میں ہندو مت پر پہلی ضرب محمد بن قاسم کے حملے کے ذریعے لگی، جس کے نتیجے میں سندھ میں مسلمان حکمران قائم ہوئے، اور بعدازاں ملتان بھی ان کے زیرِ تسلط آیا۔ گیارہویں صدی میں، محمود غزنوی کے بعد پنجاب، سندھ، بلوچستان، اور موجودہ خیبر پختونخوا پر بھی مسلمان حکمران نظر آتے ہیں۔ اس تبدیلی کو ایک بڑے تاریخی موڑ کے طور پر دیکھنے کی ضرورت ہے۔

یہی وہ علاقے تھے جنھیں بعدازاں ملا کر مغربی پاکستان کی بنیاد رکھی گئی۔ اگر میں یہ کہوں کہ محمد بن قاسم کے ذریعے سندھ، اور محمود غزنوی و شہاب الدین غوری کے ذریعے پنجاب، بلوچستان، اور خیبر پختونخوا کے علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت قائم ہوئی، جو بالآخر پاکستان کی بنیاد بنی، تو یہ غلط نہ ہوگا۔

ملتان کی آبادکاری کا تاریخی دور: ایک تحقیقی جائزہ

ملتان کب آباد ہوا؟ اس بارے میں مختلف آرا اور دعوے موجود ہیں۔ حال ہی میں مجھے حمیرا عارف دستی اور عابدہ کوثر کا ایک تحقیقی مضمون ''Multan at the Time of Colonial Annexation'' پڑھنے کا موقع ملا۔ [1]

اس مضمون کے مطابق قدیم دور میں ملتان، عظیم موریہ سلطنت کا حصہ رہا، یعنی کم و بیش تین صدیاں قبل مسیح۔ بعدازاں کسی نامعلوم وجہ سے یہ شہر تباہی کا شکار ہو گیا۔

چینی بدھ سیاح ہیون سانگ کے ملتان کے سفر کا ذکر بھی کئی کتب میں موجود ہے (ساتویں صدی عیسوی)، جس میں اس نے ملتان کو ایک ترقی یافتہ اور خوشحال شہر قرار دیا۔ اس نے یہاں

[1] https//:pu.edu.pk/images/journal/historyPStudies/PDF-FILES/
1HumairaArifDasti_v26NO2Dec2013.p

سورج دیوتا کے ایک عظیم الشان مجسمے کا تذکرہ کیا، جو خالص سونے سے بنا ہوا تھا اور قیمتی جواہرات سے مزین تھا۔ اسی وجہ سے ملتان ہندومت کے پیروکاروں کے لیے ایک اہم مذہبی مقام بن گیا، جو اس شہر کی خوشحالی کا اہم ذریعہ بھی تھا۔ (میں نے اس سورج مندر کی باقیات دیکھی ہیں۔)

بعدازاں مختلف حملہ آوروں نے اس بت کو توڑا اور اس کے ساتھ وابستہ دولت کو لوٹ لیا۔

یہی وہ دور تھا (یعنی ساتویں صدی کے وسط میں) جب عرب مسلمان جزیرۂ عرب سے باہر فتوحات کا آغاز کر چکے تھے۔ متعدد مؤرخین نے محمد بن قاسم کی آمد سے قبل بھی ہندوستان کے مغربی علاقوں، جن میں سندھ، جنوبی پنجاب اور مکران شامل ہیں، پر عرب حملہ آوروں کی یلغار کا ذکر کیا ہے۔ تاہم، تاریخی شواہد سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی حملے کامیاب نہیں ہو سکے اور عرب مسلمان ان علاقوں میں کوئی باقاعدہ ریاست قائم نہ کر سکے۔

پہلا کامیاب حملہ، جس کے نتیجے میں ان علاقوں میں اسلامی ریاست قائم ہوئی، محمد بن قاسم ہی کا حملہ شمار ہوتا ہے۔ تاریخی شواہد سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ عربوں کی آمد کے ساتھ جنوبی ایشیا میں نئے سماجی و ثقافتی روابط نے جنم لیا، اور ایک کثیر الثقافتی معاشرے کی بنیاد پڑی۔ جب عرب مسلمانوں نے ملتان پر حملہ کیا، اس وقت یہ شہر ایک مضبوط فصیل سے گھرا ہوا تھا اور یہاں ہندو حکمرانوں کی حکومت تھی۔ یاد رہے کہ آٹھویں صدی کے آغاز تک شمالی پنجاب میں گپتا سلطنت کا زوال ہو چکا تھا، ہن قبائل واپس جا چکے تھے اور چھوٹی چھوٹی متعدد ریاستیں وجود میں آ چکی تھیں۔ انھی میں سے ایک ریاست ٹانک بادشاہی تھی، جسے ٹکا یا ٹکی بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ریاست چھٹی سے دسویں صدی تک قائم رہی اور اس کا مرکز آج کا سیالکوٹ تصور کیا جاتا ہے۔ یہ ریاست جنوب میں کشمیر، شمال میں سندھ، مغرب میں دریائے سندھ اور مشرق میں دریائے بیاس تک پھیلی ہوئی تھی۔

اسی طرح ایک اور اہم ریاست چمبا ریاست تھی، جو ہندوستان کی قدیم ترین ریاستوں میں سے ایک جانی جاتی ہے۔ اس کی بنیاد چھٹی صدی کے اواخر میں رکھی گئی اور یہ ریاست ہمالیہ کے دامن میں واقع تھی۔ (آج بھی لاہور میں ''چمبا ہاؤس'' کے نام سے ایک مشہور عمارت موجود ہے۔)

ایک تیسری نمایاں ریاست برہمن خاندان کی تھی، جو 632ء سے 712ء تک سندھ پر

حکمران رہا۔ اسی خاندان کو ''چچ خاندان'' کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ ان کا صدر مقام اروڑ تھا (جس کے کھنڈرات دیکھنے کا مجھے موقع ملا ہے)۔ اس ریاست کے بارے میں سب سے زیادہ معلومات چچ نامہ سے حاصل ہوتی ہیں، جو اس خاندان کی تاریخی روایت سمجھی جاتی ہے۔ جب عرب مسلمان سندھ میں داخل ہوئے، تو یہی خاندان برسراقتدار تھا، اور راجہ داہر اس کا آخری حکمران تھا، جسے محمد بن قاسم نے شکست دی۔

ان تمام تفصیلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب عرب مسلمان آٹھویں صدی میں سندھ میں داخل ہوئے تو اس وقت سندھ اور پنجاب میں کوئی مضبوط مرکزی حکومت موجود نہ تھی، جس کی وجہ سے عربوں کو کسی بڑی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اس کے بعد مسلم سلطنت نے ان علاقوں میں قدم جمائے اور سندھ سے لے کر ملتان تک اسلامی حکومت قائم ہوگئی۔ اس کے ساتھ ساتھ معاشرتی، مذہبی اور ثقافتی تبدیلیوں کا آغاز ہوا۔ گیارویں صدی کے آغاز میں محمود غزنوی شمالی پنجاب پر حملہ آور ہوا، اور اس کے بعد یہ علاقہ بھی مسلم حکمرانی کے تحت آ گیا۔

آٹھویں صدی کے آغاز سے ہی ملتان میں آباد ہندو یا تو دیگر علاقوں کی طرف ہجرت کر گئے یا اسلام قبول کرلیا۔ یوں وہ شہر جو ہندوؤں کے لیے ایک مقدس مقام تھا، رفتہ رفتہ اسلامی مرکز بن گیا۔ ملتان اس دور میں نہ صرف ایک اہم تجارتی اور ثقافتی مرکز رہا بلکہ اسلام کی اشاعت میں بھی اس کا اہم کردار رہا۔ یہاں کی مساجد، مدارس اور دیگر آثار اس تبدیلی کے گواہ ہیں۔ عربوں کی حکومت کے بعد، سکھوں اور انگریزوں کے مختصر دور کے علاوہ، ملتان پر زیادہ تر مسلم حکمران ہی قابض رہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ تقسیم ہند تک ملتان ہندوؤں کے لیے ایک سماجی و مذہبی مرکز کی حیثیت رکھتا تھا، جہاں پورے برصغیر سے ہندو زائرین آیا کرتے تھے۔

❁❁❁

جنوبی پنجاب میں عرب حکمرانی کا تاریخی و تمدنی جائزہ

عام طور پر یہ سننے کو ملتا ہے کہ اموی دور میں عرب محمد بن قاسم کی قیادت میں سندھ پر حملہ آور ہوئے اور راجہ داہر کو شکست دے کر سندھ فتح کیا۔اس کے ساتھ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عرب ملتان تک بھی پہنچے تھے۔تاہم، یہ بات میرے علم میں نہیں تھی کہ محمد بن قاسم کے جانے کے بعد عربوں نے ایک طویل عرصے تک ملتان پر حکمرانی کی، جو اُس وقت بھی اور آج بھی پنجاب کا ایک اہم حصہ ہے۔جب میں نے اس موضوع پر مطالعہ شروع کیا تو کئی دلچسپ حقائق سامنے آئے۔

اُس دور میں، جب شمالی ہندوستان میں کئی اہم ہندو اور بدھ ریاستیں قائم تھیں، سندھ کے ساتھ ساتھ جنوبی پنجاب اور مکران کے علاقے بھی عربوں کے زیرِ اثر تھے۔یہ یاد رہے کہ اس سے پہلے، نبی کریم ﷺ کی حیاتِ مبارکہ ہی میں جنوبی ہندوستان کے علاقے کیرالہ میں چیرامان مسجد بنائی گئی، جسے ہندوستان کی سب سے قدیم مسجد ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔یہ مسجد عرب مسلمان تاجروں نے تعمیر کی تھی یا اس وقت کے بادشاہ نے مسلمانوں کے لیے بنوائی تھی، اس بارے میں کوئی مستند معلومات دستیاب نہیں۔

میں نے بیلہ، بلوچستان میں ایک مزار بھی دیکھا ہے، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ محمد بن قاسم کے ایک جرنیل کا مزار ہے۔

یہ جاننے کے بعد میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ پنجاب کی تاریخ میں عرب حکمرانوں کا کردار انتہائی اہمیت کا حامل ہے، خاص طور پر اُس دور میں جب عرب مسلمان سندھ اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں داخل ہوئے۔بعدازاں، کئی عرب افغانستان کے راستے شمالی ہندوستان بھی آئے۔ان میں جنگجو بھی شامل تھے اور صوفیائے کرام بھی۔

تاریخ میں پہلی بار 711 عیسوی میں محمد بن قاسم کی قیادت میں عربوں نے سندھ پر حملہ کیا اور راجہ داہر کو شکست دے کر اس پر قبضہ کیا۔ یہ واقعہ ہندوستان پر مسلمانوں کے حملوں کی ابتدا تھا، جو ابدالی کے دور تک جاری رہی۔ یہی وہ دور ہے جب ہندوستان میں اسلامی فتوحات کا آغاز ہوا۔ ابدالی آخری افغان حکمران تھا جس نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ اس کے بعد کبھی بھی کوئی بھی بیرونی قوت ہندوستان پر حملہ آور نہ ہوسکی۔ افغانستان سے حملوں کے بند ہونے کی ایک بڑی وجہ پنجاب اور پشاور پر سکھوں کی حکومت تھی، جس کا سربراہ رنجیت سنگھ تھا۔

محمد بن قاسم کے بعد عربوں نے سندھ میں ایک منظم حکومت قائم کی اور ان کا اثر و رسوخ ملتان تک پھیل گیا۔ ملتان اُس وقت ایک اہم تجارتی مرکز ہونے کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کا ایک مقدس مقام بھی تھا۔ یہاں ''سورج کنڈ مندر'' کے نام سے ایک نہایت خوب صورت مندر موجود تھا، جس کے کھنڈرات اب باقی نہیں رہے۔ (میں نے اس جگہ کا دورہ کیا؛ اب اس کی باقیات بھی موجود نہیں ہیں۔)

یہ سب جاننے کے بعد یہ کہنا بجا ہے کہ قدیم دور میں ملتان ہندوؤں کا ایک مقدس شہر تھا۔ اگر آپ ملتان کے قلعے جائیں تو آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اس کے ایک کونے میں ''کالی دیوی'' کا مندر آج بھی موجود ہے، جو اس بات کی نشانی ہے کہ یہاں کبھی ہندو بڑی تعداد میں آباد تھے۔ ہندو تاریخ کے مطابق ہولی کی رسم کا آغاز بھی اسی کالی دیوی کے مندر سے ہوا تھا۔ سندھ کو فتح کرنے کے بعد عربوں نے ملتان پر بھی طویل عرصے تک حکمرانی کی۔ اس دوران انھوں نے علاقے میں اپنی ثقافت، مذہب، اور نظامِ حکومت متعارف کروایا، جس کے نتیجے میں ملتان اور اس کے گرد و نواح میں عرب اور اسلامی ثقافت کا فروغ ہوا۔ عربوں کے دور میں تجارتی راستے مضبوط کیے گئے اور مقامی معیشت کو فروغ ملا، جس کے نتیجے میں بڑی تعداد میں مقامی لوگوں نے اسلام قبول کیا۔

جو بات میں نے جانی، وہ یہ ہے کہ عرب جہاں بھی گئے خواہ وہ افریقہ ہو یا ایشیا کے دور دراز علاقے وہ واپس نہیں لوٹے، بلکہ وہاں کے معاشروں کا حصہ بن گئے۔ یہی معاملہ برصغیر میں بھی

پیش آیا۔ عرب حکمرانوں کی موجودگی اوران کے اثرات نے نہ صرف سندھ بلکہ جنوبی پنجاب میں بھی ایک اہم تاریخی دور کے آغاز میں کردارادا کیا۔ اس دور میں مقامی اور بیرونی ثقافتوں کے امتزاج، مذہبی تبدیلیوں اوراقتصادی ترقی کے کئی مظاہر دیکھنے کو ملتے ہیں۔

عربوں کی حکمرانی نے شمالی ہندوستان کی تاریخ میں ایک منفرد تہذیب وتمدن کو جنم دیا، جو بعد ازاں آنے والی نسلوں کے لیے ایک سنگِ میل ثابت ہوئی۔ یہ کہنا بجا ہوگا کہ عربوں نے پنجاب کی تاریخ میں ایک نمایاں مقام حاصل کیااوران کا اثر آج بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔

پنجاب کی تاریخ بیان کرتے ہوئے عرب حکمرانوں کا تذکرہ ناگزیر ہے۔ اسی لیے ان کا مختصر تعارف پیش خدمت ہے:

عرب کب سندھ میں آئے، کیوں آئے، کیسے آئے، ان کے اثرات کیا تھے، کب انھیں زوال آیا، اور سندھ کے بعد وہ ملتان کب پہنچے؟ ان سوالات کے جوابات کے لیے میں نے کئی کتب ومقالات کا مطالعہ کیا۔ ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

History of Civilizations of Central Asia, Vol. 4: The Age of Achievement, A.D. 750 to the end of the fifteenth century.

Muslim Invasions on India (Arabs, Ghazni, and Ghor)

پی، بھاسکر ریڈی

The Chachnamah: The Mussulman Period from the Arab Conquest to the Beginning.

علی بن حامد کوفی

اس کے علاوہ دیگر مضامین سے بھی رہنمائی حاصل کی۔ جو معلومات حاصل ہوئیں، وہ نذرِ قارئین ہیں۔

این اے بلوچ نے

The Rulers of Sind, Baluchistan, and Multan (750-1500)

کے عنوان سے ایک تحقیقی مضمون تحریر کیا، جس کی روشنی میں میں ہندوستان کے مغربی علاقوں میں عربوں کی آمد کا اجمالی جائزہ پیش کر رہا ہوں۔

ساتویں صدی عیسوی میں اسلام کا آغاز عرب میں ہوا، جس کی قیادت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمائی۔ بعدازاں بنوامیہ کی بادشاہت قائم ہوئی جس کا مرکز دمشق تھا۔ 711ء میں حجاج بن یوسف کی ہدایت پر محمد بن قاسم نے سندھ پر حملہ کیا۔

اس حملے کا ایک سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے تجارتی جہازوں پر دیبل کی بندرگاہ کے قریب ایک مقامی ہندو قبیلے نے حملہ کر کے سامان لوٹ لیا اور مسلمان عورتوں اور بچوں کو قید کر لیا تھا۔ محمد بن قاسم نے اس واقعے کا بدلہ لینے کے لیے راجہ داہر کے خلاف لشکر کشی کی۔ دیبل کی فتح کے بعد نیرون کوٹ، سیوستان، اور بالآخر اروڑ (راجہ داہر کا دارالحکومت) پر قبضہ کیا گیا۔

کچھ مؤرخین کا یہ بھی کہنا ہے کہ اصل واقعہ یہ تھا کہ چند افراد، حجاج بن یوسف کے خوف سے فرار ہو کر پناہ حاصل کرنے کی غرض سے سندھ آ گئے تھے، اور محمد بن قاسم ان کے تعاقب میں آیا تھا۔ اس موقف میں کس حد تک صداقت ہے، اس بارے میں اختلاف موجود ہے، اور دونوں مؤقف رکھنے والوں کے پاس اپنے دلائل ہیں۔ تاہم اس حقیقت پر کسی کو اختلاف نہیں کہ محمد بن قاسم نے سندھ پر حملہ کیا اور یہاں اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی۔

تین سالہ مہم کے دوران محمد بن قاسم نے سندھ میں اموی خلافت کی باقاعدہ حکومت قائم کی، اور بعدازاں مکران، ملتان، اور تھر کے علاقے بھی عربوں کے زیرِ نگیں آ گئے۔ عربوں کی حکومت کے دور میں سندھ اور جنوبی پنجاب میں اقتصادی، ثقافتی، اور سیاسی میدانوں میں اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اسلامی تعلیمات کے فروغ کے ساتھ ساتھ تجارتی راستے مستحکم ہوئے، زراعت کو فروغ ملا، اور مقامی لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے اسلام قبول کیا۔ عربوں کی آمد نے برصغیر میں اسلامی حکمرانی کے تسلسل کی بنیاد رکھی، جو بعدازاں ترک، افغان، اور مغل حکمرانوں کے عہد تک جاری رہی۔

عرب فتوحات کے تناظر میں ملتان اور جنوبی پنجاب پر سیاسی و تہذیبی تسلط

عربوں نے سندھ پر کنٹرول حاصل کرنے کے بعد شمال کی طرف فتوحات کا سلسلہ جاری رکھا۔ ملتان، جو جنوبی پنجاب کا ایک اہم اور تاریخی شہر تھا، ان کی اگلی منزل بنا۔ اُس وقت ملتان ایک اہم تجارتی اور ثقافتی مرکز تھا۔ عربوں کی فتح کے پیچھے مقامی ریاست کی کمزوری، جغرافیائی تنہائی، اور معاشی زبوں حالی جیسے عوامل کارفرما تھے۔ محمد بن قاسم اور ان کی افواج کی بہادری، بہتر اسلحہ، اور منظم حکمت عملی نے اس کامیابی میں کلیدی کردار ادا کیا۔ اس فتح کے نتیجے میں جنوبی پنجاب میں بھی اسلامی ثقافت کے اثرات قائم ہوئے۔

میں یہاں یہ بات ضرور کہنا چاہوں گا کہ تاریخ کو جذبات کی بجائے دلائل اور شواہد کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔ تاریخی واقعات کو جذباتی رنگ دینا تعصّبات کو جنم دیتا ہے اور حقائق کو مسخ کر دیتا ہے۔

عرب مسلمانوں کے اثر ورسوخ ہی کا نتیجہ تھا کہ جنوبی پنجاب، خاص طور پر ملتان، ایک نئے تہذیبی دور میں داخل ہوا۔ اس خطے میں اسلامی ثقافت اور عرب حکمرانی کا دور ایک اہم تاریخی باب کی حیثیت رکھتا ہے۔

امارتِ ملتان: ملتان میں پہلی آزاد مسلمان ریاست

یہاں میں ایک اہم اور دلچسپ تاریخی پہلو کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ محمد بن قاسم کے سندھ اور ملتان پر حملوں کے بعد جو صورت حال پیدا ہوئی، وہ ایک پیچیدہ اور متنوع تاریخی پس منظر کی عکاسی کرتی ہے۔ اس دور کے سیاسی اور انتظامی حالات کو سمجھنے سے ہم بہتر طور پر اس دور کی ساخت کا ادراک حاصل کر سکتے ہیں۔

محمد بن قاسم نے 711 عیسوی میں سندھ فتح کرنے کے بعد ملتان کا رخ کیا۔ اگرچہ سندھ میں اسلامی حکومت قائم ہو چکی تھی، لیکن مختلف داخلی و خارجی عوامل نے ایک مضبوط و مستحکم حکومت کے قیام کو مشکل بنا دیا۔ محمد بن قاسم کی جلد واپسی، اموی خلافت کے مرکز (دمشق) سے فاصلہ، اور

مقامی مزاحمت نے حکومتی ڈھانچے کو غیر مستحکم رکھا۔ جب اموی خلافت سیاسی کمزوری کا شکار ہوئی، تو عباسی خلفاء نے سندھ اور ملتان کے لیے گورنر مقرر کیے۔

تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ ملتان، مکران، اور سندھ کی مقامی حکومتیں مرکز سے دوری کے باعث خودمختاری کا احساس رکھتی تھیں۔ ان کا خلافت کے ساتھ تعلق صرف رسمی سطح پر تھا۔ عباسی دور میں بھی مرکز سے گورنر مقرر کیے گئے، لیکن جغرافیائی فاصلے اور مقامی سیاسی حالات کی بنا پر مرکزی حکومت کا اثر بہت محدود ہو چکا تھا۔ ان علاقوں کے باشندے مرکز سے دور ہونے کے باعث عملی طور پر خودمختار ہو چکے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب بغداد اور کوفہ کی مرکزی حکومت کمزور پڑی، تو ان علاقوں نے مکمل آزادی کا اعلان کر دیا۔

میرا ذاتی خیال ہے جو کہ غلط بھی ہوسکتا ہے کہ یہ خودمختاری ایک طویل تاریخی عمل کا نتیجہ تھی۔ اس کے نتیجے میں بنی امیہ اور بعدازاں بنو عباس کے دور میں سندھ (جس کی حدود بعض مؤرخین کے مطابق کشمیر تک پھیلی ہوئی تھیں) میں مرکز کی جانب سے گورنر مقرر ہوتے رہے۔ تاہم جب عباسی خلافت کمزور ہوگئی، تو مقامی مسلم گورنروں نے آزادی کا اعلان کر دیا۔

اسی دور میں جنوبی پنجاب کے مرکز، یعنی ملتان میں، پہلی آزاد مسلم ریاست کی بنیاد رکھی گئی۔ اس ریاست کے شمال میں ہندوشاہی حکومت قائم تھی، جبکہ جنوب میں سندھ میں بھی ایک مسلم حکمران موجود تھا۔ یوں ملتان کی یہ ریاست جنوبی پنجاب کی اسلامی تاریخ کا ایک اہم اور منفرد باب ہے۔

ملتان میں پہلی آزاد ریاست کے بارے میں ایک مفید مضمون:

Changing Dynamics of Arab Rule in Multan from the Eighth to Eleventh Centuries CE :A Study of the Banū Sāmah Kingdom

جو مہناز شاہین اور فوزیہ فاروق احمد نے لکھا ہے۔ اس مضمون کی مدد سے جو جان سکا، وہ پیشِ خدمت ہے۔

تاریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ملتان، جس کا قدیم نام ملاستھانہ (Mulasthana) بھی ملتا ہے، مغربی ہندوستان کے قدیم شہروں میں سے ایک ہے۔ یہ شہر پنجاب میں دریائے سندھ کے مشرق میں دریائے چناب کے کنارے پر واقع ہے۔ اس کا موجودہ نام عربوں کا دیا ہوا ہے۔ ملتان افغانستان سے ہندوستان آنے والے راستے پر واقع ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ملتان کے لوگ سندھ کے زمینی راستے سے ہوکر بحرِ ہند کی دیبل بندرگاہ کو استعمال کرتے ہوئے عرب اور جنوبی ایشیا تک تجارت کرتے تھے۔ یہ تجارتی تعلقات ملتان اور دیگر ممالک کے درمیان دیرینہ تعلقات کا ثبوت ہیں۔

محمد بن قاسم کی فوج نے سندھ کو فتح کرنے کے بعد ملتان تک پیش قدمی کی، اور یوں ملتان عرب مسلمانوں کے قبضے میں آیا۔ فتح کے بعد ولید العمانی کے بیٹے داؤد نصر کو ملتان کا گورنر مقرر کیا گیا۔ اس طرح جنوبی پنجاب میں ایک مسلمان ریاست کا قیام عمل میں آیا۔ بعد میں ایک عرصے تک اموی خلفاء ملتان کے گورنر مقرر کرتے رہے۔ اس ریاست کو امارات ِ ملتان کہا جاتا تھا۔ اس خاندان کی حکومت ایک عرصے تک قائم رہی۔

عباسی دور کے خاتمے کے بعد مکران، سندھ، اور ملتان میں پانچ مسلمان ریاستیں قائم ہوئیں، جن کا تفصیلی ذکر

N A Baloch اور A Q Rafiqi نے کیا ہے۔ یحییٰ امجد کی کتاب تاریخِ ہندوستان وسطی عہد سے بھی ان ریاستوں کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

یہ معلوم ہوتا ہے کہ نویں صدی کے وسط تک پہلے اموی اور بعد میں عباسی سندھ، مکران، اور شمالی پنجاب پر بالواسطہ حکمرانی کرتے رہے۔ نویں صدی کے وسط میں جیسے ہی سندھ پر مرکزی حکومت کا اختیار کمزور ہوا، ملتان میں آباد عرب قبیلے بنوسما (Banū Sāmah) یا بنو منبہ (Banū Munabbih) نے ایک آزاد ریاست کی بنیاد رکھی، جس کا دارالحکومت ملتان تھا۔

بنو منبہ (855-959) نے تقریباً ایک صدی تک حکومت کی۔ ان کے دورِ حکومت کا ذکر کئی تاریخ دانوں نے کیا ہے اور اس کی بے حد تعریف بھی کی ہے۔ اسی دور میں ملتان کے سورج

مندر(Sun Temple) کا ذکر ملتا ہے۔عرب اس شہر کو"فراج بیت الذہب"یعنی سونے کا گھر کہتے تھے، کیونکہ یہاں کے مندر میں بڑی مقدار میں سونا تھا۔

ملتان کی تاریخ میں دسویں صدی میں امارات کے دور کا خاتمہ ہوا۔اس کے بعد یہاں غزنوی حکومت قائم ہوئی۔پھر 1445ء میں یہ لانگاہ (لنگاہ) سلطنت کا دارالحکومت بنا۔مغل سلطنت کے دوران ملتان ایک اہم صوبہ مانا جاتا تھا۔ملتان، بعد میں رنجیت سنگھ نے فتح کیا، اور 1848ء میں انگریزوں نے سکھوں کو شکست دے کر اس علاقے پر قبضہ کرلیا۔قرون وسطیٰ میں ملتان برصغیر میں سب سے اہم تجارتی اور علمی مرکز بن گیا۔اس کے بعد یہاں صوفیاء کی ایک بڑی تعداد نے بسیرا کیا،جس کی وجہ سے ملتان پورے جنوبی ایشیا میں روحانیت کا مرکز بن گیا۔یہی وجہ ہے کہ اسے صوفیاء کا شہر کہا جاتا ہے۔

❁❁❁

اسلام سے قبل شمال مغربی ہندوستان کا سیاسی وتہذیبی منظر نامہ

جس دور میں سندھ اور جنوبی پنجاب پر مسلمان حکمرانی قائم ہو چکی تھی، اسی زمانے میں یعنی نویں صدی عیسوی میں شمالی پنجاب، موجودہ خیبر پختونخوا، اور وادیٔ کابل پر ایک ہندو خاندان برسرِ اقتدار تھا، جسے ''کابل شاہی'' یا ''ہندو شاہی'' کہا جاتا ہے۔ (میں اس تمام علاقے کو مجموعی طور پر ''شمال مغربی ہندوستان'' کا نام دے رہا ہوں، جس میں دہلی سے لے کر پشاور تک کے علاقے شامل ہیں۔ جنوب میں اس کی سرحد سندھ اور بلوچستان سے ملتی ہے، جبکہ شمال میں یہ کشمیر تک پھیلا ہوا ہے۔)

انسائیکلوپیڈیا آف بریٹانیکا کے مطابق اس خاندان کے ساٹھ سے زائد حکمرانوں نے حکومت کی۔ ان کی حکمرانی تیسری صدی میں کشان سلطنت کے زوال کے بعد وادیٔ کابل اور قدیم صوبہ قندھار پر قائم ہوئی۔ مؤرخین کے مطابق ان کا تعلق کشانوں یا ترکوں سے تھا۔ بعد ازاں، نویں صدی کے آخر میں اس خاندان کے ایک آخری بادشاہ کو اس کے برہمن گورنر نے قید کر کے خود اقتدار سنبھال لیا اور ایک نئے ہندو شاہی خاندان کی بنیاد رکھی۔ اس نئے خاندان نے غزنی کے حکمرانوں کے ساتھ کئی جنگیں لڑیں، حتیٰ کہ بالآخر 1001ء میں محمود غزنوی کے ہاتھوں ان کا مکمل خاتمہ ہو گیا۔

میں یہاں یہ ضرور چاہوں گا کہ محمود غزنوی کی آمد سے قبل ان ہندو شاہی حکمرانوں کی تاریخ اور ان کے اثرات پر مزید تفصیل سے روشنی ڈالی جائے۔ ساتھ ہی، میں اس بات کا بھی جائزہ لینا چاہوں گا کہ محمود غزنوی کی فتوحات کے بعد اس خطے میں بسنے والے ہندو باشندے کہاں چلے گئے؟ کیا وہ علاقہ چھوڑ گئے، یا پھر مسلمان ہو گئے؟

اس موضوع پر مجھے سب سے مستند معلومات درج ذیل پی ایچ ڈی تھیسس سے ملی ہیں:[1]

The Last Two Dynasties of the Shahis.

(An analysis of their history, archaeology, coinage and palaeography)

Abdur Rehman-Australian National University

اس کے علاوہ دیگر متعدد ذرائع سے بھی معلومات حاصل کیں، جنھیں میں قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

البیرونی، جو محمود غزنوی کے ہمراہ ہندوستان آئے تھے، ہندو شاہی خاندان کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

''ہندو شاہی خاندان اب ناپید ہو چکا ہے اور ان کے پورے گھرانے کا کوئی معمولی نشان بھی باقی نہیں بچا۔ ہمیں تسلیم کرنا چاہیے کہ، اپنی تمام شان وشوکت کے باوجود، وہ ہمیشہ نیکی اور درست رویے پر عمل کرنے کے خواہاں تھے۔ وہ نیک جذبات اور برداشت کے حامل افراد تھے۔''

البیرونی کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب محمود غزنوی نے ہندوؤں کی آخری ریاست کو ختم کیا، تو اس کے ساتھ ہی اس خاندان اور ان کی تہذیبی علامات کا بھی صفایا ہو گیا۔ اس طرح اس خطے سے، جہاں صدیوں سے ہندوؤں کی آبادیاں تھیں اور جہاں کسی حد تک ہندومت کا آغاز ہوا، ہندو حکمرانی کا خاتمہ ہو گیا۔ اس سے پہلے، اسی علاقے میں بدھ مت کا غلبہ رہا۔ یعنی دسویں صدی عیسوی سے قبل یہاں بدھ اور ہندو دونوں عقائد کے لوگ حکمران بھی تھے اور بڑی تعداد میں آباد بھی۔ اس وقت تک نہ یہاں مسلمان تھے اور نہ ہی عیسائی۔

شمالی پنجاب اور موجودہ خیبر پختونخوا میں سب سے پہلے جن مسلمان صوفی کا تذکرہ ملتا ہے وہ حضرت سید علی ہجویریؒ ہیں، جو محمود غزنوی کے بعد یہاں تشریف لائے۔ آپ 1009ء میں غزنی (موجودہ افغانستان) میں پیدا ہوئے۔ جنیدی سلسلے سے تعلق رکھنے والے ایک فارسی صوفی اور

[1] https//:ia601205.us.archive.org/11/items/tltd_20240114/Tltd.pdf

اسلامی علوم کے ممتاز عالم کی حیثیت سے معروف ہوئے۔ 1041ء میں آپ مسعود غزنوی (محمود غزنوی کے بعد بننے والے حکمران) کے ساتھ لاہور تشریف لائے، جہاں آپ نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ دعوت و تبلیغ اور تعلیم و تربیت میں گزارا۔ آپ 1072ء میں 63 برس کی عمر میں لاہور میں وصال فرما گئے۔ آپ کا مزار آج بھی لاہور میں مرجع خلائق ہے۔ آپ کی تصنیف کشف المحجوب تاحال علمی و روحانی حلقوں میں پڑھی جاتی ہے۔ میرے علم کے مطابق یہ شمالی ہندوستان میں اسلام پر لکھی جانے والی پہلی باقاعدہ کتاب ہے۔

ان تمام حقائق سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ محمود غزنوی کے حملوں سے قبل شمالی ہندوستان میں مسلمانوں کی کوئی مستقل آبادی موجود نہ تھی (جنوبی پنجاب اور سندھ میں عرب حکمران موجود تھے)۔ مسلمان یہاں محمود غزنوی کی فتوحات کے بعد بڑی تعداد میں آئے، اور اس کے بعد اس خطے میں دوبارہ کوئی ہندو ریاست قائم نہ ہو سکی۔ البتہ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد مختصر عرصے کے لیے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی قیادت میں سکھ سلطنت ضرور قائم ہوئی۔

ہندو شاہی خاندان ایک راجپوت النسل حکمران خاندان تھا جو 843ء سے 1026ء کے درمیانی عرصے میں قائم رہا۔ ہمارے دوست امجد وڑائچ کے مطابق یہ خاندان جاٹ نسل سے تعلق رکھتا تھا۔ اس خاندان نے تقریباً دو صدیوں تک شمالی پنجاب، کابل اور قندھار کے علاقوں پر حکومت کی۔ ان کی حکمرانی ایک طرف پنجاب میں دریائے ستلج تک اور دوسری طرف کابل تک پھیلی ہوئی تھی۔

ہندو شاہی سلطنت کی بنیاد کلر (Kallar) نامی حکمران نے 843ء میں رکھی، جب اس نے آخری ترک شاہی بادشاہ لگاتورمان کو معزول کر دیا۔ اس واقعے سے ہندو شاہی تاریخ کا آغاز ہوتا ہے۔ ترک شاہی ایک مغربی ترک النسل خاندان تھا، جو ممکنہ طور پر Turko-Hephthalite یا صرف Hephthalite نسل سے تعلق رکھتا تھا۔ انھوں نے ساتویں سے نویں صدی عیسوی تک کابل، کاپیسا اور گندھارا پر حکمرانی کی۔ بعض مؤرخین انھیں خلج نسل سے بھی منسوب کرتے ہیں۔ گندھارا، جو کشمیر اور کان کے ساتھ جڑا ہوا علاقہ تھا، ان کی سلطنت کا جزو ہو سکتا ہے۔

عبدالرحمٰن کے مطابق دسویں صدی میں ہندو شاہی سلطنت کا دارالحکومت ہنڈ تھا، جو اٹک

کے قریب واقع ہے۔ غلام اسحٰق خان انسٹیٹیوٹ آف انجینئرنگ سائنسز سے ہنڈ کا فاصلہ تقریباً 15 کلومیٹر ہے۔ جہانگیرہ کے قریب ایک سڑک بھی ہنڈ تک جاتی ہے، اور اب وہاں ایک عجائب گھر (میوزیم) بھی قائم ہے۔

اسی دور میں گکھڑ اور کھوکھر قبیلے اس علاقے پر قابض تھے۔ مشہور مؤرخ فرشتہ کے مطابق یہ قبائل ہندوشاہی فوج میں بھی بڑی تعداد میں شامل تھے۔ ہندوشاہیوں کے متعلق ایک اہم گواہی البیرونی جیسے معاصر مؤرخ کی تحریروں سے بھی ملتی ہے۔ ان کے مطابق ہندوشاہی برہمن تھے، جبکہ بعض دیگر سکالر انھیں کھشتری قرار دیتے ہیں۔ عبدالرحمٰن کے نزدیک ان کی درست ذات پات متعین کرنا مشکل ہے، البتہ غالب رائے یہی ہے کہ وہ کھشتری تھے۔

شمال مغربی ہندوستان کی صورتِ حال کو سمجھنے کے لیے ماضی میں جھانکنا ضروری ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ عباسی دورِ خلافت میں پہلی مرتبہ 815ء میں خلیفہ مامون کے زمانے میں کابل پر حملہ کیا گیا، جس میں ترک شاہی سلطنت کو شکست ہوئی۔ اس شکست کے نتیجے میں ایک قدیم ریاست کا خاتمہ ہوا۔ اس کے بعد ترک شاہیوں کو نہ صرف اسلام قبول کرنا پڑا بلکہ کئی اہم شہر اور علاقے بھی چھوڑنے پڑے۔

ترک شاہی (Turko-Hephthalite) کابل سمیت وسطی ایشیاء کے کئی علاقوں پر حکمران تھے۔ ان کا مذہب کیا تھا، اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ اندازہ یہی ہے کہ عباسیوں کے ہاتھوں شکست کے بعد وہ پشاور، سوات اور شمالی پنجاب کی طرف منتقل ہو گئے اور وہاں اپنی ریاست قائم کی۔ ان کی حکومت کا خاتمہ 843ء میں ہوا، جب ان کے آخری بادشاہ لگاتورمان کو کلر نے معزول کر کے ہندوشاہی سلطنت کی بنیاد رکھی۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ کلر کا ذکر صرف البیرونی نے کیا ہے، اور اس کی حکمرانی، جغرافیائی حدود اور بادشاہت کے عرصے کے بارے میں دیگر مؤرخین خاموش ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس ابتدائی دور کے بارے میں تفصیلی معلومات دستیاب نہیں۔ تاہم، اس خاندان کے آخری حکمران جے پال کے بارے میں نسبتاً تفصیل سے معلومات ملتی ہیں، جو شمالی پنجاب کی تاریخ کو سمجھنے میں

مدد دیتی ہیں۔ ہندوشاہی سلطنت ایک مرکزی تجارتی راستے پر واقع تھی، جو برصغیر کو وسطی ایشیا سے ملاتا تھا۔ یہ علاقہ برصغیر کا دروازہ تصور کیا جاتا تھا۔ پنجاب اور وادی پشاور کی زرخیز زمینیں، مالی وسائل اور انسانی قوت نے اسے ہمیشہ بیرونی حملہ آوروں کی توجہ کا مرکز بنائے رکھا۔

یہ بات بھی اہم ہے کہ اس زمانے میں ملکوں کی سرحدیں موجودہ معنوں میں مستحکم نہ تھیں، بلکہ وقت کے ساتھ بدلتی رہتی تھیں۔ ہندوشاہی سلطنت کی حدود بھی وقتاً فوقتاً تبدیل ہوتی رہیں۔ ایک دور میں اس کی حدود سیستان سے لے کر کشمیر اور ہند تک پھیلی ہوئی تھیں۔عباسی حملوں کے نتیجے میں ان کے کئی علاقے چھن گئے، اور آخرکار وادیٔ کابل بھی ان کے ہاتھ سے نکل گئی۔البیرونی کی تحریریں اگرچہ ہندوشاہی اور ترک شاہی خاندانوں کے بارے میں ابتدائی معلومات فراہم کرتی ہیں، تاہم خود ان کے مطابق بھی یہ تفصیلات محدود ہیں۔ البیرونی ترک شاہیوں کو ترک اور ہندوشاہیوں کو ہندو قرار دیتے ہیں، لیکن ان کی اصل نسل، حکومت کی مدت، جغرافیائی حدود اور بادشاہوں کے تفصیلی تذکرے دستیاب نہیں ہیں۔

یحییٰ امجد کی تصنیف ''تاریخِ پاکستان وسطی عہد'' (سنگ میل پبلیکیشنز) سے بھی اہم معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ان کے مطابق چھٹی صدی عیسوی میں ترک شاہیوں نے وادیٔ کابل میں اپنی حکومت قائم کی، جو بعد ازاں گندھارا تک پھیل گئی۔نویں صدی میں عباسیوں کے ہاتھوں ترک شاہی حکومت کا خاتمہ ہوا، جس کے بعد ہندوشاہی خاندان نے ریاست قائم کی جس میں پنجاب بھی شامل تھا۔

اس کے بعد وادیٔ کابل، کشمیر اور موجودہ پاکستان کے علاقوں میں طاقت کا ایک مستقل تصادم جاری رہا، جس نے ایک بڑی سیاسی تبدیلی کو جنم دیا۔عباسی خلیفہ ہارون الرشید کے زمانے میں اس علاقے میں باقاعدہ مسلمان افواج کی مداخلت کا آغاز ہو چکا تھا۔ یاد رہے کہ 750ء میں بنوامیہ کے زوال کے بعد عباسی خلافت کا قیام عمل میں آیا، جو تیرہویں صدی تک قائم رہی۔

❀ ❀ ❀

شمالی برِصغیر میں ترک فتوحات سے قبل کی سیاسی وتہذیبی صورت حال

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ آٹھویں صدی کے آغاز میں عربوں کی سندھ کی فتح کے بعد، سبکتگین اور محمود غزنوی نے شمال مغربی ہندوستان کو فتح کیا تھا۔ لیکن کچھ لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ محمود غزنوی سے پہلے خلیفہ مامون الرشید نے کابل سے لے کر بھنڈ پور (موجودہ ہنڈ) کے قریب تک کا علاقہ فتح کیا تھا، جو ہندو شاہیوں نے کچھ ہی عرصے بعد دوبارہ حاصل کر لیا تھا۔ اس بارے میں مجھے کوئی مصدقہ حوالہ نہیں مل سکا، لیکن ایک نہایت دلچسپ بات علم میں آئی جو اس سے قبل میری نظر سے نہیں گزری تھی۔

آٹھویں صدی عیسوی میں جب شمال مغربی ہندوستان اور کابل پر ترک شاہیوں کی حکومت تھی، عربوں نے جہاں ایک طرف سندھ فتح کیا، وہیں ایران اور وسطی ایشیا کے بعد کابل پر بھی حملہ کیا۔ ترک شاہیوں نے عربوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کے خلاف شہنشاہِ چین سے مدد مانگی۔ اس وقت ایک اور مضبوط ریاست کشمیر میں بھی قائم تھی۔ چین کے بادشاہ نے بھی موقع غنیمت جانا اور ترک شاہیوں کی مدد کا فیصلہ کیا۔ اسی سلسلے میں آٹھویں صدی کے وسط میں چینی اور عرب فوجوں کا زبردست تصادم ہوا، جس میں عربوں کو فتح حاصل ہوئی۔ اس کے بعد افغانستان کے مغربی علاقوں میں عرب دور کا آغاز ہوتا ہے۔

یہاں ایک بات کی وضاحت بے حد ضروری ہے: ترک حکمران، جو اپنے نام کے ساتھ ''شاہی'' یا ''شاہ'' لکھتے تھے، بدھ مت کے پیروکار تھے۔ ان کا پایۂ تخت کاپیشہ (بگرام) تھا، اور

ان کا اقتدار وادیٔ کابل سے گندھارا تک پھیلا ہوا تھا۔ ساتویں صدی کے آغاز سے لے کر آٹھویں صدی کے اختتام تک وہ ایک طاقتور ریاست کے طور پر جانے جاتے تھے۔ آٹھویں صدی میں عربوں نے ایران کے علاقوں کو فتح کرنے کے بعد ترک شاہی ریاست پر حملے شروع کیے۔ یہ سلسلہ ایک سو سال سے زائد عرصہ جاری رہا، جس کے نتیجے میں مغربی افغانستان سے ترک شاہی ریاست کا خاتمہ ہوا، اور انھوں نے کابل کو اپنا پایۂ تخت بنا لیا۔ یہاں سے ایک نیا دور شروع ہوتا ہے جسے ہندو شاہی دور کہا جاتا ہے، جس کا آخری بادشاہ جے پالا تھا، جسے محمود غزنوی نے شکست دی تھی۔ ہندو شاہی دور کا آغاز ایک ہندو برہمن ''کالر'' کے ہاتھوں ہوا۔ یہ لوگ ہندو مذہب کے ماننے والے تھے۔ ان کی ریاست کی مغربی سرحد کابل جبکہ مشرقی سرحد دریائے ستلج تھی۔

جے پالا: آخری ہندو شاہی حکمران (961-1002ء)

جے پالا کا پورا نام جے پالا دیو تھا بارے عبدالرحمٰن نے بیان کیا ہے کہ اس کے نسب کے بارے میں مختلف نظریات موجود ہیں۔ کوئی واضح ثبوت موجود نہیں کہ آیا وہ بھیم کا بیٹا تھا یا کسی اور کا۔ اس کے خاندان کی اصل اور تعلقات کی وضاحت میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک بات جس پر نسبتاً اتفاق ہے، وہ یہ ہے کہ جے پالا کا بھیم سے کوئی خونی رشتہ نہیں تھا اور وہ کسی مختلف خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ دلیل یہ دی جاتی ہے کہ شاہی خاندان کے آخری چار حکمرانوں کے نام ''پال'' پر ختم ہوتے ہیں، جو ایک علیحدہ خاندان کی نشان دہی کرتے ہیں۔ یہ بحث اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ جے پالا کے نسب کے بارے میں کوئی حتمی نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکا، اور مختلف مؤرخین نے اپنے دلائل کی بنیاد پر الگ الگ آراء قائم کی ہیں۔ جو میں سمجھ سکا، اس کے مطابق جے پالا کا بھیم سے خونی رشتہ نہیں تھا، تاہم وہ دونوں ایک ہی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس بات پر بھی اختلاف ہے کہ آیا وہ راجپوت تھا یا جاٹ۔

ہندو شاہی دورِ حکومت اور پنجاب کی سیاسی و سماجی صورتِ حال

ہندو شاہی کے پہلے حکمران کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ یحییٰ امجد لکھتے ہیں کہ یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ پہلا حکمران رنبیر شاہ تھا، جو 792ء میں کابل میں تخت نشین ہوا۔ اسی بنیاد پر

ان کا خیال ہے کہ یہ شاہی "ہندوشاہی" کہلائی، جو بعض اوقات "کابل شاہی" بھی کہی جاتی ہے۔ 792ء سے 1010ء تک تقریباً دوسو سال تک ہندوشاہی خاندان کابل، سوات اور دریائے ستلج تک کے علاقوں پر حکمرانی کرتا رہا۔ بعض مؤرخین کا ماننا ہے کہ ہندوشاہی کا آغاز 850ء میں ہوا، جب آخری ترک بادشاہ ارمان کو اس کے برہمن وزیر کالر نے شکست دی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آٹھویں صدی کے اختتام تک ہندوشاہی حکومت قائم ہو چکی تھی اور یہ تقریباً ڈیڑھ سو سال تک قائم رہی۔

چونکہ یہ کتاب پنجاب کی تاریخ پر مرکوز ہے، اس لیے کابل میں ہونے والی جنگ و جدل کی تفصیلات یہاں بیان نہیں کی گئیں۔ یہاں صرف اس دور میں پنجاب کی سیاسی اور سماجی حیثیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

یحییٰ امجد کے مطابق ہندوشاہی کا سب سے نمایاں حکمران جے پالا تھا، جو 965ء سے 1001ء تک حکمرانی کرتا رہا۔ اس کی ریاست میں کشمیر، قنوج، پنجاب، سرحد اور وادیٔ سندھ شامل تھے۔ شمال میں اس کی سلطنت باجوڑ اور بونیر تک پھیلی ہوئی تھی، جبکہ جنوب میں یہ ملتان تک پہنچتی تھی۔ وہ ایک برہمن ہندو تھا اور راجہ استقبال الف سین کے بیٹے الف لام کا بیٹا تھا۔ اس دور میں شمالی ہندوستان ایک منظم سیاسی نظام کے تحت نظر آتا ہے۔ اس حکمران نے اپنے بڑے شہروں کو داخلی خودمختاری دے رکھی تھی اور ہر علاقے کا سربراہ "راجا" کہلاتا تھا۔ یوں ریاست چھوٹے چھوٹے حصوں میں منقسم تھی۔ یہ حکمران اکثر بھٹی راجپوت یا دیگر راجپوت خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے اور جاگیردارانہ نظام کا حصہ تھے۔

مسلمانوں کی آمد سے پہلے شمالی ہندوستان کی آبادی اور مذہبی صورت حال

ہندوشاہی دور کی آبادی میں اکثریت بدھ مت کے پیروکاروں کی تھی، جبکہ کچھ لوگ ہندو مت سے وابستہ تھے۔ ڈاکٹر احمد حسن دانی کا بھی یہی خیال ہے کہ اس وقت جاگیردارانہ نظام رائج تھا، جو ممکنہ طور پر اس سے قبل بھی موجود تھا۔ یہ کہنا کہ بدھ مت کے پیروکار مسلمان ہو گئے، شاید درست نہ ہو، کیونکہ شمالی ہندوستان میں مسلمان گیارھویں صدی کے آغاز میں داخل ہوئے، جب یہاں دوسو سال سے ایک ہندو برہمن ریاست قائم تھی۔ البتہ یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ کابل شاہی

کے آغاز پر بدھ مت کے پیروکار یا تو ہندو مت میں شامل ہو گئے یا تبت اور کوہِ ہندوکش کی وادیوں کی طرف ہجرت کر گئے۔

یحییٰ امجد مزید لکھتے ہیں کہ ''شاہ'' کا لفظ اسی دور میں کسی بڑے شخص کے لیے استعمال ہونا شروع ہوا۔ جب سید اس علاقے میں آئے، تو وہ بھی طاقتور طبقے میں شامل ہو گئے اور انھوں نے ''شاہ'' کا لقب اختیار کیا۔ بعد میں حکمرانوں نے اپنے لیے ''بادشاہ'' کا لقب اپنایا، جو بعد ازاں ''شہنشاہ'' میں تبدیل ہو گیا۔ احمد حسن دانی کے مطابق، بہت سے مقامات کے نام ''شاہی'' یا ''بن شاہی'' کے الفاظ سے منسوب ہیں، مثلاً دیر کی پہاڑیوں میں شاہی مقامات۔ پشاور میں ''شاہ کی ڈیری'' اور ''شاہ کوٹ'' جیسے مقامات بھی اسی سلسلے کی کڑیاں ہو سکتے ہیں۔

ہندو شاہی دور میں مندروں کی تعمیر میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ ابتدا میں بدھ مت کا اثر وسطی اور جنوبی ہندوستان میں زیادہ تھا، لیکن ترک شاہی کے خاتمے کے بعد جب ہندو شاہی برسرِ اقتدار آئے، تو مندروں کی تعمیر کا سلسلہ شروع ہوا۔ ان مندروں میں ہندو دیوی دیوتاؤں کی پرستش کے آثار واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ یہ دور جاگیردارانہ معیشت کا تھا۔ حکمران طبقے کی دولت میں بے حد اضافہ ہوا اور انھوں نے عوام کے بغاوت کے خوف سے مضبوط قلعے تعمیر کروائے۔ ہندو شاہی ریاست وسطی ایشیا اور مشرقی ایشیا کے درمیان ایک اہم تجارتی راستہ تھی۔ ان کا سکہ بین الاقوامی کرنسی کے طور پر استعمال ہوتا تھا، جو وسطی ایشیا سے لے کر ایران تک قابل قبول تھا۔ ان سکوں پر بیل اور گرم (آتش) نشان کندہ ہوتے تھے۔

ہندو شاہی کے تمام حکمران شمالی ہندوستان (خاص طور پر پنجاب سے) سے تعلق رکھتے تھے۔ اس سے قبل وسطی ایشیا، ایران، افغانستان یا مشرقی ہندوستان سے آئے ہوئے حکمرانوں نے حکومت کی، جن میں موریہ خاندان شامل تھا۔ ہندو شاہی کے بعد محمود غزنوی نے اس ریاست کا خاتمہ کیا، اور اس کے بعد پنجاب پر غیر ملکی حکمران قابض ہو گئے۔ مقامی حکمرانی صرف رنجیت سنگھ کے دور میں دکھائی دیتی ہے، جو کوئی پچاس سال تک قائم رہی، مگر بعد ازاں انگریزوں نے اس ریاست کو ختم کر دیا۔ پاکستان کے قیام کے بعد مغربی پنجاب میں مسلمانوں کی حکمرانی قائم ہوئی،

جن میں اکثریت ان مسلمانوں کی تھی جو وسطی ایشیا، ایران اور افغانستان سے آنے والے حملہ آوروں کی نسل سے تھے۔

اس بات پر مورخین میں اختلاف موجود ہے کہ ہندوشاہی کا پہلا حکمران کون تھا۔ یحییٰ امجد کے مطابق یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ پہلا حکمران رنبیر شاہ تھا، جو 792 عیسوی میں کابل میں تخت نشین ہوا۔ اسی مناسبت سے یہ ریاست ''شاہی'' یا ''ہندوشاہی'' کہلائی۔ اس طرح 792 سے 1110 عیسوی تک تقریباً دوسو سال تک ہندوشاہی حکمران کابل، سوات اور ستلج تک کے علاقوں پر حکومت کرتے رہے۔

کچھ مؤرخین کا خیال ہے کہ ہندوشاہی کا آغاز 850 عیسوی میں آخری ترک بادشاہ ارمان کے زوال کے بعد ہوا، جسے اس کے برہمن وزیر کالر نے معزول کیا۔ یہ قیاس بھی کیا جا سکتا ہے کہ آٹھویں صدی کے آغاز سے ہی ہندوشاہی حکومت قائم ہو چکی تھی اور یہ تقریباً ڈیڑھ صدی تک برسراقتدار رہے۔

یحییٰ امجد کے مطابق، ہندوشاہی کا سب سے بڑا راجہ 965 سے 1011 عیسوی تک حکومت کرتا رہا۔ اس کی سلطنت میں کشمیر، قنوج، پنجاب، سرحد اور وادئ سندھ شامل تھیں۔ شمال میں اس کی حکومت باجوڑ، بونیر، کشمیر اور جنوب میں ملتان تک پھیلی ہوئی تھی۔ وہ ایک برہمن ہندو تھا اور راجہ استقبال الف سین کے بیٹے الف لام کا بیٹا تھا۔ اس دور میں شمالی ہندوستان میں ایک منظم سیاسی نظام دکھائی دیتا ہے۔ اس نے بڑے شہروں کو داخلی خودمختاری دے رکھی تھی۔ ہر علاقے کا سربراہ ''راجا'' کہلاتا تھا۔ اس نے اپنی ریاست کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر دیا تھا جن کے سربراہ ''راجے'' یا ''مہاراجے'' کہلاتے تھے۔ ان میں سے اکثر بھٹی راجپوت یا دیگر راجپوت قبیلوں سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ بنیادی طور پر بڑے جاگیردار تھے، جو بادشاہ کی خدمت کیا کرتے تھے۔

یہ بھی ایک اہم امر ہے کہ اس وقت کی آبادی کی اکثریت بدھ مت کی پیروکار تھی جبکہ کچھ

لوگ ہندومت سے وابستہ تھے۔ ڈاکٹر احمد حسن دانی کے مطابق اس وقت جاگیردارانہ نظام قائم تھا، جو ممکن ہے کہ اس سے قبل بھی رائج ہو۔

میں یہ بات پوری وضاحت سے سمجھ نہیں پایا کہ بدھ مت، جو کبھی شمالی ہندوستان پر غالب رہا اور افغانستان تک پھیلا ہوا تھا، رفتہ رفتہ کہاں غائب ہو گیا؟ میرے خیال میں یہ کہنا کہ بدھ لوگ مسلمان ہو گئے، شاید درست نہ ہو، کیونکہ شمالی ہندوستان میں مسلمان تو گیارھویں صدی کے آغاز میں آئے، جب یہاں ایک برہمن ہندو ریاست دو سو سال سے قائم تھی۔ میرا قیاس یہ ہے کہ جب کابل شاہی ہندو ریاست قائم ہوئی اور ترک شاہی کا خاتمہ ہوا، تو بدھ مت کے پیروکار یا تو ہندومت میں ضم ہو گئے یا تبت اور کوہِ ہندوکش کی وادیوں کی طرف چلے گئے۔ اس موضوع پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔

❀ ❀ ❀

شمال مغربی ہندوستان میں پہلی مسلمان ریاست

جیسا کہ میں پچھلے صفحات میں لکھ چکا ہوں، جنوبی پنجاب (جس کا صدر مقام ملتان تھا) میں مسلمان ریاست کا آغاز آٹھویں صدی میں محمد بن قاسم کے دور سے ہی ہو چکا تھا۔ اس کے بعد ایک طویل عرصے تک سندھ، جنوبی بلوچستان اور جنوبی پنجاب میں عرب حکمران رہے، اور بعد ازاں مقامی افراد بھی حکمران بنے۔ ایک وقت ایسا آیا جب عباسی خلافت کمزور پڑ گئی، تو فاطمی مسلک سے تعلق رکھنے والے افراد بھی یہاں برسرِ اقتدار آ گئے۔

گیارھویں صدی کے ابتدائی سالوں میں جب محمود غزنوی نے ہندوستان پر حملے شروع کیے، تو اس کا قبضہ جنوبی اور شمال مغربی ہندوستان کے ان علاقوں پر ہوا، جن میں شمالی پنجاب ایک اہم خطہ تھا۔ اس کے بعد عرب حکمرانوں کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ البتہ اس مرحلے پر افغانستان، وسطی ایشیا اور ایران سے حملہ آور آنے لگے۔ (یاد رہے کہ اس وقت افغانستان نام کا کوئی ملک وجود نہیں رکھتا تھا، لہٰذا اس خطے کے جن علاقوں کا ذکر ہو، جو اب افغانستان کا حصہ ہیں، اُن کے لیے میں سہولت کے پیشِ نظر "افغانستان" کا لفظ استعمال کر رہا ہوں۔) شمال مغربی ہندوستان میں مسلمانوں کے دور کا آغاز محمود غزنوی کے حملوں سے ہوتا ہے۔ میری مراد شمال مغربی ہندوستان سے وہ علاقہ ہے جو دہلی سے لے کر پشاور تک اور شمال میں کشمیر سے لے کر ملتان تک پھیلا ہوا تھا۔ موجودہ زمانے میں اس میں ہریانہ، کشمیر، ہماچل پردیش، مشرقی و مغربی پنجاب، ہزارہ اور خیبر پختونخوا کے وسطی و شمالی علاقے شامل ہیں۔

محمود غزنوی نے ہندوشاہی خاندان (جنھیں بعض مورخین کابل شاہی بھی کہتے ہیں) کے آخری حکمران جے پال (جے پالا) کو 28 نومبر 1001ء کو پشاور کی جنگ میں شکست دی۔ یوں

پنجاب کے شمال مغربی علاقے اور پشاور پر ایک افغان قابض ہوا۔ (محمود کا تعلق غزنی سے تھا، اور وہ نسلی طور پر پختون نہیں تھا۔ اُس وقت افغانستان نامی ملک موجود نہیں تھا اور ''افغان'' کا لفظ بھی عام نہیں ہوا تھا۔ تاہم سہولت کے لیے میں محمود غزنوی یا اس دور میں کابل کی جانب سے آنے والے حملہ آوروں کو "افغان" کہہ رہا ہوں، جس سے میری مراد اُن افراد سے ہے جو موجودہ افغانستان میں آباد تھے۔)

اس سے قبل جے پالا نے محمود غزنوی کے والد سبکتگین کے ہاتھوں ہونے والی شکست کا بدلہ لینے کی کوشش کی تھی اور 980ء کی دہائی کے آخر میں غزنی پر عارضی قبضہ بھی کر لیا تھا۔ بعد ازاں، محمود غزنوی نے اس کا انتقام لیا۔ جے پالا کے بعد اس کا بیٹا آنند پال تخت پر بیٹھا اور اپنے والد کی شکست کا بدلہ لینے کی کوشش کی۔ اس نے چچ کے مقام پر متعدد پنجابی حکمرانوں کو متحد کیا، مگر اس جنگ میں بھی شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے بعد محمود غزنوی کے سامنے کوئی پنجابی حکمران مزاحمت کے قابل نہ رہا، اور یوں اس نے لاہور پر قبضہ کر لیا۔

تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ محمود غزنوی نے تقریباً سترہ مرتبہ ہندوستان پر حملے کیے اور سومنات تک جا پہنچا۔ اس نے دہلی کے بجائے لاہور کو اپنا صدر مقام بنایا اور اسے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اس نے یہاں اپنے ایک جرنیل ایاز کو گورنر مقرر کیا، جس کی قبر آج بھی لاہور میں موجود ہے۔

ایاز کا پورا نام ''ملک احمد ایاز بن ایماق ابونجم'' تھا۔ وہ جارجیا سے تعلق رکھنے والا ایک غلام تھا، جو بعد میں ترقی کرتے کرتے فوج میں افسر اور پھر جنرل کے عہدے تک پہنچ گیا۔ محمود غزنوی اور ایاز کے درمیان تعلق کو کئی شعرا نے نظموں اور حکایات میں بیان کیا ہے۔ مسلمان مورخین اور صوفیا نے ایاز کی محمود غزنوی سے غیر متزلزل وفاداری کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے۔ علامہ اقبال نے بھی ایاز کے بارے میں ایک مشہور شعر کہا ہے:

؎ ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

غزنوی سلطنت (1186-977 عیسوی): ترک نژاد خاندان، خراسان، افغانستان اور شمالی ہندوستان کے حکمران: محمود غزنوی کے آباؤ اجداد کون تھے؟ انھوں نے کب تخت پر قبضہ کیا؟ ان جیسے موضوعات پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ میں یہاں محمود غزنوی کے پنجاب پر قبضے اور اس کی قائم کردہ ریاست کے بارے میں تفصیل سے بیان کرنا چاہوں گا۔ تاہم، اس سے پہلے اس کے خاندان سے متعلق چند دلچسپ معلومات پیشِ خدمت ہیں۔

بات کچھ طویل ہو جائے گی، لیکن تاریخ کا ایک اہم ورق آپ کے سامنے رکھنا چاہوں گا۔ مسلمان کب وسطی ایشیا میں آئے، پھر کب افغانستان میں داخل ہوئے، اور بعدازاں کب شمال مغربی ہندوستان میں قدم جمانے میں کامیاب ہوئے؟ یہ ایک نہایت دلچسپ داستان ہے۔ اس موضوع پر یحییٰ امجد نے تفصیل سے لکھا ہے۔ ان کی تحریر کے علاوہ جو کچھ جان سکا ہوں، وہ بھی پیشِ خدمت ہے۔

محمود غزنوی کی سیاست کا پس منظر

حضرت علیؓ کی وفات کے بعد حضرت امیر معاویہؓ نے اپنی حکومت قائم کی اور مسلمانوں کے سربراہ بنے۔ اس دور کو ''اموی خلافت'' کہا جاتا ہے، جو 661 عیسوی میں قائم ہوئی اور 750ء تک تقریباً 90 سال تک قائم رہی۔ پھر 750ء میں حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خاندان سے تعلق رکھنے والے افراد نے اقتدار سنبھالا اور ''عباسی خلافت'' کا آغاز ہوا، جو 1258ء میں ہلاکو خان کے ہاتھوں بغداد کی تباہی تک قائم رہی۔ اگرچہ درمیانی عرصے میں سلجوقیوں کا بھی اقتدار رہا، تاہم خلافت کا مرکز عباسیوں کے پاس ہی رہا۔

اموی دورِ حکومت (711ء) میں، خلیفہ ولید بن عبدالملک کے حکم پر محمد بن قاسم نے سندھ پر حملہ کیا۔ اسی دور میں قتیبہ بن مسلم کو وسطی ایشیا کی طرف روانہ کیا گیا، جہاں اس نے بلخ، بخارا، سمرقند اور کاشغر جیسے علاقوں کو فتح کیا۔ موسیٰ بن نصیر کو افریقہ کی جانب روانہ کیا گیا۔ یوں اموی خلافت نے تین اطراف میں توسیع کا آغاز کیا: مشرق میں برصغیر، شمال میں ترکستان، اور مغرب میں افریقہ۔

خلیفہ ولید بن عبدالملک، جو اپنے والد عبدالملک بن مروان کا بڑا بیٹا تھا، 705ء سے 715ء

تک حکمران رہا۔ اگر یہ کہا جائے کہ برصغیر پر مسلمانوں کے حملوں کا باقاعدہ آغاز اسی کے دور میں ہوا، تو یہ درست ہوگا۔ خراسان کی جانب قتیبہ بن مسلم اور سمندر کے راستے سندھ کی طرف محمد بن قاسم کے حملے اسی کی سرپرستی میں ہوئے۔ اس طرح اموی دور میں سندھ، بلوچستان، جنوبی پنجاب اور خراسان خلافتِ اسلامیہ کا حصہ بن چکے تھے۔

اموی خلافت کا دارالحکومت دمشق تھا، جو موجودہ شام کے جنوب میں واقع ہے۔ اس وقت بلادِ شام میں شام، لبنان، اردن اور فلسطین کے علاقے شامل تھے۔ بعد ازاں عباسیوں نے اپنا دارالحکومت دمشق سے بغداد منتقل کر دیا، جو ایران کے مغرب میں واقع ہے اور آج بھی ایران کی سرحد کے قریب ہے۔ اس تبدیلی کی ایک ممکنہ وجہ ماوراءالنہر کے علاقوں میں ابھرتی ہوئی خودمختاری کو کنٹرول کرنا ہوسکتی ہے۔ بغداد کی قربت کے باعث عباسی اثر ورسوخ ایران اور اس کے گردونواح میں بڑھا، اور یہی وہ دور تھا جب شیعہ مسلک کو بھی فروغ حاصل ہوا۔

جب اموی خلافت کمزور ہوئی تو سندھ میں بھی مختلف علاقوں نے خودمختاری کا اعلان کیا۔ اس دور میں کئی مقامی خاندانوں نے چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم کیں، جن کا ذکر تاریخی کتب میں ملتا ہے۔

غزنوی سلطنت کا آغاز

محمود غزنوی کے آباؤ اجداد کا تعلق ماوراءالنہر کے علاقے سے تھا۔ جب ان علاقوں میں سامانی حکومت قائم ہوئی، تو انھوں نے ترک غلاموں کو اپنی فوج میں بھرتی کیا۔ ان ہی غلاموں میں ایک قابل اور بہادر شخص ''الپتگین'' بھی شامل تھا، جو بعد ازاں خراسان کا گورنر مقرر ہوا۔ خراسان ایک بہت بڑا علاقہ ہے۔ مزار شریف کے سفر کے دوران میں نے ایک بورڈ دیکھا تھا جس پر لکھا تھا: ''ہم آپ کو خراسان میں خوش آمدید کہتے ہیں۔''

الپتگین نے نئے امیر کو ہٹانے کی کوشش کی، مگر کامیاب نہ ہوسکا، لہٰذا اس نے بلخ کی طرف رخ کیا۔ بعد ازاں اس نے غزنی میں موجود ایک چھوٹی ریاست پر حملہ کیا، جس کا حکمران ابوبکر لائق تھا، جو ہندوشاہی حکومت کا حامی تھا۔ ہندوشاہی وہی خاندان تھا جس کا پایہ تخت کابل تھا اور جس کی حکومت لاہور سے کابل تک پھیلی ہوئی تھی۔ الپتگین نے غزنی پر قبضہ کرلیا اور غزنی سلطنت

کا بانی کہلایا۔ بعدازاں سامانیوں نے اسے ہٹانے کی کوشش کی، مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ اس دور میں تین اہم ریاستیں وجود میں آ چکی تھیں:

ہندوشاہی سلطنت (پنجاب تا کابل)

ترک غلاموں کی حکومت (غزنی)

سامانی سلطنت (خراسان)

ان کے درمیان براہِ راست جنگوں کا آغاز ہوا، خصوصاً ہندوشاہیوں اور ترک غلاموں کے درمیان۔ الپتگین کے بعد اس کا بیٹا ابواسحاق حکمران بنا، لیکن ہندوشاہی حکمرانوں نے غزنی پر حملہ کر کے اسے ہٹا دیا۔ بعدازاں سبکتگین نامی غلام، جو بعد میں ناصرالدین سبکتگین کہلایا، امیر بنا۔

ناصرالدین سبکتگین اور ہندوستان میں پیش قدمی

سبکتگین (997-942ء)، سلطنت غزنویہ کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ اس کا نام ترک زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی ہیں: ''عزیز شہزادہ''۔ احمد حسن کاکڑ، مشہور افغان مورخ، اپنی کتاب ''افغان، افغانستان، اور ہندوستان و فارس پر قبضے کی جدوجہد'' میں لکھتے ہیں کہ افغان تجارت کے لیے ہندوستان آتے جاتے رہتے تھے اور اس کے جغرافیے سے بخوبی واقف تھے۔ 987ء میں سبکتگین نے شیخ حمید لودھی کو ملتان کا گورنر مقرر کیا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ محمود غزنوی سے قبل بھی غزنوی حکمران ہندوستان میں سرگرم ہو چکے تھے۔ سبکتگین نے راجہ جے پال اور اس کے اتحادیوں کی، جن میں دہلی، اجمیر، کالنجر اور قنوج کے حکمران شامل تھے، متحدہ افواج کو شکست دی۔

بعدازاں ہندوشاہیوں نے ایک بار پھر غزنی پر حملہ کیا، مگر سبکتگین نے انھیں شکست دی اور غزنی کا مستحکم حکمران بن گیا۔ بعض مؤرخین کے مطابق وہ اصل میں ایرانی النسل تھا، لیکن ترکوں کے ساتھ تعلقات کے باعث ترک کہلایا۔ اس نے بلوچستان اور پنجاب کے سرحدی علاقوں پر بھی حملے کیے، اور یحییٰ امجد کے مطابق، کئی قلعے فتح کیے۔ 997ء میں سبکتگین کی وفات کے بعد اس کے بیٹوں محمود اور اسماعیل کے درمیان تخت کے لیے لڑائی ہوئی، جس میں محمود کامیاب رہا اور اسماعیل کو قید کر دیا گیا۔

اس وقت سامانی سلطنت بھی کمزور ہو چکی تھی۔ محمود غزنوی نے عباسی خلیفہ القادر کو رسمی طور پر اپنی اطاعت کا یقین دلایا، مگر حقیقت میں وہ ایک خودمختار حکمران بن چکا تھا اور اس نے ''سلطان'' کا لقب اختیار کیا۔ یہ لقب فارسی زبان کا ہے، جو اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اس کا دربار فارسی یا ترکی زبان استعمال کرتا تھا۔

مجھے دو مرتبہ محمود غزنوی کے مزار پر غزنی جانے کا موقع ملا ہے۔

جب غزنوی نے اپنی حکومت کو مضبوط کر لیا، تو اس نے جے پال سے جنگ کی، جو 1001 میں پشاور کے قریب ہوئی۔ پہلی بار محمود غزنوی نے باقاعدہ حملہ کیا اور لاہور میں اپنا گورنر مقرر کیا۔ محمود غزنوی نے ہندو شاہی سلطنت پر حملہ کیا اور پشاور میں ان کو شکست ہوئی۔ جے پال کی شکست کے بعد، شہر میں بے شمار لوٹ مار کی گئی اور عورتوں و مردوں کو غلام بنایا گیا۔ اس دور میں فوجیوں کو باقاعدہ تنخواہ نہیں ملتی تھی، بلکہ لوٹ مار کا مال ان کے لیے انعام ہوتا تھا۔ محمود غزنوی کی فوج کا انحصار غلاموں پر تھا۔ اس جنگ کے خاتمے کے بعد جے پال نے خودکشی کر لی اور ہندو شاہی ریاست کا حکمران آنند پال بن گیا۔

جے پال کی شکست کے بعد، دریائے سندھ کے مغربی علاقے، یعنی اٹک تک اور اس کے ساتھ ساتھ باجوڑ کے کئی علاقے فتح ہوئے اور شمال مغربی ہندوستان کا ایک بہت بڑا علاقہ غزنوی سلطنت کا حصہ بن گیا۔ اس کے بعد محمود غزنوی نے 17 بار ہندوستان پر حملہ کیا اور ان کی تفصیل ہمیں کتابوں میں ملتی ہے۔ محمود غزنوی نے 1021ء میں لاہور کو مکمل فتح کیا، اور یہ سال ہندوستان میں پہلی مسلم ریاست کے آغاز کا سال تھا۔ اس سے پہلے محمود غزنوی اور مقامی ہندوؤں کے درمیان کئی جنگیں ہوئیں۔ فیصلہ کن جنگ کے بعد لاہور پر محمود غزنوی کا قبضہ ہو گیا۔

جس طرح حجاج بن یوسف کے جرنیل محمد بن قاسم نے سندھ فتح کیا تھا، اسی طرح حجاج ہی کے دوسرے بڑے جرنیل قتیبہ بن مسلم نے ماوراء النہر کو فتح کیا تھا اور وہ ایک طرف موجودہ تاشقند تک اور دوسری طرف کاشغر تک جا پہنچا تھا۔ خلیفہ سلیمان، جس نے محمد بن قاسم کو برطرف کر کے قتل کروا دیا تھا، اسی نے قتیبہ بن مسلم کو بھی برطرف کر کے واپس بلوایا لیکن اُس نے بغاوت کر دی اور

خودمختار ہو گیا۔ تاہم 715ء میں اس کے فوجیوں نے اُسے قتل کر دیا اور ماوراءالنہر کے علاقے میں اُس زمانے میں نیم جاگیرداری نظام قائم تھا۔

اس کے بعد اس علاقے میں مسلمان صوفیاء کی محنت کے نتیجے میں لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ یہ علاقہ بہت خوشحال تھا، یہاں سے بے شمار دولت خلیفہ کو بطور ٹیکس بھیجی جاتی تھی۔ نویں صدی میں یہاں سے ترک غلاموں کو فوجی خدمات کے لیے اردگرد کی مسلم ریاستوں میں بھیجا جانے لگا۔ اس طرح خراسان کے علاوہ جو کبھی غیر مسلم تھے، مسلمان کے زیرِ تسلط آئے اور پھر آنے والے زمانے میں یہاں کے لوگ ہندوستان آتے رہے، کبھی حملہ آور کی شکل میں اور کبھی صوفیاء کی شکل میں جس کی وجہ سے ہندوستان میں آج ایک کثیر تعداد میں مسلمان آباد ہیں۔ یاد رہے کہ میں ہندوستان کا لفظ اس علاقے کے لیے استعمال کرتا ہوں جس میں آج بھارت، پاکستان اور بنگلہ دیش شامل ہیں۔

غزنوی دورِ حکومت اور پنجاب

میں نے اس بات کی کھوج لگانے کی مناسب کوشش کی کہ 1001ء میں جب محمود غزنوی نے جے پالا کو شکست دی اور اس کے کئی سال بعد لاہور پر بھی قبضہ کر لیا پھر وہ وقت بھی آیا جب غوری خاندان نے غزنوی دور کا خاتمہ کیا، ان قریب پونے دوسو سالوں میں پنجاب کی سیاسی، معاشی اور سماجی صورتِ حال کیسی تھی؟ یاد رہے کہ 1173ء میں افغانستان میں غوری خاندان نے غزنی پر قبضہ کر کے غزنوی دور کا خاتمہ کر دیا تھا۔ پھر محمد غوری کی قیادت میں 1175ء اور 1192ء کے درمیان، غوری خاندان نے اوچ، ملتان، پشاور، لاہور اور دہلی کے شہروں پر قبضہ کر لیا۔ 1206ء میں، غوری جنرل قطب الدین ایبک اور اس کے جانشین التمش نے دہلی سلاطین کے سلسلے کی بنیاد رکھی۔

پشاور کی فتح (1001ء) کے 20 سال بعد محمود غزنوی لاہور فتح کرنے میں کامیاب ہوا۔ لاہور اور پشاور کے درمیان 500 کلومیٹر کا فاصلہ تھا، اور یہ فاصلہ اس نے 20 سال میں مکمل کیا۔ جے پالا کو شکست دینے کے بعد، اس کا بیٹا اور مقامی راجپوت ریاستیں محمود غزنوی کی راہ میں رکاوٹ بنی رہیں۔ اس عرصے میں محمود نے لاہور کے علاوہ کئی دیگر علاقوں میں حملے کیے اور

کامیابیاں حاصل کیں، لیکن لاہور شہر پر مکمل قبضہ اس نے 1021ء میں کیا۔ اس وقت تک اس علاقے میں قائم ہندو ریاستوں اور ہندوشاہیوں کے بقیہ لوگ شکست کھا چکے تھے۔

لاہور فتح کرنے کے بعد، 1025ء میں اس نے اپنی بہت بڑی فوج اور بے شمار ترک غلاموں کے ساتھ سومنات پر حملہ کیا۔ یہ ایک طویل صحرائی سفر تھا، اور اس جنگ میں اس نے فتح حاصل کی اور ہزاروں کی تعداد میں ہندوؤں کو قتل کیا جو اپنے مندر کا دفاع کر رہے تھے۔ اس کے بعد، محمود نے 1026ء میں گجرات پر حملہ کیا، اور پھر 1027ء میں سندھی جاٹوں اور سلطان محمود کے درمیان ایک جنگ ہوئی۔

1030 میں محمود غزنوی کی وفات ہوئی۔ اس کا آخری حملہ 1027 یا 1028 میں ہوا تھا، اور یہ تقریباً 30 سال کا دور تھا جس میں اس نے 17 حملے کیے۔ اس کا مطلب یہ بنتا ہے کہ ہر دو سال میں ایک بار وہ ہندوستان پر حملہ کرتا تھا۔ اس کتاب میں میرا موضوع غزنوی دور کے آغاز سے لے کر غوری خاندان کی ابتداء کے درمیانی عرصے میں پنجاب کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی صورتِ حال کے بارے میں جو کچھ میں جان سکا وہ بیان کرنا ہے۔

محمود کی وفات کے بعد اس کے جانشینوں نے غزنی میں تخت سنبھالا اور لاہور کا گورنر بھی مقرر کیا۔ اس طرح، آپ کہہ سکتے ہیں کہ کوئی پونے دوسو سال شمالی ہندوستان خاص طور پر شمال مغربی ہندوستان کا بیشتر حصہ غزنوی سلطنت کے پاس تھا۔ یہ وہ دور تھا جب پنجاب میں غزنوی خاندان کے آغاز کے وقت کوئی مسلمان نہیں تھا۔ یہاں لوگ یا تو بدھ مت کے پیروکار تھے یا ہندو تھے، اور ہندوشاہی کئی سو سال سے حکمرانی کر رہی تھی۔ پھر غزنوی خاندان کے دور میں مسلمانوں کا ایک بڑا گروہ یہاں آباد ہوا، اور اس دوران یہاں مسلمانوں کی اکثریت ہوگئی۔ بعد میں یہ علاقے پاکستان کا حصہ بنے۔ تقسیم ہند سے پہلے لاہور سے دہلی تک کا سفر کرتے ہوئے یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت کم ہوتی جاتی ہے۔ دہلی تک پہنچتے پہنچتے یہ صرف 10 سے 12 فیصد رہ گئی تھی۔

اگر آپ لاہور سے مغرب کی طرف سفر کریں تو آپ جان جائیں گے کہ مسلمانوں کی اکثریت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ پشاور تک جاتے جاتے مسلمان 95 فیصد سے بھی زائد

ہوجاتے ہیں۔ افغانستان میں یہ تعداد تقریباً 100 فیصد کے قریب ہے۔ یہ بات بے حد اہم ہے اور اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اس دور میں کیا ہوا کہ ان علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہوگئی۔ اور اگر آپ لاہور سے مشرق کی جانب سفر کریں تو مسلمانوں کی تعداد میں کمی ملتی ہے۔ دہلی تک جاتے جاتے مسلمان آبادی کا دس فیصد رہ جاتے ہیں۔

اس سے پہلے سندھ اور بلوچستان میں مسلمان محمد بن قاسم کی قیادت میں آئے، اور کچھ اس سے پہلے بھی عرب مسلمان ان علاقوں میں پہنچے۔ ملتان تک عرب مسلمانوں کا سکہ چلتا تھا، اور پھر 1021 میں، محمود غزنوی نے پنجاب اور شمال مغربی ہندوستان میں ہندوؤں کا خاتمہ کیا اور یہ علاقے مسلمانوں کے زیرِ اثر آ گئے۔ یہی وہ علاقے ہیں جو بعد میں پاکستان کا حصہ بنے، اور ان کے متعلق علامہ اقبال نے بھی کہا تھا کہ ان علاقوں کو ملا کر ایک الگ ملک بنایا جائے کیونکہ یہاں مسلمان اکثریت میں ہیں۔ (میں اس پر بحث نہیں کرنا چاہتا، مگر یہ ایک اہم نقطہ ہے۔) ہم یہاں یہ بات کرنا چاہتے ہیں کہ غزنوی خاندان کے اختتام تک، خاص طور پر پنجاب اور اس کے گرد و نواح میں سیاسی، معاشرتی اور سماجی صورت حال کیا تھی، اور ان علاقوں میں اسلام کی تبلیغ اور مسلمانوں کی اکثریت کس طرح قائم ہوئی۔

محمود غزنوی کے ہندوستانی سماج، مذہب، سیاست اور معاشرت پر اثرات

جو میں جان سکا، اس کے مطابق 1027ء میں محمود غزنوی نے اپنی آخری جنگ سندھ کے جاٹوں کے خلاف دریائے سندھ میں لڑی۔ اس سے پہلے، سومنات سے واپسی پر سندھی جاٹوں نے محمود غزنوی کو شدید نقصان پہنچایا تھا، جس کا بدلہ لینے کے لیے وہ اگلے سال سندھ آیا۔ اس بار اس کے پاس آگ لگانے والے متعدد کیمیائی مادے تھے، جن کی مدد سے جاٹوں کی کشتیاں جلا دی گئیں۔ سندھی جاٹوں نے جنگ سے پہلے اپنے بیوی بچوں کو ایک جزیرے پر منتقل کر دیا تھا۔ جنگ میں زیادہ تر جاٹ مارے گئے، اور جو باقی بچے، انھیں غزنوی نے غلام بنا لیا۔ اُس نے اُس جزیرے تک ان کا پیچھا کیا جہاں عورتیں اور بچے پناہ لیے ہوئے تھے، اور انھیں بھی بڑی تعداد میں غلام بنا کر غزنی لے گیا۔ اس واقعے کے تین سال بعد، 1030ء میں محمود غزنوی کا انتقال ہو گیا۔

محمود غزنوی کی سیاست پر تبصرہ کرنے والوں کا ایک گروہ، خصوصاً مغربی دنیا سے تعلق رکھنے والے مؤرخین، اسے ایک ایسے حملہ آور کے طور پر پیش کرتے ہیں جس نے وادیٔ سندھ کی شاندار تہذیب کو تباہ کیا، ہندوستان میں مندروں اور شہروں کو بڑی تعداد میں برباد کیا، اور یہاں کا مال و دولت غزنی لے گیا۔ اسی طرح بھارت میں بھی، ہندو اور بعض مسلمان مؤرخین اسے ہندوستان کی ایک قدیم تہذیب کو نیست و نابود کرنے والا اور ہندو مذہب کا دشمن قرار دیتے ہیں۔ جبکہ پاکستانی تاریخ اور نصاب میں اسے اسلام کی سربلندی کے لیے برصغیر آنے والا ایک مجاہد اور ''بت شکن'' کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

محمود غزنوی کی سلطنت موجودہ پاکستان کے تقریباً تمام علاقوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ وہ افغانستان کے ایک بڑے حصے کا بھی حکمران تھا۔

یہ دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ پاکستان کا جغرافیہ وہی ہے جو آج سے ایک ہزار سال قبل غزنوی کے دور میں تھا، جس میں سندھ، مغربی پنجاب، بلوچستان، اور موجودہ خیبر پختونخوا کے اکثر علاقے شامل تھے۔ اسی دور کے بعد ان علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت قائم ہوئی۔ اسی بنیاد پر بعد ازاں مسلم لیگ نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ اکثریتی مسلم علاقوں پر مشتمل ایک الگ ملک قائم کیا جائے۔ یہی مطالبہ آگے چل کر پاکستان کی صورت میں پورا ہوا۔ یاد رہے کہ ہندوستان کے مشرق اور مغرب دونوں جانب مسلمان اکثریتی علاقے واقع تھے: ایک طرف بنگال، اور دوسری جانب پنجاب، سندھ، بلوچستان اور موجودہ خیبر پختونخوا۔

ان دو معروف نقطہ ہائے نظر کے علاوہ ایک تیسرا مؤقف بھی ہے، جس کا ذکر یحییٰ امجد نے کیا ہے، اور جنھوں نے پروفیسر محمد حبیب کا حوالہ دیا ہے۔ پروفیسر حبیب علی گڑھ یونیورسٹی سے تعلق رکھتے تھے۔

پروفیسر حبیب کا مؤقف کچھ یوں ہے:

محمود غزنوی نہ تو صرف اسلام کی تبلیغ کی خاطر جنگیں کرتا تھا، اور نہ ہی وہ کوئی دنیا پرست،

لالچی انسان تھا۔ وہ نہ کوئی اسلامی مشنری تھا اور نہ ہی مذہبی جنونیت میں مبتلا تھا۔ وہ ایک عیش وعشرت پسند بادشاہ تھا، اور وہی سب کچھ کرتا تھا جو اس زمانے کے دیگر بادشاہ کیا کرتے تھے۔

پروفیسر حبیب مزید لکھتے ہیں کہ محمود نے اپنی سلطنت کو وسعت دینے کے لیے ہندو اور مسلمان، دونوں اقوام سے جنگیں کیں۔ وہ ایک نہایت قابل جرنیل اور بہادر سپہ سالار تھا۔ اس نے خراسان پر بھی حملے کیے تھے۔ محمود غزنوی کی سیاست اس دور کی عمومی سیاست کے مانند تھی۔

پروفیسر حبیب کا خیال ہے کہ محمود کا مقصد اسلام کا احیاء نہیں بلکہ اس دور کے عظیم فارس کی ثقافت کی بحالی تھا۔ چنانچہ اسی کے بعد فارسی زبان کو سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا اور ریاستی سطح پر اس کی سرپرستی کی گئی۔

محمود غزنوی: متنوع تاریخی نقطہ ہائے نظر

محمود غزنوی کی شخصیت اور اس کی فتوحات کے حوالے سے مختلف طبقات میں متضاد آراء پائی جاتی ہیں۔ برصغیر کے ہندو مؤرخین عموماً اسے ایک ظالم حملہ آور کے طور پر پیش کرتے ہیں، جس نے مذہبی وثقافتی ورثے کو نقصان پہنچایا۔ اس کے برعکس، پاکستان میں اکثر مسلمان مؤرخین اور عوامی بیانیہ محمود غزنوی کو ایک اسلامی ہیرو کے طور پر دیکھتا ہے۔ بعض حلقے تو اسے اولیاء کی صف میں شامل کرتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ غزنی میں واقع اس کی قبر کو ایک مزار کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے، جہاں عقیدت مند زائرین بطورِ زیارت آتے ہیں۔ ذاتی مشاہدے کے مطابق، وہاں آنے والے افراد اسے روحانی شفاء کا مرکز سمجھتے ہیں، اور متولی مزار زائرین کو تبرک کے طور پر نمک دیتے ہیں، جس کے متعلق یہ تصور پایا جاتا ہے کہ وہ شفا بخش ہے۔

مغربی مؤرخین کا نقطہ نظر اس سے مختلف ہے۔ ان کے مطابق محمود غزنوی کی مہمات نے وادی سندھ اور برصغیر کے مقامی سماج، معیشت، اور تہذیب کو شدید نقصان پہنچایا۔ وہ اسے ثقافتی

تصادم اور استعماری توسیع پسندی کی ایک مثال کے طور پر دیکھتے ہیں۔

ان مختلف نقطہ ہائے نظر کی روشنی میں، میں نے محمود غزنوی کے دور کی چند تاریخی جھلکیاں پیش کی ہیں۔ان شواہد کی بنیاد پر یہ فیصلہ قارئین خود کریں کہ وہ محمود غزنوی کو کس زاویے سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ایک فاتح، ایک سیاسی حکمران، ایک مذہبی مجاہد، یا ایک تہذیبی متنازع شخصیت۔

محمود غزنوی کا طرزِ حکومت

یہ بھی ایک دلچسپ امر ہے کہ محمود غزنوی کے حکم پر فردوسی نے شاہنامہ کے عنوان سے ایک عظیم الشان کتاب تحریر کی۔فردوسی کی پیدائش 940ء میں مشہد کے قریب واقع طوس نامی گاؤں میں ایک زمیندار گھرانے میں ہوئی، تاہم اس بارے میں قطعی طور پر کچھ کہنا ممکن نہیں۔ (مجھے فردوسی کے مقبرے پر حاضری کا شرف بھی حاصل ہوا۔) فردوسی کی تخلیقی کاوشوں کا محرک درحقیقت ایک عظیم فارسی تہذیب کے احیاء کا خواب تھا۔

پروفیسر حبیب لکھتے ہیں کہ محمود غزنوی کو سائنس دانوں سے زیادہ رغبت نہ تھی، یہی وجہ ہے کہ بوعلی سینا کو یہاں سے جان بچا کر نکلنا پڑا۔وہ مزید لکھتے ہیں کہ محمود نے البیرونی کو گرفتار کر کے ہندوستان بھیج دیا تھا۔ایک اور قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ محمود غزنوی نے پہلی بار خلافت اور خلیفہ جیسے مذہبی و سیاسی تصورات کے بجائے سلطنت اور سلطان جیسی اصطلاحات کو فروغ دیا، اور یوں خلیفہ کے مرکزی اقتدار کے تصور کو عملی طور پر مسترد کر دیا۔

پروفیسر حبیب کے مطابق، محمود غزنوی بے پناہ دولت کا مالک تھا، جس کے بل پر اس نے ایک بڑی اور منظم فوج تیار کی۔اس کے برعکس، ہندوستان اس دور میں چھوٹی چھوٹی ریاستی اکائیوں میں منقسم تھا، جو متحد ہو کر اس کا مؤثر مقابلہ نہ کر سکیں۔نتیجتاً، محمود نے ایک ایک کر کے ان سب کو زیر کر لیا۔ایک اور اہم نکتہ جو پروفیسر حبیب نے بیان کیا، یہ ہے کہ محمود غزنوی کی فوج میں ہندو سپاہی بھی شامل تھے، جو غزنی میں اپنے دیوتاؤں کی پوجا کیا کرتے تھے۔اگرچہ ضروری نہیں کہ پروفیسر حبیب کی ہر بات مسلمہ حقیقت ہو، تاہم یہ ایک نقطۂ نظر ضرور ہے، جسے

یہاں بیان کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ڈاکٹر منظور اعجاز کا محمود غزنوی کے حوالے سے ایک مفصل مضمون لاہور نامہ میں شائع ہوا۔ وہ لکھتے ہیں کہ بعض افراد محمود غزنوی کو ایک مثالی شخصیت تصور کرتے ہیں، جبکہ کچھ اسے منفی کردار کا حامل قرار دیتے ہیں۔ ایک حقیقت جس پر مؤرخین کم و بیش متفق ہیں، یہ ہے کہ محمود غزنوی نے ہندو مندروں کو نشانہ بنایا، جہاں بڑی مقدار میں دولت ذخیرہ کی جاتی تھی۔ اُس دور میں مندروں کو مالیاتی مراکز کے طور پر دیکھا جاتا تھا۔

اسی سیاق میں یہ بات بھی بیان کی گئی ہے کہ محمود غزنوی نے پنجاب پر قبضے کے بعد ہندوستان سے بڑی تعداد میں غلاموں کو غزنی منتقل کیا، جنھیں غلامی کی منڈی میں بیچا گیا یا مختلف خدمات اور دستکاری کی صنعتوں میں استعمال کیا گیا۔ ڈاکٹر منظور اعجاز کا کہنا ہے کہ محمود نے ہندو کسانوں، کاریگروں اور نچلی ذات سے تعلق رکھنے والے افراد کو غلام بنا کر غزنی منتقل کرنا شروع کیا۔

مشہور مؤرخ محمد قاسم فرشتہ کے مطابق، اس قدر غلام غزنی لائے گئے کہ وہ شہر ہندوستانی آبادی کا نقشہ پیش کرنے لگا۔ اسی دور میں بہت سے افراد، خصوصاً نچلی ذاتوں سے تعلق رکھنے والے کسانوں اور کاریگروں نے غلامی سے بچنے اور زیادہ ٹیکس (جزیہ) سے نجات پانے کے لیے اسلام قبول کرنا شروع کیا۔ اسلام قبول کرنے سے نہ صرف ان کی مالی ذمہ داریاں کم ہوئیں بلکہ انھیں برہمنوں اور اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے ظلم سے بھی جزوی تحفظ حاصل ہوا۔

ہندو شاہی دور میں ان طبقات کا سماجی مقام نہایت پست تھا، لیکن محمود غزنوی کے اقتدار میں آنے کے بعد ان سے نسبتاً بہتر سلوک روا رکھا گیا۔ میرے خیال میں یہی وہ بنیادی وجہ تھی کہ نچلی ذات سے تعلق رکھنے والے ہندو عوام پہلے سے قائم نظام کی حفاظت کے لیے نہ لڑے اور سماجی تبدیلیوں سے خود کو لاتعلق رکھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک بڑی تعداد نے غلامی کے مقابلے میں اسلام قبول کرنے کو ترجیح دی۔

محمود غزنوی اور ہندو غلام: مرد، عورتیں اور بچے

تاریخی کتابوں میں اس بات کا بھی ذکر ملتا ہے کہ ہندوستان کے ہندو حلقے اس کوشش میں مصروف تھے کہ کسی طرح غزنی سے غلاموں کو واپس ہندوستان لایا جائے، اور ساتھ ہی وہ دولت بھی واپس حاصل کی جائے جو محمود غزنوی کی فتوحات کے دوران لوٹی گئی تھی۔ اگرچہ اس مقصد کے لیے کوئی باقاعدہ عسکری مہم منظم نہیں کی گئی، لیکن یہ ضرور ہوا کہ محمود غزنوی کی افواج کے ساتھ بے شمار غلام سپاہیوں کے طور پر ہندوستان آئے، اور ان میں سے بعض یہیں مقیم ہو گئے۔

بعض غلاموں کو تجارتی یا انتظامی اغراض کے تحت دوبارہ ہندوستان بھیجا گیا۔ اس طرح بہت سے غلام فوجی خدمات انجام دینے لگے، جن کی ایک بڑی تعداد بعد ازاں دہلی سلطنت کے دور میں بھی دیکھی گئی۔ ان غلاموں کی مثالوں میں سب سے نمایاں نام قطب الدین ایبک کا ہے، جو بعد ازاں خود ایک طاقتور حکمران کے طور پر ابھرا۔ یہ بھی روایت ملتی ہے کہ متعدد ہندو افراد غزنی جا کر اپنا لوٹا ہوا مال تاوان دے کر واپس خرید لائے۔ اسی طرح، غلام بنائی گئی عورتوں اور بچوں کی ایک بڑی تعداد کو بھی فدیہ یا تاوان ادا کر کے واپس لایا گیا۔ اگرچہ یہ عمل بہت بڑے پیمانے پر نہیں ہوا، تاہم اس کے واقعات تاریخ میں ملتے ہیں اور یہ ایک فطری انسانی ردعمل کے طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔

محمود غزنوی اور ہندوستان کی معاشرتی حالت: ایک تجزیاتی جائزہ

میرے خیال میں اگر آپ محمود غزنوی کی آمد سے پہلے کے پچھلے پندرہ سو سال کا جائزہ لیں تو آپ کو شمالی ہندوستان میں بے شمار تبدیلیاں نظر آئیں گی۔ کبھی یہاں ایرانی اور یونانی حکمرانی کرتے رہے، پھر ایک ایسا وقت آیا جب بدھ مت کے پیروکار بادشاہ ان علاقوں کے حاکم بنے، اور پھر ان کا دور بھی ختم ہو گیا۔ اس کے بعد ہندو شاہی سلطنت کا آغاز ہوا، اور وسطی ہندوستان میں ہندو راجپوت ریاستوں کی بنیاد پڑی۔

مسلمان مؤرخین کے مطابق ہندو شاہی اور راجپوت ریاستوں کے دور میں کئی ایسے

معاشرتی عوامل موجود تھے جو عام عوام کے لیے ناقابلِ قبول تھے، مثلاً ان کی سخت طبقاتی تقسیم: ایک طرف برہمن طبقہ تھا، اور دوسری طرف اچھوت، جو ہر قسم کے حقوق سے محروم تھے۔ جب کوئی معاشرہ طویل عرصے تک ایک جابرانہ نظام کے ماتحت رہتا ہے، تو اس کے اندر تبدیلی کی خواہش جنم لینا ایک فطری امر ہوتا ہے۔ ہندو شاہی نظام ایک زوال پذیر اور بوسیدہ ڈھانچے پر قائم تھا۔ زمینیں جاگیروں میں تقسیم ہو چکی تھیں، ہر علاقے میں کوئی نہ کوئی مقامی سردار یا زمیندار حاکم تھا، اور بڑی تعداد میں لوگ غلامی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔

ایسے حالات میں اگر کوئی بیرونی طاقت آ کر کسی ظالم طبقے کے خلاف اقدام کرے، تو عوام کی ایک بڑی تعداد اس کا خیر مقدم کرتی ہے۔ یہی معاملہ محمود غزنوی کے ساتھ بھی ہوا۔ اس نے ہندوستان کے ایک جابرانہ اور غیر منصفانہ نظام کے خلاف جنگ کی۔ اس نظام میں مذہب کو مرکزی حیثیت حاصل تھی، اور دولت کا ارتکاز مخصوص طبقے کے پاس تھا۔ محمود غزنوی نے غلاموں کو آزادی دی اور انھیں پہلی مرتبہ پیداواری عمل میں شامل کیا، جو ایک انقلابی قدم تھا۔

لہٰذا یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ محمود غزنوی کی آمد ایک معاشرتی ردِعمل کا نتیجہ تھی، کیونکہ ہندوستان کے عوام نے اس کے خلاف کسی بڑی مزاحمت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اس نے غلاموں کے ساتھ بہتر سلوک کیا اور ایک مضبوط اور منظم حکومت قائم کی۔ اس کے دور میں وادیٔ سندھ سمیت مندروں کے مرکزی نظام کو ختم کر دیا گیا اور ان کی جگہ مساجد قائم کی گئیں، جو مندروں کے مقابلے میں عوام کے لیے زیادہ کھلی اور قابلِ رسائی تھیں۔ دولت کو مخصوص اداروں کے بجائے عوام میں تقسیم کیا گیا، جس سے وسیع پیمانے پر عام لوگوں کو فائدہ پہنچا۔

اس کے نتیجے میں ایک طویل عرصے تک ایک مستحکم نظام قائم رہا۔ ایک اور اہم وجہ جو محمود غزنوی کی کامیابی کا باعث بنی، وہ اس وقت کے ہندوستانی معاشرتی ڈھانچے میں موجود ذات پات کا سخت نظام تھا۔ اس تقسیم کی وجہ سے صرف ایک مخصوص طبقہ، یعنی کشتری، جنگوں میں شریک ہوتا تھا۔ برہمن ان کے مذہبی رہنما تھے، جبکہ شودر (جو کسی چیز کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے تھے) کی ایک بڑی تعداد ہر قسم کے حقوق سے محروم تھی۔ چونکہ لڑنے والے زیادہ تر راجپوت تھے اور ان کی تعداد

بھی محدود تھی، اس لیے محمود غزنوی کو نسبتاً کم مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔

کیا ایسا ہی ہوا؟ یہ ایک سوال ہے، جس کا جواب ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے پاس مختلف ہے۔

تاریخ میں دو ایسے واقعات بھی ملتے ہیں جب مقامی عوام نے محمود غزنوی کے خلاف مزاحمت کی، اور دونوں مواقع پر اس کی فوج کو نقصان اٹھانا پڑا۔ پنجاب کے گکھڑ کسانوں اور سندھ کے جاٹوں نے اس کے خلاف جنگ کی اور اسے نقصان پہنچایا۔

اسی دور میں معروف عالم اور سائنسدان ابو ریحان البیرونی بھی ہندوستان آیا اور یہاں طویل عرصہ قیام کیا۔ اس نے اپنی مشہور کتاب کتاب الہند لکھی۔ البیرونی کے بارے میں مختلف آراء پائی جاتی ہیں۔ کچھ کے مطابق وہ عرب نژاد شیعہ تھا اور خراسان کے شہر خیوا کے ایک محلے ''بیرون'' میں رہتا تھا، جس کی نسبت سے اسے ''البیرونی'' کہا گیا۔ اس کی مادری زبان عربی تھی۔ وہ ہندوستان آیا، یہاں پنڈتوں سے سنسکرت سیکھی، اور ہندوستان کی تہذیب، فلسفہ، مذہب اور تاریخ پر گراں قدر تحقیق کی۔

البیرونی لکھتا ہے کہ ہندو طبقاتی نظام کے تحت ایک تنگ نظر قوم بن چکے تھے۔ وہ اپنی ذات کے علاوہ ہر دوسرے شخص کو کمتر سمجھتے تھے، اور اپنی مذہبی و سماجی برتری کو سختی سے قائم رکھتے تھے۔ اس دور میں ہندوؤں کی اہم ریاستیں کشمیر، سندھ اور قنوج میں تھیں، اور ان کے مابین خانہ جنگیاں عام تھیں۔ برہمن طبقے کو بے پناہ مراعات حاصل تھیں۔ اس معاشرے میں دیگر کئی برائیاں بھی عام تھیں، جیسے بچپن کی شادی، عورتوں کی سماجی حیثیت کی پستی، اور سخت ذات پات کی تقسیم۔

کیا یہ تصور درست ہے کہ اُس زمانے کے معاشرتی حالات سے عام لوگ شدید نالاں تھے، اور یہی پس منظر محمود غزنوی کی مسلسل مداخلت کا باعث بنا؟ اگر واقعی ایسا تھا، تو لازم تھا کہ محمود غزنوی نہ صرف مقامی جابرانہ نظام کو ختم کرتا بلکہ اس کی جگہ ایک منصفانہ اور عوام دوست نظام قائم کرتا۔ تاہم، تاریخی شواہد اس کے برعکس دکھائی دیتے ہیں۔ میری رائے میں محمود غزنوی کی مہمات

کا بنیادی مقصد اصلاحِ معاشرہ نہیں بلکہ مالِ غنیمت کا حصول اور سیاسی بالادستی کا قیام تھا۔ وہ جب بھی برصغیر آیا، مال و دولت سے مالا مال ہو کر واپس گیا اور اس کے ساتھ ایک بڑی تعداد میں مقامی ہندوؤں کو غلام بنا کر بھی لے گیا۔

یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا محمود غزنوی ایک مذہبی نظریاتی جنگجو تھا یا صرف ایک روایتی بادشاہ، جو فتوحات کے ذریعے دولت اور اقتدار کا خواہاں تھا؟ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اس نے صرف غیر مسلموں ہی پر حملے نہیں کیے بلکہ متعدد مسلم ریاستوں کو بھی زیرِ نگیں کیا۔ یہاں یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ محمود غزنوی کے حملوں کے بعد ہی، جب اُس نے لاہور پر قبضہ مستحکم کر لیا، تو حضرت سید علی ہجویریؒ جیسی شخصیت نے لاہور کا رُخ کیا اور اسلام کا پیغام عام کیا۔ ان کی کوششوں کے نتیجے میں بڑی تعداد میں مقامی ہندو باشندے اسلام میں داخل ہوئے۔ یہ تبدیلی اسی وقت ممکن ہوئی جب یہاں ایک مستقل مسلمان حکومت قائم ہو چکی تھی، جو دعوتی عمل کے لیے ایک سازگار ماحول فراہم کرتی تھی۔

غزنوی کی وفات کے بعد اس کا بیٹا محمد غزنی تخت نشین ہوا، اور اس کے بعد اس کے بھائی سلطان مسعود نے حکومت سنبھالی۔ سلطان مسعود نے بھی ان تمام علاقوں پر اپنا تسلط برقرار رکھا جو محمود غزنوی نے فتح کیے تھے۔ اس کا دور بھی کافی طویل اور اہم رہا، تاہم اس پر تفصیل سے بحث یہاں مناسب نہیں۔ یہ بات ضرور قابلِ ذکر ہے کہ ایک وقت ایسا بھی آیا جب غوری خاندان نے غزنی پر حملہ کیا۔ غوریوں کا عروج، ان کی فتوحات، اور محمود غزنوی کی سلطنت کا زوال ایک الگ باب ہے، جس پر آئندہ صفحات میں روشنی ڈالی جائے گی۔

محمود غزنوی کی وفات کے بعد اس کا بیٹا مسعود تخت نشین ہوا۔ اسی عہد میں سید علی ہجویریؒ لاہور تشریف لائے۔ سلطان مسعود نے بنارس تک لشکر کشی کی، اور ایک موقع پر یہاں قحط کی کیفیت بھی پیدا ہوئی۔ جب سلطان محمود اور اس کے جانشین ہندوستان میں فتوحات اور جنگوں میں مصروف تھے، تو انھی ایام میں غزنی میں ان کے خلاف بغاوت بھی واقع ہوئی۔ اس کے بعد وہی کچھ ہوا جو اقتدار کی رسہ کشی میں اکثر خاندانی سطح پر پیش آتا ہے۔ چونکہ یہ تفصیلات موضوع سے

خارج ہیں، لہٰذا ان کا مفصل ذکر یہاں مناسب نہیں۔

پھر وہ وقت آیا جب غوریوں کے ہاتھوں غزنوی سلطنت کا خاتمہ ہوا۔ غوری سلطنت کا قیام، اس کی فکری بنیادیں اور غزنی پر حملے کی وجوہات آئندہ صفحات میں زیرِ بحث آئیں گی۔ تاہم، اب تک کی گفتگو میں جو نکات سامنے آتے ہیں، ان کے مطابق ہندوستان کی اُس وقت کی معاشرتی صورتِ حال میں طبقاتی تقسیم، غلاموں کے ساتھ غیر انسانی سلوک، اور دولت کی غیر منصفانہ تقسیم جیسے عوامل وہ بنیادی اسباب تھے جن کی وجہ سے محمود غزنوی کو اپنی فتوحات میں کامیابی حاصل ہوئی۔ بعدازاں، ان ہی علاقوں میں بڑی تعداد میں لوگوں نے اسلام قبول کیا۔

میرے مشاہدے کے مطابق، محمود غزنوی سے پہلے کی ایک صدی کے دوران تین اہم تہذیبی و مذہبی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں: پہلے یونانیوں کے بعد بدھ مت کے ماننے والے غالب آئے، پھر بدھ مت کی جگہ ہندومت نے لی، اور بعدازاں مسلمان اکثریت میں نمایاں ہوئے۔

پچھلے صفحات میں بیان کردہ نکات کا خلاصہ کچھ یوں کیا جا سکتا ہے:

شمالی ہندوستان میں اسلام کا تعارف ہوا اور محمود غزنوی کے حملوں کے نتیجے میں یہ مذہب تیزی سے پھیلنا شروع ہوا۔ اس سے قبل سندھ اور جنوبی ہند کے بعض علاقوں میں اسلام کا پیغام پہنچ چکا تھا، مگر شمالی ہند میں پہلی مسلم ریاست کے قیام کے بعد صوفیائے کرام کو دعوت و تبلیغ میں بے پناہ آسانی ہوئی۔ جن علاقوں کو محمود غزنوی نے فتح کیا، وہاں کے بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا۔

محمود غزنوی نے متعدد ہندو مندروں اور مذہبی مقامات کو نشانہ بنایا، جسے وہ ایک مذہبی فریضہ سمجھتا تھا۔ ان حملوں کے نتیجے میں اسے ان مندروں سے بھاری مال و دولت حاصل ہوا، جس نے اس کی سلطنت کو مضبوط بنانے اور اسلامی اثر و رسوخ پھیلانے میں مدد دی۔

اس کے حملوں اور مندروں کی تباہی نے ہندوستان میں مذہبی و ثقافتی تقسیم کو گہرا کیا، اور ہندو مسلم تعلقات پر ایک دیرپا اثر مرتب کیا۔ آج بھی سومنات پر حملہ ہندو مسلم تاریخ میں ایک گہری خلیج کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔

اگرچہ محمود غزنوی نے فتوحات کی خاطر کئی جنگیں لڑیں، مگر اس نے فارسی زبان، اسلامی علوم اور فنون کی ترویج میں بھی ایک بنیادی کردار ادا کیا۔ ان کے زیرِ اثر ہندوستانی ادب، فنونِ لطیفہ اور تعلیمی ڈھانچے پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔

محمود غزنوی کے حملوں نے شمالی ہند میں راجپوت حکمرانی کو کمزور کیا اور برصغیر میں مسلم حکمرانی کے طویل المدتی قیام کی راہ ہموار کی۔ اس کے بعد غوریوں سے لے کر مغلوں تک ایک تسلسل قائم ہوا، جس نے برصغیر میں مرکزی حکومت کا تصور مستحکم کیا۔

غزنوی دور میں اسلامی طرزِ تعمیر کا تعارف ہوا، جس کی نمایاں مثالیں مساجد اور مقابر کی تعمیرات ہیں۔ فارسی معماروں نے اسلامی فنِ تعمیر کے عناصر جیسے محراب، گنبد، اور مینار کو مقامی طرز میں متعارف کرایا، جس نے رفتہ رفتہ ہندو طرزِ تعمیر کو پیچھے چھوڑ دیا۔

اسی دور میں فارسی ادب، خطاطی اور دیگر فنون نے بھی عروج پایا۔ فارسی، غزنوی سلطنت کی سرکاری زبان بن گئی، جو بعد ازاں دہلی سلطنت اور مغل دور میں بھی قائم رہی۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ سات صدیوں بعد بھی رنجیت سنگھ کے دربار کی سرکاری زبان فارسی ہی تھی۔

محمود غزنوی کے حملوں سے ہندوستان کی معاشی سرگرمیاں متاثر ہوئیں۔ مندروں میں محفوظ دولت کو وہ غزنی منتقل کر گیا، جس سے مقامی معیشت میں وقتی عدم استحکام پیدا ہوا۔ اس کے بعد ایران، افغانستان، وسطی ایشیا اور حتیٰ کہ یورپ میں بھی ہندوستان کی دولت اور وسائل کا چرچا ہوا، اور کئی غیر ملکی حملہ آوروں نے اس سرزمین کو سونے کی چڑیا سمجھ کر لوٹنے کی کوشش کی۔ تاہم، انھی حملوں کے بعد شمالی ہندوستان اور وسطی ایشیا کے درمیان تجارتی روابط بھی استوار ہوئے، جن سے ثقافتی اور تجارتی تعامل کو فروغ ملا، جو طویل مدتی لحاظ سے سودمند ثابت ہوا۔

سماجی لحاظ سے بھی گہری تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ غزنوی اور دیگر مسلم حملہ آوروں کے نتیجے میں ہندو اشرافیہ کی بالادستی کو زوال آیا، اور اس خلا کو نئی مسلم اشرافیہ نے پُر کیا۔ اس کے نتیجے میں ایک نئی ہند-اسلامی تہذیب نے جنم لیا، جس میں فارسی، وسطی ایشیائی اور مقامی عناصر کی آمیزش نمایاں تھی۔

محمود غزنوی کے حملوں کے نتیجے میں شمالی ہندوستان میں مسلم افواج اور حکمرانوں کی موجودگی نے صوفی مبلغین کو ایک طرح کا تحفظ فراہم کیا، خاص طور پر لاہور اور دہلی جیسے شہروں میں۔ اس کے نتیجے میں کئی قصبے اور بستیاں آباد ہوئیں، جہاں مسلمان اکثریت میں تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان علاقوں میں مسلمانوں کا اثر ورسوخ بڑھتا گیا، اور لوگوں نے یا تو مذہبی اثرات یا سماجی و معاشی وجوہات کی بنا پر اسلام قبول کیا۔ میرے خیال میں دونوں عوامل نے کردار ادا کیا۔ بعد ازاں، بڑی تعداد میں صوفیائے کرام ہندوستان تشریف لائے۔

اب تک کی بحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ محمود غزنوی اور اس کے بعد آنے والے مسلم حملہ آوروں نے ہندوستانی ثقافت پر ایک پیچیدہ، دیرپا اور کثیر الجہتی اثر چھوڑا۔ ان کی فتوحات جہاں اسلامی تبلیغ اور مسلم حکومت کے قیام کا ذریعہ بنیں، وہیں انھوں نے ہندوستانی معاشرت، زبان، طرزِ حکمرانی، لباس، فنون، تعمیرات اور اقتصادی نظام میں بھی بنیادی تبدیلیاں پیدا کیں۔ ان اثرات کا تسلسل آگے چل کر قیامِ پاکستان اور تقسیمِ ہند جیسے بڑے تاریخی واقعات میں بھی جھلکتا ہے۔

غزنوی سلطنت کا زوال اور اس کی وجوہات

یہ تو تاریخ کا مسلمہ اصول ہے:

ہر کمالے را زوالے

ہر اک کمال کو دیکھا جو ہم نے رو بہ زوال
سسک کے رہ گئی سینے میں آرزوئے کمال

محمود غزنوی جتنا عقلمند اور بہادر حکمران تھا، اس کے برعکس اس کے جانشین کمزور اور غیر مؤثر ثابت ہوئے۔ سب سے پہلے اس کے خاندان میں خانہ جنگی کا آغاز نظر آتا ہے۔ سب لوگ جانشینی کی لڑائیوں میں الجھے رہے، جس کی وجہ سے ریاست بتدریج کمزور ہوتی گئی۔ زوال کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ محمود غزنوی نے ہندوستان پر متعدد حملے کیے اور

بڑی مقدار میں مالِ غنیمت حاصل کر کے اسے اپنی سلطنت کے استحکام کے لیے استعمال کیا۔ مگر اس کے جانشینوں کو نہ تو ایسے مواقع میسر آئے اور نہ ہی ان میں ویسا تدبر اور بصیرت تھی، جس کی بدولت وہ سلطنت کو قائم رکھ سکتے۔ نتیجتاً غزنوی سلطنت دن بدن کمزور ہوتی گئی، اور اس کا اثر ورسوخ دور دراز علاقوں میں ختم ہوتا چلا گیا۔

اس کا عملی نتیجہ یہ نکلا کہ پنجاب اور افغانستان کے کئی اہم علاقوں پر غزنویوں کا کنٹرول ختم ہو گیا۔ ایک معمولی سے واقعے کے نتیجے میں غزنویوں اور غوریوں کے درمیان پہلی بڑی جھڑپ 1160ء میں دہستان کے علاقے میں ہوئی، جس میں غوریوں نے فیصلہ کن انداز میں غزنوی افواج کو شکست دی۔ اسی شکست کو غزنوی سلطنت کے زوال کی ابتدائی علامت قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس جنگ کے بعد غوریوں نے غزنی پر قبضہ کر لیا۔ غزنی کی مکمل فتح 1173ء میں عمل میں آئی، یعنی پہلی جنگ کے کوئی تیرہ سال بعد۔ یہ ایک اہم موڑ تھا، کیونکہ غزنی نہ صرف غزنوی سلطنت کا دارالحکومت تھا بلکہ اس کی طاقت، تہذیب، اور تمدن کا مرکز بھی۔

غزنوی سلطنت کے زوال میں جہاں خود ان کی اندرونی کمزوریاں شامل تھیں، وہیں غوری حکمران، بالخصوص محمد غوری کی فہم و فراست، عزم، تنظیم اور فوجی حکمتِ عملی بھی اہم عوامل تھے۔ محمد غوری نے اپنی افواج کو منظم کیا اور نہایت سوجھ بوجھ کے ساتھ جنگیں لڑیں۔ اس کی بہترین عسکری تدابیر کی بدولت وہ اہم لڑائیوں میں نہ صرف غزنویوں کو بلکہ ہندوستانی راجاؤں کو بھی شکست دینے میں کامیاب ہوا۔

❁ ❁ ❁

سلطان محمد غوری کی فتوحات

پنجاب کی تسخیر اور دہلی میں پہلی مسلم سلطنت کا قیام

محمود غزنوی کے حملوں کے بعد تقریباً 190 سال (1191ء تا 1001ء) تک وسطی ایشیا یا افغانستان سے شمال مغربی ہندوستان پر کوئی بڑا حملہ نہیں ہوا۔ غزنوی خاندان کے زوال کے بعد غوریوں نے ہندوستان پر حملے شروع کیے۔ انھوں نے غزنوی سلطنت کو کس طرح ختم کیا اور کس طرح شمال مغربی ہندوستان، جس میں پنجاب بھی شامل تھا، پر ایک طویل عرصے تک حکومت کی؟ یہ میرا موضوع ہے، جس کا ذکر پنجاب کی تاریخ کو سمجھنے کے لیے بے حد ضروری ہے۔

میں نے مئی 2023ء میں افغانستان کا پانچواں سفر کیا۔ اس سفر کے دوران مجھے غزنی، بامیان، قندھار اور ہرات جانے کا بھی موقع ملا۔ ان چار صوبوں کے درمیان غور صوبہ واقع ہے، جو غوری خاندان کا آبائی علاقہ تھا۔ اگر آپ نقشے میں دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ غور وسطی افغانستان میں پہاڑوں کے درمیان واقع ایک سرسبز علاقہ ہے۔ یہاں غوری قبیلہ آباد تھا، جس نے افغانستان سمیت شمالی ہندوستان کے ایک بڑے حصے پر حکومت کی۔ اس کے اردگرد کابل، ہرات، زابل اور بامیان جیسے صوبے موجود ہیں۔ صدیوں سے، ہندوکش کے پہاڑوں میں واقع ہونے کی وجہ سے، یہ علاقہ دفاع اور تجارت دونوں کے لیے اہم سمجھا جاتا تھا۔

غور، کابل کے جنوب مغرب میں 300 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے، جبکہ ہرات اس کے مغرب میں 400 کلومیٹر دور ہے۔ جنوب میں قندھار واقع ہے، جس کا فاصلہ تقریباً 500 کلومیٹر ہے۔ غزنی شمال مشرق میں ساڑھے تین سو کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ اگر ہم لاہور سے براستہ کابل و غزنی، غور جانا چاہیں تو تقریباً پندرہ سو کلومیٹر کا سفر طے کرنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ کئی متبادل

راستے بھی موجود ہیں۔ غور، ہندوکش پہاڑی سلسلے میں واقع ہونے کی وجہ سے، دیگر علاقوں کی نسبت یہاں کا موسم نسبتاً خوشگوار رہے۔

تاریخ کے چند بڑے واقعات، جنھوں نے ہندوستان میں طویل مدتی تبدیلیوں کو جنم دیا، ان میں غوریوں کا دہلی میں پہلی مسلم ریاست کا قیام بھی شامل ہے۔ غوریوں (جنھیں بعض اوقات ''غورید'' بھی کہا جاتا ہے) نے غزنوی سلطنت، جو تقریباً دوسو سال پر محیط تھی، کو شکست دے کر غزنی سمیت شمالی ہندوستان کے اہم مراکز پر قبضہ کیا۔ یہ کیسے ممکن ہوا؟ اگرچہ یہ میرا اصل موضوع نہیں، تاہم اس کا ایک مختصر جائزہ پنجاب کی تاریخ سمجھنے میں مددگار ہوگا، اس لیے میں وجوہات کا ایک خاکہ پیش کرنا چاہوں گا۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ غوری حکمران نسلی طور پر ترک تھے، مگر ان کی ثقافت اور زبان فارسی تھی۔ وہ طرزِ حکمرانی، فن و ادب اور تہذیب میں ترکوں سے مختلف تھے۔ میری تحقیق کے مطابق، جس طرح غزنوی سلطنت نسلاً ترک ہونے کے باوجود فارسی تہذیب و تمدن کی نمائندہ تھی، اسی طرح غوریوں کی جڑیں بھی ترکی النسل تھیں، مگر ان کی تہذیبی شناخت فارس سے وابستہ تھی۔ گویا غوری حکمرانوں میں ترکی اور فارسی دونوں روایات کی خوبیاں موجود تھیں۔ انھوں نے ایک ایسے خطے میں حکومت کی جو ترک، فارسی اور افغان روایات کا سنگم تھا۔ میرا ذاتی مشاہدہ بھی یہی ہے کہ جنوب مغربی افغانستان، جو ایران کی سرحد کے قریب واقع ہے، اپنی طرزِ زندگی کے لحاظ سے مشرقی و شمالی افغانستان سے خاصا مختلف ہے۔

محمد غوری کے نام کے حوالے سے مجھے ہمیشہ الجھن رہی۔ بعض مورخین اسے ''شہاب الدین'' لکھتے ہیں۔ اس حوالے سے محقق یحییٰ امجد کی تحقیق اہم ہے۔ ان کے مطابق:

> اس عہد میں اکثر غوریوں کے دو دو نام ہوتے تھے۔ ایک دینی حوالے سے خطاب یا لقب ہوتا، اور دوسرا اصل نام۔ وقت گزرنے کے ساتھ لقب یا خطاب تبدیل بھی ہو جاتا تھا۔ محمد غوری اور اس کے بھائی دونوں کا اصل نام محمد تھا۔ بڑے بھائی نے پہلے شمس الدین کا لقب اختیار کیا، جو بعد میں غیاث الدین میں تبدیل ہو گیا۔ چھوٹے بھائی کا پہلا لقب شہاب

الدین تھا۔ چونکہ محمد غوری نے ہندوستان پر اپنے حملے شہاب الدین کے لقب سے شروع کیے تھے، اس لیے ابتدائی مورخین جیسے فرشتہ اور دیگر نے اُسے شہاب الدین غوری کے نام سے یاد کیا۔ بعدازاں جب غیاث الدین محمد نے غزنی پر قبضہ کر کے شہاب الدین کو اس کا گورنر مقرر کیا، تو اسے معزالدین کا لقب دیا گیا۔ چنانچہ اُس کا مکمل نام سلطان شہاب الدین، معزالدین محمد غوری بن بہاء الدین سام غوری بنتا ہے، جسے ہم آج سلطان محمد غوری کے نام سے جانتے ہیں۔

غزنی پر قبضے کے بعد محمد غوری نے شمالی ہندوستان پر حملہ کیا اور ترائن کی پہلی جنگ (1191ء) پیش آئی، جس میں راجپوت حکمران پرتھوی راج چوہان نے اسے شکست دی۔ ایک سال بعد ترائن کی دوسری جنگ (1192ء) میں محمد غوری نے پرتھوی راج کو شکست دی، اور اس کے ساتھ ہی شمالی ہندوستان میں غوری حکمرانی کا آغاز ہوا۔ یہی فتح دراصل ہندوستان میں مسلم حکمرانی کے مستقل قیام کا نقطۂ آغاز بنی۔

1206ء میں محمد غوری کی وفات کے بعد اس کے جرنیل قطب الدین ایبک نے دہلی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ محمد غوری کا مزار پاکستان کے ضلع جہلم کی تحصیل سوہاوہ میں واقع ہے، جو جی ٹی روڈ سے کچھ فاصلے پر ہے۔ مجھے اس کے مزار پر حاضری کا شرف بھی حاصل ہوا۔

غوری سلطنت کی توسیع اور شمالی ہندوستان میں مسلم اقتدار کا قیام

پچھلے صفحات میں اس بات کا ایک اجمالی ذکر کیا گیا ہے کہ غوری شمال مغربی ہندوستان پر حملہ آور ہوئے اور غزنوی خاندان کی حکومت کا خاتمہ کیا۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ غزنوی دور میں دارالحکومت لاہور تھا، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی حکومت کا دائرہ عمل لاہور تک محدود تھا۔ اس کے برعکس، غوری خاندان نے اپنی حکومت کا دارالحکومت دہلی میں قائم کیا۔ اس سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ اب مسلمانوں کی عملداری شمالی ہندوستان کے ایک وسیع علاقے میں قائم ہو رہی تھی۔

یہ سب کچھ کیسے ہوا اور اس کے پنجاب پر کیا اثرات مرتب ہوئے؟ یہی وہ موضوع ہے جس پر میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ اس تحریر کے لیے میں نے درج ذیل کتب سے استفادہ کیا ہے:

History of Medieval India by V.D. Mahajan

History& Civics 7(Col. Ed) by Consulting Editors: Behula Khan, S.J. Mitchell, Subhadra Sen Gupta & Monisha Mukundan.

History of Indian Nation: Medieval India by Muzaffar H. Syed& Others.

The History of India, as Told by Its Own Historians: The Muhammadan Period, Edited from the Posthumous Papers of Sir H. M. Elliot, K.C.B East India Company's Bengal Civil Service, by Professor John Dowson, M.E.A.S Staff College, Sandhurst Vol. II, London: Trübner & Co, 60, Paternoster Row, 1869.

تاریخ فرشتہ از محمد قاسم فرشتہ

یہ تمام کُتب انٹرنیٹ پر دستیاب ہیں۔

معزالدین محمد، جسے محمد غوری کے نام سے جانا جاتا ہے، برصغیر کا ایک ممتاز اور کامیاب غوری حکمران مانا جاتا ہے۔ محمد غوری نے 1173ء میں ہندوستان میں اپنی فتوحات کا آغاز کیا، اقتدار سنبھالا، اور یہاں غوری ریاست کی بنیاد رکھی۔ اب سوال یہ ہے کہ محمد غوری نے شمال مغربی ہندوستان پر کیوں حملہ کیا؟ اس کی متعدد ممکنہ وجوہات ہوسکتی ہیں۔ میری رائے میں درج ذیل عوامل ایسے ہیں جو اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ محمد غوری شمالی ہندوستان پر حملہ کرنے کے لیے بے تاب تھا:

محمد غوری کی حکومت اس وقت کے افغانستان اور ایران کے ایک بڑے حصے پر قائم تھی۔ اُس دَور کے دیگر حکمرانوں کی طرح وہ بھی اپنی سلطنت کو وسعت دینا چاہتا تھا۔ اس کا مقصد اپنے

سیاسی اثر و رسوخ میں اضافہ کرنا بھی تھا۔ محمود غزنوی کے حملوں کے بعد محمد غوری کو یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ ہندوستان، خاص طور پر شمالی ہندوستان، خوشحال علاقوں پر مشتمل ہے۔ وہ بھی محمود غزنوی کی طرح یہاں کی دولت اور غلاموں کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ شمالی ہندوستان اُس وقت سیاسی طور پر منتشر تھا، جہاں کئی راجپوت ریاستیں موجود تھیں اور کوئی بھی مضبوط مرکزی حکومت قائم نہ تھی۔ یہ سیاسی تقسیم محمد غوری کے لیے ایک سنہری موقع تھی، جس نے اسے یہ باور کرایا کہ شمالی ہندوستان پر قبضہ کرنا کوئی دشوار کام نہیں ہوگا۔

اس بات پر بھی دو آرا نہیں ہو سکتیں کہ محمد غوری ایک مسلمان حکمران تھا۔ اگرچہ اس کے حملوں کا بنیادی مقصد اسلام کی تبلیغ نہیں تھا، تاہم اس کے پس پردہ مذہبی رجحانات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بنیادی طور پر اس کے حملے سیاسی اور علاقائی مقاصد کے حصول کے لیے تھے، لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ اپنے حملوں کو مسلم حکمرانی کے فروغ اور برصغیر میں اسلام کی توسیع کے لیے بھی استعمال کرتا رہا۔ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اگرچہ ان مسلمان حکمرانوں نے براہِ راست دعوتِ اسلام کے لیے کوئی منصوبہ بندی نہیں کی، تاہم ان کی سیاسی موجودگی نے برصغیر میں صوفیائے کرام کی تبلیغی سرگرمیوں کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو بڑی حد تک کم کر دیا۔

محمد غوری کی اہم جنگیں

انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا کے مطابق، محمد غوری کا اصل نام معز الدین محمد بن سام تھا، جسے شمالی ہندوستان کے میدانوں کا غوری فاتح کہا جاتا ہے۔ وہ ہندوستان میں مسلم حکمرانی کے بانیوں میں شمار ہوتا ہے۔ میرے خیال میں اس کا کردار محمود غزنوی کے مقابلے میں کچھ مختلف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب محمود غزنوی نے ہندوستان پر حملے کیے، تو یہاں کے تمام لوگ ہندو تھے اور اس کی فوج کو اس خطے کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں تھیں۔ مگر جب محمد غوری نے حملہ کیا تو شمالی ہندوستان میں پہلے ہی ایک بڑی مسلم آبادی موجود تھی اور محمد غوری کی فوج کو اس خطے کے متعلق کافی معلومات حاصل تھیں۔

1202ء میں غیاث الدین کی وفات کے بعد محمد غوری (جسے شہاب غوریہ بھی کہا جاتا ہے)

نے 1175ء میں ملتان اور اُچ پر قبضہ کیا، اور 1186ء میں لاہور کو غزنوی سلطنت سے چھین کر اپنی حکومت میں شامل کرلیا۔ 1191ء میں وہ ترائن کے مقام پر پرتھوی راج چوہان سے شکست کھا کر واپس غزنی چلا گیا۔

محمد غوری بحیثیت حکمرانِ لاہور

یہاں میں ایک اہم نکتہ واضح کرنا چاہتا ہوں: جب محمد غوری نے ہندوستان پر حملہ کیا تو اُس وقت پنجاب پر کسی مقامی پنجابی حکمران کی حکومت نہیں تھی، بلکہ غزنوی خاندان ہی برسراقتدار تھا۔ جب 1181ء میں محمد غوری نے لاہور پر حملہ کیا تو اُس وقت خسرو ملک وہاں کا گورنر تھا۔ اس نے مزاحمت کی کوشش کی، مگر ناکام رہا۔ اس کے بعد محمد غوری نے لاہور کے ساتھ ساتھ سیالکوٹ پر بھی قبضہ کرلیا۔ محمد غوری نے خسرو ملک کو قید کر کے قلعے میں بند کر دیا، اور بعد ازاں اُسے اور اس کے تمام رشتہ داروں کو 1192ء سے قبل سزائے موت دے دی گئی۔ اس طرح، 1021ء سے لے کر 1181ء تک تقریباً 160 سالہ غزنوی اقتدار کا خاتمہ محمد غوری کے ہاتھوں ہوا۔

یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اُس وقت حملہ آور بھی مسلمان تھا اور دفاع کرنے والا بھی۔ البتہ نارائن کی جنگ میں ایک طرف راجستھان اور پنجاب کے ہندو سردار تھے، اور دوسری طرف حملہ آور مسلمان۔ اس۔ جنگ میں مقامی پنجابی حکمرانوں نے غوری دشمن کا خوب مقابلہ کیا۔ اگرچہ وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ مگر مزاحمت شدید کی۔

درحقیقت، کسی بھی حملہ آور سے نمٹنا ریاست کی ذمہ داری ہوتی ہے، عوام کی نہیں۔ اس لیے یہ کہنا کہ پنجاب نے حملہ آوروں کا مقابلہ نہیں کیا، درست مؤقف نہیں۔ جہاں پنجابی حکمرانوں کی حکومت تھی، وہاں مزاحمت ہوئی۔ اور جہاں غزنوی حکمران تھے، وہاں مزاحمت کی ذمہ داری انھی پر عائد ہوتی تھی۔ انھوں نے بھی مقابلہ کیا، اگرچہ نتائج کچھ بھی نکل سکتے تھے۔

اس کے بعد نارائن (ترائن) کے مقام پر پرتھوی راج چوہان کے خلاف دو بڑی جنگیں ہوئیں۔ یہاں پرتھوی راج چوہان کا مختصر تعارف پیش کرنا مناسب ہوگا، جو قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث بنے گا۔

پرتھوی راج چوہان: راجپوت عسکری قیادت کا تاریخی مطالعہ

انسائیکلوپیڈیا آف برِٹانیکا کے مطابق، پرتھوی راج چوہان (1192-1166ء) ایک راجپوت جنگجو بادشاہ تھا۔ چوہان قبیلہ راجستھان میں ایک مضبوط ریاست کا مالک تھا۔ 1177ء میں، جب وہ ابھی کم عمر تھا، اسے تخت پر بیٹھنے کا موقع ملا۔ اس کی ریاست شمال میں تھانیسر اور جنوب میں میواڑ تک پھیلی ہوئی تھی۔ اسے اپنے خاندان کے چند اہم افراد، جو تخت کے دعوے دار تھے، کی بغاوت کا سامنا کرنا پڑا۔ پرتھوی راج نے ان بغاوتوں کو بے دردی سے کچل دیا۔ اس کے بعد وہ کئی قریبی ریاستوں کی طرف متوجہ ہوا اور متعدد جنگیں لڑیں۔ اس نے پرماردی دیو چنڈیلا کو شکست دی۔ اس سے جہاں اس کی ساکھ میں اضافہ ہوا، وہیں اس کے دشمنوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا۔

ایک وقت ایسا بھی آیا جب پرتھوی راج نے گجرات کی طاقتور سلطنت کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ اسی دوران اس کا قنوج کے گہاڑوالہ حکمران، جے چندر، کے ساتھ تنازع پیدا ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی ایک وجہ پرتھوی راج اور جے چندر کی بیٹی سانیوگیتا کے درمیان رومانی تعلقات تھے۔ یہ ایک طویل قصہ ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ واقعہ 1191ء میں ترائن (تراوڑی) کی پہلی جنگ سے ایک سال قبل کا ہے۔

جب ایک طرف پرتھوی راج اپنے رومانس میں مصروف تھا، تو دوسری جانب محمد غوری شمالی ہندوستان میں اپنا اقتدار قائم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ محمد غوری نے 1190ء کے آخر میں بٹھنڈہ پر قبضہ کر لیا، جو پرتھوی راج کی سلطنت کا ایک اہم حصہ تھا۔ اس پر دہلی میں موجود فوج نے پرتھوی راج سے مدد کی درخواست کی، جس پر اس نے محمد غوری کے خلاف جنگ کا فیصلہ کیا۔

پرتھوی راج چوہان 1166ء کے آس پاس موجودہ راجستھان کے علاقے اجمیر میں پیدا ہوا۔ وہ چوہان خاندان سے تعلق رکھتا تھا، جو ایک راجپوت قبیلہ تھا اور اپنی جنگجو روایات کے لیے مشہور تھا۔ اس کے والد، سومیشور، اجمیر اور دہلی کی چوہان سلطنت کے ایک قابل حکمران تھے۔ پرتھوی راج اپنے والد کی وفات کے بعد ریاست کا حاکم بنا اور بعد میں اس نے اپنی سلطنت کا دائرہ

دہلی تک پھیلا لیا۔ پرتھوی راج چوہان نے کئی اہم فوجی مہمات سر کیں۔ وہ ایک طاقتور اور قابل حکمران تھا جس نے متعدد بیرونی خطرات کو پسپا کیا اور اپنی سلطنت کے دفاع کے لیے مسلسل جدوجہد کی۔ اجمیر اور دہلی کے بعد، اس نے گنگا-جمنا دوآب (یعنی گنگا اور جمنا دریاؤں کے درمیان کا زرخیز علاقہ) کو بھی اپنی ریاست میں شامل کرلیا۔ اس دور میں وہ نہ صرف اپنی سلطنت کے لحاظ سے بلکہ سیاسی اثر ورسوخ کے اعتبار سے بھی شمالی ہندوستان کا سب سے طاقتور حکمران بن چکا تھا۔

میرے علم کے مطابق، ہندوشاہی دور کے خاتمے کے بعد چوہان خاندان کا دور ایک تاریخی اہمیت کا حامل زمانہ تھا۔ ایک طرف راجپوت حکمران تھے اور دوسری طرف غور سے آنے والے ترک النسل حملہ آور۔ تاریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دہلی سلطنت کے قیام سے قبل چوہان خاندان مسلمانوں کے حملوں کے خلاف مزاحمت کرنے والا آخری بڑا راجپوت خاندان تھا۔ اس کے بعد شمالی ہندوستان میں مسلم اقتدار کا آغاز ہوا۔ پھر کبھی بھی کوئی مقامی راجپوت سردار افغانستان سے آنے والے جنگجوؤں کے خلاف (چند استثنائی واقعات کے سوا) کھل کر میدان میں نہ آیا۔ اس کے برعکس، ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ راجپوت مسلمان درباری بن گئے اور ان سے رشتہ داریاں بھی قائم کیں۔ یاد رہے کہ بابر کے خلاف جنگ بھی ایک مسلم پختون حکمران، ابراہیم لودھی، نے لڑی تھی۔

یہ بات بھی اہم ہے کہ پرتھوی راج چوہان کو صرف اس کی فوجی فتوحات کے لیے ہی یاد نہیں کیا جاتا، بلکہ وہ فن وادب کا سرپرست بھی تھا۔ اس کے دربار میں کئی شاعر اور عالم موجود رہتے تھے۔ اس بات کا ذکر قرونِ وسطیٰ کی کئی سنسکرت کتب میں بھی ملتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ تیراندازی میں ماہر تھا اور موسیقی وشاعری کا دلدادہ بھی، جس کی بنا پر اسے ایک عظیم اور مہذب بادشاہ کے طور پر جانا جاتا ہے۔

ان تمام حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ پرتھوی راج چوہان کی زندگی ایک مثالی راجپوت حکمران کی کہانی ہے، جس نے اپنی سرزمین اور ثقافت کے دفاع کے لیے جان کی بازی لگا دی۔ اس کی افسوسناک شکست نے شمالی ہندوستان کی تاریخ کا رخ بدل دیا اور مسلم اقتدار کا باب کھولا۔ اس کی شجاعت کی داستانیں آج بھی ہندو معاشرے کی لوک روایات (folklore) میں زندہ ہیں۔ پرتھوی راج چوہان کے نام پر ایک ہندی فلم بھی بن چکی ہے، اور

بی بی سی میں اس پر ایک مضمون بھی شائع ہوا ہے۔ اس مضمون کے مطابق:

''ایک حسین بادشاہ جو اپنی محبت میں گرفتار ایک خوب صورت شہزادی کو اس کے دغا باز باپ سے بچا لیتا ہے، سینکڑوں سال سے انڈیا میں سنائی جاتی رہی ہے جس میں پرتھوی راج کی بہادری اور ہاتھیوں اور گھوڑوں سے لڑی جنگوں کی داستانیں موجود ہیں۔ یہ ایک ایسے ہیرو کی کہانی ہے جو غیر معمولی شخصیت کا حامل نظر آتا ہے۔ پرتھوی راج چوہان کو انڈیا کا آخری عظیم ہندو حکمران مانا جاتا ہے۔ انھوں نے انڈیا کے راجستھان اور دلی پر بارہویں صدی کے دوران حکومت کی تھی۔ ایک جانب پرتھوی راج اور ان کی خوب صورت ملکہ سنیوگیتا کی لازوال محبت کی داستان تو دوسری طرف ان کی متعدد جنگوں میں فتوحات اور آخر کار محمد غوری کے ہاتھوں شکست کی کہانی تاریخ کی کتابوں کا اہم حصہ رہی ہے۔''[1]

پہلی جنگِ ترائن (1191ء): محمد غوری اور راجپوت حکمرانوں کا تصادم

1191ء میں دہلی کے شمال میں واقع ترائن (جسے تاروڑی بھی کہا جاتا ہے) کے میدان میں ایک اہم جنگ لڑی گئی، جو جنوبی ایشیا کی عسکری تاریخ میں غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے۔ اس جنگ میں سلطنتِ غور کے حکمران محمد غوری اور راجپوت فرمانروا پرتھوی راج چوہان ایک دوسرے کے مدمقابل آئے۔ جنگ کے دوران محمد غوری شدید زخمی ہوا، اور اسے میدانِ جنگ سے محفوظ طریقے سے نکال کر واپس غزنی منتقل کیا گیا۔

اس جنگ کی تفصیلات تاریخِ فرشتہ کے علاوہ Muzaffar H . Syed کی تصنیف *History of Indian Nation*: Medieval India اور دیگر مستند تاریخی ماخذ میں تفصیل سے بیان کی گئی ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا میں بھی اس کا مختصر مگر جامع ذکر موجود ہے۔

تاریخ کے مطابق، پہلی جنگِ ترائن 1191ء میں اس وقت برپا ہوئی جب محمد غوری، جو اس وقت تک ملتان، گجرات اور جنوب مغربی ہندوستان کے کئی علاقوں پر قابض ہو چکا تھا، شمالی ہندوستان

[1] https//:www.bbc.com/urdu/entertainment-61741972

کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کی پیش قدمی کے مقابلے میں پرتھوی راج چوہان، جو شمالی ہندوستان میں دہلی سے لے کر راجستھان تک ایک وسیع اور مستحکم سلطنت قائم کر چکا تھا، ایک طاقتور رکاوٹ بن کر سامنے آیا۔ دونوں رہنماؤں کے توسیع پسندانہ عزائم کے باعث اس جنگ کا ہونا ناگزیر تھا۔

ترائن، موجودہ تاروڑی، دہلی سے تقریباً 110 کلومیٹر شمال میں واقع ہے اور یہ مقام پانی پت اور انبالہ کے درمیان مین جی ٹی روڈ پر واقع ہے۔ راقم کو ذاتی طور پر دہلی سے چنڈی گڑھ جاتے ہوئے اس تاریخی مقام سے گزرنے کا اتفاق ہوا۔ یہ جنگ جنوبی ایشیا کی تاریخ کی اُن چند جنگوں میں شامل ہے جنھوں نے پورے خطے کے سیاسی اور عسکری مستقبل پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

پرتھوی راج چوہان ایک تجربہ کار اور باصلاحیت راجپوت سپہ سالار تھا۔ اس کی فوج اعلیٰ تربیت یافتہ راجپوت جنگجوؤں پر مشتمل تھی جنھیں گھڑسواری، تیراندازی اور صف بندی میں مہارت حاصل تھی۔ دوسری جانب، محمد غوری کے پاس ایک نسبتاً چھوٹی مگر جنگ آزمودہ فوج تھی، جس نے پیشتر شمال مغربی ہند میں کامیابیاں حاصل کی تھیں۔ تاہم، پرتھوی راج کے منظم دفاع اور اعلیٰ عسکری قیادت کے باعث غوری کو اس معرکے میں شدید نقصان اٹھانا پڑا۔

تاریخی روایات، بالخصوص تاریخِ فرشتہ کے مطابق، محمد غوری اس جنگ میں شدید زخمی ہوا اور اس کے سپاہی اسے میدانِ جنگ سے بچا کر واپس لے گئے۔ اس جنگ کا نتیجہ پرتھوی راج چوہان کی فیصلہ کن فتح کی صورت میں سامنے آیا۔ محمد غوری کو ہندوستان میں اپنی پیش قدمی روک کر پسپائی اختیار کرنا پڑی، اور اس کے نتیجے میں راجپوت حکمران کچھ عرصے کے لیے شمالی ہندوستان میں مسلم اقتدار کے قیام کو روکنے میں کامیاب رہے۔

یہ جنگ نہ صرف ایک اہم عسکری معرکہ تھی بلکہ اس نے اس خطے کے مذہبی، تہذیبی اور سیاسی مستقبل پر بھی دوررس اثرات مرتب کیے۔ بعد ازاں، 1192ء میں ہونے والی دوسری جنگِ ترائن نے اس صورت حال کو یکسر بدل کر رکھ دیا، جو ایک الگ مطالعے کی متقاضی ہے۔

ترائن کی دوسری جنگ: برصغیر میں مسلم اقتدار کے آغاز کی فیصلہ کن جھڑپ

ترائن کی دوسری جنگ 1192ء میں پرتھوی راج چوہان اور محمد غوری کے درمیان لڑی گئی۔

یہ جنگ محمد غوری کی فیصلہ کن فتح پر منتج ہوئی، جس سے یہ ثابت ہو گیا کہ اس کی فوج اتنی منظم اور طاقتور تھی کہ وہ ہزاروں میل دور سے آ کر ہندوؤں کی ایک عظیم فوج کو شکست دے سکتی تھی۔ اس جنگ میں محمد غوری کی کامیابی نے شمالی ہندوستان میں مسلم اقتدار کے آغاز کی بنیاد رکھی اور راجپوت مزاحمت کو ایک حد تک ختم کر دیا۔

1191ء میں محمد غوری کو پہلی ترائن کی جنگ میں شکست ہوئی تھی، جس کا اس پر گہرا اثر پڑا۔ صرف ایک سال بعد، یعنی 1192ء میں، اسی مقام پر دوسری جنگ ہوئی۔ تاریخِ فرشتہ (صفحات 150 تا 148) میں اس جنگ کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔ محمد قاسم فرشتہ کے بیان کا خلاصہ درج ذیل ہے:

جب محمد غوری شکست کھا کر غزنی واپس پہنچا، تو اس نے انتقام لینے کے لیے ایک عظیم فوج تیار کرنے کی ٹھان لی۔ اس دوران اس نے دن کا سکون اور رات کا آرام ترک کر دیا۔ صرف ایک سال بعد، وہ ایک لاکھ سات ہزار خلجی و افغانی سرداروں اور سپاہیوں پر مشتمل لشکر لے کر دوبارہ ہندوستان کی طرف روانہ ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ محمد غوری کو اپنے بعض سرداروں پر شک تھا، اس لیے اس نے اس مرتبہ کسی سے مشورہ کیے بغیر خود فیصلہ کیا کہ وہ حملہ کرے گا۔ جب اس کا لشکر پشاور کے قریب پہنچا، تو ایک بزرگ درباری نے محمد غوری سے عرض کیا کہ وہ اپنے سرداروں کو معاف کر دے۔ اس پر محمد غوری نے جواب دیا:

> ''کیا تجھے معلوم نہیں کہ جس دن سے میں نے ہندوؤں سے شکست کھائی ہے، اس دن سے میں نے اپنی بیوی کا چہرہ نہیں دیکھا اور نہ ہی لباس تبدیل کیا ہے۔ یہ پورا سال میں نے انتہائی رنج والم میں گزارا ہے۔''

بزرگ کے بار بار اصرار پر، محمد غوری نے اپنے سرداروں کو معاف کر دیا۔ یہ ایک طویل داستان ہے جو اگرچہ اس مضمون سے براہِ راست متعلق نہیں، مگر ایک دلچسپ تاریخی روایت ہے۔

تاریخِ فرشتہ میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ جنگ سے قبل محمد غوری نے اجمیر کے راجہ اور وہاں کے باشندوں کو اسلام کی دعوت دی، جس کا پرتھوی راج نے سخت اور توہین آمیز جواب دیا۔

فرشتہ نے پرتھوی راج کا نام ''رائے پتھورا'' لکھا ہے، جو غالباً ترجمے یا تلفظ کے فرق کا نتیجہ ہے۔ یاد رہے کہ یہ کتاب سترھویں صدی کے آغاز میں لکھی گئی تھی۔

پرتھوی راج چوہان نے محمد غوری کا مقابلہ کرنے کے لیے ہندوستان کے مختلف راجاؤں کو خطوط لکھ کر مدد طلب کی۔ اس پر کئی راجاؤں نے اس کی حمایت میں اپنی افواج کے ساتھ اس کا ساتھ دیا۔ مختصر عرصے میں تین لاکھ راجپوتوں پر مشتمل ایک عظیم لشکر تشکیل پایا، جو محمد غوری کا مقابلہ کرنے کے لیے ترائن کی جانب روانہ ہوا۔

جنگ سے قبل راجپوت راجاؤں نے بڑی دلیری اور شجاعت کے عزم کا اظہار کیا اور مسلمانوں کو مکمل طور پر نیست و نابود کرنے کی قسمیں کھائیں۔ ان ہندو راجاؤں نے باہم عہد کیا کہ جب تک وہ مسلمانوں کا مکمل صفایا نہ کرلیں گے، اپنی تلواریں نیام میں نہ رکھیں گے۔ یہ بات اہم ہے کہ وہ گزشتہ برس محمد غوری کو شکست دے چکے تھے، اس لیے ان کے حوصلے بلند تھے۔

یہاں ایک دلچسپ واقعہ پیش آتا ہے۔ جنگ شروع ہونے سے پہلے، ہندو راجاؤں نے محمد غوری کو ایک خط بھیجا جس میں کہا گیا:

''ہم ہندو راجاؤں کے لشکر کی کیفیت تو تمہیں معلوم ہو ہی گئی ہوگی۔ ہمارے ساتھ جس قدر لشکر ہے، وہ تمہیں اور تمہاری فوج کو تباہ و برباد کرنے کے لیے کافی ہے، لیکن ابھی مختلف افواج کی آمد جاری ہے، جن کے قدموں سے زمین کا سینہ کانپ رہا ہے۔ اگر تمہیں اپنی جان عزیز ہے تو اپنے سپاہیوں کی غربت پر رحم کھاؤ۔ ہم نے اپنے معبودوں کے سامنے قسم کھائی ہے، اگر تم اپنے ارادے سے باز آ کر واپس لوٹ آؤ گے تو ہم تم سے کسی قسم کا تعرض نہ کریں گے اور تمہارا راستہ نہ روئیں گے۔ ہم تم پر رحم کھا کر تمہیں واپس لوٹ جانے کا نیک مشورہ دیتے ہیں۔ ورنہ یاد رکھو کہ کل صبح ہم اپنے تین ہزار ہاتھیوں کو بے شمار سپاہیوں کی فوج کے ساتھ میدان جنگ میں اتار کر تمہیں شکست دے دیں گے اور تمہیں ذلت و رسوائی کے ساتھ یہاں سے بھاگنا پڑے گا۔''

محمد غوری نے اس خط کا مناسب جواب دیا اور جنگ کی تیاری شروع کر دی۔ اس نے جواباً کہا:

''آپ کے لشکر کی کثرت وقوت کا حال بیان کر سکوں اور اپنی کمزوری کی روداد بتا سکوں تو مجھے یقین ہے کہ اس شرط پر صلح ہو سکتی ہے کہ سرحد، پنجاب اور ملتان پر تو غوریوں کا قبضہ رہے اور باقی تمام ہندوستانی علاقے آپ کی حکومت میں چھوڑ دیے جائیں۔''

جنگ کا آغاز ہوتا ہے جس کی تفصیل یہاں بیان نہیں کی جا سکتی۔ جنگ میں پرتھوی راج چوہان کو شکست ہوتی ہے اور بڑی تعداد میں ہندو سردار قتل کیے جاتے ہیں۔ فتح کے بعد محمد غوری اجمیر کی طرف روانہ ہوتا ہے جہاں وہ اجمیر فتح کرتا ہے۔ پھر وہ دہلی بھی فتح کرتا ہے اور اپنے غلام جرنیل قطب الدین ایبک کو دہلی کے تخت پر بٹھاتا ہے۔ اس کے بعد محمد غوری نے شمالی ہندوستان کے دیگر علاقوں کو فتح کرنے کے لیے مزید مہمات شروع کیں۔ اس طرح 1192ء میں دہلی کے تخت پر ایک مسلمان حکمران بیٹھتا ہے۔ اس تخت کا آخری مسلمان حکمران بہادر شاہ ظفر تھا، جسے 1857ء میں انگریزوں نے شکست دی۔ اس طرح دہلی کے تخت پر 865 سال تک (سوائے ایک مختصر وقفے کے) مسلمان ہی حکومت کرتے رہے۔

یہ بات بھی اہم ہے کہ اس کے باوجود دہلی اور اس کے گردونواح میں مسلمانوں کی آبادی صرف دس سے پندرہ فیصد رہی۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اسلام تلوار کے زور پر نہیں پھیلا؛ اگر ایسا ہوتا تو کم از کم شمالی ہندوستان میں مسلمان اکثریت میں ہوتے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ جنوبی ہندوستان کے کئی شہروں میں مسلمان اکثریت میں ہیں۔

❁ ❁ ❁

قطب الدین ایبک

وہ سخی ’غلام‘ جس نے ہندوستان میں مسلم سلطنت کی بنیاد ڈالی

اب یہ پہلی بار ہوا تھا کہ محمود غزنوی کے برعکس محمد غوری نے وادی سندھ سمیت شمالی ہندوستان کو مستقل نوآبادی بنانے کی شعوری جدوجہد کی اور وہ اس میں کامیاب بھی رہا۔ اس نے اپنی فتح کا آغاز سندھ سے کیا، پھر ملتان فتح کیا، پشاور کی فتح کے بعد اس نے لاہور پر قبضہ کیا اور اس کی آخری بڑی دو جنگیں پرتھوی راج چوہان کے خلاف پنجاب کے علاقے میں ہوئیں (ترائن اب ہریانہ کا حصہ ہے جو کبھی پنجاب کا حصہ تھا)۔ پرتھوی راج چوہان کی موت کے بعد ہی وہ دہلی اور اجمیر سمیت شمالی ہندوستان کے ایک بڑے حصے پر قابض ہوا۔ اس نے قطب الدین ایبک کو اس علاقے کا ایک خودمختار حاکم بنا دیا۔

اگرچہ پرتھوی راج چوہان کو شکست ہو چکی تھی لیکن ابھی بھی کئی علاقے محمد غوری کے پاس نہیں تھے۔ میں جو جان سکا اس کے مطابق محمد غوری کا کنٹرول ایک محدود علاقے پر تھا۔ پنجاب کے جاگیرداروں اور کسانوں نے دل سے محمد غوری کے اقتدار کو تسلیم نہیں کیا اور مسلسل جنگی کارروائیاں کرتے رہے۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے خلاف کئی لوگ بغاوت کرتے ہیں۔ اسی طرح کی ایک بغاوت میں مقامی لوگ سلطان محمد غوری کو قتل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ہندوستان کو غوری خاندان کی نوآبادی بنا کر چند سالوں سے زیادہ دیر تک نہیں رکھا جا سکا۔ یہاں مسلسل بغاوت کا سماں ہی رہا۔

یحییٰ امجد نے لکھا ہے کہ محمد غوری کے غزنی واپس جاتے ہی ہریانہ کے علاقے میں بغاوتیں شروع ہو گئیں۔ دریائے ستلج اور جمنا کے درمیان کے علاقے کو ہریانہ سمجھا جاتا ہے جو اس وقت

پنجاب کا مشرقی علاقہ تھا۔ قطب الدین ایبک نے ریاست کی بنیاد رکھتے ہی باقی ماندہ راجپوت سرداروں پر حملے شروع کر دیے۔ اس نے میرٹھ کے قلعوں پر حملہ کر کے پرتھوی راج کے رشتہ دار راجپوت جاگیرداروں کو نکال کر ان پر پر قبضہ کیا۔ اسی طرح اس نے موجودہ علی گڑھ کے علاقے بھی فتح کیے۔ ترائن کی جنگ کے بعد ہندو سردار مسلسل اس کوشش میں تھے کہ ایبک کو یہاں سے نکال دیں۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ ایبک کے خلاف پرتھوی راج کے بیٹے راجہ کولا نے پھر سے اجمیر پر قبضہ کر لیا تھا۔

ایبک اور مقامی لوگوں کے درمیان جنگوں کے بارے میں تاریخ سے کافی کچھ جاننے کو ملتا ہے۔ تاریخ میں دلچسپی رکھنے والے حضرات کو یہ ضرور پڑھنی چاہیے۔ یہاں میں اس کا ایک مختصر ذکر کروں گا۔ یہ بات ہمیں پنجاب میں غوری خاندان کے دور کے اہم واقعات کو سمجھنے میں مدد دے گا۔

یحییٰ امجد لکھتے ہیں کہ دہلی کو اپنا پایہ تخت بنانے کے بعد ایبک نے گجرات پر حملہ کیا اور راجہ بھیم دیو کو شکست دینے میں کامیاب ہو گیا اور ان تمام علاقوں کی دولت، بالخصوص گجرات کی بے حساب دولت کو دہلی لایا گیا۔ اس کا ایک بڑا حصہ محمد غوری کو پیش کیا گیا۔ اس کے بعد محمد غوری نے ایک بار پھر ہندوستان پر حملہ کیا اور گوالیار سمیت کئی اہم علاقوں پر قبضہ کیا۔ اس طرح اس کی حکومت شمالی ہندوستان سے نکل کر وسطی ہندوستان تک پھیل گئی۔ جب وہ وسطی پنجاب میں مصروف تھا تو اس دور میں شمالی پنجاب کے گکھڑوں نے مسلسل غوری فوجوں اور ان کے ساتھ آئے ہوئے مسلمان آبادکاروں کے خلاف مسلح جدوجہد جاری رکھی۔ ان کے بارے فرشتہ لکھتے ہیں؛

لاہور میں قیام کے زمانے میں شہاب الدین کو معلوم ہوا کہ ان غیر مسلم گکھڑوں نے، جو دریائے سندھ سے لے کر کوہ سوالک کے دامن تک کے علاقے میں آباد ہیں، بڑے ہنگامے پیدا کر رکھے ہیں۔ وہ اس حد تک متعصب ہیں کہ اُن کے آس پاس کی آبادی اُن کے ظلم وستم سے عاجز آ چکی ہے خاص طور پر پشاور اور اس کے گرد و پیش کے مسلمانوں کا تو جینا مشکل ہو گیا ہے۔ ان لامذہب گکھڑوں نے خدا پرست مسلمانوں کے لیے پنجاب کا سفر کرنا بھی مشکل کر دیا ہے۔ یہ لوگ کسی مذہب کے پابند نہیں ہیں۔

فرشتہ نے گکھڑوں بارے کافی کچھ لکھا ہے جس میں ان کی طرزِ زندگی بارے کئی منفی باتیں لکھی ہوئی ہیں۔ یہ باتیں کہاں تک سچ ہیں، معلوم نہیں۔ البتہ ایک بات کئی لوگوں نے لکھی ہے جس کے مطابق دراصل غوریوں کی بار بار وادی سندھ میں آمد پر یہاں کے مقامی لوگ خاص طور پر شمالی پنجاب کے لوگ بے حد ظلم وستم کا شکار ہوئے اور وہ ایک طرح سے بے گھر بن کر رہ گئے۔ جس پر انھوں نے غوریوں کے خلاف مسلح کارروائیاں کر کے لاہور اور غزنی کے درمیان غوری فوجوں کی بے روک ٹوک آمدورفت کو ناممکن بنا دیا۔ جس کی وجہ سے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وادی سندھ (دریائے سندھ اور دریائے راوی کے درمیانی علاقے) غوری کی ایک کالونی نہ بن سکی۔

یحییٰ امجد نے ایک دلچسپ بات کا یہاں ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

دہلی میں گکھڑوں کے سردار نے، جس کا نام سکا تھا (جسے سچا بھی کہا جاتا ہے) کسان لشکروں کی مدد سے لاہور پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ انھی جھڑپوں میں ایک دیندار مسلمان گکھڑوں کے ہاتھوں پکڑا گیا۔ سکا نے اُس سے مسلمانوں کے مذہب فلسفہ حیات اور ثقافت کے بارے میں پوچھا۔ اس دیندار مسلمان نے اسلامی تعلیمات، عبادات اور تصورِ زندگی کا تفصیلی بیان اُن کے سامنے کیا۔ سردار سکا کو یہ باتیں بے حد پسند آئیں اور اس نے کہا کہ اگر میں اسلام قبول کرنے کی خاطر سلطان شہاب الدین محمد کی خدمت میں حاضر ہوں تو وہ مجھ سے کیا سلوک کرے گا مسلمان قیدی نے اُس سے کہا کہ وہ تم سے بہت خوش ہوگا اور کوہستان کی حکومت تمہارے حوالے کرے گا۔ چنانچہ اس مسلمان نے اسی مضمون کا ایک خط سلطان محمد غوری کو لکھا جس نے فوراً ایک مرصع کمر بند اور گراں بہا خلعت سردار سکا کے لیے بھجوائی اور اپنے دربار میں طلب کیا۔ سکا نے غوری سے ملاقات کی اسلام قبول کیا اور اس کے نتیجے میں تمام گکھڑ مسلمان ہو گئے البتہ دور دراز کے علاقوں کے کچھ تھوڑے بہت گکھڑ جن تک یہ پیغام نہ پہنچ سکا، پرانی روش پر چلتے رہے۔

قتلِ محمد غوری اور ان کا مزار

اس کے بعد بھی کئی بغاوتیں ہوتی رہیں۔ اسی دور کا ایک اہم واقعہ محمد غوری کا قتل ہے جو

گکھڑوں نے کیا تھا۔ اس بارے کئی متضاد باتیں بیان کی جاتی ہے۔ محمد غوری کا مقبرہ سوہاوہ کے قریب واقع ہے (میں نے اس مقبرے کو بھی دیکھا ہے۔ چند سال قبل یہاں کوئی بڑی عمارت نہیں تھی، بلکہ ایک گاؤں کے باہر ایک قبرستان میں یہ مزار واقع تھا)۔ ایک مشہور ایٹمی سائنسدان عبدالقدیر خان نے 1995ء میں یہاں ایک شاندار مقبرہ تعمیر کروایا۔ اس نے یہ کام کیوں کیا؟ کیا اس کا براہِ راست محمد غوری سے کوئی تعلق تھا؟ اس بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے؟ یہ بات تو صرف وہی جانتے تھے۔ البتہ میرا یہ قیاس ہے کہ عبدالقدیر صاحب نسلی طور پر پختون تھے اور ان کے بڑے افغانستان سے آکر یہاں آباد ہوئے تھے، شاید یہی وجہ ہو کہ انھوں نے محمد غوری کے مقبرے کی تعمیر میں دلچسپی ظاہر کی۔

محمد غوری کے قتل کے بارے میں تاریخ فرشتہ سمیت کئی کتابوں میں پڑھا ہے کہ ان کی لاش کو غزنی لے جایا گیا اور وہیں دفن کیا گیا۔ اگر ایسا ہی ہوا ہے تو سوہاوہ میں کس کا مقبرہ ہے؟ یہی بات سید محمد لطیف نے بھی لکھی ہے۔

سچ کیا ہے، وہی جانتا ہے جو ہم سب کا پروردگار ہے۔

قطب الدین ایبک: برصغیر کا اوّلین مسلم حکمران جس کا مزار لاہور میں واقع ہے

اگر آپ لوہاری گیٹ کی طرف سے نئی انارکلی میں داخل ہوں تو آپ کے بائیں جانب ایک گلی میں قطب الدین ایبک کا مزار واقع ہے (مجھے یہاں جانے کا بھی اتفاق ہوا ہے)۔ محمد غوری نے شمالی ہندوستان میں ایک مسلمان ریاست کی باقاعدہ بنیاد رکھی (اس سے کوئی پونے دو سال پہلے شمالی پنجاب میں محمود غزنوی اپنا گورنر مقرر کر چکا تھا)۔ اس کے اس کارنامے کی وجہ سے اسے مسلمان ایک ہیرو کا درجہ دیتے ہیں۔ پاکستان میں بننے والے میزائل بھی اس کے نام پر بنائے جاتے ہیں۔ وہیں اس کے پہلے گورنر، جسے اس نے شمالی ہندوستان کا سربراہ بنایا، کا نام بھی تاریخ میں ایک اہم فرد کے طور پر جانا جاتا ہے، وہ تھے جناب قطب الدین ایبک۔ بی بی سی کی ویب سائٹ پر قطب الدین ایبک کے بارے میں ایک معلومات سے بھرپور مضمون پڑھنے کو ملا۔ اس کا خلاصہ پیشِ خدمت ہے؛

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ محمد غوری اپنے درباریوں اور اپنے غلاموں کو تحفے تحائف، زرو جواہرات اور سونے چاندی سے مالا مال کر رہے تھے۔ ان میں قطب الدین ایبک بھی تھا جس نے دربار سے باہر آنے کے بعد اپنا سارا انعام اپنے سے کم حیثیت ترکوں، پردہ داروں، فراشوں، غلاموں اور دیگر کارپردازوں میں تقسیم کر دیا۔ اس بات کا محمد غوری کو علم ہوا تو اس نے قطب الدین ایبک کی فراخدلی سے متاثر ہو کر اسے اپنے مقربین میں شامل کر لیا۔ اس کے بعد قطب الدین ایبک ترقی کرتے کرتے امیر آخور بن گیا، جو شاہی اصطبل کے سردار کا عہدہ ہوتا تھا اور اسے بادشاہ کا بے حد قرب میسر ہوتا تھا۔ یہی قطب الدین ایبک ہے جس نے ہندوستان میں ایک ایسی سلطنت کی بنیاد ڈالی جس پر مسلم حکمران آنے والے چھ سو سال سے زائد عرصے تک (1857 کی غدر تک) حکومت کرتے رہے۔ قطب الدین ایبک نے دہلی کے قریب واقع قطب کمپلیکس کی بنیاد بھی رکھی، جہاں اس نے قطب مینار کے ساتھ ساتھ قطب الاسلام مسجد (جسے بعد میں قوت اسلام کا نام دیا گیا) بھی بنوائی۔

نجف حیدر جو ایک مشہور تاریخ دان ہیں کے مطابق:

جب محمد غوری سے کسی نے پوچھا کہ آپ کی تو کوئی اولاد نرینہ نہیں ہے جس سے آپ کو آنے والے زمانے میں یاد رکھا جائے گا، تو انھوں نے کہا تھا کہ میرے پاس بہت ساری اولاد نرینہ ہیں اور وہ میرے نام کو باقی رکھنے کے لیے کافی ہیں۔ پروفیسر نجف حیدر بتاتے ہیں کہ ان کا اشارہ ان کے مخصوص غلاموں کی جانب تھا جن میں یلدوز، ایبک اور قباچہ شامل تھے۔ رحما جاوید بتاتی ہیں کہ غوری نے ان میں آپس میں رشتہ داری بھی قائم کی تھی اور یلدوز کی ایک بیٹی کی شادی ایبک سے کروائی تھی، جبکہ ایک بیٹی کی شادی قباچہ سے کروائی تھی تاکہ ان میں گہرا تعلق قائم ہو اور وہ رشتہ داری کے تحت ایک دوسرے کی مخالفت کے بجائے ایک دوسرے کی معاونت کریں۔ آکسفورڈ سینٹر فار اسلامک اسٹڈیز میں ساؤتھ ایشین اسلام کے پروفیسر معین احمد نظامی نے بی بی سی کو بتایا کہ ایبک کو غلام سلطنت کے بانی کے طور پر نہیں بلکہ انڈیا میں ترک یا مملوک سلطنت

کے بانی کے طور پر یاد کیا جانا چاہیے۔

معین احمد نظامی کے مطابق (جس کا حوالہ بی بی سی کے مضمون میں دیا گیا ہے)

قطب الدین ایبک کا تعلق ترک قبیلے ایبک سے تھا اور بچپن میں ہی وہ اپنے کنبے سے علیحدہ ہو گئے اور انھیں غلام بازار میں بیچنے کے لیے نیشا پور لایا گیا۔ ایک تعلیم یافتہ شخص قاضی فخر الدین عبد العزیز کوفی نے انھیں خریدا اور اپنے بیٹے کی طرح ان کے ساتھ سلوک کیا اور ان کی تعلیم اور فوجی تربیت کی مناسب دیکھ بھال کی۔ قطب الدین نے قاضی موصوف کی خدمت گزاری کے ساتھ ان کے بیٹوں کی طرح کلام اللہ کی تعلیم حاصل کی اور سواری و تیر اندازی کی تعلیم بھی پائی۔ چنانچہ تھوڑی ہی مدت میں وہ صفت مردانگی سے متصف ہو گیا اور اس کی ستائش کی جانے لگی۔

کہتے ہیں کہ قاضی کی موت کے بعد ان کے فرزندوں نے ایبک کو پھر سے ایک تاجر کے ہاتھ فروخت کر دیا جو انھیں غزنہ کے بازار لے آیا جہاں سے سلطان غازی معز الدین سام (سلطان محمد غوری) نے انھیں خرید لیا۔

اسد اللہ خان غالب نے اپنی ایک فارسی غزل میں خود کو ترکی کے ساتھ ساتھ ایبک بھی کہا ہے۔ غالب نے لکھا:

ایبکم از جماعۂ اتراک
در تمامی ز ماہ دہ چندیم

ان کا کہنا ہے کہ ہم ترکوں کے ایبک قبیلے سے آتے ہیں اس لیے ہم چاند سے دس گنا زیادہ خوب صورت ہیں۔ اسی طرح امیر خسرو نے بھی اس کے متعلق ایک شعر کہا ہے جس سے ایبک کی انفرادیت سامنے آتی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے:

گاہ تاتاری شود گاہ چاچی
گاہ ایبک بود گاہ لاچی

یعنی کبھی میں تاتاری ہوں تو کبھی چاچی، کبھی ایبک ہوں تو کبھی لاچی۔

ترائن کی پہلی جنگ میں محمد غوری کو شکست کا سامنا کرنا پڑا، تاہم دوسری جنگ میں وہ فتح

یاب ہوا (ان تمام تفصیلات کا تذکرہ پچھلے صفحات میں آ چکا ہے)۔ پھر وہ وقت بھی آیا جب 1206ء میں محمد غوری کی وفات کے بعد قطب الدین ایبک دہلی کے تخت پر متمکن ہوا۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ قطب الدین ایبک کو باقاعدہ طور پر غوری خاندان کی جانب سے شمالی ہندوستان کا حکمران مقرر نہیں کیا گیا تھا۔ بلکہ محمد غوری کی اچانک وفات کے باعث، چونکہ وہ کسی کو جانشین نامزد نہ کر سکے تھے، اس لیے ان کی زندگی میں جو غلام جس عہدے پر فائز تھا، وہی اس خطے کا خودمختار حکمران بن گیا۔ اس طرح قطب الدین ایبک دہلی اور لاہور کا حاکم قرار پایا۔

محمد غوری کی وفات کے بعد مجموعی طور پر چار اہم جانشین سامنے آئے: دہلی کا قطب الدین ایبک، ملتان کا ناصر الدین قباچہ، غزنی کا تاج الدین یلدوز، اور بہار و بنگال کا بختیار خلجی۔ اس کے بعد 25 جون 1206ء کو قلعۂ لاہور میں قطب الدین ایبک کی باقاعدہ تاج پوشی ہوئی۔ یہاں یہ فرق بھی قابلِ ذکر ہے کہ قطب الدین ایبک نے اپنے آقا کی طرح ''سلطان'' کا خطاب اختیار نہیں کیا، نہ اپنے نام سے کوئی سکہ جاری کیا، اور نہ ہی خطبے میں اپنے نام کا اعلان کروایا۔

قطب الدین ایبک کی وفات لاہور میں پولو کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گرنے کے باعث واقع ہوئی۔ یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ محمد غوری نے قطب الدین ایبک کو آزادی نہیں دی تھی، لہٰذا جب وہ حکمران بنا تو قانونی طور پر وہ غلام ہی شمار ہوتا تھا۔ اسی وجہ سے اس نے ابتدا میں خود کو سلطان نہیں کہلوایا۔ بعد ازاں 1208ء میں جب وہ غزنی گیا، تو وہاں محمد غوری کے ایک جانشین نے اسے آزاد قرار دیا، جس کے بعد اس نے ''سلطان'' کا خطاب اختیار کیا۔ بعض مؤرخین کا یہ بھی کہنا ہے کہ اسی موقع پر اس نے اپنا نام ''قطب الدین'' (یعنی دین کا محور) رکھا، تاہم اس دعوے کے حق میں کوئی معتبر تاریخی ثبوت موجود نہیں۔

قطب الدین ایبک کو، دیگر قرونِ وسطیٰ کے مسلم حکمرانوں کی طرح، فنِ تعمیر سے خاص شغف تھا۔ اس کا ثبوت دہلی کے علاقہ مہرولی میں 1199ء میں ایک مینار کی تعمیر ہے۔ اسی مقام پر اس نے ''قوۃ الاسلام'' مسجد کی بھی بنیاد رکھی۔ قطب مینار کی تعمیر کا آغاز بھی ایبک نے کیا، جسے بعد ازاں شمس الدین التتمش نے مکمل کیا۔ یہ اینٹ سے بنا ہوا دنیا کا بلند ترین مینار ہے، جس کی پانچ

منزلیں ہیں اوران پرآیاتِ قرآنی کندہ ہیں۔

مجھے خوددومرتبہ قطب مینار اورقوۃ الاسلام مسجدکودیکھنے کا موقع ملا ہے۔اس مسجد کے بارے میں بعض ہندومؤرخین کا دعویٰ ہے کہ اس کی تعمیر میں قدیم مندروں کے ستون استعمال کیے گئے۔ میں نے خودبھی کئی ایسے ستون دیکھے جن پر مورتیاں اب تک واضح ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب ہندوؤں کے شدیداعتراض کے باعث اس مسجد میں نمازادانہیں کی جاتی۔

معین احمد نظامی کے مطابق:

عصری اور بعد کے تمام مؤرخین نے قطب الدین ایبک کی فوجی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ اس کی وفاداری،سخاوت، جرات اورعدل وانصاف کی تعریف کی ہے۔وہ اپنی فیاضی کے باعث لاکھ بخش (یعنی لاکھوں کا عطا کرنے والا) کے لقب سے مشہور ہوئے۔"

ان کی سخاوت کی کہانیاں 17ویں صدی کے اواخر میں دکن تک عام ہوچکی تھیں۔معروف مؤرخ فرشتہ کے مطابق، اُس دور میں فیاض لوگوں کو''ایبک'' کے نام سے پکارا جاتا تھا۔دہلی میں شاید ہی کوئی شخص ایسا تھا جوایبک کی سخاوت سے محروم رہا ہو۔بعض روایات کے مطابق وہ حافظِ قرآن تھے اورنہایت خوش الحانی سے تلاوت کرتے تھے،اسی وجہ سے انھیں''قرآن خوان'' بھی کہا جاتا تھا۔

ایبک نے جس عدل وسخاوت کا معیار قائم کیا، وہ بعد کے حکمرانوں کے لیے ایک مثال بن گیا۔جیسا کہ معین احمد نظامی لکھتے ہیں:

''قطب الدین ایبک کوسخاوت کا مترادف قراردینا، درحقیقت ایسا منفردخراجِ تحسین ہے جوتاریخ میں کسی اورمسلمان حکمران کے حصے میں نہیں آیا۔''

اگرچہ ایبک کی زندگی کا بیشتر حصہ جنگ وجدل اورعسکری مہمات میں گزرا،لیکن ان کی شخصیت کا دیرپا اثران کے عدل،فیاضی اورعوامی محبوبیت کے حوالے سے تاریخ میں محفوظ رہا۔

❁ ❁ ❁

برصغیر میں مملوک سلطنت: آغاز، ارتقا اور اثرات

مملوک خاندان جنھیں خاندانِ غلاماں کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے، جس کی ابتدا قطب الدین ایبک سے ہوتی ہے، اس کا آخری حکمران شمس الدین، ایک شیرخوار تھا جسے جلال الدین خلجی نے قتل کر کے خلجی خاندان کی حکومت کے دور کا آغاز کیا تھا۔ یہ دور 84 سال پر محیط ہے (1206-1290)۔ اس دور کا ذکر ہمیں اس دور میں شمالی ہندوستان، بالخصوص پنجاب کے بارے میں جاننے میں مدد دے گا۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ اس دور کا بانی قطب الدین ایبک مملوک خاندان کے قیام سے پہلے، غوری خاندان کے منتظم کے طور پر کام کر رہا تھا۔ اس وقت شمالی ہندوستان میں کوئی الگ سے ریاست قائم نہیں کی گئی تھی بلکہ شمالی ہندوستان کا الحاق غوری ریاست سے تھا، جس کا صدر مقام غزنی اور غور تھا۔ اسی طرح کا بندوبست محمود غزنوی نے بھی کیا تھا۔ غزنوی دور بھی میں لاہور ایک آزاد علاقہ نہیں تھا بلکہ یہاں کا گورنر غزنوی بادشاہ ہی مقرر کرتے تھے۔ البتہ پہلی بار ایک مکمل طور پر خودمختار اور آزاد ریاست کی بنیاد قطب الدین ایبک نے 1206ء میں محمد غوری کی وفات کے بعد رکھی تھی۔ قطب الدین ایبک کی وفات 1210ء میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد یہ ریاست کوئی اسی برس تک قائم رہتی ہے۔ اس دور کا ایک مختصر احوال پیشِ خدمت ہے۔

خاندانِ غلاماں (سید محمد لطیف نے انھیں تاتار بھی لکھا ہے) کے بارے میں کئی مؤرخین نے تفصیل سے لکھا ہے جن میں رومیلہ تھاپر، یحییٰ امجد، محمد قاسم فرشتہ اور سید محمد لطیف شامل ہیں۔ میں نے اس موضوع پر لکھنے کے لیے زیادہ تر سید محمد لطیف کی کتاب تاریخ پنجاب سے مدد لی ہے۔

قطب الدین ایبک کوئی چودہ سال تک محمد غوری کے نمائندے کے طور پر کام کرتا رہا۔ اس کے بعد 1206ء سے 1210ء کے عرصے میں اس نے سلطان کی حیثیت سے حکومت کی۔ اس

دور میں اس نے اپنی نئی قائم شدہ ریاست کی انتظامیہ کو منظم کرنے کے لیے کئی اہم کام کیے۔ اس نے دہلی سلطنت کے سربراہ کے طور پر کئی اہم لوگوں کو اپنے دربار کا حصہ بنایا اور ٹیکسوں کی وصولی، فوجی تنظیم اور امن عامہ کو برقرار رکھنے پر توجہ دی۔ اس نے برصغیر پاک و ہند میں اسلام کے فروغ کے لیے شعوری طور پر کوشش کی اور کئی مسجدیں، مدارس اور اسلامی ادارے بھی بنائے۔ اسی دور میں دہلی کی قوۃ الاسلام مسجد بھی بنائی گئی جو مذہبی تعلیم کا مرکز بن گئی۔ (اس کی تعمیر کے بارے میں کئی خدشات اب بھی لوگوں میں پائے جاتے ہیں، جس کی وجہ سے اب اس مسجد میں نماز کی ادائیگی پر پابندی عائد کر دی گئی ہے۔)

قطب الدین ایبک آرٹ اور فن تعمیر کی سرپرستی کے لیے جانا جاتا تھا۔ انھیں قطب مینار کی تعمیر شروع کرنے کا سہرا دیا جاتا ہے، جو ہندوستان میں اسلامی فن تعمیر کی سب سے مشہور علامتوں میں سے ایک ہے۔ میرے علم کے مطابق، شمالی ہندوستان میں یہ پہلی بڑی عمارت ہے جو وسطی ایشیا سے آنے والے مسلمان حکمرانوں نے تعمیر کی۔ اس کا دور جنگ و جدل کا تھا اور اسے مقامی ہندو راجپوت حکمرانوں کی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا، خاص طور پر راجستھان سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا، جنھیں اپنی ریاستوں کے کھو جانے کا دکھ تھا۔ اس نے لاہور میں قدم جمانے کے بعد برصغیر کے شمال مغربی حصے کے دیگر اہم علاقوں پر قبضہ کر لیا، جو پہلے غزنویوں کے زیر تسلط تھے۔ ان کے دور حکومت میں لاہور ایک اہم شہر رہا۔

قطب الدین ایبک کی موت 1210ء میں پولو کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گرنے کی وجہ سے ہوئی، جس کے بعد ان کے داماد التمش نے تخت سنبھالا، جو آگے چل کر دہلی سلطنت کے سب سے مشہور اور کامیاب حکمرانوں میں سے ایک بنے گا۔ سید محمد لطیف کے بقول، قطب الدین ایبک کی موت کے بعد اس کے بیٹے آرام شاہ کو بادشاہ بنایا گیا تھا لیکن وہ تخت کو نہ سنبھال سکا اور کچھ عرصے بعد قطب الدین ایبک کا منہ بولا بیٹا، جو اس کا داماد تھا، التمش تخت نشین ہوا۔

شمس الدین التمش: خاندانِ غلاماں کا دوسرا بادشاہ

انسائیکلوپیڈیا آف برِٹانیکا کے مطابق، التمش (وفات: 29 اپریل 1236ء)

خاندانِ غلاماں کا تیسرا اور سب سے عظیم سلطان مانا جاتا ہے۔ وہ بھی ایک غلام کے طور پر ہندوستان لائے گئے تھے، جنھیں قطب الدین ایبک نے خرید کر اپنا منہ بولا بیٹا اور بعد ازاں داماد بنایا۔ وہ 1211ء میں دہلی میں تخت نشین ہوا۔ اس نے شمالی ہندوستان میں مسلم سلطنت کو مستحکم کیا، اسے وسعت دی، اور دارالحکومت دہلی منتقل کیا۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ اس نے قطب مینار کی تعمیر کا سلسلہ جاری رکھا اور اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ التمش، سلطان بننے سے پہلے، قطب الدین ایبک کے دور میں ایک قابلِ اعتماد منتظم کے طور پر جانا جاتا تھا۔ اس لیے جب وہ تخت پر بیٹھا تو وہ اس خطے کے حالات سے بخوبی واقف تھا۔ اس نے جہاں اندرونی سازشوں کو ختم کیا، وہیں سندھ، پنجاب، بنگال اور وسطی ہندوستان کے کئی علاقوں کو بھی فتح کیا۔ وہ سلطنت کے انتظامی ڈھانچے کو مضبوط بنانے کی کوششوں کے لیے بھی مشہور ہے۔

یہ بھی پہلی مرتبہ ہوا کہ التمش نے ایک باضابطہ نظامِ حکومت متعارف کروایا۔ اسی کے دور میں دہلی میں تعمیراتی ترقی کا آغاز ہوا۔ عام طور پر اسے ایک نیک دل بادشاہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کی دینداری ضرب المثل تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے عہد میں شمالی ہندوستان میں اسلامی ثقافت اور اداروں کو نمایاں ترقی حاصل ہوئی۔

التمش اور غوری خاندان آمنے سامنے

تاریخی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک موقع پر غزنی میں موجود غوری خاندان پر چنگیز خان حملہ آور ہوا۔ اس حملے کے نتیجے میں، غوری خاندان کے افراد نے پنجاب پر حملہ کیا اور ایک مرتبہ پھر اس پر قبضہ کر لیا۔ یہ واقعات براہِ راست پنجاب کی تاریخ سے تعلق رکھتے ہیں، اس لیے میں نے ضروری سمجھا کہ اس اہم واقعے کا ذکر کیا جائے، جو یقینی طور پر آپ کی دلچسپی کا باعث ہوگا۔

سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ تاریخ میں پنجاب پر قابض اسے ہی تصور کیا جاتا تھا جس کا قبضہ لاہور پر ہوتا۔ لاہور کو شمس الدین التمش کے لیے، بطور سلطان دہلی (1211ء-1236ء)، اپنے ابتدائی دورِ حکومت میں خاص سیاسی اور معاشی اہمیت حاصل تھی۔

اگر ہم نقشے کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کے مغرب میں دو اہم شہر آباد تھے: ملتان اور لاہور۔ دہلی وسطی، مشرقی اور جنوبی ہندوستان پر حاکمیت کے لیے اہم تھا، جبکہ شمال مغربی ہندوستان پر قبضے کے لیے لاہور کی حکمتِ عملی کے اعتبار سے بڑی اہمیت تھی۔

میں یہاں لاہور کو صرف ایک شہر کے طور پر نہیں بلکہ ایک پورے خطے کے طور پر پیش کرنا چاہوں گا۔ یہ علاقہ نہ صرف شمالی ہندوستان کا ایک مرکزی شہر تھا بلکہ وسطی ایشیا، غزنوی سلطنت، اور کشمیر سے مختلف راستوں کے ذریعے منسلک تھا۔ اسی بنا پر التمش کے لیے لاہور ایک سرحدی شہر کی حیثیت رکھتا تھا، جسے کنٹرول کرنا اس کی ایک مجبوری تھی۔ لاہور پر تسلط سے نہ صرف وہ دہلی کی سلطنت کو شمال مغرب سے ممکنہ حملوں (خصوصاً غوری اور خوارزمیہ سلطنت کی باقیات) سے محفوظ رکھ سکتا تھا، بلکہ اس خطے میں اپنی بالادستی بھی قائم کر سکتا تھا۔

یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ لاہور اپنے عروج کے زمانے میں غزنوی سلطنت اور ہندو شاہی سلطنت دونوں کے لیے اہم مرکز رہا ہے۔ غوری سلطنت، جو شمال مغربی برصغیر کے بڑے حصے پر قابض رہی تھی، التمش کے دور میں زوال پذیر ہو چکی تھی، لیکن اس کے بعض امرا اب بھی دہلی سلطنت کے لیے خطرہ سمجھے جاتے تھے۔ غوری خاندان کے لوگ اپنے کھوئے ہوئے علاقے دوبارہ حاصل کرنا چاہتے تھے، کیونکہ وہ خود کو محمد غوری کا اصل وارث سمجھتے تھے۔ اسی جذبے کے تحت انھوں نے پنجاب پر حملے کیے، اور ان کی التمش سے ترائن کے میدان میں جنگ بھی ہوئی۔

لاہور ہمیشہ سے ہی علاقائی معیشت کا ایک اہم مرکز رہا ہے، جس کی بڑی وجہ اس کا اہم تجارتی راستوں پر واقع ہونا تھا، جو وسطی ایشیا، مشرقِ وسطیٰ اور برصغیر کو آپس میں ملاتے تھے۔ اس پر کنٹرول کا مطلب معاشی شہ رگ پر قابض ہونا تھا۔ پنجاب کی زرخیز زمینیں دہلی سلطنت کی آمدنی کا بڑا ذریعہ تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ التمش، لاہور کو شمال مغرب میں اپنی فوجی مہمات کے لیے ایک اہم جنگی اڈے کے طور پر استعمال کرنا چاہتا تھا۔ اس کے ذریعے وہ ملتان، سیالکوٹ اور سندھ جیسے علاقوں پر دہلی کے اثرات کو بڑھا سکتا تھا۔

میرے خیال میں، لاہور کی فتح التمش کی توسیع پسندانہ پالیسی کا ایک حصہ تھی، جس کے بعد وہ

اپنی سلطنت کو شمال مغربی سرحد سے لے کر برصغیر کے وسطی علاقوں تک پھیلا سکا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ شمس الدین التمش کے لیے لاہور صرف ایک شہر نہ تھا، بلکہ دہلی سلطنت پر اپنی حکمرانی کو مستحکم کرنے اور دشمن طاقتوں کے خلاف اپنی پوزیشن مضبوط کرنے کا ایک اہم ذریعہ تھا۔

یحییٰ امجد کے بقول، یلدوز ایک خوب صورت اور ذہین شخص تھا۔ وہ محمد غوری کا غلام تھا اور اپنی ذہانت کی بنا پر ترقی کرتے ہوئے سلطانِ امراء میں شامل ہو گیا۔ اُسے شیوران اور کرمان کے علاقے بطور جاگیر دے دیے گئے۔ سلطان محمد غوری کی وفات کے بعد تاج الدین یلدوز کو غزنی کا حکمران مقرر کر دیا گیا، اور وہ وہاں تخت نشین ہوا۔ اس دوران قطب الدین ایبک دہلی کا حاکم بن چکا تھا۔

قطب الدین ایبک کی وفات کے بعد غوری سلطنت کی تقسیم کچھ یوں ہوئی: دہلی پر التمش، سندھ (جس میں ملتان بھی شامل تھا) پر ناصر الدین قباچہ، جو پہلے اچ کا گورنر تھا، اور لکھنوتی پر علی مردان خلجی قابض تھا۔ قباچہ، یلدوز اور التمش تینوں لاہور پر قبضے کے خواہشمند تھے اور ان کے درمیان شدید مقابلہ جاری تھا۔

ان لوگوں کے لیے، جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ پنجاب نے حملہ آوروں کا استقبال کیا، عرض ہے کہ اس وقت پنجاب پر مقامی نہیں بلکہ ترک حکمران قابض تھے۔ قباچہ، التمش اور یلدوز، تینوں ترک النسل تھے، پنجابی نہیں۔

یحییٰ امجد کے مطابق، جب لاہور اور دہلی قطب الدین ایبک کے ماتحت تھے، اُس وقت ملتان اور سندھ پر قباچہ کی حکومت تھی (جو قطب الدین کا داماد بھی تھا)۔ قطب الدین کی زندگی میں قباچہ اُس کا وفادار رہا، لیکن اُس کی وفات کے بعد التمش کے دور میں قباچہ اچ منتقل ہو گیا اور ملتان پر قابض ہو گیا۔ اسی دوران اُس نے لاہور پر بھی متعدد حملے کیے اور کچھ عرصے کے لیے اس پر جزوی قبضہ بھی حاصل کیا۔

اسی زمانے میں غزنی سے تاج الدین یلدوز نے بھی بار بار حملے کیے، لیکن قباچہ نے اکثر

اُسے شکست دے کر واپس دھکیل دیا۔ انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا کے مطابق، تاج الدین یلدوز غزنی میں تخت نشین تھا۔ اُس نے شمالی ہندوستان پر حملہ کیا اور التمش نے اس کا مقابلہ ترائن کے میدان میں کیا، جہاں یلدوز کو شکست ہوئی۔ میرے خیال میں، اسی جنگ کے بعد شمالی اور وسطی ہندوستان (بشمول بنگال) میں خاندانِ غلاماں کا اقتدار مستحکم ہوا۔

یہاں تاریخ میں ایک اہم موڑ دیکھنے کو ملتا ہے۔

یہ تیرھویں صدی کی بات ہے جب منگولوں نے مغربی غور، ایران اور خراسان پر حملے شروع کیے اور ان حملوں کی وجہ سے کئی لوگ ہندوستان کی طرف نقل مکانی کرنے پر مجبور ہوئے۔ اسی دور میں ستمبر 1217ء میں التمش نے قباچہ کے خلاف فوج کشی کی۔ کئی جنگوں کے بعد قباچہ کو بری طرح شکست ہوئی، جس کے بعد التمش نے شہزادہ ناصر الدین محمود کو پنجاب کا گورنر مقرر کیا۔ اس طرح التمش نے لاہور پر اپنا قبضہ مستحکم کیا۔ اسی دور میں جلال الدین خوارزم شاہ کے خلاف منگولوں نے جنگ چھیڑ دی۔

خوارزم شاہی سلطنت گیارہویں صدی میں وسط ایشیا اور ایران کی ایک مضبوط سنی مسلم ریاست تھی۔ اس سے پہلے یہ لوگ سلجوقی سلطنت کے ماتحت تھے۔ اس ریاست کا خاتمہ 1220ء میں منگولوں کے ہاتھوں ہوا۔ اسی ریاست کا ایک سربراہ سلطان علاؤ الدین محمد خوارزم شاہ تھا۔ اس کے دور میں اس ریاست کی سرحد ایک طرف اناطولیہ تک تھی اور دوسری طرف وسطی ایشیاء، افغانستان اور ترکی کے کئی علاقے شامل تھے۔ علاؤ الدین خوارزم شاہ کا بھی ہندوستان فتح کرنے کا شوق تھا (اس کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہ تھی کہ ہندوستان ایک مالدار علاقہ تھا، یہاں جو بھی آیا اسے بے حد وحساب دولت ملی) مگر خوارزمی سلطنت زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی۔ اس پر چنگیز خان نے 1221ء میں حملہ کر دیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ چنگیز خان نے ایک بڑے پیمانے پر قتلِ عام کیا۔ علاؤ الدین کی وفات کے بعد اس کا بیٹا جلال الدین جو غزنی پر قابض تھا، وہاں سے بھاگ کر ہندوستان آ گیا۔ چنگیز خان نے اس کا پیچھا کیا اور کالا باغ کے قریب دونوں میں جنگ ہوئی جس میں شکست کھا کر جلال الدین میدان جنگ سے چلا گیا۔ اس کے کئی سال بعد

تک وہ منگولوں کے خلاف جنگ میں مصروف رہا۔ یہ ایک طویل داستان ہے جس کا بالواسطہ تعلق پنجاب سے ہے، اس لیے اس کا اتنا ذکر ہی یہاں مناسب ہے۔

یہاں ایک بات کا ذکر کرنا نہایت دلچسپ ہے۔ اگر میں ہندوستان میں آنے والے صوفیائے اکرام کو دیکھوں تو یہ جان پاؤں گا کہ ایک بڑی تعداد میں صوفیاء موجودہ افغانستان کے علاقے اور وسطی ایشیاء سے آ کر ملتان، دہلی اور سندھ میں آباد ہوئے۔ لاہور میں صرف حضرت علی ہجویری کا ذکر ملتا ہے۔ میں نے اس کی وجہ جاننے کی کوشش کی تو یہ معلوم ہوا کہ قباچہ کا دورِ حکومت علمی اور دینی اعتبار سے سندھ اور جنوبی پنجاب کا ایک سنہری دور مانا جاتا ہے۔ اس دور میں شمالی پنجاب اور مغربی پنجاب میں جنگ وجدل کا بازار گرم تھا۔ لاہور کے ساتھ ساتھ دہلی میں بھی جنگ کا سماں تھا، اس لیے طورخم سے پشاور اور لاہور تک آنے کا راستہ خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اسی لیے ترکستان، افغانستان اور خراسان سے آنے والے لوگوں نے پاڑا چنار، خوست، ڈی آئی خان، چمن کے ساتھ ساتھ کئی اور راستوں سے جنوبی پنجاب (ملتان)، دہلی اور سندھ کا راستہ اختیار کیا۔ اسی وجہ سے ہندوستان آنے والے اکثر علماء، مشائخ اور صوفیائے کرام کے ساتھ ساتھ بہت سے سادات خاندان بھی انھی راستوں سے گزرے اور اس طرح یہ علاقہ ایک علمی اور مذہبی مرکز بن گیا۔ آج کی تاریخ میں بھی یہ علاقہ شمالی پنجاب سے زیادہ مذہبی رجحانات کا مالک ہے۔

یاد رہے کہ اس دور میں مملوک خاندان کا تیسرا سلطان، شمس الدین التمش تخت نشین تھا جس کا ذکر پچھلے صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ اس کا دور 1211ء سے 1236ء تک مانا جاتا ہے۔ اسی دور میں دارالحکومت لاہور سے دہلی منتقل کیا گیا۔ اسی نے ملتان کے ناصرالدین قباچہ اور غزنی کے تاج الدین یلدوز کو شکست دی تھی۔ التمش نے ہی قطب مینار کو مکمل کروایا تھا اور مہرولی (دہلی کے پاس) میں حوض شمسی بھی تعمیر کروایا تھا۔ کہتے ہیں اس نے سلطان گھڑی بھی تعمیر کروائی، جو دہلی میں پہلا اسلامی مقبرہ مانا جاتا ہے۔ مملوک خاندان کا چوتھا سلطان رکن الدین فیروز، التمش کا بیٹا تھا، اس نے 1236ء میں صرف سات ماہ حکومت کی۔ اسے اس کے والد سمیت 1236ء کو چہل گانی (ترک غلام) نے قتل کر دیا تھا۔

رضیہ سلطانہ: شمال مغربی ہندوستان میں پہلی مسلمان خاتون حکمران

مملوک خاندان کی پانچویں سلطانہ، رضیہ الدین جو التمش کی بیٹی تھیں جنھیں عرفِ عام میں رضیہ سلطانہ کہا جاتا ہے۔ ان کا دورِ حکومت 1236ء سے 1240ء تک کا ہے۔ وہ ہندوستان میں پہلی مسلمان خاتون حکمران کے طور پر جانی جاتی ہیں۔ رضیہ سلطانہ کے متعلق پڑھ کر مجھے بے حد تعجب ہوا۔ یقینی طور پر آپ کے لیے یہ ایک عجیب وغریب داستان ہوں گی۔

رضیہ سلطانہ تاریخ میں ایک ممتاز تاریخی حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ دہلی سلطنت پر حکمرانی کرنے والی پہلی خاتون بادشاہ تھیں۔ رضیہ سلطانہ کے بارے میں تاریخِ فرشتہ کے علاوہ بھی کئی کتابوں میں تفصیل سے لکھا گیا ہے۔ میں نے تاریخ فرشتہ سے جو جانا، اس کا خلاصہ کچھ یوں ہے:

رضیہ سلطانہ 1205ء میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد سلطان التمش نے رضیہ سلطانہ کو ایک قابل اور ذہین خاتون سمجھتے ہوئے اس کی تربیت کی۔ وہ انھیں اپنے بیٹوں پر ترجیح دیتا تھا۔ التمش کی موت کے بعد ان کے بیٹے رکن الدین فیروز کو ابتدائی طور پر دہلی کا سلطان قرار دیا گیا، مگر وہ زیادہ دیر تک تخت سنبھال نہ سکے۔ اس کے بعد تخت کے لیے کئی امیدوار میدان میں آئے۔ آخر کار رضیہ سلطانہ کو، جس نے اپنی انتظامی اور قائدانہ صلاحیتوں کو ثابت کیا تھا، امراء اور فوجی اشرافیہ نے حکمران کے طور پر منتخب کیا۔ اس طرح سے وہ دہلی سلطنت پر حکمرانی کرنے والی پہلی خاتون بنیں۔

انھوں نے آتے ہی کئی بدعنوان اہلکاروں کو برطرف کیا اور مختلف عہدوں پر قابل منتظمین کو تعینات کیا۔ اسی دور میں عدالتی نظام کو بہتر بنانے اور تجارت کو فروغ دینے کے لیے کئی اقدامات کیے گئے۔ میرے خیال میں وہ پہلی مسلمان خاتون حکمران تھیں جو اپنے ترقی پسندانہ رویے کے لیے جانی جاتی تھیں، اور وہ بغیر نقاب کے عوام کے سامنے آتی تھیں۔ دوسری طرف، دہلی کے ترک امرا کی طرف سے سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا، کیونکہ وہ ایک عورت کے زیرِ انتظام ہونے سے ناخوش تھے۔

ان دی کہانی نوں ادب، شاعری اور لوک داستاناں وچ بارہا بیان کیتا گیا ہے۔ رضیہ سلطانہ دی زندگی دے بارے وچ بالی وڈ وچ دو فلماں وی بنیاں:

رضیہ سلطانہ (ہدایتکار: جے راج، اداکار: نروپا رائے اور کرن)

رضیہ سلطان (ہدایتکار: کمال امروہی، اداکار: دھرمیندر اور ہیما مالنی)۔

رضیہ سلطانہ بارے درج ذیل دو مفید مضمون دیکھنے نوں ملے۔[1]

ان مضامین وچ رضیہ سلطانہ بارے تفصیل نال لکھیا گیا ہے۔ اردھانہ سنگھ لکھدے ہیں؛

Being the first woman monarch of Delhi, Razia still enjoys enormous fame in popular culture. Many books have been written on her life and times and she has also been the subject of several Bollywood movies and television series over the years. But very few of these works actually offer a holistic account of the brave and ambitious woman that she was. A female who even though living in a staunchly patriarchal set-up managed to carve out a space for herself, who followed her heart and did not care what people would think, one who did not need the support of a father, husband or son to rule, who strove to improve not just her own condition but of every female living in her dominion by setting a strong example. She did not silently confirm to the established norms but challenged them at every point and therefore it will be grave injustice in my opinion to reduce the memory of such a

[1] Gabbay,A).Jaunary 01,2011.(In Realiy a Man: Sultan Iltumish, His Dauther, Raziya, and Gender Ambiguity in Thirteenth Century Northern India. Journal of Persianate Studies, 4,1,45-63اور

Razia Sultan: The First Female Monarch of Delhi Aradhana Singh

(https://www.maitreyi.ac.in/uploads/research/Samvedna/issues/vol4/issue1)

remarkable woman into a sensational love affair-As a woman and as a ruler, Razia Sultan is and will always remain an inspiration for the coming generations of males and females alike. After all, while compiling the long list of rulers in Iltutmish's dynasty, Razia is the only one whom Minhaj-i-Siraj credited as a Lashgarkash, a war leader.

''دہلی کی پہلی خاتون حکمران ہونے کے ناطے، رضیہ آج بھی عوامی ثقافت میں بے پناہ شہرت رکھتی ہیں۔ ان کی زندگی اور دورِ حکومت پر کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور وہ برسوں سے متعدد بالی وڈ فلموں اور ٹیلی ویژن سیریز کا موضوع بھی رہی ہیں۔لیکن ان میں سے بہت کم کام ایسے ہیں جو اس بہادر اور بلند حوصلہ خاتون کی مکمل تصویر پیش کرتے ہیں۔

وہ خاتون جو سخت پدرشاہی نظام میں رہتے ہوئے بھی اپنے لیے جگہ بنانے میں کامیاب ہوئیں، جنھوں نے دل کی آواز پر عمل کیا اور اس بات کی پرواہ نہ کی کہ لوگ کیا کہیں گے۔ وہ حکمران جنھیں حکومت کرنے کے لیے نہ باپ، نہ شوہر اور نہ بیٹے کے سہارے کی ضرورت تھی۔ انھوں نے صرف اپنی حالت بہتر بنانے کی کوشش نہیں کی بلکہ اپنے زیرِ اقتدار ہر عورت کے لیے ایک مضبوط مثال قائم کی۔

رضیہ نے خاموشی سے رائج اصولوں کو قبول نہیں کیا بلکہ ہر موقع پر انھیں چیلنج کیا۔ اسی لیے میرے نزدیک یہ ایک بڑی ناانصافی ہوگی کہ ایسی غیر معمولی خاتون کی یاد کو محض ایک سنسنی خیز محبت کی کہانی تک محدود کر دیا جائے۔ ایک عورت اور ایک حکمران کی حیثیت سے رضیہ سلطان ہمیشہ آنے والی نسلوں کے مرد و خواتین کے لیے تحریک اور مثال رہیں گی۔

آخرکار، التمش کی سلطنت کے طویل فہرستِ حکمرانوں میں رضیہ وہ واحد شخصیت ہیں جنھیں منہاج السراج نے ''لشکر کش'' یعنی جنگی قائد کے طور پر تسلیم کیا۔''

رضیہ سلطانہ کی ایک طویل کہانی ہے جو پڑھنے میں دلچسپی رکھتی ہے۔ میں یہاں صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ کبھی شمالی ہندوستان، جس کا ایک اہم علاقہ پنجاب تھا، پر ایک ترک خاتون رضیہ

سلطانہ بھی حکمرانی کرتی تھیں۔ وہ کہاں دفن ہیں؟ اس بارے کئی دعوے کیے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر سید صادق علی نے رضیہ سلطانہ کی موت اور اس کے مزار کی حقیقت کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی ہے جو پڑھنے کے قابل ہے۔

اس کی قبر کہاں ہے، اس بارے مختلف باتیں کہی جاتی ہیں، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ کیتھل، جو پٹیالہ کے جنوب میں تقریباً پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے، میں مقامی جاٹوں کے ہاتھوں اس کا اور اس کے خاوند کا قتل ہوا تھا۔اس کے بعد مملوک خاندان کے کئی لوگ حکمران رہے، جن کی تفصیل یہاں بیان کرنا غیر ضروری ہے۔البتہ جب لاہور پر منگولوں نے حملہ کیا، اس کا ذکر میں ضروری سمجھتا ہوں، مگر اس سے پہلے مملوک خاندان کا خاتمہ کیسے ہوا اور خلجی کس طرح برسر اقتدار آئے، اس پر بات کرنا ضروری ہے۔

❀❀❀

خلجی خاندان کے دورِ حکومت کا تاریخی تجزیہ

انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا کے مطابق خلجی خاندان (1290-1320ء) دہلی کی مسلم سلطنت کا تیسرا مسلمان حکمران خاندان تھا۔ اس سے پہلے غوری خاندان کی حکومت رہی جس کا نمائندہ قطب الدین ایبک تھا، جو محمد غوری کی وفات کے بعد ختم ہوگئی تھی۔ غوری دورِ حکومت کو اکثر لوگ سلاطینِ دہلی میں شمار نہیں کرتے، مگر میرے خیال میں انھیں بھی شامل کرنا چاہیے۔ غوری دور میں قطب الدین ایبک ان کا یہاں گورنر تھا۔ یہ بات ضرور ہے کہ غوری خاندان کا راج ایک مختصر عرصے پر محیط تھا۔ محمد غوری کی وفات کے بعد چار سال تک قطب الدین ایبک کی حکومت رہی، جس نے مملوک خاندان کی بنیاد رکھی۔ اس لیے میں یہ کہوں گا کہ خلجی تیسرا مسلمان خاندان تھا، جو ایک عرصے تک یہاں کا حاکم رہا۔

خلجی خاندان کی بنیاد جلال الدین فیروز خلجی نے رکھی، جو مملوک خاندان کے دور میں ایک اعلیٰ فوجی کمانڈر تھا۔ اس نے دہلی کی سلطنت میں ہندوستان کے جنوبی علاقے بھی شامل کیے۔ اسی کے دور میں مسلمان حکمران جنوبی ہندوستان پر قابض ہوئے، جہاں ایک مدت تک مسلمان ریاستیں قائم رہیں۔ خلجی خاندان کا دور کیسے شروع ہوا اور اس کے پنجاب کی سیاست، معیشت اور معاشرت پر کیا اثرات مرتب ہوئے، یہی میرا موضوع ہے جس پر میں بات کرنا چاہتا ہوں۔

جلال الدین فیروز شاہ خلجی

تاریخ فرشتہ میں، معروف مورخ نظام الدین احمد بخشی کے حوالے سے لکھا ہے کہ خلجیوں کا طبقہ چنگیز خاں کے داماد قالج خان کی نسل سے تھا۔ قالج خان اپنی بیوی، جو چنگیز خان کی بیٹی تھی، سے ناراض ہو کر الگ ہو گیا تھا۔ یہ اس دور کی بات ہے جب چنگیز خان دریائے سندھ کے

کنارے سلطان جلال الدین خوارزم کا خاتمہ کرنے میں مصروف تھا۔ اس کی غیر موجودگی کے دوران قالج خان غور اور جرجستان کے پہاڑی علاقوں میں اپنے بیوی بچوں اور اہل قبیلے کو، جو تقریباً تیس ہزار تھے، لے کر چنگیز خان سے جدا ہو گیا اور وہاں مستقل قیام اختیار کر لیا۔ اس کے بعد وہ اپنے قبیلے کی قوت اور اقتدار میں روز بروز اضافہ کرتا گیا۔

پھر وہ وقت آیا جب محمد غوری اور اس کے بعد غوری فرمانرواؤں اور ان کے غلاموں نے ہندوستان میں اپنی ریاست قائم کی تو خلجی ہندوستان آ کر شاہی ملازمتیں اختیار کرنے لگے۔ وہ باہمت لوگ تھے، اس لیے کئی خلجیوں نے بہت اقتدار اور رسوخ حاصل کیا اور وہ شاہی امراء اور ارا کین سلطنت بن گئے۔ ان میں اہم نام سلطان جلال الدین فیروز شاہ اور سلطان محمود علمی مندوی کے والد بھی تھے۔ انھیں قالج خان کی وجہ سے قالجی کہا جاتا تھا، جو بعد میں خلجی بن گیا۔ یہ بات کہاں تک سچ ہے، کہنا مشکل ہے کیونکہ کئی تاریخ دان کہتے ہیں کہ محمود غزنوی کو بھی بہت سے امیر خلجی کہا جاتا تھا۔ ہوسکتا ہے یہ لوگ اس دور میں بھی آئے ہوں۔

یہاں اصل بات خلجی دور کی ہو رہی ہے۔

سید محمد لطیف لکھتے ہیں کہ اپنے دادا کے انتقال کے بعد ناصر الدین ''کرا خان'' کا بیٹا کیقباد، جو اس وقت صوبہ بنگال کا حاکم تھا، اٹھارہویں سال میں معز الدین کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ مگر وہ جلد ہی عیش و عشرت میں مشغول ہو گیا اور حکومت کی باگ ڈور مکمل طور پر اپنے وزیر کے ہاتھ میں دے دی۔ اس کے دربار میں ریاست کا نظم و نسق چلانے والے تین درباری امراء کا سربراہ خلجی قبیلے کا ملک جلال الدین فیروز تھا۔ پھر ایک دن موقع پا کر اس کے حکم پر بادشاہ کو قتل کر دیا گیا اور یوں خلجی خاندان نے اپنے آقا کو قتل کر کے تخت پر قبضہ کر لیا۔

اس طرح قطب الدین ایبک کی قائم کردہ ریاست، جسے خاندان غلاماں کا نام دیا جاتا ہے اور جس کی بنیاد 1251ء میں رکھی گئی تھی، اپنے ایک کمانڈر کے ہاتھوں 1388ء تک 83 سال قائم رہنے کے بعد ختم ہو گئی۔

یہ بات میرے لیے بھی حیرانی کا باعث تھی جب میں نے سید لطیف کی کتاب میں پڑھا کہ معز

الدین کے دور میں مغلوں نے لاہور پر حملہ کیا تھا، جس کا جواب معز الدین نے دیا اور انھیں شکست ہوئی۔ اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ بابر سے پہلے بھی مغل ہندوستان پر حملے کرتے رہے ہیں۔

جلال الدین فیروز شاہ خلجی

تاریخ فرشتہ میں جلال الدین فیروز شاہ خلجی کے بارے میں کافی تفصیل ملتی ہے۔ یہاں تفصیل کا موقع نہیں، مگر جو میں سمجھ سکا ہوں اس کے مطابق جلال الدین فیروز شاہ خلجی کی ریاست کا صدر مقام دہلی تھا۔ پنجاب پر بھی اسی کی حکومت تھی۔ تخت نشینی کے وقت اس کی عمر ستر سال سے زائد تھی۔ اس کے دور میں بار ہا بغاوتیں ہوئیں۔ اسی دور میں مغلوں نے بھی حملے کیے، لیکن انھیں پسپا کر دیا گیا۔ (شاید اسی دور میں کچھ مغل لاہور میں بس گئے اور اس جگہ کا نام مغلپورہ پڑ گیا۔)

جلال الدین فیروز شاہ خلجی کے عہد کا سب سے مشہور واقعہ دیوگری پر حملہ ہے، جو اس کے بھتیجے علاؤالدین خلجی (جو اس کا داماد بھی تھا) نے کیا۔ (میرے علم کے مطابق یہ مسلمان حکمرانوں کا دکن کی طرف پہلا حملہ تھا۔) علاؤالدین 1294ء میں دیوگری کے راجا رام چندر پر حملہ کر کے اس کی دولت اور ساز و سامان لے کر دہلی کی طرف روانہ ہوا۔ اس کے بعد اس نے اپنے چچا اور سسر جلال الدین فیروز شاہ خلجی کو قتل کر دیا اور پھر اپنے تمام خاندان کا خاتمہ کر کے خود بادشاہ بن گیا۔ یہ بالکل اسی طرح ہوا جس طرح جلال الدین فیروز شاہ خلجی نے اپنے کمسن بادشاہ کا قتل کر کے تخت پر قبضہ کیا تھا۔ اس کے بعد علاؤالدین خلجی کا دور شروع ہوا۔

اس کے دور کا ایک اہم واقعہ جس نے شمالی ہندوستان میں ایک اہم کردار ادا کیا، اس کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ یاد رہے کہ منگول، جنھیں تاریخ فرشتہ میں ''مغل'' لکھا گیا ہے، نے کئی بار حملے کیے۔ ان کے حملے مملوک دور میں شروع ہو چکے تھے۔ اسی دور میں وہ مسلمان بھی ہوئے اور علاؤالدین خلجی نے اپنی بیٹی کی شادی ان کے سپہ سالار سے کی۔ اس واقعے کی تفصیل سے پہلے شمالی ہندوستان پر منگول حملوں کا ذکر ضروری ہے۔

یہاں میں اس بات کا تذکرہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نے تاریخی حوالوں کے لیے قدیم کتب سے استفادہ کیا ہے۔ جدید تاریخی کتب بھی قابلِ اعتبار ہیں، مگر ان میں بھی قدیم کتب

کے ہی حوالے ملتے ہیں۔ اس لیے میں نے قدیم کتب سے حوالے لینے کا فیصلہ کیا ہے۔

پنجاب اور منگول حملہ آور

میں نے پچھلے صفحات میں پنجاب پر بیرونی حملوں کے بارے میں بات شروع کی تھی، لیکن درمیان میں ایک اور بات آ گئی تھی۔ اب ہم پھر اپنے موضوع کی طرف آتے ہیں۔ پنجاب پر بیرونی حملوں کے بارے میں بی بی سی نے ایک طویل مضمون شائع کیا ہے، جسے وقار مصطفیٰ نے لکھا ہے۔[1] اس مضمون کا خلاصہ پیشِ خدمت ہے۔

تیرہویں صدی میں دہلی پر مملوک برسرِ اقتدار تھے۔ لاہور ان کا ایک صوبہ تھا، جس پر عام طور پر حکمران اپنے بیٹوں یا پوتوں کو گورنر تعینات کرتے تھے۔ اس طرح دہلی کے سلاطین یہاں، جنھیں گورنر مقرر کرتے، وہی اس کے دفاع کے ذمہ دار ہوتے تھے۔ اسی دور میں منگولوں نے پنجاب پر پہلی مرتبہ 1221ء میں حملہ کیا۔ یہ بات تاریخ دان عزیز الدین احمد نے اپنی کتاب پنجاب اور بیرونی حملہ آور میں لکھی ہے کہ چنگیز خان نے جلال الدین خوارزم شاہ کو پے در پے شکست دینے کے بعد ہندوستان کی طرف جانے پر مجبور کیا۔ ہندوستان میں بھی خوارزم شاہ کی فوج نے چنگیز خان کا آخری مقابلہ کیا، اور جب شکست ہوتی نظر آئی تو خوارزم شاہ گرفتاری سے بچنے کے لیے دریائے سندھ میں کود گیا۔ اس کے بعد چنگیز خان کے ایک جرنیل بالا نویان نے کچھ دور تک خوارزم شاہ کا تعاقب جاری رکھا۔ پھر انھوں نے ملتان کا محاصرہ بھی کیا، لیکن ملتان کی گرمی برداشت نہ کر سکے اور واپس لوٹ گئے۔ اس کے بعد کئی جنگوں کا احوال ملتا ہے۔ ایک وقت آتا ہے کہ جلال الدین خوارزم شاہ کا دور ختم ہو جاتا ہے۔ یہ پنجاب پر ان کا پہلا حملہ تھا۔ اس کے بعد 1241ء میں منگولوں نے ایک بار پھر پنجاب پر چڑھائی کی اور چاروں طرف لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا۔ جو چیز سامنے آئی، اسے برباد کیا۔

تیرہویں صدی کے ایک مشہور فارسی مؤرخ قاضی منہاج سراج جوزجانی نے اپنی کتاب

[1] https//:www.bbc.com/urdu/articles/c0d330o84j20

طبقات ناصری (ترجمہ غلام رسول مہر) میں لکھا ہے کہ جب تاتاری لشکر ملتان کی طرف رواں دواں تھا تو ملتان کے والی ملک کبیر الدین ایاز نے جنگ کا فیصلہ کیا۔ جب یہ خبر تاتاریوں کی لشکرگاہ پہنچی تو انھوں نے فیصلہ کیا کہ ملتان کی بجائے لاہور پر حملہ کرنا چاہیے۔ اس وقت اختیارالدین قراقش لاہور کے والی تھے۔ یاد رہے کہ منگول جب 1241ء میں پنجاب پر حملہ آور ہوئے، اس وقت رضیہ سلطانہ کا دور ختم ہو چکا تھا اور دہلی میں مملوک برسرِ اقتدار تھے۔ ان کا دورِ حکومت 1206ء سے لے کر 1290ء تک رہا، جس کے بعد خلجی دورِ حکومت شروع ہوا۔

خلجی دور کے چار مشہور حکمرانوں کے نام اور ان کے دورِ حکومت کی تفصیل کچھ یوں ہے، جس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ یہ کس طرح ایک دوسرے کو قتل کر کے باری باری تخت نشین ہوتے رہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان مسلمان حکمرانوں نے صرف غیر مسلموں کو قتل نہیں کیا بلکہ اپنے خاندان کے لوگوں کو بھی نہیں بخشا۔

جلال الدین فیروز شاہ خلجی (1290-1296)

علاؤالدین خلجی (1296-1316)

شہاب الدین خلجی (1316)

قطب الدین خلجی (1316-1320)

میرے خیال میں یہ سب کچھ مال و دولت، جاہ و منصب اور تخت نشین ہونے کی جنگ تھی۔ یہ لوگ اسلام کی تبلیغ کی خاطر (شاید کوئی ہو بھی) ہندوستان پر حملہ آور نہیں ہوئے۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ ان کے پاس طاقت اور اقتدار تھا، جس کی مدد سے صوفیاء اکرام کو تبلیغ کا موقع ملا، اور ایک بڑی تعداد میں یہاں کے لوگ مسلمان ہوئے۔ ساتھ ہی بے شمار مسلمان ایران، وسطی ایشیاء، افغانستان اور عرب سے یہاں آ کر آباد ہوئے۔

وقار مصطفیٰ منہاج سراج کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ جب منگول لاہور پر حملہ کرتے ہیں تو قلعہ لاہور میں خوراک اور سامانِ جنگ کا کوئی وافر ذخیرہ موجود نہ تھا، اور نہ ہی لاہور کے رہنے والے کسی ایک پرچم کے نیچے جمع تھے۔ وہ ایک طرح سے تاتاریوں کے دورِ اقتدار میں ان کے

حامی تھے۔ انھیں تاتاریوں نے پناہ دی ہوئی تھی۔ اس کے لیے انھیں چاندی یا سونے کی لکڑی کی ایک چھوٹی تختی دی جاتی تھی، جسے پائزہ کہتے تھے، جس پر خدا اور بادشاہ کے نام کے بعد ایک خاص نشان کندہ ہوتا تھا۔ یہ امن کا پروانہ ہوتا تھا۔ اسی وجہ سے عوام کی اکثریت نے قلعے کی حفاظت کے لیے ملک اختیارالدین قراقش کا ساتھ نہیں دیا۔ یہ بھی ہوا کہ تاتاریوں کے خلاف جنگ کی خاطر دہلی سے کسی قسم کی مدد لاہور نہ پہنچی۔ وہاں بھی اقتدار کی جنگ جاری تھی۔ اس کے بعد ایک مدت تک لاہور پر قبضے کی خاطر جنگ جاری رہی۔

شہر پر قبضے کے لیے تاتاریوں نے لاہور کے اطراف میں بہت سی منجنیقیں نصب کر دیں اور فصیل کو توڑنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ سب دیکھ کر ملک اختیارالدین قراقش اپنی فوج اور نوکروں چاکروں کو لے کر دہلی روانہ ہو گئے۔ یہ سب جان کر اہلِ شہر خوف زدہ ہو گئے اور یوں تاتاری 22 دسمبر 1241ء کو شہر پر قابض ہو گئے۔ ان کا مقابلہ عام لوگوں نے خوب کیا اور آخر دم تک تلواریں چلاتے رہے۔ کئی نامور لوگ مارے گئے، مگر انجام منگولوں کے قبضے کی صورت میں ہوا۔ یہ ایک خونریز جنگ تھی۔

وقار مصطفیٰ، طبقاتِ ناصری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

(طائر بہادر کی قیادت میں) تاتاریوں نے شہر لے لیا تو لوگوں کو ہلاک بھی کیا اور گرفتار بھی کر لیا لیکن خود تاتاری اتنے مارے جا چکے تھے کہ ان کی گنتی مشکل تھی۔ 'قریباً تیس یا چالیس ہزار تاتاری اور اسی ہزار گھوڑے مارے گئے بلکہ اس سے بھی زیادہ اور تاتاریوں کے لشکر میں ایک بھی ایسا نہ تھا جس کے تیر یا تلوار یا ناوک کا زخم نہ لگا ہو۔' طائر بہادر اور آقسنقر کوتوال کے درمیان نیزوں سے مقابلہ ہوا۔ ہر ایک نے دوسرے کو نیزے سے زخمی کیا۔ طائر بہادر نے دوزخ کی راہ لی اور آقسنقر جو شیر کی مانند تھے، بہشت میں پہنچ گئے۔' تاہم طبقاتِ ناصری کا انگریزی ترجمہ کرنے والے مستشرق میجر جارج ہنری راورٹی کے نزدیک لاہور میں طائر بہادر کے مارے جانے کی خبر صحیح نہیں۔ منہاج سراج لکھتے ہیں کہ تاتاریوں نے لاہور پر قبضہ کر لیا اور شہر کو برباد کر کے لوٹ گئے۔ 'ملک قراقش

دریائے بیاس سے لوٹ کر لاہور پہنچے۔ جس رات وہ لاہور سے بھاگے تھے، بہت سامال و زر، جس میں نقد بھی تھا اور سامان بھی تھا۔ ان کے آدمی پانی میں ڈال گئے تھے اور اس مقام پر نشان لگا گئے تھے۔ ملک مال ہی کی غرض سے لاہور آئے تھے۔ مال انھیں مل گیا کیوں کہ وہ تاتاریوں کے ہاتھ نہیں آیا تھا۔' عزیز الدین احمد لکھتے ہیں کہ کچھ مؤرخوں کا کہنا ہے کہ منگولوں نے لاہور پر پورا سال قبضہ جمائے رکھا اور شہر کے مظلوم عوام اور مضافات کی بستیوں کے بے سہارا لوگوں کو جی بھر کر لوٹا اور برباد کیا۔ محمد حذیفہ نظام کے مطابق منگول فوج کے اکثر حملے جنوبی ایشیا کے مغربی سرحدی علاقوں کے لیے ایک نئی حقیقت بن گئے۔ 'چغتائی خانات کے جھنڈے تلے منگولوں کو شمالی پنجاب میں مستقل موجودگی قائم کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ سماجی اور سیاسی نظم و نسق کے مکمل طور پر تباہ ہونے کے علاوہ، قابل کاشت اراضی کا وسیع خطہ برباد ہو گیا اور گھاس کے میدان میں تبدیل ہو گیا کیونکہ خانہ بدوش منگول طرز زندگی سے وابستہ جنگی گھوڑے اور مویشی دریائے سندھ کے علاقے میں داخل ہوئے۔ 1916ء کے لاہور کے گزٹیئر میں لکھا ہے کہ لگ بھگ ایک صدی لاہور مسلسل منگول حملوں کی زد پر رہا۔ 1241ء میں قبضہ کیا اور 1246 میں خراج پر دیا گیا۔ شہر کو (خاندان غلاماں کے آٹھویں سلطان غیاث الدین بلبن) نے 1270ء میں دوبارہ تعمیر کیا لیکن 1285ء میں منگولوں کی واپسی ہوئی اور بلبن کے بیٹے، شہزادہ محمد، راوی کے کنارے ایک معرکے میں مارے گئے۔ شاعر امیر خسرو کو اسی وقت گرفتار کیا گیا۔' (لاہور میں) مغل پورہ کے نواحی علاقے کی بنیاد منگول آبادکاروں نے رکھی۔

جو میں جان سکا، اس کے مطابق جس دور میں تاتاری لاہور پر قابض تھے، دہلی میں مملوک برسرِ اقتدار تھے۔ انھوں نے تاتاریوں کی بالادستی قبول کر رکھی تھی۔ شمالی ہندوستان میں کوئی ایسی مضبوط مرکزی حکومت موجود نہ تھی جو تاتاریوں کا مؤثر طور پر مقابلہ کر سکتی۔ یہی وجہ تھی کہ تاتاری شمالی ہندوستان کے کئی علاقوں پر جزوی طور پر قابض رہے۔ اگرچہ انھوں نے باقاعدہ کوئی مستقل

ریاست قائم نہیں کی، مگر بدنظمی کا عالم ضرور تھا۔ اسی انتشار کے ماحول میں مملوک سلطنت کا خاتمہ ہوا اور خلجی خاندان برسرِ اقتدار آیا۔ خلجیوں کے دور میں تاتاریوں کے خلاف کئی اہم جنگیں لڑی گئیں۔

چنگیز خان کون تھا؟

یہ موضوع اس کتاب کے مرکزی مضمون سے کچھ ہٹ کر ہے، لیکن اس کا ذکر اس لیے ضروری ہے کہ تقریباً ایک صدی یعنی تیرہویں صدی کے آغاز سے لے کر چودھویں صدی کے وسط تک چنگیز خان کے جانشینوں نے کئی بار شمال مغربی ہندوستان پر حملے کیے۔ اس لیے چنگیز خان کا ایک مختصر تعارف پنجاب کی اس وقت کی صورتِ حال کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوسکتا ہے۔

یاد رہے کہ جہاں وسطی ایشیا، ہندوستان اور عرب دنیا میں چنگیز خان کو ایک سفاک اور ظالم حملہ آور کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، وہیں منگولیا میں اُسے ایک عظیم قومی ہیرو کا درجہ حاصل ہے۔ یہ بات عام ہے کہ جو کسی قوم کا ہیرو ہوتا ہے، وہ دشمن قوم کے نزدیک مجرم تصور کیا جاتا ہے۔

چنگیز خان (1227 -1162ء)، جس کا اصل نام تیموجن تھا، منگول سلطنت کا بانی اور پہلا عظیم خان (شہنشاہ) مانا جاتا ہے۔ ''چنگیز خان'' کا لقب اس نے خود اختیار کیا تھا۔ مختلف زبانوں میں یہ نام مختلف انداز سے لکھا جاتا ہے، مگر اردو میں اسے ''چنگیز خان'' ہی لکھا جاتا ہے۔ میرے مطالعے کے مطابق اس سے قبل ''خان'' کا لقب عام حکمرانوں میں مستعمل نہ تھا، اور مسلمان حکمران عمومی طور پر ''امیر'' یا ''سلطان'' جیسے القابات استعمال کرتے تھے، جیسے سلطان محمود غزنوی۔

تیموجن کی پیدائش منگول قبیلے میں ہوئی۔ بچپن ہی میں اس کے والد کا انتقال ہوگیا، جس کے باعث اس کی ابتدائی زندگی سخت مشکلات اور محرومیوں میں گزری۔ لیکن وہ ایک دلیر، جفاکش اور اعلیٰ حکمتِ عملی کا ماہر شخص تھا۔ اس نے منگول قبائل کو متحد کیا، اور اس اتحاد کی بنیاد پر منگول سلطنت کی توسیع کا آغاز کیا۔ اس کی قیادت میں منگولوں نے وسطی ایشیا، چین، مشرقِ وسطیٰ اور مشرقی یورپ تک فتوحات حاصل کیں۔ 1227ء میں اس کی وفات کے وقت منگول سلطنت مشرقی ایشیا سے یورپ کی سرحدوں تک پھیل چکی تھی۔

چنگیز خان اپنی بے رحمی اور قتل و غارت کے لیے تاریخ میں بدنام ہے، تاہم دوسری طرف اس کی فتوحات کی وجہ سے مختلف تہذیبوں کے درمیان ثقافتی، علمی اور تجارتی تبادلوں کا آغاز بھی ہوا۔ مشرق و مغرب کے درمیان خیالات اور علوم کا تبادلہ ممکن ہوا، اور شاہراہِ ریشم کی اہمیت اسی دور میں نمایاں ہوئی۔ جہاں تک میرے مطالعے کا تعلق ہے، یہ چنگیز خان کے دورِ فتوحات ہی کا اثر تھا کہ پہلی بار ہندوستان، وسطی ایشیا اور منگولیا کے مابین ایک مستقل ربط پیدا ہوا، جو بعد ازاں ایک مضبوط تعلق میں بدل گیا۔

منگولیا میں آج بھی چنگیز خان کو قومی ہیرو تصور کیا جاتا ہے۔ اگرچہ اس کے حملوں کے دوران قتل و غارت گری اور تباہی کا بازار گرم رہا، اور لاکھوں افراد مارے گئے، تاہم اس کے جانشینوں نے، جن میں قبلائی خان اور ہلاکو خان خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، ایشیا اور اس سے آگے کے وسیع علاقوں پر طویل عرصے تک حکمرانی کی۔ ان ہی میں سے ایک بڑی تعداد نے بعد ازاں اسلام قبول کیا، جس کا تاریخی اثر بہت دُور رس رہا۔

انھی کے بارے علامہ اقبال نے فرمایا تھا؛

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

خلجی اور منگولوں کے درمیان جنگیں

خلجی دور کا سب سے اہم واقعہ علاؤالدین خلجی کے عہد میں پیش آیا، جب منگول اس کی سلطنت پر حملہ آور ہوئے۔ اس واقعے کا ذکر میں ضروری سمجھتا ہوں تا کہ اس بات کا سراغ لگایا جا سکے کہ بیرونی حملہ آوروں کا پنجاب میں کس طرح راستہ روکا گیا۔ یہ بات بھی درست ہے کہ منگولوں نے خوارزمیوں کا تعاقب کرتے ہوئے مملوک دور میں لاہور پر بھی حملہ کیا تھا۔ اس کے بعد بھی انھوں نے بارہا شمال مغربی ہندوستان پر یلغار کی، اور خلجی حکمرانوں نے ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور شکست بھی دی۔

ان حملوں کا ایک مختصر تذکرہ یقیناً آپ کی دلچسپی کا باعث ہوگا۔ میری طرح آپ بھی یہ سوچنے پر مجبور ہوں گے کہ ہندوستان کے اصل وارث تو یہاں کے باشندے تھے، مگر تخت نشینی کی جنگ دو غیر ملکی قوتوں کے درمیان ہو رہی تھی؛ دونوں منگول تھے۔۔۔ایک طرف خلجی اور دوسری طرف چنگیز خان کی نسل سے چغتائی خاندان۔

یہ ایک بدقسمتی کی بات ہے کہ آج بھی کچھ ایسا ہی منظر ہے۔ خطہ وہی ہے۔۔۔حکمرانی کے دعوے دار دو؛ ایک طرف یورپ اور امریکہ، اور دوسری طرف چین اور روس۔

بڑے ہاتھیوں کی جنگ میں نقصان تو گھاس ہی کا ہوتا ہے۔۔۔اور وہی ہو رہا ہے۔۔۔ یہی میری اور آپ کی بدقسمتی ہے۔۔۔اور یہ سلسلہ کب تک چلے گا؟

شاید اُس وقت تک جب تک ہم خود انحصاری حاصل نہیں کر لیتے۔

اب ہم دوبارہ اپنے اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔ علاؤالدین خلجی کے دور میں لڑی جانے والی ایک جنگ تاریخ کی بڑی جنگوں میں شمار ہوتی ہے۔ اگرچہ علاؤالدین خلجی نے کئی اہم جنگیں لڑیں، لیکن وہ جنگیں جو اس نے منگولوں کے خلاف لڑی، انھوں نے اس خطے کا نقشہ بدل کر رکھ دیا۔ ان جنگوں کا تفصیلی ذکر مورخ فرشتہ نے بھی کیا ہے۔ اس کے علاوہ میں نے کئی اور کتابوں اور مضامین سے بھی مدد لی ہے۔[1] ان کتابوں اور مضامین کے مطالعے سے جو جان سکا وہ پیشِ خدمت ہے۔

[1] *Misrepresentation of History*, Tahir Kamran, *Political Economy* February 11,2018. https//:www.thenews.com.pk/tns/detail/564941 -misrepresentation-history

Alauddin Khalji Remembered: Conquest, Gender and Community in Medieval Rajput Narratives By Anuja Chandramouli *A Comprehensive History of Medieval India*: By Salma Ahmed Farooqi. *Character and achievements of Alauddin Khilji* Jasbir Kaur

دہلی کے سلطان علاؤالدین خلجی (1296-1316-)

جہاں وہ اپنی فوجی فتوحات، انتظامی اصلاحات اور دورِ حکومت میں کیے جانے والے اقدامات کی وجہ سے مشہور ہیں، وہیں وہ منگول حملوں کے خلاف کامیاب جنگیں لڑنے کے باعث بھی تاریخ میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔

چنگیز خان کا انتقال 1227ء میں ہوا۔ اس کی وفات کے بعد اس کی اولاد میں سے ایک گروہ نے شمال مغربی ہندوستان پر حملے کرنے شروع کیے۔ ان کا ہدف ملتان، دہلی اور لاہور جیسے اہم شہر تھے۔ یوں منگول تیرھویں صدی کے آخر اور چودھویں صدی کے پہلے عشرے تک شمال مغربی ہندوستان کے لیے ایک مستقل خطرہ بنے رہے۔

انھوں نے کئی بار ان علاقوں پر حملے کیے، مگر طویل مدتی قبضہ قائم رکھنے میں بڑی حد تک ناکام رہے۔ تاہم، علاؤالدین خلجی کے دور تک منگول اپنے تباہ کن چھاپوں اور خونریزی کی وجہ سے خوف و دہشت کی علامت بن چکے تھے، اور ان کے حملوں کی شدت میں اضافہ ہو چکا تھا۔

میرے علم کے مطابق علاؤالدین خلجی سے قبل منگولوں اور کسی بھی خلجی یا دیگر مقامی حکمران کے درمیان کوئی بڑی جنگ واقع نہیں ہوئی۔ ان کے خلاف بڑی اور فیصلہ کن جنگیں صرف علاؤالدین خلجی کے عہدِ حکومت میں ہی لڑی گئیں۔ ان جنگوں کے بعد منگول کبھی دوبارہ ہندوستان پر حملہ نہ کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ کئی مؤرخین علاؤالدین خلجی کو ہندوستان کا محسن قرار دیتے ہیں۔

یہاں میں شمال مغربی ہندوستان کے جغرافیائی نقشے کے حوالے سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں تاکہ آپ کو یہ سمجھنے میں آسانی ہو کہ مغرب سے آنے والے کئی حملہ آوروں نے پشاور کے راستے کی بجائے ملتان کا راستہ کیوں اختیار کیا۔

اگر ہم موجودہ پاکستان کے مغرب میں واقع ممالک کو دیکھیں تو شمال میں چین واقع ہے، جس کی سرحد گلگت بلتستان سے ملتی ہے۔ شمال مغرب میں افغانستان کی واخان پٹی پاکستان سے منسلک ہے، اور پھر افغانستان واقع ہے۔ جنوب مغرب میں ہماری سرحد ایران سے جا ملتی ہے۔ اس طرح پاکستان کی سرحدیں چین، افغانستان اور ایران سے ملتی ہیں۔

افغانستان کے شمال میں تاجکستان اور کرغیزستان واقع ہیں، مغرب میں ازبکستان، ترکمانستان، جنوب مغرب کی سمت ایران واقع ہے۔ یوں افغانستان کی چار ممالک ایران، ترکمانستان، ازبکستان، اورتاجکستان سے سرحدیں ملتی ہیں۔اگران ممالک سے پیچھے نظر دوڑائیں تو تاجکستان کے ساتھ کرغیزستان واقع ہے، اوراس سے اوپر قازقستان کی سرحد آتی ہے۔ یہ تمام ممالک تاریخی طور پر برصغیر تک پہنچنے والے حملہ آوروں کی گزرگاہوں میں شامل رہے ہیں۔

قدیم ہندوستان (موجودہ پاکستان) میں داخل ہونے کے کئی راستے تھے۔اگرکوئی چین سے آنا چاہتا تواس کے راستے میں لداخ اورآزاد جموں وکشمیر کے کچھ علاقے آتے تھے۔چین کی سرحد گلگت بلتستان سے بھی ملتی ہے۔تاجکستان کی پاکستان سے براہِ راست سرحد نہیں ملتی، البتہ تاجکستان اور پاکستان کے درمیان صرف واخان کی ایک تنگ پٹی حائل ہے، جوایک قدیم راستہ ہوا کرتا تھا۔اس راستے سے لوگ ہنزہ اور دیر کے علاقوں میں داخل ہوتے تھے۔اس سے نیچے کے علاقوں میں داخل ہونے کے مزید راستے موجود تھے۔کچھ لوگ ان راستوں سے ملتان پہنچتے، کچھ لاہور، اور کچھ سندھ کی طرف جنوب میں بڑھتے تھے۔بعض حملہ آور چمن کے راستے قلات اور دیگر جنوبی علاقوں میں داخل ہوتے تھے۔

اگر میں یہ کہوں کہ ہندوستان کے اس علاقے میں چار بڑے شہر یا مقامات تھے جہاں بیرونی لوگ آتے تھے: لاہور، ملتان، کوئٹہ (چمن)، اور بلوچستان کے علاقے جیسے قلات اور مکران۔اکثر حملہ آور پشاور، کوہاٹ، ژوب اور چمن کے راستے ہندوستان میں داخل ہوتے تھے۔ ان سب کی منزل شمال میں واقع لاہور اور ملتان ہی ہوا کرتی تھی۔ بڑی تعداد میں لوگ قندھار، چمن، پشین اورلورالائی کے ذریعے ملتان پہنچتے تھے۔اسی وجہ سے بہت سے حملہ آوروں نے لاہور پرحملہ کرنے سے قبل ملتان پرحملہ کیا۔

اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہ لوگ جوقندھار کے شمالی علاقوں جیسے ہرات اورمشہد سے ہندوستان آنا چاہتے تھے، ان کے لیے یہی راستہ تھا: مشہد سے ہرات، ہرات سے قندھار، قندھار سے چمن اورلورالائی کے ذریعے ملتان۔ان کے لیے لاہور بہت دور پڑتا تھا۔اسی طرح جب ہم دیکھتے ہیں

کہ وسط ایشیا یا دیگر علاقوں سے لوگ آتے تھے تو وہ عموماً صحرائی راستے استعمال کرتے تھے۔ اگر وہ حیراتان اور مزارشریف کے راستے آتے تو انھیں سلانگ جیسے دشوار گزار درّے عبور کرنا پڑتے۔ ان کے راستے میں ہندوکش کے بلند و بالا پہاڑ بھی آتے تھے، جنھیں عبور کرنا نہایت مشکل ہوتا تھا۔ لہٰذا وہ میدانی راستے اختیار کرتے تھے اور قندھار و چمن کے راستے ملتان پہنچتے تھے۔

یہ راستے جن پر لوگ سفر کرتے تھے، ان میں جنگجو، علماء، صوفیائے کرام اور تجارتی قافلے شامل ہوتے تھے، جو بالآخر دہلی تک پہنچتے تھے۔ دہلی کے بعد وہ ہندوستان کے جنوبی علاقوں مِثل اُدکن، گجرات وغیرہ کی طرف بھی سفر کرتے تھے۔ ان معلومات کو مدنظر رکھتے ہوئے آپ ان علاقوں اور راستوں کو بہتر طور پر سمجھ سکیں گے۔ ان شاء اللہ، اس سے آپ اس کتاب کے مندرجات کو بہتر انداز میں سمجھ پائیں گے۔

اب ہم اپنے اصل موضوع کی طرف آتے ہیں کہ علاؤالدین خلجی نے کس طرح منگولوں کے حملے روکے، جس کی وجہ سے وہ ہندوستان کا ایک محسن تسلیم کیا جاتا ہے۔

یوں تو منگولوں نے کئی بار ہندوستان پر حملے کیے۔ وہ خوارزمی حکمرانوں کا پیچھا کرتے کرتے بھی جنوبی پنجاب تک آ پہنچے تھے۔ تاہم، ان کے بڑے پیمانے پر حملے علاؤالدین خلجی کے دور میں شروع ہوئے (1305ء–1299ء)۔ ان کا پہلا حملہ 1299ء میں ہوا۔ انھوں نے دریائے سندھ عبور کیا اور پنجاب کے علاقے میں داخل ہوئے۔ تاہم، علاؤالدین خلجی نے اپنی منظم فوج کے ذریعے اس حملے کو پسپا کر دیا اور منگولوں کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔

اس کے بعد 1300ء میں منگولوں نے دوبارہ حملہ کیا۔ اس بار وہ لاہور تک پہنچ گئے، مگر سلطان کی فوج نے انھیں ایک بار پھر شکست دی۔ یوں ان کی یہ کوشش بھی ناکام رہی۔ بعدازاں دو بڑی جنگیں ہوئیں: ایک 1303ء میں اور دوسری 1305ء میں۔ 1305ء کی جنگ کو منگول مہمات کا فیصلہ کن خاتمہ سمجھا جاتا ہے۔ ان جنگوں کا مختصر احوال یقیناً آپ کی دلچسپی کا باعث ہوگا۔ ان جنگوں میں علاؤالدین خلجی کی کامیابی کا سبب اس کا مضبوط دفاعی نظام تھا۔ اس نے دہلی سلطنت کی شمال مغربی سرحدوں پر قلعہ بندی کی، اور کئی فوجی اصلاحات نافذ کیں، مثلاً تنخواہ دار

فوج کا قیام، جو بیرونی حملہ آوروں کو مؤثر طور پر روکنے میں کامیاب رہی۔

دی وائر (*The Wire*) نے اس موضوع پر ایک طویل مضمون

India-grateful-Alauddin-khilji-thwarting-mongol-invasions

کے نام سے شائع کیا ہے۔[1] اس کا خلاصہ پیشِ خدمت ہے۔

علاؤالدین خلجی: منگول فتوحات کے خلاف ایک عسکری مدافع اور مؤثر حکمران

علاؤالدین خلجی کی پیدائش 1266 عیسوی میں دہلی میں ہوئی۔ اس طرح وہ ایک پیدائشی ہندوستانی تھے۔ ان کا دورِ حکومت 1296 عیسوی سے 1316 عیسوی تک رہا، جس دوران انھوں نے دہلی کے سلطان کی حیثیت سے حکومت کی۔ یوں یہ کہنا بجا ہے کہ وہ ایک ہندوستانی بادشاہ تھے، نہ کہ کوئی غیر ملکی حملہ آور۔ انھیں ہندوستان کی تاریخ کے ایک مایہ ناز حکمران کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ خلجی خاندان کے بارے میں سب سے مستند تاریخی تفصیلات محمد قاسم فرشتہ کی کتاب تاریخِ فرشتہ میں ملتی ہیں، جس سے میں نے بھی استفادہ کیا ہے۔ محمد قاسم فرشتہ، بیجاپور کے سلطان ابراہیم عادل شاہ ثانی اور مورخ ضیاء الدین بارنی کے ہم عصر تھے۔ انھوں نے محمد بن تغلق اور فیروز شاہ تغلق کے ادوار کو قریب سے دیکھا تھا۔

فرشتہ کے مطابق، علاؤالدین خلجی نے اپنی عسکری صلاحیتوں کے بل بوتے پر منگولوں کو ایک مرتبہ نہیں بلکہ پانچ مرتبہ شکست دی۔ یاد رہے کہ علاؤالدین کے دور سے قبل بھی منگول ہندوستان پر حملے کرتے رہے تھے۔ تاہم، ان کے عہد میں پہلا بڑا منگول حملہ 1298 عیسوی میں ہوا۔ اس موقع پر علاؤالدین نے اپنے بھائی الغ خان اور جنرل ظفر خان کی قیادت میں ایک فوج روانہ کی، جس نے نہ صرف منگولوں کو مکمل شکست دی بلکہ 20,000 قیدیوں کو گرفتار کیا، جنھیں بعد ازاں سزائے موت دے دی گئی۔

1299 عیسوی میں منگولوں نے دوبارہ حملہ کیا اور سندھ کے علاقے سیوستان پر قبضہ کر لیا۔

---

[1] https//:thewire.in/history/india-grateful-alauddin-khilji-thwarting-mongol-invasions

علاؤالدین نے ایک بار پھر ظفر خان کو روانہ کیا، جنھوں نے قلعہ واپس لے کر منگولوں کو شکست دی۔ اسی سال، منگول کمانڈر دوا خان نے بدلہ لینے کے لیے ایک اور بڑے حملے کا منصوبہ بنایا اور اپنے بیٹے قتلوغ خواجہ کو دو لاکھ سپاہیوں کے ساتھ دہلی سلطنت کو نیست و نابود کرنے کے ارادے سے روانہ کیا۔ یہ خبر جب علاؤالدین کو ملی تو دیر ہو چکی تھی۔ ان کے مشیروں نے مشورہ دیا کہ صلح کر لی جائے، جیسا کہ اس سے قبل جلال الدین خلجی نے منگولوں کے ذلت آمیز مطالبات تسلیم کر کے جنگ ٹال دی تھی۔ مگر اس بار علاؤالدین آخری دم تک لڑنے کے لیے پرعزم تھا۔

یہ جنگ کیلی (Killi) کے مقام پر لڑی گئی۔ منگولوں کی قیادت قتلوغ خواجہ کے ہاتھ میں تھی جبکہ علاؤالدین خود بھی میدانِ جنگ میں موجود تھا۔ متعدد کتب میں کیلی کو دہلی سے چند کلومیٹر دور بتایا گیا ہے، جبکہ میری تحقیق کے مطابق یہ مقام فیروز پور سے جنوب مغرب کی طرف تقریباً دس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے (ممکن ہے کہ یہ کوئی اور جگہ ہو جس کا نام بھی کیلی ہو)۔ اس جنگ میں جنرل ظفر خان شہید ہو گیا، لیکن فیصلہ کن فتح علاؤالدین کو حاصل ہوئی۔ منگولوں کے پیچھے ہٹنے کی اصل وجہ قتلوغ خواجہ کا شدید زخمی ہونا تھا۔ شکست خوردہ منگول بغیر رُکے واپس چلے گئے۔

1303 عیسوی میں، دوا خان نے ایک بار پھر دہلی پر حملہ کیا۔ اس مرتبہ منگولوں کی تعداد 1,20,000 گھڑسواروں پر مشتمل تھی اور ان کی قیادت جنرل ترغھائی کر رہا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب علاؤالدین چتور کی طویل جنگ میں مصروف تھا، جس کے نتیجے میں اس کی فوج کمزور ہو چکی تھی اور ساز و سامان کا بھی بڑا نقصان ہو چکا تھا۔ کمک بھی نہ پہنچ سکی، لیکن اس کے باوجود علاؤالدین نے ہمت نہ ہاری اور ایک دفاعی جنگ لڑ کر منگولوں کو ایک مرتبہ پھر شکست دی۔

منگول اس شکست کو بھول نہ سکے۔ 1305 عیسوی میں انھوں نے ترغھائی، علی بیگ اور ترتاق کی قیادت میں دوبارہ حملہ کیا۔ ترغھائی تو دہلی پہنچنے سے پہلے ہی ایک جھڑپ میں مارا گیا، جبکہ علی بیگ اور ترتاق نے دہلی کے سخت دفاع کو دیکھ کر اودھ کے دیہی علاقوں میں لوٹ مار شروع کر دی۔ علاؤالدین نے جنرل ملک نائک کو بھیجا، جس نے 30 دسمبر 1305ء کو ایک بڑی جنگ کے بعد منگولوں کو عبرتناک شکست دی۔ ہزاروں منگول قیدیوں کو دہلی لایا گیا، جن میں دو اہم

جرنیل بھی شامل تھے۔

یہ آخری حملہ بھی نہ تھا۔منگولوں کی دہلی پر قبضے کی خواہش برقرار رہی۔چنانچہ 1306 عیسوی میں دوا خان نے ایک مرتبہ پھر کوبک اور اقبال مند کو پچاس سے ساٹھ ہزار گھڑسواروں کی فوج کے ساتھ روانہ کیا۔کوبک نے دریائے راوی کی طرف پیش قدمی کی جبکہ اقبال مند ناگور کی جانب بڑھا۔علاؤالدین نے اس بار اپنے پسندیدہ جرنیل ملک کافور کو روانہ کیا۔کافور نے راوی کی جنگ میں کوبک کو شکست دے کر زندہ گرفتار کر لیا۔ایک بار پھر منگولوں کو زبردست شکست ہوئی۔

یہ تمام تفصیلات ظاہر کرتی ہیں کہ علاؤالدین خلجی نے ایک ناقابلِ تسخیر دشمن کو متعدد بار شکست دی۔اس نے نہ صرف منگولوں کے بڑے حملوں کو روکا بلکہ ہندوستان کی سرزمین کو محفوظ رکھا، جو شاید کسی اور کے بس کی بات نہ تھی۔یاد رہے کہ یہ وہی دور تھا جب ہلاکو خان بغداد کو تباہ کر رہا تھا۔چنانچہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ علاؤالدین نے شمالی ہندوستان کو منگول یلغار سے بچا کر ایک تاریخی کارنامہ انجام دیا۔علاؤالدین خلجی کے بارے میں بعض داستانیں مشہور ہیں، جیسے اس کا تعلق ملک کافور سے اور پدماوتی کے ساتھ اس کا سلوک۔اسی پس منظر میں پدماوتی کے نام سے ایک فلم بھی بن چکی ہے۔

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ علاؤالدین خلجی کی قیادت اور عسکری صلاحیتوں کی وجہ سے ہندوستان پر منگول حملوں کا خطرہ ایک عرصے تک ٹل گیا تھا۔بعد میں تیمور اور بابر کی صورت میں حملہ آور آئے، جن کا تذکرہ آئندہ کیا جائے گا۔تاہم، علاؤالدین نے اپنے دورِ حکومت میں منگولوں کو ہندوستان کی سرحدوں سے پسپا کر دیا، جو ایک تاریخی کامیابی تھی۔اس کامیابی نے نہ صرف اس کی حکمرانی کو مستحکم کیا بلکہ اسے انتظامی اور اقتصادی اصلاحات پر توجہ دینے کا موقع بھی دیا۔منگولوں کے خلاف کامیاب دفاع نے اسے ایک مضبوط اور قابل حکمران کی حیثیت دی۔تاہم، 1316 عیسوی میں اس کی وفات کے بعد خلجی خاندان کی طاقت آہستہ آہستہ زوال پذیر ہونے لگی۔اس کے بعد پنجاب ایک مرتبہ پھر حملہ آوروں کے رحم و کرم پر کھڑا تھا۔

❋❋❋

سلطنتِ دہلی میں اقتدار کی منتقلی: زوالِ خلجی اور قیامِ تغلق

یہ بات ہم سب جانتے ہیں کہ ہر عروج کو بالآخر زوال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہی حال خلجی خاندان کے ساتھ بھی ہوا۔ تاہم اس بار تاریخ میں کئی دلچسپ اور سبق آموز واقعات بھی پیش آئے۔ ہم نے مشاہدہ کیا کہ کس طرح بعض غیر معمولی عادات واطوار کے حامل افراد ہندوستان پر قابض رہے، اور کس طرح انھوں نے طاقت کے بل پر مقامی آبادی پر ظلم وستم کیے۔ میرے خیال میں، جہاں ایک طرف یہ سب کچھ ان غیر ملکی قابض حکمرانوں کی عسکری طاقت کا نتیجہ تھا، وہیں دوسری طرف مقامی باشندوں کی کمزوری، نااہلی، اور باہمی نفاق بھی اس تباہی کا سبب بنی۔ اس کا خمیازہ مقامی آبادی کو طویل عرصے تک بھگتنا پڑا بلکہ آج بھی کسی نہ کسی شکل میں بھگت رہے ہیں۔ اصل آزادی تو اُس دن حاصل ہوگی، جس دن ہم معاشی اور فکری طور پر خودمختار ہوجائیں گے۔

تاریخِ فرشتہ کے مطابق، خلجی خاندان شمال مغربی اور وسطی ہندوستان پر حکومت کرنے والے اہم مسلم حکمران خاندانوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس خاندان کی بنیاد جلال الدین خلجی نے 1290ء میں رکھی، اور یہ سلسلہ 1320ء تک جاری رہا، جب اس کے آخری حکمران، خسرو خان، کو قتل کردیا گیا۔

علاؤالدین خلجی کی وفات کے بعد، مبارک شاہ خلجی (حکومت: 1316–1320ء) نے اقتدار سنبھالا، جو اس خاندان کا آخری باقاعدہ حکمران ثابت ہوا۔ اس کے دور میں سلطنت میں مزید انحطاط اور بگاڑ پیدا ہوا۔ مبارک شاہ کی شخصیت اور طرزِ حکومت کے بارے میں مؤرخین نے بہت کچھ لکھا ہے، جو بظاہر خلجی خاندان کی تاریخ کا ایک تاریک باب معلوم ہوتا ہے۔ اسے اس کے نہایت قریبی اور بااعتماد ساتھی، خسرو خان، نے 1320ء میں قتل کردیا۔ مبارک شاہ کے قتل

کے بعد، خسرو خان نے تخت سنبھالا، لیکن اس کی حکومت محض دو ماہ جاری رہ سکی۔ جلد ہی غیاث الدین تغلق (بانئ خاندانِ تغلق) نے اسے معزول کر دیا اور دہلی میں اپنی حکومت قائم کی۔ اس طرح تغلق خاندان کے قیام کے ساتھ دہلی سلطنت کی تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہوا۔

یہ ایک طویل اور پیچیدہ داستان ہے کہ کس طرح علاؤالدین خلجی کی وفات کے بعد سلطنت داخلی انتشار کا شکار ہوئی۔ ملک کافور بھی قتل کر دیا گیا، اور پھر مبارک شاہ بادشاہ بنا۔ اس کے بارے میں بھی کئی عجیب وغریب روایتیں ملتی ہیں۔ تاہم، یہ تمام تفصیلات میرے موجودہ موضوع کا حصہ نہیں۔ میں یہاں صرف اس پہلو پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں کہ دہلی سلطنت کے سلاطین نے شمال مغربی ہندوستان کی ثقافت، تہذیب، تمدن اور طرزِ زندگی پر کیا اثرات مرتب کیے۔ مگر اس سے پہلے، تغلق خاندان کا ایک مختصر تعارف ضروری ہے۔

تغلق خاندان کا دورِ حکومت (1320ء-1413ء)

تغلق خاندان کی حکمرانی کی بنیاد غازی ملک (سلطان غیاث الدین تغلق) نے رکھی۔ خلجی خاندان کا زوال ان کی اندرونی کمزوریوں اور انتشار کی وجہ سے واقع ہوا۔ اس حکومت کا خاتمہ خاندان کے ایک اہم فرد کی بغاوت کے نتیجے میں ہوا۔ تغلق خاندان کا آغاز 1320ء میں ہوا اور اس کا اختتام 1413ء میں ہوا۔ یوں اس خاندان کی حکومت تقریباً ترانوے سال تک قائم رہی۔ تغلق خاندان نے ہندوستان میں متعدد انتظامی اصلاحات کیں، اور اس دور میں دہلی سلطنت کا دائرہ جنوبی ہند تک وسیع ہو چکا تھا۔ تاریخ فرشتہ میں اس عہد کی تفصیلات وضاحت سے بیان کی گئی ہیں۔ میں نے جو کچھ مطالعہ کیا، اس کا خلاصہ پیشِ خدمت ہے۔

تغلق خاندان کے ابتدائی پس منظر کے حوالے سے زیادہ تفصیل دستیاب نہیں، لیکن یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تعلق سابق غلام خاندان سے تھا۔ روایات کے مطابق، تغلق کے والد سلطنتِ دہلی کے مشہور بادشاہ بلبن کے غلاموں میں سے تھے۔ تغلق خاندان، خلجی حکومت کا وفادار رہا اور ان کے دورِ حکومت میں کئی اہم عہدوں پر فائز رہا۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ خلجی خاندان کا آخری حکمران، خسرو خان، ہندی نژاد اور سابق غلام تھا، جس نے اسلام قبول کیا اور مختصر عرصے کے لیے

دہلی سلطنت میں بطور فوجی جنرل خدمات انجام دیں۔ اس کا اصل تعلق خلجی خاندان سے نہ تھا، لہٰذا جب اس نے مبارک شاہ کو قتل کر کے تخت پر قبضہ کیا، تو خلجی خاندان نے اسے دل سے قبول نہ کیا۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ ملک کافور اور خسرو خان نے علاؤالدین خلجی کی قیادت میں سلطنت کو وسعت دینے کے لیے کئی جنگیں لڑیں۔ خسرو خان کے دور میں غازی ملک، پنجاب کے گورنر تھے۔ خسرو خان کے مظالم اور غیر مقبول طرزِ حکومت سے تنگ آ کر بہت سے لوگ اس کے خلاف ہو گئے۔ اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے غازی ملک نے کھوکھر قبائل کی مدد سے خسرو خان کو قتل کر دیا اور تغلق خاندان کے اقتدار کی بنیاد رکھی۔ 1320ء میں غازی ملک نے خسرو خان کے خلاف جنگ کی، اسے شکست دی اور دہلی کے تخت پر قابض ہوا۔

یہ تمام واقعات میرے مضمون کا بنیادی موضوع نہیں ہیں۔ میرے مطالعے کا اصل مرکز شمالی ہندوستان کے حکمرانوں کے پنجاب کی معاشرت، سیاست اور معیشت پر مرتب ہونے والے اثرات کا تجزیہ ہے۔

جناب امیر خسرو نے تغلق خاندان کے ابتدائی دور پر مبنی ایک منظوم کتاب تغلق نامہ لکھی، جس کا اردو ترجمہ بھی دستیاب ہے۔ میرے علم کے مطابق، کسی بھی مسلمان حکمران کے متعلق اس قدر تفصیل سے شعری انداز میں شاید ہی کوئی تحریر کی گئی ہو۔ (یہ کتاب اردو ترجمے کے ساتھ ریختہ ویب سائٹ پر دستیاب ہے۔)

امیر خسرو تغلق نامہ میں بیان کرتے ہیں کہ غازی ملک (غیاث الدین تغلق)، جلال الدین خلجی کے شاہی محافظ دستے میں شامل تھے۔ بعد ازاں، علاؤالدین خلجی نے انھیں پہلے ملتان اور پھر دیپالپور کا گورنر مقرر کیا۔ یہ دونوں علاقے جنوبی پنجاب کا حصہ تھے اور اس دور میں دہلی سلطنت کی سرحدی حدود میں شمار ہوتے تھے۔ انھی علاقوں سے منگول حملہ آور دہلی پر حملہ کیا کرتے تھے۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو غیاث الدین تغلق پر خلجی حکومت کا اعتماد بخوبی ظاہر ہوتا ہے۔

غیاث الدین تغلق: پہلا تغلق حکمران (1320-1325)

غیاث الدین تغلق نے، جن کا اصل نام غازی ملک تھا، بادشاہ بننے کے بعد سلطان غیاث

الدین تغلق کا لقب اختیار کیا۔ انھوں نے سیاسی عدم استحکام اور اندرونی خلفشار کے نتیجے میں، آخری خلجی حکمران خسرو خان کا تختہ الٹ کر 1320ء میں دہلی سلطنت کا اقتدار سنبھالا۔ یاد رہے کہ وہ اس سے قبل خلجی سلطنت کی طرف سے ملتان اور دیپالپور جیسے اہم علاقوں کے گورنر کے طور پر خدمات انجام دے چکے تھے۔

عام طور پر مانا جاتا ہے کہ وہ ترک-منگول نژاد تھے اور علاؤالدین خلجی اور بعد ازاں مبارک شاہ خلجی کے تحت ایک باصلاحیت سپہ سالار کے طور پر مشہور تھے۔خسرو خان کی بدانتظامی اور غیر مقبول طرزِ حکمرانی کی وجہ سے خلجی خاندان روبہ زوال تھا، اور ایسے حالات میں غیاث الدین تغلق نے دہلی سلطنت کو دوبارہ منظم اور مستحکم کرنے کے لیے مؤثر اقدامات کیے۔

انھوں نے فوج کو مضبوط کیا، انتظامیہ کو بہتر بنایا، اور ریاستی ڈھانچے کی اصلاح کے لیے کئی اہم منصوبے شروع کیے۔ ان ہی کے دور میں تغلق آباد کا مشہور قلعہ تعمیر ہوا۔ان کے عہد میں منگولوں نے متعدد بار حملے کیے، جن کا انھوں نے نہایت جرات اور دانش مندی سے مقابلہ کیا۔ دہلی سلطنت کا دائرہ کار ان کے دور میں مزید وسعت اختیار کر گیا، اور بنگال، اڑیسہ اور ورنگل جیسے علاقے بھی سلطنت میں شامل ہو گئے۔انھوں نے ڈاک کا نظام بہتر بنایا، عدلیہ کو مؤثر بنایا، آبپاشی اور زراعت کو ترقی دی، اور امن و امان کے قیام پر بھرپور توجہ دی۔ ان وجوہات کی بنیاد پر ان کا دورِ حکومت ایک کامیاب اور مثالی دور مانا جاتا ہے۔

تاریخ فرشتہ میں لکھا گیا ہے کہ غیاث الدین تغلق نے خسرو خان اور اپنے سرپرست کے قاتلوں کو سزا دے کر سلطنت پر قبضہ کیا اور اپنی بہترین حکمتِ عملی کے ذریعے دہلی سلطنت کو ایک مضبوط حکومت میں ڈھال دیا۔ ان کی فلاحی پالیسیوں کی وجہ سے رعایا ان سے بے حد محبت و عقیدت رکھتی تھی۔ وہ ایک خدا ترس، نیک اور پرہیزگار بادشاہ تھے جو اپنی سنجیدگی، علم اور بردباری کے باعث پہچانے جاتے تھے۔ وہ دینی احکامات کی سختی سے پیروی کرتے اور پنج وقتہ نماز باجماعت ادا کرتے تھے۔

وہ دیوانِ عام میں بیٹھ کر رعایا کے مسائل سنتے، ان کی معاشی حالت پر غور کرتے اور ان

کی بہتری کے لیے اقدامات کرتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو بادشاہ کے بجائے رعایا کا خادم سمجھتے تھے۔ ایک اہم خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ اپنے سابق آقا یعنی خلجی خاندان کے پسماندگان کی عزت کرتے تھے۔ انھوں نے ان لوگوں کو سخت سزائیں دیں جنھوں نے قطب الدین کی بیوہ کا نکاح خسرو خان سے عدت ختم ہونے سے پہلے کر دیا تھا۔

مورخ محمد قاسم فرشتہ لکھتے ہیں کہ غیاث الدین تغلق کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ عہدوں کی تقسیم میں صرف قابلیت کو معیار بناتے تھے اور ہر شخص کو اس کی اہلیت کے مطابق ذمہ داری سونپتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جب کوئی فتح نامہ آتا یا کوئی خوشی کی تقریب ہوتی، جیسے شادی یا بچے کی پیدائش، تو وہ فراخدلی سے روپیہ خرچ کرتے۔ وہ علماء، مشائخ، امرائے سلطنت اور درباریوں کو انعام و اکرام سے نوازتے اور شاہی خلعتوں سے سرفراز کرتے تھے۔ ان کی بھرپور کوشش ہوتی کہ رعایا کی بدحالی کو حتی الوسع دور کیا جائے۔

یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان کے دور میں منگولوں نے ہندوستان کا رخ نہیں کیا۔ میرے علم کے مطابق، وہ پہلے مسلمان بادشاہ تھے جنھیں تعمیرات سے بے حد شغف تھا۔ انھوں نے تغلق آباد کا عظیم الشان قلعہ اور کئی دیگر عمارات تعمیر کروائیں۔ وہ شراب نوشی کے سخت خلاف تھے اور انھوں نے سلطنت میں شراب پر مکمل پابندی عائد کر دی تھی۔

غیاث الدین تغلق کی وفات ایک معمہ بن گئی۔ مؤرخ فرشتہ کے مطابق، جب وہ ایک جنگ میں فتح حاصل کرنے کے بعد واپس آئے، تو ان کے بیٹے نے ان کے اعزاز میں ایک محل تعمیر کروایا۔ اس محل میں ہونے والی ایک تقریب کے دوران لکڑی کی چھت گرنے سے ان کی موت واقع ہوئی۔ کچھ مؤرخین اسے سازش قرار دیتے ہیں، جبکہ کچھ اس سے اختلاف کرتے ہیں۔

ان کے دور میں حضرت نظام الدین اولیاء دہلی میں مقیم تھے، اور مختلف روایات کے مطابق، ان دونوں کے تعلقات ادب و احترام پر مبنی تھے۔ اسی دور میں مشہور شاعر اور موسیقار امیر خسرو بھی موجود تھے۔ ایک طرف جہاں غیاث الدین نے سلطنت کی توسیع اور استحکام پر توجہ دی، وہیں امیر خسرو کی شاعری، موسیقی، اور ہندوی- فارسی ادب کی خدمات آج بھی زندہ جاوید ہیں۔

محمد بن تغلق: ایک متضاد فطرت کا حامل مسلمان فرمانروا

محمد قاسم فرشتہ نے محمد بن تغلق کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔ جب میں نے ان کے بیانات کا مطالعہ کیا، تو مجھے یہ جان کر شدید حیرت ہوئی کہ اس قسم کے ظالم حکمرانوں نے کبھی ہندوستان پر حکومت کی ہے؟ فرشتہ کے بیان کردہ واقعات کا خلاصہ کچھ یوں ہے، اور مجھے یقین ہے کہ یہ پڑھ کر آپ بھی افسوس اور حیرت میں مبتلا ہوں گے۔

محمد بن تغلق (1325-1351ء) ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں میں سب سے زیادہ متنازع اور دلچسپ شخصیت کے طور پر جانا جاتا ہے۔ وہ غیاث الدین تغلق کا بیٹا اور جانشین تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک ذہین، فہیم، اور اعلیٰ تعلیم یافتہ فرد تھا، جو فلسفہ، فلکیات، ریاضی، طب، اور دینیات جیسے کئی علوم میں مہارت رکھتا تھا۔ اسے عربی، فارسی اور سنسکرت زبانوں پر عبور حاصل تھا، اور وہ منطق میں بھی خاص دلچسپی رکھتا تھا۔

اس کے دورِ حکومت میں کئی انتظامی اصلاحات اور منصوبے متعارف کروائے گئے، جیسے فوجی توسیع، مواصلاتی نظام کی بہتری، بنیادی ڈھانچے کی ترقی، اور ٹیکس کا نیا نظام۔ مگر بدقسمتی سے، اس کی اکثر پالیسیاں ناقابلِ عمل ثابت ہوئیں اور ان کے باعث عوام کو شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

محمد بن تغلق نے اپنی حکمرانی کے دوران گجرات، مالوہ، بنگال اور دکن جیسے علاقوں پر کامیاب فوجی مہمات کیں۔ چاندی کی قلت کے پیش نظر اس نے تانبے کے سکوں کی کرنسی متعارف کروائی، مگر یہ تجربہ مکمل طور پر ناکام ہوا اور سلطنت شدید معاشی بحران کا شکار ہوگئی۔ اس نے ہمالیہ سے خراسان تک فتوحات کے خواب دیکھے، اور ایک منظم اور تربیت یافتہ فوج بھی تیار کی، لیکن اس منصوبے پر عمل درآمد نہ ہوسکا اور خزانہ خالی ہوگیا۔

اس کا سب سے متنازع اقدام دارالحکومت کو دہلی سے دولت آباد (موجودہ مہاراشٹر) منتقل کرنا تھا۔ اس فیصلے کو زبردستی نافذ کیا گیا، جس کے نتیجے میں ہزاروں لوگ بے گھر ہو گئے اور شدید مشکلات سے دوچار ہوئے۔ اخراجات پورے کرنے کے لیے اس نے زرخیز دوآبہ (گنگا-جمنا) کے علاقوں پر بھاری ٹیکس عائد کیے۔ قحط کے دوران کسان ٹیکس ادا نہ کر سکے، اور ظالمانہ ٹیکس

وصولی نے بغاوتوں کو جنم دیا۔ بنگال، سندھ اور دکن میں بار بار بغاوتیں ہوئیں، جنھوں نے دہلی سلطنت کو اندر سے کھوکھلا کر دیا۔

محمد بن تغلق ایک بے رحم اور غیر مستقل مزاج حکمران کے طور پر جانا جاتا ہے۔ اس کی فطرت متضاد تھی ایک طرف سخاوت کا مظاہرہ کرتا، تو دوسری طرف انتہائی ظلم وستم سے کام لیتا۔ اس نے تقریباً چھبیس سال حکومت کی، لیکن جب 1351ء میں اس کا انتقال ہوا، تو دہلی سلطنت زوال کا شکار ہو چکی تھی۔

محمد قاسم فرشتہ کے مطابق، محمد بن تغلق پنجاب کے زرخیز علاقوں سے بھاری محصولات وصول کرتا تھا، اور اس میں مسلسل اضافہ کرتا رہا، جو رعایا کی برداشت سے باہر تھا۔ کسانوں نے احتجاجاً اپنی فصلیں اور مکانات جلا دیے اور جنگلوں کی طرف ہجرت کر گئے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ جو لوگ آگ لگانے کے ذمہ دار ہیں، انھیں قتل کر دیا جائے۔ اس اقدام نے دوآبہ کے علاقے کو ویران کر کے رکھ دیا۔

فرشتہ مزید لکھتے ہیں کہ محمد بن تغلق جب شکار کے لیے نکلتا، تو وہ جنگلی جانوروں کے بجائے انسانوں کو قتل کر کے اپنے خنجر اور تیر کی پیاس بجھاتا۔ مقتولین کے سروں کو کاٹ کر دیواروں پر لٹکا دیا جاتا۔ اس کی یہ سفاکیت تغلق خاندان کے دورِ حکومت پر ایک سیاہ دھبے کی حیثیت رکھتی ہے۔

فیروز شاہ تغلق (1351-1388): ایک پاک طینت حکمران

محمد قاسم فرشتہ نے فیروز شاہ تغلق کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ محمد بن تغلق کا چچازاد بھائی تھا، اور محمد بن تغلق نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں خود اپنی زبان سے فیروز شاہ کو جانشین مقرر کیا۔ جب محمد بن تغلق کا انتقال ہوا تو سلطنت میں شدید بدامنی پھیلی ہوئی تھی۔ تاہم، فیروز شاہ اور سلطنت کے دیگر خیر خواہوں نے مختصر مدت میں کئی اہم اور مفید فیصلے کیے، جن کے نتیجے میں ملک بھر میں امن وامان قائم ہوا۔ فیروز شاہ نے مختلف چھوٹے چھوٹے تنازعات کو ختم کر کے ریاست کو استحکام دیا۔

فیروز شاہ تغلق اپنے پیش رو محمد بن تغلق کے برعکس نرم مزاج، اصلاح پسند اور عوام دوست حکمران کے طور پر جانا جاتا ہے۔ اس کی انتظامی اصلاحات اور ترقیاتی منصوبے اسے ایک مثبت

حکمران کی حیثیت دیتے ہیں۔تاہم، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس کی نرم مزاجی کی پالیسی نے دہلی سلطنت کو کمزور کر دیا، اور کئی علاقے سلطنت سے علیحدہ ہو گئے۔فیروز شاہ کو تعمیرات کا بھی غیر معمولی شوق تھا۔اس نے فیروز آباد (دہلی)، جونپور اور حصار جیسے شہر آباد کیے۔اس کے دور میں کئی نہریں، سڑکیں، شفاخانے اور تعلیمی ادارے قائم کیے گئے۔اسلام کے فروغ کے لیے اس نے مدارس قائم کیے اور دینی تعلیم کو فروغ دیا۔بعض مؤرخین کے مطابق، اس نے بعض ہندو مندروں کو منہدم کیا اور غیر مسلموں پر جزیہ نافذ کیا۔

اب تک کی تحقیق کے مطابق، فیروز شاہ تغلق نے کئی نمایاں اقدامات کیے جن میں زرعی اصلاحات، کسانوں پر ٹیکس میں کمی، علم و ادب کی سرپرستی، اشوک کے کتبے دہلی منگوانا، مصر کے عباسی خلیفہ سے خلافت کی سند حاصل کرنا، اور شہری ترقی شامل ہیں۔ان اقدامات کی بدولت وہ آج بھی تاریخ میں ایک اصلاح پسند حکمران کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ فیروز شاہ نے غیر ضروری فوجی مہمات سے گریز کیا اور زیادہ تر اپنے وسائل سلطنت کی داخلی ترقی پر صرف کیے۔وہ مسلمان علماء اور صوفیائے کرام کا قدردان تھا اور ان کی سرپرستی کرتا تھا۔تاہم، اس کی جنگ سے گریز کی پالیسی کی وجہ سے بعض دشمن طاقتور ہو گئے، اور اس کے کمزور جانشینوں کے باعث دہلی سلطنت زوال کا شکار ہوگئی۔

فیروز شاہ تغلق اور شمالی ہندوستانی ثقافت پر اس کا اثر

فیروز شاہ تغلق (حکمرانی: 88-1351ء) کے دورِ حکومت میں شمالی ہندوستانی ثقافت، خصوصاً فنِ تعمیر، انتظامیہ، مذہب اور سماجی ڈھانچے پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔اس نے فلاحی منصوبوں پر توجہ دے کر ایک نیا طرزِ حکمرانی متعارف کروایا۔

اس کے دور میں بہتر سڑکوں کے جال کی بدولت دور دراز علاقے آپس میں مربوط ہو گئے۔آبپاشی کے لیے بنائی گئی نہریں مقامی خوشحالی کا باعث بنیں۔فنِ تعمیر میں سرکلر گنبد اور آرائشی خطاطی کو فروغ ملا، جو بعد ازاں مغلیہ فنِ تعمیر کی بنیاد بنے۔اشوک کے پتھر کے ستون کو بہار سے دہلی منتقل کیا گیا، جو ہندوستان کی قدیم تاریخ سے اس کی دلچسپی کا مظہر تھا۔فارسی زبان کو عروج

حاصل ہوا اور اسے سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا، جس کے نتیجے میں اہلِ ہند کی ایک بڑی تعداد فارسی کے عالم بن گئے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں قرآنِ مجید کا پہلا ترجمہ بھی فارسی میں اسی دور میں ہوا۔ اس بارے کوئی مصدقہ بات نہیں ملی کہ کس نے یہ ترجمہ کیا تھا۔

رنجیت سنگھ جیسے بعد کے پنجابی حکمران کی درباری زبان بھی فارسی ہی تھی، حالانکہ اس کی ذاتی زبان پنجابی تھی۔ فارسی شاعری اور نثر کی سرپرستی کے نتیجے میں غالب اور اقبال جیسے شعرا نے بھی فارسی میں کلام کہا۔ سنسکرت میں لکھی گئی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ ہوا، اور عربی رسم الخط کو فروغ ملا، جس سے ہندو اور بدھ مت کے علوم تک مسلمانوں کی رسائی ممکن ہوئی۔ باوجود اس کے کہ فیروز شاہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھا، اس کے دربار میں بعض ہندو اہلِ علم بھی شامل تھے۔ البتہ اس کی نرم مزاجانہ پالیسیوں کے نتیجے میں بنگال، گجرات اور دکن میں بغاوتیں ہوئیں۔ اس کی سخت اسلامی پالیسیوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فاصلے بڑھانے میں بھی کردار ادا کیا۔

یہ سب پہلو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ فیروز شاہ تغلق نے ایک مخلوط میراث چھوڑی ایک طرف اس نے شہری ترقی، تعلیم اور اسلامی ثقافت کی ترویج میں نمایاں کردار ادا کیا، تو دوسری طرف اس کی سخت مذہبی پالیسیاں اور کمزور فوجی حکمت عملی دہلی سلطنت کے زوال کا باعث بنیں۔ فنِ تعمیر، انتظامی اصلاحات اور مذہبی پالیسیوں پر اس کے اثرات نے شمالی ہندوستان کے ثقافتی منظر نامے کو صدیوں تک متاثر کیا۔

فیروز شاہ تغلق نے یمنا سے حصار، ستلج سے دریائے گھاگھر اور گھاگھر سے فیروز آباد، مانڈوی، اور سرمور پہاڑیوں سے ہانسی تک نہریں بنوائیں۔ ان نہروں کو رضیہ کینال، الغ کینال، فیروز آباد کینال اور کھاکھڑا کینال کے ناموں سے جانا جاتا تھا۔

کوشش کے باوجود، مجھے فیروز شاہ کے دورِ حکومت میں لاہور سے متعلق خاص معلومات نہیں مل سکیں، حالانکہ یہ علاقہ بھی اس کی سلطنت کا حصہ تھا۔

فیروز شاہ تغلق کی وفات کے دس سال بعد 1398ء میں امیر تیمور نے دہلی پر حملہ کیا، شہر کو لوٹا، اور ہزاروں انسانوں کا قتلِ عام کیا۔ فیروز شاہ کے بعد تغلق خان، ابوبکر شاہ، ناصر الدین محمد

شاہ، علاؤ الدین شاہ، ناصر الدین نصرت شاہ اور ناصر الدین دین محمد شاہ حکمران بنے، لیکن ان میں سے کوئی بھی کوئی قابلِ ذکر کارنامہ انجام نہ دے سکا۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ بڑے حادثے ایک دن میں نہیں ہوتے، بلکہ برسوں کی غلط حکمت عملیوں اور کمزوریوں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ یہی معاملہ تغلق خاندان کے ساتھ بھی ہوا۔ محمد بن تغلق کے دور میں ہی دکن، بنگال، سندھ اور ملتان کے صوبے آزادی کا اعلان کر چکے تھے۔ امیر تیمور کے حملے نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ مختلف علاقوں کے سردار بغاوت پر اُتر آئے، جن کے نتیجے میں گجرات، مالوا اور جونپور جیسی ریاستیں وجود میں آئیں۔ راجپوتوں نے آزادی کا اعلان کر کے راجپوتانہ پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔

اسی عرصے میں فیروز شاہ کے سابق گورنر، خضر خان نے دہلی پر قبضہ کر کے تغلق خاندان کا تختہ الٹ دیا، اور یوں سید خاندان دہلی سلطنت کا نیا حکمران بن گیا۔

اس پورے عہد کا اہم ترین واقعہ امیر تیمور کا دہلی پر حملہ تھا۔ اس دوران ہونے والے قتلِ عام، لوٹ مار اور ظلم و ستم کی داستانیں آج تک تاریخ میں محفوظ ہیں۔ اس سے پہلے کبھی ایسا نہ ہوا تھا کہ ایک مسلمان حکمران خاندان، جو وسط ایشیا سے تعلق رکھتا تھا، کسی دوسرے مسلمان کے ہاتھوں یوں تباہ ہوا ہو۔

مجھے جنوری 2025ء میں تاشقند، سمرقند اور بخارا جانے کا موقع ملا۔ تاشقند کے ایک بڑے پارک میں امیر تیمور کا مجسمہ نصب ہے۔ اسی طرح سمرقند میں بھی ان کا ایک مجسمہ موجود ہے، اور میں نے ان کی قبر پر بھی حاضری دی۔ آج کے ازبکستان میں امیر تیمور کو ایک قومی ہیرو کی حیثیت حاصل ہے۔

❁ ❁ ❁

امیر تیمور کا حملہ دہلی پر
شمالی ہندوستان کی تباہی اور زوال کا جائزہ

انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا کے مطابق 1398ء میں تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ دہلی کے مسلمان سلاطین اپنی ہندو رعایا کے ساتھ حد سے زیادہ رواداری کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ یہاں کی دولت بھی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے 24 ستمبر کو دریائے سندھ کو عبور کیا۔ اس نے ملتان اور لاہور کے درمیان تلنبہ پر حملہ کیا۔ اس کے بعد ہر جگہ قتل و غارت گری کرتا ہوا دہلی کی طرف بڑھا۔ دہلی کے سلطان محمود تغلق کی فوج نے 17 دسمبر کو پانی پت میں اس سے جنگ کی مگر اسے شکست ہوئی۔ امیر تیمور تقریباً پانچ دن تک دہلی میں رہا۔ اس دوران دہلی کھنڈرات کے ڈھیر میں بدل گیا، جسے دوبارہ تعمیر کرنے میں ایک صدی سے زیادہ کا عرصہ لگا تھا۔ تیمور نے دہلی سے بہت زیادہ مال غنیمت سمیٹا اور اس کے ساتھ ساتھ 90 پکڑے گئے ہاتھیوں کو سمرقند میں ایک مسجد کی تعمیر کے لیے کانوں سے پتھر لے جانے کے لیے استعمال کیا۔

اس کے حملے میں کتنے قتل ہوئے؟ اس کا کوئی اندازہ کرنا مشکل ہے۔ اس کے جانے کے بعد تغلق خاندان تقریباً پندرہ برس تک حکومت کرتا رہا لیکن ان کی خاندانی چپقلش اور علاقائی بغاوتوں نے اسے بے حد کمزور کر دیا تھا۔

تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیوں کیا؟ اس بارے کئی لوگوں نے لکھا ہے۔ ان سب میں مشترک بات یہ ہے کہ چونکہ اسے معلوم تھا کہ ہندوستان میں ہندوؤں کی بڑی تعداد موجود ہے، وہ

چاہتا تھا کہ ہندوستان میں ہندوازم کو کچل دیا جائے اور یہاں کے عوام اسلام قبول کریں۔ میرے خیال میں یہ بات درست نہیں ہے۔ اگر ایسا ہی تھا تو اسے اس کام کے لیے کوئی تدبیر کرنی چاہیے تھی۔ وہ تو صرف پندرہ دن ہی دہلی میں رہا اور یہاں قائم ایک مسلم ریاست کا خاتمہ کیا۔ یہ بھی درست ہے کہ اس نے بے شمار غیر مسلموں کو، جن میں اکثریت ہندوؤں کی تھی، بے گناہ قتل کیا۔

دوسری وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ وہ ہندوستان کی دولت پر قبضہ کرنا چاہتا تھا، جو ہندوستان کی مختلف عمارتوں اور مندروں میں موجود تھی۔ ایسا اس سے پہلے محمد غوری اور محمود غزنوی بھی کر چکے تھے۔ یہ بات بھی اس کے علم میں تھی۔ وہ ہندوستان کی دولت سے واقف تھا اور اس نے ان ناخوشگوار حالات سے فائدہ اٹھایا جو حملے کے دور میں ہندوستان میں چل رہے تھے۔

میرے خیال میں اس کا مقصد صرف اپنی سلطنت کو توسیع دینا تھا۔ اس نے جہاں ہندوستان کو تباہ کیا، وہیں ایران، بغداد، ترکی کے ساتھ ساتھ مشرقی یورپ کو بھی نہیں بخشا۔ یہی اس کے دماغ کا فتور تھا۔ وہ قتل کرنے میں خوشی محسوس کرتا تھا۔ اس کے بعد ان کے سروں کے مینار بنا کر سرور حاصل کرتا تھا۔ وہ اپنی کتاب تزکِ تیموری (جس کا ترکی سے فارسی اور فارسی سے انگریزی ترجمہ نیٹ پر موجود ہے، میں لکھتا ہے کہ میں قرآن مجید میں بیان کیے گئے حکم کے مطابق ہندوستان پر حملہ کر رہا ہوں۔ [۱]

یہ بات کتنی مضحکہ خیز ہے! کیا اسلام اس بات کی اجازت دیتا ہے جو اس نے کیا؟ وہ کیسا انسان تھا، یہ بات ہم اس کے عمل سے بہتر انداز میں جان سکتے ہیں۔ آپ بھی سوچیں، میں بھی سوچتا ہوں۔

میرا یہاں اصل موضوع اس کے حملے اثرات کا جائزہ لینا ہے کہ اس کے حملے کے بعد فیروز محمد شاہ تغلق کے دور کا ایک خوشحال پنجاب کس حالت کو پہنچا۔ اس بارے ایک مضمون پڑھنے کو ملا۔ [۲]

اس مضمون کے مطابق تیمور کے جانے کے بعد شمالی ہندوستان کا پورا خطہ افراتفری کی ناقابلِ تصور حالت سے دوچار ہو گیا۔ جنگ میں تغلق خاندان کے لوگ دہلی سے دور چلے گئے

[۱] https//:archive.org/details/mulfuzattimuryor00timuuoft/page/n13/mode/2up

[۲] https//:historyunravelled.com/invasions/the-plunder-of-india-by-timur

تھے اور یوں دہلی تقریباً مکمل طور پر خالی اور کھنڈر ہو چکا تھا۔ یہاں کا کوئی حاکم باقی نہ رہا۔ بدامنی اور قتل و غارت کے ساتھ ساتھ بڑے پیمانے پر فصلوں کو تباہ کیا گیا اور گھروں کو آگ لگا دی گئی، جس کے نتیجے میں قحط اور بیماری نے زندہ بچ جانے والوں کے لیے زندگی کو دشوار بنا دیا تھا۔ تیمور کی فوج نے خوراک کے ذخیرے اور کھڑی فصلوں کو شدید نقصان پہنچایا۔ شہر کی ہوا اور پانی کی فراہمی ہزاروں انسانوں اور جانوروں کی مردہ لاشوں سے آلودہ ہو گئی، جس کے باعث وبا پھیل گئی۔ ایک رپورٹ کے مطابق تباہی اس قدر مکمل تھی کہ شہر تقریباً ختم ہو گیا اور جو لوگ باقی تھے وہ بھی فوت ہو گئے۔ صدیوں میں تعمیر کیا گیا شہر ایک ظالم حملہ آور کے ہاتھوں برباد ہو گیا۔ اسے کیا ملا سوائے اپنے نفس کی تسکین کے۔

میں یہاں اس مضمون کے الفاظ جو انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیے گئے ہیں، پیش کر رہا ہوں۔

تیمور نے جو تباہی مچائی اس کے ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ تغلق سلطنت مکمل طور پر ٹوٹ گئی۔ جونپور میں خواجہ جہاں نے اپنے طور پر حکومت کی۔ بنگال کی آزادی کی ایک طویل تاریخ تھی۔ گجرات میں مظفر شاہ نے کسی بھی آقا کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ مالوا میں دلاور خان نے رجائی طاقت کا استعمال کیا۔ تیمور کے وائسرائے خضر خان نے پنجاب اور بالائی سندھ کی انتظامیہ کی صدارت کی۔ غالب خان نے سمانہ کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ اوہدی کے شمس خان کو بیانہ پر کنٹرول حاصل تھا۔ محمد خان کے تحت، کالپی اور محبہ نے ایک معمولی سلطنت قائم کی۔

اس سے انکار نہیں کہ 1414ء میں سید خاندان کے بعد بننے والے کمزور تغلق خاندان کو تیمور کے حملے سے ایک مہلک دھچکا لگا۔ تیمور نے ہندوستان کی خوشحالی کو خاک میں ملا دیا۔ دہلی، بھٹنیر، دیپالپور، میرٹھ اور ہریدوار میں عظیم تعمیرات اور فن پاروں کو منہدم کر دیا گیا۔ چوری، جلاؤ گھیراؤ اور لوٹ مار کی وجہ سے ہندوستان نے اپنی بے پناہ دولت کھو دی۔ تیمور کے حملے کے نتیجے میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان خلیج بڑھتی گئی۔ مسلمان ہندوؤں کی عدم

برداشت کی وجہ سے ان ہندوؤں کو تبدیل کرنے میں ناکام رہا جو مسلمانوں کو ملیچھ کے طور پر دیکھتے تھے۔ تیمور کے ہندوؤں کے وحشیانہ قتل اور ان کی کھوپڑیوں کے ساتھ ٹاورز کی تعمیر نے پہلے سے موجود ناراضی کو بڑھا دیا۔

تیمور کے حملے نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے لیے بات چیت کرنا بہت زیادہ مشکل بنا دیا۔ حملے کے نتیجے میں ہندوستانی آرٹ نے وسطی ایشیا تک اپنا راستہ بنایا۔ تیمور نے ہندوستان سے بہت سے کاریگروں اور فنکاروں کو سمرقند بھیجا، جہاں انھوں نے مساجد اور دیگر ڈھانچے کی تعمیر پر کام کیا۔ تیمور کے حملے سے مغلوں کی فتح ممکن ہوئی۔ بابر نے دہلی کے تخت کا کچھ حصہ اس لیے دعویٰ کیا کہ وہ تیموری نسل سے تھا۔ بابر نے تیمور کی پنجاب اور دہلی کی فتح میں ہندوستان پر اپنے حملے کی اخلاقی اور قانونی بنیاد دونوں تلاش کیں۔

یہ تھا پنجاب۔ اس کے بعد تیمور نے جاتے وقت جنوبی پنجاب اور بالائی سندھ کے علاقے میں خضر خان کو یہاں کا حاکم مقرر کیا۔ اس نے بعد میں سید خاندان کے دورِ حکومت کی بنیاد رکھی اور یوں سلاطین دہلی جس کی بنیاد قطب الدین ایبک نے رکھی تھی کے بعد خلجی دور آیا، ان کے بعد تغلق آئے۔ اب باری سید خاندان کی تھی۔

اب کی بار بھی حملہ آور کا مقابلہ ایک حکمران نے ہی کیا۔ یہ اسی کا فرض تھا۔ اس میں یہ بات کہاں سے آ گئی کہ اہلِ پنجاب نے تیمور کو دہلی جانے کا راستہ دیا۔ تلنبہ کی جنگ میں تغلق ہی ہارے تھے۔ پانی پت کی جنگ بھی تغلق ہی ہارے تھے۔

سید خاندان کا مختصر دورِ حکومت (1414ء-1451ء)

تیمور کے جانے کے بعد، دہلی سلطنت کا چوتھا حکمران خاندان ''سید خاندان'' کو مانا جاتا ہے۔ اس خاندان کے چار حکمرانوں نے 1414ء سے 1451ء تک، محض 37 سال کے قلیل عرصے میں دہلی پر حکومت کی۔ اس خاندان کے بانی، خضر خان، جو پہلے ملتان میں تیموری جاگیردار (گورنر) کے طور پر کام کر رہے تھے، نے 1414ء میں دہلی فتح کیا۔ انھوں نے اعلان

کیا کہ وہ تغلق خاندان کے حکمران مبارک شاہ کے ماتحت سلطان ہیں۔

انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا کے مطابق، سید خاندان کا دعویٰ تھا کہ وہ نبی کریم ﷺ کی اولاد سے ہیں، اسی نسبت سے انھیں ''سید'' کہا جاتا تھا۔ تیمور کے جانے کے بعد دہلی سلطنت کی مرکزی حکومت شدید کمزور ہو چکی تھی۔ اگلے تقریباً پچاس برسوں تک شمالی ہندوستان عملی طور پر مقامی اور علاقائی طاقتوں میں تقسیم ہو گیا، جن میں شرقی (جونپور) کا حکمران سب سے طاقتور تصور کیا جاتا تھا۔

سید خاندان کی حکومت اپنے عہد کی ایک کمزور اور غیر مستحکم حکومت تھی۔ ان کے دور میں مشرقی علاقوں میں موجود بغاوتی ریاستوں اور شمال مغرب میں کھوکھروں نے آزادی کا اعلان کر دیا اور دہلی کے خلاف کئی جنگیں ہوئیں۔ اگرچہ خضر خان کے جانشین مبارک شاہ کو کچھ کامیابیاں حاصل ہوئیں، لیکن 1434ء میں انھیں قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد محمد شاہ اور عالم شاہ جیسے ناتجربہ کار اور نااہل حکمران تخت نشین ہوئے، جو سلطنت کو مستحکم نہ رکھ سکے۔ بالآخر 1448ء میں عالم شاہ نے دہلی چھوڑ کر بدایوں چلے جانے کا فیصلہ کیا۔ چند برس بعد، 1451ء میں بہلول لودھی نے، جو پہلے ہی پنجاب پر قابض تھا، دہلی پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح سید خاندان کا خاتمہ ہوا اور دہلی سلطنت کے آخری مسلمان خاندان، لودھی خاندان کا آغاز ہوا، جس کا اختتام بابر کے ہاتھوں ہوا۔

اگرچہ سید خاندان کا دور عمومی طور پر بدانتظامی، بدامنی اور انتشار سے تعبیر کیا جاتا ہے، لیکن اس کے باوجود ان حکمرانوں نے وسائل کی کمی کے باوجود کچھ تعمیراتی کوششیں کیں۔ جو عمارتیں تعمیر کی گئیں، وہ فنی اور جمالیاتی معیار کے اعتبار سے کمزور تھیں۔ ان کے دور میں مبارک شاہ نے ''مبارک آباد'' نامی شہر کی بنیاد رکھی، جو 1433ء میں دریائے جمنا کے کنارے آباد کیا گیا۔ خضر خان نے بھی اپنی حکومت کے ابتدائی ایّام میں 1414ء میں ''خضر آباد'' کی بنیاد دریائے جمنا کے کنارے پر رکھی تھی۔

سید دور کے فنِ تعمیرات کی چند مثالیں آج بھی موجود ہیں، جن میں مبارک شاہ کا مقبرہ

خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ یہ مقبرہ اس خاندان کی نمایاں ترین تعمیرات میں شمار ہوتا ہے۔محمد شاہ کا مقبرہ، جسے سید خاندان کے تیسرے حکمران نے 1444ء میں تعمیر کروایا، بھی دیدنی تھا۔ یہ مقبرہ دہلی کے ''لودھی گارڈن'' میں واقع ہے۔

لودھی خاندان کا آغاز اور زوال

سید خاندان کے خاتمے کے بعد، ان کے نامزد کردہ پنجاب کے گورنر، بہلول لودھی نے لودھی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ (اس وقت پنجاب کو سرہند کا گورنر کہا جاتا تھا، شاید اس دور میں سرہند ہی پنجاب کا صدر مقام تھا۔ میرے آباؤ اجداد بھی اسی شہر سے تعلق رکھتے تھے، میرے والدِ محترم کی پیدائش بھی یہیں ہوئی، اور مجھے بھی اسے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔)

بہلول لودھی نے، جو ایک افغان شاہی خاندان سے تعلق رکھتا تھا، دہلی سلطنت کے پانچویں اور آخری خاندان کی بنیاد رکھی۔ انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا کے مطابق، لودھی خاندان افغان نژاد تھا۔ بہلول لودھی (حکومت: 1489ء-1451ء) نے سید خاندان سے حکومت چھین کر اپنی حکمرانی قائم کی۔ سید دور میں وہ پنجاب کے سب سے طاقتور سرداروں میں شمار ہوتا تھا۔ بہلول لودھی ایک بہادر اور مدبر جرنیل تھا۔ اس نے اپنی مضبوط شخصیت کے ذریعے افغان اور ترک سرداروں کو متحد کیا۔ ابتدائی طور پر اس نے دہلی کے قریبی علاقوں پر کنٹرول حاصل کیا اور پھر اپنی سلطنت کو بنگال کی سرحدوں تک وسعت دی۔ اس کی فتوحات میں مالوہ اور جونپور کی طاقتور ریاستوں پر قبضہ بھی شامل تھا۔ وہ تقریباً 38 سال تک حکومت کرتا رہا۔

اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا سکندر لودھی (1517ء-1489ء) تخت نشین ہوا۔ اس نے بھی اپنے والد کی طرح سلطنت کو مزید وسعت دینے پر توجہ دی اور بہار پر قابض ہو گیا۔ سکندر لودھی نے جدید شہر آگرہ کی بنیاد رکھی، جو ابتدا میں سکندر آباد کہلاتا تھا۔ تاہم، اس کے دور میں مذہبی تعصب میں کوئی کمی نہیں آئی۔

کئی مورخین نے سکندر لودھی (1517ء-1489ء) کے بارے میں لکھا ہے کہ اس نے

متعدد مساجد تعمیر کروائیں، اور اسی کے دور میں ریاست کا دارالحکومت دہلی سے آگرہ منتقل کیا گیا۔ وہ تجارت کی سرپرستی کے لیے بھی جانا جاتا ہے۔ وہ ایک مشہور شاعر بھی تھا اور ''گُرُخ'' اس کا تخلص تھا۔ اس کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے کئی مندروں کو تباہ کیا، مسلم خواتین کو صوفیاء کے مزاروں پر جانے سے روکا، اور ایک برہمن کو پھانسی دینے کا حکم جاری کیا۔ یہ بات معروف محقق جے ایس گریوال نے اپنے ایک مضمون میں لکھی ہے۔[1]

سکندر لودھی کی وفات کے بعد اس کے بڑے بیٹے، ابراہیم لودھی (1526ء-1517ء) نے اقتدار سنبھالا۔ اس نے بھی شاہی اختیار کو بڑھانے کی کوشش کی، لیکن وہ ایک سخت مزاج حکمران تھا۔ اس کی سخت گیر پالیسیوں کے باعث پنجاب کے گورنر، دولت خان لودھی (جو ابراہیم لودھی کا چچا تھا) ناراض ہو گیا۔ دولت خان کو امید تھی کہ سکندر لودھی کے بعد تخت اسے ملے گا، لیکن جب ایسا نہ ہوا، تو اس نے کابل کے مغل حکمران بابر کو ہندوستان پر حملے (1526ء) دہلی کا آخری لودھی سلطان ثابت ہوا۔ اس کے ساتھ ہی سلاطین دہلی کا بھی اختتام ہو گیا جس کی بنیاد قطب الدین ایبک نے 1206ء میں رکھی تھی اور جو تقریباً 320 سال تک قائم رہی۔ اس دوران پانچ خاندانوں یعنی مملوک (قطب الدین ایبک)، خلجی، تغلق، سید اور لودھی نے شمال مغربی ہندوستان کے ساتھ ساتھ گجرات، دکن، بہار، راجستھان اور بنگال تک کے ایک وسیع رقبے پر حکومت کی۔

ابراہیم لودھی کے بارے میں سر یسائی لکھتے ہیں کہ اس میں ایک بہترین جنگجو کی خصوصیات موجود تھیں، مگر وہ فیصلہ سازی میں جلد باز تھا اور بعض اوقات غیر دانشمندانہ فیصلے بھی کرتا تھا۔ اسے اپنے دور میں متعدد بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ لودھی خاندان کو زوال سے بچانے کی کوشش کرتا ہوا ہی مارا گیا، جب 1526ء میں پانی پت کی پہلی جنگ میں اسے بابر کے ہاتھوں شکست ہوئی اس کے ساتھ ہی لودھی خاندان کی مخلوط ریاست کا خاتمہ ہو گیا اور مغل سلطنت کا آغاز ہوا۔

❁❁❁

---

[1] Grewal, J.S. (1990): *The New Cambridge History of India. The Sikhs of the Punjab.* Cambridge University Press: Vol.II.3

منگول حملے، مقامی مزاحمت، اور ثقافتی اثرات

جس وقت منگول شمال مغربی ہندوستان پر حملہ آور ہو رہے تھے، اس وقت دہلی کے تخت پر پہلے مملوک، پھر خلجی، اور بعد ازاں تغلق خاندان کے حکمران براجمان تھے۔ ان سب کو مجموعی طور پر سلاطینِ دہلی کہا جاتا ہے۔ ان کے بعد بھی کئی خاندان حکومت میں آئے، یہاں تک کہ 1526ء میں مغلوں نے ہندوستان میں قدم رکھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مغل خود بھی منگول نسل سے تعلق رکھتے تھے؛ ان کے قبیلے کا نام "مغل" تھا۔

سلاطینِ دہلی نے منگول حملہ آوروں کا نہایت دلیری سے مقابلہ کیا، اگرچہ منگول بھاری جانی نقصان کے باوجود اپنے حملے روکنے کو تیار نہ تھے۔ حملہ آور صرف تلوار نہیں لاتے بلکہ اپنے ساتھ زبان، تہذیب، تمدن اور مکمل معاشرتی نظام بھی لاتے ہیں، جن کے اثرات مفتوحہ علاقوں پر دیرپا ہوتے ہیں۔ مثلاً عربوں کے اثر سے افریقہ کے کئی ممالک کی زبان عربی بنی، اور انگریزوں کے زیرِ اثر ہندوستان میں انگریزی زبان کو فروغ ملا۔

میرے علم کے مطابق، بار بار منگول حملوں کے باعث پنجاب میں قلعوں کو دفاعی لحاظ سے مضبوط بنایا گیا۔ اس دور میں کئی نئے قلعے تعمیر ہوئے اور مختلف شہروں کو فصیلوں کے ذریعے محفوظ کیا گیا۔ پہلی بار یہ بھی دیکھنے کو ملا کہ مقامی حکمرانوں اور برادریوں نے منگولوں کے خلاف جدید جنگی حکمت عملی اپنائی اور باہمی اتحاد کا مظاہرہ کیا۔

کشوری لال نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ علاؤ الدین خلجی نے دیوگیری کے ہندو بادشاہ رام چندر کی بیٹی جھتیا پالی سے شادی کی تھی، جس سے اس کا ایک بیٹا شہاب الدین عمر پیدا

ہوا۔[1] یہ شہزادہ بعدازاں کچھ عرصے کے لیے تخت پر بھی بیٹھا۔ کیا علاؤالدین خلجی کی فوج میں مقامی لوگ بھی شامل تھے؟ اس بارے میں مجھے تفصیلی معلومات حاصل نہ ہوسکیں، البتہ مختلف مؤرخین کے مطابق علاؤالدین نے مقامی لوگوں سے بھاری ٹیکس وصول کر کے ایک بڑی فوج تیار کی۔ اگر مقامی لوگ اسے بڑی مقدار میں مال، اناج، اور ساز وسامان مہیا نہ کرتے تو اس کے لیے منگولوں کو شکست دینا ممکن نہ ہوتا۔

منگولوں کے بار بار حملوں کی وجہ سے ان علاقوں میں بڑے پیمانے پر تباہی پھیلی جہاں وہ قابض رہے۔ ان کی فطرت میں تباہی اور بربادی شامل تھی۔ میری تحقیق کے مطابق، ہر فاتح نے قتلِ عام کیا خواہ وہ تیمور ہو یا سکندر لیکن چنگیز خان اور اس کی اولاد نے صرف قتل عام نہیں کیا، بلکہ پورے پورے شہر برباد کر دیے۔ یہی وجہ ہے کہ چنگیز خان کو عموماً ایک عظیم فاتح نہیں سمجھا جاتا۔ شمال مغربی ہندوستان میں بھی اس کی اولاد نے یہی طرزِ عمل اپنایا۔ انھوں نے زرعی زمینوں، تجارتی راستوں، اور شہری مراکز کو وسیع پیمانے پر تباہ کر دیا، جس کے نتیجے میں پنجاب کی زراعت پر مبنی معیشت درہم برہم ہوگئی۔ اس کے بعد قحط اور آبادیوں کی نقل مکانی ہوئی، کئی کاریگر اور تاجر علاقہ چھوڑ کر چلے گئے۔ جو نہ جا سکے، انھوں نے منگول حکمرانی تسلیم کر لی اور نئے سرپرستوں کے تحت اپنا کام جاری رکھا۔

یہاں میں ایک اہم بات کا تذکرہ ضروری سمجھتا ہوں، وہ ہے وسطی ایشیا سے لوگوں کی نقل مکانی اور ان کی ہندوستان آمد۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں، منگولوں نے اپنے پہلے حملوں میں خوارزمی سلطنت کو ختم کیا اور پھر ایران کی جانب بڑھ کر تباہی مچائی۔ اس دوران اہلِ علم، امراء، اور دیگر بااثر افراد کو اپنی جان بچانے کے لیے وسطی ایشیا سے ہجرت کر کے ہندوستان آنا پڑا۔ وہ کبھی واپس نہ جا سکے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ان مہاجرین کی آمد سے پنجاب میں نئے ثقافتی اور لسانی عناصر کا جنم ہوا۔

اگر آپ غور کریں تو دیکھیں گے کہ ملتان اور سندھ کے بالائی علاقوں میں عمارتوں کی تعمیر

---

[1]) History of Khalijis (1290-1320)

میں نیلی ٹائلوں کا استعمال نمایاں ہے۔ ایسا طرزِ تعمیر ہندوستان کے دیگر علاقوں میں نہیں پایا جاتا۔ میری تحقیق کے مطابق، اس کی وجہ یہ ہے کہ منگول حملوں کے دوران ترکستان اور وسطی ایشیا سے ہجرت کر کے آنے والے لوگ ان علاقوں میں آباد ہو گئے تھے۔ انھی کی وجہ سے یہ مخصوص طرزِ تعمیر یہاں رائج ہوا۔

منگول اور صوفیاء کی شمال مغربی ہندوستان میں آمد

شمال مغربی ہندوستان میں سب سے زیادہ صوفیاء کرام ملتان اور دہلی کے گردونواح میں پائے جاتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ منگولوں کے حملوں کے دوران ایک بڑی تعداد میں صوفیاء اور اہلِ علم حضرات نے ان علاقوں کی طرف ہجرت کی۔ ان کا پہلا پڑاؤ عام طور پر ملتان ہوتا تھا، اور بعدازاں وہ دہلی کی طرف روانہ ہوتے تھے۔

جب میں نے اس موضوع پر مزید تحقیق کی تو نہایت دلچسپ حقائق سامنے آئے۔ مثال کے طور پر حضرت بہاؤالدین زکریا (1182-1262) کا خاندان خوارزم سے ہجرت کر کے ملتان آیا تھا۔ انھی کے پوتے حضرت شاہ رکنِ عالم بھی ملتان ہی میں مقیم رہے۔ اسی طرح بخارا میں سلسلۂ نقشبندیہ کے بانی حضرت بہاؤالدین نقشبند کا مزار موجود ہے، جبکہ سلسلۂ چشتیہ کے بانی حضرت معین الدین چشتی کا تعلق چشت (افغانستان) سے تھا۔ کئی اولیاء بغداد سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے۔ بابا فرید کی پیدائش کوٹ مٹھن میں ہوئی، لیکن ان کے والدین کابل سے یہاں آئے تھے، اور اس سے قبل وہ وسطی ایشیاء ہی میں مقیم تھے۔ خواجہ بختیار کاکی کا تعلق بھی بغداد سے تھا۔ شیخ احمد سرہندی کے آباؤاجداد کا تعلق عرب سے تھا۔

تحقیق سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بیشتر صوفیائے کرام اس دور میں شمال مغربی ہندوستان میں آئے جب منگولوں نے وسطی ایشیاء کے ساتھ ساتھ شمالی عرب (جیسے بغداد)، شمالی ایران (جیسے تہران و مشہد)، جنوبی ترکستان (جیسے سمرقند و بخارا)، مغربی افغانستان (چشت و ہرات) اور شمالی افغانستان (کابل) میں شدید تباہی پھیلائی۔ اس کے بعد منگولوں نے بارہا شمال مغربی ہندوستان پر حملے کیے، جنھیں سلاطینِ دہلی نے بڑی حد تک پسپا کر دیا۔ اس کے باوجود وہ ان

علاقوں کے کئی حصوں پر قابض رہے، اور ایک طویل عرصے تک بغداد پر بھی ان کا قبضہ قائم رہا۔ بعدازاں وہ وقت بھی آیا جب منگولوں نے اسلام قبول کیا، اور وسطی ایشیاء میں تیمور کے عروج کے بعد انھیں وہاں سے نکلنا پڑا۔

یہ ایک نہایت دلچسپ تاریخی عمل ہے، جو مطالعہ کا تقاضا کرتا ہے۔ ایک اور اہم بات یہ ہے کہ بہت سے منگولوں نے اسلام قبول کرلیا اور وہی شمال مغربی ہندوستان میں آباد ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پنجاب میں، خصوصاً حکمران طبقے اور شہری آبادیوں میں، اسلام کے پھیلاؤ کی رفتار میں تیزی آئی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم ہوا کہ صوفیاء کے علاوہ عام لوگ بھی، جو منگول حملوں کے نتیجے میں بے گھر ہو چکے تھے، پنجاب میں آ کر آباد ہوئے۔ صوفیاء کرام کی تعلیمات نے اس خطے کی روحانی اور ثقافتی زندگی پر گہرے اثرات ڈالے اور پنجاب کی ہم آہنگی و رواداری پر مبنی روایات کو تقویت دی۔

یہ تمام باتیں جاننے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ جہاں ایک طرف منگول حملوں نے تباہی اور انتشار برپا کیا، وہیں انھوں نے ثقافتی تبادلوں اور معاشرتی تبدیلیوں کو بھی جنم دیا جنھوں نے پنجاب کی تاریخ اور شناخت پر دیرپا نقوش چھوڑے۔

سلاطینِ دہلی اور ہندوستانی زبان، ثقافت، مذہب پر اثرات

اب ہم یہاں رک کر غوری، مملوک، خلجی، تغلق، سید اور لودھی ادوارِ حکومت میں اُن اثرات کا جائزہ لیں گے جو ان سلاطین کی حکومت کی وجہ سے شمال مغربی ہندوستان، خصوصاً پنجاب، پر مرتب ہوئے۔ یاد رہے کہ میں جغرافیائی اعتبار سے دہلی کو پنجاب کا ہی ایک حصہ سمجھتا ہوں، البتہ جمنا کے مشرق میں واقع علاقے پنجاب سے باہر شمار ہوتے ہیں۔ اسی طرح پنجاب کی جنوبی سرحد راجستھان اور سندھ تک پھیلی ہوئی تھی، جس میں ملتان بھی شامل تھا۔

یہ بھی اہم ہے کہ ڈیرہ اسماعیل خان، جہاں کی اکثریت سرائیکی بولتی ہے جسے بعض لوگ پنجابی کی ایک شاخ اور بعض ایک الگ زبان قرار دیتے ہیں کو بھی تاریخی طور پر پنجاب کا حصہ تصور کیا جاتا رہا ہے۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر مختلف آرا پائی جاتی ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ

انگریزوں کے دور سے قبل کوئی مستقل سرحدی نظام موجود نہ تھا، اور یہ نظام پہلی بار برطانوی دور حکومت میں قائم ہوا۔ لہٰذا کسی ایک حتمی رائے پر پہنچنا مشکل ہے۔

اب ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں، یعنی سلاطینِ دہلی کے پنجاب کی معیشت، معاشرت، سیاست اور مذہب پر اثرات کا جائزہ، نیز منگول حملوں کے نتیجے میں آنے والی تبدیلیوں پر بھی روشنی ڈالیں گے۔ اسی کے بعد مغلیہ دور کا آغاز ہوتا ہے۔

میں طویل عرصے سے اس بات کی تلاش میں تھا کہ یہ جان سکوں کہ آخر وہ کون سا وقت تھا جب ہندوستان، خصوصاً شمال مغربی ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی میں خاطر خواہ اضافہ ہوا؟ کیسے اس خطے میں ایک نئی زبان اور تہذیب نے جنم لیا؟ یہ سب کچھ کس دور میں اور کیسے وقوع پذیر ہوا؟ کیسے بابا فرید نے تیرھویں صدی میں پنجابی زبان میں شاعری کی؟ کیا اس وقت پنجابی شاعری کا چلن تھا؟ یاد رہے کہ خواجہ غلام فرید کا نسب حضرت عمرؓ سے ملتا ہے، اور ان کا خاندان بھی عرب سے ہی ہجرت کر کے آیا تھا۔ ان کا زمانہ انیسویں صدی کا ہے۔ ان سوالات کے جوابات تلاش کرنے کے لیے میں نے متعدد کتابیں اور تحقیقی مضامین کا مطالعہ کیا۔ یہ بھی جاننے کی کوشش کی کہ بارھویں صدی کے بعد وسطی ایشیا سے اتنی بڑی تعداد میں صوفیاء کیوں آئے؟ صوفی ازم کی کشش کیا تھی جس نے مقامی لوگوں کو اپنی طرف مائل کیا؟ اس جیسے بے شمار سوالات ذہن میں تھے۔

اس حوالے سے رومیلا تھاپر کی تقاریر سے بہت فائدہ ہوا۔ اس کے علاوہ موجودہ دور کے مؤرخین مثلاً بپن چندر، کے این پانیکر، عرفان حبیب، سومیت سرکار، تانیکا سرکار، آر ایس شرما، ڈاکٹر مبارک علی، ڈاکٹر اشتیاق احمد، ڈاکٹر عزیز احمد، اعتزاز احسن اور امجد نواز وڑائچ کی کتب سے بھی مدد لی۔ قدیم دور کی کتب، مثلاً تاریخِ فرشتہ، تغلق نامہ وغیرہ بھی بہت مفید ثابت ہوئیں۔

اگر آپ محمود غزنوی کے دور کے بعد کی صورت حال کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ ان کے حملوں کے تقریباً دو سو سال بعد قطب الدین ایبک نے پہلی بار دہلی میں امن و استحکام کی بنیاد رکھی۔ اس کے بعد سوا تین سو سال بعد بابر نے مغل سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ غزنوی کی فتوحات

(1001ء) سے لے کر بابر کی فتح (1526ء) تک کے تقریباً پانچ سو برس کے عرصے میں غوری، مملوک، خلجی، تغلق، سید، لودھی اور دیگر خاندانوں نے حکومت کی۔

اس طویل عرصے میں بے شمار جنگیں ہوئیں۔ یہی وہ دور ہے جب شمال مغربی ہندوستان کے ساتھ ساتھ جنوبی ہندوستان اور بنگال میں اسلام کی تبلیغ اور توسیع ہوئی۔ مذہبی تبدیلی کے ساتھ ساتھ ثقافتی تبدیلی بھی نمایاں رہی، جس میں سب سے اہم کردار صوفیائے کرام کا نظر آتا ہے۔

آخر ایسا کیوں ہوا؟ کیا ان پانچ صدیوں میں مقامی لوگ اتنے کمزور رہے کہ بیرونی حملہ آوروں کا راستہ نہ روک سکے؟ پانچ صدیاں کوئی مختصر مدت نہیں۔ آخر کیسے ایک کے بعد دوسرا غیر مقامی خاندان اقتدار پر قابض ہوتا گیا؟ یہ ہیں وہ بنیادی سوالات جن پر میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔

ہندوستان میں صوفیا

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جتنے بھی مسلمان حکمران ہندوستان میں آئے، انھوں نے اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کے لیے مذہب کا استعمال ضرور کیا۔ اگرچہ ان میں بعض حکمرانوں نے واقعی دینِ اسلام کی خدمت بھی کی، تاہم کئی ایسے بھی تھے جن کے افعال اسلامی تعلیمات کے سراسر منافی تھے۔ انھی اعمال کی بنا پر آج تک ہندوستان میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ایک نمایاں خلیج محسوس کی جا سکتی ہے۔

اسی عہد میں صوفیائے کرام کا ظہور بھی ہوا، جنھوں نے کبھی حکمرانوں کی سرپرستی میں، اور کبھی ان سے الگ رہتے ہوئے اپنے نظریات کو عام کیا۔ بعض اوقات صوفیاء اور حکمرانوں کے مابین باہمی تعاون بھی دیکھنے میں آیا۔ یہاں ہم سب سے پہلے اُن صوفیائے کرام کے عقائد اور نظریات پر نظر ڈالتے ہیں جو برصغیر میں تشریف لائے۔

میرے علم کے مطابق، صوفی سلسلوں کی باضابطہ بنیاد پہلی مرتبہ وسطی ایشیا میں رکھی گئی (ممکن ہے کہ اس کے علاوہ دیگر مقامات پر بھی ان کی ابتدا ہوئی ہو)۔ اسلام کے ابتدائی پانچ سو سالوں میں، یعنی آغازِ اسلام سے لے کر پانچویں صدی ہجری تک، ان سلسلوں کے بارے میں

کوئی واضح ذکر نہیں ملتا۔ مؤرخین کے مطابق، کل بارہ معروف صوفی سلسلے وجود میں آئے، جن میں سے چار نے برصغیر میں خاص شہرت حاصل کی:

نقشبندی سلسلہ: اس کے بانی شیخ بہاؤالدین نقشبند (1389ء-1318ء) بخارا (موجودہ ازبکستان) کے رہائشی تھے۔

چشتیہ سلسلہ: اس کے مشہور بزرگ خواجہ نظام الدین اولیاء (1325ء-1238ء) ہیں۔

سہروردی سلسلہ: اس کی بنیاد شیخ ضیاءالدین ابوالنجیب سہروردی (1168ء-1097ء) نے بغداد میں رکھی۔

قادریہ سلسلہ: یہ سلسلہ عبدالقادر جیلانی (1166ء-1078ء) سے منسوب ہے۔

اگر ان سلسلوں کے ادوار پر غور کیا جائے تو یہ تقریباً ایک ہی تاریخی عرصے میں معرضِ وجود میں آئے۔ مزید برآں، یہ سلسلے زیادہ تر برصغیر (ہندوستان) اور افغانستان میں فعال رہے، جبکہ باقی مسلم دنیا میں ان کا اثر نسبتاً کم رہا۔ دیگر مسلم علاقوں میں فقہی مذاہب کی پیروی (مثلاً امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ) کا رجحان زیادہ نمایاں ہے۔ برصغیر میں تاہم فقہی پیروی کے ساتھ ساتھ صوفی سلسلوں کی روحانی روایت بھی خاصی مضبوط اور جڑیں رکھنے والی رہی ہے۔

اسلامی روایت میں صوفیانہ روحانیت اور فقہی نظام کا تقابلی مطالعہ

صوفی اسلام اور فقہی (امامی) اسلام جو عمومی طور پر رائج اسلامی روایت کے نمائندہ ہیں دونوں میں اسلامی فکر اور عبادات بنیادی اہمیت کی حامل ہیں، مگر ان کے مابین بعض اساسی فرق بھی موجود ہیں، جن کی بنیاد پر یہ دو الگ الگ شناخت رکھتے ہیں۔ مشاہدے میں آیا ہے کہ کئی افراد بیک وقت کسی صوفی سلسلے سے وابستہ ہونے کے ساتھ ساتھ کسی امام کی فقہ پر بھی عمل کرتے ہیں۔

صوفی اسلام کا مرکز روحانیت، محبت، اور قربِ الٰہی ہوتا ہے۔ صوفیانہ نقطۂ نظر کے مطابق، انسان کا مقصد اللہ کی قربت حاصل کرنا اور باطن کی پاکیزگی اختیار کرنا ہے۔ صوفیانہ طرزِ حیات عموماً ذاتی روحانی تجربات اور مجاہدات پر مشتمل ہوتا ہے۔ صوفی حضرات جسمانی عبادات (نماز،

روزہ وغیرہ) کے ساتھ ساتھ دل کی صفائی، ذکرِ الٰہی، مراقبہ، اور تسبیحات پر بھی زور دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک تمام انسانیت میں اللہ کی موجودگی کو محسوس کرنا اور اس کی محبت میں فنا ہو جانا انسانیت کی معراج ہے۔ صوفی سلسلوں میں ایک روحانی رہنما یا ''شیخ'' کو مرکزی مقام حاصل ہوتا ہے، جو اپنے مریدین کی روحانی تربیت کرتا ہے۔

دوسری طرف فقہی روایت سے وابستہ وہ افراد ہیں جو کسی امام کے مقلد ہوتے ہیں یا بعض اوقات غیر مقلد (جیسے اہلِ حدیث) کہلاتے ہیں۔ مقلدین، اسلامی تعلیمات کے فہم اور اطلاق کے لیے اماموں (فقہاء) کی رہنمائی کو بنیادی حیثیت دیتے ہیں۔ ان اماموں کی فکر کا محور فقہ (اسلامی قانون) اور شریعت ہوتی ہے، جو عبادات، اخلاقیات، معاشرتی معاملات، اور روزمرہ زندگی کے مسائل کا حل پیش کرتی ہے۔

اسلام کے چار معروف ائمہ امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ، اور امام احمد بن حنبلؒ کا دور ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی کا ہے۔ ابتدائی اسلامی معاشروں میں انھی کی تعلیمات کے ذریعے دین کی ترویج و تفہیم کا عمل جاری رہا۔ آج بھی دنیا بھر میں ان کے پیروکار موجود ہیں۔ عام طور پر مسلمانوں کی اکثریت شرعی مسائل اور فتاویٰ کے لیے ان اماموں کی آراء کو معتبر مانتی ہے۔ فقہی اختلافات کی بنیاد پر اسلامی معاشرے میں مختلف مکاتبِ فکر اور فرقے وجود میں آئے۔

یہ تمام پہلو مدنظر رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ صوفی اسلام روحانیت اور قلبی تجربات پر زور دیتا ہے، جب کہ فقہی اسلام (اماموں کا اسلام) فقہ، شریعت، اور ظاہری عبادات کی پاسداری پر مرکوز ہے۔ اسی بنا پر دونوں کے طرزِ عمل اور مذہبی ترجیحات میں فرق نظر آتا ہے۔ تاہم، اسلامی تاریخ میں دونوں روایات کا الگ الگ مگر اہم مقام ہے۔ اماموں کا اسلام فقہی اور قانونی اصولوں پر مبنی ہے، جب کہ صوفی اسلام کی بنیاد روحانیت، محبت، اور قربِ الٰہی پر استوار ہے۔ دونوں طریقے مسلمانوں کے لیے راہِ ہدایت فراہم کرتے ہیں، اگرچہ ان کی نوعیت مختلف ہے۔ ایک مسلمان بیک وقت دونوں روایتوں پر عمل پیرا بھی ہو سکتا ہے۔

میں جس نکتے کی طرف آپ کی توجہ مبذول کروانا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ شمال مغربی

ہندوستان، خصوصاً پنجاب میں، صوفیاء نے کس طرح مقامی ہندو آبادی کو اسلام کی طرف مائل کیا۔ اس ضمن میں جو کچھ میرے مشاہدے اور مطالعے میں آیا ہے، وہ پیشِ خدمت ہے۔

خانقاہی روایت اور صوفیاء کا سماجی و روحانی اثر

صوفی حضرات جہاں قیام پذیر ہوتے تھے، اُس مقام کو خانقاہ کہا جاتا تھا۔ خانقاہ یا دربار میں عمومی طور پر تین بنیادی اجزاء پائے جاتے تھے: صوفی کا مزار (جو بعد از وفات تعمیر کیا جاتا)، مراقبہ ہال و مدرسہ یا مسجد، اور لنگر خانہ بمع مہمان خانہ۔ جب میں نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ آخر ایسی کون سی مخصوص بات تھی جس کی وجہ سے پنجاب کے ہندو، مسلمان صوفیاء کی دعوت سے بڑی تعداد میں اسلام کی طرف راغب ہوئے، تو میرے مطالعے کے مطابق اس کا سبب یہ تھا کہ ان صوفیاء نے غیر مسلموں کے ساتھ بہترین تعلقات قائم کیے، انھیں عزت و احترام دیا جو اُس وقت ہندو معاشرت میں ذات پات کے نظام کی وجہ سے نایاب تھا، خاص طور پر شودر طبقہ اس سے بری طرح متاثر تھا۔

صوفیاء نے فقہی سختیوں کے بجائے محبت، رواداری، اور اخلاص کو ترجیح دی۔ انھوں نے موسیقی (خصوصاً قوالی) کو عام کیا، سالانہ عرس کی تقریبات کو روحانی میلے کی شکل دی۔ لوگوں کی دلچسپی کی خاطر ان میں کھیل تماشے، لوک رسم و رواج، اور عوامی میل جول بھی شامل ہوتا گیا۔ یہ تمام عوامل عوام الناس کو خانقاہوں کے قریب لانے میں نہایت مؤثر ثابت ہوئے۔

خانقاہ ایک ایسا مقام تھی جہاں صوفی بزرگ روحانی تربیت، عبادات، اور تعلیمات کے ذریعے لوگوں کو جمع کرتے تھے۔ یہاں تعلیم کے ساتھ ساتھ چلّہ کشی، مراقبہ، اور ذکر و اذکار جیسی روحانی مشقیں بھی کی جاتیں۔ خانقاہ اکثر ایک پناہ گاہ کے طور پر کام کرتی تھی، جہاں لوگ دنیاوی الجھنوں سے نکل کر اپنی روحانی نشو و نما پر توجہ دے سکتے تھے۔ یہ سماجی بہبود کا مرکز بھی تھی جہاں غریبوں، مسافروں، اور ضرورت مندوں کی مدد کی جاتی تھی۔ خانقاہوں میں اجتماعی کھانے، دعائیں، اور ذکر کی محفلیں لوگوں کو باہمی ربط اور اخوت کا احساس دلاتی تھیں۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اکثر خانقاہوں میں گوشت نہیں پکایا جاتا تھا تاکہ ایسے زائرین بھی، جو مذہبی یا ثقافتی

وجوہات کی بنا پر گوشت سے پرہیز کرتے تھے، قریب آسکیں۔

اگرچہ اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، میں یہاں اس کا مختصر ذکر صرف اس لیے کر رہا ہوں تاکہ یہ واضح کرسکوں کہ صوفیاءِ کرام نے کس طرح پنجاب کی تاریخ کا رخ موڑ دیا۔

میرے مشاہدے کے مطابق، صوفیاء نے نہایت اخلاص اور محنت کے ساتھ ایک ایسا ہمہ گیر طرزِ عمل اختیار کیا، جس میں ہر فرد کو گلے لگایا، ان کے مسائل سنے، ان کے دکھ درد میں شریک ہوئے، اور ان کے کلچر و رسوم کے خلاف سخت رویہ نہیں اپنایا۔ انھوں نے لوگوں کو عزت دی، ذکر و اذکار کے ذریعے ان کی روحانی تربیت کی، اور ان کے کھانے پینے و رہائش کا بندوبست کیا۔ میں یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ انھوں نے ایک شاملاتی (Inclusive) طرزِ فکر اپنایا، یعنی سب کو ساتھ لے کر چلنے والا انداز۔

یہی رویہ مغل دور میں بھی نظر آتا ہے۔ مغل بادشاہ اکبر نے اسی طرزِ فکر کے تحت دینِ الٰہی کی بنیاد رکھی اور ہندو عورتوں سے شادی کا رواج شروع کیا۔ اُس نے اپنے دربار میں غیر مسلموں کو بھی جگہ دی۔ حتیٰ کہ اس کی فوج کی قیادت بھی ایک ہندو راجپوت کے ہاتھ میں تھی۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مغلیہ سلطنت کی کامیابی کا ایک سبب ہندو مسلم اتحاد اور رواداری بھی تھا۔

تاہم، جب اورنگزیب عالمگیر نے سخت مذہبی پالیسی اپنائی، تو اس کے نتیجے میں بغاوتیں شروع ہوئیں۔ اس نے سکھوں کے خلاف سخت گیر رویہ اختیار کیا، جس کے ردعمل میں سکھ تحریک نے زور پکڑا۔ جیسے ہی اورنگزیب کی وفات ہوئی، مغلیہ سلطنت کے زوال کا آغاز ہو گیا۔ اس کے بعد انگریزوں نے بھی مقامی اقوام کے ساتھ تعاون پر مبنی پالیسی اپنائی، جبکہ رنجیت سنگھ کے دربار کا ایک اہم رکن بھی مسلمان تھا۔

اپنے طویل ہندوستانی اسفار کے دوران میں نے یہ مشاہدہ کیا کہ تقسیمِ ہند کے بعد پنجاب کی بہت سی مساجد ویران ہو گئیں جن میں سے بعض کو میں نے خود دیکھا لیکن کوئی خانقاہ غیر آباد نہ ہوئی۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ خانقاہیں صرف مسلمانوں کا مرکز نہیں تھیں بلکہ سکھ اور ہندو بھی ان سے عقیدت رکھتے تھے، اور آج بھی رکھتے ہیں۔ یہ بات اس حقیقت کی تصدیق کرتی ہے کہ

صوفیائے کرام کا مقام غیر مسلموں میں بھی انتہائی بلند تھا۔ جہاں مسلمان بادشاہ ان کے دربار میں حاضری دیتے تھے، وہیں سکھ و ہندو راجے بھی ان کی خدمت میں پیش ہوتے تھے۔

یہ بات بیان کرنا بھی ضروری ہے کہ اس طرزِ عمل کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمان کئی ایسے عقائد و اعمال کا حصہ بنے جو عرب دنیا میں عام نہیں ہیں۔ میرے خیال میں اگر یہ کہا جائے کہ ہندوستان میں اسلام کی ایک مخصوص اور مختلف شکل نے جنم لیا، تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا۔ مشہور مؤرخہ رومیلا تھاپر نے اسے ''لبرل اسلام'' کا نام دیا ہے، جس سے مراد وہ اسلام ہے جس میں شریعت کی سخت پابندی پر اصرار نہیں کیا جاتا بلکہ انسانی اقدار، رواداری، اور بین المذاہب ہم آہنگی پر زور دیا جاتا ہے۔

برصغیر میں صوفیائے اکرام اور مسلمان حکمرانوں کے باہمی تعلقات ایک تاریخی و تجزیاتی مطالعہ

اب میں اپنے دوسرے سوال کی طرف آتا ہوں، جس کا تعلق صوفیاء اور حکمرانوں کے باہمی تعلق سے ہے۔ میں یہ بات بیان کرنا چاہتا ہوں کہ کس طرح ان دو مختلف گروہوں نے مل کر اپنے مقاصد حاصل کیے۔ میں نے جو پڑھا، اس میں کہیں بھی کسی صوفی نے کسی مسلمان حکمران کے ساتھ جنگ نہیں کی، اور نہ ہی کسی مسلمان حکمران نے کسی صوفی کو قتل یا قید کیا۔ صرف ایک واقعہ احمد سرہندیؒ کا ملتا ہے، جنھیں کچھ وقت کے لیے جہانگیر نے قید کیا، مگر بعد میں رہا کر دیا۔ اس کی وجہ بھی ان کی فقہی تعلیمات تھیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ مغل بادشاہ ایک طرف صوفیاء کے درباروں میں اپنے وارث کی پیدائش کے لیے دعا کروانے جاتے تھے (جیسے اکبر اور شیخ سلیم چشتی کا واقعہ)، اور دوسری طرف ہندو عورتوں سے شادیاں بھی کرتے، نیا دین بھی ایجاد کرتے، اور تخت کے لیے خونریزی بھی کرتے تھے۔ یہ سب ساتھ ساتھ کیسے ممکن تھا؟ یہ صرف اس وقت ممکن ہو سکتا تھا جب دونوں گروہ، یعنی صوفیاء اور حکمران، اپنے اپنے مفادات کے حصول کے لیے اپنے اپنے میدان میں کام کر رہے تھے۔

برصغیر پاک و ہند میں صوفیاء اور مسلم حکمرانوں کے تعلقات پیچیدہ، متحرک، دوستانہ اور عقیدت پر مبنی تھے۔ بہت سے حکمرانوں نے اپنے اقتدار کو روحانی جواز فراہم کرنے کے لیے صوفیاء سے دعائیں اور آشیرواد حاصل کیے۔ صوفیاء کو معاشرے میں متقی اور روحانی طور پر بااثر شخصیت سمجھا جاتا تھا، اور ان کی حمایت حکمرانوں کے لیے اقتدار کو مستحکم کرنے کا ذریعہ بنتی تھی۔ اس کے بدلے میں کئی صوفیاء کو زمینیں، مراعات اور تحفظ بھی دیا جاتا تھا۔ اسی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمان حکمرانوں کی سرپرستی نے تصوف کو برصغیر میں پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا، اور اسے خطے کی روحانی اور ثقافتی شناخت کا ایک لازمی جزو بنا دیا۔

یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ صوفی تعلیمات نے، جن کا مرکز مذہب سے قطع نظر رواداری، محبت اور باہمی احترام پر ہوتا تھا، برصغیر کی متنوع آبادیوں کو قریب لانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان تعلیمات نے مسلمانوں، ہندوؤں اور دیگر برادریوں کے درمیان پائی جانے والی خلیج کو کم کرنے میں مدد دی، جو مسلمان حکمرانوں کے لیے امن و امان سے حکومت کرنے کا سبب بنی۔ اسی لیے مسلم حکمران اپنی سلطنتوں میں ہم آہنگی قائم رکھنے کے لیے اکثر صوفیاء پر انحصار کرتے تھے۔ چونکہ صوفیاء کو مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کا اعتماد حاصل ہوتا تھا، اس لیے سیاسی یا سماجی بحران کے دوران ان کی ثالثی اہم کردار ادا کرتی تھی۔ حتیٰ کہ جنگ میں جانے سے قبل بھی حکمران صوفیاء کے درباروں میں حاضری دینا ایک معمول تھا۔

دوسری جانب یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ کئی صوفیاء نے شاہی درباروں میں بااثر کردار ادا کیے۔ انھوں نے حکمرانی، عدل اور قیادت سے متعلق مشورے دیے۔ حکمران ان کی روحانی بصیرت کا احترام کرتے اور اخلاقی معاملات پر رہنمائی حاصل کرتے تھے۔ جب کبھی داخلی یا خارجی تصادم پیدا ہوتا، تو صوفیاء کو ثالثی کے لیے بلایا جاتا تھا۔

بہت سے صوفیاء خیراتی ادارے بھی چلاتے تھے، جیسے شفا خانے، مدارس اور لنگر خانے وغیرہ، جنھیں اکثر حکمران مالی تعاون فراہم کرتے تھے۔ اس کے نتیجے میں حکمرانوں کو سماجی استحکام قائم رکھنے میں مدد ملتی۔ مغل بادشاہوں نے کئی خیراتی ادارے صوفیاء کے نام پر قائم کیے۔ اسی

طرح صوفیانہ طرزِ عمل جیسے موسیقی (قوالی)، شاعری اور صوفی ادب کو نہ صرف حکمرانوں نے قبول کیا بلکہ اسے فروغ بھی دیا۔ شاہی دربار اور صوفی ثقافت کے امتزاج نے ایک منفرد تہذیبی فضا پیدا کی، جس نے اسلامی اور ہندوستانی روایات کو مزید تقویت دی۔ کئی مغل بادشاہ، خصوصاً اکبر، تصوف کے مخلص سرپرست تھے۔ انھوں نے نہ صرف صوفی اخلاقیات کی اہمیت کو تسلیم کیا بلکہ مذہبی رواداری اور ثقافتی امتزاج کے فروغ میں صوفی تعلیمات سے استفادہ بھی کیا۔ اکبر نے صوفیائے کرام کے ساتھ ساتھ کئی غیر مسلم سنتوں کو بھی اپنے دربار میں جگہ دی، جو اس کی وسعتِ نظر اور رواداری کا مظہر تھا۔

تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ صوفیائے کرام نے بعض اوقات سیاسی ہنگامہ خیزی کے دوران اپنے علاقوں کی سیاست میں براہ راست کردار بھی ادا کیا۔ کچھ مواقع پر صوفی بزرگوں اور ان کے پیروکاروں نے ظالم حکمرانوں کے خلاف مزاحمت کی، اور ان حکمرانوں کے خلاف آواز بلند کی جو عدل وانصاف کے اسلامی اصولوں سے انحراف کرتے تھے۔ اگرچہ صوفیاء اکثر حکمرانوں کی سرپرستی میں کام کرتے تھے، تاہم وہ اسلام کے پرامن پیغام کو عام کرنے میں بھی سرگرم رہے۔ ان کی دعوت وتبلیغ کی کامیابی میں حکمرانوں کی سرپرستی، تحفظ اور وسائل کی فراہمی کا بڑا دخل تھا، جس کے باعث اسلام کی تعلیمات کو بہتر انداز میں عام کرنے کا موقع ملا۔

یہ بات بھی اہم ہے کہ برصغیر میں ابتدائی طور پر آنے والے صوفیاء میں سید علی ہجویریؒ نمایاں حیثیت رکھتے ہیں، جو 1041ء میں مسعود غزنوی کے دور میں لاہور تشریف لائے۔ ان کے بعد بارہویں صدی کے آخر میں خواجہ معین الدین چشتیؒ غوری دور میں ہندوستان آئے۔ اس کے بعد صوفیاء کی ایک بڑی تعداد سلطنت دہلی کے دور میں ہندوستان پہنچی اور مختلف علاقوں میں تبلیغی اور روحانی خدمات انجام دیتی رہی۔

میرے فہم کے مطابق، صوفیائے کرام کی دعوتی کاوشوں نے نہ صرف مسلمانوں کے اقتدار کو مستحکم کرنے میں مدد دی بلکہ صوفیاء کو بھی حکمرانوں کی سرپرستی اور تحفظ حاصل رہا، جس کے نتیجے میں وہ دعوتِ اسلام کے عمل کو بہتر طریقے سے آگے بڑھا سکے۔

صوفیاء اور مسلم حکمرانوں کے باہمی تعاون سے مذہبی اور سیاسی دونوں شعبوں کو فائدہ پہنچا۔ حکمرانوں نے جہاں صوفیاء کو وسائل اور تحفظ فراہم کیا، وہیں صوفیاء نے روحانی رہنمائی، مذہبی رواداری، سماجی فلاح و بہبود اور ثقافتی انضمام کو فروغ دیا۔ ان کی مشترکہ کوششوں نے ایک ایسے معاشرے کو جنم دیا جس میں سیاسی استحکام کے ساتھ روحانی ہم آہنگی بھی قائم رہی۔ ان کے اثر و رسوخ نے ہندوستان کے روحانی و ثقافتی تانے بانے میں ایک نئے دور کا آغاز کیا، جس میں اسلامی، ہندو اور مقامی روایات کا ایک منفرد امتزاج دیکھنے کو ملا۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی کہا جاتا ہے کہ برصغیر کے مسلمانوں نے کئی ہندو روایات کو اپنایا ہے۔

یہ حقیقت بھی تسلیم شدہ ہے کہ ہندوستان میں اسلام تلوار کے زور پر نہیں پھیلا بلکہ صوفیائے کرام نے اپنے کردار، اخلاق اور روحانی اثر سے اسلام کی تعلیمات کو عام کیا۔ اگرچہ بعض علاقوں میں اسلام کے پھیلاؤ کے دوران سیاسی اثرات بھی موجود تھے، تاہم مجموعی طور پر صوفیاء کی تبلیغی سرگرمیاں غیر عسکری اور پُرامن ذرائع پر مبنی تھیں۔

میں نے اس امر کا بھی مطالعہ کیا کہ برصغیر میں کس دور میں مقامی اقوام (خصوصاً ہندو اور بدھ مت کے پیروکار) کی بڑی تعداد نے اسلام قبول کیا۔ میری تحقیق کے مطابق سب سے زیادہ لوگوں نے سلطنت دہلی کے دور میں اسلام قبول کیا۔ مغلیہ دور میں اس نوعیت کا کوئی بڑا واقعہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ میں نے تزکِ جہانگیری اور اکبر نامہ کا تفصیلی مطالعہ کیا، مگر ان میں عوام کے دائرہ اسلام میں داخل ہونے کے ایسے شواہد موجود نہیں جو سلطنت دہلی کے دور کی نوعیت کے ہوں۔

اس کے ساتھ یہ بھی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ برصغیر کے وہ تمام معروف صوفی بزرگ، جن کے ہاتھوں لاکھوں ہندو مسلمان ہوئے، وہ سب یا تو دہلی سلطنت کے ابتدائی دور میں برصغیر کے شمال مغربی علاقوں میں آئے یا ان علاقوں سے دیگر خطوں، بشمول جنوبی ہند اور بنگال، کی طرف روانہ ہوئے۔

پنجاب کی سماجی ساخت میں صوفیائے کرام کا کردار: ایک تحقیقی جائزہ

میرے علم کے مطابق صوفیاء کی آمد اور ان کی تبلیغ کا سب سے زیادہ کام گیارھویں اور

پندرھویں صدی کے درمیان نظر آتا ہے۔ اس دوران ان کے پنجاب کی ثقافت پر گہرے اثرات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ان کی تعلیم کا مرکز تصوف تھا۔ تصوف نے خطے کے روحانی، سماجی اور ثقافتی منظرنامے کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ ان اثرات کا ذکر کچھ یوں ہے:

صوفیاء کی تعلیم کا مرکز محبت، عقیدت، اور دنیاوی وابستگیوں کو ترک کرنے پر تھا، اس لیے ایک بڑی تعداد میں لوگ اس طرف راغب ہوئے۔ اس سے متاثر ہو کر پنجابی زبان میں شاعری بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان پنجابی شاعروں میں بابا فرید، بابا بلھے شاہ، وارث شاہ، حضرت سلطان باہو، اور شاہ حسین کے علاوہ بھی کئی شخصیات شامل ہیں۔

صوفی مزارات روحانی سکون کی جگہیں بن گئیں، جہاں مختلف عقائد کے لوگ شفا اور برکت کے لیے آتے تھے۔ اس طرح ان مزارات پر سالانہ میلے لگنے شروع ہوئے، جہاں پنجاب کی ثقافت پروان چڑھتی نظر آتی ہے۔

پہلی مرتبہ پنجاب میں ہم آہنگی کی ثقافت کو فروغ ملا۔ اسلامی اور مقامی روایات کے عناصر کو ملا کر ایک نئی روحانی دنیا آباد کی گئی۔ صوفیاء کے مزارات پر محبت اور رواداری کے صوفی پیغام کی وجہ سے پنجاب کی متنوع آبادیوں میں مل بیٹھنے کا منظر دیکھنے کو ملتا ہے۔ مزارات پر مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندو، بدھ مت، عیسائی اور سکھ بھی بڑی تعداد میں آتے تھے۔ اس طرح عقائد کا یہ اختلاط ایک مخصوص ہند-اسلامی ثقافت کے عروج کا باعث بنا۔

اسی دور میں صوفی شاعری اور گیت (جیسے قوالی) نے اس ثقافتی امتزاج میں اہم کردار ادا کیا۔ صوفیاء نے اپنی شاعری کے ذریعے ثقافتی اور مذہبی تقسیم کو مٹایا، اور اپنی تعلیمات میں محبت، رواداری اور فرقہ واریت کو مسترد کرنے کی آفاقی سچائیوں پر زور دیا۔

یہ بھی پہلی بار دیکھنے کو ملا کہ صوفیا کرام نے سماجی بہبود کی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، جس سے پسماندہ طبقات کی ضروریات پوری کرنے میں مدد ملی۔ آج بھی ان مزارات پر لنگر جاری ہیں، جہاں سے لاکھوں افراد روزانہ کھانا حاصل کرتے ہیں۔

ایک اہم بات اس دور کی یہ ہے کہ صوفی شاعروں اور صوفیاء نے پنجابی زبان کو اپنی

تعلیمات کے فروغ کے لیے استعمال کیا۔ پنجاب کے اکثر صوفیاء نے اپنے گہرے روحانی اور فلسفیانہ تصورات کو عام لوگوں تک پہنچانے کے لیے پنجابی کا استعمال کیا، جس کی وجہ سے آج بھی عام آدمی صوفیاء کے کلام سے واقف ہے۔ پنجابی ادب میں صوفیانہ شاعری ایک بڑی اور منفرد صنف بن گئی۔

مسلمان حکمران صوفیاء سے عقیدت رکھتے تھے، اس لیے صوفی مزارات زیارت کے اہم مراکز بن گئے، جن کی بدولت پنجاب میں ایک نئے طرزِ تعمیر کو فروغ ملا۔ ملتان میں بننے والے مزارات اس کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

مسلمان صوفیاء اور سکھوں کے درمیان باہمی احترام دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس تعلق نے پنجاب کے روحانی منظرنامے کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ اسی دور میں پنجاب میں تصوف کے نمایاں اثرات میں سے ایک سکھ مت کا آغاز ہے۔ سکھ مت کے بانی، بابا گرونانک صاحب، خدا کی عقیدت، بنی نوع انسان کی مساوات، اور رسمی طریقوں کی نفی پر زور دیتے تھے۔ وہ مسلمان صوفی نظریات سے بہت متاثر تھے۔

الغرض، یہ کہا جا سکتا ہے کہ بارھویں سے پندرھویں صدی تک پنجاب پر تصوف کا اثر جہاں ایک طرف روحانی تھا، وہیں دوسری طرف ثقافتی اور سیاسی بھی تھا۔ اس کے نتیجے میں عام لوگوں میں رواداری، اتحاد اور ہند–اسلامی ثقافتی امتزاج کی صورتیں ابھر کر سامنے آئیں۔ صوفیا کرام نے محبت، امن، اور خدمتِ انسانیت جیسی اقدار کو فروغ دے کر پنجاب کے مذہبی، سماجی اور سیاسی منظرنامے کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے اپنی شاعری، سماجی خدمات اور روحانی رہنمائی کے ذریعے ایک متحرک اور متنوع ثقافت کی بنیاد رکھی، جس میں اسلامی، ہندو اور مقامی روایات کو باہم ملا کر آنے والی نسلوں پر گہرا اثر ڈالا۔

یہ بات بھی اہمیت رکھتی ہے کہ اسی دور کے بعد فقہی اسلام اور علماء ئے دین کی سرگرمیاں نمایاں ہونے لگیں۔ شاہ ولی اللہؒ جیسے مصلحین نے، جنھوں نے پہلی بار قرآن مجید کا فارسی میں ترجمہ کیا (یاد رہے کہ فارسی اُس وقت اہلِ علم اور دربار کی زبان تھی، جبکہ عام لوگ

پنجابی بولتے تھے)، اسلامی تعلیمات کے فروغ کا ایک نیا باب شروع کیا۔ رنجیت سنگھ کے دور تک فارسی ہی دربار کی زبان رہی۔ بعد ازاں، انگریزوں نے مشرقی پنجاب میں ہندی اور مغربی پنجاب میں اردو کو ذریعہ تعلیم مقرر کیا۔

اسی زمانے میں شیخ احمد سرہندیؒ اور دیگر جید علماء نے تصوف سے قدرے مختلف راستہ اختیار کرتے ہوئے فقہی اور دینی علوم کے فروغ پر زور دیا۔ اس کے ساتھ ہی مدارس کے قیام کا آغاز ہوا، جس کے نتیجے میں فقہی تعلیمات کا دائرہ وسیع تر ہوتا گیا۔ یوں صوفیاء اپنے روحانی مشن پر کام کرتے رہے جب کہ علمائے دین شریعت اور فقہ کی تعلیم عام کرنے میں سرگرمِ عمل رہے۔

میں نے جن موضوعات پر اب تک بات کی ہے، ان میں یہ موضوع سب سے زیادہ دلچسپ اور ہمہ گیر محسوس ہوتا ہے۔ تاہم، اس مقام پر میں اس بحث کو مزید وسعت دینا مناسب نہیں سمجھتا۔ اگر آپ کو اس موضوع سے دلچسپی ہو تو میری تجویز ہے کہ اس پر مزید مطالعہ ضرور کریں۔

❀ ❀ ❀

مغل

آلِ تیمور سے تعلق رکھنے والے ہندوستان پر حکومت کے دعویدار

اب تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے، اس سے یہ تو پتا چلتا ہے کہ ہندوستان میں ترکوں کے بعد افغانوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ ان کا آخری حکمران لودھی خاندان تھا، جس نے آگرہ کو اپنا صدر مقام بنایا ہوا تھا۔ آگرہ، دہلی سے تقریباً سوا دوسو کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آگرہ آج بھی بہت زیادہ سرسبز نہیں ہے، تو پھر اسے دہلی کے بجائے کیوں چُنا گیا؟ جو بات میری سمجھ میں آتی ہے، وہ صرف یہی ہے کہ آگرہ سے بنگال اور جنوبی ہندوستان کو کنٹرول کرنا نسبتاً آسان تھا، لیکن دوسری طرف آگرہ، دہلی کے مقابلے میں افغانستان سے کافی دُور واقع ہے۔ لودھی خاندان کو شکست دینے کے بعد ظہیرالدین بابر شمالی ہندوستان کا حکمران بن گیا۔ یہ ایک بہت بڑی سیاسی تبدیلی تھی، جو آئندہ تین صدیوں تک قائم رہی۔

اس سے پہلے کہ ہم مغل خاندان کی حکمرانی اور اس کے اثرات کا جائزہ لیں، میں چاہوں گا کہ آپ کے سامنے ظہیرالدین بابر کی مختصر سوانح پیش کروں۔

بابر کے بارے میں تفصیل سے جاننے کے لیے اس کی لکھی ہوئی کتاب تزکِ بابری (اردو میں بابرنامہ) نہایت مفید ہے، جو اس نے اپنی مادری زبان میں لکھی تھی، جو ترکی سے ملتی جلتی ہے۔ بعدازاں اس کا فارسی، اردو اور انگریزی میں ترجمہ بھی ہوا۔ یہ ایک نہایت دلچسپ کتاب ہے، جس میں کئی حیران کن معلومات موجود ہیں۔ مثلاً جب بابر کی عمر محض 12 برس تھی، تب اسے فرغانہ کا حکمران بنا دیا گیا تھا۔

ظہیرالدین محمد بابر 1483ء میں موجودہ ازبکستان کے شہر اندیجان میں پیدا ہوا۔ اس کی

وفات 1530ء میں آگرہ، ہندوستان میں ہوئی، جبکہ اس کا مزار کابل میں واقع ہے۔ مجھے یہ مزار دیکھنے کا موقع بھی ملا ہے۔ یہ مزار باغِ بابر میں ایک اونچائی پر واقع ہے۔ یاد رہے کہ بابر کو پہلے آگرہ میں دفن کیا گیا تھا، مگر بعدازاں اسے کابل منتقل کر کے وہاں دفنایا گیا، جو اس کی کابل سے بے پناہ محبت کا اظہار ہے۔ میں نے آج تک جتنے بھی مزارات دیکھے ہیں، ان سب پر چھت ہوتی ہے، لیکن بابر کے مزار پر کوئی چھت نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایسا اس کی وصیت کے مطابق کیا گیا تھا۔

تاریخِ فرشتہ میں بابر کے بارے میں تفصیل سے لکھا گیا ہے۔ جو کچھ میں نے وہاں پڑھا، اس کا خلاصہ کچھ یوں ہے:

بابر کے دادا، سلطان ابوسعید مرزا کو عراق میں شہید کیا گیا۔ ان کے گیارہ بیٹے تھے، جن میں سے چند کے نام یہ تھے: سلطان احمد مرزا، سلطان محمد مرزا، سلطان مراد مرزا، سلطان عمر مرزا اور سلطان مرزا۔ ان میں سے چار نے حکمرانی کی۔ الغ بیگ مرزا کابل کا حکمران تھا، سلطان احمد مرزا سمرقند پر قابض تھا، سلطان محمد مرزا حصار، قندوز اور بدخشاں پر حکومت کرتا تھا، جبکہ عمر شیخ مرزا اندیجان اور فرغانہ کا فرمانروا تھا۔

عمر شیخ مرزا ایک عادل اور منصف حکمران تھا، اور اس کا دور عدل و انصاف سے مزین تھا۔ اس کے بیٹے کی ولادت ہوئی تو اس کا نام بابر مرزا رکھا گیا۔ اس خاندان کا نسب امیر تیمور گورکانی سے ملتا ہے، اسی لیے مغل خود کو تیمور کی نسل سے شمار کرتے ہیں۔ اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ بابر سے قبل بھی مغل کابل تک آ چکے تھے۔ میں نے اس سے قبل بھی ذکر کیا ہے کہ بابر سے پہلے متعدد مغل سرداروں نے شمالی ہندوستان پر حملے کیے تھے۔ بابر، اپنے والد کی اچانک وفات کے بعد محض بارہ برس کی عمر میں فرغانہ کا حکمران بن گیا۔

فرغانہ مشرقی ازبکستان کا ایک شہر ہے، جو تاشقند سے تقریباً 320 کلومیٹر مشرق میں، اندیجان سے 75 کلومیٹر جنوب مغرب میں، اور کرغزستان کی سرحد سے صرف 20 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ والد کی وفات کے بعد، بابر کو متعدد سیاسی اور عسکری مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ ایک طویل داستان ہے جس کا ذکر یہاں غیر ضروری ہے۔ فی الحال صرف اتنا کہنا کافی ہے

کہ ایک دن وہ بھی آیا جب بابر نے ہندوستان پر حملہ کیا۔

یاد رہے کہ فرغانہ سے کابل کا فاصلہ تقریباً 1400 کلومیٹر جبکہ دہلی کا فاصلہ 2700 کلومیٹر کے قریب ہے۔ ظاہر ہے، فاصلہ راستے کے انتخاب پر بھی منحصر ہوتا ہے۔ جنوری 2025ء میں مجھے ازبکستان جانے کا موقع ملا، جہاں میں نے تاشقند، سمرقند اور بخارا جیسے عظیم تاریخی شہر دیکھے۔

ہماری کہانی کا آغاز بابر کے ہندوستان پر حملے سے ہوتا ہے۔

یہ بات نہایت اہم ہے کہ مغلوں کا حملہ ہندوستان پر ہونے والے پچھلے حملوں سے بالکل مختلف نوعیت کا تھا۔ مغلوں سے قبل مسلمان حکومتیں ہندوستان کے بڑے حصے پر قائم تھیں، جن کا آغاز قطب الدین ایبک سے 1210ء میں ہوا۔ لیکن سب سے طویل دورِ حکومت مغلوں کا ہے۔ مغلیہ سلطنت اپنے وقت کی ایک عظیم الشان اور منظم سلطنت تھی۔ یہ سب کچھ کس طرح ہوا، اور پنجاب پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے؟ یہی میرا موضوع ہے، جس پر میں آپ سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔

مغل حملوں سے قبل ہندوستان کا سیاسی و ریاستی منظرنامہ

مغلوں سے پہلے ہندوستان کئی علاقائی سلطنتوں میں بٹا ہوا تھا۔ دہلی سلطنت کی باگ ڈور لودھی خاندان کے پاس تھی، جس کی بنیاد بہلول لودھی نے رکھی تھی۔ بابر کے حملے کے وقت ابراہیم لودھی تخت نشین تھا۔ لودھی خاندان کا کنٹرول زیادہ تر شمالی ہندوستان تک محدود تھا۔ جنوبی ہندوستان کی کئی ریاستیں آزادی کا اعلان کر چکی تھیں۔ راجپوت میواڑ، رانا سانگا کی قیادت میں طاقت پکڑ رہے تھے۔ جنوب میں وجے نگر سلطنت، جو ایک غالب ہندو طاقت تھی، قائم ہو چکی تھی۔ بہمنی سلطنت اور اس کی جانشین ریاستیں دکن میں اپنا اثر و رسوخ جما چکی تھیں۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اسی سیاسی انتشار نے بابر کو حملہ کرنے اور تسلط قائم کرنے کا موقع فراہم کیا۔

میں نے اس بات کی کھوج لگانے کی کوشش کی کہ بابر کو ہندوستان آنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ وہ اس سے پہلے کابل پر قبضہ کر چکا تھا۔ اس سوال کا جواب میں نے کئی لوگوں سے سنا۔ جو کچھ سنا اور پڑھا، سب پیشِ خدمت ہے۔ بابر کی کتاب میں اس کا تذکرہ مختصر ہے، جبکہ تاریخِ فرشتہ میں کافی تفصیل سے لکھا گیا ہے۔ میں نے دونوں سے استفادہ کیا ہے۔

فرشتہ کی جلد نمبر دو میں بابر کے ہندوستان پر حملے کے بارے میں تفصیل سے لکھا گیا ہے۔ اس کتاب کے مطابق، بابر نے پہلا حملہ 925 ہجری میں کیا، جو 1520 عیسوی بنتا ہے۔ اس کا ذکر اس نے اپنی کتاب میں بھی کیا ہے۔ فرشتہ لکھتے ہیں کہ اس نے پہلی مرتبہ دریائے سندھ کو عبور کیا اور جنوبی پنجاب میں پیش قدمی کی۔ اس نے ایک بڑے علاقے پر حکمرانی کی۔ اس دوران اس نے ابراہیم لودھی کو یہ پیغام بھیجا کہ:

''جن جگہوں پر آپ لوگوں نے قبضہ کیا ہے، یہ ہمارے آباؤ اجداد کی ہیں، اور آپ انھیں ہمیں واپس کر دیں۔''

اسی دوران اس کا ایک بیٹا پیدا ہوا، جس کا نام ان کی روایت کے مطابق ہندال مرزا رکھا گیا۔ اس حملے کے بعد بابر واپس چلا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد بابر نے لاہور فتح کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس دوران اس نے یوسف زئی قبیلے کو بھی شکست دی، لیکن اسے خبر ملی کہ سلطان سعید کابل کو فتح کرنے آ رہا ہے، چنانچہ وہ واپس چلا گیا اور اپنے ایک جرنیل کو لاہور پر حملے کا حکم دیا۔

یہ بابر کا دوسرا حملہ تھا۔ اس کے بعد اس نے تیسرا حملہ ایک سال بعد کیا۔ یہاں آ کر اس نے بہت زیادہ قتل و غارت کی اور تقریباً 30 ہزار لونڈیاں اور غلام گرفتار کر کے بادشاہ کی فوج میں شامل کر دیے گئے۔ یہ واقعہ سیّد پور کے علاقے میں پیش آیا، لیکن یہ کہاں واقع تھا، اس کا ذکر تاریخِ فرشتہ میں نہیں ملتا۔

اسی دوران اس نے جنوبی پنجاب کے کئی علاقے تباہ کیے، قتل و غارت کی، اور بے شمار دولت سمیٹ کر واپس چلا گیا۔ یہاں پر یہ بات بھی لکھی ہوئی ہے (جس کی میں تلاش میں تھا) کہ دولت خان لودھی (جو ابراہیم لودھی کا چچا تھا) اپنے بھتیجے ابراہیم لودھی سے ناراض تھا۔ شاید وہ اپنے بھائی کے بعد خود حکمران بننا چاہتا تھا، لیکن اس کے بھائی کی بجائے اس کے بیٹے ابراہیم لودھی کو تخت پر بٹھایا گیا۔ ابراہیم لودھی کے اپنے سرداروں سے بھی اچھے تعلقات نہیں تھے۔

دولت خان لودھی نے اپنے قابلِ اعتماد لوگوں کو بابر کی خدمت میں بھیجا اور کہا کہ وہ ہندوستان پر حملہ کرے، اور وہ اس کی مدد کریں گے۔ یہ واقعہ 1523 عیسوی کا ہے، جب بابر نے

چوتھی بار حملہ کیا۔اس بار وہ جنوبی پنجاب کی بجائے شمالی پنجاب آیا اور کھوکھروں سے اس کی لڑائی ہوئی۔وہ سیالکوٹ کے قریب کسی مقام پر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔اس دوران لودھی خاندان کے وہ افراد جو پنجاب پر قابض تھے، انھوں نے بابر کا مقابلہ کیا، لیکن شکست کھائی۔اس طرح بابر لاہور میں داخل ہوگیا۔حسبِ معمول، جیسا کہ چنگیز خان کے حملہ آور کرتے آئے تھے، بابر نے بھی لاہور کو آگ لگادی اور کچھ دن وہاں ٹھہرنے کے بعد دیپالپور چلا گیا۔

یہاں دولت خان لودھی اس سے آملا اور اس کا وفادار بن گیا، لیکن بعد میں یہی دولت خان، جس نے اپنے خاندان سے غداری کی تھی، بابر کے ساتھ بھی غداری کی کوشش کرنے لگا۔اس پر بابر نے اسے قید کر دیا۔اس دوران بابر نے عبدالعزیز کو لاہور کا گورنر مقرر کیا اور خسرو خان کو سیالکوٹ اور ملتان کی ذمہ داری سونپی۔بابر کے واپس جانے کے بعد، دولت خان نے دوبارہ بغاوت کردی۔دوسری طرف، ابراہیم لودھی کی فوج بھی دولت خان کے خلاف ہوگئی۔اب دولت خان کا مقابلہ ابراہیم لودھی سے تھا۔اس جنگ کی تفصیل بھی تاریخِ فرشتہ میں ملتی ہے۔

بابر کا آخری حملہ

بابر یہاں کے حالات کا جائزہ لینے کے بعد واپس چلا گیا تھا، لیکن شمالی وجنوبی پنجاب کے سرسبز وشاداب علاقے اسے بے حد پسند آئے۔یہی وجہ تھی کہ اس نے دوبارہ ہندوستان پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔اس سے قبل وہ یہ انتظام کر چکا تھا کہ لاہور سے اسے مستقل طور پر محصول ملتا رہے۔اس بار بابر نے پھر دریائے سندھ عبور کیا، سیالکوٹ پہنچا، اور لاہور سمیت گردونواح کے علاقے اپنے ہم خیال افراد میں تقسیم کر دیے۔ابراہیم لودھی کی فوج نے سخت مزاحمت کی، لیکن لاہور پر قبضے کے بعد بابر پانی پت کی جانب روانہ ہوگیا۔

پانی پت کی جنگ: جس کے بعد ہندوستان میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا

پانی پت میں اس سے قبل بھی کئی جنگیں ہوچکی تھیں۔ہندوستان کے سفر کے دوران مجھے پانی پت دیکھنے کا موقع ملا۔یہاں 21 اپریل 1526ء کو بابر اور ابراہیم لودھی کی افواج کے درمیان فیصلہ کن جنگ ہوئی۔اس جنگ میں ابراہیم لودھی مارا گیا اور اس کی فوج بھی میدان چھوڑ کر فرار

ہونا چاہتی تھی، لیکن بابر کی فوج نے انھیں مکمل طور پر شکست دے دی۔ فتح کے بعد بابر آگرہ پہنچا اور وہاں کے قلعے پر قبضہ کرلیا۔ اس جنگ میں ہمایوں بھی بابر کے ہمراہ تھا۔ جنگ کے بعد بابر نے آگرہ کا نظم و نسق سنبھالا اور بے شمار دولت حاصل کی۔

یہ ایک دلچسپ امر ہے کہ آج سے پانچ سو سال قبل پانی پت کے میدان میں دو غیر ملکی قوتوں مغل اور لودھی کے درمیان جنگ ہوئی۔ ایک افغانستان سے آیا تھا اور دوسرا وسطی ایشیا سے۔ میدانِ جنگ پنجاب تھا۔ آج بھی اسی خطے میں عالمی قوتوں کے درمیان کشیدگی پائی جاتی ہے؛ ایک جانب چین اور روس، دوسری جانب امریکہ۔

کچھ بھی تو نہیں بدلا... اور شاید بدلے گا بھی نہیں، جب تک ہم خود کو نہ بدلیں۔

رانا سانگا اور مغلوں کی طاقت

بابر کی حکومت کے قیام کے بعد کئی طاقتیں اس کی مخالفت پر آمادہ ہوگئیں، مگر اس کی سلطنت دن بدن مضبوط ہوتی گئی۔ اس نے آس پاس کے کئی علاقوں کو فتح کیا۔ رانا سانگا، جو ہندو راجاؤں میں نمایاں مقام رکھتا تھا، لودھی خاندان کے بعض افراد کے ساتھ مل کر ایک بڑی فوج تیار کر چکا تھا۔ بابر کو ہندوستانی امراء پر زیادہ اعتماد نہیں تھا، لہٰذا اس نے انتظامیہ میں زیادہ تر ترک اور مغل سرداروں پر انحصار کیا۔

بابر نے اس موقع پر کہا: ''یہ میرے لیے بڑی بدقسمتی ہوگی کہ میں نے اتنا بڑا ملک فتح کیا اور اب اسے چھوڑ دوں۔''

اسی دوران اس نے شراب نوشی ترک کی اور داڑھی نہ کٹوانے کا فیصلہ کیا۔ بعد ازاں، رانا سانگا کے ساتھ ایک شدید جنگ ہوئی جس میں ہندوؤں کو شکست ہوئی، اور رانا سانگا بمشکل جان بچا کر فرار ہوا۔ مورخین کے مطابق بابر نے مرنے والے دشمنوں کے سروں سے ایک مینار بھی تعمیر کروایا۔ اس کے بعد بابر نے بنگال اور بہار کا رخ کیا، مگر وہاں بھی اسے افغانوں کی مزاحمت کا سامنا رہا۔ آخرکار، 1530ء میں بابر کا انتقال ہوگیا اور بعد میں اس کی میت کابل منتقل کی گئی۔

بابر کی شخصیت

بابر ایک ذہین، خوب صورت اور انصاف پسند انسان تھا۔ وہ حسین چہروں کا دلدادہ تھا، اور اس کے دربار میں خوش شکل افراد کی کثرت تھی۔ یہ تھا بابر کا مختصر تذکرہ۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ہمایوں تخت نشین ہوا۔لیکن اس سے قبل کہ ہم ہمایوں کے بارے میں کچھ بیان کریں، مناسب ہوگا کہ بابر کے دور میں شمال مغربی ہندوستان کی سیاست، ثقافت، معیشت اور مذہبی فضا پر اس کے اثرات کا جائزہ لیا جائے۔

انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا میں بابر کے بارے میں ایک طویل مضمون موجود ہے، جس کا خلاصہ پیشِ خدمت ہے:

جب ابراہیم لودھی جنگ میں مارا گیا اور بابر کو فتح نصیب ہوئی، تو تین دن بعد اس نے دہلی پر قبضہ کرلیا اور 4 مئی کو آگرہ پہنچا۔ وہاں پہنچ کر اس نے دریائے جمنا کے کنارے ایک باغ تعمیر کروایا، جو آج ''رام باغ'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ مغلوں کے جمالیاتی ذوق کی علامت ہے۔ تاہم، مغل سلطنت کی بنیادیں ابھی مستحکم نہ تھیں، کیونکہ دریائے گنگا کے اطراف کئی افغان سردار موجود تھے، جو اگرچہ غیر منظم تھے، لیکن زبردست عسکری صلاحیت رکھتے تھے۔ جنوب میں مالوا اور گجرات کی سلطنتیں موجود تھیں جو وسیع وسائل کی حامل تھیں۔ راجستھان میں میواڑ کا رانا سانگا ایک طاقتور کنفیڈریسی کا قائد تھا، جو شمالی ہندوستان میں بابر کی پوزیشن کے لیے خطرہ بن چکا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ بابر ہندوستان کے موسم اور حالات سے تنگ آکر تیمور کی طرح واپس جانا چاہتا تھا، لیکن اس نے رانا سانگا کے ساتھ جنگ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس مقصد کے لیے اس نے شراب نوشی ترک کردی، شراب کے برتن توڑ دیے اور شراب کو کنویں میں بہا دیا۔ پھر اس نے خدا کی مدد سے جنگ کی۔

پانی پت کی جنگ کے بعد بابر صرف چار سال زندہ رہا، اور ان چار برسوں میں اس نے متعدد جنگیں لڑیں۔

بابر کے عہدِ حکومت کے شمال مغربی ہندوستان پر سیاسی، فوجی اور ثقافتی اثرات

انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا کے مطابق، بابر کی سلطنت قندھار سے لے کر بنگال کی سرحدوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی جنوبی حد راجپوتانہ کے ریگستان، رنتھمبور، گوالیار اور چندیری کے قلعوں تک تھی۔ یہ بات اہم ہے کہ یہ کوئی منظم ریاست نہیں تھی، بلکہ ایک طرح سے مقامی سرداروں کا ایک اتحاد تھی۔ ایک سلطنت تو قائم ہو چکی تھی، لیکن اسے پائیدار اور منظم کرنا ابھی باقی تھا۔ اس لحاظ سے یہ ایک غیر یقینی ورثہ تھا، جو بابر نے اپنے بیٹے ہمایوں کو منتقل کیا۔

تاریخ میں ایک دلچسپ واقعہ مذکور ہے: 1530ء میں جب ہمایوں سخت بیمار ہوا اور اس کے بچنے کی امید نہ رہی، تو بابر نے دعا کی کہ وہ اپنی جان ہمایوں کی زندگی کے بدلے خدا کے حضور پیش کرتا ہے۔ اس نے نذر پوری کرنے کے لیے ہمایوں کے بستر کے گرد سات چکر لگائے۔ ہمایوں صحت یاب ہو گیا، اور بابر کی صحت بگڑ گئی۔ اسی سال وہ انتقال کر گیا۔ یہ واقعہ گلبدن بیگم نے اپنی کتاب ہمایوں نامہ میں بیان کیا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بابر مغل سلطنت کا بانی ہے، لیکن اس سلطنت کو مستحکم کرنے کا کارنامہ اس کے پوتے اکبر نے انجام دیا۔ تاہم، بابر ایک دلیر، بہادر اور عادل حکمران کے طور پر ہمیشہ مغلوں کے لیے مشعلِ راہ رہا۔ بابر نہ صرف ایک باوقار شخصیت کا مالک تھا بلکہ ایک ترک نژاد شاعر بھی تھا۔ اسے فطرت سے بے پناہ محبت تھی، جس کا ثبوت یہ ہے کہ جہاں بھی گیا، باغات اور عمارات تعمیر کروائیں۔ اس نے کابل میں بھی ایک خوب صورت باغ بنوایا، جہاں اس کا مزار واقع ہے۔ مجھے اس باغ کو دیکھنے اور مزار پر فاتحہ خوانی کا موقع ملا۔ یہ میرے لیے ایک دلگداز اور یادگار تجربہ تھا۔

بابر نے نثری یادداشتوں کی صورت میں بابر نامہ تحریر کیا، جو آج ایک مشہور خودنوشت سوانح کے طور پر جانی جاتی ہے۔ اکبر کے دورِ حکومت میں 1589ء میں اس کا ترکی سے فارسی میں ترجمہ کیا گیا، اور بعد ازاں انگریزی میں بھی اس کا ترجمہ ہوا (*Memoirs of Babur*)۔ اس کتاب کے مطابق بابر اپنی عمر کے لحاظ سے غیر معمولی طور پر مہذب، ذہین، بہادری سے لبریز اور قدرتی حسن کا دلدادہ تھا۔ یہ سب درست ہے، لیکن میں نے اس کی تحریروں سے یہ بھی محسوس کیا کہ

وہ دشمنوں کے ساتھ رحم کا برتاؤ نہیں کرتا تھا، اور سزا دینے میں انتہا پسندی کی حد تک چلا جاتا تھا۔

بابر کے حملوں کے نتیجے میں جو سلطنت قائم ہوئی، وہ بعد ازاں آل انڈیا مغل سلطنت کے قیام کا پیش خیمہ بنی۔ شمالی ہندوستان میں بابر نے رانا سانگا کی قیادت میں راجپوت اتحاد کی قوت کو توڑ دیا، اور یوں طاقت کا توازن یکسر بدل گیا۔ اب پورے شمالی ہندوستان میں صرف ایک مرکزی اقتدار تھا، جس کے سربراہ بابر خود تھے۔

مغلوں کے دورِ حکومت میں تقریباً دو سو سال تک ہندوستان کو شمال مغرب سے بیرونی حملوں سے تحفظ حاصل رہا۔ کشان سلطنت کے زوال کے بعد یہ پہلی بار ہوا کہ کابل، قندھار اور شمالی ہندوستان کو شامل کرنے والی ایک متحدہ سلطنت وجود میں آئی، جس نے شمال مغربی حملوں کو مؤثر طور پر روکا۔ کابل اور قندھار پر کنٹرول کی بدولت ہندوستانی بیرونی تجارت کو بھی نئی جہت ملی، کیونکہ یہ دونوں شہر مشرق میں چین اور مغرب میں بحیرہ روم کے بندرگاہی شہروں تک قافلوں کے گزرگاہ بنے۔

بابر کی بدولت ہندوستانی سپاہیوں کو جنگ کا ایک نیا اسلوب سیکھنے کو ملا۔ رفتہ رفتہ میدانِ جنگ میں ہاتھیوں کی جگہ گھوڑوں نے لے لی۔ بابر کی آمد سے پہلے ہندوستان میں بارود کا استعمال نہ ہونے کے برابر تھا، مگر پانی پت کی پہلی جنگ (1526ء) کے بعد توپ خانے اور بارود کے استعمال کا آغاز ہوا۔ یہیں سے گھڑسوار اور توپ خانے کا مؤثر امتزاج فروغ پانے لگا۔

یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بابر سے پہلے دہلی کے مسلمان حکمران اسلامی دنیا کے خلیفہ کی بیعت کرتے تھے، لیکن بابر نے یہ روایت ختم کر دی۔ وہ پہلا حکمران تھا جس نے خود کو ''بادشاہ'' کہلوانا پسند کیا، اور خلیفہ کے ساتھ تمام رسمی تعلقات ختم کر دیے۔ اس نے اپنے آپ کو مذہبی اثر و رسوخ سے آزاد ایک خودمختار سیاسی حکمران کے طور پر پیش کیا۔ رانا سانگا کے خلاف جنگ کو بھی اس نے مذہبی جہاد کے بجائے سیاسی ضرورت کے طور پر بیان کیا۔

بابر فارسی اور عربی زبانوں میں بھی تعلیم یافتہ تھا، اور اسی وجہ سے اس کا شمار ترکی زبان کے اہم ادیبوں میں ہوتا ہے۔ آج بھی اس کی خودنوشت تزکِ بابری (بابر نامہ) عالمی ادب کی

کلاسکس میں شامل ہے۔ ان تمام پہلوؤں سے ثابت ہوتا ہے کہ بابر کے دور سے ہندوستانی تہذیب وثقافت میں ایک نئی اور دیرپا تبدیلی کا آغاز ہوا۔ اس کی سلطنت میں تجارت، ثقافت اور روایات کے منفرد امتزاج کو فروغ حاصل ہوا۔

بابر کا یہ شعر کافی مشہور ہے:

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

(بابر! زندگی کا لطف اٹھا، کیونکہ یہ دنیا دوبارہ نہیں ملے گی۔)

میں جس قدر جان سکا ہوں، اس کے مطابق ہندو بابر کے خلاف زیادہ بات نہیں کرتے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اس کا دور بے حد مختصر تھا، اور اس نے اپنے دور میں ہندوؤں کو مذہبی طور پر کوئی خاص نقصان نہیں پہنچایا۔

یہاں ایک بات کی نفی بھی ہوتی ہے کہ مقامی لوگوں نے حملہ آوروں کا راستہ نہیں روکا۔ ان سے گزارش ہے کہ وہ بابر کے ساتھ رانا سانگا کی جنگوں کا احوال ضرور پڑھیں تا کہ وہ یہ جان سکیں کہ کوئی بھی حملہ آور بغیر جنگ کے ہندوستان پر قابض نہیں ہوا۔ یہ بات بھی ایک حقیقت ہے کہ مقامی لوگوں کی نااتفاقی، جنگی صلاحیت میں کمی، جنگ کی ناتجربہ کاری کی وجہ سے وہ بیشتر جنگوں میں کامیاب نہ ہوسکے۔ مقابلہ ضرور کیا، شکست یا فتح تو مقدر کی بات ہے۔ بابر کے ساتھ ایک نہیں کئی جنگیں پنجاب کی سرزمین پر لڑی گئیں جن میں پنجاب کے لوگ ہی تھے۔

فتح یا شکست کے کئی عوامل ہوسکتے ہیں۔ حملہ آور کے خلاف جنگ یہ بات تو ظاہر کرتی ہے کہ اپنی دھرتی کی حفاظت کی کوشش تو کی ہے۔ ایسا تو پنجاب نے ہر دور میں کیا ہے۔

❀❀❀

ہمایوں کی حکمرانی

سیاسی چیلنجز، جلاوطنی اور تختِ دہلی کی بازیافت

تاریخِ فرشتہ میں ہمایوں کے حالات نسبتاً تفصیل سے ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمایو ں نامہ بھی ایک اہم تاریخی ماخذ ہے، جو گلبدن بیگم نے تحریر کی۔ وہ مغل بادشاہ بابر کی بیٹی اور ہمایوں کی بہن تھیں۔ انھوں نے اس کتاب میں مغل شہنشاہ ہمایوں کی زندگی، فتوحات، شکست، جلاوطنی اور دوبارہ تخت نشینی کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ ہمایو ں نامہ مغلیہ دربار کی روزمرہ زندگی، خواتین کے کردار اور شاہی خاندان کے داخلی معاملات پر ایک منفرد اور قریبی نظر پیش کرتی ہے۔ یہ مغل دور کی واحد تاریخی کتاب ہے جو کسی شہزادی نے لکھی۔

میں طویل عرصے سے اس سوال کا متلاشی تھا کہ مغلوں کی اصل زبان کیا تھی؟ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی مادری زبان ترکی تھی، جسے چغتائی ترکی کہا جاتا ہے۔ جب میں آذربائیجان گیا اور وہاں کے لوگوں سے ان کی زبان کے بارے میں دریافت کیا، تو انھوں نے بتایا کہ ان کی زبان چغتائی ترکی سے خاصی مشابہت رکھتی ہے۔ اس مشاہدے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مغلوں کی زبان ترکی سے قریبی تعلق رکھتی تھی۔

تاہم یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مغل دربار اور شاہی خاندان میں فارسی زبان کیوں رائج ہوئی؟ اس کا جواب مجھے ہمایو ں نامہ کے مطالعے سے ملا۔ آپ بھی لطف اندوز ہوں کہ کس طرح ترک النسل مغل حکمرانوں کی زبان، رفتہ رفتہ فارسی بن گئی، اور رنجیت سنگھ کے دور تک فارسی نہ صرف درباری بلکہ علمی و ادبی زبان بھی رہی۔ اردو کے کئی ممتاز شعرا، جیسے کہ غالب اور اقبال، نے فارسی میں گراں قدر شاعری کی۔ یہ بات اہم ہے کہ بابر بادشاہ نے اپنی خودنوشت تزکِ بابری اپنی

مادری زبان ترکی میں تحریر کی، اور اس کے بیشتر اشعار بھی ترکی زبان میں ہیں، جب کہ اس کی بیٹی گلبدن بیگم نے ہمایوں نامہ فارسی میں لکھا۔ یہ تبدیلی کیوں اور کیسے آئی؟

بابر، سمرقند چھوڑنے کے بعد ایک طویل عرصے کابل میں مقیم رہا۔ کابل کے عوام کی زبان فارسی تھی۔ جب وہ ہندوستان آیا تو یہاں کے مسلمان بھی فارسی زبان سے مانوس تھے، کیونکہ اس سے قبل کے بیشتر مسلمان حکمران یا تو ایران سے آئے تھے یا وسطی ایشیا سے۔ اس طرح رفتہ رفتہ فارسی، چغتائی ترکی پر غالب آ گئی، یہاں تک کہ بابر کی اولاد اپنی مادری زبان سے تقریباً ناواقف ہو گئی۔ گلبدن بیگم چونکہ کابل میں پیدا ہوئیں، اس لیے وہ ترکی اور فارسی دونوں زبانوں سے واقف تھیں۔ ان کی تحریر میں بعض مقامات پر ترکی الفاظ کی جھلک بھی نمایاں ہے، جو ان کی لسانی شناخت کی علامت ہے۔

یوں، مجھے اپنے سوال کا جواب مل گیا کہ فارسی کی جانب مغلوں کا جھکاؤ کابل میں قیام اور ہندوستان کی مسلم تہذیب سے قربت کا نتیجہ تھا۔ بعد ازاں بہادر شاہ ظفر کے دور تک آتے آتے اردو زبان نے اپنا مقام حاصل کر لیا۔

بات کچھ طویل ہو گئی، لیکن یہ ذکر ضروری ہے کہ کس طرح پنجاب اور برصغیر کی علمی و سرکاری زبانیں، عوامی زبان سے جدا ہو گئیں۔ میرے نزدیک اس دور کے حکمران طبقے نے خود کو عوام سے علیحدہ رکھنے کے لیے ان کی زبان سے بھی فاصلہ رکھا۔ آج بھی یہی حال ہے؛ عوام پنجابی، سندھی، بلوچی، پشتو یا دیگر مقامی زبانیں بولتے ہیں، جبکہ حکمران طبقہ انگریزی زبان میں گفتگو کرتا ہے۔ آج بھی ریاستی امتحانات انگریزی میں لیے جاتے ہیں، اور حکمران عوامی زبان بولنے سے گریزاں نظر آتے ہیں۔

بابر کی وفات کے بعد تخت نشینی اور ہمایوں کی علمی دلچسپیاں

تاریخ فرشتہ کے مطابق، بابر کی وفات کے بعد ان کی خواہش کے مطابق ہمایوں کو تخت نشینی کا شرف حاصل ہوا۔ نصیرالدین ہمایوں ایک بلند پایہ حکمران تھا، جو اعلیٰ اخلاق اور شائستہ طبیعت کا حامل

تھا۔ اگرچہ وہ عیش وعشرت سے رغبت رکھتا تھا، تاہم وہ علم ودانش کا بھی قدردان تھا، خصوصاً علمِ ریاضی اور نجوم سے گہری دلچسپی رکھتا تھا اور ان علوم میں مہارت رکھتا تھا۔ انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا میں ہمایوں کے بارے میں ایک طویل مضمون پڑھنے کو ملا، جس کا خلاصہ پیشِ خدمت ہے۔

جہاں بابر نے مغل اقتدار کی بنیاد رکھی، وہیں ہمایوں کو ایک مستحکم سلطنت کے بجائے داخلی و خارجی چیلنجز وراثت میں ملے۔ اس نے دو ادوار (1540-1530 اور 1556-1555) میں حکومت کی، تاہم اس کی حکمرانی اکثر داخلی خلفشار اور جنگی مہمات میں گھری رہی۔ ہمایوں کو ایک غیر مستحکم سلطنت ملی، جہاں افغان اور راجپوت قوتیں مغل اقتدار کو محض وقتی فتوحات کی بنیاد پر تسلیم کر رہی تھیں، مگر اس سے مکمل طور پر مطیع نہیں تھیں۔ مغل سلطنت کو گجرات کے سلطان بہادر شاہ کی بغاوت کا سامنا کرنا پڑا، جس نے افغان اور مغل مخالف عناصر کو متحد کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ ہمایوں نے 1535ء میں گجرات پر کامیابی حاصل کی، لیکن بہادر شاہ کی موت سے قبل اس خطرے کا مکمل خاتمہ ممکن نہ ہوسکا۔ اسی دوران، ایک افغان سردار شیر خان (بعد میں شیر شاہ سوری) مشرقی ہندوستان میں اپنی قوت مضبوط کر رہا تھا۔ بالآخر، 1539 میں چوسہ اور 1540 میں قنوج کی جنگوں میں ہمایوں کو فیصلہ کن شکست کا سامنا کرنا پڑا، جس کے نتیجے میں وہ ہندوستان سے جلاوطن ہو گیا۔

جلاوطنی کے سال اور سلطنت کی بحالی

ہمایوں کو جلاوطنی کے دوران مختلف علاقوں میں پناہ تلاش کرنا پڑی۔ اس نے پہلے سندھ اور پھر مارواڑ میں پناہ لینے کی کوشش کی، تاہم وہ زیادہ دیر تک کسی بھی مقام پر قیام پذیر نہ رہ سکا۔ اسی دوران، 1542ء میں اس کا بیٹا جلال الدین محمد اکبر سندھ میں پیدا ہوا۔ بالآخر، 1544ء میں ایران پہنچنے پر صفوی حکمران شاہ طہماسپ نے اسے عسکری مدد فراہم کی۔ اس امداد کے نتیجے میں ہمایوں نے 1545ء میں قندھار پر قبضہ کیا اور کابل پر بھی اپنا اقتدار بحال کیا، اگرچہ اسے اپنے بھائی کامران مرزا کی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔

شیر شاہ سوری کی موت کے بعد اس کے جانشینوں کے درمیان باہمی جنگوں نے مغلوں کے

لیے ایک بار پھر ہندوستان میں واپسی کے دروازے کھول دیے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہمایوں نے فروری 1555ء میں لاہور پر قبضہ کر لیا اور پھر سرہند میں افغان گورنر سکندر کو شکست دے کر جولائی میں دہلی اور آگرہ پر دوبارہ قبضہ کر لیا، یوں مغل سلطنت بحال ہوگئی۔

ہمایوں کی بحالی زیادہ عرصے تک برقرار نہ رہ سکی۔ جنوری 1556ء میں اپنی ذاتی لائبریری کی سیڑھیوں سے گر کر وہ شدید زخمی ہو گیا اور کچھ دن بعد وفات پا گیا۔ اس کا مقبرہ، جو دہلی میں واقع ہے، مغل فنِ تعمیر کا ایک اہم شاہکار ہے اور اسے 1993ء میں یونیسکو کے عالمی ثقافتی ورثے کی فہرست میں شامل کیا گیا۔ مجھے ہمایوں کے مقبرے پر جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ ایک لاجواب عمارت ہے۔ میرے علم کے مطابق، مغل دور کی یہ پہلی بڑی عمارت ہے، جس کے بعد اسی طرزِ تعمیر کو فروغ ملا۔

یہ سب کہنے کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ ہمایوں کو تاریخ میں ایک مہم جو، مگر کمزور حکمتِ عملی کا حامل حکمران تصور کیا جاتا ہے، جس نے سخت حالات کے باوجود مغل اقتدار کی بحالی میں اہم کردار ادا کیا، مگر اپنی زندگی میں سلطنت کو مکمل استحکام نہ دے سکا۔ تاہم، اس کا بیٹا اکبر اعظم ایک مضبوط حکمران کے طور پر مغل سلطنت کو بامِ عروج تک پہنچانے میں کامیاب ہوا۔

میرے خیال میں ہمایوں نے ہمت نہیں ہاری اور ایک مرتبہ پھر مغل اقتدار کی بنیاد رکھی۔ اس بار اس نے اپنے بیٹے اکبر کو ایک مستحکم ریاست سونپی، جو بابر کی وفات کے وقت اس قدر مستحکم نہیں تھی۔

ہمایوں کا ہندوستانی ثقافت اور معیشت پر اثر: ایک تجزیاتی مطالعہ

ہمایوں کا دورِ حکومت (1530-40 اور 1555-56) اگرچہ نسبتاً مختصر اور سیاسی لحاظ سے غیر مستحکم رہا، تاہم اس کے عہد کے کچھ اہم اثرات ہندوستان کی ثقافت اور معیشت پر مرتب ہوئے۔ ان صفحات میں انھی اثرات کا تجزیہ کیا جائے گا۔

مغل فنِ تعمیر کی بنیاد

ہمایوں کے دور میں مغل فنِ تعمیر کے بنیادی عناصر متعارف ہوئے، جو بعد میں اکبر، جہانگیر

اور شاہجہان کے عہد میں اپنی انتہا کو پہنچے۔ اس کا مقبرہ، جو دہلی میں واقع ہے، مغل فنِ تعمیر کا پہلا نمایاں شاہکار سمجھا جاتا ہے اور بعد میں تعمیر ہونے والے تاج محل جیسے عظیم الشان عمارتوں کے لیے بنیاد ثابت ہوا۔ ہمایوں نے اپنے جلاوطنی کے دوران ایک طویل عرصہ ایران میں گزارا، اور جب وہ دوبارہ ہندوستان پر قابض ہوا تو ایرانی معماروں اور فنکاروں کو ہندوستان مدعو کیا۔ اس اقدام سے مغل فنِ تعمیر اور مصوری میں ایک منفرد ایرانی طرز کا امتزاج پیدا ہوا، جو آئندہ ادوار میں مزید ترقی پذیر ہوا۔ مجھے ہمایوں کا مقبرہ دیکھنے کا بھی موقع ملا ہے۔ یہ مقبرہ اس کی بیوی نے بنوایا تھا۔ یہ ایک خوب صورت اور پرشکوہ عمارت ہے جو دید کے قابل ہے۔

مذہبی اثرات اور فارسی زبان کی سرپرستی

تاریخی طور پر مشاہدہ کیا گیا ہے کہ مغل بادشاہوں کا بنیادی عقیدہ سنی اسلام تھا، لیکن ہمایوں کے ایران میں قیام کی وجہ سے کئی شیعہ علماء ہندوستان آئے، جس سے ہندوستان میں شیعہ مسلک کی ترویج ہوئی۔ اسی اثر کی وجہ سے بعد میں جہانگیر کے دور میں شیعہ عقائد کے تناظر میں شیخ احمد سرہندی کو قید کیا گیا۔

ہمایوں کے دور میں ترکی زبان کے بجائے فارسی کو سرکاری زبان کے طور پر اپنایا گیا۔ اس کے بعد مغل دربار میں فارسی زبان و ادب کو غیر معمولی ترقی حاصل ہوئی، اور کئی فارسی اسکالرز اور شعراء ہمایوں کے دربار سے وابستہ رہے۔ یہ ادبی ترقی بعد میں مغل ہندوستان میں فارسی زبان کو ایک مضبوط علمی و ادبی روایت کے طور پر مستحکم کرنے میں معاون ثابت ہوئی۔ یہ وہ بات تھی جس کی تلاش میں، میں تھا کہ مغل اپنی مادری زبان کو کیوں بھول گئے؟

علمی و سائنسی ترقی

ہمایوں کو علمِ نجوم، ریاضی، اور جغرافیہ سے خاص شغف تھا، جس کی بنا پر اس نے اپنے دورِ حکومت میں علماء، مصنفین اور دانشوروں کی سرپرستی کی۔ اس اقدام سے علمی و سائنسی تحقیقات کی راہ ہموار ہوئی، اور مغل دربار میں فارسی و ہندوستانی ثقافت کے امتزاج کی جھلک دیکھی جانے لگی،

جو بعد کے مغل حکمرانوں کے عہد میں مزید نمایاں ہوئی۔

معاشی ترقی اور تجارتی سرگرمیاں

ہمایوں کے دوسرے دورِ حکومت کو ایک پُرامن دور قرار دیا جاتا ہے، جس کے نتیجے میں تجارتی سرگرمیاں بحال رہیں۔ صفوی سلطنت کے ساتھ بہتر تعلقات کے باعث ہندوستان اور ایران کے درمیان تجارتی روابط مضبوط ہوئے۔ مغل دربار میں ایرانی اثر ورسوخ کے تحت قالین بافی، مصوری، اور دیگر دستکاریوں کو فروغ حاصل ہوا، جو بعد میں ہندوستانی معیشت کا ایک اہم جزو بن گیا۔

زرعی اصلاحات اور مالیاتی نظام

ہمایوں کے عہد میں زراعت کے شعبے میں کچھ بنیادی اصلاحات متعارف کرائی گئیں۔ اس نے جاگیرداری نظام کو برقرار رکھتے ہوئے زرعی زمینوں کی تقسیم کے اصول وضع کیے، جو بعد میں اکبر کے دور میں مزید مستحکم ہوئے۔ ہمایوں نے اپنے نام کے سکے بھی جاری کیے، تاہم اس کے مالیاتی نظام کو شیر شاہ سوری کے زیادہ مؤثر نظام نے پیچھے چھوڑ دیا، جو بعد میں مغل معیشت کے لیے ایک مضبوط بنیاد ثابت ہوا۔

یہ سب جان کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمایوں کے دورِ حکومت کا ہندوستانی ثقافت اور معیشت پر سب سے نمایاں اثر فارسی اثرات کا فروغ تھا، جو بعد کے مغل حکمرانوں کے طرزِ حکمرانی کو گہرے انداز میں متاثر کرتا رہا۔ اگرچہ اس کا عہد سیاسی اور عسکری چیلنجز میں گھرا رہا، لیکن اس نے فارسی زبان، فنِ تعمیر، اور علمی روایات کو ہندوستانی ثقافت میں متعارف کرانے میں ایک کلیدی کردار ادا کیا۔ اس کے بیٹے اکبر نے انھی بنیادوں پر ایک مستحکم مغل سلطنت کی تشکیل کی، جسے ہندوستان کی تاریخ میں ایک سنہری دور کے طور پر جانا جاتا ہے۔

اکبر کا دورِ حکومت

مغل سلطنت کا عروج اور تاریخی اہمیت

اکبر کا پورا نام ابوالفتح جلال الدین محمد اکبر تھا، اور وہ مغل بادشاہ ہمایوں کا بیٹا تھا۔ مورخین کے مطابق، اکبر بادشاہ کا دورِ حکومت مغلیہ سلطنت کی تاریخ میں ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے عہد میں ایسے اقدامات کیے گئے جو نہ صرف اس کے پیشروؤں میں نظر نہیں آتے ہیں بلکہ اس کے جانشینوں نے بھی انھیں مکمل طور پر اختیار نہیں کیا۔ اکبر نے اپنی طویل حکمرانی کے دوران ایک نئے مذہبی نظریے کی بنیاد رکھی اور دیگر مذاہب کے پیروکاروں کے ساتھ رواداری اور ہم آہنگی کا عملی مظاہرہ کیا۔ مجھے اکبر کے مزار پر جانے کا موقع بھی ملا، جو آگرہ کے نواح میں سکندرہ کے مقام پر واقع ہے۔

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ مغلیہ سلطنت کے چھ اہم حکمران بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہجہان اور اورنگزیب عالمگیر میں سے صرف ہمایوں دہلی میں مدفون ہے، جبکہ دیگر مختلف مقامات پر سپردِ خاک کیے گئے۔ بابر کا مزار کابل میں، جہانگیر کا لاہور میں، شاہجہان کا آگرہ میں، اکبر کا سکندرہ میں، اور اورنگزیب عالمگیر کا دکن میں واقع ہے۔ اکبر کے مزار کی عظمت اور جلالت بے مثال ہے، جو اس کی وسیع حکمرانی اور شاندار سلطنت کی علامت کے طور پر قائم ہے۔ اکبر نے اپنے دورِ حکومت کے دوران لاہور کو بھی اپنی سلطنت کا ایک اہم مرکز بنایا، اور اس کے عہد کی بیشتر حکمرانی کا دائرہ پنجاب کے وسیع علاقوں پر محیط رہا۔ مجھے ان چھ میں سے پانچ کے مزار دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ تاریخی طور پر، میں دہلی کو بھی پنجاب کا ایک حصہ تصور کرتا ہوں، کیونکہ موجودہ دور میں بھی

دہلی کے اطراف میں ہریانہ کا خطہ واقع ہے، جو ماضی میں متحدہ پنجاب کا ایک اہم حصہ رہا ہے۔ اس موضوع پر اس کتاب میں نے کئی جگہ بات کی ہے۔ میرے نزدیک جمنا سے لے کر سندھ (اٹک) تک کا علاقہ، ہزارہ اور ہمالیہ کے دامن سے لے کر راجستھان اور سندھ کے علاقے پنجاب کا حصہ ہیں۔ دہلی کو انگریزوں نے الگ کر کے ایک وفاقی علاقہ قرار دیا تھا۔

اکبر کے عہدِ حکومت کے سیاسی، ثقافتی، اقتصادی اور سماجی اثرات کا تفصیلی جائزہ آئندہ حصے میں پیش کیا جائے گا۔ یہ بھی ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ میں نے ابوالفضل کی تصنیف اکبر نامہ کا مکمل مطالعہ کیا ہے، جو تقریباً 1600 صفحات پر مشتمل ایک مفصل تاریخی دستاویز ہے۔ اس کے مطالعے کے بعد، میں نے اس کا ایک مختصر خلاصہ بھی تحریر کیا، جو تقریباً 50 صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ تحریر میری ابتدائی علمی کاوشوں میں سے ایک ہے، جو کتابچے کی صورت میں شائع کی جائے گی۔

اکبر نامہ کے مطالعے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اکبر اپنی طرزِ حکمرانی، مذہبی رواداری، اور انتظامی مہارت کے لحاظ سے دیگر مغل بادشاہوں سے نمایاں طور پر مختلف تھا۔ آئندہ حصے میں اس کے عہد کی خصوصیات پر مزید تفصیل سے روشنی ڈالی جائے گی۔

اکبر کی حیات اور حکمرانی کے بنیادی ماخذ

مغل شہنشاہ اکبر کی زندگی اور حکمرانی سے متعلق سب سے مستند معلومات اکبرنامہ سے حاصل ہوتی ہیں، جو اس کے درباری مؤرخ ابوالفضل نے تحریر کیں۔ اس کے علاوہ تاریخِ فرشتہ میں بھی اکبر کے عہد پر تفصیلی بحث موجود ہے۔ مزید برآں، انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا میں اکبر کی شخصیت اور طرزِ حکمرانی پر ایک جامع مضمون دستیاب ہے۔ ان کے علاوہ بھی متعدد تاریخی کتب اکبر کے دورِ حکومت اور اس کی پالیسیوں کے مطالعے کے لیے نہایت مفید ہیں۔

اکبر کی زندگی پر کئی فلمیں بھی بنائی گئی ہیں، جن میں مغلِ اعظم کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔

ابتدائی زندگی اور تخت نشینی

جب ہمایوں جلاوطنی کے ایام گزار رہا تھا، تو وہ عمرکوٹ (موجودہ سندھ) میں ایک ہندو

سردار کے ہاں مقیم تھا۔اسی دوران، 1542ء میں اکبر کی پیدائش ہوئی۔بعدازاں، اکبر 1605ء میں آگرہ میں وفات پا گیا۔اس کا دورِحکومت 1556ء سے 1605ء تک محیط تھا، جوتقریباً پچاس برس پر مشتمل ہے۔اس عرصے میں مغلیہ سلطنت نے برصغیر کے بیشتر علاقوں پر اقتدار قائم کرلیا تھا۔

اکبر کی حکمرانی: اتحاد اور اصلاحات

اکبر نے اپنی سلطنت میں استحکام اور ہم آہنگی کو برقرار رکھنے کے لیے متعدد اصلاحات متعارف کرائیں۔ان میں سب سے متنازع اس کا مذہبی نظریہ دینِ الٰہی تھا،جس کے ذریعے اس نے مختلف مذاہب کے پیروکاروں کو متحد کرنے کی کوشش کی۔اسی پالیسی کے نتیجے میں اکبر کو غیر مسلم طبقات کی حمایت اور وفاداری حاصل ہوئی۔اس کے علاوہ، اس نے انتظامی اصلاحات کیں، جن میں مرکزی مالیاتی نظام کا قیام، ٹیکس کے منظم نظام کی تشکیل، اور درباری نظم و نسق کو مستحکم کرنا شامل ہے۔

اکبر کے دربار میں ہندو، پارسی، عیسائی، اور مسلم علماء و مفکرین موجود رہتے تھے، جو اس کی مذہبی رواداری اور علمی دلچسپی کی عکاسی کرتے ہیں۔اگرچہ وہ خود رسمی تعلیم سے محروم تھا، لیکن اس نے علماء، شعرا، مصوروں اور موسیقاروں کی سرپرستی کی، اور اپنے دربار کو ثقافتی ترقی کا مرکز بنا دیا۔

اکبر کی تخت نشینی اور ابتدائی چیلنجز

ہمایوں نے شیر شاہ سوری کے جانشینوں کو شکست دے کر اپنی حکومت بحال کی، مگر چند ہی سال بعد 1556ء میں اس کا انتقال ہوگیا۔اس وقت اکبر محض تیرہ برس کا تھا، اور اسے تخت پر بٹھا دیا گیا۔ابتدائی دور میں مغلیہ سلطنت کو شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا، خاص طور پر افغان سرداروں اور مقامی ہندو راجاؤں کی طرف سے۔تاہم، مغل فوج نے 1556ء میں پانی پت کی دوسری جنگ میں ہیمو کو شکست دے کر اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا، جس کے بعد سلطنت میں نسبتی استحکام پیدا ہوا۔

ہیمو، یا ہیم چند وکرمادتیہ (Hemu Chand Vikramaditya)، ایک ہندو سپہ سالار اور منتظم تھا جو شیر شاہ سوری کے جانشینوں کے دور میں افغان سلطنتِ سور کے تحت ابھرا۔

وہ ہندوؤں میں ایک طاقتور اور نایاب تاریخی شخصیت کے طور پر جانا جاتا ہے کیونکہ وہ مغلوں کے خلاف ایک بڑی فوجی قوت کے طور پر ابھرا اور دہلی کے تخت پر مختصر وقت کے لیے براجمان بھی ہوا۔ ہیمو کا تعلق ایک ہندو بنیے (تاجر) خاندان سے تھا اور وہ ریواڑی (موجودہ ہریانہ) میں پیدا ہوا۔ یاد رہے کہ ہیمو بھی ایک پنجابی تھا جو ایک غیر ملکی قابض حکمران کے خلاف جنگ کر رہا تھا۔

جب ہمایوں 1555ء میں دوبارہ دہلی پر قابض ہوا اور جلد ہی 1556ء میں وفات پا گیا، تو ہیمو نے اس موقع کو غنیمت جانا۔

اس نے دہلی اور آگرہ پر قبضہ کر کے خود کو ''وکرمادتیہ'' کے لقب سے بادشاہ قرار دے دیا، جو کہ قدیم ہندو روایات میں ایک طاقتور لقب تھا۔ وہ پہلا غیر مسلم حکمران تھا جس نے مغلیہ دور کے بعد دہلی پر حقیقی قبضہ حاصل کیا (اگرچہ مختصر وقت کے لیے)۔

اکبر کے دور میں مغلوں نے ہیمو کی بڑھتی ہوئی طاقت کو ایک سنجیدہ خطرہ سمجھا۔ 1556ء میں پانی پت کی دوسری جنگ میں، جو اکبر کی کم عمری کے دورِ اقتدار کی پہلی بڑی جنگ تھی، مغل افواج کی قیادت بیرم خان نے کی، جب کہ ہیمو خود اپنی فوج کی قیادت کر رہا تھا۔ جنگ کے دوران ہیمو کو ایک تیر آنکھ میں لگا، جس سے وہ شدید زخمی ہو کر ہوش کھو بیٹھا۔ اس کے بیہوش ہونے کے بعد اس کی فوج کا حوصلہ ٹوٹ گیا اور وہ شکست کھا گئی۔

بعد ازاں، ہیمو کو گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا، اور مغل سلطنت نے دہلی پر دوبارہ قبضہ جما لیا۔

آج بھی ہیمو ہندو مزاحمت کی ایک علامت کے طور پر جانا جاتا ہے۔ وہ آخری غیر مسلم حکمران تھا جس نے دہلی پر اقتدار قائم کیا۔ اس کی شکست کے بعد مغلوں کی حکمرانی مستحکم ہوئی اور اکبر نے ایک طویل دورِ حکومت کا آغاز کیا۔

ابتدائی طور پر اکبر کی حکمرانی پنجاب اور دہلی کے نواحی علاقوں تک محدود تھی۔ اس کی سلطنت کے استحکام میں اس کے مشیر اور اتالیق، بیرم خان کا کلیدی کردار رہا۔ تاریخی طور پر بھی مغل حکمرانوں کا اصل اقتدار پنجاب میں ہی مضبوط رہا، جبکہ دیگر علاقوں میں ان کا اثر و

رسوخ قدرے محدود تھا۔

مہمات اور فتوحات

وقت گزرنے کے ساتھ، اکبر نے ہندوستان کے ایک وسیع حصے پر اپنی حکمرانی قائم کر لی۔ اس نے عسکری اور سفارتی حکمتِ عملیوں کو یکجا کرتے ہوئے مختلف علاقوں کو فتح کیا۔ اس کی پالیسی میں فتح کے ساتھ ساتھ مفاہمت کا عنصر بھی شامل تھا، اور وہ دشمنی کے بجائے اتحاد پر یقین رکھتا تھا۔ اکبر نے متعدد مقامی حکمرانوں سے دوستانہ تعلقات قائم کیے، ان کے ساتھ رشتہ داریاں استوار کیں، اور جاگیریں عطا کر کے ان کی حمایت حاصل کی۔

اکبر نے راجپوت سرداروں کے ساتھ خصوصاً مفاہمانہ حکمتِ عملی اپنائی۔ انھیں ان کے آبائی علاقوں پر حکمرانی کی اجازت دی گئی، بشرطیکہ وہ مغل اقتدار کو تسلیم کریں، خراج ادا کریں، وقتِ ضرورت فوج فراہم کریں، اور شاہی خاندان سے رشتہ داری قائم کریں۔ تاہم، اکبر ایک سخت گیر حکمران بھی ثابت ہوا، خاص طور پر جب 1568ء میں اس نے چتوڑ کے قلعے پر قبضہ کیا اور شدید خونریزی کی۔ چتوڑ کی فتح کے بعد دیگر راجپوت حکمرانوں نے اکبر کی بالادستی کو تسلیم کر لیا، اگرچہ میواڑ کی مزاحمت 1583ء تک جاری رہی۔

سیاست، رواداری، اور ثقافت

یہ تمام واقعات اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ اکبر کی حکمرانی کا دور محض عسکری فتوحات کا زمانہ نہیں تھا، بلکہ یہ سفارت کاری، حکومتی استحکام، اور بین المذاہب ہم آہنگی کا بھی ایک اہم عہد تھا۔ اکبر نے مفاہمت اور عسکری فتوحات پر مبنی پالیسی اختیار کی۔ وہ تنازعات کے بجائے سفارتی تعلقات اور اتحاد پر یقین رکھتا تھا۔ اس نے اپنی رعایا کے مفادات کا خیال رکھا، مختلف طبقات کے ساتھ ازدواجی تعلقات قائم کیے، اور اہم شخصیات کو جاگیریں عطا کیں۔

اکبر نے خاص طور پر راجپوت سرداروں کے ساتھ جاگیردارانہ پالیسی اپنائی، جس کے تحت انھیں اپنے آبائی علاقوں پر حکمرانی کی اجازت دی گئی، بشرطیکہ وہ اسے شہنشاہ تسلیم کریں، خراج ادا

کریں، وقتِ ضرورت فوجی مدد فراہم کریں، اور مغل شاہی خاندان سے رشتہ داری قائم کریں۔

تاہم، تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبر بعض مواقع پر سخت گیر حکمران بھی ثابت ہوا۔ مثال کے طور پر، میواڑ میں طویل مزاحمت کے بعد 1568ء میں اس نے چتوڑ کے تاریخی قلعے (موجودہ چتوڑ گڑھ) پر قبضہ کیا، جس کے نتیجے میں وہاں کے باشندوں کا قتلِ عام ہوا۔ اگرچہ میواڑ نے مغل اقتدار کو تسلیم نہیں کیا، تاہم چتوڑ کی شکست نے دیگر راجپوت حکمرانوں کو 1570ء میں اکبر کی بالادستی قبول کرنے اور سیاسی و ازدواجی اتحاد پر آمادہ ہونے پر مجبور کر دیا، اگرچہ مارواڑ کی ریاست نے 1583ء تک مزاحمت جاری رکھی۔

اکبر نامہ کی روشنی میں اکبر کا طرزِ حکمرانی

اکبر نامہ کے مطابق، اکبر کے طرزِ حکمرانی کی نمایاں خصوصیات میں سے ایک اس کے دربار میں ہندو، بالخصوص راجپوت سرداروں کی شمولیت تھی۔ اس کے عہد میں راجپوت شہزادے مغل حکومت کے اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز ہوئے، جس کی بدولت اسے اپنی انتظامیہ میں ہندوؤں کی غیر معمولی حمایت حاصل رہی، جو اس سے قبل کسی بھی مسلمان حکمران کے لیے ممکن نہ ہو سکی تھی۔ یہی امر اکبر کی سلطنت کے استحکام اور توسیع میں معاون ثابت ہوا۔

اکبر نے 1572ء میں گجرات کو فتح کیا، جو اپنی بندرگاہوں کی بدولت ایک اہم تجارتی مرکز تھا۔ اس مہم کے نتیجے میں مغل سلطنت کے لیے بیرونی دنیا کے ساتھ تجارتی راستے ہموار ہوئے۔ اپنے دورِ حکومت کے آخری برسوں میں اس نے کشمیر، سندھ، اور قندھار کو بھی اپنی سلطنت میں شامل کیا۔

تاہم، اس کے اقتدار کے آخری ایام میں اس کا بیٹا، شہزادہ سلیم (جو بعد میں شہنشاہ جہانگیر بنا)، بغاوت پر آمادہ تھا، جس کے باعث اکبر کو شدید ذہنی کوفت کا سامنا کرنا پڑا۔ جہانگیر نامہ کے مطابق، شہزادہ سلیم نے ایک موقع پر کھلم کھلا بغاوت کی، لیکن بعد ازاں اس نے اکبر سے معافی مانگ کر صلح کر لی۔

اکبر کی انتظامی اصلاحات: جس کی قدر آج بھی کی جاتی ہے

اکبر سے پہلے بابر اور ہمایوں کا دور ایک طرح سے انتشار کا دور تھا۔ اس کے برعکس، اکبر

کا زمانہ، ابتدائی چند سالوں کو چھوڑ کر، ایک پُرامن دور مانا جا سکتا ہے۔ اس دور میں جنگیں تو ضرور ہوئیں، لیکن سیاسی انتشار نہیں تھا۔ اس وجہ سے اکبر کو کئی اصلاحات کرنے کا موقع ملا، جن کا ایک مختصر ذکر کچھ یوں ہے۔

اکبر نے حکم دیا کہ اس کی حکومت میں ہر افسر کو وہ خود مقرر کرے گا۔ اس کے دور میں ایک منفرد نظام وضع کیا گیا۔ اس نے 10 افراد کے کمانڈر سے لے کر 5,000 افراد کے کمانڈر تک درجہ بندی کی۔ مغل شہزادوں کو اعلیٰ عہدے الاٹ کیے گئے۔ افسروں کو یا تو شہنشاہ کے خزانے سے نقد ادائیگی کی جاتی تھی یا وہ محصول اکٹھا کر کے تنخواہ حاصل کرتے تھے۔ سیاسی طور پر، اس نظام کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ یہ نظام محنتی، قابل اور بااثر افراد کے لیے ایک پرکشش کیریئر بن گیا۔ اس طرح، اکبر بہت سے راجپوت شہزادوں کی وفادار خدمات کو شامل کرنے کے قابل ہوا۔

اس کے دور میں مرکزی مالیاتی نظام کی بنیاد رکھی گئی۔ اس نے ہر صوبائی گورنر (صوبہ دار، جسے بعد میں نواب کہا جانے لگا) کے ساتھ ایک سول ایڈمنسٹریٹر (دیوان) کو بھی متعین کیا، جو محصولات کی وصولی کی نگرانی کرتا تھا، حسابات تیار کرتا تھا، اور براہِ راست شہنشاہ کو رپورٹ کرتا تھا۔ اس نے یہ بھی بندوبست کیا کہ ہر اہم واقعے کی باقاعدہ رپورٹ اسے ملتی رہے۔ میں نے اکبر نامہ میں یہ بھی پڑھا ہے کہ اکبر مصوروں، شاعروں، موسیقاروں اور اسکالرز کی سرپرستی کرتا تھا۔ اس کے علاوہ، وہ ٹیکنالوجی کی ترقی میں بھی دلچسپی رکھتا تھا۔

اکبر کا دربار ایک پُرتعیش اور شاندار دربار تھا۔ وہ جسمانی طور پر مضبوط تھا اور مہمات میں مشکلات کا مقابلہ بھی کرتا تھا۔ اگرچہ وہ ناخواندہ تھا، لیکن وہ ایک طاقتور اور ذہین دماغ کا مالک تھا۔ اس نے اپنے دربار میں مسلم علمائے کرام کو قائل کیا کہ وہ اسے اسلامی قانون کے ان نکات پر ثالث کے طور پر قبول کریں، جو ان کے درمیان تنازعے کا سبب بنتے تھے۔ اس اقدام کو مسلمان علماء نے بے حد ناپسند کیا۔ اس نے مسلمانوں، ہندوؤں، پارسیوں اور عیسائیوں کے

درمیان مذہبی مباحثوں کی بھی حوصلہ افزائی کی۔ اکبر کا جاری کردہ دینِ الٰہی، جو ایک نئی سوچ تھی، میں خود اکبر کو ایک مرکزی مقام حاصل تھا۔ یہ ایک سیاسی چال ہو سکتی ہے، مگر مذہبی نہیں۔۔۔ یہ میرا ذاتی خیال ہے، ممکن ہے درست نہ ہو۔

یہ سب جان کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اکبر کے دور میں جہاں ایک ثقافتی تصادم موجود تھا، وہیں سیاسی تصادم بھی عروج پر تھا۔ مذہبی اختلافات بھی پائے جاتے تھے۔ ایسے ماحول میں ہندوستان جیسے ایک وسیع ملک میں ایک مضبوط، خیر خواہ، روادار اور روشن خیال حکمران کی ضرورت تھی، جسے اکبر نے سمجھا اور اسے پورا کیا۔

ہندوستانی سماج، ثقافت اور معیشت پر بادشاہ اکبر کے اثرات

اکبر کے اکیاون سالہ دورِ حکومت میں ہندوستانی سماج پر کئی گہرے اثرات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس کا ایک مختصر ذکر کچھ یوں ہے۔

مذہبی رواداری اور سماجی ہم آہنگی

اکبر نے ہندوستانی معاشرے میں عالمی امن کی خاطر کئی اقدامات کیے، جن میں مذہبی رواداری سب سے اہم ہے۔ اس نے اپنے پیشروؤں کے برعکس غیر مسلموں پر جزیہ ٹیکس ختم کر دیا اور بین المذاہب مکالمے کی حوصلہ افزائی کی۔ اس کے دربار میں ہندو، جین، سکھ اور عیسائی علماء شامل تھے، جس سے ایک دوسرے کو سمجھنے میں آسانی ہوئی۔

امتیازی طرزِ عمل کا خاتمہ

اکبر نے ہندوؤں کو اعلیٰ عہدے دیے۔ راجپوت شہزادیوں کے ساتھ اس کی شادی کے اتحاد نے ہندو مسلم تعلقات کو مزید مضبوط کیا۔

سماجی اصلاحات

اکبر نے ہندوستانی سماج کے سماجی ڈھانچے کو بہتر بنانے کے لیے اہم کوششیں کیں۔ یہ بھی ایک اہم بات ہے کہ اکبر نے ستی کے رواج کی مخالفت کی اور بچپن کی شادی کی حوصلہ شکنی کی۔ مزید

برآں، اس نے خواتین کو بعض اقتصادی اور سماجی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی اجازت دے کر ان کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے اقدامات متعارف کروائے۔

مغل فنِ تعمیر کی ترقی

اکبر کے دور میں مغل فنِ تعمیر کو عروج ملنا شروع ہوا۔ وہ اس فن کا ایک عظیم سرپرست تھا۔ اس کے دور میں فتح پور سیکری، بلند دروازہ، اور ہمایوں کا مقبرہ جیسی عظیم الشان یادگاروں کی تخلیق ہوئی۔ لاہور کے شاہی قلعے میں بھی اس نے کئی عمارتیں تعمیر کروائیں۔

ادب اور زبان کا فروغ

اکبر کے دورِ حکومت میں فارسی سرکاری عدالتی زبان بن گئی، لیکن اس نے ہندی اور سنسکرت جیسی مقامی زبانوں کے فروغ کی بھی حمایت کی۔ اکبر نامہ اور آئین اکبری، جو ابوالفضل نے تحریر کیے، سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نظامِ حکومت کس قدر مضبوط تھا۔ اکبر نے متعدد زبانوں میں مخطوطات کے وسیع ذخیرے کے ساتھ ایک لائبریری بھی قائم کی۔

موسیقی اور فنون کا فروغ

اکبر موسیقی کا پرجوش حامی تھا۔ ہندوستانی تاریخ کے عظیم ترین موسیقاروں میں سے ایک، تان سین، اس کے دربار سے منسلک تھا۔ اس نے ہندوستانی کلاسیکی موسیقی کی سرپرستی کی اور نئے راگوں اور موسیقی کے اسلوب کو فروغ دیا، جو آج بھی اثر انداز ہیں۔

زرعی اصلاحات

اکبر نے اہم زرعی اصلاحات متعارف کروائیں۔ اس نے زمین کی زرخیزی اور پیداواری صلاحیت کی بنیاد پر زمینی محصولات کی وصولی کو معیار بنایا۔

تجارت اور معیشت

اکبر کے دورِ حکومت میں ہندوستان کی تجارت میں نمایاں اضافہ ہوا۔ اس نے محفوظ تجارتی راستے قائم کیے، بنیادی ڈھانچے کو بہتر بنایا، اور فارس، وسطی ایشیا اور یورپ کے ساتھ تجارت کو

فروغ دیا۔وزن اور پیمائش کی معیاری کاری نے ہموار تجارتی لین دین میں سہولت فراہم کی۔

کرنسی اور مالی استحکام

اکبر نے یکساں کرنسی کا نظام متعارف کروا کر مالیاتی نظام کی اصلاح کی،جس میں روپیہ اور دام کے سکے شامل تھے۔اس سے معیشت مستحکم ہوئی اور تجارت میں سہولت پیدا ہوئی۔اس کی مالی پالیسیوں نے بعد کے مغل دورِ حکومت میں معاشی خوشحالی کی بنیاد رکھی۔

یہ تمام عوامل مدنظر رکھتے ہوئے، یہ کہنا مناسب ہوگا کہ بادشاہ اکبر کا عہد ہندوستانی تاریخ میں ایک دورِ انقلاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی پالیسیوں نے نہ صرف مذہبی رواداری کو فروغ دیا بلکہ ثقافتی ورثے کو تقویت بخشی اور اقتصادی ترقی کو مہمیز دی۔مختلف روایات کے امتزاج اور مؤثر انتظامی اصلاحات کے ذریعے، اس نے ایک مستحکم،خوشحال، اور متحد مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھی۔اس کی وراثت آج بھی ہندوستانی سماج، ثقافت اور طرزِ حکمرانی پر اپنے دیرپا اثرات مرتب کر رہی ہے۔

❀❀❀

جہانگیر (1627ء-1569ء)

مغل بادشاہت کا ایک اہم دور جب سکھ دشمنی کا آغاز ہوا

جہانگیر (1627-1569ء) مغل سلطنت کا چوتھا بادشاہ تھا، جس نے 1605ء سے 1627ء تک حکومت کی۔ اس کا پورا نام نورالدین محمد جہانگیر تھا، اور وہ شہنشاہ اکبر اعظم کا بیٹا تھا۔ وہ فنونِ لطیفہ، ثقافت اور عدل وانصاف میں دلچسپی رکھنے والا فرمانروا تھا۔ اس کے دور میں اکبر کی کئی پالیسیوں کا تسلسل جاری رہا۔ اس نے سلطنت کے نظم ونسق اور نظامِ عدل کو مزید مستحکم کیا اور ایرانی طرزِ تعمیر کو فروغ دیا۔ اس کی اہلیہ نور جہاں، جس کا مقبرہ لاہور میں جہانگیر کے مقبرے کے قریب واقع ہے، مغل سیاست میں نہایت بااثر شخصیت بن کر ابھریں۔ جہانگیر کو اپنے بیٹے شہزادہ خرم (جو بعد میں شاہجہان کہلایا) کی بغاوت کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی کے دور میں برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستان میں تجارت کی اجازت دی گئی۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ وہ واحد مغل بادشاہ ہے جس کی تدفین لاہور میں ہوئی۔

جہانگیر نے شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ کو گوالیار کے قلعے میں قید بھی کیا، اور اسی کے عہد میں سکھوں پر شدید مظالم ڈھائے گئے۔ اس نے اپنی سوانح عمری تزکِ جہانگیری کے نام سے تحریر کی، جو ایک عمدہ تاریخی دستاویز ہے۔ میں نے اس کتاب کا مطالعہ کیا ہے اور اس سے کئی حقائق سیکھنے کو ملے۔ اس کے علاوہ انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا اور تاریخِ فرشتہ میں بھی اس دور کے متعلق تفصیلی معلومات درج ہیں۔ انھی ذرائع کی مدد سے جو کچھ معلوم ہوا، وہ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

جہانگیر 1569ء میں فتح پور سیکری میں پیدا ہوا اور 12 اکتوبر 1627ء کو کشمیر جاتے ہوئے انتقال کر گیا۔ وہ 1605ء سے 1627ء تک ہندوستان کا ایک بااثر حکمران رہا۔ شہزادہ سلیم اس کا

ابتدائی لقب تھا۔ وہ اکبر کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ ایک موقع پر اس نے اپنے والد کے خلاف بغاوت کی، مگر بعد میں باپ بیٹے میں صلح ہوگئی۔ اکبر کی وفات کے بعد جہانگیر نے تخت سنبھالا۔ ابتدا میں اسے اپنے بیٹے خسرو مرزا کی بغاوت کا سامنا کرنا پڑا، جسے اس نے کامیابی سے ختم کیا۔ روایت ہے کہ اس نے اپنے محل کے باہر سونے کی زنجیر لٹکائی تاکہ عوام براہِ راست انصاف کے لیے بادشاہ سے رجوع کر سکیں۔ اسی بنا پر اس کے عدل کو ''عدلِ جہانگیری'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

جہانگیر نے ایک ایرانی خاتون نور جہاں سے شادی کی، جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سلطنت میں نہایت بااثر شخصیت بن گئیں۔ وہ عدالتی و انتظامی امور میں بھی سرگرم رہیں۔ ان کا بھائی آصف خان بھی ایک کلیدی منصب پر فائز رہا۔ جہانگیر کے دور کی ایک مشہور جنگ میواڑ کی جنگ ہے، جو رانا امر سنگھ کے خلاف لڑی گئی۔ طویل مزاحمت کے بعد امر سنگھ نے 1615ء میں مغل بالادستی تسلیم کر لی۔ قندھار پر صفویوں کے قبضے کے بعد جہانگیر نے ایرانیوں کے خلاف مہم چلائی اور قندھار کو دوبارہ حاصل کر لیا۔ اسی دور میں پرتگالیوں نے ہُگلی (بنگال کی اہم بندرگاہ) پر قبضہ کر لیا، جس کے جواب میں 1615ء میں جہانگیر نے فوجی کارروائی کا حکم دیا اور مغل افواج نے پرتگالیوں کو شکست دی۔

ایک مرتبہ جہانگیر کو ایک موقع پر اس کے جرنیل مہابت خان نے اغوا بھی کیا۔ جہانگیر کا دور سیاسی استحکام، ثقافتی ترقی اور یورپی اثر و رسوخ کے آغاز کے حوالے سے نمایاں ہے۔ تزکِ جہانگیری میں درج ہے کہ وہ شراب اور افیون کے استعمال کا عادی تھا۔ اس نے فارسی ثقافت، فنونِ لطیفہ، ادب اور مصوری کی سرپرستی کی۔ اس کی کتاب میں فارسی اشعار کی کثرت ملتی ہے، جو اس کی ادبی ذوق کی علامت ہے۔

شہنشاہ جہانگیر کے دور کے سماجی، ثقافتی، اقتصادی اور مذہبی اثرات

جہانگیر کی پالیسیوں نے ہندوستانی سماج، طرزِ حکمرانی اور روزمرہ زندگی کو گہرے انداز میں متاثر کیا۔ آگرہ کے قلعے میں نصب زنجیرِ عدل عوامی انصاف کی ایک علامت تھی۔ اس

نے اکبر کے دور کی فلاحی پالیسیوں کو جاری رکھا، جن میں جبری مشقت کی ممانعت اور کسانوں سے بہتر برتاؤ شامل تھا۔

جہانگیر کے عہد میں پہلی بار خواتین، بالخصوص ملکہ نور جہاں کی بدولت، سیاست، انتظامیہ اور تجارت میں متحرک کردار ادا کرتی نظر آئیں۔ بیوگان کی دوبارہ شادی کی حمایت اور کم عمری کی شادیوں کی حوصلہ شکنی کی گئی، مگر یہ اصلاحات صرف شاہی و اشرافیہ طبقے تک محدود رہیں۔ جہانگیر نے یورپی اقوام سے سفارتی اور تجارتی روابط کو فروغ دیا۔ مغربی آلات، شیشے کے برتن اور مصوری ہندوستان میں رائج ہوئے۔ اس کے دور میں متعدد تعمیراتی منصوبے بھی مکمل ہوئے، مثلاً شالیمار باغ (کشمیر)، اکبر کا مقبرہ (آگرہ) اور بابر کا مقبرہ (کابل)۔

معاشی لحاظ سے بھی اس کا دور خاص اہمیت رکھتا ہے۔ بیرونی تجارت کو فروغ دیا گیا، جس کے نتیجے میں پرتگالی، انگریز اور ڈچ تاجروں کو تجارتی چوکیوں کے قیام کی اجازت دی گئی۔ 1615ء میں سر تھامس رو نے اس کے دربار کا دورہ کیا، جس کے نتیجے میں سورت میں انگریزوں کو تجارتی مرکز قائم کرنے کی اجازت ملی۔ اس کے ساتھ ہی فارس، وسطی ایشیا اور سلطنتِ عثمانیہ سے تجارت میں بھی اضافہ ہوا۔ ذرائع آمد و رفت کو بہتر بنایا گیا، کرنسی نظام کو مضبوط کیا گیا، اور نئے سکے جاری کیے گئے۔

جہانگیر کی مذہبی پالیسی ایک پیچیدہ امتزاج تھی۔ رواداری اور ظلم و ستم دونوں اس کے طرزِ عمل میں دکھائی دیتے ہیں۔ شیخ احمد سرہندیؒ کی گرفتاری ایک اہم واقعہ تھا۔ بعض مورخین کے مطابق نور جہاں نے شیعہ اسلام کی حمایت کی، جس کے نتیجے میں اہلِ سنت علماء، خصوصاً شیخ احمد سرہندیؒ سے کشیدگی پیدا ہوئی۔ اسی طرح گرو ارجن دیوؒ (پانچویں سکھ گرو) کو 1606ء میں شہزادہ خسرو کی حمایت کے الزام میں سزائے موت دی گئی، جس سے سکھوں اور مغلوں کے تعلقات میں شدید تناؤ پیدا ہوا۔ یہ واقعہ بعد میں اورنگزیب عالمگیر کے دور میں مغل سلطنت کے لیے ایک بڑی آزمائش بن کر ابھرا، اور سکھوں کی مزاحمت نے مغلیہ سلطنت کے زوال میں اہم کردار ادا کیا۔

اورنگزیب عالمگیر
مغلیہ سلطنت کا آخری مقتدر حکمران

اورنگزیب عالمگیر (1707-1618) ہندوستان کا چھٹا مغل شہنشاہ تھا، جس نے 1658ء سے 1707ء تک تقریباً پچاس برس حکومت کی۔ وہ شہنشاہ شاہ جہاں کا بیٹا تھا۔ اس نے اقتدار اپنے بھائیوں سے جنگ کر کے حاصل کیا تھا۔ اس کے دور میں مغل سلطنت ایک وسیع علاقے پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی شخصیت کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ وہ جہاں ایک طرف ذاتی طور پر نیک اور پرہیز گار مانا جاتا ہے، وہیں اس کے دور میں مذہبی رواداری کا وہ سلسلہ، جو اکبر کے عہد میں شروع ہوا تھا، ختم ہوتا نظر آتا ہے۔

اس کا دور مذہبی قدامت پرستی، طویل فوجی مہمات، اور علاقائی طاقتوں بشمول مراٹھوں، راجپوتوں اور سکھوں کی بڑھتی ہوئی مزاحمت کی وجہ سے بھی جانا جاتا ہے۔ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اورنگزیب عالمگیر کے عہد میں مغل حکومت کا دائرہ دکن تک وسیع ہو گیا تھا۔ اس دور میں افغانستان کا بیشتر حصہ، کشمیر، بنگال سمیت کئی اہم علاقے مغل سلطنت میں شامل تھے۔

جب میں یہ تحریر لکھ رہا تھا، انھی دنوں میں نے پڑھا کہ اورنگ آباد سے تقریباً 25 کلومیٹر دور خلد آباد قصبے میں، اورنگزیب عالمگیر کے مقبرے کو گرانے کے لیے پورے مہاراشٹر میں مظاہرے کیے جا رہے ہیں۔ اس پر کئی مقامات پر جھڑپیں بھی ہوئیں۔ یہ سب کچھ اس کے ہندوؤں کے خلاف کیے گئے اقدامات کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ یاد رہے کہ کسی اور مغل بادشاہ کے خلاف ہندوؤں کی طرف سے ایسی کوئی تحریک کبھی نہیں اٹھی۔

ان بادشاہوں نے جو کچھ کیا، کیا وہ اسلام کے اصولوں کے مطابق تھا؟ میرے خیال میں

ایسا نہیں تھا۔ کسی بھی مذہب کی عبادت گاہ کو گرانا، وحشیانہ طریقے سے قتل کرنا، لوٹ مار کرنا یہ کسی بادشاہ کا اپنی ریاست کو بچانے کا حیلہ تو ہوسکتا ہے، لیکن اسلام کی تبلیغ کا طریقہ ہرگز نہیں۔ سب مسلمان بادشاہوں نے ایسا نہیں کیا، مگر جس نے بھی کیا، درست نہیں کیا۔

اورنگزیب عالمگیر کے دور کے چند اہم واقعات

اپنے پیش رووں کے برعکس، اورنگزیب عالمگیر کا رویّہ غیر مسلموں کے ساتھ چند معاملات میں سخت تھا۔ اس کے دور میں کئی ہندو مندروں کی تباہی کا ذکر ملتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس نے بعض ثقافتی روایات کا خاتمہ کیا۔ دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کے عہدِ حکومت میں اس کی انتظامیہ میں بہت سے ہندو افسران شامل تھے۔ اس کی یہ شہرت آج تک قائم ہے کہ وہ اسلامی قانون (شریعت) کی سختی سے پابندی کرتا تھا۔ اس کا دور جنگی نوعیت کا تھا، جس کی وجہ سے باوجود اس کے کہ اس نے کئی مالی اور فوجی اصلاحات نافذ کیں، اس کی سلطنت مالی بحران کا شکار رہی۔

میرے خیال میں اگر آپ اس دور کا تجزیہ کریں تو معلوم ہوگا کہ مراٹھے اور سکھ دو ایسی طاقتیں تھیں جنھوں نے اورنگزیب عالمگیر کے خلاف بھرپور مزاحمت کی۔ جیسے ہی اس کی وفات ہوئی، یہی دونوں قوتیں مغل سلطنت کے زوال کا پیش خیمہ بنیں۔ پنجاب میں سکھ برادری نے، گرو گوبند سنگھ کی قیادت میں، مغل حکومت کے خلاف شدید مزاحمت کی۔ اورنگزیب عالمگیر کا انتقال 1707ء میں، 88 سال کی عمر میں، احمد نگر میں ہوا۔ اس کے بعد اس کا کوئی بھی جانشین ایسا نہ تھا جو اس کی قائم کردہ وسیع سلطنت کو برقرار رکھ سکتا۔

اورنگزیب عالمگیر کے بارے میں ایک اہم کتاب

اورنگزیب عالمگیر کے بارے میں ایک مفصل کتاب مشہور بنگالی مورخ جدوناتھ سرکار (Jadunath Sarkar) نے Maasir-i-'Alamgiri: A History of the Emperor Aurangzib-'Alamgir تصنیف کی ہے۔ اس کتاب میں اورنگزیب عالمگیر کے حالاتِ زندگی کو نہایت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ (یہ کتاب انٹرنیٹ پر بھی دستیاب ہے۔) جدوناتھ

کے مطابق اورنگزیب عالمگیر نے تقریباً انچاس (49) برس ہندوستان پر حکومت کی۔ ان کے دور میں مغلیہ سلطنت اپنی وسیع ترین حدود تک پہنچ گئی، جو نہ اس سے پہلے ممکن ہو سکا تھا اور نہ اس کے بعد۔ وہ ہندوستان کی تاریخ کے آغاز سے لے کر برطانوی اقتدار کے عروج تک، ہندوستان میں قائم ہونے والی سب سے بڑی واحد ریاست کا حکمران تھا۔ اورنگزیب عالمگیر کی سلطنت غزنی سے چاٹگام، کشمیر سے کرناٹک تک پھیلی ہوئی تھی، جس میں لداخ اور مالابار جیسے دور دراز علاقے بھی شامل تھے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ ان کی سلطنت رقبے کے لحاظ سے اشوکا اور گپتا حکمرانوں کی سلطنتوں سے بھی زیادہ وسیع تھی۔ جدوناتھ سرکار لکھتے ہیں کہ جیسے ہی اورنگزیب عالمگیر نے آنکھیں بند کیں، مغلیہ سلطنت دیوالیہ ہو چکی تھی۔ اس کا انتظامی ڈھانچہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گیا تھا اور کئی مقامی سرداروں نے آزادی کا اعلان کر دیا تھا۔

میرے خیال میں اس وقت دہلی کے تخت پر پانچ بڑی طاقتیں حملہ آور تھیں: مراٹھے، انگریز، راجپوت، جاٹ اور سکھ۔ ان سب نے مل کر مغلیہ سلطنت کو زوال پذیر کیا۔ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اورنگزیب عالمگیر کی وفات کے بعد تقریباً ڈیڑھ سو سال تک مغلیہ سلطنت کمزور ضرور رہی، لیکن کسی نہ کسی شکل میں قائم ضرور رہی۔

اورنگزیب عالمگیر نامہ: ایک مختصر تاریخی ماخذ

اورنگزیب عالمگیر کے حکم پر 1688ء میں مرزا محمد کاظم بن محمد امین منشی، جو پادشاہ نامہ کے مصنف بھی تھے، نے ایک نئی تاریخ مرتب کرنا شروع کی۔ اس کتاب میں اورنگزیب کے دورِ حکومت کے ابتدائی دس برسوں کی مفصل تاریخ درج ہے۔ اگرچہ اس کتاب میں بادشاہت کے بتیسویں سال تک کے حالات بھی شامل کیے گئے، تاہم جب یہ کتاب اورنگزیب عالمگیر کو پیش کی گئی تو اس نے اسے مزید جاری رکھنے کی اجازت نہیں دی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کتاب میں ان کی بے حد تعریف کی گئی تھی اور ان کے نیک اعمال کو نمایاں انداز میں بیان کیا گیا تھا، اس لیے انھوں نے اس کی اشاعت سے اجتناب کیا تاکہ ان کے باطنی تقویٰ کو نمایشی شکل نہ دی جائے۔

یہ کتاب فارسی زبان میں ہے اور انٹرنیٹ پر دستیاب ہے۔ مجھے اس کا صرف انگریزی ترجمہ ہی دستیاب ہوا۔ تاہم، یہ ایک نہایت مفید کتاب ہے جو اس دور کے حالات جاننے میں بے حد مددگار رہے۔

اورنگزیب عالمگیر اور اسلامی پالیسی

اورنگزیب عالمگیر کی اسلامی پالیسیوں کے بارے میں ایک تحقیقی مضمون ''Islami Policy of Aurangzeb Alamgir (1658-1707)'' کے عنوان سے ڈاکٹر کشور سلطانہ اور صباء ریاض نے تحریر کیا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے اورنگزیب کی اسلامی پالیسیوں کا دفاع کیا ہے۔

ان کے مطابق برصغیر پاک و ہند پر حکومت کرنے والا آخری بڑا مسلم خاندان مغل خاندان (1526-1857) تھا۔ اس سے قبل مسلم حکمرانی کا آغاز 712ء میں محمد بن قاسم کی فتحِ سندھ اور ملتان سے ہوا۔ بعدازاں سلطان شہاب الدین غوری نے مسلم سلطنت کو شمالی ہندوستان اور بنگال تک وسعت دی، جس کے بعد قطب الدین ایبک نے دہلی سلطنت کی بنیاد رکھی۔

مغل بادشاہوں نے دہلی سلطنت کی اسلامی پالیسیوں کو جاری رکھا، البتہ جلال الدین اکبر کے دور میں کچھ نئے رجحانات سامنے آئے۔ ان رجحانات کی شیخ احمد سرہندی (مجدد الف ثانی) نے شدید مخالفت کی، اور یہ بحث اورنگزیب کے دور تک جاری رہی۔ اورنگزیب نے 1658ء میں اقتدار سنبھالا اور سلطنت کو اسلامی شریعت کے مطابق چلانے کی بھرپور کوشش کی۔ دارا شکوہ اور اورنگزیب کے درمیان جانشینی کی جنگ کو اکثر لبرل اور قدامت پسند اسلامی نظریات کا تصادم قرار دیا جاتا ہے، جس میں اورنگزیب کامیاب ہوا۔ انھوں نے اسلامی قوانین نافذ کیے اور فتاویٰ عالمگیری جیسا عظیم فقہی مجموعہ مرتب کروایا، جو آج بھی اسلامی قانون کا اہم حوالہ ہے۔

اگرچہ اورنگزیب نے دربار میں اصلاحات کیں اور حکمتِ عملی سے حکومت کو مستحکم کیا، لیکن ہندو، جاٹ، سکھ اور مراٹھہ قوتوں نے ان کی سلطنت کے خلاف مزاحمت شروع کر دی۔ یہ سب

قوتیں اکبر کی نرم پالیسیوں کی وجہ سے پہلے ہی منظم ہو چکی تھیں۔ اسلامی قوانین کے نفاذ اور سیاسی استحکام کے باوجود مختلف مزاحمتی تحریکوں نے مغلیہ سلطنت کو کمزور کیا۔

یہ مضمون بھی قابلِ مطالعہ ہے۔ اس کے مطابق اورنگزیب پر لگائے گئے کئی الزامات بے بنیاد ہیں۔ تاہم، دوسری جانب سکھ اور ہندو مؤرخین اورنگزیب کو اپنے مذاہب کا سب سے بڑا دشمن تصور کرتے ہیں۔

فتاویٰ عالمگیری: فقہِ حنفی کا عظیم ذخیرہ

فتاویٰ عالمگیری ایک عظیم فقہی مجموعہ ہے، جو مغل شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر کے حکم پر حنفی مکتبِ فکر سے وابستہ علماء کی کوششوں سے تیار کیا گیا۔ اس کی تدوین کے لیے دنیا بھر سے 500 علماء کو مدعو کیا گیا، جن میں 300 برصغیر، 100 عراق اور 100 حجاز سے تعلق رکھتے تھے۔ شیخ نظام (لاہور کے ممتاز فقیہ) کو اس منصوبے کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ کئی برسوں کی محنت کے بعد ایک مربوط اسلامی ضابطۂ قانون تیار کیا گیا، جو بعد ازاں مغلیہ سلطنت میں نافذ ہوا۔ یہ کتاب عربی زبان میں مرتب کی گئی اور اس میں شخصی، خاندانی، معاشی، معاشرتی، اور دیگر فقہی موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس کے مصادر میں قرآن مجید، احادیث مبارکہ (صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابو داؤد، جامع ترمذی) شامل ہیں۔

یہ کتاب اب دس جلدوں میں دستیاب ہے اور آج بھی حنفی فقہ کے حوالے سے برصغیر میں ایک مستند اور معیاری حوالہ سمجھی جاتی ہے۔

اورنگزیب عالمگیر: ہندوستانی ثقافت، معاشرت، معیشت اور مذہب پر اثرات

میں نے پچھلے صفحات میں مغل شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر کے بارے میں ایک مختصر تحریر لکھی ہے، جس کا مقصد ان کے بارے میں چند بنیادی معلومات آپ کی خدمت میں پیش کرنا تھا۔ میرا اصل موضوع ان کے ہندوستانی تہذیب، بالخصوص پنجاب پر گہرے اور دیرپا اثرات کا جائزہ لینا ہے۔ یہی اس کتاب کا مرکزی موضوع ہے۔ جو کچھ میں جان سکا، وہ پیش خدمت ہے۔

ثقافتی اثرات: اورنگزیب عالمگیر کا دورِ حکومت مغلوں کی ثقافتی سرپرستی میں ایک نمایاں تبدیلی کا مظہر تھا۔ جہاں اکبر، جہانگیر اور شاہ جہاں کے عہد میں فن و ثقافت کو فروغ ملا، وہیں اورنگزیب عالمگیر نے بعض ثقافتی سرگرمیوں پر سختی کی، جس کے نتیجے میں دربار کی روایتی ثقافتی زندگی میں زوال آیا۔ یہ طرزِ عمل ان سے پہلے کے مغل بادشاہوں کے برعکس تھا۔ وہ خود نہایت مذہبی تھا اور شراب کو ہاتھ تک نہیں لگاتا تھا۔ اس نے موسیقی، رقص اور مصوری وغیرہ پر پابندی لگا دی، جس کے باعث کئی فنکار اور موسیقار دربار چھوڑ کر دیگر علاقوں میں منتقل ہو گئے، اور یوں مغل دربار کی ثقافتی رونق ماند پڑ گئی۔

مندر اور عبادت گاہوں کی مسماری: یہ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے کئی ہندو مندروں کو مسمار کیا یا انھیں مساجد میں تبدیل کر دیا، جن میں کاشی وشوناتھ مندر (وارانسی) اور کرشنا جنم بھومی مندر (متھرا) شامل ہیں۔ ان اقدامات کے باعث ہندوؤں اور مغل سلطنت کے درمیان ثقافتی اور مذہبی کشیدگی نے جنم لیا، جو آج تک کسی نہ کسی صورت میں جاری ہے۔

مغل فنِ تعمیر: اگرچہ اورنگزیب نے شاہی تفریحی اخراجات پر پابندیاں عائد کیں، تاہم فارسی خطاطی اور اسلامی فنِ تعمیر کی سرپرستی جاری رکھی۔ لاہور کی بادشاہی مسجد اور اورنگ آباد میں ''بی بی کا مقبرہ'' جیسے شاندار تعمیراتی نمونے ان کے دور میں مکمل ہوئے، جو آج بھی ان کے دور کی حسین یادگاریں سمجھے جاتے ہیں۔

سماجی اثرات: اورنگزیب کی سماجی پالیسیاں انتظامی بہتری کے ساتھ ساتھ سماجی اضطراب کا بھی سبب بنیں۔ ان کے دورِ حکومت میں غیر مسلموں پر مختلف سماجی پابندیاں عائد کی گئیں، جنھوں نے معاشرے میں بے چینی کو جنم دیا۔ یہ بے چینی بعد ازاں مغل سلطنت کے زوال میں ایک اہم عنصر ثابت ہوئی۔

مقامی لوگوں کا امورِ ریاست سے دور ہونا: اکبر اور جہانگیر کے عہد میں راجپوت، مراٹھے اور دیگر مقامی طبقات کو مغل انتظامیہ میں شامل کیا گیا تھا، لیکن اورنگزیب کی سخت گیر پالیسیوں

کے باعث یہ طبقات حکومت سے دور ہوتے چلے گئے، جس کے نتیجے میں ان کی مزاحمت میں اضافہ ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے دور میں سلطنت مسلسل جنگی حالت میں رہی۔

ہندو رسوم و رواج پر پابندیاں: یہ بات مکمل تحقیق طلب ہے، لیکن اکثر ہندو مؤرخین لکھتے ہیں کہ اورنگزیب نے جزیہ (غیر مسلموں پر عائد ٹیکس) دوبارہ نافذ کیا، جسے اکبر نے ختم کر دیا تھا۔ علاوہ ازیں، دیوالی اور ہولی جیسے مذہبی تہواروں پر بھی پابندیاں لگائی گئیں۔

معاشی اثرات: اورنگزیب کی طویل فوجی مہمات اور مذہبی پالیسیوں نے ہندوستانی معیشت پر ملے جلے اثرات ڈالے۔ سلطنت مسلسل مالی بحران کا شکار رہی۔ دکن میں مراٹھوں کے خلاف مستقل جنگوں نے خزانے کو خالی کر دیا، اور معیشت عدم استحکام کا شکار ہوئی۔

زرعی نظام پر منفی اثرات: کسانوں پر بھاری ٹیکس عائد کیے گئے، جس کے باعث زرعی پیداوار متاثر ہوئی۔ خاص طور پر دکن میں بغاوتوں اور افلاس میں اضافہ ہوا۔

تجارتی ترقی اور تحدیدات: اورنگزیب نے یورپی تاجروں کے ساتھ تجارتی تعلقات برقرار رکھے۔ سورت، بنگال اور مدراس جیسے بندرگاہی شہر تجارتی سرگرمیوں کے اہم مراکز بنے رہے، اگرچہ ان پر بعض اوقات سختیاں بھی کی گئیں۔

سکھوں اور ہندوؤں کے خلاف اقدامات: انھوں نے سکھوں کے نویں گرو، گرو تیغ بہادر کو جبری مذہبی تبدیلیوں کے خلاف مزاحمت پر پھانسی دے دی، جس کے نتیجے میں سکھوں میں عسکری رجحان پیدا ہوا۔ شیواجی جیسے ہندو رہنماؤں کی مزاحمت بھی بڑھ گئی، جس سے دکن میں کئی دہائیوں پر محیط تنازعات جنم لیتے رہے۔ ان کی مذہبی عدم رواداری نے ہندوستانی معاشرے کو تقسیم کر دیا، جس کے نتیجے میں مراٹھوں، سکھوں، راجپوتوں اور دیگر مقامی قوتوں کے لیے مغل سلطنت کو چیلنج کرنا آسان ہو گیا۔ یہی وہ عوامل تھے جو بعد ازاں سلطنت کے زوال کا سبب بنے۔

یہ سب جان کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اورنگزیب عالمگیر کی حکمرانی کے ہندوستانی تاریخ پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ اگرچہ انھوں نے سلطنت کو اپنی وسیع ترین جغرافیائی

حدود تک پہنچایا، لیکن ان کی سخت گیر مذہبی اور سماجی پالیسیوں نے سیاسی، سماجی اور ثقافتی ہم آہنگی کو نقصان پہنچایا، اور یوں سلطنت اندر سے کمزور ہوگئی، جس سے برطانوی نوآبادیاتی حکمرانی کے لیے راہ ہموار ہوئی۔

حال ہی میں بی بی سی نے اورنگزیب عالمگیر پر ایک مضمون شائع کیا، جس کا عنوان تھا: [1]

''مغل بادشاہ اورنگزیب کی پونے تیرہ روپے میں بنی قبر کے خلاف انڈیا میں احتجاج اور ہنگامے کیوں؟''

اس مضمون کا خلاصہ کچھ یوں ہے:

مغل بادشاہ اورنگزیب کے خلاف نفرت ہندوستان میں بڑھ رہی ہے، خاص طور پر مہاراشٹر میں، جہاں ان کے مقبرے کو مسمار کرنے کی مہم زور پکڑ رہی ہے۔ حالیہ بالی وڈ فلم چھاوا میں اورنگزیب کو ظالم اور ہندو مخالف دکھائے جانے کے بعد یہ تنازع شدت اختیار کر گیا ہے۔ ناگپور میں ہندو گروپوں کے مظاہروں کے دوران تشدد، آگ زنی اور کرفیو نافذ کیا گیا۔ حکمران جماعت بی جے پی اور شیوسینا کے کچھ رہنما مقبرہ گرانے کی حمایت کر رہے ہیں، جبکہ اپوزیشن نے حکومت پر فرقہ وارانہ سیاست کرنے کا الزام عائد کیا ہے۔

اورنگزیب نے 49 سال حکومت کی اور 1707ء میں وفات پائی۔ انھیں مہاراشٹر کے خلد آباد میں دفن کیا گیا، جہاں اُن کی قبر سادہ اور بغیر نقش و نگار کے بنائی گئی تھی۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں وہ مراٹھوں سے نبرد آزما رہے، جو مغلیہ زوال کی بڑی وجہ بنے۔ مورخین میں ان کی شخصیت پر شدید اختلاف ہے۔ کچھ انھیں متعصب، ظالم اور مندر شکن حکمران سمجھتے ہیں، جبکہ دوسرے انھیں رحمدل اور انصاف پسند کہتے ہیں۔ بعض شواہد کے مطابق انھوں نے ہندو مندروں کو مالی امداد بھی دی اور کئی ہندو وزراء کو اعلیٰ عہدے دیے۔

یہ تنازع اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ تاریخ کے پیچیدہ کرداروں کو آج کی سیاست میں فرقہ وارانہ مقاصد کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔

---

[1] https//:www.humsub.com.pk/583830/مغل-بادشاہ-اورنگزیب-کی-پونے-تیرہ-روپے

اورنگزیب پر ایک کتاب لکھنے والی مصنفہ آدرے ٹرسکی نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے کہ مرنے سے پہلے اورنگزیب نے اپنے بیٹوں کو متعدد خطوط لکھے تھے۔ بعض خطوط میں انھوں نے ایک بادشاہ کی حیثیت سے اپنی خامیوں اور کوتاہیوں پر افسوس کا اظہار کیا۔ مرنے سے کچھ دن قبل انھوں نے لکھا:

''میں ایک اجنبی کی طرح آیا اور ایک اجنبی کی طرح جا رہا ہوں۔''

عالمگیر کے مقبرے کے انہدام کا مطالبہ

حال ہی میں بھارت کے اُس شہر میں، جہاں مغل بادشاہ اورنگزیب عالمگیر کا مقبرہ واقع ہے، ایک نئی تحریک نے جنم لیا ہے جس کا مطالبہ ہے کہ بادشاہ کی قبر کو وہاں سے ختم کر دیا جائے۔ اس موضوع پر مختلف آراء سامنے آئیں، اور عالمی نشریاتی ادارے سی این این نے بھی اس تناظر میں ایک تفصیلی مضمون شائع کیا، جس کا خلاصہ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

وہ ضلع جہاں عالمگیر مدفون ہیں، تاریخی طور پر اورنگ آباد کہلاتا تھا، اور یہ نام خود اورنگزیب نے تجویز کیا تھا۔ بعدازاں، سیاسی تبدیلیوں کے زیر اثر، اس کا نام تبدیل کر کے ''چھترپتی سمبھا جی نگر'' رکھا گیا، جو مراٹھا رہنما شیوا جی کے بیٹے کے نام پر ہے۔ حالیہ برسوں میں بھارتی سیاسی بیانیے میں یہ رجحان نمایاں ہوا ہے کہ تاریخ کو ازسرنو ترتیب دے کر اسے مخصوص نظریاتی سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس عمل میں تاریخ کو اس کے اصل سیاق و سباق سے کاٹ کر اس میں افسانوی رنگ بھرنے کی کوشش کی جاتی ہے، جس سے بعض اوقات فرقہ وارانہ تناؤ جنم لیتا ہے۔

اسی طرح، مذکورہ علاقے میں حال ہی میں ہندو مسلم کشیدگی اُس وقت شدت اختیار کر گئی جب چند ہندو تنظیموں نے مغل بادشاہ کے مقبرے کو گرانے کا مطالبہ کیا۔ دوسری جانب، اگرچہ بھارتیہ جنتا پارٹی (بی جے پی) بظاہر اس بات کی تردید کرتی ہے کہ وہ مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لیے مغل حکمرانوں کے ناموں کا استعمال کر رہی ہے، مگر زمینی حقائق اس کے برعکس نظر آتے ہیں۔ موجودہ حکومت کے بعض بیانات اور اقدامات مذہبی اقلیتوں، بالخصوص مسلمانوں، میں عدم تحفظ اور اضطراب کا باعث بن رہے ہیں۔

یہ امر اپنی جگہ درست ہے کہ اورنگزیب ایک پیچیدہ شخصیت کے حامل تھے، جن کے عہد کو مکمل طور پر سمجھنا سہل نہیں۔ تاہم یہ امر بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ایک ایسے دور میں حکمران تھے جب نہ موجودہ ہندوستان کا سیاسی تصور تھا، نہ کوئی آئینی نظام، نہ پارلیمنٹ اور نہ ہی جمہوریت۔ لہٰذا ان کی شخصیت اور طرزِ حکومت کا تجزیہ اُس وقت کے تاریخی، سیاسی اور سماجی تناظر میں ہی مناسب طریقے سے کیا جا سکتا ہے۔

دلچسپ امر یہ ہے کہ جہاں ایک جانب ناگپور میں اُن کے مقبرے کو ہٹانے کے مطالبات کیے جا رہے ہیں، وہیں خود ہندو قوم پرست حلقوں کے بعض اراکین نے ان مطالبات کی مخالفت بھی کی ہے۔ سی این این کے مضمون میں ایک جملہ خاص طور پر توجہ طلب ہے، جسے اس کے اصل انگریزی متن میں پیش کرنا زیادہ موزوں ہوگا:

Neither praise nor blame

یہ ایک ایسا نکتہ ہے جو کسی بھی تاریخی شخصیت کے غیر جانبدارانہ مطالعے کے لیے رہنمائی فراہم کر سکتا ہے۔

❀❀❀

اکبر تا عالمگیر

مغل حکمرانوں کا غیر مسلم رعایا سے سلوک اور اس کے سیاسی وسماجی اثرات

تاریخی شواہد اس امر کی تائید کرتے ہیں کہ مغل شہنشاہ اکبر اعظم (حکومت: 1556ء-1605ء) کی طویل اور کامیاب حکمرانی کا ایک نمایاں سبب اُس کی مفاہمتی حکمت عملی اور سیاسی بصیرت تھی، جس کے ذریعے اُس نے اپنے دشمنوں کو دوستوں میں تبدیل کر کے ایک مستحکم اور ہم آہنگ سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اکبر نے نہ صرف عسکری میدان میں فتوحات حاصل کیں بلکہ داخلی استحکام کے لیے ایسے اقدامات کیے جنھوں نے ریاست کو دیرپا سیاسی وحدت اور سماجی ہم آہنگی عطا کی۔ اس کی سب سے مؤثر حکمت عملی وہ تھی جسے ''صلحِ کُل''، یعنی ''عالمگیر امن'' کے تصور کے تحت عملی جامہ پہنایا گیا۔ یہ پالیسی مذہبی رواداری، سماجی اشتراک اور سیاسی شمولیت پر مبنی تھی۔

اکبر کی مفاہمتی حکمت عملی کے تحت نہ صرف اُس کے سابقہ دشمن، جیسے راجپوت حکمران، افغان سردار، اور دیگر باغی عناصر کو معاف کیا گیا، بلکہ انھیں سلطنت کے انتظامی ڈھانچے میں باعزت مقام دیا گیا۔ انھیں مناصب اور جاگیریں عطا کی گئیں، جس سے وہ ریاست کے مخالفین سے ریاست کے محافظوں میں تبدیل ہو گئے۔

اکبر کی راجپوت پالیسی اُس کی سیاسی ذہانت کی واضح مثال ہے۔ اُس نے راجپوت ریاستوں کو عسکری طاقت سے کچلنے کے بجائے ان کے ساتھ سیاسی اتحاد قائم کیے۔ راجپوت سرداروں کو مغلیہ دربار میں اہم عہدے دیے گئے، اور ازدواجی تعلقات کے ذریعے باہمی اعتماد کو فروغ دیا گیا۔ راجہ مان سنگھ اس حکمت عملی کا درخشاں مظہر تھے، جو اکبر کے قریبی مشیر اور معتمد جرنیلوں میں شمار کیے جاتے تھے۔

اس کے ساتھ ساتھ اکبر نے مذہبی رواداری کو بھی اپنی پالیسی کا بنیادی ستون بنایا۔ اُس نے غیر مسلم رعایا پر عائد جزیہ ٹیکس ختم کیا، اور دیگر مذاہب کے پیروکاروں، مثلاً ہندوؤں، جینوں، زرتشتیوں اور عیسائیوں کو نہ صرف فکری مکالمے میں شامل کیا بلکہ انھیں انتظامیہ میں بھی جگہ دی۔ اس رویے نے مختلف مذہبی برادریوں کے درمیان باہمی احترام اور ریاست کے لیے وفاداری کے جذبات کو فروغ دیا۔

اکبر کی ازدواجی حکمت عملی بھی اُس کی مفاہمتی سوچ کی عکاس تھی۔ اُس نے مختلف ممتاز غیر مسلم خاندانوں، خصوصاً راجپوت شہزادیوں سے شادیاں کیں، جن میں جودھا بائی نمایاں ہیں۔ ان ازدواجی اتحادوں نے دیرینہ دشمنیوں کے خاتمے میں کلیدی کردار ادا کیا اور باہمی سیاسی اعتماد کو تقویت دی۔

مزید برآں، اکبر کا ایک اور اہم سیاسی پہلو معافی اور اعتماد سازی کا تھا۔ وہ بغاوت کرنے والے سرداروں کو معاف کر کے انھیں دوبارہ ریاستی نظام میں شامل کرتا، بشرطیکہ وہ اطاعت قبول کرتے۔ متعدد افغان اور ازبک رئیس، جو ابتدا میں مخالف تھے، بعد ازاں سلطنت کے کلیدی مناصب پر فائز ہوئے، جس سے ریاستی استحکام کو مزید وسعت ملی۔

یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اکبر کی مفاہمتی پالیسی نہ صرف دشمنوں کو زیر کرنے کا مؤثر طریقہ تھی، بلکہ اُس نے ایک ایسی ریاست کی بنیاد رکھی جو جامع، کثیر المذاہبی اور کثیر النسلی تھی۔ اس میں مختلف طبقات نے رضاکارانہ طور پر شرکت کی، جس کے نتیجے میں مغلیہ سلطنت کو سیاسی استحکام، سماجی ہم آہنگی اور جغرافیائی توسیع کے نئے افق میسر آئے۔ اکبر کا یہ ماڈل برصغیر کی سیاسی تاریخ میں ایک منفرد اور مؤثر حکمرانی کی مثال بن گیا۔

یہ امر واضح رہے کہ اس تجزیے کا مقصد اکبر اعظم کے مذہبی تصورات یا کسی نئے مذہب کے قیام کی حمایت نہیں ہے، بلکہ یہاں صرف اُس کی سیاسی حکمت عملی، مفاہمتی طرزِ حکومت، اور ریاستی استحکام کے لیے اپنائے گئے اقدامات کا غیر جانب دارانہ جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

جہانگیر اور اورنگزیب کی سخت گیر پالیسیوں کا جائزہ

اکبر اعظم کی حکمرانی کو جہاں مذہبی رواداری، سیاسی مصالحت، اور دشمنوں کو اتحادیوں میں تبدیل کرنے کی حکمت عملی کا مظہر سمجھا جاتا ہے، وہیں اس کے برعکس جہانگیر (1605-1627) اور اورنگزیب عالمگیر (1658-1707) کی پالیسیوں میں سخت گیری، مذہبی شدت پسندی اور محدود سیاسی شمولیت کے عناصر نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان دونوں حکمرانوں نے اپنی طرزِ حکمرانی میں ایسی روش اپنائی جس کے اثرات برصغیر کی غیر مسلم برادریوں، خصوصاً ہندوؤں اور سکھوں، پر دور رس اور گہرے انداز میں مرتب ہوئے۔

جہانگیر کے دور میں صوفی سلسلوں اور خاص طور پر سکھ مت کے ساتھ تعلقات تناؤ کا شکار رہے۔ اس کا سب سے واضح ثبوت گرو ارجن دیو جی (پانچویں سکھ گرو) کی گرفتاری اور بعد از اں قتل ہے، جس نے مغل ریاست اور سکھ برادری کے درمیان ایک مستقل خلیج پیدا کر دی۔

عالمگیر نے اکبر کی ''صلحِ کل'' کی روادارانہ پالیسی کو ترک کرتے ہوئے ریاست کو سخت گیر مذہبی اصولوں، بالخصوص اسلامی شریعت، کی بنیاد پر تشکیل دینے کی کوشش کی۔ اُس کے عہد میں مذہبی اقلیتوں پر کئی امتیازی اقدامات کیے گئے، جن میں جزیہ کا دوبارہ نفاذ، مندروں کی مسماری، اور مذہبی آزادیوں پر پابندیاں شامل تھیں۔ ان اقدامات نے اکثریتی ہندو آبادی اور سکھ برادری کو مغلیہ اقتدار سے مزید دور کر دیا۔ سکھ رہنما گرو تیغ بہادر کی موت اس دور کی ایک اور سنگین مثال ہے، جس نے سکھوں کو عسکری مزاحمت کی طرف مائل کر دیا۔

اسی طرح راجپوتوں کے ساتھ اکبر کے قائم کردہ پرامن تعلقات بھی اورنگزیب کے دور میں بگڑ گئے، اور میواڑ، مراٹھوں و دیگر علاقائی قوتوں کے ساتھ مغل سلطنت کے تعلقات شدید کشیدگی کا شکار ہو گئے۔ نتیجتاً، مختلف مزاحمتی تحریکیں ابھریں، جن میں سب سے اہم سکھوں کی عسکری تنظیم، خالصہ تحریک تھی، جس کی بنیاد گرو گوبند سنگھ نے رکھی۔

یہ تمام حقائق اس نتیجے کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ جہانگیر اور اورنگزیب کی حکمرانی میں

سیاسی مفاہمت اور رواداری کے بجائے سختی، مذہبی یکسانیت اور عدم شمولیت کا رجحان غالب رہا۔ ان پالیسیوں نے ریاست کے سماجی تانے بانے کو کمزور کیا، اقلیتوں کو حکومت سے بیگانہ کیا، اور مغلیہ سلطنت کے اندرونی استحکام کو نقصان پہنچایا۔

تاریخ کا یہ باب ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ ایک کثیر المذہبی، کثیر النسلی معاشرے میں سیاسی استحکام، دیرپا حکمرانی اور قومی ہم آہنگی کے لیے رواداری، وسعتِ نظر، اور شمولیتی حکمتِ عملی ناگزیر ہوتی ہے۔

جہاں تک ان پالیسیوں کے ''درست'' یا ''نادرست'' ہونے کا تعلق ہے، یہ ایک ایسا پہلو ہے جس کا تعین ہر قاری اپنے تاریخی فہم، زاویۂ نگاہ اور مطالعے کی بنیاد پر خود کر سکتا ہے۔ میری ذمہ داری صرف تاریخی حقائق کو غیر جانب دارانہ انداز میں پیش کرنا ہے۔ یہاں قاری کا مقصد صرف یہ تھا کہ میں آپ کے سامنے حقائق رکھوں؛ ان سے میرا متفق ہونا ضروری نہیں۔

عالمگیر کی وفات کے بعد بہادر شاہ ظفر کے دہلی سے روانگی تک

یہاں میں ایک اور بات بھی آپ کی معلومات کے لیے رکھنا چاہتا ہوں، جس سے آپ کو اس دور کے حالات کا جائزہ لینے میں مدد مل سکتی ہے۔ عالمگیر کی وفات کے بعد 151 سال میں کون لوگ دہلی کے تخت پر براجمان ہوئے؟

عالمگیر (اورنگ زیب) کی وفات 1707ء میں ہوئی، اور اس کے بعد سے لے کر 1857ء کی جنگِ آزادی تک مغل سلطنت زوال پذیر ہوتی گئی۔ اس دوران کئی مغل بادشاہ تخت نشین ہوئے، جن میں سے بیشتر کی حکومت کمزور، مختصر یا محض رسمی حیثیت رکھتی تھی۔ ذیل میں عالمگیر کے بعد سے بہادر شاہ ظفر دوئم تک کے مغل بادشاہوں کی مختصر تاریخی ترتیب اور مدتِ حکومت درج کی گئی ہے۔ بابا بندہ سنگھ بہادر کی موت (1716ء) کے بعد برصغیر، بالخصوص پنجاب، ایک طویل سیاسی، عسکری اور سماجی تبدیلی کے عمل سے گزرا۔ اس تناظر کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ مغلیہ سلطنت کے ان بادشاہوں کا مختصر جائزہ لیا جائے جنھوں نے 1707ء سے 1857ء کے درمیانی عرصے میں تختِ دہلی پر باری باری حکومت کی۔

عالمگیر کے بعد بہادر شاہ اول (1707-1712) تخت نشین ہوا۔ وہ ایک نسبتاً بردبار اور معتدل مزاج حکمران تھا، مگر اس کی حکمرانی کا دور داخلی سیاسی چیلنجز اور مذہبی بغاوتوں سے خالی نہ تھا۔ اسی کے عہد میں بابا بندہ سنگھ بہادر نے سرہند پر حملہ کیا، جہاں مغل فوج کو شکست ہوئی اور وزیر خان مارا گیا۔ اس کے بعد جہاندار شاہ (1712-1713)، جو بہادر شاہ اول کا بیٹا تھا، برسرِ اقتدار آیا۔ اس کا دورِ حکومت ایک سال سے بھی کم عرصے پر محیط رہا، اور وہ درباری سازشوں کا شکار ہو کر اقتدار سے محروم ہو گیا۔ فرخ سیر (1713-1719) ایک باصلاحیت اور سیاسی شعور رکھنے والا حکمران تھا، تاہم جلد ہی وہ طاقتور درباری امراء، بالخصوص سید برادران، کے زیر اثر آ گیا۔ یہی وہ دور تھا جب بابا بندہ سنگھ بہادر کو انتہائی سفاکانہ انداز میں شہید کیا گیا۔ اس کے بعد رفیع الدرجات (1719) نے محض دو ماہ حکومت کی۔ وہ بھی سید برادران کی پشت پناہی سے تخت پر بٹھایا گیا۔ اسی سال رفیع الدولہ (شاہ جہاں ثانی) چند ماہ کے لیے بادشاہ بنا مگر جلد ہی وفات پا گیا۔

محمد شاہ (1719-1748) نے طویل ترین عرصہ حکومت کی، اور اسی دوران نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کر کے شہر کو بے مثال تباہی سے دوچار کیا۔ محمد شاہ کو بعد ازاں ''رنگیلا'' کے لقب سے یاد کیا جانے لگا۔ اس کے دور میں مغلیہ سلطنت کے زوال کا عمل تیزی سے شروع ہوا۔ احمد شاہ بہادر (1748-1754) محمد شاہ کا جانشین تھا، جسے مراٹھوں اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ ان حملوں کے مقابلے میں کامیاب دفاع نہ کر سکا۔ عالمگیر ثانی (1754-1759) بھی اندرونی سازشوں کا شکار ہوا۔ اگرچہ وہ نام کا بادشاہ تھا، مگر حقیقی اقتدار اس کے ہاتھ میں نہیں تھا۔ اس کے بعد شاہ جہاں سوم (1759-1760) محض ایک سال کے لیے تخت نشین کیا گیا۔ اس کا اقتدار محض علامتی حیثیت رکھتا تھا۔

شاہ عالم ثانی (1760-1806) کا دور ایک طویل اور پرآشوب زمانہ رہا۔ اس عرصے میں تیسری جنگِ پانی پت (1761)، انگریزوں کے ساتھ معاہدے، اور بنگال کے سقوط جیسے اہم واقعات پیش آئے۔ 1788ء میں غلام قادر روہیلہ نے دہلی پر قبضہ کر لیا اور شاہ عالم کو معزول کر دیا، جو مغلیہ زوال کی انتہا کی علامت تھی۔ اکبر شاہ ثانی (1806-1837) کو

انگریزوں کی اجازت سے تخت پر بٹھایا گیا۔ اس کے اختیارات محض لال قلعے تک محدود تھے، جو اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ اب مغل بادشاہ محض علامتی حیثیت رکھتے تھے جبکہ حقیقی اقتدار انگریزوں کے ہاتھ میں تھا۔

آخر میں بہادر شاہ ظفر (1837-1857) مغلیہ سلطنت کے آخری بادشاہ قرار پائے۔ 1857ء کی جنگِ آزادی میں ان کا کردار علامتی طور پر اہم تھا۔ تاہم، اس بغاوت کی ناکامی کے بعد انھیں گرفتار کر کے رنگون (برما) جلاوطن کر دیا گیا، جہاں 1862ء میں ان کا انتقال ہوا۔

مندرجہ بالا تجزیے کی روشنی میں یہ سمجھنا ممکن ہوتا ہے کہ پنجاب اور دہلی کے سیاسی حالات میں رونما ہونے والی بڑی تبدیلیوں کے پس منظر میں مغلیہ سلطنت مسلسل زوال کا شکار تھی، اور سکھ طاقت اس زوال کے خلا کو پُر کرتی ہوئی ایک نمایاں قوت کے طور پر سامنے آ رہی تھی۔ یہی وہ سیاق و سباق ہے جس میں بابا بندہ سنگھ بہادر کی موت کے بعد کے واقعات کو بہتر انداز میں سمجھا جا سکتا ہے۔

اس امر کا اعتراف ضروری ہے کہ ان واقعات کا دائرہ کئی دہائیوں پر محیط ہے، جس کے باعث بعض واقعات کا تکرار کے ساتھ ذکر ناگزیر ہے۔ قاری سے اس بابت پیشگی معذرت قبول فرمائی جائے۔

بہادر شاہ اول تا بہادر شاہ ثانی

''مغلیہ سلطنت کا دورِ زوال (1707-1857ء)''

مغل سلطنت کو ہم دو ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا دور 1526ء سے 1707ء تک ہے، جو مجموعی طور پر 181 سال پر مشتمل ہے۔ اس عرصے میں مغل سلطنت کے چھ عظیم بادشاہ گزرے۔ دوسرا دور 1707ء سے 1857ء تک محیط ہے، جو تقریباً ڈیڑھ سو سال پر مشتمل ہے۔ اس مدت کے دوران بارہ مغل بادشاہ تختِ دہلی پر متمکن ہوئے، جن کے نام حسبِ ذیل ہیں:

بہادر شاہ اول (1707-1712)

جہاں دار شاہ (1712 - 1713)

فرخ سیر (1713 - 1719)

رفیع الدرجات (1719)

شاہ جہان ثانی (رفیع الدولہ) (1719)

محمد شاہ (1719 - 1748)

احمد شاہ بہادر (1748 - 1754)

عالمگیر ثانی (1754 - 1759)

شاہ جہان سوم (1759 - 1760)

شاہ عالم ثانی (1760 - 1806)

اکبر شاہ ثانی (1806 - 1837)

بہادر شاہ ثانی (بہادر شاہ ظفر) (1857 - 1837ء)

میرے لیے اس تمام عرصے کا تفصیلی ذکر کرنا ممکن نہیں، اور یہ اس کتاب کے دائرہ کار سے بھی باہر ہے۔ تاہم، میں اس دوران پیش آنے والے چند اہم واقعات کا تذکرہ ضرور کروں گا تاکہ یہ واضح کیا جا سکے کہ ان حالات نے پنجاب کے سماج پر کس نوعیت کے اثرات مرتب کیے۔

مراٹھا اور مغل: میدانِ جنگ میں

میں اس کتاب میں مغلوں اور مراٹھوں کے درمیان ہونے والی تمام جنگوں کی تفصیل بیان نہیں کرنا چاہتا۔ تاہم ایک مختصر تذکرہ ناگزیر ہے، کیونکہ ایک وقت ایسا بھی آیا جب مراٹھے پنجاب کو فتح کر کے پشاور تک جا پہنچے۔ لہٰذا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مراٹھے بعض اوقات پنجاب پر قابض بھی رہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ سب کچھ کیسے ممکن ہوا؟ اور اس کا پنجاب کے معاشرتی ڈھانچے پر کیا اثر پڑا؟

پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ مراٹھے کون تھے۔

مجھے خوش نصیبی سے مراٹھوں کے تاریخی مرکز، پونا جسے پونے بھی کہتے ہیں جانے کا موقع ملا۔ اگر آئندہ بھی بھارت جانے کا موقع ملے تو ایک مرتبہ پھر پونا جانے کی ضرور کوشش کروں گا۔

آیئے جانتے ہیں کہ مراٹھے کون تھے۔

انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا کے مطابق مراٹھا سلطنت ایک ابتدائی جدید ہندوستانی سلطنت تھی جو 17ویں صدی میں ابھری اور 18ویں صدی کے دوران برصغیر کے بیشتر حصے پر غالب آ گئی۔ مراٹھے دراصل مراٹھی بولنے والے جنگجو گروہ تھے جو زیادہ تر موجودہ ریاست مہاراشٹر سے تعلق رکھتے تھے۔ مہاراشٹر رقبے کے لحاظ سے بھارت کی تیسری اور آبادی کے لحاظ سے دوسری بڑی ریاست ہے، جس کی سرحدیں گجرات، مدھیہ پردیش، چھتیس گڑھ، آندھرا پردیش، کرناٹک اور گوا سے ملتی ہیں۔ اس کے بڑے شہروں میں ممبئی (دارالحکومت)، پونا، ناگپور اور اورنگ آباد شامل ہیں۔

مراٹھا حکمران اس وقت کے اسلامی حکمرانوں کی مخالفت میں اُٹھے۔ انھوں نے سیاسی شعور اور مزاحمت کا آغاز اپنے پہلے بادشاہ شیواجی کی قیادت میں کیا۔ مراٹھا سلطنت کا باضابطہ قیام 1674ء میں شیواجی کی تاجپوشی کے ساتھ ہوا، جنھیں ''چھترپتی'' (چھتری کا محافظ) کا لقب دیا

گیا۔ یہ وہ دور تھا جب مغل سلطنت پر اورنگزیب عالمگیر کی حکمرانی تھی، جو جنوبی ہند خصوصاً دکن کو مکمل طور پر فتح کرنا چاہتے تھے۔ شیواجی کی فوج زیادہ تر کسانوں پر مشتمل تھی جو تیز رفتار اور متحرک کارروائیوں کے ماہر تھے۔ اگرچہ وہ کئی سالوں تک عملی طور پر مراٹھا سلطنت کے سربراہ رہے، تاہم ان کی باقاعدہ تاجپوشی 1674ء میں عمل میں آئی۔

شیواجی کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے سنبھاجی نے 1680ء میں اقتدار سنبھالا۔ وہ 1689ء تک برسراقتدار رہے، جب مغل بادشاہ اورنگزیب نے حملہ کر کے انھیں گرفتار کرلیا اور قتل کر دیا۔ اس کے بعد سنبھاجی کے سوتیلے بھائی راجارام کو تخت پر بٹھایا گیا۔ اورنگزیب نے سنبھاجی کے بیٹے شاہو کو بھی قید کرلیا۔ اورنگزیب کی وفات (1707ء) کے بعد بہادر شاہ اول نے خانہ جنگی کے دوران شاہو کو رہا کر دیا۔ 1713ء میں شاہو نے بالاجی وشوناتھ کو اپنا ''پیشوا'' یعنی وزیرِ اعظم مقرر کیا، جس سے مراٹھا سلطنت میں ''پیشوا دور'' کا آغاز ہوا۔ اس دور میں ساری سیاسی و عسکری طاقت پیشوا کے ہاتھ میں آ گئی۔ پونا مراٹھا پیشواؤں کا دارالحکومت بنا۔ 1720 -61ء کے درمیان مراٹھا سلطنت نے غیر معمولی وسعت حاصل کی۔ انھوں نے مغل سلطنت کے کئی علاقوں پر قبضہ کرلیا، مالوا، گجرات، اور 1737ء میں دہلی پر حملہ بھی کیا۔ 1758ء تک وہ شمال میں پشاور تک پہنچ چکے تھے۔

مراٹھا طرزِ حکومت عمومی طور پر سخت اور عوام کے لیے ناقابلِ برداشت تھا، جس کی وجہ سے انھیں مقامی آبادی کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔

1761ء میں افغان حکمران احمد شاہ ابدالی نے پانی پت کی تیسری جنگ میں مراٹھوں کو فیصلہ کن شکست دی۔ کئی مقامی حکمران، خصوصاً راجپوت، مراٹھوں کی حمایت کو تیار نہ تھے، جس کی وجہ سے وہ میدانِ جنگ میں تنہا رہ گئے۔ اس شکست نے مراٹھا سلطنت کی طاقت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا۔

یہ مختصر تاریخی جائزہ اس امر کو واضح کرتا ہے کہ کس طرح ایک غیر منظم مگر جنگجو قوم عروج پر پہنچی، پھر سخت حکمرانی اور کمزور سیاسی ڈھانچے کی وجہ سے جلد ہی زوال کا شکار ہوگئی۔ مراٹھا

سلطنت کے زوال اور شمالی ہند میں انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ کے درمیان تعلق ایک اہم موضوعِ تحقیق ہے۔

اس تحریر کا مقصد اس سوال کا جواب تلاش کرنا ہے کہ مغل سلطنت کے آخری دور میں ان کے پانچ بڑے دشمن یعنی سکھ، مقامی راجپوت، جاٹ، مراٹھا، اور انگریز کیسے ابھرے۔ ان خطرات کے مقابلے میں مغلوں کو افغانستان سے آنے والے احمد شاہ ابدالی کی مدد حاصل ہوئی۔ جب مراٹھا ابدالی کے ہاتھوں شکست کھا گئے اور ابدالی واپس چلا گیا، تو کیا انگریزوں کے سامنے کوئی بڑی طاقت باقی رہی جو انھیں شمالی ہندوستان پر قبضہ کرنے سے روک سکتی؟

کیا مراٹھوں کی تباہی شمالی ہندوستان پر انگریزوں کے قبضے کا پیش خیمہ ثابت ہوئی؟ یہ وہ اہم سوال ہے جس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ دوسری طرف، یہ سوال بھی اہمیت رکھتا ہے کہ اگر ابدالی مغل سلطنت کی مدد کو نہ آتا، تو کیا مراٹھے ہندوستان بھر میں مسلمانوں کا خاتمہ کر دیتے اور ان کی ریاستوں کو تباہ کر دیتے؟ اس صورت میں مسلمانوں کو بے حد نقصان پہنچتا۔ کیا ابدالی کی مدد نے مسلمانوں کو تحفظ فراہم کیا؟ یہ ایک اور پہلو ہے جس پر غور کرنا ضروری ہے۔ یاد رہے کہ صرف ایک مرتبہ ہی احمد شاہ ابدالی مسلمان علماء کی دعوت پر آیا تھا۔ اس کے باقی آٹھ حملے اس کے اپنے مفاد کی خاطر تھے۔

ایک اور اہم سوال یہ ہے کہ مراٹھوں کی ابدالی کے خلاف جنگ میں مقامی راجپوت اور جاٹ ریاستوں نے ان کا ساتھ کیوں نہ دیا؟ نیز، مراٹھے شمالی ہندوستان میں مستحکم حکومت کیوں قائم نہ کر سکے؟ مراٹھوں کی جانب سے مغل سلطنت کو کمزور کرنے کی کوششوں نے شمالی ہندوستان، خاص طور پر پنجاب، کے سماجی و سیاسی حالات پر کیا اثرات مرتب کیے؟ یہ وہ اہم موضوعات ہیں جن پر اس باب میں توجہ مرکوز کی جائے گی۔ اس بحث میں، میں اپنی رائے دینے کی بجائے، تاریخی حالات و واقعات کو پیش کروں گا، تاکہ قارئین خود فیصلہ کر سکیں۔

پانی پت میں ہونے والے نقصان کے بعد، مادھوراؤ اول پیشوا بن گیا اور اس نے بہت سی ریاستوں سے دوستی کر کے، مراٹھا کنفیڈریسی تشکیل دی۔ اس میں نمایاں طور پر بڑودہ کے گائکوار،

گوالیار کے سندھیا اور اندور کے ہولکر تھے۔ یہ وہ ریاستیں تھیں جو مراٹھا سلطنت کے خاتمے کے بعد آزاد ہو گئیں۔

یہ بات بھی یاد رہے کہ کئی اینگلو-مراٹھا جنگیں بھی ہوئیں۔ اسی دور میں انھوں نے پہلی مراٹھا-میسور جنگ 1785 سے 1787 تک جس کی وجہ سے ٹیپو سلطان کی ریاست کمزور ہوئی۔ جب ٹیپو انگریزوں سے جنگ کر رہا تھا، اس وقت نظام اور مراٹھے انگریزوں کی مدد کر رہے تھے۔ انگریزوں نے میسور ریاست کا خاتمہ کرنے کے بعد، نظام سے دوستی کی اور مراٹھوں کو میدان جنگ میں مراٹھا سرداروں کے معاملات میں برطانوی مداخلتوں نے 1803 سے 1805 تک دوسری اینگلو-مراٹھا جنگ شروع کی، جس سے مراٹھوں کو کافی نقصان پہنچا۔ مراٹھا برصغیر میں انگریزوں کی مخالفت کرنے والی آخری بڑی طاقت تھی اور اس کا خاتمہ 1818ء میں تیسری اینگلو-مراٹھا جنگ میں مراٹھوں کی شکست کے ساتھ ہوا، اس کے بعد پیشوا، باجی راؤ دوم کی جلاوطنی، اور مراٹھا کا علاقہ براہ راست برطانوی حکومت کے تحت آیا۔ کچھ علاقے جیسے بڑودہ اور اندور انگریزوں کے ماتحت پر نسلی ریاستوں کے طور پر رہنے پر مجبور ہوئے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہندوستان کی آزادی کی تحریک کے تناظر میں، مراٹھا سلطنت اور خاص طور پر شیوا جی کو بہت زیادہ توجہ ملی، ہندوستانی قوم پرستوں نے مراٹھوں کو مغلوں کے ظلم کے خلاف ہندو قوم پرستی کے ہیرو کے طور پر بیان کیا۔ آج بھی ہندوستان میں شیوا جی کو ایک ہیرو کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

مراٹھوں کا دہلی پر حملہ اور اس کے اثرات

میں یہاں اس تاریخی واقعے کا جائزہ پیش کرنا چاہتا ہوں جب مراٹھے مقامی راجپوت ریاستوں کے ساتھ مل کر دہلی پر قابض ہوئے۔ اورنگزیب کی موت کے بعد مغل سلطنت کمزور ہونا شروع ہو گئی تھی، اور اس کے نتیجے میں مراٹھوں نے برصغیر پاک و ہند میں اپنا اثر و رسوخ بڑھانے اور زوال پذیر مغل سلطنت کو چیلنج کرنے کی اپنی وسیع مہم کے ایک حصے کے طور پر 1737ء میں دہلی پر حملہ کیا۔ اس وقت مغل سلطنت زوال کی حالت میں تھی، اور مراٹھوں نے دہلی سمیت شمالی

ہندوستان پر اپنا تسلط قائم کر کے اقتدار کے خلا کو پُر کرنے کی کوشش کی۔ دہلی، جو مغل سلطنت کا علامتی اور سیاسی مرکز تھا، مراٹھوں کے لیے ایک اہم ہدف تھا۔

شاہجہاں کے دور میں اورنگزیب دکن فتح کرنے کی غرض سے دکن میں موجود تھا۔اس کے بعد اس نے اپنے دور حکومت میں دکن کو اپنے نشانے پر رکھا اور مراٹھوں کو بے حد نقصان پہنچایا۔ اورنگزیب کی موت کے بعد، مغل سلطنت 1707ء میں زوال کی حالت میں آ گئی۔ سلطنت اندرونی تنازعات، کمزور قیادت، اور مالی عدم استحکام سے دوچار تھی۔ یہی وجہ تھی کہ مراٹھوں کے لیے یہ ایک بہترین موقع تھا کہ وہ ماضی کے تنازعات کا بدلہ لیں اور مغلوں پر اپنا تسلط قائم کریں۔

اس کے علاوہ، شمالی ہندوستان اقتصادی لحاظ سے کافی مضبوط تھا۔شمالی ہندوستان پر قبضے کے نتیجے میں مراٹھوں کو اس خطے کے امیر وسائل اور تجارتی راستوں تک رسائی مل سکتی تھی، جس سے ان کی سلطنت مزید مضبوط ہو سکتی تھی۔ تاہم ایسا نہیں ہوا۔ مراٹھوں کی توسیع پسندی ہی ان کی تباہی کا سبب بنی، جیسا کہ مغل سلطنت کی توسیع پسندانہ پالیسیاں بھی ان کے زوال کا باعث بنی تھیں۔

1737ء میں دہلی پر مراٹھہ حملے کے دوران مغل شہنشاہ محمد شاہ (جسے محمد شاہ رنگیلا بھی کہا جاتا ہے) تخت نشین تھا، جس نے 1719 سے 1748ء تک حکومت کی۔ محمد شاہ ایک کمزور اور غیر مؤثر حکمران تھا، اور اس کے دور حکومت نے مغل سلطنت کے مزید زوال کی نشاندہی کی۔ وہ مراٹھہ حملے کا مؤثر طریقے سے مقابلہ کرنے یا سلطنت کی علاقائی سالمیت کو برقرار رکھنے میں ناکام رہا۔

تاریخ کے مطابق، باجی راؤ اول (مراٹھا سلطنت کے پیشوا) کی قیادت میں مراٹھوں نے 1737ء میں دہلی پر کامیابی سے حملہ کیا۔ تاہم، مراٹھوں نے فوری طور پر دہلی پر مستقل قبضہ کرنے کی بجائے خراج وصول کیا۔ مغل بادشاہ نے مالوا صوبے، نرمدا اور چمبل کے درمیان خطے کی خراج اور مراٹھوں کو جنگی اخراجات کے طور پر 50 لاکھ روپے دینے کا وعدہ کیا۔ اس کے بعد مراٹھے لاہور اور پشاور تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔

مراٹھوں کا لاہور پر قبضہ

2 اپریل 1758ء کو پہلی مراٹھا فوج لاہور میں داخل ہوئی۔ پونے میں بیٹھے پیشوا نے کہا کہ

انھوں نے 700 سال قبل عظیم ہندوشاہی حکمران جے پالا سے محمود غزنوی کے ذریعے لاہور پر قبضے کا بدلہ لیا تھا۔ وہ لاہور کے پہلے مراٹھا حکمران تھے۔

افغان افواج کے میدان سے نکلنے کے بعد، سکھوں نے راولپنڈی اور اٹک تک ان کا پیچھا کیا۔ وہ علاقے کو اچھی طرح جانتے تھے اور انھوں نے ابدالی افواج کو کافی نقصان پہنچایا۔ اس کے بعد ابدالی فوج افغانستان چلی گئی۔ لاہور میں گھر سے دوری اور موسم دونوں نے مراٹھوں کا حوصلہ پست کرنا شروع کر دیا۔ ادینہ بیگ اور سکھ دونوں نے سمجھ لیا تھا کہ مراٹھا افواج کا مقابلہ صبر و تحمل سے کیا جا سکتا ہے۔ مراٹھوں نے لاہور پر قبضہ ابدالی فوج کو شکست دے کر حاصل کیا تھا۔

پنجاب کی تاریخ میں مراٹھوں، سکھوں اور آدینہ بیگ کا کردار

دین چودھری سیال نے اپنی اہم تصنیف تاریخ خالصہ میں متعدد تاریخی واقعات پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کتاب کا ایک باب بالخصوص قابلِ ذکر ہے، جس میں انھوں نے 1757ء میں مراٹھوں کے حملے کے بعد دہلی اور لاہور پر قبضے، نیز مرزا آدینہ بیگ کی وفات کے تناظر میں خطۂ پنجاب کی سیاسی کیفیت کا جائزہ پیش کیا ہے۔ اس باب سے کئی اہم و دلچسپ نکات سامنے آتے ہیں، جن میں سے چند کا ذکر ذیل میں کیا جا رہا ہے۔

جب 1757ء میں مراٹھوں نے شمالی ہندوستان پر یلغار کی اور دہلی کو فتح کیا، تو اس کے بعد ان کی نظریں لاہور پر مرکوز ہو گئیں۔ انھوں نے رگھوناتھ راؤ کے بھائی شمشیر بہادر اور مرزا آدینہ بیگ کی معاونت سے لاہور پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔ قابلِ غور امر یہ ہے کہ اس وقت لاہور میں درانی سلطنت کے نامزد کردہ ایک گورنر بھی موجود تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا وہ گورنر پنجابی النسل تھا یا محض درانیوں کا نمائندہ؟

اس دور میں اگرچہ سکھوں نے لاہور کے بعض حصوں پر قبضہ جما رکھا تھا، لیکن مراٹھوں کی فوجی قوت کے سامنے انھوں نے عارضی طور پر پسپائی اختیار کی۔ بعد ازاں مراٹھوں نے ملتان پر بھی قبضہ کر لیا اور درانی فوج پیچھے ہٹتے ہوئے دریائے اٹک کے پار چلی گئی۔ یوں، مراٹھوں کا اثر و نفوذ دریائے اٹک تک پھیل گیا۔ انھی دنوں مرزا آدینہ بیگ، جو سابقہ مغلیہ نائب میر منو کے تحت

کام کر چکا تھا، مراٹھوں کی جانب سے پنجاب کا صوبیدار مقرر ہوا۔

یہ ایک اہم تاریخی نکتہ ہے کہ جنوبی ہند سے تعلق رکھنے والے مراٹھا قبضہ گیر عناصر کو پنجاب میں ایک غیر پنجابی اور موقع پرست شخصیت، مرزا آدینہ بیگ کی حمایت حاصل رہی۔ یوں ایک غیر ملکی حملہ آور نے دوسرے غیر ملکی قابض کی پشت پناہی کی۔ آدینہ بیگ نے مراٹھوں سے یہ معاہدہ کیا کہ وہ سالانہ 75 لاکھ روپے ادا کرے گا اور اس کے بدلے علاقے کی حکمرانی حاصل کرے گا۔ اس معاہدے کے بعد مراٹھا قائدین واپس دکن چلے گئے اور آدینہ بیگ کا سیاسی عروج شروع ہوا۔

آدینہ بیگ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ مختلف اوقات میں بغاوتوں کو ہوا دیتا رہا۔ وہ کبھی مغلوں کا وفادار تھا اور کبھی درانیوں سے ساز باز کرتا رہا۔ اس کی شخصیت موقع پرستی کا مظہر تھی۔ اس نے ضلع گورداسپور میں ''آدینہ نگر'' کے نام سے ایک بستی بھی قائم کی، جبکہ اس کی قبر گوجرانوالہ میں واقع ہے۔ 1758ء کے آس پاس وہ سلطنتِ تیموریہ کا آخری ناظمِ لاہور تھا۔

1763ء کے اختتام پر جب احمد شاہ ابدالی لاہور آیا، تو سکھ پہلے ہی شہر چھوڑ چکے تھے۔ اگلے سال، لدھیانہ کے جنوب میں ایک مقام پر ایک خونریز معرکہ ہوا، جسے سکھوں نے ''گھلوگھارہ''، یعنی قتلِ عام کی جگہ کا نام دیا۔ گرفتار ہونے والوں میں پٹیالہ کے بانی، آلا سنگھ بھی شامل تھے، جنھیں ابدالی نے بہادری کے صلے میں سات لاکھ روپے لے کر نہ صرف آزاد کیا بلکہ ''راجہ'' کا خطاب بھی دیا۔

یہ واقعہ پنجاب کی تاریخ میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے، کیونکہ یہ پہلا موقع تھا جب سکھوں اور ابدالی کے درمیان کسی حد تک مفاہمت ہوئی۔ آلا سنگھ کی رہائی نے ''پھول ریاستِ'' کے تصور کو جنم دیا، جو خالصہ کی مرکزی تنظیم سے الگ تھلگ تھی۔ اس کے بعد احمد شاہ نے لاہور کی صوبیداری ہندو سردار کابلی مل کو سونپی۔

تاہم، جیسے ہی ابدالی واپس قندھار روانہ ہوا، سکھوں نے لاہور پر حملہ کر دیا۔ گوجر سنگھ، دِلہا سنگھ اور سوبھا سنگھ کی قیادت میں انھوں نے شہر کے مضافات کو لوٹا اور پھر شہر کا محاصرہ کیا۔ کابلی مل نے طویل مزاحمت کی اور شہر کے دروازے بند کر کے دفاع کو یقینی بنانے کی کوشش کی، لیکن جب

محاصرہ طویل ہوا اور مالی وسائل ختم ہونے لگے، تو اس نے شہر کے ساہوکاروں کو لوٹ لیا۔ آخرکار، جب سکھوں کا زور بڑھا اور اس کی شکست یقینی نظر آنے لگی، تو وہ اہل وعیال سمیت فرار ہو گیا۔ سکھوں نے شہر میں داخل ہو کر باقی ماندہ املاک کو بھی لوٹا اور شہر کو تینوں سرداروں کے مابین تقسیم کر لیا، جنھوں نے اپنے نمائندے مقرر کیے۔

اس دور میں لاہور پر جو قیامت گزری، اس کی مثال تاریخ میں کم ہی ملتی ہے۔

احمد شاہ ابدالی کی واپسی کے بعد سکھوں نے قصور پر حملہ کیا اور وہاں کے پٹھانوں کو شکست دی۔ بعدازاں، انھوں نے مالیرکوٹلہ کا رخ کیا اور اس کے حکمران ہینگن خان کو، جو ان کے شدید مخالف اور درانیوں کے حامی تھے، قتل کر دیا۔ پھر وہ سرہند کی طرف بڑھے اور دسمبر 1763ء میں چالیس ہزار سکھوں نے شہر پر قبضہ کر لیا۔ زین خان، جو افغان حکمران تھا، مارا گیا اور سکھوں نے جمنا سے ستلج تک کا علاقہ اپنے قبضے میں لے لیا۔ سرہند شہر کو تباہ کر دیا گیا، اس کی حویلیاں مسمار کی گئیں اور مکانات نذرِ آتش کیے گئے۔ سکھوں کو اس شہر سے ذاتی رنج تھا کیونکہ یہیں ان کے گرو گوبند سنگھ کی والدہ اور فرزندان قتل کیے گئے تھے۔

1764ء میں احمد شاہ ابدالی نے ایک اور حملہ کیا، لیکن جیسے ہی وہ جمنا کنارے پہنچا، اسے افغانستان میں بغاوت کی خبر ملی اور وہ واپس پلٹ گیا۔ یوں سرہند سکھوں کے قبضے میں رہا۔ اسی سال سکھوں نے کابلی مل کو لاہور سے بے دخل کیا اور جہلم سے ستلج تک کا علاقہ سرہند کی طرز پر تقسیم کیا۔ انھوں نے مسلمانوں کی مساجد کو نشانہ بنایا، اور بعض روایات کے مطابق مساجد کو سور کے خون سے دھونے پر مجبور کیا گیا۔ پھر سکھ سردار امرتسر میں اکٹھے ہوئے، خالصہ راج اور اپنے مذہب کا اعلان کیا، اور ''گوبند شاہی'' کے نام سے ایک سکہ جاری کیا جس پر درج تھا:

''دیگ و تیغ و فتح و نصرت یافت از نانک گورو گوبند سنگھ۔''

یہی عبارت بعدازاں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے سکوں پر بھی کندہ کی گئی، البتہ اس میں معمولی تبدیلی کے ساتھ:

''دیگ و تیغ و فتح و نصرت بے درنگ یافت از نانک گورو گوبند سنگھ۔''

اس دور میں سکھوں نے تقریباً دو سال سکون میں گزارے۔ ہر سکھ سردار خود مختار تھا، ان کے وسائل، صلاحیتیں اور نظامِ معیشت ایک دوسرے سے جداگانہ تھے۔ اسی دور میں سکھوں نے بارہ ''مسلیں'' یا گروہ قائم کیے، جو علاقائی، نسبی یا نظریاتی بنیادوں پر ایک دوسرے سے الگ تھے۔ ہر مِسل ایک سردار کے تحت کام کرتی تھی، اور ان میں سے بعض نئی مسلیں باہمی اختلافات کے نتیجے میں وجود میں آئیں۔

مراٹھوں کی پشاور پر فتح

لاہور پر قبضہ کرنے کے بعد، مراٹھے پشاور پر حملہ آور ہوئے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ لاہور سے پشاور تک کا سارا علاقہ بھی ان کے قبضے میں آ گیا۔ اس واقعے کی تفصیلات *An Advanced History of Modern India* میں ملتی ہیں، جو Sailendra Nath Sen نے تحریر کی ہے۔ اس کتاب کے مطابق، مراٹھوں نے سکھوں اور راجپوت ریاستوں کی مدد سے ابدالی فوجوں کو شکست دے کر پشاور پر قبضہ کیا۔ اس فتح کے بعد، راؤ ہولکر کو برصغیر کے اس خطے میں مراٹھوں کا نمائندہ مقرر کیا گیا۔ یہ جنگ 8 مئی 1758ء لڑی گئی۔ یاد رہے کہ صرف ایک ماہ قبل اپریل میں مراٹھوں نے لاہور فتح کیا تھا۔ اس سے یوں لگتا ہے کہ ابدالی فوج ان کے سامنے بے بس تھی۔ مراٹھوں اور سکھوں کی مشترکہ فوج سے شکست کھانے کے بعد، ابدالی فوجیں جہاں خان اور تیمور شاہ درانی کی قیادت میں قلعہ چھوڑ کر افغانستان کی طرف فرار ہو گئیں۔ اسی دوران، مراٹھوں نے قلعے پر قبضہ کر لیا۔ اس فتح سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مراٹھے اپنے دارالحکومت پونے سے تقریباً دو ہزار کلومیٹر دور، افغان سرحد تک اپنی حکمرانی قائم کر چکے تھے۔

یاد رہے کہ اس کے علاوہ بھی کئی جنگیں ہوئیں۔ ان سب کی تفصّل میرا موضوع نہیں ہے، میں یہاں صرف ان اثرات کا جائزہ ہی پیش کرنا چاہتا ہوں جو مراٹھوں کی وجہ سے پیدا ہوئے۔

مراٹھوں کی سیاسی حکمتِ عملی اور شمالی ہندوستان میں ان کا اثر

مراٹھوں کے حملے شمالی ہندوستان میں ایک منفرد تاریخی اہمیت کے حامل ہیں، تاہم وہ اس خطے میں کوئی مستقل ریاست قائم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ان کی مہمات مسلسل

جنگ وجدل پر مبنی تھیں، جو انھیں ایک مستحکم حکومت قائم کرنے سے باز رکھتی رہیں۔ اس کی دو بنیادی وجوہات سامنے آتی ہیں:

اول، مقامی ہندو ریاستیں مراٹھوں کو ایک ممکنہ خطرہ تصور کرتی تھیں، کیونکہ وہ ان سے زیادہ طاقتور تھے اور ان کے اقتدار کے لیے چیلنج بن سکتے تھے۔ دوم، مراٹھے خود بھی ایک مربوط اور منظم طرزِ حکمرانی کے حامل نہ تھے، اور اپنے مرکز سے دور ایک مستحکم حکومت قائم رکھنا ان کے لیے مشکل تھا۔ تاہم، ان کے حملوں نے شمالی ہندوستان کے سیاسی، اقتصادی، اور ثقافتی ڈھانچے پر گہرے اور دیرپا اثرات مرتب کیے، خاص طور پر اٹھارہویں صدی کے دوران۔

مراٹھوں نے مغلیہ سلطنت کے زوال میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ مغل حکومت پہلے ہی داخلی انتشار، کمزور قیادت، اور مالی عدم استحکام کے باعث زوال پذیر تھی۔ مراٹھہ رہنما، جیسے باجی راؤ اوّل اور رگھوناتھ راؤ، مغل اقتدار کو چیلنج کرتے رہے اور انھیں سیاسی و مالی مراعات حاصل ہوئیں۔ نتیجتاً، مغلوں کا سیاسی اثر و رسوخ کمزور ہو گیا، اور وہ ایک بڑے جغرافیائی علاقے پر اپنا کنٹرول برقرار رکھنے میں ناکام رہے۔

مراٹھوں نے مغل اقتدار کو کمزور کرنے کے ساتھ ساتھ شمالی ہندوستان میں سیاسی طاقت کو مزید منتشر کرنے میں بھی کردار ادا کیا۔ ان کے جابرانہ طرزِ عمل کے باعث راجپوت، جاٹ، اور سکھ جیسی علاقائی قوتوں میں ناراضگی پیدا ہوئی، اور وہ مراٹھوں کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ اس کا نتیجہ پانی پت کی تیسری جنگ (1761ء) میں مراٹھوں کی شکست کی صورت میں نکلا، جس میں احمد شاہ ابدالی کے خلاف ہندو اور سکھ قوتوں نے مراٹھوں کا ساتھ نہیں دیا۔

مراٹھوں کی حکمرانی کے دوران شمالی ہندوستان میں معاشی نظام کو بھی شدید نقصان پہنچا۔ انھوں نے کسانوں پر اضافی مالی بوجھ ڈالا اور ''چوتھ'' اور ''سردیش مکھی'' جیسے محصولاتی نظام متعارف کرائے، جنھوں نے مقامی معیشت کو عدم استحکام کا شکار کر دیا۔ مستقل جنگوں اور لوٹ مار کی پالیسی کے باعث تجارتی راستے غیر محفوظ ہو گئے، جس نے شمالی ہندوستان میں اقتصادی سرگرمیوں کو شدید متاثر کیا۔ تاجروں اور کاروباری طبقات کو غیر یقینی حالات اور مالی بوجھ کا سامنا

کرنا پڑا، جس سے معیشت مزید زوال پذیر ہوگئی۔

مراٹھوں کے حملوں اور ان کی حکمرانی نے شمالی ہندوستان کے ثقافتی وسماجی ڈھانچے پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے۔ وہ ہندو ثقافت اور شناخت کے احیا کے حامی تھے اور اسلامی حکمرانی کے اثرات کو کم کرنے کی کوششوں میں مصروف رہے۔ خاص طور پر پنجاب اور دیگر مسلم اکثریتی علاقوں میں ان کی پالیسیوں نے ہندو-مسلم کشیدگی کو بڑھایا، جو بعد میں سماجی و مذہبی تنازعات کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ پنجاب کا یہ دور عدم استحکام اور بے چینی سے عبارت رہا۔

1761ء میں احمد شاہ ابدالی نے پانی پت کی تیسری جنگ میں مراٹھوں کو ایک فیصلہ کن شکست دی، جس کے بعد شمالی ہندوستان میں مراٹھوں کا اثر ورسوخ کمزور پڑ گیا۔ اس جنگ کے نتیجے میں مراٹھہ طاقت کو ایک ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا اور ان کی مزید توسیع کا عمل رک گیا۔ اس جنگ کے بعد مراٹھے اپنے کھوئے ہوئے مقام کو دوبارہ حاصل نہ کر سکے، جس سے برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی سمیت دیگر طاقتوں کے عروج کی راہ ہموار ہوئی۔

پانی پت کی تیسری جنگ کے بعد شمالی ہندوستان میں طاقت کا ایک خلا پیدا ہو گیا، جسے مغل، راجپوت اور سکھ پُر کرنے میں ناکام رہے۔ یہ خلا برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے پُر کیا، جو اس خطے میں اپنے تسلط کے لیے موزوں موقع کی منتظر تھی۔ انیسویں صدی کے اوائل تک برطانوی حکمرانی نے ہندوستان کے بیشتر حصوں، بشمول سابقہ مراٹھہ علاقوں، پر اپنا قبضہ جما لیا۔ مراٹھوں، سکھوں اور راجپوتوں کے باہمی تنازعات نے بھی ان قوتوں کو کمزور کر دیا، جس سے انگریزوں کے لیے انھیں فرداً فرداً شکست دینا آسان ہو گیا۔

اگرچہ مراٹھے اپنے عروج کو برقرار نہ رکھ سکے، لیکن ان کی مزاحمتی پالیسیوں نے ہندوستان میں غیر ملکی تسلط کے خلاف جدوجہد کو ایک نئی جہت دی۔ مغلوں اور بعد ازاں انگریزوں کے خلاف ان کی کوششوں نے ہندوستانی آزادی کی تحریک کو متاثر کیا، اور ان کے مزاحمتی جذبات آنے والی نسلوں کے لیے ایک تحریک ثابت ہوئے۔ مراٹھوں کی جنگی حکمتِ عملی، ان کی انتظامی پالیسیاں، اور ان کا سیاسی تجربہ ہندوستان میں آزادی کی جدوجہد کے کئی پہلوؤں پر اثر انداز ہوا۔

ان تمام حقائق کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ مراٹھوں کے حملے اور ان کے سیاسی عزائم نے شمالی ہندوستان میں ایک نئے دور کا آغاز کیا، جس میں طاقت کی روایتی تقسیم بکھر گئی اور نئے سیاسی و سماجی عوامل نے جنم لیا۔ اگرچہ وہ ایک مستحکم حکومت قائم کرنے میں ناکام رہے، لیکن ان کی سرگرمیوں نے مغل اقتدار کے زوال کو تیز کیا، علاقائی ریاستوں میں سیاسی عدم استحکام پیدا کیا، اور برطانوی حکمرانی کے لیے راہ ہموار کی۔ ان کے دور کے اثرات ہندوستان کی تاریخ میں دیرپا ثابت ہوئے اور آنے والے وقتوں میں ہندوستان کے سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی ڈھانچے کی تشکیل میں معاون رہے۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ مراٹھے شمالی ہندوستان میں اپنی کوئی مستقل ریاست قائم نہ کر سکے۔ ان کا دور جنگوں اور فتوحات کا دور تھا، جس میں استحکام کی بجائے مسلسل تصادم غالب رہا۔

میرے خیال میں اس کی دو بڑی وجوہات تھیں۔ پہلی یہ کہ مقامی ہندو ریاستیں یہ سمجھتی تھیں کہ مراٹھوں کا اس علاقے میں قدم جمانا ان کے لیے نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے، کیونکہ مراٹھے ان سے زیادہ طاقتور تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ خود مراٹھے بھی کوئی بہت زیادہ منظم قوت نہ تھے۔ ان کے لیے اپنے مرکز سے اس قدر دور رہ کر حکومت کرنا آسان نہ تھا۔ البتہ، ان کے حملوں کی وجہ سے شمالی ہندوستان پر گہرا اور دیرپا اثر پڑا، خاص طور پر اٹھارھویں صدی کے دوران۔ ان کی آمد سے سیاسی منظرنامے میں ایک بڑی تبدیلی رونما ہوئی، جس نے یہاں کے سماجی، اقتصادی اور ثقافتی حالات کو بھی متاثر کیا۔

مغل حکومت کا زوال: مراٹھوں نے مغلیہ سلطنت کے زوال کو تیز کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ مغل سلطنت پہلے ہی اندرونی تنازعات، کمزور قیادت، اور مالی بحران کی وجہ سے زوال پذیر تھی۔ مراٹھوں نے، باجی راؤ اوّل اور رگھوناتھ راؤ جیسے رہنماؤں کی قیادت میں، مغلوں کو چیلنج کیا اور ان سے مراعات حاصل کیں۔ اس کے نتیجے میں مغل حکومت نہ صرف سیاسی بلکہ مالی طور پر بھی بہت کمزور ہوگئی۔ کئی اہم علاقوں پر کنٹرول ختم ہوا اور بھاری خراج کی ادائیگی نے ان کے وقار کو شدید نقصان پہنچایا۔

طاقت کی تقسیم: جہاں مراٹھوں نے مغلوں کو کمزور کیا، وہیں انھوں نے شمالی ہندوستان میں سیاسی طاقت کے ٹکڑے کرنے کا عمل بھی تیز کیا۔ ان کے جابرانہ رویوں کی وجہ سے راجپوتوں، جاٹوں اور سکھوں جیسی علاقائی طاقتوں میں شدید ناراضی پیدا ہوئی، جو بعد ازاں ان کے مخالف بن گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ پانی پت کی تیسری جنگ میں احمد شاہ ابدالی کے خلاف ہندوؤں اور سکھوں نے مراٹھوں کا ساتھ نہیں دیا۔

جب مغل اقتدار کا خاتمہ ہو چکا تھا، مقامی ریاستیں بھی کمزور ہو چکی تھیں، ابدالی حملہ آور تھا اور مراٹھے زوال کا شکار ہو چکے تھے، تو اس تمام افراتفری نے برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے اٹھارہویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں ہندوستان پر اپنا تسلط قائم کرنا آسان بنا دیا۔

مراٹھوں نے اپنے زیرِ کنٹرول علاقوں میں سب سے زیادہ ظلم کسانوں پر کیا۔ انھوں نے کسانوں پر اپنا محصولاتی نظام (چوتھ اور سردیش مکھی) نافذ کیا۔ اگرچہ اس سے انھیں مالی وسائل حاصل ہوئے، لیکن اس نظام نے مقامی آبادی پر شدید بوجھ ڈالا اور خطے میں معاشی عدم استحکام کو جنم دیا۔

مراٹھا توسیع کے نتیجے میں مسلسل جنگوں اور بدامنی نے شمالی ہندوستان کے تجارتی راستوں اور اقتصادی سرگرمیوں کو بھی بری طرح متاثر کیا۔ اس دور میں سیکورٹی کی کمی، مسلسل خراج کی وصولی، اور سیاسی انتشار نے تاجروں اور عام شہریوں کی زندگی کو شدید مشکلات سے دوچار کیا۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ مراٹھوں نے ہندو مذہب اور ثقافت کے فروغ کے لیے بعض اوقات اسلام دشمنی پر مبنی اقدامات بھی کیے۔ خاص طور پر پنجاب جیسے علاقوں میں، جہاں مسلمان اکثریت میں تھے اور صدیوں سے مغل (اسلامی) حکمرانی قائم تھی، مراٹھوں نے ہندو شناخت کی بحالی کی کوشش کی۔ اس عمل نے ان علاقوں میں ثقافتی تصادم کو جنم دیا، جہاں پہلے ہندو حکمران مغل اثر کے تحت تھے۔ اس کے نتیجے میں ہندو مسلم سماجی اور مذہبی تنازعات نے جنم لیا۔ اٹھارھویں صدی کا یہ دور پنجاب کی تاریخ میں بدامنی کا ایک سیاہ باب سمجھا جاتا ہے۔

اور پھر وہی ہوا... جو ہر ظالم کے ساتھ ہوتا آیا ہے۔

پانی پت کی تیسری جنگ (1761ء)

جب مراٹھوں کے مظالم حد سے بڑھ گئے تو افغانستان کے بادشاہ احمد شاہ ابدالی، جو اس سے قبل بھی کئی مرتبہ ہندوستان پر حملہ آور ہو چکے تھے، ایک بار پھر شمالی ہندوستان پر چڑھ دوڑے۔ اس مرتبہ اُن کا ہدف مراٹھے تھے، جن کے خلاف انھوں نے پانی پت کی تیسری جنگ لڑی۔ اس جنگ میں مراٹھوں کو فیصلہ کن شکست ہوئی، جس کے نتیجے میں شمالی ہندوستان میں ان کا اثر ورسوخ ختم ہو گیا۔ یہ جنگ مراٹھوں کی طاقت کا زوال ثابت ہوئی، اور ان کی توسیع کی راہ مسدود ہو گئی۔ اس شکست کے بعد مراٹھے اپنا سابقہ غلبہ دوبارہ حاصل کرنے میں ناکام رہے، جس سے نہ صرف انگریزوں بلکہ دیگر اُبھرتی ہوئی طاقتوں کو بھی آگے بڑھنے کا موقع ملا۔

یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ پانی پت کی تیسری جنگ کے بعد شمالی ہندوستان میں مراٹھوں کی جانب سے طاقت کو مستحکم کرنے میں ناکامی نے ایک سیاسی خلا پیدا کر دیا، جسے نہ مغل، نہ راجپوت اور نہ ہی سکھ پُر کرنے کے قابل تھے۔ اس خلا کو برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے پُر کیا، جو پہلے ہی فاصلے پر بیٹھ کر اس جنگ کے نتائج کا انتظار کر رہی تھی۔ انیسویں صدی کے اوائل تک انگریز ہندوستان کے بیشتر حصے پر اپنا تسلط قائم کر چکے تھے، بشمول وہ علاقے جو پہلے مراٹھوں کے زیرِ اثر تھے۔ مراٹھوں کے سکھوں اور راجپوتوں کے ساتھ جاری تنازعات نے ان تمام قوتوں کو الگ الگ کر دیا، جس سے انگریزوں کے لیے انھیں انفرادی طور پر زیر کرنا آسان ہو گیا۔

اگرچہ آخر کار مراٹھے زوال پذیر ہو گئے، لیکن انھوں نے غیر ملکی تسلط کے خلاف مزاحمت ترک نہ کی۔ مغلوں کے خلاف جدوجہد اور بعد ازاں انگریزوں کے خلاف محاذ آرائی کے باعث، وہ ہندوستان کی آزادی کے لیے سرگرم بعد کی نسلوں کے لیے ایک مؤثر مثال اور تحریک بنے۔

نادر قلی بیگ افشار: جس کے دہلی پر ظلم کی کہانی آج بھی ناقابلِ بیان ہے

میں نے گزشتہ صفحات میں اس امر کا تفصیلی ذکر کیا ہے کہ مراٹھوں نے 1737ء میں دہلی پر

قبضہ کیا اور مغل بادشاہ سے متعدد مراعات حاصل کرنے کے بعد شمالی ہندوستان کے کئی علاقوں کو فتح کرلیا۔ اسی دوران انھوں نے مشرقی ہندوستان کی جانب بھی اپنی فتوحات کا سلسلہ جاری رکھا۔ ابھی یہ زخم تازہ ہی تھے کہ ایک اور طاقتور اور بے رحم حکمران، نادر قلی بیگ افشار نے، جو تاریخ میں نادر شاہ کے نام سے معروف ہے، مغل سلطنت پر حملہ کر دیا اور دہلی میں تباہی و بربادی کی ایسی مثال قائم کی، جو تاریخ میں ایک عظیم المیے کے طور پر یاد کی جاتی ہے۔

یہ واقعہ اپنے عہد کے نہایت اہم تاریخی واقعات میں شمار ہوتا ہے۔ اس سانحے کی تفصیلات معروف مورخ سید محمد لطیف نے اپنی تصنیف تاریخِ پنجاب میں نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان کی ہیں۔ میں نے اس کتاب کا بغور مطالعہ کیا ہے اور قارئین سے بھی گزارش ہے کہ وہ اس تاریخی حوالے کا ضرور مطالعہ کریں۔ ذیل میں اس تحریر کا خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے۔

نادر شاہ کا اصل نام نادر قلی بیگ افشار تھا۔ بعد ازاں اس نے ''شاہ'' کا لقب اختیار کیا۔ وہ اکتوبر 1688ء میں ایران میں پیدا ہوا اور 1747ء میں، جب وہ شب کے وقت خواب گاہ میں موجود تھا، اپنے ہی محافظوں کے ہاتھوں قتل کر دیا گیا۔ اس کی سلطنت دریائے سندھ سے لے کر قفقاز کے پہاڑوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب وہ دہلی پر قابض ہوا اور اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس نے مغل سلطنت کے مغربی حصے، جیسے قندھار وغیرہ، کو اپنی ریاست میں شامل کرلیا، تاہم شمالی ہندوستان کو اپنی سلطنت کا حصہ نہیں بنایا۔

نادر شاہ کے ابتدائی حالات سے متعلق یہ بات واضح ہے کہ اس کا تعلق ترک نژاد افشار قبیلے سے تھا، جو ایران کے صفوی شاہ کے وفادار سمجھے جاتے تھے۔ بعد ازاں اس نے ایک عسکری گروہ تشکیل دیا اور اس کی قیادت سنبھالی۔ وہ غیر معمولی عسکری صلاحیتوں کا حامل تھا، جس کی بدولت صفوی حکمران شاہ طہماسپ دوم نے اسے اپنے قریب کرلیا، کیونکہ وہ اپنے کھوئے ہوئے تخت کی بازیابی کی کوشش کر رہا تھا۔ نادر شاہ کی عسکری مہارت کی وجہ سے غلزئی افغانوں کو فیصلہ کن شکست ہوئی، اور طہماسپ دوبارہ ایرانی تخت پر براجمان ہوسکا۔

فروری 1739ء میں، جب نادر شاہ نے شمالی ہندوستان میں مغل سلطنت کے کئی اہم شہروں پر قبضہ کر لیا، تو اس نے کرنال کے مقام پر مغل افواج سے فیصلہ کن جنگ لڑی اور کامیابی حاصل کی۔ اس فتح کے بعد وہ دہلی میں داخل ہوا اور بے پناہ دولت، قیمتی اشیاء اور بھاری تاوان حاصل کر کے واپس چلا گیا۔ تاہم اس کے حکم پر دہلی میں قتل و غارت گری کا ایسا بازار گرم ہوا، جس کی مثال تاریخ میں شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔

اس نے اپنے بیٹے نصر اللہ کی شادی اورنگ زیب کے پوتے اور کام بخش کے بیٹے عزیز الدین کی بیٹی سے کر دی۔ نادر شاہ خود بھی خانِ دوراں کے بھائی مظفر کی خوب صورت بیٹی کو اپنی ملکہ بنانے کا خواہشمند تھا، لیکن اس کی بیویوں میں سے ایک، جو اس کے مزاج کو قابو میں رکھنے کا فن جانتی تھی، اس نے اسے باز رکھا۔ باقی دنیا جس کے ظلم سے خائف تھی، وہ عورت اس پر غالب آ گئی۔

نصر اللہ کی شادی کا اگلا ہفتہ عوامی دعوتوں، ضیافتوں، کھیل تماشوں، جلوسوں اور دیگر تفریحات میں گزرا، جن میں جنگلی جانوروں کی لڑائیاں بھی شامل تھیں۔

ایسی شادی مرضی کی تو نہیں ہوتی، میرے نزدیک یہ بھی تاوان ہی کی ایک شکل ہے!

اگرچہ نادر شاہ ایک شاندار سپہ سالار اور عسکری حکمتِ عملی کا ماہر تھا، تاہم اس میں سیاسی بصیرت اور نظم و نسق کی مہارت کی نمایاں کمی تھی، جس کے باعث اس کے دورِ اقتدار کے آخری سالوں میں ایران شدید انتشار کا شکار ہو گیا۔ اس کی مسلسل فوجی مہموں کے نتیجے میں ہزاروں جانیں ضائع ہوئیں۔ اس نے اپنے عسکری اخراجات پورے کرنے کے لیے غیر معمولی طور پر بھاری ٹیکس عائد کیے، جس سے ایران کی معیشت زوال پذیر ہو گئی۔

نادر شاہ کی فطرت ہمیشہ ہی سخت گیر اور بے رحم رہی، لیکن عمر کے ساتھ ساتھ اس کے ظلم و جبر میں مزید اضافہ ہوتا گیا۔ جہاں بھی اس نے قدم رکھا، وہاں قتل و غارت اور تشدد کی نئی مثالیں قائم ہوئیں۔ اس کے نتیجے میں اس کے خلاف کئی بغاوتیں جنم لینے لگیں۔ بالآخر خراسان میں ایک بغاوت کو کچلنے کی کوشش کے دوران اسے اپنے ہی محافظوں نے قتل کر دیا۔ نادر شاہ کی شخصیت اور فتوحات کے حوالے سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس کی تمام تر دلچسپی جنگ و جدل اور فتوحات میں مرکوز

تھی۔ ایک روایت کے مطابق، جب اسے بتایا گیا کہ جنت میں جنگ نہیں ہوتی، تو اس نے حیرت سے کہا: ''پھر وہاں کوئی لذت کیسے ہوسکتی ہے؟''

اب میں اپنے اصل موضوع کی طرف آتا ہوں کہ نادرشاہ نے شمالی ہندوستان پر حملہ کیوں کیا اور اس کے اس حملے نے شمالی ہندوستان، بالخصوص پنجاب کے سماجی و معاشرتی حالات پر کیا اثرات مرتب کیے۔

ہندوستان پر نادرشاہ کے فوجی حملے کے تاریخی اور جغرافیائی عوامل کا تحقیقی جائزہ

نادرشاہ ایک طرف وسطی ایشیا میں اپنی فتوحات میں مصروف تھا اور دوسری طرف افغانستان میں پختون قبائل کے خلاف جنگ کر رہا تھا۔ ایسے میں اس نے شمالی ہندوستان پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیوں کیا؟ یہ ایک اہم تاریخی سوال ہے، جس کے جواب میں مختلف مورخین نے اپنی آراء پیش کی ہیں۔

سید محمد لطیف کے مطابق، نادرشاہ کے حملے کی ایک بنیادی وجہ مغلوں کی جانب سے افغان مہاجرین کو پناہ دینا تھی۔ جب نادرشاہ نے 1738ء میں قندھار پر قبضہ کیا تو متعدد افغان باشندے دہلی ہجرت کر گئے، جہاں مغل حکومت نے انھیں پناہ دی۔ نادرشاہ نے کئی بار ان کی حوالگی کا مطالبہ کیا، لیکن مغل حکمرانوں نے ٹال مٹول سے کام لیا۔ اس پر نادرشاہ نے ہندوستان پر حملے کا فیصلہ کیا۔ تاہم، اگرچہ یہ وجہ کسی حد تک درست ہوسکتی ہے، لیکن ایک وسیع پیمانے پر فوجی مہم کے آغاز کے لیے یہ واحد یا بنیادی عنصر نہیں ہوسکتا تھا۔ ہندوستان پر نادرشاہ کے حملے کے پیچھے کئی سیاسی، اقتصادی اور جغرافیائی عوامل کارفرما تھے، جن میں سے چند درج ذیل ہیں:

مغلیہ سلطنت کی کمزوری: اورنگزیب عالمگیر کی وفات (1707ء) کے بعد مغلیہ سلطنت زوال کا شکار ہوچکی تھی۔ محمد شاہ رنگیلا (1748-1719ء) کی قیادت میں دربار میں عیش و عشرت اور سازشیں عام ہوگئی تھیں۔ داخلی انتشار، بغاوتوں، درباری ریشہ دوانیوں اور صوبائی گورنروں کی خودمختاری کے باعث مرکزی حکومت کمزور ہوچکی تھی۔ مغل افواج میں نظم و ضبط کا فقدان تھا، اور

دفاعی صلاحیتیں کمزور پڑ چکی تھیں۔ نادرشاہ اس سیاسی کمزوری سے بخوبی واقف تھا اور جانتا تھا کہ ایک بکھرتی ہوئی سلطنت اس کے حملے کا مؤثر جواب دینے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔

سرحدی توسیع اور فوجی فتوحات: نادرشاہ نے 1738ء میں قندھار، غزنی، کابل اور پشاور کو فتح کر کے مغلیہ سلطنت کی سرحدوں تک اپنی حکومت کو وسعت دے دی تھی۔ اس کے بعد ہندوستان پر حملہ کرنا ایک فطری قدم محسوس ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ، مغل گورنروں کی نااہلی اور کمزوری بھی اسے ہندوستان پر حملے کی ترغیب دے رہی تھی۔

معاشی عوامل اور دولت کی خواہش: نادرشاہ کی مسلسل فوجی مہمات کی وجہ سے ایران میں معاشی بحران پیدا ہو چکا تھا۔ اپنے فوجی اخراجات پورے کرنے کے لیے اسے بے پناہ دولت کی ضرورت تھی۔ ہندوستان اپنی دولت، سونے کے ذخائر اور تجارتی خوشحالی کے باعث دنیا بھر میں مشہور تھا۔ نادرشاہ جانتا تھا کہ مغلیہ سلطنت کمزور ہو چکی ہے اور اسے شدید مزاحمت کا سامنا نہیں ہوگا، لہٰذا ہندوستان پر حملہ کر کے وہ اپنی معاشی مشکلات کو کم کر سکتا ہے۔

ہندوستان میں ایرانی اور افغان باشندوں کے ساتھ ناروا سلوک: بعض مورخین کے مطابق، ہندوستان میں موجود ایرانی اور افغان تاجروں اور باشندوں کے ساتھ کیے جانے والے ناروا سلوک کا بدلہ لینا بھی نادرشاہ کے حملے کی ایک وجہ تھی۔ اسے اطلاع ملی تھی کہ مغل حکمرانوں کے دور میں ایرانی تاجروں کو خاص تحفظ حاصل نہیں رہا اور انھیں مختلف مشکلات کا سامنا ہے۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ نادرشاہ کے ہندوستان پر حملے کے پیچھے کوئی ایک وجہ نہیں تھی، بلکہ سیاسی، اقتصادی اور جغرافیائی عوامل نے مل کر اس مہم کو جنم دیا۔ کرنال کی جنگ میں مغل فوج کی شکست اور دہلی کی تباہی نے ہندوستان کی تاریخ پر گہرے اثرات مرتب کیے اور مغل اقتدار کو مزید کمزور کر دیا۔

شمالی ہندوستان، بالخصوص پنجاب، پر نادرشاہ کے حملے کے اثرات: 1739ء میں نادرشاہ کا

ہندوستان پر حملہ ایک اہم تاریخی واقعہ تھا، جس کے مغل سلطنت اور برصغیر پاک و ہند کے لیے گہرے نتائج برآمد ہوئے۔ اس حملے، خاص طور پر دہلی کی لوٹ مار، بڑے پیمانے پر تباہی، سیاسی عدم استحکام اور اقتصادی زوال کا باعث بنی۔ ذیل میں اس حملے کے اہم اثرات بیان کیے جا رہے ہیں۔ یہ میرے خیالات ہیں، ممکن ہے کچھ پہلوؤں میں اختلاف ہو:

سیاسی اثرات: مغلیہ سلطنت، جو پہلے ہی زوال کا شکار تھی، اس کے اقتدار کو شدید دھچکا لگا۔ حملے نے مغل فوج اور انتظامیہ کی کمزوریوں کو بے نقاب کر دیا۔ اس حملے کے بعد مراٹھوں، جاٹوں اور سکھوں جیسی علاقائی طاقتوں کو مغل بالادستی کو چیلنج کرنے کا موقع ملا۔

معاشی اثرات: نادر شاہ نے ہندوستان سے بے پناہ دولت اکٹھی کی۔ اس نے مشہور تختِ طاؤس اور کوہِ نور ہیرے بھی بادشاہ سے لے لیے۔ ایک طرف اس نے بڑی مقدار میں سونا، چاندی اور زیورات قبضے میں لیے، اور دوسری طرف امن و امان کی خرابی کی وجہ سے معاشی سرگرمیاں متاثر ہوئیں۔

سماجی اور ثقافتی اثرات: دہلی میں بڑے پیمانے پر ہونے والے قتل عام کی وجہ سے لوگوں پر گہرے معاشرتی اثرات مرتب ہوئے۔ خاندانی نظام ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوا۔ اس حملے کے نتیجے میں بڑے پیمانے پر خوف اور عدم استحکام پیدا ہوا، جس سے بہت سے علماء، کاریگر اور تاجروں کو جنوبی ہندوستان اور بنگال کی طرف ہجرت کرنا پڑی۔ مغلیہ تہذیب و ثقافت کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا، جس کی وجہ سے اندرونی اقتدار کی کشمکش اور گروہ بندی میں تیزی آئی۔

فوجی نتائج: کرنال کی جنگ میں مغل فوج کی شکست نے اس کی فوجی کمزوری کو ظاہر کیا۔ نادر شاہ کے حملے نے مغلوں کے فرسودہ طریقوں کے مقابلے میں فارسی فوجی حکمت عملی کی برتری کو واضح کیا۔ چند سال بعد اسی صورت حال نے احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان پر حملہ کرنے کا موقع فراہم کیا۔

جغرافیائی و سیاسی تبدیلیاں: نادر شاہ نے افغانستان اور پنجاب کے کچھ حصوں پر قبضہ کر لیا، جس سے ان علاقوں میں مغلوں کا کنٹرول کمزور ہو گیا۔ ان سرحدی علاقوں کے نادر شاہ کے قبضے کی وجہ سے مغل سلطنت کے لیے افغان حکمرانوں کی طرف سے حملوں کا خطرہ بہت بڑھ گیا۔

نادر شاہ کا حملہ ہندوستانی تاریخ میں ایک اہم موڑ تھا۔ اس نے مغلیہ سلطنت کے زوال کو تیز کیا، معیشت کو درہم برہم کر دیا، اور ہندوستان کو مزید حملوں کا شکار بنا دیا۔ اس کے بعد پیدا ہونے والی افراتفری نے بالآخر برطانوی نوآبادیاتی توسیع کی راہ ہموار کی، کیونکہ علاقائی طاقتیں مغلوں کی کمزور حکمرانی سے پیدا ہونے والے طاقت کے خلا کو پر کرنے کے لیے جدوجہد کر رہی تھیں۔ ایک بڑی مرکزی حکومت کا خاتمہ درحقیقت ہندوستان کی اجتماعی وحدت پر ایک کاری ضرب ثابت ہوا، اور اس کے بعد ہندوستان کبھی بھی متحد نہیں ہو سکا۔

احمد شاہ ابدالی

جس نے ہندوستان پر نو بار حملہ کیا

پروفیسر ڈاکٹر عاشق محمد خان درانی، جو بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان کے شعبہ تاریخ کے سابق چیئرمین رہ چکے ہیں، نے تاریخ افغانستان کے عنوان سے ایک کتاب تصنیف کی ہے۔ اس کتاب میں افغانستان کی تاریخ پر ان کی گہری تحقیق اور تجزیات شامل ہیں۔ ڈاکٹر درانی کی تصانیف تاریخ کے طلبہ اور محققین کے لیے اہم ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں، جو افغانستان اور ملتان کی تاریخ کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ میں نے اس کتاب میں یہ پڑھا ہے کہ احمد شاہ ابدالی نے نو بار ہندوستان پر حملہ کیا۔ ان میں سے کئی حملے صرف شمالی ہندوستان تک محدود تھے۔ میں پہلے احمد شاہ ابدالی کے بارے میں کچھ بیان کروں گا، پھر ان حملوں کا ذکر کروں گا۔ بعد میں ان حملوں کی وجہ سے شمالی ہندوستان، بالخصوص پنجاب کے سماج پر مرتب ہونے والے اثرات پر بات کروں گا۔

احمد شاہ درانی: افغانستان کے بانی اور توسیع پسند حکمران

انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا میں احمد شاہ ابدالی کے بارے میں ایک طویل مضمون ملتا ہے۔ اس مضمون کا خلاصہ پیشِ خدمت ہے۔ احمد شاہ درانی کی پیدائش 1722ء میں ملتان، پنجاب میں ہوئی، جہاں ان کے والد جنگ سے بچنے کے لیے قندھار سے ملتان آئے تھے۔ ان کا انتقال اکتوبر 1772ء میں ہوا۔ احمد شاہ ابدالی کا مزار قندھار میں واقع ہے۔ مجھے ان کے مزار پر دو مرتبہ جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ انھیں افغانستان میں ایک پیر کا درجہ حاصل ہے، اور عام افغانی انھیں ''بابا احمد شاہ ابدالی'' کے نام سے پکارتے ہیں۔ یاد رہے کہ ''ابدالی'' ان کے قبیلے کا نام تھا، جبکہ ''درانی'' ان کا لقب تھا (درانی کا مطلب ایک بہترین ہیرا ہے)۔

احمد شاہ ابدالی کو جدید افغان ریاست کے بانی اور ایک وسیع سلطنت کے حکمران کی حیثیت حاصل ہے۔ ان کی سلطنت نے دریائے آمو سے لے کر بحرِ ہند، اور خراسان سے کشمیر، پنجاب اور سندھ تک وسعت اختیار کی۔ ایک مرکزی حکمران کے طور پر، احمد شاہ درانی کو ملکی و خارجہ امور سمیت ریاست کے تمام سول و عسکری محکموں پر مکمل اختیار حاصل تھا۔ ان کی معاونت کے لیے ایک وزیرِ اعظم اور نو تا حیات مشیروں پر مشتمل کونسل موجود تھی، جس کے ارکان کا انتخاب انھوں نے ممتاز افغان قبائل کے سرداروں میں سے کیا تھا۔

احمد شاہ درانی، سدوزئی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے اور محمد زمان خان کے دوسرے فرزند تھے۔ ابتدا میں وہ نادر شاہ افشار کے ماتحت ابدالی گھڑسوار فوج کے کمانڈر کے طور پر خدمات انجام دیتے رہے۔ یاد رہے کہ اس وقت قندھار اور ہرات پر نادر شاہ کی حکمرانی تھی، اس لیے اس علاقے کے بیشتر پختون ان کے ساتھ تھے۔ 1747ء میں نادر شاہ کے قتل کے بعد، قندھار کے قریب ایک قبائلی جرگے میں انھیں افغان سرداروں نے متفقہ طور پر بادشاہ منتخب کیا، جہاں ان کے نام کے سکے جاری کیے گئے اور انھوں نے دارالحکومت کی بنیاد رکھی۔

احمد شاہ درانی نے اپنی سلطنت کو وسعت دینے کے لیے 1747ء سے 1769ء کے درمیان ہندوستان پر نو مرتبہ حملے کیے، اگرچہ ان کا بنیادی مقصد مستقل طور پر کسی ہندوستانی سلطنت کا قیام نہیں تھا۔ 1757ء میں، دہلی پر بلا مزاحمت قبضہ کرنے کے بعد، انھوں نے آگرہ، متھرا، اور وریندن کو بھی لوٹ لیا۔ حملوں کی تعداد کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے، کیونکہ کئی حملے صرف سرحدی علاقوں تک محدود تھے، اس لیے کچھ مورخین انھیں حملوں کی گنتی میں شامل نہیں کرتے۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ احمد شاہ ابدالی نے مغلوں کو مراٹھوں سے بچانے کے عوض دہلی سے واپسی سے قبل مغل شہنشاہ محمد شاہ کی بیٹی حضرت بیگم سے نکاح کیا، جبکہ ان کے بیٹے تیمور کو پنجاب کا وائسرائے مقرر کیا گیا، جس نے بعد میں مغل شہنشاہ عالمگیر ثانی کی بیٹی سے شادی کی۔ اس طرح، باپ اور بیٹے دونوں نے مغل شہزادیوں سے شادیاں کیں۔

میرے خیال میں یہ تاوان تھا۔۔۔ کاش ایسا نہ ہوتا۔۔۔ احمد شاہ ابدالی کے اس فعل نے

ان کی قدر میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔

تاہم، 1758ء میں سکھ، مغل اور مراٹھہ افواج کے مشترکہ حملے کے نتیجے میں تیمور کو پنجاب سے پسپا ہونا پڑا۔ اس کے بعد احمد شاہ ابدالی نے 1759ء سے 1761ء کے دوران ایک بھرپور حملہ کیا اور پانی پت کی تیسری جنگ (14 جنوری 1761ء) میں مراٹھوں کو فیصلہ کن شکست دے کر انھیں پنجاب سے بے دخل کر دیا اور دہلی کے شمال میں ان کی وسیع فوج کو تہس نہس کر دیا۔ اس کے بعد مغل برائے نام حکمران رہ گئے، جبکہ اصل اختیار ابدالی خاندان کے پاس تھا، البتہ ہندوستان کے شہنشاہ کے طور پر مغل ہی جانے جاتے تھے۔

1760ء کی دہائی میں، احمد شاہ درانی نے سکھوں کے خلاف چار عسکری مہمات کا آغاز کیا، مگر اندرونی بغاوتوں اور دیگر چیلنجز کے باعث ان کی سلطنت عدم استحکام کا شکار ہوگئی، اور بالآخر وہ پنجاب پر اپنا تسلط برقرار نہ رکھ سکے۔ احمد شاہ درانی کو ان کی وفات کے بعد قندھار میں سپردِ خاک کیا گیا، جہاں ان کا مقبرہ آج بھی موجود ہے۔

احمد شاہ درانی کے ہندوستان پر حملے کے محرکات

تاریخی اعتبار سے احمد شاہ درانی کے ہندوستان پر حملوں کے پس پردہ کئی عوامل کارفرما تھے۔ ان حملوں کے مقاصد کو محض مذہبی بنیادوں پر محدود کرنا مناسب نہیں ہوگا، بلکہ سیاسی، معاشی، اور عسکری حکمت عملیوں کے تناظر میں بھی ان کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

شاہ ولی اللہ کی دعوت: حقیقت یا مفروضہ؟

ایک عمومی تاثر پایا جاتا ہے کہ احمد شاہ درانی کو ہندوستان پر حملے کی دعوت شاہ ولی اللہ نے دی تھی۔ تاہم، اس حوالے سے مختلف تاریخی ذرائع میں تضاد پایا جاتا ہے۔ سید محمد لطیف کی تصنیف میں اس بات کا کوئی واضح ثبوت نہیں ملتا کہ شاہ ولی اللہ نے احمد شاہ درانی کو براہِ راست حملے کی دعوت دی تھی۔ البتہ یہ ضرور بیان کیا گیا ہے کہ اُس دور میں سکھوں اور مراٹھوں کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ اور ان کے مظالم کے سبب بعض مسلم حلقے احمد شاہ درانی کی آمد کو خوش آئند سمجھتے تھے۔

ہری رام گپتا کی تصنیف *Marathas and Panipat* کے مطابق نہ صرف شاہ ولی اللہ

بلکہ کئی دیگر مذہبی و سیاسی شخصیات نے بھی احمد شاہ درانی کو ہندوستان پر حملے کی دعوت دی تھی۔ اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ احمد شاہ درانی اس سے قبل بھی بغیر کسی دعوت کے کئی بار ہندوستان پر حملہ کر چکا تھا، لیکن اس مخصوص حملے کی وجہ سکھوں اور مراٹھوں کے مظالم اور شمالی ہندوستان میں مسلمانوں کے تحفظ کی خواہش کو قرار دیا جاتا ہے۔

احمد شاہ درانی کے ہندوستان پر حملے کے بنیادی عوامل

احمد شاہ درانی کے ہندوستان پر حملے محض مذہبی مقاصد کے تحت نہیں کیے گئے تھے، بلکہ ان کے پیچھے کئی دیگر سیاسی، عسکری اور اقتصادی عوامل بھی موجود تھے:

ہندوستان کی دولت کا استحصال: احمد شاہ درانی اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھا کہ ہندوستان، خصوصاً مغلیہ سلطنت، بے پناہ دولت رکھتی ہے۔ محمود غزنوی اور نادر شاہ کی طرح، اس نے بھی ہندوستان کو دولت کی سرزمین کے طور پر دیکھا۔ وہ نادر شاہ کے ساتھ دہلی آ چکا تھا اور اس تجربے نے اسے ہندوستان کے اقتصادی وسائل کی اہمیت سے روشناس کروایا۔ اس کے حملوں کے نتیجے میں نہ صرف وسیع مقدار میں مال و دولت افغانستان منتقل کی گئی، بلکہ ایک بڑی تعداد میں مرد و خواتین کو بھی غلام بنا کر لے جایا گیا۔

مراٹھوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کا مقابلہ: احمد شاہ درانی نے مغل سلطنت کی زوال پذیری اور مراٹھوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو ایک بڑا خطرہ تصور کیا۔ مراٹھے شمالی ہندوستان میں اپنا تسلط بڑھا رہے تھے، جس سے پنجاب، جو احمد شاہ درانی کے زیرِ اثر تھا، براہِ راست خطرے میں تھا۔ اسی خطرے کے پیش نظر اس نے پانی پت کی تیسری جنگ (1761ء) میں مراٹھوں کو شکست دینے کے لیے حملہ کیا۔

پنجاب پر کنٹرول برقرار رکھنا: احمد شاہ درانی کے لیے پنجاب ایک اہم خطہ تھا جو افغانستان اور ہندوستان کے درمیان ایک پیش قدمی کے لیے ایک بہترین راستہ فراہم کرتا تھا۔ اسے یہ اندیشہ تھا کہ اگر پنجاب اس کے کنٹرول سے نکل گیا، تو مراٹھے افغانستان کی سرحد تک پہنچ سکتے ہیں۔ مراٹھوں نے بالفعل پشاور پر قبضہ کر لیا تھا، جو اس خطرے کی ایک واضح مثال تھی۔

ہندوستان میں سیاسی عدم استحکام: مغل سلطنت کے زوال کے ساتھ، ہندوستان میں شدید سیاسی عدم استحکام پیدا ہو چکا تھا۔ مختلف ہندوستانی حکمرانوں، بشمول مغل شہنشاہ، روہیلا سرداروں اور دیگر مقامی نوابوں نے احمد شاہ درانی کو اپنے سیاسی مفادات کے تحفظ کے لیے مداخلت کی دعوت دی۔ اس داخلی انتشار نے احمد شاہ درانی کو ہندوستان میں بار بار حملے کرنے کی ترغیب دی۔

اپنی سلطنت کو محفوظ بنانا: احمد شاہ درانی کے حملے ایک وسیع حکمت عملی کا حصہ تھے، جس کا مقصد نہ صرف ہندوستان میں اپنا اثر ورسوخ قائم کرنا تھا بلکہ اپنی افغان سلطنت کو مراٹھوں اور دیگر بیرونی خطرات سے محفوظ رکھنا بھی تھا۔ اگرچہ اس نے شمالی ہندوستان میں کئی فتوحات حاصل کیں، مگر وہ کبھی بھی ہندوستان پر مستقل قبضہ قائم کرنے میں دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔

سکھ مزاحمت کا مقابلہ: پانی پت کی جنگ کے بعد، احمد شاہ درانی کو پنجاب میں سکھوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس نے کئی مواقع پر سکھوں کو دبانے کی کوشش کی، لیکن اس کی وفات کے بعد سکھوں نے پنجاب پر غلبہ حاصل کر لیا۔ بعض مواقع پر اس نے سکھوں کے ساتھ مصالحت بھی کی، جس کی ایک مثال ریاست پٹیالہ ہے۔

احمد شاہ درانی کے حملے: مذہبی یا سیاسی و اقتصادی؟

یہ سوال کہ آیا احمد شاہ درانی کے حملے اسلام کی سربلندی کے لیے تھے یا محض سیاسی و معاشی عوامل پر مبنی تھے، ہمیشہ سے متنازع رہا ہے۔ ہندو اور سکھ مؤرخین عام طور پر یہ مؤقف رکھتے ہیں کہ ان حملوں کا مقصد صرف دولت کا حصول اور سیاسی غلبہ تھا، جبکہ مسلم مؤرخین اکثر انھیں اسلام کے تحفظ کے لیے کی جانے والی جدوجہد قرار دیتے ہیں۔

اگر ہم تاریخی شواہد کا غیر جانبدارانہ تجزیہ کریں، تو یہ واضح ہوتا ہے کہ احمد شاہ درانی ایک مسلمان حکمران تھا، اور اس دور کے دیگر حکمرانوں کی طرح اس کے اقدامات بھی سیاسی، عسکری اور معاشی مفادات سے جڑے ہوئے تھے۔ اس کے حملوں کے نتیجے میں ہندو اور سکھ بڑی تعداد میں مارے گئے، ان کے مقدس مقامات کی بے حرمتی ہوئی، لیکن ساتھ ہی ساتھ شمالی ہندوستان میں مسلم آبادی کو بھی تحفظ حاصل ہوا۔ اگر وہ ہندوستان پر حملے نہ کرتا، تو غالب امکان تھا کہ مراٹھے،

راجپوت، جاٹ اور سکھ مسلم ریاستوں کو مکمل طور پر ختم کر دیتے۔

اس کے ثبوت کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ لاہور میں سکھوں کی مِسلوں کے دور میں اور اس کے بعد بھی سکھ دورِ حکومت (1799-1849) کے دوران بادشاہی مسجد کو غیر مذہبی مقاصد کے لیے استعمال کیا گیا، جس میں اسے گھوڑوں کے اصطبل اور فوجی چھاؤنی کے طور پر استعمال کیا گیا۔ بعض مؤرخین کے مطابق، یہ اقدام احمد شاہ درانی کی جانب سے گولڈن ٹیمپل کی بے حرمتی کے ردعمل کے طور پر کیا گیا تھا۔ تاہم، 1849ء میں جب انگریزوں نے پنجاب پر قبضہ کیا، تو انھوں نے بادشاہی مسجد کو مسلمانوں کے مذہبی استعمال کے لیے بحال کر دیا۔ سید محمد لطیف کی History of the Punjab اور کنہیا لال کی تاریخِ لاہور میں سکھوں کے دور میں بادشاہی مسجد کی حالت پر تفصیلات موجود ہیں۔

یہ سب کچھ جان کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ احمد شاہ درانی کے حملوں کو محض مذہبی جہاد قرار دینا ایک محدود نقطہ نظر ہوگا، کیونکہ ان کے پیچھے کئی سیاسی، اقتصادی اور عسکری عوامل کارفرما تھے۔ تاہم، ان حملوں نے شمالی ہندوستان میں طاقت کا توازن تبدیل کر دیا اور مسلم آبادی کو مراٹھوں اور سکھوں کے اثر و رسوخ سے عارضی تحفظ فراہم کیا۔ تاریخی اعتبار سے ان حملوں کو ایک پیچیدہ اور کثیر الجہتی تناظر میں دیکھنا ضروری ہے، تاکہ ان کے حقیقی مقاصد اور اثرات کو درست طریقے سے سمجھا جا سکے۔

میں کسی کی بھی عبادت گاہ کی بے حرمتی کو مناسب نہیں سمجھتا۔ ایسا کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔

یہ تمام حالات و واقعات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو برصغیر میں مسلمانوں کی مکمل تباہی منظور نہ تھی، جس کے نتیجے میں احمد شاہ ابدالی کی صورت میں ایک مضبوط قیادت میسر آئی۔ اگرچہ اس کی آمد سے برصغیر کے مسلمانوں کو ایک حد تک تحفظ حاصل ہوا اور وہ سکون کا سانس لے سکے، لیکن اس کے بعض اقدامات، بالخصوص ہندو اور سکھ مقدس مقامات کی بے حرمتی، مذہبی بنیادوں پر ایک دیرپا تقسیم کا سبب بنے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان ہی عوامل نے بعد میں آزادیِ ہند کے عمل کو تقسیمِ ہند کی صورت میں تبدیل کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہو۔

❀❀❀

جنگِ بکسر
جس نے ہندوستان کی تاریخ بدل کر رکھ دی

اب تک کے تاریخی تناظر میں یہ واضح ہوتا ہے کہ برطانوی قوتوں کا شمالی ہندوستان پر مکمل قبضہ نہیں ہوا تھا۔ اس وقت شمالی ہندوستان میں طاقت کے توازن کا دار و مدار نادر شاہ، احمد شاہ ابدالی، مغل حکمرانوں، سکھوں اور مراٹھوں کے مابین جاری سیاسی اور عسکری کشمکش پر تھا۔ دوسری جانب برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی جنوبی ہندوستان اور بنگال میں اپنی گرفت مضبوط کر رہی تھی۔

بکسر کی جنگ: پس منظر اور اثرات

1757ء میں ہونے والی جنگِ پلاسی اس تناظر میں ایک فیصلہ کن معرکہ ثابت ہوئی، جس کے بعد برطانوی قوتوں نے بنگال اور بہار پر اپنی بالواسطہ حکمرانی قائم کرنے کی کوشش کی۔ یہ وہ مرحلہ تھا جب پہلی بار برطانوی نظریں شمالی ہندوستان کی جانب مرکوز ہوئیں۔ اس سلسلے میں ایک اور اہم جنگ 22 اکتوبر 1764ء کو بہار کے شہر بکسر کے مقام پر لڑی گئی، جو شمال مشرقی ہندوستان پر برطانوی تسلط کے استحکام کا باعث بنی۔ بکسر، دہلی سے نو سو کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس کے اور دہلی کے درمیان ایودھیا اور لکھنؤ جیسے اہم شہر آباد ہیں۔

اس جنگ میں ایک جانب برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کی افواج تھیں، جن کی قیادت میجر ہیکٹر منرو کر رہے تھے، جبکہ دوسری جانب بنگال، اودھ اور مغل سلطنت پر مشتمل ہندوستانی اتحاد کی مشترکہ فوج موجود تھی۔ بکسر کی جنگ میں برطانوی فتح نے برصغیر میں انگریزی حکمرانی کے پھیلاؤ کو مزید تقویت دی، اور اس کے نتیجے میں برطانوی اثر و رسوخ وسیع ہو گیا۔ تاہم، اس جنگ کے بعد بھی شمال مغربی ہندوستان، بالخصوص دہلی، برطانوی تسلط سے محفوظ رہا۔

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ بکسر کی جنگ کے تقریباً 94 برس بعد تک مغل بادشاہ دہلی کے تخت پر براجمان رہے، اور رسمی طور پر بادشاہت کا حق دہلی کے مغل حکمران کو ہی حاصل تھا۔ اس جنگ کے اثرات کو سمجھنا پنجاب میں آنے والی سیاسی تبدیلیوں کے پس منظر کو جاننے میں بھی مددگار ثابت ہوتا ہے۔ اس جنگ کی تفصیلات انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا سے لی گئی ہیں۔

یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ 1757ء میں جنگِ پلاسی جیتنے کے بعد پہلی بار برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایک بڑی فوج تیار کی، جس میں ہندوستانی سپاہی اور گھڑسوار دستے شامل تھے۔ یہاں سے ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کے لوگ انگریزوں کی فوج میں شامل ہونا شروع ہوئے، اور انگریزوں نے انھیں اپنے ہی ہم وطنوں پر گولیاں چلانے کے لیے استعمال کیا۔ نہ صرف انگریزوں نے یہاں کے لوگوں کو سپاہی بھرتی کیا، بلکہ انھوں نے ایک بڑی تعداد کو تعلیم دے کر اپنے انتظامی معاملات میں معاون کے طور پر بھی رکھا۔

اگر آپ نقشے کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ بکسر دریائے گنگا کے جنوب میں، پٹنہ کے قریب، اتر پردیش میں واقع ہے۔ اس کے مشرق میں مغربی بنگال واقع ہے۔ بکسر کی جنگ سے پہلے جنوبی ہند اور بنگال پر انگریزوں کا براہِ راست اور بالواسطہ قبضہ ہو چکا تھا۔ اب وہ شمالی ہندوستان کی طرف رخ کر رہے تھے۔

اس جنگ کے نتیجے میں 1765ء کا معاہدۂ الہ آباد ہوا، جس میں مغل شہنشاہ نے بنگال کی خودمختاری انگریزوں کے حوالے کر دی۔ جنگِ پلاسی کا فاتح لارڈ رابرٹ کلائیو بنگال کا پہلا گورنر مقرر ہوا۔

بعض قارئین یہ سوال اٹھا سکتے ہیں کہ جنگِ بکسر کا پنجاب سے کیا تعلق ہے؟ اس سوال کا جواب تاریخی حقائق کی روشنی میں یہ ہے کہ جنگِ بکسر کے بعد معروضی طور پر مغلیہ سلطنت کی مرکزیت اور عملی حیثیت کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ اس زوال کے نتیجے میں ہندوستان میں طاقت کا توازن مکمل طور پر تبدیل ہو گیا، اور برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے برصغیر کے دیگر علاقوں، خصوصاً پنجاب، کی طرف پیش قدمی کی راہ ہموار ہو گئی۔

جنگِ بکسر کے بعد انگریزوں نے شمالی ہندوستان میں اپنی سیاسی وعسکری موجودگی کو بتدریج وسعت دینا شروع کی، اور اسی تناظر میں وہ ستلج کے مشرق میں واقع سکھ ریاستوں کے ساتھ سفارتی وتجارتی تعلقات قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ تعلقات بظاہر دوستانہ نوعیت کے تھے،لیکن درحقیقت یہ ایک نرم نوآبادیاتی حکمتِ عملی (Soft Colonization Strategy) کا حصہ تھے،جس کے ذریعے کمپنی نے مستقبل میں پنجاب پر مکمل تسلط کے لیے بنیاد فراہم کی۔

یوں جنگِ بکسر محض ایک فوجی معرکہ نہیں بلکہ اس نے ہندوستان کے سیاسی منظرنامے پر دور رس اثرات مرتب کیے،جن میں پنجاب کی سیاسی خودمختاری کا بتدریج خاتمہ بھی شامل تھا۔

جنگِ بکسر کا ایک مختصر احوال

اس جنگ کا احوال کئی مورخین نے تحریر کیا ہے۔ میں نے درج ذیل معلومات مارک کارٹ رائٹ (Mark Cartwright) کے ایک مضمون Battle of Buxar سے حاصل کی ہیں۔ اس مضمون کا خلاصہ پیشِ خدمت ہے:

22 اور 23 اکتوبر 1764ء کو شمال مشرقی ہندوستان کے علاقے بہار میں لڑی جانے والی جنگِ بکسر (جسے بھکسر یا بکسر بھی کہا جاتا ہے)، برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی (EIC) اور برصغیر کے مقامی حکمرانوں کے مابین ایک فیصلہ کن معرکہ ثابت ہوئی۔ اس جنگ میں برطانوی فوج کی قیادت ہیکٹر منرو (1726-1805) نے کی، جبکہ ان کے مدِ مقابل نواب اودھ شجاع الدولہ، نوابِ بنگال، اور مغل شہنشاہ شاہ عالم ثانی (1760-1806) کی متحدہ افواج تھیں۔

بنگال کی فتح کے بعد، برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کی توجہ شمالی ہندوستان پر مرکوز ہوگئی، جہاں ابھی تک مغل حکمرانی قائم تھی۔ بنگال میں انگریزوں کی کامیابی کے بعد، یہ واضح ہو چکا تھا کہ اب شمالی ہندوستان پر قبضے کی کوشش کی جائے گی۔ اس خطرے کو محسوس کرتے ہوئے، تین طاقتور ریاستوں نے برطانوی پیش قدمی کو روکنے کے لیے اتحاد قائم کیا۔

اتحاد میں شامل تین طاقتیں شامل تھیں:

ریاست اودھ: جس کا دارالحکومت لکھنؤ تھا اور اس وقت نواب شجاع الدولہ

(1774-54ء)اس کے حکمران تھے۔

بنگال کے سابق نواب میر قاسم جو انگریزوں سے ناراض ہو کر اس اتحاد میں شامل ہوئے۔

مغل بادشاہ شاہ عالم ثانی، جو برطانوی اثر ورسوخ کے خلاف مزاحمت کرنا چاہتے تھے۔ان کی فوج کی قیادت ایک فرانسیسی جنرل جین بپٹسٹ جینٹل (Jean Baptiste Gentil) کر رہے تھے۔یہ اتحادی افواج راستے میں مغل فوج کے ساتھ شامل ہو گئیں،اور مجموعی طور پر پچاس ہزار فوجیوں پر مشتمل ایک بڑا لشکر تشکیل پایا۔ برطانوی فوج نے میجر ہیکٹر منرو کی قیادت میں اس اتحاد کا سامنا کیا۔عددی برتری کے باوجود، اتحادی فوج کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ جنگ کا نتیجہ نکلا کہ؛

میر قاسم میدان چھوڑ کر چلے گئے۔

شجاع الدولہ نے برطانوی بالادستی کو تسلیم کر لیا۔

شاہ عالم ثانی نے انگریزوں سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔

معاہدۂ الہ آباد(1765):غلام ہندوستان پر مہرِ تصدیق

اس جنگ سے پہلے ہندوستان بھر میں کئی مقامات پر انگریزوں کے خلاف مزاحمت ہو رہی تھی۔ یہ آخری جنگ تھی جس کے بعد انگریزوں کے قدم روکنے کے لیے کوئی بھی قوت میدان میں نہ تھی۔ یہ جنگ ہندوستان میں برطانوی غلبے کے لیے فیصلہ کن ثابت ہوئی، کیونکہ اس کے بعد انگریزوں کے خلاف کوئی بڑی مزاحمتی قوت باقی نہ رہی۔12راگست 1765 کو، مغل شہنشاہ شاہ عالم دوم نے الہ آباد میں برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ معاہدہ کیا۔اس معاہدے کے مطابق مغل شہنشاہ نے بنگال، بہار اور اڑیسہ میں زمینی محصول جمع کرنے کا مستقل حق انگریزوں کو دے دیا،جس سے کمپنی کو مالی طور پر مزید مستحکم ہونے کا موقع ملا۔کمپنی نے مغل بادشاہ کو سالانہ 2.6 ملین روپے دینے کا وعدہ کیا۔شاہ عالم کو جنگ کے اخراجات کی مد میں 50 لاکھ روپے کمپنی کو ادا کرنے کا پابند کیا گیا۔

اس معاہدے کے بعد، برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی برصغیر کی سب سے طاقتور قوت بن گئی۔ کمپنی کو فوج، بحری بیڑے اور تجارتی مراکز کو وسعت دینے کے وسیع مواقع حاصل ہوئے۔آخر کار،

1801 میں اودھ کو برطانوی اثر ورسوخ میں شامل کیا گیا، اور 1856 میں اس کا باضابطہ الحاق ہو گیا۔

اس جنگ میں، مشکل حالات کے باوجود، برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایک فیصلہ کن فتح حاصل کی۔ اس کامیابی کے نتیجے میں کمپنی کو مختلف علاقوں میں مالیاتی اور انتظامی اختیارات حاصل ہوئے، خصوصاً محصولات جمع کرنے کے حقوق، جنھوں نے اس کے مالی وسائل میں نمایاں اضافہ کیا۔ یہ مالیاتی استحکام کمپنی کے لیے برصغیر میں مزید علاقائی توسیع کی راہ ہموار کرنے کا سبب بنا اور اس کے اقتدار کو مستحکم کرنے میں مددگار ثابت ہوا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی، جو 1600ء میں قائم کی گئی تھی، 18 ویں صدی کے وسط تک برصغیر میں اپنی تجارتی اجارہ داری کے ذریعے بے پناہ منافع حاصل کر رہی تھی، جس سے اس کے شیئر ہولڈرز غیر معمولی طور پر دولت مند ہو چکے تھے۔ اگرچہ بظاہر یہ ایک تجارتی ادارہ تھا، لیکن درحقیقت یہ برطانوی حکومت کے نوآبادیاتی عزائم کی تکمیل کا ایک مؤثر ذریعہ بھی بن چکی تھی۔

تاریخی تناظر میں دیکھا جائے تو برطانوی حکمتِ عملی یہ رہی کہ کسی بھی علاقے پر تسلط قائم کرنے سے قبل وہاں تجارتی سرگرمیوں کے فروغ پر توجہ مرکوز کی جاتی تھی۔ وہ ابتدائی طور پر تجارتی روابط استوار کرتے، بنیادی ڈھانچے اور عوامی فلاح و بہبود کے منصوبے متعارف کرواتے، جس کے نتیجے میں انھیں مقامی حالات، وسائل، اور سماجی و سیاسی ماحول سے متعلق اہم معلومات حاصل ہو جاتیں۔ ساتھ ہی، وہ مقامی آبادی کی ہمدردیاں حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہو جاتے۔ بعد ازاں، جب ان کی تجارتی اور سیاسی بنیادیں مستحکم ہو جاتیں، تو وہ فوجی مداخلت کے ذریعے اپنی گرفت مضبوط کرتے اور رفتہ رفتہ پورے علاقے پر اپنا کنٹرول قائم کر لیتے۔ یہ طرزِ عمل صرف برطانوی استعمار تک محدود نہیں رہا بلکہ آج کے جدید دور میں بھی کئی عالمی طاقتیں اسی حکمتِ عملی کو اپناتے ہوئے مختلف ممالک میں اپنے اثر و رسوخ کو وسعت دینے کی پالیسی پر عمل پیرا نظر آتی ہیں۔

کمپنی نے اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے ایک خودمختار فوج تشکیل دی، جو نہ صرف اس کی تجارتی سرگرمیوں کو محفوظ رکھتی بلکہ نوآبادیاتی توسیع میں بھی کلیدی کردار ادا کرتی۔ اس کے علاوہ،

کمپنی نے برطانوی فوج سے بھی سپاہیوں کی خدمات حاصل کیں تاکہ اپنی عسکری قوت کو مزید مستحکم کر سکے۔ 1750ء کی دہائی تک، ایسٹ انڈیا کمپنی نہ صرف برصغیر میں اپنا تجارتی نیٹ ورک وسعت دے چکی تھی، بلکہ علاقائی کنٹرول کو بھی مضبوط کرنے کی پالیسی پر عمل پیرا ہو چکی تھی، جس کے نتیجے میں اسے ایک تجارتی ادارے سے نوآبادیاتی طاقت میں تبدیل ہونے کا موقع ملا۔ یہی وہ دور تھا جب انگریزوں نے مقامی لوگوں کو اپنی فوج میں بھرتی کرنا شروع کیا۔

برطانوی فوج میں ہندوستانی شمولیت: ایک تجزیاتی مکالمہ

میرے ایک دور کے رشتہ دار، جو برطانوی فوج سے صوبیدار کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے، سے ایک بار میں نے دریافت کیا کہ انھوں نے برطانوی فوج میں شمولیت کیوں اختیار کی؟ نیز، دورانِ ملازمت انھوں نے اپنے ہی ہم وطنوں پر ہتھیار کیوں اٹھائے، اور برطانوی مفادات کی خاطر دیگر ممالک میں جنگیں کیوں لڑیں؟ حتیٰ کہ مکہ مکرمہ میں بھی برطانوی احکامات کے تحت فائرنگ کیوں کی؟

ان کا جواب حقیقت پر مبنی اور ایک وسیع تر سماجی و معاشی پس منظر کا عکاس تھا۔ انھوں نے وضاحت کی کہ وہ ایک دیہی پس منظر سے تعلق رکھتے تھے، جہاں معاشی مواقع نہایت محدود تھے۔ ان کے بقول، ''ہمارے پاس کوئی مستقل ذریعہ معاش نہیں تھا، پانی تک کی قلت تھی، اور زندگی بسر کرنے کے لیے بنیادی سہولیات بھی میسر نہ تھیں۔ ایسے میں ہماری اولین ترجیح روزگار کا حصول اور خاندان کی کفالت تھی۔ برطانوی فوج میں شمولیت اس وقت ایک ایسا ذریعہ تھا جو ہمیں مالی استحکام، باقاعدہ تنخواہ، راشن، وردی، اور طبی سہولیات فراہم کرتا تھا۔ اس کے علاوہ، ملازمت کے اختتام پر پنشن اور بعض اوقات زمین کی الاٹمنٹ بھی کی جاتی تھی، جو ہمارے معاشی تحفظ کا ضامن تھا۔''

سماجی وقار اور فوجی روایات: صوبیدار صاحب نے مزید وضاحت کی کہ فوج میں شمولیت سے نہ صرف انھیں روزگار حاصل ہوا بلکہ سماجی وقار بھی نصیب ہوا۔ برصغیر کے مخصوص جنگجو طبقات،

جیسے کہ راجپوت، جاٹ، سکھ، مراٹھا اور پٹھان، کے لیے فوجی خدمت ہمیشہ سے عزت و افتخار کا باعث رہی تھی۔ انگریزوں کی فوج میں خدمات انجام دینا ان طبقات کے لیے ایک فطری انتخاب تھا، جو انھیں اپنی روایتی عسکری شناخت برقرار رکھنے کا موقع فراہم کرتا تھا۔

سیاسی پس منظر اور برطانوی غلبہ: انھوں نے مزید کہا کہ مغلیہ سلطنت اور دیگر مقامی طاقتوں (جیسے کہ مراٹھا اور سکھ سلطنت) کے زوال کے بعد، برطانوی فوج ایک غالب عسکری قوت کے طور پر ابھری۔ جو لوگ فوجی پیشہ اختیار کرنا چاہتے تھے، ان کے پاس برطانوی فوج میں شمولیت کے علاوہ کوئی دوسرا مؤثر متبادل نہیں تھا۔

میرے خیال میں، برطانوی حکمتِ عملی میں ایک اہم عنصر یہ تھا کہ انھوں نے ہندوستان میں ایک مضبوط مقامی فوجی ڈھانچہ برقرار رکھا، جس کے ذریعے داخلی استحکام کو یقینی بنایا اور بغاوت کے امکانات کو کم کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ، برطانوی فوج میں شامل ہونے والے نوجوانوں کو ملک کے مختلف حصوں اور بیرونِ ملک خدمات انجام دینے کے مواقع بھی ملے، جو ان کے لیے ایک پرکشش پہلو تھا۔

سیاسی شعور اور برطانوی وفاداری: مکالمے کے اختتام پر، میں نے صوبیدار صاحب سے دریافت کیا کہ آیا انھیں کبھی یہ احساس ہوا کہ وہ اپنے ہی ہم وطنوں کے خلاف ہتھیار اٹھا رہے ہیں؟ ان کا جواب حیران کن تھا۔ انھوں نے اعتراف کیا کہ اس وقت انھیں اس حقیقت کا مکمل ادراک نہ تھا، کیونکہ ان میں سیاسی شعور کی کمی تھی۔ ان کے بقول، ''ہم برطانوی حکمرانوں کو غیر ملکی قابضین کے بجائے ایک جائز آجر (Employer) کے طور پر دیکھتے تھے۔ اس کے علاوہ، اس دور میں برطانوی اقتدار کے ساتھ مقامی ریاستوں کی بڑی تعداد منسلک تھی، جس سے ہمیں یہی محسوس ہوتا تھا کہ برطانوی حکومت کی وفاداری کوئی غیر معمولی امر نہیں۔''

نتائج اور تاریخی تجزیہ: یہ مکالمہ اس حقیقت کو اجاگر کرتا ہے کہ برطانوی فوج میں ہندوستانیوں کی شمولیت محض عسکری مجبوری نہیں تھی بلکہ یہ معاشی استحکام، سماجی وقار، فوجی مراعات، اور اس وقت کے سیاسی حالات کا نتیجہ تھی۔ تاہم، جیسے جیسے ہندوستان میں قومی شعور

بیدار ہوا، خاص طور پر 1857ء کی جنگِ آزادی اور پہلی جنگِ عظیم کے بعد، ہندوستانیوں نے اپنی برطانوی وفاداری پر سوالات اٹھانے شروع کر دیے، جو بالآخر مزاحمت اور آزادی کی تحریکوں کے فروغ کا سبب بنا۔

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ برطانوی سامراج کی بقا میں مقامی ہندوستانی فوجیوں کا کلیدی کردار تھا۔ اگر برطانوی فوج کو ہندوستانی فوجیوں کی معاونت حاصل نہ ہوتی، تو برطانیہ کا ہندوستان پر تسلط برقرار رکھنا مشکل ہو جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ برطانوی سلطنت کی سب سے بڑی اور مضبوط فوج ہندوستانی فوج تھی، جس نے برطانوی مفادات کے تحفظ کے لیے دنیا کے مختلف حصوں میں جنگیں لڑیں اور قربانیاں دیں۔

❁❁❁

شاہ عالم ثانی

زوال پذیر مغلیہ سلطنت کا ایک بے اختیار بادشاہ

ایک مختصر تذکرہ شاہ عالم ثانی کا، جس سے ہمیں یہ جاننے کا موقع ملے گا کہ اُس وقت کے سیاسی حالات کیسے تھے۔

شاہ عالم ثانی (1728-1806)، جو علی گوہر کے نام سے پیدا ہوئے، مغلیہ سلطنت کے سترھویں حکمران تھے۔ ان کے دور میں مغلیہ اقتدار اس قدر کمزور ہو چکا تھا کہ ایک مشہور فارسی محاورہ زبان زدِ عام ہو گیا:

سلطنتِ شاہ عالم، از دہلی تا پالم۔ یعنی ان کی سلطنت صرف دہلی کے نواحی علاقے پالم تک محدود تھی۔

وہ 1772ء میں مراٹھا قوتوں کے زیرِ سایہ دہلی واپس لوٹے، مگر 1788ء میں غلام قادر روہیلہ نے انھیں قید کر کے اندھا کر دیا۔ وہ نہ صرف ایک حکمران تھے بلکہ شاعر بھی تھے، اور "آفتاب" تخلص کرتے تھے۔ ان کی تصنیف عجائب القصص اردو نثر کی قدیم اور اہم کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ یہ سب جان کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جنگِ بکسر اور معاہدۂ الہ آباد ہندوستان میں برطانوی نوآبادیاتی اقتدار کے قیام میں سنگِ میل ثابت ہوئے۔ مغل سلطنت اب صرف نام کی رہ گئی تھی، جبکہ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی برصغیر پر عملی حکمرانی کرنے لگی۔

بکسر کی جنگ کے شمالی ہندوستان پر سیاسی اور سماجی اثرات

اب میں اپنے اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔ اس وقت یہ واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے کہ شمالی ہندوستان میں مغل حکمران برائے نام تھے، جبکہ حقیقی اقتدار انگریزوں کے ہاتھ میں تھا۔

یہ ایک بڑی تاریخی تبدیلی تھی۔ اس تبدیلی کے سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی اور مذہبی اثرات ناگزیر تھے، جن میں سے جو کچھ میں سمجھ پایا، وہ یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔

بکسر کی جنگ میں شکست نے مغل سلطنت کے وقار اور اختیارات کو شدید نقصان پہنچایا۔ شہنشاہ شاہ عالم ثانی کو برطانوی تسلط کو تسلیم کرنے پر مجبور کیا گیا، جس کے نتیجے میں وہ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیرِ اثر ایک کٹھ پتلی حکمران بن گئے۔ اس جنگ کے بعد سلطنتِ مغلیہ کے زوال نے ایک خلا پیدا کیا، جس سے برصغیر میں برطانوی بالادستی کا آغاز ہوا۔ بنگال اور بہار پر قبضے کے بعد انگریزوں نے وافر مالی وسائل حاصل کیے، جو ان کی علاقائی توسیع کے لیے ایک مضبوط بنیاد بنے۔

بکسر کی فتح نے نہ صرف مشرقی ہندوستان میں انگریزوں کے اقتدار کو مستحکم کیا بلکہ برصغیر بھر میں ان کی آئندہ فوجی اور انتظامی توسیع کی راہ بھی ہموار کی۔

ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ اس جنگ کے بعد انگریزوں کا مقامی حکمرانوں سے جو رویہ رہا، اس نے ہندوستانیوں میں شدید ناراضگی اور بے چینی پیدا کی۔ دیسی حکمرانی کے خاتمے اور برطانوی پالیسیوں کے نفاذ نے وسیع پیمانے پر عوام میں عدم اطمینان کو جنم دیا۔ یہی جذبات بعد ازاں انیسویں اور بیسویں صدی میں تحریکِ آزادی کی صورت میں سامنے آئے۔

یہ سب جان کر میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ بکسر کی جنگ ہندوستانی تاریخ کا ایک فیصلہ کن موڑ تھی، جس نے نہ صرف مغلیہ حاکمیت کے خاتمے بلکہ برطانوی سامراج کے آغاز کی علامت بن کر، آزادی کی خواہش کو بھی جنم دیا۔

ان تمام حالات کے مطالعے کے بعد میرے ذہن میں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے: بکسر کی جنگ میں مقامی راجپوت ریاستوں نے حصہ کیوں نہیں لیا؟ اگر وہ بھی اس جنگ میں شریک ہوتیں تو کیا اس کے نتائج مختلف ہو سکتے تھے؟ اس سوال کا کوئی حتمی جواب تو میرے پاس نہیں، لیکن اگر آپ کے پاس کوئی تاریخی یا تحقیقی رائے ہو تو ضرور آگاہ کریں۔

میرا ذاتی تجزیہ یہ ہے کہ ہندوستان کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے کی سب سے بڑی وجہ مقامی حکمرانوں اور ریاستوں کے درمیان عدم اتحاد تھا۔ یہاں کے لوگ نہ تو تعداد میں کم تھے، نہ

وسائل کی کمی تھی، نہ بہادری کا فقدان تھا۔ یہ جنگجو، دلیر اور ذہین قوم تھی۔ لیکن جو چیز مفقود تھی، وہ اتحاد اور یگانگت تھی۔ یہی بنیادی کمزوری صدیوں تک برصغیر کو غیر ملکی تسلط کا شکار بنائے رہی۔ افسوسناک امر یہ ہے کہ یہ عدم اتحاد آج بھی قائم ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ صورتِ حال کب تک جاری رہے گی؟ شاید جب تک عوام اور ان کی قیادت اتحاد و اتفاق کو اپنی اولین ترجیح نہیں بناتے، تاریخ کے یہ تلخ اسباق بار بار دہرائے جاتے رہیں گے۔

اب ہم اپنے اصل موضوع کی طرف واپس آتے ہیں اور ان سیاسی، سماجی اور ثقافتی تبدیلیوں کا جائزہ لیتے ہیں جو بکسر کی جنگ (1764ء) کے بعد شمالی ہندوستان اور پنجاب میں رونما ہوئیں۔

بکسر کی جنگ کے اثرات کا تاریخی جائزہ

بکسر کی جنگ کے نتیجے میں مغل سلطنت عملاً ختم ہوگئی اور اودھ ایک ماتحت ریاست بن کر رہ گیا۔ مغل شہنشاہ نے بنگال، بہار اور اڑیسہ میں برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کو محصولات جمع کرنے کا اختیار تفویض کر دیا، جس کے نتیجے میں ہندوستان میں باضابطہ برطانوی انتظامیہ کا آغاز ہوا۔ اودھ کے نواب شجاع الدولہ کو بھی برطانوی ماتحتی قبول کرنا پڑی، جبکہ بنگال کے نواب کا عہدہ محض رسمی رہ گیا اور اصل اقتدار کمپنی کے ہاتھ میں آ گیا۔

پنجاب اگرچہ براہِ راست اس جنگ سے متاثر نہ ہوا، تاہم اس کے بالواسطہ اثرات بہت گہرے تھے۔ مغل اقتدار کی کمزوری نے طاقت کے خلا کو جنم دیا، جس سے علاقائی طاقتیں خصوصاً سکھ ریاستیں ابھر کر سامنے آئیں۔ اس ضمن میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی قیادت میں ایک مضبوط سکھ سلطنت قائم ہوئی۔ تاہم انیسویں صدی کے آغاز میں جب انگریزوں نے مشرقی اور شمالی ہندوستان پر اپنی گرفت مضبوط کر لی تو انھوں نے پنجاب کی طرف پیش قدمی شروع کی، اور بالآخر 1849ء میں اسے بھی اپنے قبضے میں لے لیا۔

بکسر کی جنگ کے بعد مغلیہ دربار کے زیرِ سرپرستی پروان چڑھنے والے علماء، شعرا اور

فنکار شدید متاثر ہوئے، کیونکہ ان کے لیے سرپرستی کے روایتی ذرائع ختم ہو گئے۔ فارسی، جو انتظامیہ کی زبان تھی، اپنی افادیت کھونے لگی، کیونکہ انگریزوں نے انگریزی اور مقامی زبانوں کو حکومت و عدلیہ میں رائج کیا۔

پنجاب میں سکھ شناخت مزید مستحکم ہوئی، اور سکھ مت کو نئی قوت ملی۔ اس کے برعکس، ہندوستانی اشرافیہ، جو مغلیہ دربار سے وابستہ تھی، برطانوی طرزِ زندگی اپنانے پر مجبور ہوگئی، جس کے نتیجے میں ادب، فنِ تعمیر، اور معاشرت میں مغلیہ، فارسی اور یورپی ثقافتوں کا امتزاج پیدا ہوا۔

برطانوی تسلط کے بعد پہلی بار ریونیو اور ٹیکس وصولی کا مکمل اختیار کمپنی کے پاس آ گیا، جس سے مقامی حکمرانوں کی مالی خودمختاری ختم ہوگئی۔ جاگیرداری نظام بھی زوال پذیر ہوا، کیونکہ کمپنی نے براہِ راست محصولات وصول کرنے کی پالیسی اپنائی۔

اسی دوران، ہندوستانی صنعتوں کا بھی زوال شروع ہوا۔ انگریز حکام نے مقامی دستکاریوں، کپڑا سازی، اور دیگر صنعتوں کو ختم کر کے یورپی مصنوعات کی درآمد کو فروغ دیا۔ پنجاب کی معیشت بھی متاثر ہوئی، کیونکہ تجارتی راستے بدل گئے اور بنگال و بمبئی نئے معاشی مراکز کے طور پر ابھرے، جس سے پنجاب کی تجارت کو نقصان پہنچا۔

بکسر کی جنگ نے نہ صرف شمالی ہندوستان میں برطانوی اقتدار کو مستحکم کیا بلکہ طویل المدتی سیاسی، سماجی اور اقتصادی اثرات بھی مرتب کیے۔ اس جنگ نے مغل سلطنت کے زوال، برطانوی استعمار کے عروج اور ہندوستانی معیشت کے زوال کی راہ ہموار کی۔ پنجاب میں سکھ حکمرانوں نے مغل زوال کے بعد پیدا ہونے والے خلا سے فائدہ اٹھایا، لیکن برطانوی توسیع پسندی کے نتیجے میں 1849ء میں پنجاب بھی انگریزوں کے زیرِ اقتدار آ گیا۔

ان تبدیلیوں نے عوامی شعور کو بیدار کیا اور استحصالی نظام کے خلاف نفرت کو فروغ دیا، جو آخرکار آزادی کی تحریکوں کا پیش خیمہ بنی اور برطانوی راج کے خاتمے پر منتج ہوئی۔

❁ ❁ ❁

سکھ مت

(تاریخی پس منظر، عقائد اور فلسفہ)

میں نے سکھوں کے بارے میں دو مختلف ذرائع سے معلومات حاصل کی ہیں۔ میرے آباؤ اجداد کا تعلق ریاست پٹیالہ کے شہر سرہند سے تھا، اور میرے والد محترم کی پیدائش بھی اسی شہر میں ہوئی تھی۔ ہم کب مسلمان ہوئے، اس بارے میں میرے پاس کوئی قطعی معلومات نہیں ہیں۔ تاہم میری ذاتی رائے یہ ہے کہ ہمارا خاندان شیخ احمد سرہندی کی تعلیمات کے اثر سے مسلمان ہوا تھا۔ ہم کسی وقت راجستھان سے پنجاب آئے تھے، اور اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب میں نے اپنی دادی کی بہن کو راجستھانی لباس میں ملبوس دیکھا۔ یہ صرف میرا قیاس ہے، ممکن ہے درست نہ ہو، لہٰذا اسے حتمی نہ سمجھا جائے۔ یہ محض میری ذاتی فہم ہے جو میں نے بیان کی ہے۔

میرے بزرگ ایک سکھ ریاست سے تعلق رکھتے تھے، اس لیے میں نے ان سے سکھوں کے بارے میں بہت سی باتیں سنیں۔ سکھوں کے بارے میں جاننے کا دوسرا ذریعہ ان کی تحریریں اور سکھ محققین کے لیکچرز ہیں۔ اس کے علاوہ میرے کئی سکھ دوست بھی ہیں جن سے مجھے اس موضوع پر گفتگو کا موقع ملا۔ ان تمام ذرائع سے جو معلومات میں نے حاصل کی ہیں، وہ میں یہاں آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔

مغل سلطنت کے آخری ایّام میں پنجاب میں ایک نئی طاقت نے جنم لیا جس کی بنیاد ایک مذہب پر رکھی گئی تھی۔ یہ پنجاب کی تاریخ کا ایک نہایت اہم واقعہ ہے۔ یہ کیسے، کب اور کیوں ہوا۔ اس کا مختصر تذکرہ ہمیں پنجاب کے سماج میں آنے والی بڑی تبدیلیوں کو سمجھنے میں مدد دے گا۔

میں نے سکھوں پر لکھنے کے لیے انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا میں شائع ہونے والے ایک طویل اور معلوماتی مضمون سے مدد لی ہے، جسے ولیم ہیوٹ مک لاؤڈ (William Hewat McLeod) نے تحریر کیا ہے۔[۱] یاد رہے کہ میرے آباؤ اجداد کا تعلق ریاست پٹیالہ سے تھا، جو کہ ایک سکھ ریاست تھی۔ میں نے اپنے بزرگوں سے سکھوں کے بارے میں بہت کچھ سنا، جس کی وجہ سے مجھے یہ تحریر لکھنے میں آسانی ہوئی۔

سکھ مت کا آغاز پندرہویں صدی کے آخر میں پنجاب میں ہوا۔ ''سکھ'' لفظ ''سیکھنے'' سے نکلا ہے، جس کا مطلب ہے ''طالب علم'' یا ''سیکھنے والا۔'' ''گرو'' کا مطلب ہوتا ہے ''استاد'' یا ''راہ دکھانے والا۔'' سکھ اپنے مذہب کو گرومت یعنی ''گرو کا راستہ'' کہتے ہیں۔ سکھ روایت کے مطابق، اس مذہب کی بنیاد گرو نانک (1469-1539) نے رکھی، جن کے بعد نو دیگر گرو اس تحریک کی رہنمائی کرتے رہے۔[۲]

دسویں گرو، گرو گوبند سنگھ (1666-1708) کی وفات کے بعد کوئی نیا انسانی گرو مقرر نہیں کیا گیا۔ سکھوں کی مقدس کتاب گرو گرنتھ صاحب کو ہی ان کا دائمی اور آخری گرو مانا جاتا ہے۔ یہ کتاب سکھوں کے لیے واحد اور ابدی رہنما کی حیثیت رکھتی ہے، اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی کا سکھ تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اس مضمون میں واضح طور پر لکھا گیا ہے کہ سکھوں کا یہ مؤقف ہے کہ ان کی مذہبی روایت ہمیشہ سے ہندو مت سے الگ اور خود مختار رہی ہے۔ اگرچہ ایک عرصے تک کہا جاتا رہا کہ سکھ مت اپنے ابتدائی دور میں ہندو روایت کے اندر ایک اصلاحی تحریک کے طور پر ابھرا، لیکن سکھوں کی موجودہ شناخت ایک الگ مذہب کی ہے۔ میں نے پاکستان کے صوبہ سندھ میں قائم بیشتر مندروں میں بابا گرو نانک کی تصاویر دیکھی ہیں، مگر کسی گردوارے میں کسی ہندو پنڈت کی

---

[۱] William Hewat McLeod(1932-2009-(Renowned Historian and scholar of Sikhism, known for his extensive research on Sikh history and religion

[۲] یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ عام طور پر لفظ گرو لکھا جاتا ہے۔ سید محمد لطیف کی کتاب میں گورو لکھا ملتا ہے۔ میں گرو ہی کو بہتر جان کر ترجیح دی ہے۔ ہم اپنے گھروں میں اسے گرو ہی بولتے ہیں۔

تصویر نظر نہیں آئی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سکھ مت کے ظہور سے قبل پنجاب میں دو بڑے مذاہب اسلام اور ہندومت موجود تھے۔ اگرچہ عیسائی، جین اور بدھ بھی تھے، لیکن ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ یہ بات معروف ہے کہ بابا گرونانک کی پیدائش ایک ہندو گھرانے میں ہوئی، تاہم ان کی تعلیمات نے ایک الگ راہ اختیار کی۔[1]

سکھ مت شمالی ہندوستان کی سنت روایت سے گہرا تعلق رکھتا ہے، جو مشہور صوفی شاعر کبیر (1440-1518) کی فکر سے متاثر تھی۔ ان کی تعلیمات کا اثر ہندو بھگتی تحریک پر بھی پڑا، حالانکہ ان دونوں کے درمیان کچھ بنیادی فرق بھی پائے جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ سکھ مت پر مسلمان صوفیوں کا بھی قابلِ ذکر اثر رہا ہے۔ خصوصاً مغلیہ دور میں اسلامی تصوف، سنت روایت اور سکھ مت ایک دوسرے سے فکری سطح پر متاثر ہوئے۔ یہ اثر کس حد تک گہرے ہیں۔ اس پر بحث تا حال جاری ہے۔

میں نے ایک کتاب بھی دیکھی ہے جو ایک مسلمان عالم نے لکھی، جس میں بابا گرونانک کو ایک ''بت شکن'' کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

مسلمانوں کے ایک اہم شاعر علامہ اقبال نے ایک نظم میں بابا گرونانک بارے درج ذیل ایک شعر لکھا ہے؛

پھر اُٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اک مردِ کامل نے جگایا خواب سے

بھگت کبیر: ایک نمایاں رہنما

بھگتی تحریک کے نمایاں رہنماؤں میں بھگت کبیر (1440-1518) کا نام خاص اہمیت رکھتا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مطابق، کبیر ایک مشہور ہندوستانی شاعر اور صوفی سنت تھے، جنھیں ہندو، مسلمان، اور سکھ برادریوں میں یکساں عزت حاصل ہے۔ ان کی پیدائش

[1] https//:www.humsub.com.pk/510831/nasir-iqbal-lahore-12

اور ابتدائی زندگی کے بارے میں مختلف روایات موجود ہیں، تاہم عمومی رائے یہ ہے کہ وہ ایک مسلمان جولاہے کے گھر پیدا ہوئے اور بعدازاں سوامی رامانند کی تعلیمات سے متاثر ہوئے۔ کبیر نے ہندو اور مسلم مذہبی رسومات پر تنقید کرتے ہوئے رسمی عبادات کے بجائے روحانی سچائی، خلوص، اور اللہ یا رام کی یاد کو اہم قرار دیا۔ ان کا پیغام زیادہ تر گیتوں اور دوہوں کی صورت میں ہے، جو آج بھی عوام میں مقبول ہیں۔

مختلف مذاہب کبیر کو اپنے زاویے سے دیکھتے ہیں۔

سکھ روایات میں وہ گرو نانک کے فکری پیش رو سمجھے جاتے ہیں، مسلمان انھیں صوفی روایت کا نمائندہ مانتے ہیں، جبکہ ہندو انھیں وشنو بھگتی کے ترجمان کے طور پر دیکھتے ہیں۔ کبیر نے اپنی زندگی وارانسی میں بسر کی، جہاں وہ جولاہے کے طور پر کام کرتے رہے۔ یہ پیشہ اس وقت ذات پات کے نظام میں نچلے طبقے سے منسوب تھا۔ ان کی تعلیمات نے ایک علیحدہ مذہبی سلسلے ''کبیر پنتھ'' کی بنیاد رکھی، جو بالخصوص دلت طبقے میں مقبول ہوا۔ کبیر کی شاعری نے نہ صرف بھگتی تحریک بلکہ شمالی ہندوستان کی روحانی و ادبی روایات پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ ان کے کئی اشعار گرو گرنتھ صاحب میں بھی شامل ہیں، جو ان کے فکری اثرات کی وسعت کو ظاہر کرتے ہیں۔

معروف نقاد سردار جعفری نے انھیں اردو کا تیسرا بڑا شاعر قرار دیا ہے، جو میر اور غالب کے بعد آتے ہیں۔ ان کے مطابق، اردو شاعری کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو بھگت کبیر، قلی قطب شاہ سے بھی قدیم شاعر نظر آتے ہیں، جبکہ ان سے قبل صرف امیر خسرو ہی ایک نمایاں شاعر دکھائی دیتے ہیں۔ شمالی ہندوستان میں بھگتی تحریک کے اثرات کو مکمل طور پر سمجھنے کے لیے کبیر کی تعلیمات کا تفصیلی مطالعہ ناگزیر ہے۔ اگرچہ یہ مضمون اس بحث کے دائرہ کار سے باہر ہے، تاہم یہ واضح ہے کہ بابا گرو نانک، بھگت کبیر سے متاثر تھے، اور ان کے کئی اشعار سکھوں کی مقدس کتاب، گرو گرنتھ صاحب، میں شامل کیے گئے ہیں، جو ان کے فکری اثرات کی تصدیق کرتے ہیں۔

چلتی چکی دیکھ کر ، دِیا کبیرا روئے
دوئی پٹن کے بیچ میں ، ثابت بچا نہ کوئے

بابا گرونانک صاحب: سکھ مذہب کے بانی

اس سے پہلے کہ ہم سکھوں اور مغلوں کے درمیان برپا ہونے والی جنگوں کا احوال جانیں، یہ بہتر ہوگا کہ ہم بابا گرونانک صاحب، جو سکھ مذہب کے بانی سمجھے جاتے ہیں، کے بارے میں کچھ جان لیں۔ مجھے ان کی جنم بھومی ننکانہ صاحب جانے کا اتفاق بھی ہوا ہے۔ اس کے علاوہ میں نے سکھوں کے کئی اہم گردوارے بھی دیکھے ہیں، جن میں شیر گڑھ (سرہند) میں واقع گردوارہ فتح گڑھ، گردوارہ سیس گنج، گولڈن ٹیمپل، کرتار پور، پنجہ صاحب، ننکانہ صاحب، اور دیگر کئی گردوارے شامل ہیں، جیسے گردوارہ کشمو راور گردوارہ سچا صاحب۔

بابا گرونانک صاحب کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ میں نے ان کے بارے میں ایک طویل مضمون انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا میں پڑھا، جس کا خلاصہ پیشِ خدمت ہے۔

یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ جب بابر نے 1526ء میں ہندوستان فتح کیا، تو اسی وقت بابا گرونانک صاحب نے اپنی تعلیمات کا آغاز کیا، لیکن اس تحریک نے ابھی زور نہیں پکڑا تھا۔ تاہم جب جہانگیر کا دور آیا، تو سکھ ایک مضبوط قوت کے طور پر ابھر رہے تھے۔ میرے خیال میں سکھوں کی بڑھتی ہوئی طاقت جہانگیر کے لیے ناقابلِ قبول تھی، اسی لیے اس نے سکھوں کے ساتھ جنگ کی اور ان کے کئی گروؤں کو قتل کیا۔

کیا جہانگیر نے ایسا کسی مذہبی بنیاد پر کیا یا یہ ایک سیاسی عمل تھا؟ یہ وہ سوال ہے جس کا جواب میں نے اگلے صفحات میں دینے کی کوشش کی ہے۔

گرونانک (1539ء-1469ء) ایک ممتاز ہندوستانی روحانی استاد اور سکھ مذہب کے بانی تھے۔ انھیں سکھوں کے پہلے گرو کے طور پر جانا جاتا ہے۔ ان کے بارے میں یقین سے کہا جاتا ہے کہ وہ ایک توحید پرست مصلح تھے جن کی تعلیمات نے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو متاثر کیا۔ گرونانک 1469ء میں رائے بھوئی دی تلونڈی (اب ننکانہ صاحب، پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ ان کی زندگی کے ابتدائی حالات زیادہ تر جنم ساکھیوں سے معلوم ہوتے ہیں، جوان کے

بچپن اور روحانی سفر پر روشنی ڈالتی ہیں۔ بابا گرونانک صاحب کا تعلق کھتری ذات سے تھا، جو ایک تجارتی برادری تھی۔ ان کے اعلیٰ سماجی رتبے نے ان کے پیغام کے پھیلاؤ میں مدد دی۔

گرونانک کی تعلیمات نے سکھ مت کی بنیاد رکھی، جسے بعد میں آنے والے سکھ گروؤں نے مزید فروغ دیا۔ ان کے اقوال اور شبد سری گروگرنتھ صاحب میں شامل ہیں، جو سکھوں کی مقدس کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کے فلسفے نے مذہبی ہم آہنگی، مساوات اور روحانی وحدت پر زور دیا، جو آج بھی سکھ مذہب کی اساس سمجھے جاتے ہیں۔ وہ بیس سال کی عمر میں سلطان پور چلے گئے، جہاں انھوں نے مقامی راجہ کے ہاں ملازمت کی۔ اس دوران وہ روحانی جستجو بھی جاری رکھے ہوئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ تیس سال کی عمر میں بابا گرونانک صاحب ایک دن ندی میں نہاتے ہوئے غائب ہو گئے، اور لوگوں نے سمجھا کہ وہ ڈوب گئے ہیں۔ تاہم روایات کے مطابق، اسی دوران انھیں حقیقت کا ادراک ہوا۔ تین دن بعد جب وہ ندی سے واپس آئے تو انھوں نے اعلان کیا:

"کوئی ہندو نہیں، کوئی مسلمان نہیں۔"

یہ بیان مذہبی تفریق کی نفی اور ایک وحدانی روحانی حقیقت کے اظہار کی علامت تھا۔ اس کے بعد بابا گرونانک صاحب نے ایک جداگانہ راستے پر چلنے کا اعلان کیا اور ایک طویل روحانی سفر کا آغاز کیا۔ انھوں نے دنیا بھر کا سفر کیا، حتیٰ کہ وہ عرب تک بھی گئے۔ انھوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ سفر اور تبلیغ میں گزارا۔ ان کی تعلیمات عالمگیر وحدت، الٰہی محبت، اور مذہبی ہم آہنگی پر مبنی تھیں۔ انھی نظریات نے سکھ مت کی بنیاد رکھی اور انھیں دنیا بھر میں ایک عظیم روحانی مصلح کے طور پر متعارف کرایا۔

یہ بھی تاریخ میں ملتا ہے کہ بابا گرونانک صاحب نے اپنی زندگی کے آخری سال کرتارپور (نارووال کے قریب) میں گزارے۔ اسی دوران سکھ برادری کی بنیاد رکھی گئی، اور بابا گرونانک صاحب کو ایک روحانی پیشوا کے طور پر تسلیم کیا جانے لگا۔ ان کی تعلیمات نے ایک نئی روحانی اور سماجی تحریک کو جنم دیا، جو بعد میں سکھ مت کی بنیاد بنی۔ ان کے پیغام کے بنیادی نکات محبت، ہم

آہنگی، اور الٰہی حقیقت کی تلاش تھے، جو آج بھی لاکھوں افراد کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔

بابا گرونانک صاحب کے یہی اصول سکھ ثقافت کی بنیاد بنے۔ آج کوئی بھی گردوارہ لنگر کے بغیر مکمل نہیں ہوتا، جہاں ذات، مذہب، یا جنس کی تفریق کے بغیر سب کو کھانا پیش کیا جاتا ہے۔ اس روایت کی مالی اعانت عوامی عطیات سے کی جاتی ہے اور یہ گرونانک کے انسان دوستی پر مبنی پیغام کا عملی اظہار ہے۔ میں نے خود بھی بارہا اس منظر کا مشاہدہ کیا ہے۔ میرے خیال میں اس روایت نے سکھوں کو ایک اعلیٰ سماجی مقام عطا کیا ہے۔

یہاں میں ایک سوال ضرور اٹھانا چاہوں گا کہ کیا لنگر کی ابتدا مسلمانوں کے صوفیائے کرام کے مزاروں پر پہلے سے ہو چکی تھی؟ میرے خیال میں مسلمان صوفیاء کے مزاروں پر لنگر کی روایت پہلے سے موجود تھی۔ یہ بھی ایک دلچسپ امر ہے کہ آج بھی اکثر مسلمان صوفیاء کے مزاروں پر گوشت نہیں پکایا جاتا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ گوشت نہ کھانے والے افراد بھی کھانے سے محروم نہ رہیں۔ اسی طرح گردواروں کے لنگر میں بھی گوشت شامل نہیں ہوتا۔ اگر میں یہ کہوں کہ بابا گرونانک صاحب یا ان کے بعد سکھوں کے ہاں لنگر کی روایت کا تعلق مسلمان صوفیاء کی ان روایتوں سے جڑتا ہے، تو یہ بات غلط نہ ہوگی۔

یہ محض میرا قیاس ہے؛ ممکن ہے درست نہ ہو۔ یہ کوئی حتمی مؤقف نہیں، بلکہ وہ بات ہے جو میں نے سمجھی اور بیان کر دی ہے۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ بابا گرونانک صاحب کو مسلمانوں میں بھی عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ان کے پیغام میں توحید (یعنی ایک خدا پر ایمان)، انسانیت، خدمت اور مساوات جیسے عناصر شامل تھے، جو اسلامی تعلیمات سے کافی قریب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں ہندوؤں کے ساتھ ساتھ کئی مسلمانوں نے بھی اپنا روحانی پیشوا مانا۔ بعض مسلمان انھیں ''ولی اللہ'' (اللہ کے دوست) اور ایک صوفی بزرگ مانتے ہیں۔ ان کی تعلیمات صوفیانہ روایت سے مشابہت رکھتی ہیں، جن میں ذکرِ الٰہی، عاجزی، اور خدمتِ خلق پر زور دیا جاتا ہے۔

کیا بابر کے حملے کے وقت بابا گرونانک صاحب نے اس کی مخالفت کی تھی؟ یہ ایک سوال تھا

جس کا جواب میں نے تلاش کرنے کی کوشش کی۔ جتنا میں جان سکا، اس کے مطابق بابا گرونانک صاحب نے مغل بادشاہ بابر کے حملوں کے دوران ظلم وستم کے خلاف آواز بلند کی، جو ان کے اسلامی اصولوں سے قربت کی ایک علامت سمجھی جاسکتی ہے۔ بعض تحریروں میں یہ بھی لکھا ملتا ہے کہ وہ بابر کو "بابر" کے بجائے "جابر" کہا کرتے تھے۔

یہ بھی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ بابا گرونانک صاحب کی وفات کے بعد مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان ان کی آخری رسومات کی ادائیگی کے حوالے سے اختلاف پیدا ہوا۔ مسلمان انھیں ایک ولی اور صوفی مانتے ہوئے اسلامی طریقے سے دفن کرنا چاہتے تھے، جبکہ سکھ انھیں اپنا گرو تسلیم کرتے ہوئے اپنی روایات کے مطابق آخری رسومات ادا کرنا چاہتے تھے۔ زبانی روایت کے مطابق، جب ان کے جسم پر سے چادر ہٹائی گئی تو وہاں صرف پھول موجود تھے۔ چنانچہ مسلمانوں نے ان پھولوں کو ایک جانب دفن کر دیا، جبکہ سکھوں نے دوسری جانب ایک سمادھی تعمیر کر دی۔

آج کرتارپور، پاکستان میں واقع گرونانک صاحب کا مزار اسی مشترکہ عقیدت کی علامت ہے، جہاں سکھ اور مسلمان دونوں ان کا احترام کرتے ہیں۔

بابا گرونانک صاحب اور بابر بارے ایک طویل مضمون سکھوں کی ایک قابلِ اعتماد ویب (sikhiwikia.org) پر ملتا ہے۔ بابروانی کے نام سے کئی اشعار بھی اس میں پڑھنے کو ملتے ہیں۔

بابا گرونانک صاحب نے مغل بادشاہ بابر کے ہندوستان پر حملے اور اس کے ظلم وستم کا ذکر اپنی مشہور بانی (اشعار) میں کیا ہے، جو "بابروانی" کے نام سے معروف ہے۔ یہ اشعار "سری گرنتھ صاحب" میں موجود ہیں اور اُس وقت کے سیاسی وسماجی حالات کی عکاسی کرتے ہیں۔

بابا گرونانک صاحب نے بابر کے حملے کو "جبار" (ظالم) کے آنے سے تشبیہ دی اور ہندوستان میں ہونے والی تباہی پر گہرے افسوس کا اظہار کیا۔ بابا گرونانک صاحب نے بابر بارے کئی شعر بھی کہے۔

ان اشعار میں وہ اُس دور میں بابر کی افواج کے ہاتھوں ہونے والے قتل و غارت، لوٹ مار اور عام لوگوں کی مشکلات کو بیان کرتے ہیں۔ بابا گرو نانک صاحب نے نہ صرف ظلم و ناانصافی کی مذمت کی بلکہ خدا سے سوال کیا کہ وہ ان مظالم پر خاموش کیوں ہے؟ یہ اشعار تاریخ کا ایک اہم حوالہ ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ بابا گرو نانک صاحب نہ صرف ایک عظیم روحانی پیشوا تھے بلکہ ایک جری سماجی مصلح بھی، جو ہر قسم کے ظلم کے خلاف آواز بلند کرتے تھے۔

اب تک کی گفتگو سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ بابا گرو نانک صاحب، جو سکھ مذہب کے بانی ہیں، نے صوفی اور بھگتی مکاتبِ فکر کو یکجا کرنے کی کوشش کی۔ طویل عرصے تک سکھ مت کو ہندو مت کی ایک شاخ تصور کیا جاتا رہا، حالانکہ اس میں اسلام کے ساتھ بھی کئی نظریاتی مماثلتیں موجود تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں مذاہب کے پیروکار سکھ مت کو اپنے نظریات سے قریب محسوس کرتے رہے۔

سکھ مت

پنجاب کے سماج پر اثرات

اب میں اپنے اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔ میں اس بات کی تلاش میں تھا کہ بابا گرو نانک صاحب کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق ایک نیا مذہب وجود میں آیا جو اس سے پہلے سے موجود ہندوازم اور اسلام سے بے حد مختلف تھا۔ بابا گرو نانک صاحب ایک ہندو گھرانے میں پیدا ہوئے مگر وہ مسلمانوں سے بھی ملتے رہے۔ انھوں نے مکہ کا سفر بھی کیا۔ ان کی تعلیمات میں اسلام کا رنگ بھی نظر آتا ہے۔ مسلمانوں نے ان کے بارے کتابیں بھی لکھی۔ حتیٰ کہ علامہ اقبال بھی ان سے متاثر تھے۔ اس مذہب نے پنجاب کے سماج، معیشت، معاشرت، مذہب پر کیسے اثرات مرتب کیے؟

اس سوال کی تلاش کرتے ہوئے مجھے درج ذیل مضامین ملے:

Impact of Sikhism on Indian Society by Prof_Hazara Singh

Sikhism and Its Impact on Indian Society by Hazara Singh

NORMS AND FORMS OF SIKHISM ANDTHEIR IMPACT ON SOCIETY by Harpreet Singh

Guru Gobind Singh's Contribution to Indian History by Dr Vikram Singh Deol and Dr B.R.Ambedka

ان مضامین سے جو جان سکا، وہ پیشِ خدمت ہے۔ یاد رہے کہ یہ میری کتاب کا ایک اہم ترین موضوع ہے۔

1- سکھ مت نے ہندوستانی قوم پرستی کے فروغ میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ خالصہ کو بنیاد بنا کر انگریزوں کے ذریعہ متعارف کرایا گیا مغربی نظامِ تعلیم اپنا کر ایک ترقی یافتہ نسل تیار کرنے میں مدد دی۔

2- سکھ مت نے عوام کو توہمات سے نجات دلا کر ان کے ذہنی اور فکری دائرے کو وسعت دی۔ انھوں نے لوگوں کو یہ باور کروایا کہ ذہنی آزادی کے بعد ہی ہم سماجی جبر، سیاسی استحصال اور معاشی ناانصافی کے خلاف مزاحمت کر سکتے ہیں۔ یہی بات قوم پرستی کے فروغ کا باعث بنی، جس کے نتیجے میں ہندوستانیوں نے ذات پات کی تفریق سے بالاتر ہو کر بھائی چارے اور سماجی ذمہ داری کا شعور حاصل کیا۔

3- صدیوں سے شمال مغرب سے ہونے والے حملے ہندوستان کو نقصان پہنچاتے رہے، جن کے نتیجے میں مذہبی مقامات کی تباہی، خواتین کی بے حرمتی، اور عوامی ذلت ہوئی۔ مگر خالصہ کے قیام کے بعد صورت حال یکسر بدل گئی۔ سکھوں نے نہ صرف بیرونی حملہ آوروں کا مقابلہ کیا بلکہ پشاور تک اپنی بالادستی بھی بحال کی۔

4- سکھ سپاہیوں کو بہادری اور نظم و ضبط کی علامت سمجھا جانے لگا۔ یہ پہلی بار ہوا کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ (1839-1799ء) کے دورِ حکومت میں ہندوستانیوں نے صدیوں کے غیر ملکی تسلط کے بعد اپنی قومی شناخت مستحکم کی اور قوم پرستی کو فروغ دیا۔ پہلی بار پنجاب میں ایک وسیع پیمانے پر ایسی ریاست قائم ہوئی، جس کا راجہ ایک مقامی فرد تھا۔

5- انگریزی تعلیم میں ایک اہم کمی تھی کہ یہ یہاں سے پڑھ کر نکلنے والے افراد صرف وائٹ کالر نوکریوں کے لیے موزوں تھے اور دستی مشقت کو کمتر سمجھتے تھے۔ اس کے برعکس، سکھ مذہب نے محنت کو تقدس بخشا۔ گرو گوبند سنگھ نے واضح طور پر محنت کی اہمیت پر زور دیا، یہاں تک کہ ایک امیر زادے کے ہاتھ سے پانی قبول کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ اس نے کبھی کوئی عملی کام نہیں کیا تھا۔ سکھ تعلیمات نے ان کے پیروکاروں کو محنتی، بہادر اور کشادہ دل بنایا،

جبکہ مغربی تعلیم یافتہ بنگالی نوجوانوں میں یہ رجحان کمزور رہا۔

6- پنجاب میں خوشحالی اور سکھ مت کا کردار بھی ایک اہم حقیقت ہے۔ پنجاب کی خوشحالی میں سکھ مت کے اثر و رسوخ کو ایک بنیادی عنصر سمجھا جاتا ہے، جو محنت کو عبادت کی تکمیل قرار دیتا ہے۔ باوجود اس کے کہ ہندوستان کے مشرقی صوبوں کے مقابلے میں پنجاب کو معدنی وسائل (کوئلہ اور لوہا) کی کمی، سمندر سے دوری، اور مون سون کی محدود بارشوں جیسے مسائل کا سامنا تھا، پھر بھی پنجاب خوشحالی کی مثال بن کر ابھرا۔

7- پنجاب کے عوام میں محنت کا جذبہ سکھ تعلیمات سے جڑا ہوا ہے، جس نے اس خطے کو ایک زرعی اور اقتصادی قوت میں تبدیل کر دیا۔

8- سکھ روایت کے مطابق، دعا صرف ذاتی بھلائی کے لیے نہیں بلکہ سب کی فلاح و بہبود کے لیے کی جاتی ہے، جو ان کے ذہنی وسعت اور آفاقی نقطہ نظر کی علامت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پنجابی دنیا بھر میں ہر معاشرے میں آسانی سے رچ بس جاتے ہیں اور تعصب، صوبائیت، اور لسانیت جیسے منفی رجحانات سے کم متاثر ہوتے ہیں۔ یہ عالمگیر سوچ سکھ مذہب کی ابتدائی تاریخ میں بھی نظر آتی ہے۔ میرے خیال میں یہی فلسفہ پنجاب کے عوام کی رواداری، محنت، اور بہادری کی بنیاد ہے، جو انھیں ہندوستان کے دیگر خطوں سے منفرد بناتا ہے۔

9- سکھ مت کو سیکولر آفاقیت، قربانی اور سماجی مساوات کا مجموعہ سمجھا جاتا ہے۔ سکھ مت کی بنیادی تعلیمات میں سیکولر آفاقیت اور سوشلسٹ اصول شامل ہیں، جو ہر سکھ کے دل میں رچی بسی ہیں۔

10- سکھ مت کی سیاسی اور سماجی فلسفہ بھی مساوات پر مبنی ہے۔ گرونانک نے فرمایا:

''مرد ہر جگہ ایک جیسے ہوتے ہیں، بس ان کی ظاہری شکل مختلف ہوتی ہے۔''

11- یہ تعلیمات سکھ مت کو نہ صرف سیکولر بناتی ہیں بلکہ روحانی طور پر سماجی انصاف کی راہ بھی دکھاتی ہیں۔

12- سکھ مت قربانی اور ایثار کا مذہب ہے۔ گرو گوبند سنگھ نے، جو ایک شہید کے بیٹے تھے، نہ

صرف اپنی ذات بلکہ اپنے چاروں بیٹوں کو بھی قربانی کے لیے پیش کر دیا۔ ان کے دو بڑے بیٹے، اجیت سنگھ اور جوجھر سنگھ، بہادری سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے، جس پر گرو نے شکرانے کے طور پر دعا کی:

''پروردگار، میں نے تیرے حوالے کر دیا، جو صرف تیرا تھا۔''

13- سکھ مت نے موجودہ سماجی درجہ بندیوں کو چیلنج کیا اور مساوات پسندی کو فروغ دیا، ذات، جنس، یا سماجی حیثیت سے قطع نظر تمام لوگوں کی برابری کی وکالت کی۔ ایک طرف تعلیمات تھیں اور دوسری طرف سکھوں کا طرزِ عمل تھا۔ میں نے دیکھا ہے کہ دونوں میں بعض اوقات ایک واضح فرق نظر آتا ہے۔

14- سکھ مت نے پنجاب میں اپنی روایات، زبان (پنجابی) اور رسم و رواج کے ساتھ ایک الگ ثقافتی شناخت کو فروغ دیا۔ سکھ مت کی وجہ سے پنجابی زبان کو تحفظ بھی ملا اور فروغ بھی، جس کی ایک بڑی وجہ گرو گرنتھ صاحب کا پنجابی زبان میں ہونا ہے۔

15- سکھ گرو اور رہنماؤں نے سماجی اصلاحات کے لیے مہم چلائی، خاص طور پر بچپن کی شادی اور خواتین پر ظلم جیسی برائیوں کے خاتمے کے لیے۔ لیکن میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ ستی کی رسم بھی برقرار رہی۔

16- مہاراجہ رنجیت سنگھ (1839-1792ء) کے دور میں سکھ کنفیڈریسی اور سکھ سلطنت کے قیام نے سکھوں کی بڑھتی ہوئی سیاسی اور فوجی طاقت کو یکجا کیا، جس نے تقسیم ہند کے موقع پر ایک اہم کردار ادا کیا۔ اسی بنیاد پر مغربی پنجاب (بھارتی پنجاب) ایک خود مختار صوبہ بنا۔

17- مغل حکومت کے خلاف مزاحمت سکھوں کا ایک اہم کارنامہ سمجھا جاتا ہے، جس کی وجہ سے مغل سلطنت کے تحت سکھوں کو ظلم و ستم اور تشدد کا سامنا کرنا پڑا، جس کے نتیجے میں سکھ مت کی عسکریت پسندی اور مغل تسلط کے خلاف ان کی مزاحمت میں اضافہ ہوا۔

18- سکھوں نے برطانوی ہندوستانی فوج میں ایک اہم کردار ادا کیا، اور ان کی وفاداری اور فوجی قابلیت کو انگریزوں نے بہت قدر کی نگاہ سے دیکھا۔

19- سکھ زیادہ تر دیہات میں رہتے تھے، اس لیے انھوں نے پنجاب کی معیشت کو بہتر بنانے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ یہ ہم مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکمرانی کے دور میں دیکھ سکتے ہیں۔

20- برطانوی نوآبادیاتی دور میں، سکھوں کو انگریزوں نے انتظامی خدمات میں، خاص طور پر فوج میں ملازمت دی، جس کی وجہ سے سکھ دنیا بھر میں پھیل گئے۔

21- سکھ اور ہندو کشیدگی بھی دیکھنے کو ملتی ہے، جو پوری تاریخ میں موجود رہی ہے۔ ایک بڑا واقعہ اندرا گاندھی کا گولڈن ٹیمپل پر حملہ مانا جاتا ہے۔

22- سکھوں کو ظلم وستم کا بھی سامنا کرنا پڑا، خاص طور پر مغل حکمرانوں کے ساتھ ان کی جنگوں میں، جن میں ان کا قتلِ عام کیا گیا۔

23- سکھوں کو ایک عرصے تک اور کسی حد تک آج بھی امتیازی سلوک، پسماندگی، زبان کے حقوق، اور آزادیِ اظہار جیسے مسائل کا سامنا ہے۔

یہ تمام نکات ان مضامین میں درج تھے۔ تاہم، میں نے اپنی تفہیم کی بنیاد پر درج ذیل تبدیلیوں اور تاریخی پیش رفت کو بھی نوٹ کیا ہے۔

1- سکھ مت کے ظہور سے قبل شمالی ہندوستان، خصوصاً پنجاب، میں بنیادی طور پر دو مذاہب کے پیروکار آباد تھے، جبکہ بدھ مت کا اثر ورسوخ ایک طویل عرصہ قبل ختم ہو چکا تھا۔ سکھ مت کے ابھرنے سے ایک تیسری قوت وجود میں آئی، جسے ابتدا میں ہندو مت کا ہی ایک تسلسل تصور کیا جاتا تھا۔ تاہم، جیسے ہی سکھوں نے سیاسی اور عسکری طاقت حاصل کی، مغل حکمرانوں نے انھیں اپنے اقتدار کے لیے ایک ممکنہ خطرہ سمجھنا شروع کر دیا۔ خاص طور پر، اس کشیدگی میں اس وقت اضافہ ہوا جب سکھوں کے ایک گروہ نے مغل شہزادہ خسرو کو پناہ دی، جو جہانگیر کے خلاف بغاوت کر چکا تھا۔ اس واقعے کے بعد،

مغل حکمرانوں اور سکھوں کے درمیان تنازعات شدت اختیار کر گئے، جس کے نتیجے میں پنجاب میں بڑے پیمانے پر خونریزی دیکھنے کو ملی۔

2- ان تنازعات کے دوران دونوں جانب سے مقدس مقامات کی بے حرمتی کے واقعات پیش آئے۔ مسلمان جرنیلوں نے امرتسر میں گولڈن ٹیمپل کو نقصان پہنچایا، جبکہ سکھوں کی طرف سے لاہور کی بادشاہی مسجد کی بے حرمتی کی گئی۔ ان کارروائیوں نے دونوں برادریوں کے درمیان دشمنی کو مزید گہرا کر دیا۔ نتیجتاً، پنجاب میں اورنگزیب عالمگیر کی وفات کے بعد سے جنگِ آزادی تک مسلسل عدم استحکام اور شورش کی کیفیت برقرار رہی۔

3- مقامی مسلمان ابتدا میں مغلوں اور بعد ازاں افغان حکمرانوں کو اپنا واحد سہارا سمجھتے تھے، جبکہ سکھوں نے خود کو ایک آزاد اور خودمختار طاقت کے طور پر منظم کر لیا تھا۔ مغل سلطنت کے زوال کے بعد، پنجاب میں مسلمان خود کو سکھوں کے رحم و کرم پر محسوس کرنے لگے، جس کی وجہ سے وہ برطانوی حکمرانوں کی طرف جھکاؤ اختیار کرنے لگے۔

مغل، ابدالی، سکھ کشمکش کی تاریخی نوعیت

آغاز، عوامل اور پنجاب کے سماج پر مرتب ہونے والے اثرات کا مطالعہ

مغل، ابدالی سکھ کشمکش کا آغاز کب ہوا؟ اس کا سبب کیا تھا؟ اس سے کسے فائدہ پہنچا؟ اور اس کے پنجاب کے سماج پر کیا اثرات مرتب ہوئے؟ یہ اور اس طرح کے کئی سوالات کے جوابات تلاش کرنے میں مجھے خاصا وقت لگا۔ آج بھی پاکستان میں مسلمانوں کا ایک گروہ رنجیت سنگھ کو پنجاب کا ہیرو مانتا ہے، جبکہ دوسرا گروہ اُسے اسلام دشمن سمجھتا ہے۔

اس موضوع پر بات کرنے کے لیے میں نے کئی کتابیں مطالعہ کیں۔ سب سے زیادہ معلومات مجھے سید محمد لطیف کی کتاب تاریخِ پنجاب سے حاصل ہوئیں۔ اگر آپ اس بارے میں مزید جاننا چاہتے ہیں تو درج ذیل مضامین اور کتابیں بے حد مفید ثابت ہوسکتی ہیں۔ یہ تمام مواد انٹرنیٹ پر دستیاب ہے۔

SIKHS DURING THE MUGHAL RULE (1708-1799)

Sikh Struggle for Freedom and Sovereignty[1]

Mughal-Sikh Relations: Revisited

By Robina Shoeb, Tauqeer Ahmad Warriach, Muhammad Iqbal Chawla,

Sikh-Muslim Relations during the Mughal Era

[1] https//:bairagi.sdcollegeambla.ac.in/wp-content/uploads/2017/12/Chapter-7.pdf

(1526-1801) Arshad Ali Mazhar Abbas Hadaiqa Sarda

History I-Mughal Sikh Conflict by Prateek Mishraon

Mughal-Sikh relations and the 18th-century

Chamkaur battle: Insights from the Zafarnama

Rohan Kumar Nirwan

تقسیم بر صغیر سے پہلے پنجاب میں مسلم، سکھ سیاسیات (2)
لیفٹیننٹ کرنل (ر) غلام جیلانی خان

یہ دراصل مغل، ابدالی اور سکھ کشمکش کا دور تھا۔ سہولت کے پیشِ نظر میں اسے ''مغل۔سکھ کشمکش'' ہی لکھوں گا۔ ابدالی، ایک لحاظ سے مغلوں کے اتحادی تھے، اور دونوں مل کر سکھوں کے خلاف برسرِ پیکار رہے۔ مغل۔سکھ تصادم کا ذکر کرتے ہوئے یہاں یہ اعتراف ضروری سمجھتا ہوں کہ اس موضوع پر لکھنا میرے لیے ایک غیر معمولی چیلنج ثابت ہوا ہے ایسا چیلنج جو مجھے کسی اور تاریخی موضوع پر لکھتے وقت درپیش نہیں آیا۔ اس کی بنیادی وجہ اس دور کی تاریخ میں مذہبی جذبات کی گہری موجودگی اور حساسیت ہے۔

تاریخ دانوں کا ایک مؤقف یہ ہے کہ یہ محض اقتدار کی کشمکش تھی، جو اُس وقت کے سیاسی حالات کا نتیجہ تھی؛ جبکہ دوسرا مؤقف اسے ایک مذہبی تصادم قرار دیتا ہے، جس کا نشانہ سکھ مت تھا۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ دونوں بیانیے بیک وقت درست ہو سکتے ہیں؟ بظاہر، دونوں امکانات کو کلی طور پر رد نہیں کیا جا سکتا۔

میرا مقصد یہاں واقعات کا غیر جانب دارانہ بیان پیش کرنا ہے، اور ان کی تشریح و تعبیر کا فیصلہ قارئین پر چھوڑنا چاہتا ہوں۔ تاہم ایک حقیقت جسے پورے یقین سے تسلیم کیا جا سکتا ہے، یہ ہے کہ اس تصادم کی چنگاری آج تک مکمل طور پر نہیں بجھی، اور مستقبل قریب میں بھی اس کے مکمل خاتمے کے آثار نظر نہیں آتے۔ یہ کشمکش دو مذاہب کے درمیان ہونے والے المناک واقعات کی صورت میں نسل در نسل منتقل ہوتی رہی ہے، اور بظاہر آئندہ بھی ہوتی رہے گی۔ ماضی کے حکمرانوں

کی غلطیوں کی قیمت آنے والی نسلوں کو چکانا پڑے گی۔

ایک اور اہم پہلو قابلِ غور ہے، آیا اس تصادم میں ہندو فریق کی کوئی مستقل حیثیت تھی؟ کیا یہ کشمکش کسی تیسرے فریق کے اکسانے کا نتیجہ تھی؟ اگرچہ اس سوال کا مفصل تجزیہ اس کتاب کے دائرۂ کار سے باہر ہے، لیکن یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر مورخین نے نسبتاً کم توجہ دی ہے۔ امید ہے کہ مستقبل میں اس پر مزید تحقیقی کام سامنے آئے گا۔

یہاں ایک ذاتی پہلو کا ذکر بھی ضروری ہے۔

تقسیمِ پنجاب کے دوران میرے خاندان کی کئی خواتین اغوا ہوئیں: ان میں سے بعض بازیاب ہو گئیں، جبکہ کچھ ہمیشہ کے لیے کھو گئیں۔ میری سوتیلی والدہ بھی انھی بدنصیب خواتین میں شامل تھیں۔ یہ زخم آج بھی تازہ ہے، اور ممکن ہے کہ کئی نسلوں تک اس کا درد باقی رہے۔

میرے بزرگوں کے مطابق، جب سکھ حملہ آور ہمارے خاندان کے افراد کو قتل کر رہے تھے، تو وہ یہ کہتے جاتے تھے کہ یہ اورنگزیب کے دور میں کیے گئے مظالم کا بدلہ ہے۔ یہ امر ثابت کرتا ہے کہ سکھ قوم اپنے گروؤں پر ہونے والے مظالم کو ڈیڑھ صدی بعد بھی نہیں بھولی تھی۔ ایسے زخموں کے بھرنے میں شاید صدیاں درکار ہوں۔

اب میں ایک بار پھر اپنے موضوع کی طرف آتا ہوں، یعنی مغلوں اور سکھوں کے درمیان ہونے والی کشمکش۔ یہاں بیان کردہ تمام تاریخی حوالہ جات سید محمد لطیف کی مشہور کتاب تاریخِ پنجاب سے ماخوذ ہیں۔

جب ظہیر الدین بابر نے پنجاب پر حملہ کیا، تو اس کے سپاہیوں نے بابا گرو نانک صاحب اور ان کے متعدد پیروکاروں کو، جن میں بھائی مردانہ بھی شامل تھے، ایمن آباد سے گرفتار کر کے بادشاہ کے سامنے پیش کیا۔ بابر، جو خود عربی اور فارسی کا عالم اور شاعر تھا، بابا گرو نانک کے خیالات سے بے حد متاثر ہوا۔ بادشاہ نے انھیں قیمتی تحائف دینے کا حکم دیا، تاہم بابا گرو نانک نے ان تحائف کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ ان کے لیے سب سے قیمتی انعام خالق کی عبادت سے حاصل ہونے والی روحانی تسکین ہے، اور

چونکہ ان کی زندگی کا مقصد حقیقی بادشاہ یعنی خدا کو راضی کرنا ہے، اس لیے انھیں دنیاوی بادشاہوں کی خوشنودی کی ضرورت نہیں۔

بعض تاریخی روایات کے مطابق، بابر نے انھیں قید کر کے چکی پیسنے پر مجبور کیا، لیکن سید محمد لطیف کی کتاب میں اس واقعے کا ذکر نہیں ملتا۔

سکھوں کے چوتھے گرو، گرو رام داس، کی مغل بادشاہ اکبر سے لاہور میں بالمشافہ ملاقات ہوئی۔ اکبر، جو اپنی رواداری اور کشادہ دلی کے لیے معروف تھا، گرو رام داس کے خیالات سے متاثر ہوا۔ اس نے اظہارِ عقیدت کے طور پر انھیں ایک قطعہ زمین عنایت کیا، جو اپنی گولائی کے سبب ''چکر رام داس'' کہلایا۔ اس مقام پر گرو رام داس نے ایک قدیم تالاب کی ازسرِ نو تعمیر کروائی، جسے ''امرتسر'' یا ''لازوال تالاب'' کا نام دیا گیا۔ بعد ازاں، اسی تالاب کے وسط میں ''ہرمندر صاحب'' کے نام سے ایک عظیم الشان گردوارہ تعمیر کیا گیا، اور اس کے اطراف رہائشی عمارات قائم ہوئیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ یہ مقام ''امرتسر'' کے نام سے ایک معروف شہر بن گیا۔

ہرمندر صاحب کی بنیاد 28 دسمبر 1588ء کو ایک صوفی بزرگ، میاں میر نے رکھی، جس سے اس کی تعمیر میں بین المذاہب رواداری کی ایک اہم مثال سامنے آتی ہے۔ 1604ء میں سکھوں کے پانچویں گرو، گرو ارجن دیو نے یہاں آدی گرنتھ (سکھوں کی مقدس کتاب) کا ایک نسخہ رکھا اور اس مقام کو ''اٹھ سٹھ تیرتھ'' (سکھ روایت میں ایک مقدس جگہ) کا درجہ دیا۔

دو سال بعد، سکھوں کے چھٹے گرو، گرو ہرگوبند صاحب نے سری اکال تخت صاحب کی بنیاد رکھی، جو سکھوں کی مذہبی اور سیاسی قیادت کی علامت بن گیا۔ تاہم، یہ مقدس مقام متعدد حملوں کی زد میں رہا۔ خاص طور پر، 1757ء، 1762ء اور 1764ء میں افغان حملہ آوروں نے ہرمندر صاحب کو شدید نقصان پہنچایا۔ ان حملوں کے دوران، بابا دلیپ سنگھ اس گردوارے کی حفاظت کرتے ہوئے مارے گئے (سکھ انھیں شہید کہتے ہیں۔) یہ گردوارہ نہ صرف سکھ مذہب کے ماننے والوں کے لیے ایک روحانی مرکز ہے بلکہ تاریخ میں اسے ایک ایسی علامت کے طور پر بھی

دیکھا جاتا ہے جو قربانی، استقامت اور مذہبی ہم آہنگی کی عکاسی کرتی ہے۔

یہاں ایک وضاحت کرنا ضروری ہے کہ لفظ ''شہید'' اسلامی اصطلاح میں اس فرد کے لیے استعمال ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑتے ہوئے جان سے جاتا ہے۔ اسی طرح، سکھ مذہب میں بھی اس شخص کو ''شہید'' کہا جاتا ہے جو سکھ دھرم کی خاطر اپنی جان قربان کر دیتا ہے۔ انگریزی زبان میں ایسے افراد کے لیے لفظ ''Martyred'' استعمال کیا جاتا ہے، جس کا مطلب ہے وہ شخص جو کسی عظیم مقصد یا عقیدے کے لیے اپنی جان قربان کر دے۔ اس لحاظ سے لفظ ''شہید'' صرف مسلمانوں تک محدود نہیں بلکہ سکھوں کی طرف سے بھی مستعمل ہے۔

دوسری جانب، ہندو مت میں بھی ایسے افراد کی قربانی کو عزت دینے کے لیے مختلف اصطلاحات مستعمل ہیں، اگرچہ ''شہید'' کا اردو مترادف بالکل ویسا موجود نہیں ہے، مگر معنی کے لحاظ سے قریبی الفاظ جیسے ''سمرپت'' (خود کو وقف کرنے والا)، ''تھروت'' یا ''بالیدان'' (قربانی) استعمال کیے جاتے ہیں۔ اس لیے میں یہ سمجھتا ہوں کہ شہید کا لفظ ضروری نہیں کہ صرف مسلمان ہی استعمال کر سکتے ہیں۔ اسے دوسرے مذاہب کے لوگ بھی استعمال کرتے ہیں۔

مجھے خود اس تاریخی شہر امرتسر کو قدرے دور سے دیکھنے کا موقع ملا۔ امرتسر کا قیام سکھوں کے لیے ایک اہم موڑ ثابت ہوا، کیونکہ پہلی بار انھیں ایک مستقل مرکزی مقام میسر آیا، جو آج بھی ان کی مذہبی اور سماجی سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ اس طرح گرو رام داس نے بطور قوم سکھوں کے مستقبل کی عظمت کی بنیاد رکھ دی۔ اس وقت سکھ ایک پر امن اور شریفانہ طرزِ عمل کے حامل تھے اور اپنے پہلے گرو، بابا نانک کے وضع کردہ بنیادی اصولوں پر کاربند تھے۔ ان اصولوں میں سکھوں کو متحد رہنے، بھائی چارے کو فروغ دینے اور باہمی رواداری کی تعلیم دی گئی تھی۔

ان واقعات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اکبر، جو دیگر مذاہب کے ساتھ رواداری اور دوستانہ تعلقات رکھنے کے لیے مشہور تھا، نے سکھ مت کے لیے جگہ فراہم کی اور اسے پنپنے کا موقع دیا۔ یہ امر اس حقیقت کا بھی عکاس ہے کہ اکبر کے دور تک مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان کوئی واضح

اختلاف موجود نہیں تھا۔ میں نے کئی سکھ سکالرز کی گفتگو سنی، وہ اس بات کو تسلیم نہیں کرتے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ جگہ خریدی گئی تھی۔ کیا سچ ہے، معلوم نہیں۔ جو پڑھا جو سنا وہ میں نے بیان کر دیا۔ میں اسے پرکھنے کے قابل نہیں ہوں۔

گرو ارجن دیو جی (1563ء-1606ء)

گرو ارجن دیو جی سکھ مت کے پانچویں گرو تھے اور انھوں نے سکھ مذہب کی بنیادوں کو مزید مستحکم کیا۔ ان کے نمایاں کارناموں میں شامل ہے کہ اس وقت تک سکھ ایک منظم جماعت کی شکل میں موجود نہیں تھے۔ پہلی مرتبہ یہ ہوا کہ گرو ارجن دیو جی نے آدی گرنتھ کی تدوین کی، جو سکھوں کی مقدس کتاب بن گئی۔ اس میں انھوں نے بابا گرونانک صاحب اور دیگر سکھ گروؤں کے علاوہ بعض بھگتوں (ہندو اور مسلمان صوفیوں) کی تعلیمات کو بھی شامل کیا۔ ان کے دور میں سری ہرمندر صاحب کی تعمیر مکمل کرائی، جو آج سکھوں کا سب سے مقدس مقام ہے۔

یہاں میں ایک اہم نکتہ بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں، جس کے نتیجے میں مغل شہنشاہ جہانگیر نے گرو ارجن دیو جی کو سزائے موت دی۔ میں طویل عرصے تک اس سوال پر غور کرتا رہا کہ اکبر کے دور میں قائم دوستانہ تعلقات کس طرح دشمنی میں بدل گئے؟ ایسا کیا واقعہ پیش آیا کہ دونوں گروہ ایک دوسرے کے جانی دشمن بن گئے، اور یہ دشمنی آج تک برقرار رہے؟

اس سوال کا جواب مجھے سید محمد لطیف کی تصنیف تاریخِ پنجاب میں ملا۔ جو کچھ میں نے سمجھا، وہ پیشِ خدمت ہے۔ یہ میرا قیاس ہے، ہوسکتا ہے درست نہ ہو، یہ کوئی حتمی بات نہیں ہے، جو میں نے سمجھا وہ بیان کر دیا ہے۔

سید محمد لطیف لکھتے ہیں کہ گرو ارجن دیو وہ پہلے سکھ گرو تھے جنھوں نے روایتی درویشانہ طرزِ زندگی ترک کر کے ایک شاہانہ طرزِ عمل اختیار کیا۔ انھوں نے سادہ لباس کی بجائے قیمتی ملبوسات زیب تن کیے اور اپنی درویشانہ گدی کو ایک باوقار تخت میں تبدیل کر دیا۔ ان کے زیرِ تصرف بے شمار نوکر چاکر، عمدہ ہاتھی اور گھوڑے موجود تھے۔ وہ ایک عظیم اور پرعزم رہنما تھے،

جن کے خیالات بلند اور عزائم وسیع تھے۔ یہی وہ وقت تھا جب سکھ برادری منظم ہونے لگی اور ایک معاشرتی و روحانی وحدت کی شکل اختیار کرنے لگی۔ گرو ارجن دیو نے خاص طور پر اس بات پر توجہ دی کہ بابا گرونانک کی تعلیمات مختلف مذاہب اور معاشرتی طبقات کے لیے یکساں طور پر قابلِ قبول ہوں۔ انھوں نے سکھوں کو ایک منفرد سماجی ڈھانچے میں تشکیل دینے کے لیے ایک منظم مذہبی ضابطہ متعارف کروایا، جس میں بابا گرونانک کے ارشادات اور اشعار کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔

ان کی موت کی بنیادی وجہ مغل شہنشاہ جہانگیر کے ساتھ بڑھتی ہوئی کشیدگی تھی۔ جہانگیر نے ان پر الزام عائد کیا کہ وہ مغل حکومت کے خلاف سرگرم عناصر کو پناہ دے رہے ہیں اور سکھوں کو ایک الگ مذہبی و سیاسی قوت میں تبدیل کر رہے ہیں۔ 1606ء میں انھیں لاہور میں گرفتار کر لیا گیا اور شدید اذیتیں دی گئیں، جس کے نتیجے میں وہ شہید ہو گئے۔

سکھ تاریخ میں گرو ارجن دیو کی موت کو ایک انتہائی اہم موڑ سمجھا جاتا ہے، کیونکہ اس کے بعد سکھ مت میں عسکری مزاحمت کے عناصر شامل ہونے لگے۔ یہی وجہ ہے کہ بعد میں گرو گوبند سنگھ نے سکھ برادری کو ایک مسلح قوت میں تبدیل کیا، اور مستقبل میں مغل سلطنت کے ساتھ سکھوں کی مسلسل کشمکش دیکھنے میں آئی۔

گرو گوبند سنگھ (1708ء-1666ء) سکھوں کے دسویں اور آخری انسانی گرو تھے، جنھوں نے سکھ مت میں ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ وہ ایک عظیم رہنما، شاعر، جنگجو اور اصلاحات کے بانی تھے۔ ان کی قیادت میں سکھ مت ایک روحانی تحریک سے ایک مسلح اور منظم برادری میں تبدیل ہو گیا۔

جہانگیر نے اپنی خودنوشت تزکِ جہانگیری میں گرو ارجن دیو کے قتل کا ذکر مختصر لیکن واضح انداز میں کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

''اور میں نے کہا کہ اس کو قتل کر دینا چاہیے اور حکم دیا کہ اسے اذیت دے کر قتل کیا جائے اور اس کی جائیداد ضبط کر لی جائے۔''

سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ محض ایک سیاسی انتقام تھا یا اس کے پیچھے مذہبی عناد کارفرما تھا؟

میرے خیال میں یہ ایک سیاسی انتقام تھا، جسے مذہب کی آڑ میں جواز فراہم کیا گیا۔ اسی دور میں ہم دیکھتے ہیں کہ جہانگیر نے اپنے بیٹے خسرو مرزا کو بھی سخت سزا دی تھی، جو ایک بغاوت کے خلاف کارروائی سمجھی جاتی ہے۔ اگر خسرو کی سزا کو سیاسی سمجھا جاتا ہے، تو گرو ارجن دیو جی کو دی گئی سزا بھی سیاسی ہی قرار دی جانی چاہیے۔

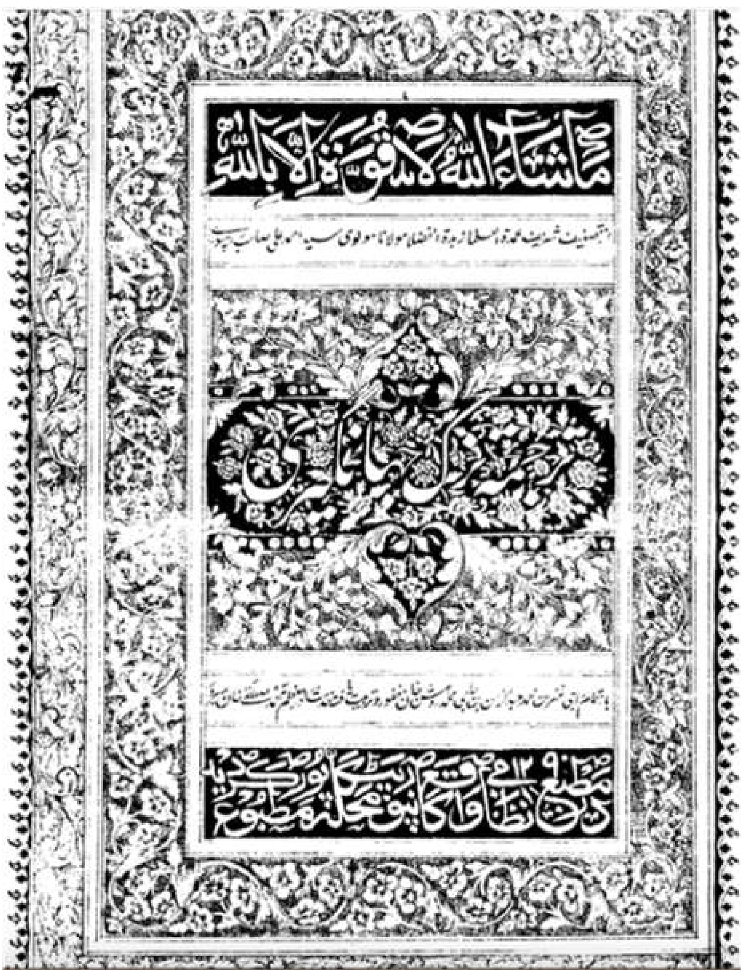
یہاں میں اس بات کی نشاندہی ضروری سمجھتا ہوں کہ جب خود جہانگیر اپنی کتاب میں گرو ارجن دیو کے قتل کا اعتراف کر رہا ہے، تو سید محمد لطیف کیسے یہ لکھ سکتے ہیں کہ گرو ارجن دیو پر تشدد بھی کیا گیا اور ان کی وفات قید کے دوران مرگی کی بیماری کے سبب ہوئی؟

مزید برآں، یہ سوال بھی قابلِ غور ہے کہ جہانگیر اور گرو ارجن دیو جی کے درمیان اختلافات کا آغاز کب اور کیسے ہوا؟ اس حوالے سے سید محمد لطیف کی تحریر اہمیت کی حامل ہے، جسے میں یہاں نقل کر رہا ہوں۔

ارجن نے شہنشاہ جہانگیر کے دور میں لاہور کے وزیر خزانہ چانڈو شاہ کی بیٹی سے اپنے بیٹے ہرگوبند کی شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ کہا جاتا ہے اس نے چانڈو شاہ کی طرف سے بھیجے گئے منگنی کے تحائف کو بھی واپس کر دیا۔ وزیر، جس نے گورو (سید محمد لطیف گورو لکھتے ہیں۔) کو بھکاری کہہ کر اور اسے ایک مکان کی تالی اور خود کو بالائی منزل کہہ کر اپنے ساتھ موازنہ کر کے دشمنی کی دعوت دی تھی، اب لاکھوں روپوں سے گورو کو ٹھنڈا کرنے کے لیے بذات خود گیا، لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی کیونکہ گورو نے اعلان کر دیا تھا: "میرے الفاظ پتھر پر کندہ ہیں اور انھیں مٹایا نہیں جا سکتا۔ اگر تم اپنی بیٹی کے جہیز کے ساتھ پوری دنیا بھی دو تو میرا بیٹا اس کے ساتھ شادی نہیں کرے گا"۔ وزیر بہت شرمندہ ہوا لہٰذا اس نے گورو کو تباہ کرنے کا تہیہ کر لیا۔ اس نے شہنشاہ جہانگیر (جو اس وقت لاہور میں تھا) سے اس کی غیبت شروع کر دی۔ بادشاہ کے باغی بیٹے خسرو کی کامیابی کے لیے (جو اس وقت عارضی طور پر پنجاب پر قابض تھا) دعائیں کرنے کی بنا پر ارجن پہ بغاوت کا الزام لگایا گیا۔ اسے قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ بادشاہ نے اس

سے ایک بہت بڑی رقم ہتھیانے کی خواہش کا اظہار کیا، جسے ادا کرنے کے وہ قابل نہیں تھا۔ اس پر تشدد کیا گیا اور جس وقت 1606ء میں لاہور کے قریب قید میں تھا تو مرگی کی حالت میں فوت ہو گیا۔ یہ جہانگیر کی حکومت کا دوسرا سال تھا۔ اس نے چوبیس سال تک بطور گورد حکومت کی۔ اس کی سمادھ اب قلعہ لاہور کے سامنے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے مقبرے کے نزدیک استادہ ہے۔

تزک جہانگیری میں جو لکھا ملا، اس کا عکس یہاں دے رہا ہوں، جس سے سب کچھ واضح ہے۔





بیسوین تاریخ عبداللہ خان کو سرفراز کرکے منصب ڈھائی ہزاری ذات اور پانسو سوارون کا مع اصل و اضافہ مقرر کیا او
دولاکھ روپیہ یکو نکو دیکر حکم فرمایا کہ اونکو مدد خرچ مین دین اور بتدریج اونکے ماہیانون مین وضع کرتے جاوین اور پنچہزار روپیہ
قاسم بیگ خان داماد بادشاہ و بیگ خان کو اور تین ہزار سید بہادر خان کو عنایت کیے اور موضع گوبند وال مین کہ
کنارہ دریاے بیاہ کے واقع ہی ایک ہندو تھا ارجن نام لباس فقیری اور بزرگی مین کہ بہت بیوقوف ہندو و مسلمان اوس کے
حالات کے مرید اور معتقد تھے اور اوسنے اپنی ولایت مشہور کر رکھی تھی کہ سب لوگ اوسکو گرو کہتے تھے اور اطراف و جوانب سے
لوگ اوسکے معتقد ہو کر آتے تھے یہ دوکان اوسکی تین چار پشت سے گرم تھی اور مین بہت دنون سے سوچتا تھا کہ اوسکی اوس جھوٹی
دوکان کو برطرف کرون یا مدو اوسکو مسلمان کرون یہان تک کہ جب ان دنون خسرو نے اس راہ سے گذر کیا تو اس دک مجہول
نے اوس سے ملنے کا ارادہ کیا اتفاق سے اوسکے مقام پر جاکر خسرو مقیم ہوے اسنے باہر نکلکر اوس سے ملاقات کی اور اکثر باتین اوسکو کہین
اور اوسکی پیشانی پر اونگلی سے زعفران کا قشقہ کھینچا اور اس حرکت کو شگون اوسکے مقصود کا کیا جب مینے اوسکی یہ باتین سنین اور پہلے سے بھی
اوسکی واہیات مجکو خوب معلوم تھی تو مینے حکم اوسکے حاضر کرنے کا دیا جب وہ پکڑا آیا تو اوسکا گھر بار اور متعلقات تمام مرتضے خان کو دیدے
دیا اور اوسکے اسباب کو ضبط کرکے فرمایا کہ اوسکو واسطے سیاست کے قتل کرین اور دو شخص اور کہ نام اونکا راجو اور انبا تھا اور
دولت خان خواجہ سرا کی حمایت سے ظلم و تعدی مین زندگانی کرتے تھے اور جب تک خسرو لاہور پر قابض رہا اونھون نے خوب

یہ واقعہ سکھ تاریخ میں غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے، کیونکہ اس کے بعد سکھ مت میں ایک عسکری عنصر نمایاں ہونے لگا۔ اس تبدیلی کی بنیادی وجہ مغل شہنشاہ کے حکم پر گرو ارجن دیو جی کی موت تھی، جسے سکھ روایات میں اولین موت کا درجہ حاصل ہے۔ سکھوں کے لیے یہ واقعہ ہمیشہ ایک گہرے جذباتی اور تاریخی اثر کا حامل رہا ہے۔ میرے خیال میں، جب بھی مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان مفاہمت یا صلح کی کوششیں کی گئیں، گرو ارجن دیو جی کی موت وہ نکتہ تھا جو دونوں برادریوں کے درمیان ایک مستقل رکاوٹ کے طور پر موجود رہا۔ یاد رہے کہ سکھ بھی اپنے ان افراد کے لیے شہید اور موت کا لفظ ہی استعمال کرتے ہیں جو سکھ دھرم کی خاطر مارے گئے۔

پنجاب سکھوں کا مذہبی اور ثقافتی مرکز رہا ہے، لیکن اسی خطے میں ایک بڑی مسلم آبادی بھی بستی ہے۔ اگرچہ دونوں برادریاں ایک ہی جغرافیائی سرزمین پر آباد ہیں اور ان کی زبان، رہن سہن، بول چال، حتیٰ کہ شادی بیاہ کی رسوم بھی ایک جیسی ہیں، اس کے باوجود ایک گہری خلیج نے ہمیشہ ان کے درمیان فاصلہ برقرار رکھا ہے۔ بدقسمتی سے، یہ خلیج آج بھی موجود ہے۔

اگرچہ ظاہری طور پر دونوں گروہ ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں، مگر حقیقت میں ان کے

سماجی اور ثقافتی دائرے ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ سکھوں نے نہ صرف اپنی عبادت گاہیں علیحدہ قائم کیں بلکہ اپنے تعلیمی ادارے اور رہائشی بستیاں بھی الگ ہی بسائیں، جس سے اس تقسیم کو مزید تقویت ملی۔ اس تقسیم کی ایک نمایاں مثال خالصہ کالجز کے قیام سے دی جاسکتی ہے، جو سکھ برادری کے لیے مخصوص تعلیمی ادارے تھے اور ان کی جداگانہ شناخت کو مزید مستحکم کرنے میں اہم کردار ادا کرتے رہے۔ اسی طرح، میرے آبائی شہر ٹوبہ ٹیک سنگھ میں بھی اس سماجی تفریق کی واضح مثال موجود ہے۔ یہاں ایک جانب گوبند پورہ کے نام سے بستی قائم کی گئی، جو آج بھی موجود ہے، جبکہ دوسری جانب اسلام پورہ کے نام سے ایک محلہ بسایا گیا۔

یہ مثال اس بات کی عکاسی کرتی ہے کہ کس طرح ایک ہی شہر میں مذہبی اور سماجی بنیادوں پر دو مختلف برادریاں الگ الگ آباد ہوئیں۔ یہ طرزِ رہائش اس تاریخی پس منظر کو اجاگر کرتا ہے جس کے تحت دونوں گروہوں نے اپنے سماجی و ثقافتی ادارے اور رہائشی علاقے علیحدہ رکھنے کو ترجیح دی، جس سے ان کے درمیان تقسیم مزید گہری ہوتی گئی۔

گرو ہر گوبند صاحب کی قیادت اور عسکری اصلاحات

گرو ہر گوبند صاحب سکھوں کے چھٹے گرو تھے، اور ان کا دورِ قیادت 1606ء سے 1644ء تک رہا۔ وہ گرو ارجن دیو جی کے بیٹے تھے، اور اپنے والد کی وفات کے بعد انھوں نے سکھ مت میں ایک نئے عہد کی بنیاد رکھی۔ ان کے دور میں سکھ مت، جو ابتدا میں ایک روحانی و اصلاحی تحریک تھا، میں عسکری رنگ بھی نمایاں ہونے لگا۔ میرے خیال میں یہ تبدیلی مغل حکمرانوں کے طرزِ عمل کے ردِعمل کے طور پر آئی۔ یا یہ بھی ممکن ہے کہ سکھوں کو یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ مغل سلطنت کمزور ہو رہی ہے، اور اس کے بعد پیدا ہونے والے خلا کو پُر کرنے کے لیے انھیں اپنے آپ کو تیار کرنا ہوگا۔ ایک رائے یہ بھی ہو سکتی ہے کہ سکھوں کے نزدیک ان کا دھرم صرف اسی صورت میں باقی رہ سکتا ہے جب ایک ہاتھ میں گرنتھ صاحب اور دوسرے ہاتھ میں تلوار ہو۔ یہ میرا قیاس ہے، ممکن ہے درست نہ ہو، حتمی بات نہیں، صرف جو میں نے سمجھا وہ بیان کر رہا ہوں۔

یہ تمام امور مدِنظر رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ گرو صاحب نے سکھوں کی روحانی رہنمائی کے ساتھ ساتھ ان کی جسمانی و عسکری حفاظت کے لیے بھی اقدامات کیے۔ اسی مقصد کے تحت انھوں نے امرتسر میں اکال تخت صاحب کی بنیاد رکھی، جو سکھوں کے لیے ایک سیاسی و عسکری مرکز بن گیا۔ اسی دور میں سکھ برادری کے اندر جنگی مہارت پیدا کرنے کے لیے باقاعدہ فوج تشکیل دی گئی، جسے ''سنت سپاہی'' کے تصور کے تحت منظم کیا گیا۔ گھڑسوار فوج تیار کی گئی، اور ہتھیاروں کے استعمال پر زور دیا گیا۔ مغل بادشاہ جہانگیر نے ابتدا میں گرو ہر گوبند کو قید کر لیا، تاہم بعد میں انھیں رہا کر دیا گیا۔ اس واقعے کی تفصیل سید محمد لطیف نے مفصل انداز میں بیان کی ہے، جس کا تذکرہ یہاں اس کتاب کے دائرہ کار سے باہر ہے۔

جہانگیر کی وفات کے بعد، شاہجہان کے عہد میں مغلوں اور سکھوں کے درمیان کئی کھلی جنگیں ہوئیں، خصوصاً 1628ء سے 1634ء کے دوران۔ ان جنگوں کے باعث سکھوں کو اپنی حفاظت کے لیے ہتھیار اٹھانے پر مجبور ہونا پڑا، لیکن ساتھ ہی گرو ہرگوبند صاحب انھیں انصاف، انسانیت اور اخلاقیات کے اصولوں پر کاربند رہنے کی تلقین بھی کرتے رہے۔ ان کے دور میں سکھ مت صرف ایک روحانی تحریک نہیں رہا، بلکہ ایک منظم عسکری قوت میں تبدیل ہو گیا۔

اب ہم اپنے اصل موضوع کی طرف آتے ہیں: گرو ہرگوبند (1644ء-1595ء) کے پنجاب پر کیا اثرات مرتب ہوئے؟ ان کا دور سکھ مت میں عسکریت کے آغاز، مغل سلطنت کے ساتھ کشیدگی، اور سکھ برادری کی اجتماعی شناخت کے ارتقا کے حوالے سے نمایاں اہمیت رکھتا ہے۔

گرو ہرگوبند نے سکھ مت میں مذہبی قیادت کے ساتھ ساتھ عسکری قوت کی ضرورت کو اجاگر کیا۔ ان کے دور میں پنجاب بھر میں سکھ مت کا دائرہ وسیع ہوا۔ ان کی قیادت میں سکھوں نے مختلف علاقوں میں اپنے مراکز قائم کیے، جن میں کئی گوردوارے شامل تھے۔ اس سے سکھ مت کی نظریاتی اور جغرافیائی وسعت میں اضافہ ہوا، اور پنجاب کے مختلف طبقات نے سکھ دھرم کو قبول کیا۔

گرو ہرگوبند کے اقدامات نے نہ صرف سکھوں کے لیے عسکری تربیت کی راہ ہموار کی، بلکہ ان کے بعد سکھ برادری ایک الگ سیاسی طاقت کے طور پر بھی ابھرنے لگی۔ انھوں نے پنجاب میں لنگر (سماجی مساوات کی علامت) اور کمیونٹی سروس کی روایت کو مزید فروغ دیا، جو آج بھی سکھ مت کی پہچان ہے۔ ان کے اقدامات نے کسانوں اور عام لوگوں کو خودمختاری کی راہ پر ڈالا تاکہ وہ مغل تسلط سے نجات حاصل کر سکیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بیشتر سکھوں کا تعلق دیہات سے تھا اور وہ کسان تھے، جبکہ شہروں میں ہندو اکثریت میں تھے اور پنجاب کی معیشت پر ان کا غلبہ تھا۔ کسان طبقہ خوشحال ہونے کے ساتھ ساتھ منظم بھی ہونے لگا، جس کا اثر مستقبل میں سکھ راج کے قیام پر پڑا، جہاں زراعت اور مقامی معیشت کو استحکام حاصل ہوا۔

مندرجہ بالا بحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ گرو ہرگوبند نے سکھ مت کو محض ایک

روحانی تحریک کے طور پر محدود نہیں رکھا، بلکہ اسے ایک دفاعی و عسکری قوت میں تبدیل کر دیا، جو مغل سلطنت کے خلاف منظم مزاحمت کا مرکز بنی۔ ان کی اصلاحات اور عسکری حکمت عملی نے مستقبل کے سکھ رہنماؤں، مثلاً بندہ سنگھ بہادر، دلباغ سنگھ اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے لیے ایک بنیاد فراہم کی۔ ان کی پالیسیوں اور اثرات کو آج بھی سکھ تاریخ اور پنجاب کی ثقافتی و سیاسی ساخت میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔

گرو ہرگوبند کی فکر اور عملی حکمتِ عملی بعض اسلامی صوفی روایات، خصوصاً ''شریعت اور طریقت'' کے امتزاج سے مشابہت رکھتی تھی۔ اس کے نتیجے میں کچھ مسلمان صوفیا بھی ان کے نظریات سے متاثر ہوئے، خصوصاً لاہور اور کشمیر کے متعدد صوفی علماء کے ساتھ ان کے قریبی تعلقات اور روحانی مکالمے اس امر کی گواہی دیتے ہیں۔ تاریخی حوالوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی فوج میں بعض مسلمان جنگجو بھی شامل تھے، جو مغل حکمرانوں کے خلاف سکھ افواج کے شانہ بشانہ لڑے۔

تاہم، جہاں کچھ مسلمان علماء نے ان کے نظریات و اقدامات کو سراہا، وہیں درباری علماء کے ایک طبقے نے، خاص طور پر جہانگیر اور شاہجہان کے ادوار میں، ان کے بڑھتے ہوئے عسکری اثر و رسوخ کو ایک سیاسی و مذہبی چیلنج کے طور پر دیکھا۔ یہی وجہ ہے کہ مغل دربار میں انھیں ایک ممکنہ خطرہ تصور کیا جانے لگا۔

یہ تاریخی موڑ پنجاب کی سیاست اور مذہبی تعلقات میں ایک اہم تبدیلی کی علامت تھا۔ اسی مقام سے برصغیر میں مسلمانوں کے سیاسی زوال کے آثار نمایاں ہونے لگے، جو بعد ازاں مزید گہرے ہوتے چلے گئے۔

❀ ❀ ❀

گرو ہر رائے

سکھوں کے ساتویں گرو، جن کا دور ایک پُرامن عہد مانا جاتا ہے

گرو ہر رائے (پیدائش: 1630، پنجاب، ہندوستان وفات: 1661، پنجاب) سکھوں کے ساتویں گرو (1661-1644) تھے۔ان کے بارے میں انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا پر ایک تحریر موجود ہے، جس کا خلاصہ کچھ یوں ہے:

گرو ہر رائے اپنے دادا گرو ہر گوبند کے بعد سکھوں کے گرو مقرر ہوئے۔ ان کے دور میں مالوہ کے علاقے میں سکھ مت کی تبلیغ کا دائرہ وسیع ہوا اور مقامی برار قبائل کی ایک بڑی تعداد نے سکھ مذہب قبول کیا۔انھوں نے سکھ فوجیوں کی تربیت کا بھی بندوبست کیا۔ان کے زمانے میں مغل خاندان کے ساتھ عمومی طور پر پُرامن تعلقات قائم رہے۔ تاہم، جب مغل شہزادہ دارا شکوہ (جو عالمگیر کا بھائی اور گرو ہر رائے کا عقیدت مند تھا) اپنے بھائی اورنگزیب کے ساتھ تخت کے لیے جدوجہد میں مارا گیا، تو حالات بدل گئے۔

ایک موقع پر اورنگزیب نے گرو ہر رائے کو دارا شکوہ کے ساتھ اپنے تعلقات کی وضاحت کے لیے دہلی طلب کیا۔اس موقع پر گرو صاحب نے خود جانے کے بجائے اپنے بیٹے رام رائے کو نمائندگی کے لیے بھیجا۔رام رائے نے دربار میں ایسے بیانات دیے جو مغل حکام کو خوش کرنے کے لیے تھے، مگر ان میں بعض نکات سکھ مت کی بنیادی تعلیمات سے متصادم تھے۔گرو ہر رائے کو یہ بات سخت ناپسند آئی اور انھوں نے رام رائے کو گدی کا وارث بنانے سے انکار کر دیا۔

گرو ہر رائے اور اورنگزیب کے تعلقات اُس دور میں پیدا ہونے والی مذہبی اور سیاسی تبدیلیوں کے تناظر میں بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ اورنگزیب کی حکمرانی میں مذہبی انتہا پسندی کا

رجحان بڑھا، جس نے غیر مسلم اقلیتوں، خصوصاً ہندوؤں اور سکھوں کے لیے مسائل پیدا کیے۔ داراشکوہ کے صوفیانہ خیالات سکھ مت سے ہم آہنگ تھے، اس لیے گرو ہر رائے کا اس سے قرب ہونا فطری بات تھی۔ مگر جب اورنگزیب نے اقتدار سنبھالا، تو اس نے ان تعلقات کو شک کی نگاہ سے دیکھا۔

سید محمد لطیف کے مطابق، گرو ہر رائے نے دربار میں جانے کے بجائے ایک پیغام بھیجا، جس میں کہا کہ وہ ایک فقیر منش شخص ہیں اور دربار سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ اس پر اورنگزیب نے ان کے بیٹے کو انعام واکرام دے کر واپس بھیج دیا۔ گرو ہر رائے کی جانب سے کوئی تحریری تصنیف دستیاب نہیں، کیونکہ ان کا زیادہ وقت سکھوں کی روحانی تعلیمات کی تبلیغ میں گزرا، اور انھوں نے زبانی تعلیم کو ترجیح دی۔ ان کی تعلیمات سادگی، محبت، اور انسانیت پر مبنی تھیں، جو سکھ مت کی بنیادی اقدار ہیں۔

میرے خیال میں گرو ہر رائے کا دور سکھوں اور مغلوں کے درمیان نسبتاً پُرامن رہا، اگرچہ بعض پیچیدگیاں موجود تھیں۔ گرو ہر رائے نے ایک محتاط حکمت عملی اختیار کی، جس کی بدولت سکھوں کی تنظیمی اور عسکری طاقت میں اضافہ ہوا۔ یہی حکمت عملی آگے چل کر مغل سلطنت کے زوال کے اسباب میں سے ایک بنی۔ گرو ہر رائے کے دور میں جو بنیادی تبدیلی آئی، وہ سکھوں کی بہتر تنظیم اور روحانی پختگی تھی۔ اگرچہ اس دور میں براہِ راست جنگیں نہیں ہوئیں، مگر اورنگزیب کی سخت گیر مذہبی پالیسیوں کی وجہ سے کشیدگی کی بنیاد پڑ گئی، جس کے اثرات آنے والی سکھ تاریخ پر واضح نظر آتے ہیں۔

اس موضوع پر مندرجہ ذیل کتب اور ماخذات مفید معلومات فراہم کرتے ہیں:

Sikh History by Dr Gopal Singh

Tuzk-e-Jahangiri (جہاں گیر کی یادداشتیں) اگرچہ اس میں گرو ہر رائے کا ذکر براہ راست موجود نہیں، لیکن مغل و سکھ تعلقات کی نوعیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے

History of the Sikhs by Dr Hari Ram Gupta سکھوں اور

مغلوں کے باہمی تعلقات کا تفصیلی جائزہ

The Sikh Religion: Its Gurus, Sacred Writings and Authors by Max Arthur Macauliffe

سکھ مت کی تعلیمات اور مغل دربار کے ساتھ تعلقات پر مفصل تبصرہ۔

تمام معتبر ماخذات اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ گرو ہر رائے کا دور (1644-1661) نسبتاً پُر امن تھا، اور ان کی پالیسی مغل حکومت سے براہِ راست تصادم سے گریز کی تھی۔ تاہم، دارا شکوہ کے ساتھ ان کے قریبی تعلقات نے اورنگزیب کی نگاہ میں ان کے مقام کو مشکوک بنا دیا، جس کے اثرات بعدازاں مزید گہرے ہوتے گئے۔

یہ نتائج میری ذاتی تحقیق، مطالعے اور فہم پر مبنی ہیں، جن کی قطعیت کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم، میں نے دستیاب ذرائع اور تاریخی شواہد کی روشنی میں جو کچھ سمجھا، اسے اس تحریر میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

سری گرو ہر کرشن جی، سکھ مت کے آٹھویں گرو

سری گرو ہر کرشن جی کے بارے میں کئی مضامین پڑھنے کا موقع ملا۔ایک مختصر تحریر *Delhi Sikh Gurdwara Management Committee* کی ویب سائٹ پر دستیاب ہوئی۔ اس تحریر سے جو کچھ جان سکا، وہ پیشِ خدمت ہے:

سری گرو ہر کرشن جی، سکھ مت کے آٹھویں گرو، 7 جولائی 1656ء کو کیرت پور صاحب میں پیدا ہوئے۔ وہ گرو ہر رائے کے دوسرے بیٹے تھے، اور صرف پانچ سال کی عمر میں انھیں گروتوا کی ذمہ داری سونپی گئی۔ ان کے دور کا بیشتر حصہ دہلی میں گزرا، جہاں انھیں سیاسی اور روحانی چیلنجز کا سامنا رہا۔گرو ہر کرشن جی نے اپنی کم عمری کے باوجود سکھ مت کی روحانی تعلیمات کو فروغ دیا، اور ایک انسان دوست رہنما کے طور پر اپنی پہچان بنائی۔ دہلی میں وبا پھیلنے کے دوران، انھوں نے مذہب و ذات سے بالاتر ہو کر لوگوں کی خدمت کی، جس پر انھیں ''بچہ نبی'' یا ''بالا پیر'' کے القاب سے یاد کیا جانے لگا۔ان کی انسانیت نوازی اور بے لوث خدمت نے مقامی مسلمانوں کو بھی متاثر کیا۔ روایت کے مطابق، اورنگ زیب نے بھی ان کے خلاف کسی قسم کی کارروائی نہ کی، کیونکہ وہ گرو ہر کرشن جی کی انسان دوستی سے متاثر تھا۔

گرو صاحب کی ذہانت کا ایک واقعہ اس وقت پیش آیا جب راجہ جے سنگھ نے گرو جی سے حقیقی ملکہ کی شناخت کرنے کو کہا۔گرو ہر کرشن جی نے فوراً ایک سادہ لباس خاتون کو ملکہ کے طور پر منتخب کیا، جو ان کی فراست اور باطنی بصیرت کی دلیل تھا۔گرو ہر کرشن جی کی زندگی کا اختتام ایک بیماری کے باعث ہوا، جس کے دوران وہ شدید بخار میں مبتلا ہو گئے۔ اپنے آخری وقت میں انھوں

نے اپنی والدہ کو بلایا اور اپنے جانشین کے طور پر ''بابا بکالا'' کے الفاظ کہے، جس سے مراد گرو تیغ بہادر تھے۔ 30 مارچ 1664 کو گرو ہر کرشن جی نے وفات پائی، اور ان کے آخری کلمات ''واہگرو'' تھے۔

گرو ہر کرشن جی کی زندگی اور تعلیمات سکھ تاریخ کا اہم باب ہیں۔ انھوں نے سکھ قوم کو محبت، انسانیت، اور بھائی چارے کا پیغام دیا۔ ان کی قربانی اور خدمت کا اثر آج بھی سکھ برادری میں نمایاں طور پر محسوس کیا جاتا ہے۔ وہ آٹھ سال کی عمر میں وفات پا گئے اور صرف تین سال تک گرو رہے۔ اسی وجہ سے وہ سب سے کم عمر سکھ گرو سمجھے جاتے ہیں۔

The Times of India

میں ان کے بارے ایک مضمون ملتا ہے جس کا عنوان ہے؛

Guru Hari Krishna: The Beaocn of Compassion and service

اس مضمون میں ان کے بارے بے حد مفید معلومات ملتی ہیں۔

❀❀❀

سری گرو تیغ بہادر
بقول سکھ دوسرے شہید گرو

سری گرو تیغ بہادر سکھ مذہب کے نویں گرو تھے، جنھوں نے مذہبی آزادی، انسانی وقار، اور انصاف کے دفاع میں بے مثال قربانی دی۔ ان کی قربانی صرف سکھ مت کے لیے ایک روشن مثال ہے، جسے برصغیر کی تاریخ میں خاص مقام حاصل ہے۔[1]

سری گرو تیغ بہادر بارے کئی مضامین پڑھنے کا موقع ملا۔ جن میں چند درج ذیل ہیں۔

Guru Tegh Bahadar by Mohinder Pal Kohli

Guru Tegh Bahadar by Harbans Singh

Life of Guru Tegh Bahadar by Max Arthur Macauliffe, Sir Daljeet Singh Raja.

A Brief Life Sketch Guru Tegh Bahadar by Max Arthur Macauliffe, Sir Daljeet Singh Raja

اس کے علاوہ میں نے درج ذیل ماخذ سے بھی مدد لی ہے۔

https//:www.britannica.com/biography/Guru-Tegh-Bahadur

https//:www.sikhiwiki.org/index.php/Guru_Tegh_Bahadur

https//:sgpc.net/ten-guru-sahibs/guru-tegh-bahadur-sahib/

---

[1] عام طور پر شہید کا لفظ مسلمان اپنے ان لوگوں کے لیے بولتے ہیں جو اسلام کی خاطر جنگ کرتے ہوئے مارے جائیں۔ مگر سکھ بھی اپنے ان لوگوں کے لیے شہید کا لفظ ہی بولتے ہیں جو سکھ مت کی خاطر قتل کیے جائیں۔

یہاں پیش کردہ تجزیہ اُن معلومات پر مبنی ہے جو میں نے مختلف ذرائع سے حاصل کی ہیں۔ یہ موضوع نہایت حساس ہے، کیونکہ ایک طرف عالمگیر جیسی شخصیت ہے، جسے بہت سے مسلمان ولی کا درجہ دیتے ہیں، اور دوسری طرف گرو تیغ بہادر کی المناک شہادت ہے، جسے سکھ برادری کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ گرو تیغ بہادر کی موت کے بعد سکھوں اور مغلوں کے درمیان تعلقات مزید کشیدہ ہو گئے، جس کے نتیجے میں متعدد معرکے رونما ہوئے۔ ان جنگوں نے برصغیر کی تاریخ پر گہرا اثر ڈالا اور بالآخر مغلیہ سلطنت کے زوال اور ایک منظم سکھ ریاست کے قیام کی بنیاد رکھی۔ یہ واقعہ محض ایک تاریخی تنازع نہیں، بلکہ اس نے برصغیر میں سیاسی، سماجی اور مذہبی تبدیلیوں کا آغاز بھی کیا۔

جو کچھ جان سکا، وہ پیشِ خدمت ہے۔ میں نے زیادہ تر معلومات Gurmukh Singh OBE کی کتاب *The True Story*:Guru Tegh Bahadur 1621-1675 سے حاصل کی ہیں۔ اس کتاب پر ایک جامع تبصرہ Hardev Singh Virk نے لکھا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر کئی مضامین سے بھی استفادہ کیا ہے۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مطابق، گرو تیغ بہادر (1621-1675) سکھوں کے نویں گرو (1664-1675) اور سکھ تاریخ میں دوسری بڑی شخصیت تھے۔ وہ دسویں گرو، گرو گوبند سنگھ کے والد بھی تھے۔ جیسا کہ قبل ازیں ذکر ہو چکا ہے، آٹھویں گرو، سری ہرکرشن جی، نے اپنے پیروکاروں کو اشارہ دیا تھا کہ ان کا جانشین بکالا گاؤں میں ملے گا۔ چنانچہ، ایک وفد اس ہدایت کی روشنی میں وہاں روانہ ہوا۔ ایک امیر سکھ تاجر، بھائی مکھن شاہ، نے گرو تیغ بہادر کی شناخت میں مرکزی کردار ادا کیا۔ یہ امر اس وجہ سے اہم ہے کہ گرو تیغ بہادر نمود و نمائش اور خودستائی سے ہمیشہ گریزاں رہے۔ اس حقیقت کے ادراک کے بعد، بھائی مکھن شاہ نے انھیں سکھوں کا نواں گرو تسلیم کر لیا۔

گرو تیغ بہادر کے عہد میں مغل شہنشاہ اورنگزیب کی حکمرانی تھی، جس کی پالیسیوں کو سخت گیر اور مذہبی جبر پر مبنی قرار دیا جاتا ہے۔ تاریخی روایات کے مطابق، اورنگزیب نے کشمیر کے ہندوؤں کو جبراً اسلام قبول کرنے کا حکم دیا، جس کی مزاحمت کی گئی۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر، گرو تیغ بہادر نے ان ہندوؤں کے دفاع میں آواز بلند کی۔ انھوں نے اورنگزیب کو پیغام دیا کہ اگر وہ خود پہلے اسلام قبول کرے، تو دیگر ہندو بھی اس کی پیروی کریں گے۔ ان کا یہ جرأت مندانہ

اقدام مذہبی آزادی اور انسانی حقوق کے تحفظ کی علامت کے طور پر جانا جاتا ہے۔

اپنے اصولی موقف کے پیشِ نظر، گرو تیغ بہادر نے دہلی کا سفر اختیار کیا، جہاں انھیں مغل حکام نے گرفتار کر کے قلعے میں قید کر لیا۔ تاریخی ذرائع کے مطابق، اورنگزیب نے ان سے مطالبہ کیا کہ وہ یا تو اسلام قبول کریں یا اپنی کرامت و معجزے کا مظاہرہ کریں۔ تاہم، گرو تیغ بہادر نے ہر قسم کی سودے بازی اور دباؤ کو مسترد کر دیا، جس کے نتیجے میں انھیں سزائے موت دے دی گئی۔ ان کی موت سکھ مت میں ایک عظیم قربانی اور آزادیِ مذہب کے لیے جدوجہد کی علامت بن گئی۔

جب گرو تیغ بہادر کو سکھ برادری کی روحانی اور سماجی قیادت سونپی گئی، تو وہ عقیدت مندوں کے لیے مذہبی اور اخلاقی رہنمائی کا مرکز بن گئے۔ سکھ تعلیمات کو مستحکم کرنے اور اخلاقی اقدار کو فروغ دینے میں ان کا کردار نہایت اہم رہا۔

یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ گرو ہرگوبند کے دور سے چلی آتی روایات کے مطابق، گرو تیغ بہادر نے بھی ایک باوقار طرزِ زندگی اختیار کیا، جس میں حفاظتی مسلح دستے اور دیگر شاہی علامات شامل تھیں۔ تاہم، ان کی ذاتی زندگی سادگی اور قناعت پر مبنی تھی۔ تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دور میں مغل سلطنت کے ساتھ کوئی بڑا عسکری تصادم نہیں ہوا، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی قیادت روحانی، اخلاقی اور سماجی اصلاحات پر مرکوز تھی۔ گرو تیغ بہادر کی قربانی نہ صرف سکھ مت کے پیروکاروں کے لیے بلکہ تمام مذاہب کے ماننے والوں کے لیے مذہبی آزادی کی ایک روشن مثال ہے، جو آج بھی تاریخی اور نظریاتی طور پر نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔

ان کا یہ قول بے حد مشہور ہے:

> ''گرو نے مسکرا کر کہا: میرے دوستو! صرف اپنے جسم کو دھونے سے پاک نہیں ہوا جا سکتا، کیونکہ آلودہ دماغ کو پانی سے نہیں دھویا جا سکتا۔ یہ صرف اللہ تعالیٰ کا حقیقی نام ہے جو تمام گناہوں کو دھو سکتا ہے اور روح کو آزاد کر سکتا ہے۔''

گرو تیغ بہادر: تبلیغی سرگرمیاں اور تاریخی پس منظر

شیرومنی گردوارہ پربندھک کمیٹی (Shiromani Gurdwara Parbandhak

Committee) کے ایک شائع شدہ مضمون کے مطابق، 1665ء میں گرو تیغ بہادر جی نے ایک مقامی راجہ سے زمین خرید کر ایک نئے شہر، چک نانکی، کی بنیاد رکھی، جو بعد ازاں سری آنند پور صاحب کے نام سے معروف ہوا۔ موجودہ دور میں آنند پور صاحب سکھوں کے لیے نہایت مقدس مقام کی حیثیت رکھتا ہے۔

آنند پور صاحب میں مختصر قیام کے بعد، گرو تیغ بہادر نے سکھ مت کی تبلیغ کے لیے ہندوستان کے مشرقی حصوں کی جانب ایک وسیع سفر کا آغاز کیا۔ اس دوران وہ اپنے قریبی ساتھیوں اور عقیدت مندوں کے ہمراہ مختلف مقامات پر رکے اور مذہبی و سماجی اصلاحات کے فروغ کے لیے کوشاں رہے۔ تاہم مغل حکومت نے ان کی ان سرگرمیوں کو ناپسند کیا، جس کے نتیجے میں دسمبر 1665ء میں مغل افسر عالم خان روہیلہ نے انھیں گرفتار کر کے دہلی روانہ کر دیا، جہاں انھیں شہنشاہ اورنگزیب کی عدالت میں پیش کیا گیا۔ بعد ازاں انھیں راجہ جے سنگھ کے بیٹے، کنور رام سنگھ، کے حوالے کیا گیا، جنھوں نے گرو جی کو عزت و احترام دیا اور ان کی رہائی کے احکامات حاصل کیے۔

دو ماہ بعد رہائی کے بعد، گرو تیغ بہادر نے اپنے تبلیغی مشن کو دوبارہ شروع کیا اور متھرا، آگرہ، الہ آباد، بنارس، ساسارام اور بالآخر مئی 1666ء میں پٹنہ پہنچے۔ عام طور پر سکھ برادری کو پنجاب سے وابستہ سمجھا جاتا ہے، تاہم اس سفر کے دوران انھوں نے مختلف خطوں میں موجود سکھ برادری سے رابطہ قائم کیا اور انھیں مزید مستحکم کیا۔ اکتوبر 1666ء میں گرو تیغ بہادر مونگیر، کلکتہ، صاحب گنج اور کانت نگر کے راستے ڈھاکہ پہنچے۔ اس سفر سے قبل انھوں نے اپنے اہلِ خانہ کے محفوظ قیام کے لیے پٹنہ میں ضروری انتظامات کیے، جہاں ایک نیک سکھ خاتون ان کی نگرانی کر رہی تھیں۔ اس وقت ماتا گجری جی اپنے پہلے بیٹے کی ولادت کی منتظر تھیں۔

مغل حکومت کی پالیسیوں اور گرو تیغ بہادر کا ردِعمل

یہ وہ دور تھا جب گرو تیغ بہادر اپنے تبلیغی مشن پر سرگرم عمل تھے، جبکہ دوسری جانب شہنشاہ اورنگزیب کے دورِ حکومت میں ہندو برادری پر مذہبی جبر میں اضافہ ہو رہا تھا۔ تاریخی حوالوں کے مطابق:

غیر مسلموں پر جزیہ نافذ کیا گیا۔

دیوالی اور ہولی جیسے تہواروں پر پابندی عائد کی گئی۔

کئی اہم ہندو مندر مسمار کیے گئے، جن کی جگہ مساجد تعمیر کی گئیں۔

تاریخی شواہد کے مطابق، اسی زمانے میں کچھ سکھ گردوارے بھی منہدم کیے گئے۔

ان واقعات کی صحت کے بارے میں کئی سوالات اٹھائے گئے ہیں۔ ایسے کسی واقعے کا ذکر سید محمد لطیف نے اپنی کتاب میں نہیں کیا۔ مگر ان کے علاوہ کئی مورخین نے ان واقعات کا ذکر کیا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اکادکا واقعات کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا ہو۔ ان عوامل کے پیشِ نظر، گرو تیغ بہادر نے ان حالات سے آگاہی حاصل کی اور اس کے ردِعمل میں پنجاب کی جانب سفر کا آغاز کیا۔

آنند پور واپسی اور سماجی اصلاحات

فروری 1671ء میں، گرو تیغ بہادر آنند پور صاحب واپس پہنچے، جہاں تقریباً دو سال تک انھوں نے سکھ مت کی تبلیغ میں مشغول رہتے ہوئے عوامی مشکلات کا قریب سے مشاہدہ کیا۔ 1672ء میں، انھوں نے پنجاب کے مختلف علاقوں کا سفر کیا اور وہاں کے معاشرتی و اقتصادی طور پر کمزور طبقات کی بہبود کے لیے متعدد اقدامات کیے۔

ان کے فلاحی کاموں میں بنجر زمینوں پر درختوں کی شجر کاری، غریب اور بے زمین کسانوں میں مفت مویشیوں کی تقسیم، ڈیری فارمنگ کے فروغ کی ترغیب، پانی کی قلت سے نمٹنے کے لیے کمیونٹی کنوؤں کی کھدائی شامل تھی۔

میں یہاں ایک اور بات بھی آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں جس کا ذکر بہت کم ملتا ہے۔ اس دور میں جہاں ایک طرف مغل۔سکھ جنگیں جاری تھیں تو دوسری طرف بڑی تعداد میں سکھ ایک مشہور صوفی سخی سرور (جن کا مزار ڈیرہ غازی خان کے قریب واقع ہے) کے مرید بن گئے تھے۔ جو سکھ سخی سرور کے مرید ہو گئے تھے، یا وہ لوگ جو بیک وقت سکھ تعلیمات سے متاثر تھے اور سخی سرور کی درگاہ سے بھی وابستہ رہے، انھیں عام طور پر سروری فقیر، سخی سرور یا، یا پیر راستے والے کہا جاتا تھا۔ پنجاب کے دیہی علاقوں میں یہ اصطلاحات مختلف شکلوں میں استعمال ہوتی رہی

ہیں۔ ان کے اپنے گردوارے بھی ہوتے تھے۔

سروری فقیر/ سرور یا لوگ حضرت سید احمد سخی سرور (جنھیں لوگ احتراماً ''پیر پٹھانا'' بھی کہتے ہیں) سے عقیدت رکھتے تھے۔ کچھ سکھ خاندانوں نے مذہبی ہم آہنگی اور روحانی وابستگی کی بنا پر ان سے بیعت کی۔ ان کی رسومات میں سکھ اور صوفی اسلامی عناصر کا امتزاج نظر آتا ہے۔ بعض اوقات ایسے افراد کو ''پیر راستے والا'' بھی کہا جاتا تھا، یعنی وہ جو پیر کی تعلیمات کے ساتھ کسی اور مسلک یا روایت سے بھی جڑے ہوں۔

اسی دور میں ہمیں دوہری وابستگی (Syncretism) نظر آتی ہے۔ اس وقت پنجاب میں ایسی دوہری مذہبی وابستگی عام رہی، خاص طور پر مغل دور اور اس کے بعد کے ادوار میں۔ سکھ مت، اسلام (خصوصاً صوفی سلسلے)، اور ہندو مت کے ماننے والے بعض افراد مشترکہ روحانی بزرگوں کی درگاہوں پر حاضری دیتے تھے۔

گرو تیغ بہادر اور اورنگزیب: تاریخی سیاق وسباق کا تجزیہ

ایک طویل عرصے سے میں اس سوال کے جواب کی تلاش میں تھا کہ گرو تیغ بہادر کے ساتھ شہنشاہ اورنگزیب (عالمگیر) نے اس قدر سخت رویہ کیوں اپنایا؟ اس حوالے سے مجھے شی رومنی گردوارہ پربندھک کمیٹی کے ایک مضمون میں اس مسئلے کا ممکنہ جواب ملا۔

مذکورہ مضمون کے مطابق، گرو تیغ بہادر کے مسلسل تبلیغی دوروں اور سماجی اصلاحات نے نہ صرف مسلمان علما بلکہ مغل دربار کے اعلیٰ مراعات یافتہ طبقے میں بھی تشویش پیدا کر دی تھی۔ ان حلقوں کو خدشہ تھا کہ کہیں یہ تحریک ان کے اقتدار کے لیے خطرہ نہ بن جائے۔ اس امکان کو بھی رد نہیں کیا جا سکتا کہ مغلیہ سلطنت کے حکام نے گرو تیغ بہادر کی مذہبی سرگرمیوں کے بارے میں مبالغہ آمیز اور جانب دارانہ رپورٹیں دربار میں بھیجی ہوں، جنھوں نے شہنشاہ کے نقطۂ نظر پر اثر ڈالا ہو۔

یہ بحث بھی موجود ہے کہ اورنگزیب کے دورِ حکومت میں ہندوستان کو دارالاسلام بنانے کی کوششیں کی گئیں اور اس مقصد کے تحت غیر مسلموں، بالخصوص ہندو برادری، پر جبر وتشدد کے

واقعات پیش آئے۔ کئی روایات کے مطابق، ہندوؤں کو زبردستی اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا گیا، اور انکار کی صورت میں انھیں قتل کی دھمکیاں دی گئیں۔ تاہم، اس دعوے کی صداقت پر اتفاقِ رائے موجود نہیں، کیونکہ تاریخی مصادر اس حوالے سے متضاد ہیں۔ ممکن ہے کہ بعض مقامات پر ایسے واقعات پیش آئے ہوں، لیکن ان کی مکمل اور حتمی تصدیق ایک پیچیدہ امر ہے۔

شی رومنی گردوارہ پربندھک کمیٹی کے مطابق، کشمیر کے اُس وقت کے مغل گورنر شیر افگن خان نے وسیع پیمانے پر کشمیری پنڈتوں کا قتلِ عام کیا اور ان کی املاک ضبط کر لیں۔ اس کے نتیجے میں متاثرہ کشمیری پنڈت، پنڈت کرپا رام دت کی قیادت میں، مئی 1675ء میں آنندپور صاحب پہنچے اور گرو تیغ بہادر سے مدد طلب کی۔

گرو صاحب نے نہ صرف ان کے مسائل غور سے سنے، بلکہ پرامن طریقے سے جبری تبدیلی مذہب کے خلاف مزاحمت پر رضامندی ظاہر کی۔ سکھ رہنماؤں اور کشمیری پنڈتوں کے ساتھ طویل مشاورت کے بعد گرو صاحب نے سچائی اور دھرم (مذہبی آزادی) کے دفاع کے لیے اپنی جان قربان کرنے کا فیصلہ کیا۔

دوسری طرف، مشہور مورخ سید محمد لطیف کا مؤقف اس سے مختلف ہے۔ وہ اس بات کو مسترد کرتے ہیں کہ کشمیری پنڈتوں کے قتلِ عام یا زبردستی تبدیلی مذہب کے پس منظر میں گرو تیغ بہادر کو سزا دی گئی۔ ان کے مطابق، گرو تیغ بہادر نے بنگال سے واپسی کے بعد آنندپور صاحب کو اپنا مرکز بنایا اور مغل سلطنت کے لیے امن و امان کا مسئلہ پیدا کر دیا، جس پر شہنشاہ اورنگزیب نے فوجی کارروائی کے ذریعے انھیں گرفتار کر کے دربار میں طلب کیا۔ سید محمد لطیف مزید بیان کرتے ہیں کہ عالمگیر نے گرو صاحب کو اسلام قبول کرنے کو کہا، لیکن انکار پر انھیں سزائے موت دی گئی۔

یہ واقعہ تاریخی ذرائع میں متضاد بیانیوں کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ بعض حوالہ جات اسے مذہبی آزادی کے دفاع میں دی گئی قربانی کے طور پر بیان کرتے ہیں، جبکہ دیگر اسے ایک سیاسی اقدام کے طور پر دیکھتے ہیں۔ حتمی طور پر یہ کہنا مشکل ہے کہ گرو تیغ بہادر کی موت کا اصل پس منظر کیا تھا، تاہم یہ حقیقت ناقابلِ تردید ہے کہ ان کی قربانی سکھ تاریخ میں ایک انتہائی اہم

اور یادگار واقعہ بن چکی ہے۔

اب تک جو کچھ میں جان سکا ہوں، اس کے مطابق اس بات پر سبھی متفق ہیں کہ عالمگیر نے گرو صاحب کو تین میں سے ایک بات ماننے کو کہا:

کوئی کرامت دکھائیں،

اسلام قبول کریں،

یا پھر موت کو گلے لگائیں۔

گرو صاحب نے تیسری بات کو قبول کیا۔

اسی پر ان کے بارے میں کہا جاتا ہے:

''سر دیا ہے، سرِ (راز) نہیں دیا۔''

(یعنی سر کٹوا دیا، لیکن ایمان یا مذہب کا راز افشا نہیں کیا۔ یا یوں کہا جا سکتا ہے: سر کٹانا قبول کیا، مگر دھرم بدلنا قبول نہ کیا۔)

گرو تیغ بہادر کی موت: تاریخی، سماجی اور مذہبی اثرات

گرو تیغ بہادر کی موت ہندوستانی تاریخ، خصوصاً شمالی ہندوستان، پر گہرے اثرات مرتب کرنے والا ایک غیر معمولی واقعہ تھی۔ یہ واقعہ 1675ء میں پیش آیا، جبکہ شہنشاہ اورنگزیب کی وفات 1707ء میں ہوئی۔ گرو تیغ بہادر کی قربانی نے جہاں ایک طرف عالمگیر کے طرزِ حکمرانی کو بے نقاب کیا، وہیں ظلم و جبر کے خلاف مزاحمت کو بھی اجاگر کیا۔

گرو تیغ بہادر کی قربانی کے بعد سکھ برادری میں مغل سلطنت اور اورنگزیب کے خلاف شدید غم و غصہ پیدا ہوا۔ یہ وہ وقت تھا جب سکھ قوم نے فیصلہ کیا کہ اپنے مذہب (دھرم) کی بقا اور تحفظ کے لیے عسکری قوت ناگزیر ہے۔ حالانکہ سکھوں اور مغلوں کے درمیان اختلافات اور کشیدگی پہلے بھی موجود تھی، خاص طور پر گرو ارجن دیو کی شہادت (1606ء) کے بعد، لیکن گرو تیغ بہادر کی موت نے ان اختلافات کو کھلی دشمنی میں تبدیل کر دیا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب سکھوں نے ہتھیار اٹھانے کا فیصلہ کیا، اور بالآخر یہی عسکری قوت مغل سلطنت کے زوال کا پیش خیمہ بنی۔ یہی مزاحمتی رویہ بعد

میں سکھ سلطنت کے قیام کا باعث بنا، اور تقسیمِ پنجاب کے وقت بھی اس کا نمایاں کردار رہا۔

گرو تیغ بہادر: ایک شاعر، مفکر اور 'ہند دی چادر'

سکھ برادری کے لیے گرو تیغ بہادر نہ صرف ایک روحانی پیشوا تھے بلکہ ایک عظیم شاعر اور مفکر بھی سمجھے جاتے ہیں۔ انھوں نے 57 سالوک اور پندرہ راگوں میں گربانی لکھی، جسے بعد میں دسویں گرو، گرو گوبند سنگھ نے گرو گرنتھ صاحب میں شامل کیا۔ انھیں 'ہند دی چادر' بھی کہا جاتا ہے، کیونکہ انھوں نے دھرم، سچائی اور انسانیت کے اصولوں پر عمل پیرا ہوتے ہوئے اپنی جان قربان کی۔

گرو تیغ بہادر کی تبلیغی سرگرمیوں کا ایک اہم پہلو یہ بھی تھا کہ شمالی ہندوستان میں بڑی تعداد میں کسان اور عام لوگ سکھ مت قبول کر رہے تھے۔ تاریخی حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ تر وہ لوگ سکھ مت اپنا رہے تھے جو پہلے ہندو مذہب سے تعلق رکھتے تھے، جبکہ مسلمانوں میں سکھ مت اختیار کرنے کا رجحان نسبتاً کم تھا۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر، ہندو مذہبی رہنماؤں نے ممکنہ طور پر گرو تیغ بہادر کے اثر ورسوخ کو ایک خطرہ سمجھا۔ یہی خدشہ مغل دربار تک پہنچا، اور یہ بھی ممکن ہے کہ بعض ہندو حلقوں نے گرو تیغ بہادر کے خلاف سازش کی ہو۔ ایک ایسا ہی واقعہ 1606ء میں گرو ارجن دیو جی کے ساتھ بھی پیش آیا تھا، جب مغل حکام نے ان پر سختی کی۔

یہ ایک امرِ واقعہ ہے کہ گرو صاحب کی موت نے ہندوستان کی تاریخ، خاص طور پر شمالی ہندوستان، پر گہرا اثر ڈالا اور عالمگیر کے کردار کو بے نقاب کیا، ظلم اور ناانصافی کو اجاگر کیا۔ یاد رہے کہ یہ واقعہ 1675ء میں پیش آیا، جبکہ عالمگیر کی وفات 1707ء میں ہوئی۔ اس واقعے کے بعد سکھوں میں اورنگزیب اور اس کی حکومت سے نفرت پیدا ہوئی اور سکھ قوم ایک عسکری قوت بن کر ابھری۔

انھوں نے طے کیا کہ وہ اپنے مذہب (دھرم) کی حفاظت صرف ہتھیاروں کے ذریعے ہی کر سکتے ہیں۔ اس سے پہلے بھی سکھوں اور مغلوں کے درمیان ایک نفرت کی دیوار موجود تھی (گرو ارجن دیو کی شہادت کے سبب)، لیکن اب یہ دیوار دشمنی میں بدل گئی۔ سکھوں نے اس کے بعد تلوار اٹھانے کا فیصلہ کیا اور پھر یہی تلوار مغل سلطنت کے خاتمے کا باعث بنی۔ اسی تلوار نے تقسیمِ پنجاب کے وقت بھی اپنا کردار ادا کیا۔

جو میں نے جانا ہے، اس کے مطابق کسی بھی فرد کو زبردستی اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ جس نے بھی ایسا کیا، اس نے اسلام کے احکامات کی سخت خلاف ورزی کی۔ اگر یہ واقعہ محض اقتدار کی حفاظت کی خاطر کیا گیا تھا، تب بھی یہ قابلِ مذمت ہے۔ لیکن اگر یہ عمل کسی مسلمان حکمران نے کیا، تو یہ اس کا ذاتی فعل ہو سکتا ہے، اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ اس واقعے کی بنیاد پر اسلام کے خلاف بات کرنا ایک درست طرزِ عمل نہیں ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ سکھ، جو ایک خدا پر ایمان رکھنے والے، امن و امان کے حامی اور سچائی کے علمبردار تھے، ایک عسکری قوت میں تبدیل ہو گئے۔ اس سے قبل شمالی ہندوستان میں کوئی بھی مقامی طاقت مغلوں کے سامنے کھڑی نہ ہوئی تھی، لیکن اب پہلی بار مغل سلطنت کو ایک مقامی طاقت سے براہِ راست ٹکر لینا پڑی۔ یہ جنگ اپنے مذہب کی حفاظت کے لیے تھی، نہ کہ اقتدار کی جنگ۔ اس جنگ میں سکھوں کی شرکت ایک مذہبی فریضہ سمجھ کر تھی، اور ہر سکھ اس میں اپنا کردار ادا کرنا چاہتا تھا۔ دوسری طرف مغل حکام نے اس جنگ کو اقتدار کی بجائے مذہب کی جنگ کے طور پر پیش کیا۔

اگر میں یہ کہوں کہ یہ واقعہ، اور اس جیسے کئی اور واقعات، تقسیمِ ہند کی بنیاد بنے، تو غلط نہ ہوگا۔ مسلمان ہندوستان میں ہی رہے، مگر الگ سے۔ وہ کبھی بھی مقامی اہلِ ہند کی طرح نہ رہے۔ ان کا لباس، خوراک، رہن سہن، طرزِ زندگی، زبان، سوچ و فکر، طرزِ تعمیر، اور رسم و رواج، سب مقامی لوگوں سے مختلف رہے۔ اس کے باوجود، 712ء سے لے کر 1857ء تک (یعنی 1147 سال) ہندوستان کے بیشتر علاقوں میں مسلمان اور غیر مسلم ایک ہی ریاست کے شہری رہے۔ آج بھی مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد بھارت میں رہ رہی ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اتنے بڑے تمدنی فرق کے باوجود بھی ایک ریاست کے شہری بن کر رہا جا سکتا ہے۔

یہ محض میرا تجزیاتی نقطۂ نظر ہے، جو کسی حتمی نتیجے کا درجہ نہیں رکھتا۔ ممکن ہے اس میں علمی اختلاف کی گنجائش ہو، تاہم میں نے اپنی فہم و تحقیق کی روشنی میں اپنا مؤقف پیش کر دیا ہے۔

❀ ❀ ❀

گرو گو بند سنگھ کی سوانح حیات اور تشکیلِ خالصہ
ایک تجزیاتی مطالعہ

انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا کے مطابق، گرو گو بند سنگھ (1666-1708) سکھوں کے دسویں اور آخری گرو تھے۔ اُن کی شہرت خاص طور پر خالصہ کی بنیاد رکھنے کے حوالے سے ہے، جو ایک ایسا مذہبی و سماجی گروہ تھا جو سکھ مت کے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے ذات پات سے آزاد تھا۔ خالصہ کی تخلیق نے سکھوں کو ایک نئی مذہبی، عسکری اور اجتماعی شناخت عطا کی اور سکھ تعلیمات کو مزید مستحکم کیا۔

گرو گو بند سنگھ، جن کا اصل نام گو بند رائے تھا، سکھوں کے نویں گرو گرو تیغ بہادر کے فرزند تھے۔ اُنھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم پنجابی، برج، سنسکرت اور فارسی زبانوں میں حاصل کی، اور ساتھ ہی تلوار، نیزہ، تیر و کمان، مسکٹ اور میچ لاک جیسے ہتھیاروں کے استعمال میں بھی مہارت حاصل کی۔ ان کی تعلیم صرف روحانی کتب تک محدود نہ تھی بلکہ وہ عسکری تربیت میں بھی ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ گرو تیغ بہادر کی موت کے بعد، گرو گو بند سنگھ کو سکھوں کا دسواں گرو مقرر کیا گیا۔

اپنی قیادت کے دوران، گرو گو بند سنگھ نے سکھوں کے لیے ایک مربوط مذہبی اور عسکری تنظیم قائم کی۔ انھوں نے سکھ قوانین کو مرتب کیا، گرو گرنتھ صاحب کو مکمل کیا اور سکھ برادری کو ایک متحد اور منظم جماعت میں تبدیل کیا۔ ان کی تعلیمات آج بھی سکھ قوم کے لیے رہنمائی کا ذریعہ ہیں۔

انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا میں یہ بھی درج ہے کہ گرو گو بند سنگھ نے 1699ء میں خالصہ کی بنیاد رکھی۔ خالصہ ایک ایسی جماعت تھی جو ذات پات کی تقسیم سے پاک تھی اور سکھ مذہب کے اصولوں پر کاربند رہتے ہوئے بہادری، استقامت اور اخلاقی دیانت کی عملی تصویر

تھی۔ خالصہ کا قیام بیساکھی کے روز عمل میں آیا، جب سکھوں کی ایک بڑی تعداد آنند پور میں جمع ہوئی۔ اس دن گرو گوبند سنگھ نے ایک اہم مذہبی رسم کا آغاز کیا، جو سکھ روحانیت اور سماجی تنظیم کا ایک نیا سنگ میل ثابت ہوا۔

اسی موقع پر پانچ افراد، جو زعفرانی لباس میں ملبوس تھے، گرو کی موجودگی میں خیمے سے باہر آئے۔ ان سب نے پگڑیاں باندھی ہوئی تھیں اور تلواریں سجائی ہوئی تھیں، جو خالصہ کی نئی شناخت کی علامت بن گئیں۔ انھیں ''پنج پیارے'' کا خطاب دیا گیا اور وہ خالصہ کے ابتدائی ارکان قرار پائے۔ بعد ازاں، گرو گوبند سنگھ نے اعلان کیا کہ تمام مرد سکھوں کو ''سنگھ'' (شیر) اور تمام خواتین کو ''کور'' (شہزادی) کا لقب دیا جائے گا۔ اس اقدام کا مقصد سکھ برادری میں مساوات اور ذات پات کی نفی کرنا تھا۔ انھوں نے سکھوں کو خالصہ کی پانچ ''ک'' (کیش، کرپان، کڑا، کچھا، کنگھا) اپنانے کی ہدایت بھی کی، جو آج بھی سکھ شناخت کا حصہ ہیں۔

اسی دوران، شیوالک پہاڑیوں کے راجپوت حکمرانوں نے سکھوں کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کو خطرہ محسوس کرتے ہوئے گرو گوبند سنگھ کو علاقے سے بے دخل کرنے کی کوشش کی۔ بلاس پور کے راجہ کی قیادت میں ایک اتحاد قائم ہوا، مگر یہ کوشش ناکام رہی۔ بالآخر انھوں نے مغل بادشاہ اورنگزیب سے مدد مانگی، جس کے نتیجے میں لاہور کے گورنر اور سرہند کے فوجدار کو اضافی افواج فراہم کرنے کا حکم جاری کیا گیا۔ یہ مشترکہ فوج مئی 1705ء میں آنند پور کا محاصرہ کرنے میں کامیاب ہوئی۔ گرو گوبند سنگھ اور اُن کے ساتھیوں نے اس حملے کا بھرپور مقابلہ کیا، کیونکہ سکھ یہ معرکہ اپنے مذہب اور سیاسی آزادی کے تحفظ کے لیے لڑ رہے تھے۔

دسمبر 1705ء میں، دشمن کی جانب سے قرآن پر حلف اٹھا کر امن کی ضمانت دینے کے بعد گرو گوبند سنگھ اور ان کے پیروکاروں نے آنند پور کو خالی کرنے کا فیصلہ کیا۔ مگر جونہی سکھوں نے روانگی اختیار کی، مغل افواج اور پہاڑی سرداروں نے وعدہ خلافی کرتے ہوئے ان پر حملہ کر دیا۔ اس حملے میں کئی سکھ شہید ہوئے اور گرو گوبند سنگھ کا قیمتی سامان، بشمول اہم مخطوطات، ضائع ہو گیا۔

یہ جنگ سکھوں اور مغلوں کے مابین ایک اہم معرکہ تھی، اور خالصہ تنظیم کی صورت میں

سکھوں کی مغل سلطنت کے خلاف پہلی منظم عسکری مزاحمت تھی۔ اگرچہ اس سے پہلے مغلوں نے گرو ارجن دیو اور گرو تیغ بہادر کو قتل کیا تھا، لیکن یہ پہلا موقع تھا جب سکھوں نے اجتماعی طور پر منظم ہو کر مغلوں کا سامنا کیا۔ یہی واقعہ سکھ تاریخ کا ایک فیصلہ کن سنگ میل بن گیا۔

گرو گوبند سنگھ: سید محمد لطیف کے تناظر میں ایک تجزیاتی مطالعہ

انیسویں صدی کے ممتاز پنجابی مورخ سید محمد لطیف نے اپنی معروف تصنیف تاریخِ پنجاب میں گرو گوبند سنگھ کی شخصیت، خدمات اور افکار پر نہایت تفصیل اور تحسین آمیز انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ وہ اس امر کی صراحت کرتے ہیں کہ جس قدر مدح سرائی انھوں نے گرو گوبند سنگھ کے لیے کی ہے، اس درجے کی تحسین شاذ و نادر ہی کسی اور گرو کے لیے کی گئی ہے۔

سید محمد لطیف گرو گوبند سنگھ کو ایک انقلابی اور اصلاح پسند رہنما کے طور پر پیش کرتے ہیں، جن کی شخصیت پر ان کے والد گرو تیغ بہادر کی موت نے گہرا اثر ڈالا۔ گرو تیغ بہادر کی المناک موت نے گرو گوبند سنگھ کے دل میں ظلم و جبر کے خلاف مزاحمت کا شدید جذبہ پیدا کیا، جس کے نتیجے میں 1699ء میں خالصہ کے قیام کی بنیاد رکھی گئی۔ گرو گوبند سنگھ نے مساوات، شجاعت اور روحانی نظم و ضبط کو یکجا کرتے ہوئے ایک ترقی پسند، منظم اور نظریاتی سکھ قوم کے قیام کا تصور پیش کیا۔ انھوں نے ''پانچ ککار'' (Five Ks) کو سکھ شناخت کا بنیادی ستون قرار دے کر ایک منفرد اور مربوط اجتماعی شعور کو فروغ دیا۔

سید محمد لطیف نے گرو گوبند سنگھ کی عسکری حکمت عملیوں پر بھی سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ ان کے مطابق گرو نے مغل سلطنت اور مقامی طاقتوں کے خلاف دفاعی اور جارحانہ اقدامات کے ذریعے ایک فعال سیاسی و عسکری کردار ادا کیا۔ وہ گرو گوبند سنگھ کو ایک ایسے رہنما کے طور پر پیش کرتے ہیں جو بیک وقت روحانی پیشوا اور عسکری قائد کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس دوہری قیادت نے اُس وقت کے پنجاب کے سماجی و سیاسی منظرنامے کو نئی جہت دی۔ ان کا بیان کردہ تجزیہ نہ صرف گرو گوبند سنگھ کی تاریخی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے بلکہ سکھ مت میں ان کی دائمی میراث پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔

پنجاب میں گرو گوبند سنگھ کے اثرات: ایک سماجی و فکری تجزیہ

گرو گوبند سنگھ سکھ مذہب کے دسویں اور آخری گرو تھے۔ 1699ء میں خالصہ کے قیام کے ذریعے انھوں نے نہ صرف سکھ مذہب کی تنظیم نو کی بلکہ ہندوستانی معاشرے میں ایک گہرا سماجی و فکری اثر بھی مرتب کیا۔ وہ ایک ایسی روحانی و عسکری برادری کے بانی کے طور پر سامنے آتے ہیں جو ہمہ وقت عدل، مساوات اور آزادی کے تحفظ کے لیے تیار رہتی تھی۔

انھوں نے ذات پات پر مبنی نظام کی شدید مخالفت کرتے ہوئے عالمگیر مساوات، سماجی انصاف اور انسانی ہمدردی جیسے اعلیٰ اقدار کو فروغ دیا۔ ان کی تعلیمات نے ظلم کے خلاف شعوری بیداری اور عملی مزاحمت کی تحریک دی، جسے اُن کی سب سے بڑی علمی اور اخلاقی خدمت کہا جا سکتا ہے۔

علاوہ ازیں، گرو گوبند سنگھ ایک قادرالکلام شاعر اور فاضل عالم تھے۔ انھوں نے فارسی، سنسکرت، ہندی اور پنجابی سمیت مختلف زبانوں میں علمی و روحانی مضامین پر مشتمل تحریریں رقم کیں۔ ان کی تصانیف سکھ ادب میں ایک نمایاں مقام رکھتی ہیں اور علم، ثقافت اور اخلاقی نظم وضبط کی اہمیت کو اجاگر کرتی ہیں۔ یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ انھوں نے ظلم و ستم کے باوجود اخلاقی استقامت کو ترک نہ کیا۔ مذہبی آزادی کے تحفظ کی خاطر انھوں نے بیس سے زائد جنگوں کی قیادت کی، جن میں ان کا مقصد محض عسکری کامیابی نہیں بلکہ اصولی موقف اور روحانی وقار کا تحفظ بھی تھا۔ ان کا وژن روحانی طاقت، قربانی اور اخلاقی سالمیت کو سکھ فلسفے کا لازمی جزو قرار دیتا ہے۔

گرو گوبند سنگھ کی وراثت آج بھی دنیا بھر میں افراد کو ناانصافی، جبر اور استبداد کے خلاف کھڑے ہونے کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔ ان کی حیات، علم، روحانیت اور ہمت کا ایسا مینار ہے جو زمان و مکان کی قید سے ماورا ہو کر آج بھی انسانیت کے لیے مشعلِ راہ ہے۔

میرے فکری نقطۂ نظر سے گرو گوبند سنگھ کی سب سے نمایاں اور انقلابی خدمت یہ ہے کہ انھوں نے ذات پات، خاندانی تفاخر، برادری کی تفریق اور نسبی برتری جیسے سماجی تعصّبات کا نہ صرف انکار کیا بلکہ ان کی واضح طور پر نفی کی۔ انھوں نے اعلان کیا کہ ہر فرد ''سنگھ'' ہے اور کسی کو محض

راجپوت، جاٹ، یا کسی اور نسلی یا قبائلی شناخت کی بنیاد پر برتر نہیں سمجھا جا سکتا۔ ان کے نزدیک تمام انسان برابر ہیں، چاہے وہ موچی ہو یا نائی، جاٹ ہو یا راجپوت، ڈوگر ہو یا گجر سب ایک ہی خالق کے بندے ہیں اور مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔

یہ پیغام نہ صرف سکھ مذہبی و سماجی فلسفے کی اساس قرار پایا بلکہ انسانی مساوات کے اصول کو ایک عملی شکل بھی دی۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ یہی پیغام ہمیں اسلام کی تعلیمات میں بھی ملتا ہے، بالخصوص پیغمبرِ اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آخری خطبے میں، جہاں انھوں نے واضح الفاظ میں فرمایا کہ کسی عربی کو عجمی پر، اور کسی گورے کو کالے پر کوئی فوقیت نہیں، مگر تقویٰ کے معیار کے سوا۔ یوں گرو گوبند سنگھ کا تصورِ مساوات عالمگیر اقدار سے ہم آہنگ نظر آتا ہے، جو مختلف مذاہب میں یکساں اہمیت کا حامل ہے۔

پچھلے صفحات میں بیان کردہ تمام نکات اپنی جگہ پر درست اور اہم ہیں، تاہم اس امر پر بھی توجہ دینا ضروری ہے کہ جب سکھ برادری نے گرو گوبند سنگھ کی تعلیمات کی روشنی میں سماجی اور عسکری ترقی کی، تو وہ ایک وسیع اور منظم ریاست کے قیام میں کامیاب ہوئے۔ اس ریاست کی حدود ستلج کے مغرب سے لے کر جمرود تک، اور کشمیر سے لے کر بنوں و ملتان تک پھیلی ہوئی تھیں۔

یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت میں مذہبی لحاظ سے آبادی کی ساخت کچھ یوں تھی: مسلمان تقریباً 70 فیصد، ہندو تقریباً 20 فیصد، اور سکھ محض 10 فیصد تھے۔ اس طرح ایک اقلیتی گروہ نے اکثریتی آبادی پر کامیابی سے حکمرانی کی۔ میری رائے میں اس غیر معمولی کامیابی کی بنیاد گرو گوبند سنگھ نے اپنے نظریات، اصلاحات اور روحانی قیادت کے ذریعے رکھی تھی۔ اگرچہ یہ تجزیہ میرا ذاتی استنباط ہے اور اسے حتمی یا قطعی رائے نہیں کہا جا سکتا، تاہم میرے فہم کے مطابق گرو گوبند سنگھ کی تعلیمات ہی اس تاریخی پیش رفت کی بنیاد قرار دی جا سکتی ہیں۔

سکھ، مغل، ابدالی، مراٹھے اور انگریز
ایک تاریخی تصادم اور پنجاب کا ایک پُرآشوب دور

میرے مطالعے کے مطابق، پنجاب کی تاریخ کا سب سے پُرآشوب اور پُرآزمائش دور وہ ہے جو مغل شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر کی وفات (1707ء) سے لے کر سکھوں اور انگریزوں کے درمیان آخری جنگ (1849ء) تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ ڈیڑھ صدی کا عرصہ سیاسی انتشار، مذہبی کشمکش اور عسکری تصادم سے عبارت ہے۔ اگرچہ حالات کی خرابی کی بنیاد سترہویں صدی کے اواخر میں پڑ چکی تھی، تاہم اٹھارہویں صدی کے آغاز سے ایک واضح اور منظم بربریت نے جنم لیا، جو انیسویں صدی کے وسط تک جاری رہی۔

اس زمانے میں نادر شاہ کا تباہ کن حملہ، مغلوں اور سکھوں کے درمیان مسلسل جنگیں، احمد شاہ ابدالی کی متعدد یورشیں، اور برصغیر میں انگریزوں کی بڑھتی ہوئی مداخلت نے پنجاب کو ایک مستقل میدانِ جنگ بنا دیا۔ ان واقعات کے پیچھے صرف سیاسی تسلط کی خواہش کارفرما نہ تھی بلکہ تہذیبی، مذہبی اور قومی تشخص کے دفاع کی جدوجہد بھی شامل تھی۔

سکھ اور مغل تعلقات کی کشیدگی کا آغاز غالباً شہنشاہ اورنگزیب کی مذہبی شدت پسندی اور زبردستی تبدیلیٔ مذہب کی پالیسی سے ہوا۔ گرو تیغ بہادر کی شہادت (1675ء) نے ان تعلقات میں زہر گھول دیا۔ اس واقعے نے نہ صرف سکھ برادری کو ہلا کر رکھ دیا بلکہ گرو گوبند سنگھ کے نظریاتی و تنظیمی سفر کو بھی نئی سمت دی۔ 1699ء میں خالصہ کے قیام نے سکھ برادری کو ایک مسلح، منظم اور خودمختار مذہبی و سیاسی قوت میں تبدیل کر دیا، جس نے آئندہ دہائیوں میں مغل اور افغان سلطنتوں کے لیے ایک مضبوط چیلنج تشکیل دیا۔

احمد شاہ ابدالی نے 1747ء سے 1769ء تک ہندوستان پر کئی حملے کیے جن کا مقصد نہ

صرف دولت لوٹنا تھا بلکہ دہلی اور اس کے اطراف پر سیاسی اثر و رسوخ قائم رکھنا بھی تھا۔ سکھوں نے ان حملوں کے دوران زبردست مزاحمت کی، اگرچہ انھیں بدترین مظالم کا سامنا کرنا پڑا جیسے 1752ء کا معرکہ لہراں، 1761ء کی پٹیالہ لڑائی، اور 1762ء کا ہولناک واقعہ "وڈا گھلوگھارا"[1] جس میں ہزاروں سکھوں کو قتل کر دیا گیا۔ تاہم اس کے باوجود سکھوں نے اپنی مزاحمتی تحریک جاری رکھی۔ ابدالی کی موت کے بعد ان کی جانشین قوتیں سکھوں کا سامنا نہ کر سکیں، اور اس خلا سے فائدہ اٹھا کر سکھوں نے پنجاب میں اپنی سیاسی پوزیشن مستحکم کرنا شروع کی، جو رنجیت سنگھ کی زیرِ قیادت ایک باقاعدہ ریاست کے قیام پر منتج ہوئی۔[1]

یہ عسکری، سیاسی اور تہذیبی تصادم صرف میدانِ جنگ تک محدود نہ رہا بلکہ اس نے پنجاب کے اجتماعی شعور، مذہبی ہم آہنگی، اور سماجی ساخت کو بھی متاثر کیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس دور میں سکھوں کو شدید مظالم کا سامنا کرنا پڑا، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جب سکھ طاقت میں آئے تو بعض مواقع پر عام مسلمانوں کو بھی ان کی طرف سے ناانصافیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یہی پہلو اس دور کی تاریخ کو پیچیدہ، کثیر جہتی اور اکثر متنازع بنا دیتا ہے۔

ان واقعات نے صرف ماضی ہی کو متاثر نہیں کیا بلکہ مستقبل کی صورت گری میں بھی کردار ادا کیا۔ سکھ اور مسلمان تاریخی ہیروز اور بیانیوں میں بٹ گئے۔ ایک فریق کے نزدیک رنجیت سنگھ ہیرو اور روشن خیال حکمران ہے، تو دوسرے فریق کے نزدیک وہ ایک متعصب اور اسلام دشمن حکمران کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ کوئی احمد شاہ ابدالی کو "رحمت اللہ علیہ" کہتا ہے، تو دوسرا اُسے ظلم کی علامت مانتا ہے۔

---

[1] سکھوں کا ایک بڑا قتل عام جسے پنجابی میں وڈا گھلوگھارا اور انگریزی میں the great massacre یا holocaust کہتے ہیں۔ وہ عظیم قتل عام ہے جو افغانی درانی فوجوں نے سکھوں کا کیا۔ اور یہ 1746 کے چھوٹے قتل عام کے علاوہ ہے جو دہائیوں تک جاری رہا۔ سکھوں کو ختم کرنے کے لیے افغان حملہ آوروں کا ایک خونی منصوبہ تھا۔ گرودوارہ وڈا گھلوگھارا صاحب، کتبا-باہمنیاں گاؤں میں واقع ہے۔ وڈا گھلوگھارا فروری 1762 کو کپ سر ہیڑے گاؤں کی دھرتی سے شروع ہوکر دھلیر-جھن سے ہوتا ہوا آگے گاؤں کتبا-باہمنیاں کے پاس جا کر ختم ہوا۔ گھلوگھارے کا مطلب سب کچھ برباد ہوجانا ہے۔ لفظ گھلو گھارے کا تعلق افغانی بولی سے ہے۔

یہ ذہنی اور تاریخی تقسیم وہ بنیادیں فراہم کرتی ہے جن پر تقسیمِ ہند کے وقت پنجاب کی عملی تقسیم بھی واقع ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ دونوں اقوام کے درمیان موجود گہرے تاریخی شکوے اور علیحدہ ہیروز کا تصور اتنا مضبوط ہو چکا تھا کہ متحدہ پنجاب میں ان کا اکٹھے رہنا ممکن نہ رہا۔ ایک وقت میں مشرقی پنجاب میں بیس فیصد مسلمان آباد تھے، آج ان کی تعداد برائے نام ہے۔ اسی طرح مغربی پنجاب میں کبھی سکھ پندرہ فیصد تک موجود تھے، آج وہاں اُن کا وجود تقریباً نا پید ہے۔

یہ تمام عوامل ایک گہرے اور پیچیدہ تاریخی تناظر کی عکاسی کرتے ہیں، جسے یک رُخا انداز میں نہیں دیکھا جا سکتا۔ اسی سلسلے کی ایک مختصر جھلک پیش کی گئی ہے۔

سکھ، مغل اور ابدالی تصادم: سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی اثرات

سکھوں، مغلوں اور احمد شاہ ابدالی کے درمیان جاری رہنے والے تصادمات کا سب سے نمایاں اثر سیاسی سطح پر محسوس کیا گیا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مغل سلطنت کے بتدریج زوال کے نتیجے میں شمالی ہندوستان، خصوصاً پنجاب میں، طاقت کا ایک نمایاں خلا پیدا ہوا۔ اس سیاسی خلا کو پُر کرنے کے لیے مختلف قوتیں متحرک ہوئیں، مگر اس دور میں سکھ برادری نے نہ صرف عسکری بلکہ تنظیمی سطح پر بھی خود کو منظم کر کے اس خلا کو مؤثر انداز میں پُر کیا۔

1699ء میں خالصہ کی تشکیل سکھ تاریخ کا ایک سنگ میل ثابت ہوئی، جس نے سکھ برادری کو محض ایک مذہبی جماعت سے ایک منظم عسکری اور سیاسی تحریک میں تبدیل کر دیا۔ اس تحریک کے نتیجے میں متعدد چھوٹی چھوٹی سکھ ریاستیں وجود میں آئیں، جو بالآخر رنجیت سنگھ کی قیادت میں ایک متحد اور مضبوط سکھ سلطنت کی شکل اختیار کر گئیں۔

ان سیاسی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ معاشرتی سطح پر بھی گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ متواتر جنگوں اور سیاسی بے یقینی کے باعث پنجاب کا معاشرتی ڈھانچہ شدید متاثر ہوا۔ زراعت، صنعت وحرفت، اور تجارتی سرگرمیاں زوال کا شکار ہو گئیں۔ مختلف مذاہب اور ذاتوں پر مشتمل برادریوں کے درمیان باہمی اعتماد کا فقدان پیدا ہوا، جس نے معاشرتی ہم آہنگی کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا۔ وہ گروہ جو کبھی ثقافتی اشتراک اور مذہبی رواداری کا نمونہ تھے، باہمی نفرت اور بدلے کی

سیاست کا شکار ہو گئے۔

تصادم کا ایک اور اہم پہلو اس کی تہذیبی و مذہبی نوعیت تھی۔ مغل حکمران اپنے آپ کو اسلام کا محافظ تصور کرتے تھے، جبکہ سکھ تحریک نے مذہبی آزادی، مساوات اور ایک الگ قومی تشخص پر زور دیا۔ یہ محض سیاسی غلبے کی جنگ نہ رہی، بلکہ رفتہ رفتہ مذہب اور تہذیب کے تحفظ کی جدوجہد بن گئی۔ احمد شاہ ابدالی کے حملے بھی جزوی طور پر مذہبی محرکات کے تحت تھے، جن کے دوران سکھ برادری کو بے پناہ جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑا۔ ان حملوں کو سکھوں نے اپنی مذہبی شناخت کے خلاف ایک یلغار تصور کیا، جس سے ان کے اندر اجتماعی مزاحمت اور قربانی کا جذبہ مزید مستحکم ہوا۔

مسلسل جنگ و جدل، بدامنی، لوٹ مار اور قتل و غارت نے عوامی نفسیات پر بھی نہایت منفی اثرات مرتب کیے۔ قانون و انصاف کا فقدان، معاشرتی افراتفری اور عدم تحفظ نے ہر قوم اور مذہب کے افراد کو اپنے تاریخی بیانیے میں خود کو مظلوم اور مخالف فریق کو ظالم کے طور پر پیش کرنے پر آمادہ کیا۔ یہی ذہنی و تاریخی تقسیم بعد ازاں تقسیمِ ہند (1947ء) کے دوران خونریز فسادات اور اجتماعی ہجرت کی صورت میں اپنے منطقی انجام کو پہنچی۔ سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان فاصلہ اس قدر بڑھ چکا تھا کہ باہمی بقائے باہمی کا تصور ہی معدوم ہو گیا۔

ان تمام عوامل نے مل کر ایک ایسے پنجاب کو جنم دیا، جو نہ صرف جغرافیائی طور پر تقسیم ہو چکا تھا بلکہ تہذیبی، مذہبی، ثقافتی اور ذہنی سطح پر بھی منقسم ہو چکا تھا۔ جہاں ایک جانب سکھوں کے لیے رنجیت سنگھ قومی ہیرو کی حیثیت رکھتے تھے، وہیں مسلمانوں کے لیے احمد شاہ ابدالی ایک مذہبی محافظ کے طور پر یاد رکھا گیا۔ یہی دوہرا تاریخی بیانیہ آج تک اجتماعی شعور کو تقسیم کیے ہوئے ہے۔

اگرچہ مختلف افراد اس حقیقت کو تسلیم کریں یا نہ کریں، تاہم یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ آج بھی کئی پنجابی مسلمان خاندانوں میں لفظ ''سِکھ'' مثبت مفہوم میں استعمال نہیں ہوتا۔ بعینہٖ، بہت سے سکھ خاندانوں میں ''مسلمان'' کے بجائے توہین آمیز لفظ ''مسلہ'' کا استعمال عام ہے۔ اس باہمی تعصب اور نفرت کی جڑیں براہ راست 1947ء کے المناک فسادات سے جا ملتی ہیں، جن میں دونوں جانب کے گروہوں نے ناقابلِ بیان مظالم ڈھائے۔

ریاست پٹیالہ، جو اُس وقت ایک اہم سکھ ریاست تھی، فسادات کے دوران کئی منظم سکھ جتھوں کا مرکز بنی۔ قتل و غارت، لوٹ مار اور اغوا کی زیادہ تر کارروائیاں انھی جتھوں نے انجام دیں۔ مصنف کی ذاتی گواہی کے مطابق اُن کی سوتیلی والدہ کو بھی اسی افراتفری میں اغوا کر لیا گیا تھا۔ اسی طرح مصنف کے خاندان کے بیس سے زائد افراد قتل ہوئے اور دس سے زیادہ خواتین اغوا کی گئیں۔ یہی ذاتی سانحات وہ اسباب بنے جن کی بنا پر بزرگوں کی گفتگو میں سکھوں کے لیے مثبت جذبات ناپید تھے۔

میرے نزدیک جن مظالم کا ارتکاب سکھوں نے کیا، ان کی اُن کے مذہب، سکھ دھرم، میں کوئی گنجائش موجود نہیں۔ سکھ مت امن، خدمت اور انسانیت کا درس دیتا ہے، اور مذکورہ اقدامات اس کے بنیادی اصولوں کے منافی تھے۔ اسی طرح، مغربی پنجاب، سندھ، خیبر پختونخوا اور بلوچستان میں ہندو اور سکھ اقلیتوں کے خلاف مسلمانوں کی جانب سے کیے گئے مظالم کی بھی اسلام میں ہرگز اجازت نہیں ہے۔ اسلام عدل، رواداری اور اقلیتوں کے تحفظ کا علمبردار مذہب ہے، اور ان فسادات میں کی گئی کارروائیاں اسلامی اصولوں سے متصادم تھیں۔

یہ سوال بھی توجہ طلب ہے کہ اُس وقت کے بااختیار ادارے اور قیادت کہاں تھی؟ مہاراجہ پٹیالہ، برطانوی انتظامیہ، برٹش انڈین آرمی، اور سیاسی قائدین اگر چاہتے تو یہ خونریزی روکی جا سکتی تھی۔ لیکن انھوں نے مداخلت نہ کی، یا مصلحتاً چشم پوشی اختیار کی۔ اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ اس انسانی المیے کے اصل ذمہ دار وہی مقتدر حلقے تھے، تو یہ بات بے جا نہ ہوگی۔

ان فسادات کو میرے بزرگ ''اجاڑا'' کہا کرتے تھے، ایک ایسا عمل جس میں زندگی، رشتے، اور انسانیت سب کچھ ویران ہو جائے۔ یہی کیفیت شاعر سہیل سعدی کے اس شعر میں مؤثر انداز میں بیان ہوئی ہے:

شوق تو نہیں تھا اجڑنے کا ہمیں
سوچ سمجھ کر اجاڑا گیا ہمیں

❁❁❁

سکھ۔مغل تصادم کی تاریخ

افغان حکمران احمد شاہ ابدالی کی شمولیت کے تناظر میں

سکھوں اور مغلوں کے درمیان باقاعدہ جنگ کا آغاز اس وقت ہوا جب گرو گوبند سنگھ، جو اس وقت آنند پور میں قیام پذیر تھے اور جنھوں نے خالصہ کی بنیاد رکھی تھی، مغل ریاست کے لیے ایک خطرہ بن کر ابھرے۔ (اگرچہ اس سے قبل گرو ارجن دیو جی کے عہد میں ایک جھڑپ کا ذکر ملتا ہے، لیکن پہلی بار مغل افواج نے سکھوں کے ایک باقاعدہ مرکز پر حملہ کیا۔) اس کے بعد ایک طویل عرصے تک سکھوں، مغلوں اور بعدازاں افغانوں کے درمیان کئی معرکے برپا ہوئے۔ ایک طرف مغل اور افغان تھے، تو دوسری طرف خالصہ۔ ان جھڑپوں اور جنگوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ ان سب کا احاطہ ممکن نہیں۔ چنانچہ میں یہاں صرف چند اہم جنگوں کا ذکر کروں گا۔ میری تحقیق کا اصل محور ان جنگوں کی وجوہات اور ان کے پنجاب پر سماجی اثرات کا مطالعہ ہے۔

اس مقالے کی تیاری میں درج ذیل کتب اور مضامین سے استفادہ کیا گیا ہے:

The Sikh-Mughal Wars

https//:dvnetwork.org/page/the-sikh-mughal-wars

Warrior Saints: Four Centuries of Sikh Military History

(Volume I) از: اماندیپ سنگھ مدرا، پرمجیت سنگھ۔

تاریخ پنجاب از سید محمد لطیف

مَیں نے خاص طور پر کوشش کی کہ کسی مسلم مؤرخ کی ایسی کتاب حاصل ہو جو مکمل طور پر اس موضوع پر ہو، مگر ایسی کوئی تصنیف دستیاب نہ ہو سکی۔ البتہ مختلف مضامین سے ضرور مدد ملی۔ جو کچھ

میں جان سکا، وہی پیشِ خدمت ہے۔

آنند پور اور چمکور کی جنگیں، اور گرو گوبند سنگھ کی وفات: سکھ تاریخ میں یہ واقعہ نہایت اہمیت کا حامل ہے اور اسے متعدد تاریخی کتب میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ میری رائے میں یہ معرکہ بعد کی کئی جنگوں کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ ذیل میں اس کا مختصر مگر جامع تذکرہ پیش ہے۔

آنند پور کی جنگ 1704ء میں اُس وقت برپا ہوئی جب گرو گوبند سنگھ کی قیادت میں سکھوں کو مغل اور پہاڑی ریاستوں کی متحدہ فوج کا سامنا کرنا پڑا۔ اس جنگ کی اصل وجہ خالصہ کی تشکیل اور سکھوں کی بڑھتی ہوئی عسکری طاقت تھی، جسے مغل حکومت نے اپنے اقتدار کے لیے خطرہ محسوس کیا۔ اورنگزیب کے عہد میں سکھوں کو ایک بغاوتی قوت کے طور پر دیکھا جانے لگا۔ آنند پور، جو اُس وقت سکھ تحریک کا مرکز تھا، مغل حکومت اور مقامی راجوں کے لیے سیاسی و عسکری چیلنج بن چکا تھا۔

مغلوں اور پہاڑی راجوں نے مل کر آنند پور صاحب کا طویل محاصرہ کیا جو کئی مہینے جاری رہا۔ خوراک اور پانی کی قلت کے بعد مذاکرات ہوئے اور گرو گوبند سنگھ کو قلعہ چھوڑنے کی تحریری ضمانت دی گئی۔ لیکن قلعہ خالی کرتے ہی مغل افواج نے وعدہ خلافی کرتے ہوئے حملہ کر دیا۔ اس حملے میں سکھوں کو شدید جانی نقصان اٹھانا پڑا، لیکن گرو گوبند سنگھ دشمن کے گھیرے سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے اور جنوب کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ واقعہ مغل حکمرانی کے خلاف سکھوں کے دلوں میں مزید مزاحمت، نفرت اور آزادی کے جذبے کا سبب بنا۔

چمکور کی جنگ: جہاں گرو گوبند سنگھ کے دو بیٹے بھی مارے گئے: انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا کے مطابق، گرو گوبند سنگھ اپنے چالیس کے قریب ساتھیوں اور دو بڑے بیٹوں کے ساتھ آنند پور سے نکل کر چمکور (فاصلہ تقریباً 40 کلومیٹر) تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ مغل فوج نے ان کا تعاقب کیا اور 7 دسمبر 1705ء کو چمکور کی جنگ میں گرو کے دونوں بیٹوں سمیت تقریباً تمام سکھ مارے ہو گئے۔ گرو گوبند سنگھ کے ساتھ صرف پانچ سکھ رہ گئے۔ یہاں انھوں نے خالصہ کے مستقبل کو محفوظ رکھنے کے لیے آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا اور پنجاب کے علاقے مالوا کے جنگلات میں پناہ لی۔

سکھ تاریخ کے مطابق گرو گوبند سنگھ کی زندگی قربانیوں سے بھری ہوئی ہے۔ان کے چار بیٹے، جنھیں ''چار صاحبزادے'' کہا جاتا ہے،سکھ مذہب اور انسانی اقدار کے تحفظ کے لیے شہید ہوئے۔ ان کے دو بڑے بیٹوں، اجیت سنگھ اور جوجار سنگھ، نے میدان جنگ میں شہادت پائی، جبکہ ان کے دو چھوٹے بیٹوں، زُوراور سنگھ اور فتح سنگھ، کو مغل حکمرانوں نے دیوار میں زندہ چنوا دیا۔ان سانحات کے باوجود گرو گوبند سنگھ نے اپنی جدوجہد جاری رکھی اور اپنے پیروکاروں کو ہمت اور صبر کا درس دیا۔

سید محمد لطیف لکھتے ہیں کہ جب گرو گوبند سنگھ کو اپنے بیٹوں کی موت کی خبر دی گئی، تو انھوں نے زمین پر انگلی سے لکیریں کھینچیں، پھر انھیں مٹا کر فرمایا:

''سکھ بھائیو! جب یہ لکیریں وجود میں آئیں تو کوئی خوشی نہ ہوئی اور جب مٹا دیں تو کوئی افسوس نہیں۔جیسے یہ لکیریں عارضی ہیں، ویسے ہی یہ دنیاوی دکھ اور خوشیاں بھی عارضی ہیں۔ خدا ہی خالق ہے، وہ جو چاہے کرے، جب حکومت اسی کے ہاتھ میں ہے تو ہمیں کیا شکایت؟ اس کی رضا پر بھروسا رکھو، وہی قادرِ مطلق ہے۔''

سرہند میں گرو کے چھوٹے بیٹوں کی موت: آنند پور کے بعد گرو کے دو چھوٹے بیٹے زوراور سنگھ اور فتح سنگھ اپنی دادی ماتا گجری کے ساتھ سرہند کے قریب ایک نوکر کے دھوکے کا شکار ہو کر مغل حاکم وزیر خان کے پاس پہنچا دیے گئے۔سکھ روایات کے مطابق، 13 دسمبر 1705ء کو ان دونوں بچوں کو اپنے عقیدے سے انکار نہ کرنے پر قتل کر دیا گیا۔ان کی دادی بھی اسی روز غم کی شدت سے وفات پا گئیں۔

کہا جاتا ہے کہ بچوں کو زندہ دیوار میں چنوا دیا گیا، تاہم بعض مسلم مورخین اس کی تردید کرتے ہیں۔سید محمد لطیف لکھتے ہیں کہ بعض روایات کے مطابق جب یہ بچے وزیر خان کے پاس لائے گئے تو اس نے کہا: ''بچوں کو کچھ نہ کہا جائے۔'' مگر دیوان کلجاس نے، جو گرو گوبند سنگھ سے ذاتی عناد رکھتا تھا، ان کے قتل کا حکم دے دیا۔اگرچہ قتل کا طریقہ متنازع ہے، لیکن بچوں کی موت ایک حقیقت ہے۔ان کی یاد میں سرہند میں ایک گردوارہ تعمیر کیا گیا۔

میں نے سن 2000ء میں اس گردوارے کا دورہ کیا۔وہاں ایک دیوار میں وہ جگہ دیکھی جو

سکھ روایت کے مطابق بچوں کو زندہ دفن کرنے کی جگہ ہے۔ بچوں کے قتل پر میری جتنی بھی مذمت ہو، کم ہے۔ اس وقت سرہند کا گورنر وزیر خان تھا اور ہندوستان کا بادشاہ عالمگیر۔ میری نظر میں دونوں اس ظلم میں برابر کے شریک تھے۔

مکتسر کی جنگ: ایک تاریخی موڑ: مکتسر کی جنگ، جس مقام پر آج ایک مقدس تالاب واقع ہے، سکھ تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ اس کا تذکرہ مؤرخ سید محمد لطیف نے بھی کیا ہے۔ اس جنگ کی تفصیلات جاننے کے لیے نہ صرف قدیم تاریخی متون بلکہ جدید ذرائع، بالخصوص سکھ ذرائع ابلاغ سے بھی استفادہ کیا گیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ معروف ادیب اور روحانی شخصیت اشفاق احمد، جنھیں میں ذاتی طور پر اپنا مرشد تصور کرتا ہوں، کا تعلق بھی اسی علاقے سے یعنی مکتسر میں آباد مہمند پٹھان قبیلے سے تھا۔

مکتسر کی جنگ اس وقت شروع ہوئی جب گرو گوبند سنگھ نے اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ ''کھدرانہ'' نامی گاؤں میں قیام کیا۔ یہ مقام اس لیے اہم تھا کہ یہاں پانی کی دستیابی جنگ کے تناظر میں نہایت اہمیت رکھتی تھی۔ مغل کمانڈر وزیر خان نے گرو کو گرفتار کرنے کے لیے فوج روانہ کی۔ کھدرانہ، جو بعد میں مکتسر کہلایا، جلد ہی میدانِ جنگ میں تبدیل ہو گیا۔ مغل افواج تعداد میں کہیں زیادہ تھیں، جب کہ سکھ نہ صرف تعداد میں کم تھے بلکہ پچھلی جنگوں سے تھکے ہوئے بھی تھے۔ تاہم، اسی موقع پر مائی بھاگو کی قیادت میں چالیس سکھ مدد کے لیے آ پہنچے۔ اگرچہ ان کی تعداد کم تھی، مگر ان کی مزاحمت غیر معمولی اور تاریخ ساز تھی۔ گرو گوبند سنگھ کو علم تھا کہ ان کی بقا کے امکانات محدود ہیں، لیکن انھوں نے خالصہ کے اصولوں پر سمجھوتہ نہیں کیا۔

اس جنگ میں شامل چالیس سکھ، جن کے قائد مہا سنگھ تھے، تقریباً سب ہی مارے گئے۔ ان کی قربانی نے نہ صرف جنگ کا رخ موڑ دیا بلکہ گرو گوبند سنگھ اور ان کے ساتھیوں کو محفوظ مقام تک پہنچنے میں مدد دی۔ ان لوگوں کی قربانی نے سکھ مزاحمت کی تاریخ کو ایک نیا رخ دیا۔

❁ ❁ ❁

بندہ سنگھ بہادر سے رنجیت سنگھ تک
پنجاب میں ظلم، مزاحمت اور ریاست کی تشکیل کا سفر

عالمگیر کی وفات کے بعد تقریباً نو دہائیاں شمالی ہندوستان، بالخصوص پنجاب، شدید سیاسی افراتفری، بدامنی اور تشدد کی لپیٹ میں رہا۔ اس عرصے کے دوران نادر شاہ کا حملہ (1739ء)، احمد شاہ ابدالی اور مراٹھوں کے درمیان تیسری جنگِ پانی پت (1761ء)، اور جنگِ بکسر (1764ء) جیسے اہم واقعات پیش آئے، جن کا مختصر جائزہ میں پہلے صفحات میں پیش کر چکا ہوں۔

اب میں اُن تاریخی لمحات کا تفصیلی جائزہ پیش کروں گا جن میں سکھوں کی مغلوں اور افغانوں کے ساتھ ہونے والی جنگیں شامل ہیں۔ میں اس بات پر بھی روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا کہ کس طرح پنجاب میں مقامی مسلم اور سکھ ریاستیں ابھریں، کس طرح انگریزوں نے دہلی پر بالواسطہ تسلط قائم کیا، اور سکھ مسلیں کس طرح منظم ہوئیں۔ ان تمام حالات کے نتیجے میں، بالآخر مہاراجہ رنجیت سنگھ کی قیادت میں ایک مضبوط سکھ ریاست قائم ہوئی۔

یہ ایک کٹھن اور پیچیدہ موضوع ہے، جس کے تاریخی واقعات کی زمانی ترتیب بعض اوقات الجھی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ مزید برآں، یہ صرف سیاسی اقتدار کی جنگ نہیں تھی، بلکہ ایک گہری روحانی اور تہذیبی جدوجہد بھی تھی ایسی جدوجہد جس کا مقصد اپنی مذہبی شناخت اور ثقافتی وجود کا تحفظ تھا۔ میں نے ان تاریخی حقائق کو ترتیب دینے اور ان کے تجزیے کی بھرپور کوشش کی ہے؛ تاہم، اس کوشش کی کامیابی کا فیصلہ قارئین خود کریں گے۔

بابا بندہ سنگھ بہادر (1716ء-1670ء): سید محمد لطیف کے مطابق، دکن میں قیام کے

دوران گرو گوبند سنگھ کی ملاقات بیراگی سلسلے سے تعلق رکھنے والے ایک جوگی، بندہ سے ہوئی۔ بندہ ایک بااثر روحانی شخصیت تھا، جس کے سینکڑوں مرید تھے اور وہ بڑی شان وشوکت سے زندگی بسر کرتا تھا۔ گرو گوبند سنگھ کی روحانی بصیرت، فصاحت و بلاغت، اور انقلابی جذبے نے بندہ پر گہرا اثر چھوڑا۔ یہ ملاقات اس قدر فیصلہ کن ثابت ہوئی کہ بندہ گرو گوبند سنگھ کے مشن میں شامل ہو گیا اور ان کا عقیدت مند اور پیروکار بن گیا۔ بندہ نے اپنی عبادت، اخلاص، اور روحانی مشقوں سے گرو کا اعتماد حاصل کیا اور جلد ہی ان کا قریبی رفیق بن گیا۔ اگرچہ اسے گرو گوبند سنگھ کا جانشین رسمی طور پر تسلیم نہیں کیا گیا، تاہم گرو نے واضح طور پر اعلان کیا کہ ان کے بعد بندہ ہی سکھوں کا رہنما اور محافظ ہوگا۔

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ 1707ء میں اورنگزیب کی وفات ہوئی، اور اس کے محض ایک سال بعد گرو گوبند سنگھ بھی ایک قاتلانہ حملے میں شہید ہو گئے۔ ان کے قتل کی وجوہات کے بارے میں مختلف آرا پائی جاتی ہیں، جن میں سید محمد لطیف اور سکھ مؤرخین کے بیانیے میں خاصا فرق موجود ہے۔

بابا بندہ سنگھ بہادر سکھ تاریخ کی ایک نمایاں اور انقلابی شخصیت تھے جنھوں نے برصغیر میں مغل سلطنت کے خلاف ایک مؤثر اور منظم مسلح جدوجہد کا آغاز کیا۔ ہمارے بزرگ جب بھی اپنے دیس (سرہند) کی بات کرتے تھے تو بندہ سنگھ کا بھی نام لیتے تھے۔ اُن کی قیادت میں سکھوں نے مغلوں کے زیرِ تسلط علاقوں پر حملے کیے اور عارضی طور پر ایک آزاد سکھ ریاست کی بنیاد رکھی۔ [1]

انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا کے مطابق، بندہ سنگھ بہادر کا اصل نام لچھمن دیو تھا، جو راجوری (موجودہ بھارت) میں پیدا ہوئے۔ نوجوانی میں انھوں نے دنیاوی زندگی ترک کر کے ایک تپسوی کا روپ اختیار کیا اور مادھوداس بیراگی کے نام سے شہرت پائی۔ 1708ء میں جب ان کی ملاقات گرو گوبند سنگھ سے ہوئی، تو انھوں نے سکھ مت قبول کیا، اور سکھ برادری میں شامل ہونے کے بعد انھیں بندہ سنگھ بہادر کا نام عطا کیا گیا۔ وہ ایک باصلاحیت اور مدبر سپہ سالار سمجھے جاتے ہیں۔ سکھوں کی ایک قابلِ اعتماد ویب سے بابا بندہ سنگھ بہادر بارے جو جان سکا وہ پیش

[1] https//:www.sikhiwiki.org/index.php/Banda_Singh_Bahadur

خدمت ہے۔[1]

گرو گوبند سنگھ کی وفات کے بعد بندہ سنگھ بہادر کا مقصد وزیر خان کو سزا دینا اور سرہند کو فتح کرنا تھا۔ اس مقصد کی خاطر اُسے اپنی طاقت کو مجتمع کرنے کے لیے کچھ وقت درکار تھا۔ اس نے 1710ء میں اپنا ہیڈ کوارٹر سدھورا سے تقریباً 20 کلو میٹر دور، نہان کے جنوب میں، نچلی شیوالک پہاڑیوں میں واقع مخلص پور میں قائم کیا۔ اس کا قلعہ ایک پہاڑی کی چوٹی پر واقع تھا۔ بابا بندہ سنگھ بہادر نے مخلص پور کا نام بدل کر ''لوہ گڑھ'' رکھ دیا، اور یہی مقام پہلی سکھ ریاست کا دارالحکومت بن گیا۔

بندہ نے شمال میں شیوالک پہاڑیوں، مغرب میں دریائے تانگری، مشرق میں دریائے جمنا، اور جنوب میں سمانہ، تھانیسر، کیتھل اور کرنال تک کے علاقے فتح کیے۔ ان علاقوں میں اُس نے مغل دور کے رائج زمینداری نظام کو ختم کر دیا اور حقیقی کاشتکاروں کو زمین کا مالک قرار دیا۔ اس طرح اُس نے کسانوں کی ملکیت کو تسلیم کرتے ہوئے آبادی کی بھاری اکثریت کی حمایت حاصل کی۔

میرے خیال میں اس سے پہلے کسی نے بھی ایسا اقدام نہیں کیا تھا۔ کیا ہم اسے سوشلزم کی ایک ابتدائی شکل کہہ سکتے ہیں؟ اس سماجی تبدیلی کا باقاعدہ مطالعہ ہونا چاہیے۔

بابا بندہ سنگھ بہادر کے ان اقدامات کو ہر خاص و عام نے بے حد سراہا۔ یاد رہے کہ عالمگیر کی وفات کے بعد بہادر شاہ اوّل کا دورِ حکومت 1707ء سے 1712ء تک رہا۔ اُس نے سفارت کاری پر زیادہ توجہ مرکوز کی اور اورنگزیب کی پالیسیوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والی کشیدگی کو کم کرنے کی کوشش کی۔ دوسری طرف بندہ سنگھ بہادر اپنی سول اور فوجی انتظامیہ کو منظم کرنے میں مصروف تھا۔ بہادر شاہ اس وقت دہلی سے دور تھا، اور دہلی حکومت نے اپنا کھویا ہوا علاقہ واپس لینے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی۔ البتہ سرہند کا گورنر، وزیر خان، بابا بندہ سنگھ بہادر کے خطرے سے نمٹنے کے لیے آزادانہ طور پر تیاریاں کر رہا تھا۔

اب یہاں ایک بڑی تبدیلی دیکھنے کو ملتی ہے۔ بابا بندہ سنگھ بہادر کی فوج میں شامل ہر سکھ، گرو گوبند سنگھ اور اُن کے صاحبزادوں کی موت کی وجہ سے، انتقام لینے کے لیے بے تاب تھا۔ کئی سکھ

---

[1] https//:www.sikhiwiki.org/index.php/Banda_Singh_Bahadur

اپنے مذہبی دشمنوں کو سزا دینا چاہتے تھے۔ البتہ ایک گروہ جو ایسے مواقع پر اکثر منظرِ عام پر آتا ہے صرف لوٹ مار کی نیت رکھتا تھا۔

وزیر خان نے بندہ کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا اور اس معرکے کو مذہبی جنگ کا نام دیا۔ اُس نے ملیر کوٹلہ کے نواب، دیگر مسلم سرداروں، جاگیرداروں اور کئی راجپوت حکمرانوں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ اُس کی فوج تعداد میں بھی بندہ سنگھ بہادر کی فوج سے زیادہ تھی اور بہتر تربیت یافتہ بھی۔ اس موقع پر یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ مغل فوج میں ہندو راجپوت بھی شامل تھے۔ اس سے مغل۔سکھ جنگوں میں ہندوؤں کا کردار صاف دیکھا سکتا ہے۔

بابا بندہ سنگھ بہادر اور جنگِ سرہند (1710ء): مئی 1710ء میں بابا بندہ سنگھ بہادر اور مغل فوجدار وزیر خان کے مابین سرہند کے مقام پر ایک فیصلہ کن جنگ لڑی گئی، جس میں بابا بندہ سنگھ بہادر کی افواج کو فتح حاصل ہوئی اور وزیر خان میدانِ جنگ میں مارا گیا۔ یہ جنگ نہ صرف عسکری اعتبار سے اہم تھی بلکہ سیاسی اور جذباتی لحاظ سے بھی سکھ تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس فتح کے فوراً بعد سرہند شہر میں بڑے پیمانے پر قتل و غارت کا آغاز ہوا۔ روایت کے مطابق یہ کارروائی گرو گوبند سنگھ کے دو کمسن صاحبزادگان صاحبزادہ زوراور سنگھ اور صاحبزادہ فتح سنگھ کی مظلومانہ موت کے ردِعمل میں کی گئی، جنہیں وزیر خان کے حکم پر زندہ دیوار میں چنوایا گیا تھا۔ میں اس کی ہر لحاظ سے مذمت کرتا ہوں۔ اس کی اسلام میں کہیں بھی اجازت نہیں ہے۔

تاریخی ماخذوں میں اس واقعے کی مختلف تعبیرات موجود ہیں۔ معروف مورخ سید محمد لطیف اپنی کتاب تاریخ پنجاب میں لکھتے ہیں کہ بندہ سنگھ کی افواج نے سرہند پر قبضے کے بعد ظلم و بربریت کی انتہا کر دی؛ ہزاروں بے گناہ شہریوں کو، جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے، قتل کیا گیا اور کئی تاریخی عمارتیں نذرِ آتش کر دی گئیں۔ میں اس ظلم کی بھی جو سکھوں نے سرہند کے بے گناہ لوگوں پر کیا، سکھ دھرم کے منافی سمجھتا ہوں میں اس کی بھی مذمت کرتا ہوں۔

اس جنگ سے قبل بابا بندہ سنگھ بہادر سمانا، سدھورا اور دیگر قریبی علاقوں کو فتح کر چکے تھے۔ سرہند پر پہلی مرتبہ سکھ اقتدار قائم ہوا، جس نے خطے میں مغلیہ اقتدار کو شدید دھچکا پہنچایا۔

پنجاب میں سکھ ریاست کا قیام اور اقلیت کی حکمرانی: ایک تاریخی وسماجی تجزیہ: بابا بندہ سنگھ بہادر کی قیادت میں شمالی ہندوستان میں سکھوں کی پہلی منظم ریاست کا قیام عمل میں آیا، جو مذہبی بنیادوں پر قائم ہوئی۔ یہ ریاست نہ صرف عسکری بلکہ انتظامی اور قانونی ڈھانچے کے لحاظ سے بھی منفرد تھی۔ اس کی زبان، قوانین اور نظم ونسق سکھ اصولوں پر مبنی تھے، اور انتظامیہ مکمل طور پر سکھ افراد پر مشتمل تھی۔ کسی غیر سکھ کو ریاستی امور میں شمولیت حاصل نہ تھی۔ یہ کہنا کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی قائم کردہ ریاست پہلی سکھ ریاست تھی، درست نہیں۔

یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ بابا بندہ سنگھ بہادر کے دور میں سکھ آبادی پنجاب کی مجموعی آبادی کا محض پانچ فیصد یا اس سے بھی کم تھی۔ اس کے باوجود، اس قلیل تعداد نے ایک مضبوط اور فعال ریاست کی بنیاد رکھی، جو تاریخی اعتبار سے ایک اہم واقعہ ہے۔ اگر ہم 1941ء کی مردم شماری کا جائزہ لیں تو اس وقت پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریت (55 فیصد)، ہندو اقلیت (30 فیصد) اور سکھ (15 فیصد) تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ سکھ، باوجود اقلیت میں ہونے کے، ایک طویل عرصے تک پنجاب پر حکمرانی کرتے رہے، جبکہ ہندو آبادی، جو ایک تہائی کے قریب تھی، کبھی پنجاب میں مستقل حکمرانی حاصل نہ کر سکی۔

تقسیمِ ہند (1947ء) کے بعد پنجاب کے کئی علاقوں کو تقسیم کر کے ''ہریانہ'' کے نام سے نیا صوبہ قائم کیا گیا، جہاں ہندو اکثریت کی بنا پر اب جمہوری طریقے سے ہندو حکومت قائم ہے۔ اس سیاسی تغیر سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقتدار صرف عددی اکثریت سے نہیں، بلکہ تنظیم، مقصد، قیادت، اور وقت کے تقاضوں کو سمجھنے کی صلاحیت سے وابستہ ہوتا ہے۔

زرعی اصلاحات اور سیاسی خودمختاری: فتحِ سرہند کے بعد بابا بندہ سنگھ بہادر نے نہ صرف سکھ حکومت کی بنیاد رکھی بلکہ زرعی اصلاحات بھی متعارف کروائیں۔ انھوں نے زمینداری نظام کو ختم

کر کے زمین کی ملکیت براہِ راست کسانوں کے سپرد کر دی۔ ان کا دارالحکومت لوہ گڑھ تھا، جہاں سے وہ انتظامی اور عسکری امور سرانجام دیتے تھے۔ جنگِ سرہند نہ صرف ذاتی اور مذہبی مظالم کا بدلہ تھی بلکہ سکھوں کی خودمختاری کا پہلا باقاعدہ سیاسی اور عسکری اظہار بھی تھی۔ اس نے یہ واضح کر دیا کہ سکھ اب ایک منظم طاقت کے طور پر برصغیر کے سیاسی نقشے پر ابھر چکے ہیں۔

تاہم، اس تاریخی واقعے کا ایک اخلاقی پہلو بھی قابلِ غور ہے۔ بابا گرونانک دیو جی نے جس دھرم کی بنیاد سچائی، ہمدردی اور اخلاقی اصولوں پر رکھی، وہ اب ایک مسلح تحریک کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جنھوں نے ظلم کیا، انھیں سزا دینا تو قابلِ فہم ہے، لیکن عام شہریوں کا کیا قصور تھا؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو نہ صرف سکھ تاریخ بلکہ دنیا کی ہر انقلابی تحریک کے ضمیر کو جھنجھوڑتا ہے۔

سیاسی و مذہبی خودمختاری کا اظہار: تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ بابا بندہ سنگھ بہادر کی قیادت میں سکھوں نے لاہور سمیت پنجاب کے متعدد علاقوں پر فتوحات حاصل کیں، اور نومبر 1709ء سے ستمبر 1710ء کے درمیان، یعنی ایک سال سے بھی کم عرصے میں، دہلی کے دروازوں تک اپنی قوت کا دائرہ وسیع کر دیا۔ ان فتوحات کے بعد بابا بندہ سنگھ بہادر نے ایک خودمختار سکھ ریاست کے قیام کا اعلان کیا اور اپنا دارالحکومت مکلس پور میں قائم کیا، جسے بعد ازاں ''لوہ گڑھ'' (یعنی قلعہ فولاد) کا نام دیا گیا۔ انھوں نے سرہند سے حاصل ہونے والا خزانہ، فتوحات کے دوران حاصل کی گئی مالِ غنیمت، نذرانے اور دیگر ذرائع سے حاصل شدہ آمدنی لوہ گڑھ میں جمع کی، جو ریاست کا سب سے محفوظ مقام تصور کیا جاتا تھا۔

یہاں سے انھوں نے ریاستی امور کی باقاعدہ نگرانی شروع کی اور مکمل حکومتی ڈھانچے کی بنیاد رکھی۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ پہلی مرتبہ انھوں نے اپنی خودمختاری کے اظہار کے طور پر ایک سکہ جاری کیا، جس پر گرونانک دیو اور گرو گوبند سنگھ کے ناموں کی مہر ثبت کی گئی۔ یہ سکہ محض مالیاتی علامت نہیں بلکہ سیاسی و مذہبی خودمختاری کا اعلان بھی تھا۔ اسی کے ساتھ، انھوں نے سکھ برادری کے لیے

ایک نیا کیلنڈر بھی متعارف کروایا، جسے ''نئی سمت'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔

یہ اقدامات مسلمانوں کے سکہ جاری کرنے کی روایت کی یاد دلاتے ہیں، جس میں سکہ جاری کرتے وقت اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا نام درج کیا جاتا تھا۔ بابا بندہ سنگھ بہادر کا یہ عمل اسی روایت کا تسلسل محسوس ہوتا ہے۔

لوہ گڑھ: ایک فوجی و دفاعی مرکز: لوہ گڑھ صاحب ایک تاریخی مقام ہے، جو ہمالیہ کے دامن میں واقع ایک بلند پہاڑی چوٹی پر قائم ہے۔ یہ مقام جغرافیائی طور پر ہماچل پردیش کے ضلع نہان اور ہریانہ کے قصبہ سدھورا کے درمیان واقع ہے، اور سدھورا سے تقریباً 21 میل کے فاصلے پر ہے۔ فاصلہ کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ مقام سدھورا اور نہان کے درمیان ایک وسطی نقطے پر آتا ہے۔قدرتی طور پر یہ مقام انتہائی سنگلاخ، پُر پیچ اور دشوار گزار ہے۔ یہاں تک رسائی صرف پتھریلے اور گھاٹیوں والے راستوں کے ذریعے ممکن تھی، جو تاریخی لحاظ سے فوجی اور دفاعی مقاصد کے لیے نہایت موزوں تصور کیے جاتے تھے۔

ان فتوحات اور اصلاحات کے نتیجے میں بڑی تعداد میں لوگ سکھ مت میں شامل ہونے لگے۔ بندہ سنگھ بہادر نہ صرف عوامی سطح پر سکھ عقیدے کے محافظ کے طور پر ابھرے، بلکہ مظلوم طبقات کے چیمپئن کے طور پر بھی مقبول ہوئے۔ انھوں نے باقاعدگی سے دربار کا انعقاد شروع کیا، جہاں لوگ اپنی شکایات پیش کرتے، اور وہ عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے۔ ان کی عوام دوستی، انصاف پسندی اور شفاف حکمرانی نے انھیں عام لوگوں کے دلوں میں محبت، اعتماد اور عقیدت کی علامت بنا دیا۔ جب عام لوگوں کو یہ محسوس ہوا کہ سکھ تخت نشین ہیں، طاقت اور دولت ان کے پاس ہے، اور وہ ہمیں اپنا ہمسر سمجھتے ہیں، تو ایک بڑی تعداد نے سکھ دھرم قبول کیا۔ میرے علم کے مطابق سکھ مت قبول کرنے والوں میں ہندو دھرم سے تعلق رکھنے والی نچلی ذات کے افراد کی اکثریت تھی۔ کسی بھی مسلمان نے شاید ہی سکھ مت قبول کیا ہو، اس بارے مجھے کوئی علم نہیں۔

تاریخی سیاق و سباق میں دیکھا جائے تو اُس وقت کے معاشرے میں تین نمایاں فریق موجود تھے: مسلمان، ہندو اور سکھ۔ مسلمان حکمران زوال کا شکار تھے، ہندو طبقہ خاموش تماشائی بنا ہوا تھا، جبکہ سکھ ایک ابھرتی ہوئی مزاحمتی قوت بن چکے تھے۔ بعض مورخین، جیسے سید محمد لطیف، کا ماننا ہے کہ مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان پیدا ہونے والی غلط فہمیوں میں بعض ہندو عناصر نے بھی کردار ادا کیا، جنھوں نے دونوں فریقوں کے مابین فاصلوں کو بڑھایا۔ جب مغل انتظامیہ نے سکھ طاقت کو کچلنے کی کوشش کی، تو اس کے نتیجے میں سخت ردعمل سامنے آیا، جس کا مظاہرہ سرہند کے قتل عام میں ہوا۔

میرے آبا و اجداد کا تعلق تاریخی شہر سرہند سے رہا ہے۔ مجھے بھی اس شہر کی زیارت کا شرف حاصل ہوا، جس نے میری تاریخی دلچسپی کو مزید گہرا کر دیا۔ میرے بزرگوں کے مطابق، سرہند نے تاریخ میں متعدد بار تباہی و بربادی دیکھی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب اگر کسی کو مکان تعمیر کرنے کی ضرورت پیش آتی، تو وہ شہر کے نواح سے محض ایک رات کی محنت سے اینٹوں کی وافر مقدار جمع کر لیتا، جو پرانی اور مسمار شدہ عمارات سے حاصل کی جاتی تھیں۔

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ سرہند، دہلی اور لاہور کے درمیان واقع ایک مرکزی مقام تھا، اور مغلیہ دور میں ایک اہم و باوقار مرکز سمجھا جاتا تھا۔ یہاں ایک عظیم باغ جس کا نام عام خاص باغ تھا، تعمیر کیا گیا تھا، جو شاہی قیام گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ مغل بادشاہ جب لاہور سے دہلی یا اس کے برعکس سفر کرتے تو اکثر یہاں قیام فرماتے تھے۔

عام خاص باغ مغلیہ دور کی وہ شاہکار تعمیر ہے جو سرہند شہر میں واقع تھی۔ یہ باغ اس زمانے کی شاندار فن تعمیر، باغبانی اور ریاستی حکمت عملی کا مظہر تھا۔ مغل سلاطین جب دہلی سے لاہور یا لاہور سے دہلی سفر کرتے تو سرہند میں قیام کے لیے عام خاص باغ کو ترجیح دیتے تھے، کیوں کہ یہ مقام جغرافیائی طور پر دونوں شہروں کے درمیان واقع تھا اور شاہی قیام کے لیے نہایت موزوں سمجھا جاتا تھا۔ اس باغ کو اس طرح ڈیزائن کیا گیا تھا کہ اس میں عوام کے لیے مخصوص حصہ (عام)

اور بادشاہ وامراء کے لیے الگ شاہی حصہ (خاص) موجود تھا۔اسی دوگانہ استعمال کی وجہ سے اس کا نام ''عام خاص باغ'' پڑا۔

یہ باغ مغلیہ طرزِ تعمیر کے مطابق چار باغ (چہار باغ) طرز پر بنایا گیا تھا۔اس میں نہری نظام، فوارے، سنگِ مرمر سے مزین راہداریاں اور بارہ دری جیسی تعمیرات موجود تھیں۔مغلیہ سلطنت کے زوال اور سکھ حملوں کے بعد یہ باغ بھی تباہی کا شکار ہوا۔ جنگ آزادی کے بعد برطانوی دور میں اس باغ کی بہت سی باقیات یا تو مٹی میں دفن ہوگئیں یا مقامی لوگوں نے تعمیراتی سامان کے طور پر استعمال کرلیں۔آج عام خاص باغ کے کچھ ہی آثار باقی رہ گئے ہیں۔ بھارتی محکمہ آثارِ قدیمہ نے کچھ حصوں کو محفوظ کر رکھا ہے، تاہم اس کی مکمل بحالی ابھی تک نہیں ہوسکی۔

میرے حالیہ دورۂ سرہند کے دوران مجھے حضرت مجدد الف ثانیؒ کے دربار پر حاضری کا شرف حاصل ہوا، اور ساتھ ہی اُس گردوارے کی زیارت بھی کی، جہاں سکھ روایت کے مطابق گرو گوبند سنگھ جی کے دو صاحبزادگان کو دیوار میں زندہ دفن کیا گیا تھا۔

اس تاریخی مشاہدے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ظلم کے خلاف کیا جانے والا ردعمل، خواہ وہ کسی بھی شکل میں ہو، ایک فطری اور غیر متوقع عمل ہوتا ہے۔ یہ ردعمل کب، کہاں اور کس شدت سے ظاہر ہوگا، اس کی پیش گوئی ممکن نہیں۔ یہی کیفیت ہمیں سرہند کی جنگ میں بھی نظر آتی ہے، جو ایک فطری انسانی جذباتی ابال کا اظہار تھی ایک ایسا ابال جو برسوں کے جبر اور استحصال کے بعد رونما ہوا۔ یہ رائے میری ذاتی فہم، مشاہدے اور مطالعے پر مبنی ہے، جسے حتمی اور قطعی نہیں سمجھنا چاہیے۔علمی دیانت کے تقاضوں کے تحت یہ تسلیم کرنا ضروری ہے کہ یہ تجزیہ کسی بھی اختلافِ رائے یا متبادل تحقیق کی گنجائش کو رد نہیں کرتا۔

بابا بندہ سنگھ بہادر کی گرفتاری، شہادت اور پنجاب کا سیاسی منظر نامہ

تاریخی تجزیے کے لیے یہ جاننا نہایت ضروری ہے کہ جب بابا بندہ سنگھ بہادر کو گرفتار کر کے دہلی لایا گیا، اس وقت برصغیر میں مغل شہنشاہ فرخ سیر کی حکومت قائم تھی۔ 1710ء میں سرہند کی

فتح کے بعد بابا بندہ سنگھ بہادر نے تقریباً پانچ سال تک اپنی عسکری سرگرمیاں جاری رکھیں، جن کے دوران انھوں نے مغل اقتدار کے خلاف مختلف علاقوں میں فتوحات حاصل کیں۔ تاہم اس بار صورت حال مختلف تھی، کیونکہ دہلی دربار نے براہِ راست اس تحریک کو کچلنے کا فیصلہ کیا۔

فرخ سیر کے حکم پر مغل جرنیل عبدالصمد خان نے پنجاب کے تمام فوجداروں اور جاگیرداروں کو لاہور میں جمع کیا۔ اس مہم میں پہاڑی ریاستوں کے متعدد ہندو حکمرانوں نے، مثلاً کنگرا، چمبا اور بلور، مغل افواج کا ساتھ دیا، البتہ منڈی، کلو اور مالا بار نے اس میں شرکت سے گریز کیا۔ اس اتحاد سے واضح ہوتا ہے کہ سکھوں کے خلاف مزاحمت محض مسلمانوں تک محدود نہ تھی، بلکہ بعض ہندو عناصر بھی اس مخالف محاذ کا حصہ تھے۔

عبدالصمد خان کی قیادت میں متحدہ مغل و پہاڑی افواج نے گورداسپور کے ننگل کے مقام پر واقع سکھ قلعے پر حملہ کیا، جہاں بابا بندہ سنگھ بہادر موجود تھے۔ یہ ایک غیر متوازن معرکہ تھا کیونکہ مغل و ہندو افواج کی تعداد سکھوں کے مقابلے میں پچاس گنا زیادہ تھی۔ آٹھ ماہ تک جاری رہنے والے محاصرے کے بعد، 7 دسمبر 1715ء کو قلعہ فتح کر لیا گیا اور بابا بندہ سنگھ بہادر کو ان کے ساتھیوں سمیت گرفتار کر لیا گیا۔

بابا بندہ سنگھ بہادر کی موت: ایک تاریخی و انسانی حقوق کا تناظر

بابا بندہ سنگھ بہادر کی گرفتاری کے بعد پیش آنے والے واقعات نہ صرف المناک تھے بلکہ انسانی حقوق کی شدید خلاف ورزیوں کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔ تاریخی شواہد کے مطابق، انھیں تین ماہ تک مسلسل جسمانی اذیتوں اور غیر انسانی سلوک کا سامنا کرنا پڑا۔ اس دوران ان کی اہلیہ اور کمسن بیٹے اجے سنگھ کو بھی قید میں رکھا گیا۔ 5 مارچ 1716ء کو گرفتار سکھوں کو اسلام قبول کرنے کی پیشکش کی گئی، تاہم تمام اسیران نے اپنے مذہب پر قائم رہنے کو ترجیح دی اور کسی نے بھی اپنے ایمان سے انحراف نہ کیا۔ روزانہ قیدیوں کو جیل سے نکال کر ان کے سر قلم کیے جاتے رہے۔ یہ واقعات مذہبی استقامت اور عقیدے کے لیے دی جانے والی قربانی کی

تاریخی مثال کے طور پر یاد کیے جاتے ہیں۔

مغل حکام کا یہ طرزِ عمل دراصل سیاسی انتقام کا مظہر تھا، جس کا کوئی جواز اسلامی تعلیمات میں نہیں ملتا۔ اس نوعیت کے اقدامات، جو مذہب کے نام پر کیے گئے، درحقیقت اسلام کی روح اور اصولِ عدل و رحم کے منافی تھے۔ انھیں اسلامی اقدار سے منسوب کرنا ایک تاریخی اور اخلاقی مغالطہ ہے۔

یہ بھی قابلِ غور امر ہے کہ اُس دور کے بعض مسلمان حکمرانوں کے جبر و تشدد پر مبنی طرزِ حکمرانی کے اثرات وقتی نہیں تھے، بلکہ ان کی بازگشت آج بھی برصغیر کے معاشرتی اور مذہبی تناظر میں محسوس کی جاسکتی ہے۔ خصوصاً پنجاب کا سماج ان پالیسیوں کے شدید منفی اثرات کا شکار رہا، جنھوں نے مذہبی تفریق اور فرقہ وارانہ کشیدگی کو جنم دیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ خلیج مزید گہری ہوتی گئی، جس کا تدارک آج بھی ایک چیلنج ہے۔

سکھ قیادت کی بعض کارروائیاں: ایک تنقیدی زاویہ

یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ بابا بندہ سنگھ بہادر کی قیادت میں سرہند میں جو تباہی ہوئی، اور اس کے نتیجے میں بعض بے گناہ افراد مارے گئے، وہ سکھ مذہب کی بنیادی تعلیمات سے مطابقت نہیں رکھتی۔ اس پہلو کی جتنی مذمت کی جائے کم ہے۔ میری رائے میں بابا بندہ سنگھ بہادر کے بعض اقدامات، خصوصاً مسلمانوں کے خلاف، قابلِ تحسین نہیں بلکہ شدید قابلِ مذمت ہیں۔ متعدد سکھ مؤرخین اور محققین نے بھی ان اعمال پر تنقیدی نگاہ ڈالی ہے۔

کئی غیر جانب دار مؤرخین اور سکھ اسکالرز اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ ان فتوحات کے دوران کئی بے گناہ شہری مارے گئے اور مفتوحہ علاقوں، خصوصاً مسلمانوں کے خلاف، بعض مقامات پر ظلم و ستم کا ارتکاب ہوا۔ مثال کے طور پر، معروف مؤرخ ڈاکٹر جگت سوکھا (*The Sikh Martyrs*) لکھتے ہیں:

While Banda Singh is revered for his bravery, it is equally

important to acknowledge that his campaign included excesses against the innocent, which cannot be reconciled with Sikh principles of justice and compassion.

(سوکھا، 1995)

اسی نوعیت کی رائے ہربنس سنگھ نے اپنی *Encyclopaedia of Sikhism* میں دی ہے، جہاں وہ بندہ سنگھ کی بعض کارروائیوں کو ''reactionary violence'' قرار دیتے ہیں۔

تاہم، بابا بندہ سنگھ بہادر کی قربانی اور مغلیہ سلطنت کے خلاف ان کی جدوجہد کو سکھ قوم نے اپنی خودمختاری کی تحریک کا سنگ میل قرار دیا۔ اس کا ثبوت مشرقی پنجاب میں موجود ان سے منسوب یادگاروں سے ملتا ہے۔ فتح گڑھ صاحب میں 1993ء میں قائم کردہ ''بابا بندہ سنگھ بہادر انجینئرنگ کالج'' اس سلسلے کی ایک نمایاں مثال ہے، جسے حکومتِ پنجاب کی منظوری اور شرومنی گردوارہ پربندھک کمیٹی (SGPC) کی سرپرستی میں قائم کیا گیا۔

اسی طرح، بابا بندہ سنگھ بہادر وار میموریل، جو موہالی، بھارت میں واقع ہے، نہ صرف سکھ قوم کی عقیدت کا مظہر ہے بلکہ سکھ عسکری مزاحمت کی ایک علامتی یادگار بھی ہے۔ اس میں 328 فٹ بلند ''فتح برج'' (Victory Tower) اور عظیم الشان گنبد شامل ہیں۔

ایک دلچسپ سماجی حقیقت یہ ہے کہ فرخ سیر جس کے حکم پر بابا بندہ سنگھ بہادر کو گرفتار کیا گیا اور جن پر مظالم ڈھائے گئے کے نام پر آج کوئی یادگار، ادارہ یا عمارت موجود نہیں۔ یہ حقیقت بذاتِ خود اس بات کا ثبوت ہے کہ تاریخ نے کن کرداروں کو دوام بخشا اور کن کرداروں کو اجتماعی حافظے سے محو کر دیا۔

اس تضاد کو مدنظر رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ:

''تاریخ صرف فتوحات کو نہیں، نیتوں اور اصولوں کو بھی پرکھتی ہے۔''

آخرکار 9 جون 1716ء کو بابا بندہ سنگھ بہادر اور ان کے ساتھیوں کو دہلی قلعے سے باہر لایا

گیا۔شہنشاہ نے ایک بار پھر اسلام قبول کرنے کی دعوت دی، مگر بابا بندہ سنگھ نے موت کو ترجیح دی۔ان کے سامنے ان کے کمسن بیٹے کو شہید کیا گیا، پھر خود انھیں سخت جسمانی اذیتیں دی گئیں۔ لوہے کی سلاخوں سے ان کے اعضا الگ کیے گئے اور انھیں نہایت بے رحمی سے قتل کر دیا گیا۔تمام تر ظلم کے باوجود انھوں نے غیر معمولی صبر اور وقار کا مظاہرہ کیا۔

اس طرح ایک عظیم سکھ رہنما کی زندگی کا اختتام ہوا، لیکن ان کی موت نے پنجاب کی تاریخ کا رخ موڑ دیا۔ اس واقعے کے بعد نہ صرف مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان بلکہ سکھوں اور ہندو ریاستوں کے درمیان بھی کشیدگی اور جنگ وجدل کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا، جو ڈیڑھ صدی تک جاری رہا۔ بالآخر 1849ء میں سکھ سلطنت کے زوال اور انگریزوں کی آمد نے اس خطے کے سیاسی منظر نامے کو مکمل طور پر بدل کر رکھ دیا۔ انگریزوں کی حکومت 1947ء تک برقرار رہی۔

میرے نزدیک برصغیر میں غیر ملکی تسلط کی بنیادی وجہ داخلی انتشار، باہمی چپقلش اور مذہبی منافرت تھی۔ جب گھر کے افراد باہم لڑنے لگیں، تو بیرونی دشمن کے لیے مداخلت کا راستہ خود بخود ہموار ہو جاتا ہے۔

بابا بندہ سنگھ بہادر: ایک متنازع مگر مؤثر شخصیت کا تاریخی تاثر

سکھ روایت میں بابا بندہ سنگھ بہادر (1670–1716) کو ایک جری اور دلیر مجاہد کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ وہ نہ صرف سکھ عسکری قوت کے اولین قائدین میں شمار ہوتے ہیں بلکہ انھیں سکھ ریاست کا بانی، ظلم کے خلاف اُٹھ کھڑے ہونے والا ایک آزاد فکر سیاسی رہنما، اور موت کو اعلیٰ مرتبہ سمجھنے والی شخصیت تصور کیا جاتا ہے۔انھوں نے مغلیہ سلطنت کے استبدادی ڈھانچے کو چیلنج کیا اور ظلم و جبر کے شکار طبقات کے حق میں آواز بلند کی۔سکھ مؤرخین کے نزدیک ان کی جدوجہد قربانی، استقامت اور آزادی کے نصب العین کی آئینہ دار ہے۔

دوسری طرف، مسلمان حکمران طبقے اور ان کے ہم عصر درباری مؤرخین میں بابا بندہ سنگھ بہادر کا تاثر خاصا مختلف اور جزوی طور پر منفی رہا ہے۔ ان مؤرخین، جن میں خفی خان اور گلزارِ

ابراہیمی کے مصنف شامل ہیں، نے انھیں ایک بغاوت برپا کرنے والے اور فتنہ انگیز فرد کے طور پر پیش کیا۔ ان کے بقول، بابا بندہ سنگھ کی جانب سے مغل گورنر وزیر خان کے قتل، سرہند اور دیگر علاقوں میں مغلیہ افواج کی شکست وفتوحات دہلی دربار کے لیے باعثِ تشویش بنیں۔ بابا بندہ سنگھ بہادر اور اس کے ساتھیوں کی لوٹ مار، سرہند کی فتح کے بعد عام لوگوں کا قتل عام جیسے واقعات کی وجہ سے ان کی جدوجہد کو سلطنت کے خلاف ایک خطرناک مسلح تحریک اور مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کا ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے۔

تاہم، اس بیانیے سے ہٹ کر عوامی سطح پر بابا بندہ سنگھ بہادر کا تاثر زیادہ پیچیدہ اور متنوع رہا ہے۔ مشرقی پنجاب کے مختلف شہروں میں کیے گئے ذاتی مشاہدات کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ بعض مقامی مسلمان طبقات اور مؤرخین نے انھیں ایک نڈر، مظلوموں کا حامی اور انصاف پسند شخصیت کے طور پر بھی پیش کیا ہے۔ ان کے اقدامات کو بعض حلقے گرو گوبند سنگھ کے کمسن صاحبزادوں کی مظلومانہ موت اور دیگر مظالم کے ردِعمل میں سامنے آنے والی انتقامی کارروائی کے طور پر دیکھتے ہیں۔

یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ سکھ مذہبی روایت میں اگرچہ بابا بندہ سنگھ بہادر کو روحانی پیشوا یا مقدس درجہ حاصل نہیں، تاہم ان کی عسکری قیادت، بے خوفی اور موت کی قربانی کو اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ ان کے کردار کو جدید سکھ تاریخ میں ایک انقلابی رہنما کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے، جو برصغیر میں استبداد کے خلاف مزاحمت کی ایک بڑی علامت بن گئے۔

بابا بندہ سنگھ بہادر کی یاد میں سکھ برادری اُن کی سالگرہ مناتی ہے، اور اسی عرصے میں گرو گوبند سنگھ کے چاروں صاحبزادوں کی موت کی یاد بھی عقیدت وسوگ کے ساتھ منائی جاتی ہے۔ ذاتی مشاہدے کے مطابق، سکھ برادری اس دوران عام طور پر خوشی کی تقریبات، جیسے شادی بیاہ اور جائیداد کی خرید وفروخت سے اجتناب کرتی ہے، جو ان کی جذباتی وابستگی اور اجتماعی یادداشت کا مظہر ہے۔

❀ ❀ ❀

بابا بندہ سنگھ بہادر کی موت سے فتحِ لاہور تک
سکھ طاقت کی تنظیمِ نو اور آزادی کی جدوجہد

بابا بندہ سنگھ بہادر کی موت (1716ء) کے بعد بادی النظر میں یہ تاثر غالب ہوا کہ سکھ تحریک کا خاتمہ ہو چکا ہے، تاہم تاریخی شواہد اس قیاس کی تردید کرتے ہیں۔ 1716ء سے 1799ء کے درمیان کا عرصہ اگرچہ عمومی تاریخی بیانیے میں کم توجہ کا مستحق ٹھہرا ہے، لیکن حقیقتاً یہ دور سکھ قوم کی تنظیمِ نو، عسکری ابھار اور سیاسی بالیدگی کا وہ اہم مرحلہ ہے، جس نے ایک مستحکم اور خودمختار سکھ سلطنت کے قیام کی بنیاد فراہم کی۔

اس عرصے میں مغلیہ سلطنت زوال پذیر ہو چکی تھی اور شمال مغربی برصغیر سیاسی خلا اور انتشار کا شکار تھا۔ سکھوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نہ صرف منظم عسکری قوت کی بنیاد رکھی بلکہ علاقائی خودمختاری کے لیے عملی اقدامات بھی کیے۔ متعدد سکھ سرداروں اور گروہی اتحادوں (مسلز) نے مقامی سطح پر حکمرانی قائم کی، اور رفتہ رفتہ ایک اجتماعی سکھ سیاسی شناخت ابھر کر سامنے آئی، جس کا نقطۂ عروج مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سلطنت تھی۔

1739ء میں نادر شاہ کی ہندوستان پر یلغار نے مغلیہ اقتدار کی رہی سہی ساکھ کو بھی ختم کر دیا۔ اس حملے کے بعد برصغیر سیاسی و انتظامی طور پر افراتفری کا شکار ہو گیا، اور امن و قانون کی عملاً کوئی حیثیت باقی نہ رہی۔ اس صورتِ حال میں خالصہ پنتھ نے عوام، خصوصاً دیہی طبقات، کے لیے ایک متبادل اور محافظانہ کردار ادا کیا، جس کے نتیجے میں سکھوں کی صفوں میں تیزی سے اضافہ ہوا۔

اس عہد میں سکھ تحریک محض مذہبی ردعمل یا شخصی انتقام کا تسلسل نہ رہی، بلکہ یہ ایک نظریاتی و سیاسی جدوجہد کی شکل اختیار کر چکی تھی، جس کا مقصد آزادی، خودمختاری اور قومیت پر مبنی سیاسی نظم کا

قیام تھا۔ اس جدوجہد نے لاہور سے دہلی تک کے پورے خطے کو متاثر کیا، اور سکھ قوت نہ صرف خارجی حملہ آوروں کے خلاف ایک مؤثر دفاعی حصار بن کر ابھری بلکہ مغلوں اور افغانوں کے درمیان رکاوٹ بھی بنی، جو ایک نئے سیاسی منظرنامے کی تشکیل کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

معروف مورخ ڈاکٹر ہری رام گپتا نے اپنی تصنیف *History of the Sikhs* (پانچ جلدیں) میں اس دور کو خاص اہمیت دی ہے۔ ان کے مطابق 1716ء سے 1738ء تک سکھوں کے بارے میں دستیاب معلومات محدود اور غیر مربوط ہیں، اور زیادہ تر مواد روایات پر مبنی ہے۔ چنانچہ گپتا کی تحقیق کا نقطۂ آغاز 1739ء ہے ایک ایسا فیصلہ کن سال، جس میں نادر شاہ کی یلغار نے برصغیر کے سیاسی توازن کو یکسر بدل دیا۔

اسی تناظر میں قاضی نور محمد کی جنگ نامہ، تذکرہ طہماس خان مسکین، اور سوانحِ نجیب الدولہ جیسی ذاتی نوعیت کی سوانحی تحریریں اس دور کے حالات کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ مزید برآں، ڈاکٹر سکھ جیت کور بھلر اور کرم جیت کور رومانہ کا تحقیقی مضمون "Invasions of Ahmad Shah Abdali in Punjab and the Sikhs" بھی اس دور کی تفہیم میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

اسی لیے یہ سوال بجا ہے کہ ایک کو ڈاکو کہنا اور دوسرے کو معزز بادشاہ کہنا کیا معنی رکھتا ہے؟ دونوں ہی عام لوگوں سے مال و دولت لیتے ہیں؛ ایک قانون کو آگے رکھتا ہے، نظام بناتا ہے اور بندوق کو پیچھے رکھتا ہے، جبکہ دوسرا بندوق کی نوک پر جب چاہے جتنا چاہے مال چھین لیتا ہے۔

یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ جب مالی وسائل کسی منظم اور قانونی نظام کے تحت جمع کیے جاتے ہیں، تو عوام کو اس عمل سے وہ اذیت اور بے چینی محسوس نہیں ہوتی جو کسی غیر منظم، غیر قانونی یا جبری طریقے سے حاصل کی گئی دولت کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ ایسے مواقع پر نہ تو مالی وصولی کی کوئی واضح مقدار متعین ہوتی ہے، نہ ہی اس دولت کے استعمال یا نگرانی کا کوئی مؤثر طریقۂ کار موجود ہوتا ہے، جس کی وجہ سے اسے لوٹ مار یا بے ضابطہ استحصال کے زمرے میں شمار کیا جاتا ہے۔ اسی بنا پر دنیا بھر میں مالی وسائل کے حصول کے لیے ایک باقاعدہ ٹیکس نظام قائم کیا گیا ہے،

جو ریاست اور شہریوں کے درمیان ایک غیر تحکمانہ مگر باقاعدہ معاہدے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ذاتی طور پر میں بھی اس اصول کو درست اور موزوں سمجھتا ہوں اور اپنے ذمے واجب الادا تمام سرکاری محصولات اور ٹیکسز کی ادائیگی کو نہ صرف قانونی ذمہ داری بلکہ اخلاقی فریضہ تصور کرتا ہوں۔

البتہ، یہ ایک اہم سوال ہے کہ ریاست اپنی جانب سے اس نظام کے بدلے شہری کو کیا فراہم کرتی ہے؟ اس سوال کا کوئی حتمی اور جامع جواب تا حال موجود نہیں، جو اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ ٹیکس اور عوامی فلاح کے درمیان تعلق کی نوعیت پر مزید غور و فکر اور شفاف مکالمے کی ضرورت ہے۔

❁ ❁ ❁

بابا بندہ سنگھ بہادر کے بعد سکھوں کی سیاسی و عسکری تنظیم نو
ایک علمی تجزیہ

سید محمد لطیف جیسے ابتدائی مورخین نے بابا بندہ سنگھ بہادر کی موت (1716ء) اور تیسری جنگِ پانی پت (1761ء) کے درمیانی عرصے کو مؤثر انداز میں موضوع نہیں بنایا۔ لطیف کی توجہ کا مرکز براہِ راست 1761ء کے بعد کے واقعات ہیں؛ یوں تقریباً پینتالیس برس پر مشتمل ایک فیصلہ کن تاریخی مرحلہ ان کی تحریروں میں پس منظر میں چلا جاتا ہے۔ اس قابلِ ذکر خلا کو پُر کرنے کی منظم کوشش ڈاکٹر ہری رام گپتا نے کی، جنھوں نے 1768ء تک کے حالات کا جامع تجزیہ پیش کیا ہے۔ ان کے مطابق یہی وہ دور تھا جب سکھ برادری ایک مربوط عسکری، سیاسی اور سماجی طاقت کے طور پر سامنے آئی، اور لاہور جیسا اہم شہر بلا شرکتِ غیرے ان کے زیرِ اختیار آ گیا۔

یہ مرحلہ برصغیر کی سیاسی تاریخ میں ایک اہم موڑ تھا، جب سکھ قوت نے ایک طرف زوال پذیر مغل سلطنت اور دوسری طرف کابل کی درانی سلطنت کے درمیان ایک مزاحمتی فصیل کا کردار ادا کیا۔ سکھوں کی اس تدریجی مگر مسلسل عسکری اور سیاسی پیش رفت نے شمال مغرب سے ہونے والے خارجی حملوں کے طویل سلسلے کو مؤثر طور پر روک دیا۔ نتیجتاً نہ صرف مغلیہ سلطنت بیرونی کمک سے محروم ہوگئی، بلکہ سکھ سلطنت جیسی خودمختار مقامی ریاستوں کے قیام کی راہ بھی ہموار ہوئی۔

اس تحریر میں میں نے کوشش کی ہے کہ 1716ء سے 1799ء تک کے درمیانی دور کے تمام اہم سیاسی، عسکری، تنظیمی اور سماجی پہلوؤں کا احاطہ کیا جائے تاکہ اس دور کی ہمہ گیر تاریخی اہمیت کو واضح کیا جا سکے۔

دستاویزی شواہد کے مطابق، جنوری 1748ء میں مغل گورنر شاہ نواز خان کی دعوت پر احمد

شاہ ابدالی نے لاہور پر حملہ کیا اور شہر کو شدید لوٹ مار کا نشانہ بنایا۔ افغان لشکر کو خطیر مالِ غنیمت حاصل ہوا۔ بعدازاں ابدالی دہلی کی جانب روانہ ہوا اور سرہند کے قریب مغل افواج سے اس کا آمنا سامنا ہوا۔ وزیر قمرالدین کی قیادت میں ہونے والی اس مڈبھیڑ میں قمرالدین ہلاک ہو گیا، اور اس کا بیٹا میر منو میدانِ جنگ میں کامیاب ہو کر لاہور و ملتان کا گورنر مقرر ہوا۔ تاہم، احمد شاہ کو اپنے بھتیجے لقمان خان کی بغاوت کی اطلاع موصول ہونے پر واپس قندھار لوٹنا پڑا۔

اس سیاسی تناظر میں 1716ء سے 1748ء تک کا دور سکھوں کے لیے نہایت کٹھن رہا۔ مغلیہ سلطنت اس عرصے میں نسبتی استحکام کی حامل تھی اور سکھوں کو پنپنے کا موقع نہ مل سکا۔ ان پر سخت مظالم روا رکھے گئے، جس کے نتیجے میں وہ جنگلوں اور پہاڑی علاقوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ تاہم، جب احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے مغل اقتدار کو متزلزل کیا، تو سکھوں کے لیے سیاسی ابھار کا ایک نادر موقع فراہم ہوا۔ سکھوں نے اپنے پوشیدہ ٹھکانوں سے نکل کر منظم سرگرمیوں کا آغاز کیا اور تیزی سے اپنی قوت کو مجتمع کرنے لگے۔

اسی دوران، جسا سنگھ اہلووالیا کی قیادت میں سکھوں نے مغل عہدیدار ادینہ بیگ خان کو شکست دے کر امرتسر پر قبضہ کیا۔ یہاں انھیں اکال تخت جیسی علامتی و روحانی مرکزیت حاصل ہوئی، اور سکھوں نے باقاعدہ ایک قومی عسکری تنظیم کی بنیاد رکھی۔ جسا سنگھ کو سکھ افواج کا سربراہ منتخب کیا گیا، اور سکھوں کو گیارہ (کچھ لوگوں نے انھیں بارہ بھی لکھا ہے) مختلف گروپوں (مسلس) میں تقسیم کیا گیا، جن کی قیادت نامور سکھ رہنماؤں نے سنبھالی۔ یہ پیش رفت سکھ تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز تھی، جس نے ان کی قومی حیثیت، عسکری طاقت اور سیاسی بصیرت کو ایک منظم ڈھانچے میں ڈھال دیا۔

اس سیاسی و عسکری تبدیلی کے پس منظر کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس دور کے عمومی سیاسی منظرنامے پر بھی نظر ڈالیں۔ عالمگیر کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت میں چودہ بادشاہ یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے، جن میں سے بعض کی بادشاہت محض چند روزہ تھی۔ اقتدار کے اس عدمِ استحکام نے نہ صرف انتظامی انتشار کو جنم دیا بلکہ بیرونی حملوں اور اندرونی بغاوتوں کی راہ بھی ہموار

کی۔ جب کوئی مستحکم مرکزی حکومت موجود نہ ہو، بیرونی حملہ آور طاقتور ہوں، اور داخلی عناصر بھی خودمختاری کے لیے سرگرم ہوں، تو سلطنت کا انہدام ناگزیر ہوجاتا ہے۔

ڈھائی پھٹ: سکھوں کی وہ جنگی حکمتِ عملی جس نے نادرشاہ کو پریشان کر دیا: 1739ء میں ایرانی حکمران نادرشاہ کے حملے نے ہندوستان، بالخصوص مغل دارالحکومت دہلی، کو تہ و بالا کر دیا۔ اس خونریز یلغار کے اثرات پورے برصغیر میں محسوس کیے گئے، جن میں پنجاب بھی شامل تھا۔ نادر شاہ کی اس بربریت نے نہ صرف دہلی کو قتل و غارت اور لوٹ مار کا مرکز بنایا بلکہ اس کے نتیجے میں مغلیہ سلطنت کا عملی زوال اور سیاسی انتشار بھی نمایاں ہوا۔

اس حملے کے تناظر میں پنجاب میں حکومتی نظم و نسق برائے نام رہ گیا تھا۔ معروف مورخ ہری رام گپتا اپنی کتاب *History of the Sikhs* (Volume I) میں لکھتے ہیں کہ نادرشاہ کے حملے کے وقت پنجاب، سرہند اور دیگر شمالی ہندوستانی علاقوں میں مغلیہ اقتدار محض ایک رسمی وجود رکھتا تھا۔ انتظامی اعتبار سے ان علاقوں میں عملاً کوئی مرکزی اختیار باقی نہ رہا تھا۔ اس سیاسی خلا اور انتشار سے سکھوں نے فہم و فراست سے فائدہ اٹھایا۔ نواب کپور سنگھ، جسا سنگھ اہلووالیہ اور دیگر سکھ رہنماؤں نے نادرشاہ کے واپسی قافلے پر حکمتِ عملی سے حملے کیے۔ یہ حملے، جو گرمیوں میں نادر شاہ کی سیالکوٹ کے راستے واپسی کے دوران کیے گئے، ایک منظم مزاحمتی سرگرمی کے مظہر تھے۔

ڈاکٹر گنڈا سنگھ اپنی تحقیقی تصنیف جسا سنگھ اہلووالیہ میں رقم کرتے ہیں کہ نادرشاہ کا سیالکوٹ کی پہاڑی گزرگاہوں سے واپسی کا فیصلہ اس کے لیے مہنگا ثابت ہوا۔ ان پہاڑی علاقوں میں چھپے سکھوں نے قافلے پر متعدد حملے کیے، جن سے نادرشاہ کو جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑا۔ ان حملوں کا مقصد لوٹے گئے خزانے کی واپسی اور قیدی بنائی گئی خواتین کی آزادی تھا۔ بعض روایات کے مطابق، سکھوں نے تقریباً 2200 خواتین کو آزاد کرایا۔

پروفیسر اندو بنگا کے مطابق، سکھوں نے ''ڈھائی پھٹ'' کہلانے والی جنگی حکمتِ عملی اپنائی، جو چھاپہ مار (گوریلا) طرز پر مبنی تھی۔ اس میں سکھ جنگجو چھوٹے گروہوں کی صورت میں قافلے کے کسی کمزور حصے پر حملہ کرتے اور جوابی کارروائی سے قبل پہاڑیوں میں غائب ہوجاتے۔ قاضی نور

محمد نے اپنی تصنیف جنگ نامہ میں بھی اس حکمتِ عملی کا ذکر کیا ہے۔

نادر شاہ اور لاہور کے گورنر زکریا خان کے درمیان ہونے والی ایک مشہور گفتگو تاریخ میں محفوظ ہے، جس میں نادر شاہ نے سکھ حملہ آوروں کے بارے میں پوچھا تو زکریا خان نے انھیں ''ہندو فقیر'' کہہ کر ان کے مقامِ سکونت کے بارے میں کہا:

''ان کے گھران کے گھوڑوں کی پیٹھ پر ہیں۔''

نادر شاہ نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

''پھر وہ وقت دور نہیں جب یہ لوگ اس ملک کے حاکم بن جائیں گے۔''

سکھوں پر ظلم اور ان کی مزاحمتی قوت کا ارتقاء

1714ء سے 1753ء کے درمیان سکھوں پر بار بار ریاستی جبر اور قتلِ عام کیا گیا۔ اس وقت کے مغلیہ اور بعد ازاں ابدالی گورنروں کی یہ سرکاری پالیسی تھی کہ ''کوئی سکھ زندہ نہ بچے''۔ دہلی دربار اس پالیسی کو روکنے میں مکمل طور پر ناکام رہا۔ اس پس منظر میں احمد شاہ ابدالی کے حملے شروع ہوئے، جن کا پہلا حملہ 1748ء میں اور آخری 1765ء میں ہوا۔

1762ء میں ابدالی نے سکھوں پر جو حملہ کیا، وہ تاریخ میں وڈا گھلوگھارا (عظیم قتلِ عام) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، جس میں ایک ہی دن میں تقریباً 35 ہزار سکھوں کو قتل کیا گیا۔ مگر اسی سال اکتوبر میں سکھوں نے بھرپور جوابی کارروائی کرتے ہوئے احمد شاہ ابدالی کی فوج پر حملہ کیا، جس سے وہ حیران و پریشان ہو گیا۔ 1765ء میں سکھوں نے لاہور کو افغان قبضے سے آزاد کرایا۔ اگرچہ افغانوں نے کئی بار لاہور کو واپس لینے کی کوشش کی، مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ اس وقت تک سکھ پنجاب کی ایک طاقتور سیاسی و عسکری قوت بن چکے تھے۔ نریندر پال سنگھ کے مطابق، سکھوں نے 1765ء تک بے شمار جنگیں لڑیں، جن کے بعد وہ نہ صرف پنجاب بلکہ برصغیر کے دیگر علاقوں میں بھی ایک منفرد شناخت کے حامل بنے۔

میں نے جو جانا، اس کے مطابق سکھوں کی مغل اور ابدالی افواج کے خلاف مزاحمتی جدوجہد کا تاریخی مطالعہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ یہ معرکہ ایک طرف منظم و باقاعدہ ریاستی افواج

اور دوسری طرف غیر منظم مگر پُرعزم مزاحمتی قوتوں کے درمیان تھا۔ مغلیہ اور ابدالی افواج میدانِ جنگ میں روایتی جنگی اصولوں کے تحت فیصلہ کن معرکوں کی خواہاں تھیں، جبکہ سکھوں نے عمومی طور پر روایتی جنگ سے اجتناب کرتے ہوئے گوریلا جنگی حکمتِ عملی کو اختیار کیا۔ سوائے چند مواقع کے، جن میں وڈا گھلوگھارا جیسا عظیم سانحہ شامل ہے، سکھوں نے چھوٹے چھوٹے گروہوں کی صورت میں اچانک حملے اور فوری انخلاء کی پالیسی اپنائی، جو اکثر مؤثر اور کامیاب ثابت ہوئی۔ یہ حکمتِ عملی نہ صرف ان کے محدود وسائل کا بہترین استعمال تھی بلکہ طاقتور حملہ آور افواج کو مستقل دباؤ میں رکھنے کا ذریعہ بھی بنی۔

لاہور کی تاریخ میں پہلا معروف گورنر ملک ایاز تھا، جسے تقریباً 1036ء میں اس منصب پر فائز کیا گیا۔[1] اس کے بعد 1765ء تک (یعنی تقریباً سات صدیوں پر محیط 729 سالہ عرصے میں)، سوائے ایک مختصر وقفے کے جب مراٹھے عارضی طور پر لاہور پر قابض ہوئے، کوئی بھی مقامی مسلمان، ہندو یا سکھ فرد لاہور کا گورنر نہ بن سکا۔ اس طویل عرصے میں، برصغیر پر افغانستان، وسط ایشیا، چین اور ایران کی سمت سے جو حملہ آور آتے رہے، ان کے خلاف مزاحمت کی ذمہ داری مقامی عوام یا کسانوں کی بجائے اس وقت کے سیاسی حکمرانوں پر عائد ہوتی تھی۔ اگر ان حملہ آوروں کو روکا نہ جا سکا، تو اس کی براہِ راست ذمہ داری انھی غیر مقامی حکمرانوں پر عائد ہوتی ہے جنھوں نے برصغیر پر حکومت کی۔

تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ ان حملہ آور افواج میں بڑی تعداد افغان جنگجوؤں کی ہوتی تھی، جن کا بنیادی مقصد ہندوستان کے وسائل اور دولت پر قبضہ کرنا تھا۔ دستیاب تاریخی ذرائع کے مطابق، ان افواج میں مقامی پنجابی افراد نے بطور باقاعدہ سپاہی شمولیت اختیار نہیں کی۔ اس

---

[1] سلطان محمود غزنوی کا محبوب غلام اور مشیر۔ پورا نام ابوالنجم ایاز۔ باوجود قرب سلطانی کے اس کی زندگی بڑی سادہ اور کفایت شعارانہ تھی۔ وہ قرب سلطانی سے بیشتر کا مفلسانہ لباس بطور یادگار اپنے پاس صندوق میں محفوظ رکھتا، جب کبھی اس یادگار کو ملاحظہ کرتا تو ایاز قدر خود بہ شناس کہتا، یعنی ایاز، تو اپنی ماضی کی حیثیت کو بھول نہ جانا۔ مؤرخین کا خیال ہے کہ وزیر آباد کے قریب سوہدرہ کا قصبہ اسی آیاز نے آباد کیا تھا۔ 1036 کے لگ بھگ لاہور کا صوبیدار مقرر ہوا اور یہیں وفات پائی۔ اس کا مزار چوک رنگ محل میں ہے۔

کے برعکس، بعض اوقات مقامی حکمرانوں نے حملہ آوروں کے خلاف مزاحمت کی، جیسا کہ محمود غزنوی کی برصغیر پر پہلی یلغار کے موقع پر ایک مقامی پنجابی حکمران نے مزاحمت کی تھی۔ بعدازاں احمد شاہ ابدالی کی آخری مہم کے دوران، سکھوں نے فیصلہ کن جنگیں لڑیں۔ سکھ بھی اسی دھرتی کے سپوت تھے۔ وہ ہر لحاظ سے پنجابی تھے۔ یہ سب دیکھ کر کیسے کوئی کہہ سکتا ہے کہ۔ پنجابیوں نے حملہ آوروں کے خلاف مزاحمت نہیں کی؟

اس طویل عرصے میں کئی مواقع پر مقامی آبادی نے بھی حملہ آوروں کی پیش قدمی کے خلاف مزاحمت کی، جن میں ہندو اور سکھ خاص طور پر پیش پیش رہے۔ بعض تاریخی روایات کے مطابق، برصغیر کے بعض مسلمان حکمرانوں اور گروہوں نے مذہبی یا سیاسی ہمدردی کے تحت ان حملہ آوروں کا ساتھ بھی دیا۔ البتہ یہ بھی تاریخی ریکارڈ کا حصہ ہے کہ بعض مقامی مسلمان شخصیات، جیسا کہ دلا بھٹی، ان حملہ آوروں کے خلاف نبرد آزما ہوئیں۔ معروف صوفی شاعر وارث شاہ کی تحریروں میں بھی ان حملہ آوروں کے خلاف تنقیدی لہجہ پایا جاتا ہے، جو اس دور کے عوامی جذبات کی نمائندگی کرتا ہے۔

یہ سب جان کر کہا جا سکتا ہے کہ نادر شاہ اور اس کے بعد احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے پنجاب کو جنگ و جدل، معاشی تباہی اور انسانی المیوں کا شکار بنایا۔ لیکن انھی حملوں کے دوران سکھوں کی مزاحمتی قوت، جنگی حکمت عملی اور قیادت نے انھیں ایک ابھرتی ہوئی سیاسی و عسکری طاقت میں تبدیل کر دیا۔ سکھوں کا یہ کردار صرف بقا کی جنگ نہ تھا بلکہ ایک ایسی جدوجہد تھی جس کے نتیجے میں 1765ء کے بعد سکھ اقتدار کا آغاز ہوا، جس نے مغلیہ اور ابدالی تسلط کا خاتمہ کر کے پنجاب کو ایک نئے تاریخی موڑ سے روشناس کرایا۔

سکھوں کی مزاحمتی تاریخ میں نامور سکھ سردار

اس کتاب کے موجودہ حصے میں اُن ممتاز سکھ رہنماؤں کا تذکرہ ناگزیر ہے جنھوں نے سکھ مزاحمتی تحریک کی قیادت کی اور اس کے نظریاتی و عسکری خدوخال متعین کیے۔ ان قائدین کی مدبرانہ قیادت اور بے مثال قربانیوں کے نتیجے میں سکھ برادری، جو کبھی ایک مظلوم اور منتشر قوم تھی،

ایک منظم، نا قابلِ شکست اور فعال عسکری قوت میں تبدیل ہوگئی۔ یہی وہ قیادت تھی جس نے اُس دور کی دو بڑی سیاسی و عسکری طاقتوں مغلیہ سلطنت اور درانی سلطنت (افغانوں) کو مؤثر طور پر چیلنج کیا۔ انھی کوششوں نے بالآخر سکھ قوم کے لیے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی صورت میں ایک مضبوط اور متحد سیاسی اکائی، یعنی سکھ سلطنت، کے قیام کی بنیاد فراہم کی، جو برصغیر کی تاریخ میں ایک اہم سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ جن شخصیات کو ایک گروہ اپنے ہیروز کے طور پر یاد کرتا ہے، انھیں دوسرا گروہ مخالف یا دشمن کے طور پر دیکھتا ہے۔ سکھ برادری جن افراد کو قومی ہیروز کے طور پر یاد رکھتی ہے، وہی افراد اکثر مسلم تاریخی بیانیے میں مخالف کرداروں کے طور پر پیش کیے گئے ہیں۔ اس طرح ہر گروہ نے اپنے اپنے ہیروز کو تاریخ میں مثالی حیثیت دی اور ان کی یاد کو عقیدت و افتخار سے زندہ رکھا۔ یہی متضاد بیانیے اور تاریخی تناظرات وہ گہری خلیج بن گئے جنھوں نے بالآخر پنجاب کی تقسیم کی نظریاتی بنیاد فراہم کی۔ یہ خلیج 1947ء کے دوران ہونے والی تقسیمِ ہند میں تقریباً بیس لاکھ سکھوں، ہندوؤں اور مسلمانوں کی ہولناک اور بے گناہ اموات کا سبب بنی، جو انسانی تاریخ کا ایک المناک باب ہے۔

یہ ایک ذاتی تجزیہ ہے، جس کی درستی کا دعویٰ نہیں کیا جا رہا، تاہم یہ کوشش ضرور ہے کہ ماضی کے پیچیدہ تاریخی عوامل کو سمجھنے اور بیان کرنے کی سعی کی جائے۔

سکھوں کی مزاحمتی تاریخ میں چند اہم سرداروں کا کردار

یہ نکتہ بھی تاریخی لحاظ سے خاصی اہمیت رکھتا ہے کہ 1765ء سے 1799ء تک سکھوں کو متعدد مواقع پر اپنی ریاستی حیثیت سے دستبردار ہونا پڑا۔ احمد شاہ ابدالی کے جانشین مسلسل لاہور پر حملہ آور ہوتے رہے، جس کے نتیجے میں سکھوں کو بارہا سیاسی و عسکری چیلنجز کا سامنا کرنا پڑا۔ اس پورے عرصے کی جنگوں اور مزاحمتی کوششوں کا مطالعہ یقیناً تاریخ اور سیاست سے دلچسپی رکھنے والے قارئین کے لیے باعثِ توجہ ہوگا۔

جتنا میں سمجھ سکا ہوں، اُس کے مطابق، سوائے ایک بڑے واقعے کے جسے عرفِ عام میں ''وڈا گھلوگھارا'' کہا جاتا ہے اور جس میں تیس ہزار سے زائد سکھ مارے گئے اس دور کی سکھ مزاحمت میں کئی نمایاں شخصیات نے غیر معمولی کردار ادا کیا۔ ان میں سرفہرست سردار جسا سنگھ اہلوو الیا کا نام آتا ہے۔ ان کے علاوہ بھی کئی سکھ سرداروں نے اہم کارنامے سرانجام دیے۔ ان میں سے چند افراد کا ایک مختصر تعارف پیشِ خدمت ہے۔

سکھوں کی مزاحمتی تاریخ میں جسا سنگھ اہلوو الیا کا کردار: سردار جسا سنگھ اہلوو الیا اٹھارہویں صدی کے وہ ممتاز سکھ رہنما تھے جنھوں نے سکھ قوم کی سیاسی اور عسکری تنظیمِ نو میں مرکزی کردار ادا کیا۔ وہ سکھ میسلز میں سے ایک معروف عسکری اتحاد ''اہلوو الیا مِسل'' کے بانی تھے (اسے کئی لوگوں نے مسل بھی لکھا ہے) اور انھیں سکھ تاریخ میں ''سلطان القوم'' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کی تربیت خالصہ روایت اور عسکری نظم و ضبط کے تحت ہوئی، جبکہ نواب کپور سنگھ جیسے بزرگ سکھ رہنماؤں نے ان کی فکری و عملی رہنمائی کی۔ جسا سنگھ اہلوو الیا محض ایک سپہ سالار نہ تھے بلکہ وہ سکھوں کی اجتماعی مزاحمت کے علامتی رہنما کے طور پر ابھرے۔

1739ء میں جب نادر شاہ دہلی کو تاراج کر کے واپس لوٹ رہا تھا، تو جسا سنگھ اہلووالیا اور نواب کپور سنگھ نے اس کے قافلے پر حملہ کر کے اغوا شدہ خواتین کو رہا کرایا اور لوٹی گئی عوامی دولت کو واپس تقسیم کیا۔ یہ واقعہ سکھوں کی گوریلا حکمتِ عملی اور عوام دوستی کی بہترین مثال سمجھا جاتا ہے۔

بعدازاں، احمد شاہ ابدالی کے مسلسل حملوں کے دوران، جسا سنگھ نے سکھ مزاحمت کی قیادت سنبھالی۔ ان کی قیادت میں 1765ء میں سکھ افواج نے لاہور پر قبضہ کیا، جو پنجاب کی سیاسی تاریخ کا ایک فیصلہ کن لمحہ تھا۔ اسی تسلسل میں، 1783ء میں جسا سنگھ اہلووالیا نے دیگر سکھ سرداروں کے ہمراہ دہلی کی جانب پیش قدمی کی اور لال قلعے پر سکھ پرچم بلند کیا۔

یہ وہی دہلی تھی جس پر تقریباً ساڑھے پانچ سو سال قبل سلطان معزالدین غوری کے بعد مسلمانوں نے تسلط قائم کیا تھا، اور اب تاریخ نے یہ نظارہ دیکھا کہ سکھ اقتدار نے بھی وہاں اپنی علامتی موجودگی درج کروائی۔ یہ واقعہ اس حقیقت کی نشان دہی کرتا ہے کہ مغل سلطنت، بظاہر قائم ہونے کے باوجود، عملاً زوال پذیر ہو چکی تھی۔

شہید بابا دیپ سنگھ جی

شہید بابا دیپ سنگھ جی (1682-1757): سکھ تاریخ میں قربانی، مزاحمت اور روحانی استقامت کی علامت۔

مینور سنگھ کے ایک تحقیقی مضمون کے مطابق، شہید بابا دیپ سنگھ جی سکھ قوم کے اُن نمایاں مجاہدوں میں سے ہیں جنھوں نے اٹھارہویں صدی میں مغلیہ ظلم اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں کے خلاف سکھ مزاحمت کی قیادت میں کلیدی کردار ادا کیا۔ یاد رہے کہ شہید ان کے نام کا حصہ ہے جو سکھ کتابوں میں لکھا ملتا ہے۔ وہ نہ صرف ایک ماہر سپاہی تھے بلکہ ایک جید سکھ دھرم کے عالم بھی تھے، جنھوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ سکھ تعلیمات کی خدمت اور دفاع کے لیے وقف کیا۔ ذیل میں اس مضمون کا خلاصہ پیشِ خدمت ہے۔ [1]

[1] https//:www.sikhnet.com/news/life-baba-deep-singh-ji

مینور سنگھ لکھتے ہیں کہ بابا دیپ سنگھ جی کا بچپن دسویں سکھ گرو، گرو گوبند سنگھ جی کی صحبت میں گزرا۔ انھوں نے گرمکھی، گربانی کے علاوہ کئی دیگر زبانوں میں بھی مہارت حاصل کی۔ اس کے ساتھ ساتھ انھیں گھڑسواری، ہتھیاروں کے استعمال اور مارشل آرٹس کی بھی باقاعدہ تربیت دی گئی۔ 1709ء میں انھوں نے بابا بندہ سنگھ بہادر کے ساتھ مغل اور ابدالی حکمرانوں کے خلاف جنگ میں شرکت کی، اور بعدازاں انھیں دل خالصہ کے ایک جتھے کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ 1748ء میں جب دل خالصہ کی تنظیمِ نو ہوئی، تو انھیں ''شہیداں دی مِسل'' کی قیادت سونپی گئی۔

اپریل 1757ء میں، احمد شاہ ابدالی کی دہلی سے واپسی کے دوران، بابا دیپ سنگھ جی نے ایک مؤثر کارروائی کرتے ہوئے قیدیوں کو آزاد کرایا اور لوٹا گیا مال واپس لینے میں کامیابی حاصل کی۔ تاہم، جب ابدالی کے بیٹے تیمور شاہ کی جانب سے سری ہرمندر صاحب (گولڈن ٹیمپل) کی بے حرمتی کی خبر ملی، تو بابا دیپ سنگھ جی نے اعلان کیا: ''اس برس دیوالی ہم امرتسر میں منائیں گے۔'' اس موقع پر انھوں نے ترن تارن کے مقام پر مٹی میں ایک لکیر کھینچ کر صرف اُن افراد کو ساتھ آنے کی دعوت دی جو موت کے لیے تیار تھے۔

11 نومبر 1757ء کو گوہلواڑ کے قریب ایک شدید معرکہ ہوا، جس میں بابا دیپ سنگھ جی نے اپنی جان قربان کر دی۔ آج بابا دیپ سنگھ جی کو سکھ تاریخ کا ایک مقدس اور لازوال کردار مانا جاتا ہے، جن کی یاد کو مختلف تاریخی و روحانی مقامات پر زندہ رکھا گیا ہے۔ سری ہرمندر صاحب کمپلیکس میں واقع گوردوارہ اُس مقام پر قائم ہے جہاں ان کا سر گرا تھا۔ شہید گنج بابا دیپ سنگھ جی گوردوارہ، جو اُن کے کریا کرم کی جگہ کے طور پر معروف ہے، ایک اہم یادگار ہے۔ اکال تخت صاحب میں اُن کی استعمال کردہ دو دھاری تلوار (کھنڈا) محفوظ ہے، جو اُن کی روحانی اور عسکری عظمت کی علامت ہے۔ برج بابا دیپ سنگھ، تخت سری دمدمہ صاحب کے قریب واقع ایک یادگاری مینار، ان کی عظمت کا ایک اور اظہار ہے۔

سکھوں کے نزدیک بابا دیپ سنگھ جی کی شخصیت بہادری، روحانیت اور قربانی کا استعارہ بن چکی ہے۔ ان کی زندگی نہ صرف تاریخی اہمیت رکھتی ہے بلکہ آج بھی حق، حریت اور ایمان کی راہ

پر چلنے والوں کے لیے ایک ہمہ گیر الہام کا ذریعہ ہے۔

سردار چرت سنگھ: مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دادا

سردار چرت سنگھ کی تاریخی اہمیت کے حوالے سے معروف مورخ خوشونت سنگھ نے ایک مفصل مضمون تحریر کیا ہے، جس میں ان کی زندگی، عسکری خدمات اور سکھ تاریخ میں ان کے کردار کو وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ اس مضمون کی بنیاد پر سردار چرت سنگھ کی شخصیت کا جو خاکہ سامنے آتا ہے، وہ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

امجد وڑائچ نے اپنی کتاب پنجاب کٹھرے میں کئی حوالوں سے یہ بات ثابت کی ہے کہ سردار چرت سنگھ وڑائچ جاٹ تھا اور اس کا تعلق ضلع گوجرانوالہ کے ایک نواحی گاؤں سکر چک سے تھا۔ اسی نسبت سے انھوں نے اپنی عسکری تنظیم یا جتھے کو، جو سکھ سیاق میں ''مِسل'' کہلاتی ہے، ''سکر چکیہ مِسل'' کا نام دیا۔ ''مِسل'' دراصل عربی و فارسی زبان کا لفظ ہے، جس کے لغوی معنی جماعت یا گروہ کے ہیں۔ اٹھارہویں صدی میں یہ مِسل سکھ مزاحمتی تحریک کا ایک فعال اور مؤثر دھڑا شمار ہوتی تھی۔

چرت سنگھ نے جوانی ہی میں عسکری سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کیا اور اپنے والد کے ساتھ مختلف فوجی مہمات میں شریک رہے۔ والد کی وفات کے بعد، انھوں نے تقریباً 150 گھڑ سواروں کے ساتھ سنگھپوریہ مِسل سے علیحدگی اختیار کی اور سکر چکیہ مِسل کی بنیاد رکھی۔ ان کی قیادت میں یہ مِسل گوجرانوالہ اور گردونواح کے علاقوں میں ایک بااثر قوت بن کر ابھری۔

چرت سنگھ کو سب سے زیادہ شہرت احمد شاہ ابدالی کے خلاف مزاحمت کے ضمن میں حاصل ہوئی۔ 1761ء میں پانی پت کی تیسری جنگ کے بعد، جب ابدالی نے اپنے جنرل نورالدین کو پنجاب میں سکھوں کے خاتمے کے لیے بھیجا، تو چرت سنگھ نے دیگر سکھ سرداروں کے ساتھ مل کر شدید مزاحمت کی اور اسے شکست دی۔ سیالکوٹ کا محاصرہ اس جدوجہد کا ایک یادگار واقعہ ہے، جہاں نورالدین کو بھیس بدل کر فرار ہونا پڑا۔

چڑت سنگھ کی فوجی سرگرمیوں سے متعلق کئی دلچسپ واقعات سامنے آتے ہیں۔ انھوں نے سب سے پہلے ایمن آباد پر حملہ کیا، جہاں مقامی فوجدار کو قتل کر کے شہر پر قبضہ کیا اور کثیر مقدار میں مالِ غنیمت حاصل کیا۔ اس کے بعد انھوں نے وزیر آباد پر بھی کامیابی سے قبضہ کیا۔ ان کی عسکری زندگی کا سب سے نمایاں کارنامہ سیالکوٹ کی جنگ میں فتح ہے، جہاں اگست 1761ء میں احمد شاہ ابدالی کے مقرر کردہ جنرل نورالدین بمیزات کی فوج کا محاصرہ کیا گیا۔

محاصرے کے دوران چڑت سنگھ کی قیادت اور حکمت عملی نے دشمن افواج کو سخت دباؤ میں ڈال دیا، حتیٰ کہ نورالدین کو سادہ لباس میں فرار ہونا پڑا۔ اس فتح کے بعد سردار چڑت سنگھ کو لاہور کے افغان گورنر، خواجہ عبید خان کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا، جس نے گوجرانوالہ پر چڑھائی کی اور شہر کا محاصرہ کیا۔ تاہم، چڑت سنگھ نے رات کے وقت چھاپہ مار حملوں کے ذریعے دشمن کو حیران کر دیا، جس سے محاصرہ کنندگان کی صفوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ اس موقع پر جسا سنگھ آلووالیا کی قیادت میں دیگر سکھ سردار بھی چڑت سنگھ کی مدد کو پہنچے، جس کے نتیجے میں افغان افواج کو نہ صرف پسپائی اختیار کرنا پڑی بلکہ وہ اپنا توپ خانہ، اسلحہ اور رسد چھوڑ کر فرار ہو گئیں۔

سردار چڑت سنگھ کی عسکری بصیرت کا ایک اور اہم مظاہرہ 5 فروری 1762ء کے سانحۂ وڈا گھلوگھارا (عظیم قتلِ عام) کے دوران دیکھنے کو ملا، جب سکھ احمد شاہ ابدالی کی افواج کے خلاف شدید جنگ میں مصروف تھے۔ اس موقع پر بھی چڑت سنگھ نے غیر معمولی بہادری، ثابت قدمی اور جنگی حکمتِ عملی کا مظاہرہ کیا، جو سکھ قوم کی بقا اور خودداری کی علامت بن گیا۔

چڑت سنگھ کی وفات 1774ء میں ایک حادثاتی دھماکے کے نتیجے میں جموں میں ہوئی، جہاں وہ رنجیت دیو کے خلاف ایک مہم کے دوران برج راج دیو کی حمایت کر رہے تھے۔ ان کی وفات نے اگرچہ ان کی براہِ راست قیادت کا خاتمہ کیا، لیکن ان کے قائم کردہ عسکری و سیاسی ڈھانچے پر ان کے بیٹے مہان سنگھ اور پوتے مہاراجہ رنجیت سنگھ نے سکھ سلطنت کی بنیاد رکھی۔ سردار چڑت سنگھ کو سکھ تاریخ میں ایک اہم عسکری اور سیاسی شخصیت کے طور پر یاد کیا جاتا ہے، جنھوں نے سکھ خودمختاری کی راہ ہموار کی اور اپنی جرات مندانہ قیادت سے آنے والی نسلوں کے لیے ایک مثالی

کردار قائم کیا۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ چڑت سنگھ کی سمادھی گوجرانوالہ کے قریب واقع تھی، مگر 1947ء کے بعد ہجرت، سیاسی حالات اور عدم توجہی کے باعث وہ یادگار باقی نہ رہ سکی یا غیر واضح ہو چکی ہے۔ اب شاید اس کا کوئی نشان باقی نہیں رہا۔

خوشونت سنگھ کے بقول:

''چڑت سنگھ، بندہ سنگھ بہادر کے بعد کے دور کے سب سے قابل عسکری رہنماؤں میں سے تھے۔ ان کی قیادت نے ان کے پوتے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عروج کی بنیاد رکھی۔ افغان حملوں کے دوران ان کی جرات مثالی تھی۔''

نواب کپور سنگھ جو کبھی بندہ سنگھ بہادر کے رفقاء میں شامل تھا

نواب کپور سنگھ کے بارے تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ وہ اپنی ابتدائی زندگی میں بندہ سنگھ کے ساتھیوں میں بھی شامل تھا۔ وہ ایک نڈر اور بہادر سردار تھا اور طویل قامت اور مضبوط جثے کا مالک تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ عقل منداور سمجھدار بھی تھا۔ اس نے بچپن میں ہی ہتھیاروں کا استعمال جس میں تلوار، نیزہ، تیر اور بندوق شامل تھے سیکھ لیا تھا۔ یہی وہ دور تھا جب زکریا خان اپنے والد عبدالصمد خان کی جگہ 1726ء میں پنجاب کی گورنری پر فائز ہوئے اور 1745 تک اس عہدے پر رہے۔ اسی کے دور کا ایک اہم واقعہ ہے جب 1726ء میں گاؤں وان کے جاٹ سردار تارا سنگھ کو اس کے 22 ساتھیوں سمیت مغل گورنر کے 2200 گھڑسواروں کے ایک دستے قتل کر دیا تھا۔ اس واقعے کے بعد وسطی پنجاب کے سکھوں میں مغلوں کے خلاف نفرت میں بے حد اضافہ ہوا اور حکومت سے انتقام لینے کا عزم کیا۔

اس واقعے کے بعد کپور سنگھ، جو اس سانحے پر بہت غمزدہ تھا نے جنگ کرنے کا فیصلہ کیا اور بہت سے جوانوں کے ساتھ ملا کر ایک طاقتور گروہ ترتیب دیا۔ اس نے اس دور میں سکھوں کی کئی مواقع پر رہنمائی کی اور وہ ایک قابل منتظم اور ایک کامیاب اور قابل رہنما کے طور پر جانا جانے لگا۔ اس نے پرگنہ ہیڈ کوارٹر سے لاہور کے صوبائی خزانے میں لے جانے والے محصولات کو بھی

لوٹا۔ مغل حکومت اور سکھوں کے درمیان کئی بار شدید تصادم بھی ہوا جس کے نتیجے میں بھاری جانی نقصان ہوتا تھا۔ ریاست کی طرف سے ظلم وستم اور سکھوں کی طرف سے انتقام کا سلسلہ کچھ سالوں تک جاری رہا یہاں تک کہ حکومت نے ان سے نمٹنے کا یہ طریقہ کارگر پایا۔ پھر حکومت نے انھیں راضی کرنے کی کوشش کی۔ 1733ء میں پنجاب کے گورنر زکریا خان نے ایک تجویز پیش کی۔ یہ ایک طرح کا امن معاہدہ تھا۔ یاد رہے کہ اس وقت کی بات ہے جب ابھی نادر شاہ نے حملہ نہیں کیا تھا۔ مغل سلطنت اس وقت تک کافی مضبوط تھی۔

پنجاب کے گورنر زکریا خان نے 1733ء مغل بادشاہ سے کہا وہ سکھوں کو ایک گرانقدر رقم دی جائے۔ بادشاہ نے اس تجویز کی تائید کی تھی۔ سوبیگ سنگھ، ایک سرکاری ٹھیکیدار اور سرکاری دفتر میں فارسی جاننے والے ایک کلرک کو زکریا خان نے سکھوں سے مذاکرات کے لیے تعینات کیا تھا۔ اس نے اکال تخت پر اکٹھے ہوئے سکھوں سے ملاقات کی اور انھیں حکومت کی طرف سے ''نواب'' کی پیشکش کی، ساتھ ہی ایک جاگیر بھی دی، جس میں دیپالپور، کنگنوال اور جھبل کے پرگنوں پر مشتمل تھا، جس کی کل سالانہ آمدنی تقریباً ایک لاکھ روپے تھی۔ سکھوں نے یہ تجویز قبول کر لی۔ پہلے یہ پیشکش دیوان دربارا سنگھ کو کی گئی تھی جو سکھوں کے ایک ممتاز رہنما تھے، انھوں نے یہ کہہ کر یہ پیشکش ٹھکرا دی،

''ہمارے لیے کیا نوابی ہے جس کا گرو نے بادشاہی کا وعدہ کیا ہے؟ گرو کا کلام پورا ہونا چاہیے۔ خالصہ، جس کا مطلب آزادانہ طور پر حکومت کرنا ہے، ماتحت عہدہ قبول نہیں کر سکتا۔''

اس پیشکش کو کئی دوسرے سکھوں نے بھی ٹھکرا دیا۔ اس سے لگتا ہے کہ کوئی بھی یہ آفر قبول کرنے کے حق میں نہیں تھا۔ لیکن سکھ انکار بھی کرنا نہیں چاہتے تھے۔ آخر کار کپور سنگھ فیض اللہ پوریا کو اس اعزاز کے لیے منتخب کیا گیا۔ اس نے اسے تب ہی قبول کیا جب اسے 1733ء میں خالصہ کے پانچ ارکان کے پیروں کے چھونے سے پاک کیا گیا تھا۔

یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے، جو یاد رکھنے کے قابل ہے۔

جسّا سنگھ رام گڑھیا (1803-1723ء): سکھ مزاحمت، ریاست سازی اور قیادت کا

درخشاں باب۔

جسّا سنگھ رام گڑھیا (1723-1803) اٹھارہویں صدی کے ممتاز سکھ رہنما اور رام گڑھیا مِسل کے بانی تھے، جنھیں پنجاب کی سیاسی، عسکری، اور ثقافتی تاریخ میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ ان پر ایک تفصیلی مضمون محترمہ چرنجیت اجیت سنگھ نے *Singh Bahadur Sardar Jassa Singh Ramgarhia 1723-1803* کے عنوان سے تحریر کیا، جب کہ پرتھ پال سنگھ کپور نے ان کی حیات و خدمات پر ایک مکمل کتاب *A Heroic Jassa Singh Ramgarhia Figure of the Eighteenth Century* تصنیف کی۔

یہاں میں ایک وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ کافی عرصہ قبل لوگ اپنے نام کے ساتھ اپنے گاؤں یا علاقے کا نام لکھتے تھے۔ جیسے لاہوری، قصوری، سرہندی، دہلوی، لکھنوی وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح سکھوں نے بھی اپنے نام کے ساتھ پانے گاؤں یا علاقے کا نام لکھا کرتے تھے۔ رام گڑھیا کا مطلب ہے رام گڑھ کے رہنے والا۔ اسی طرح جسا سنگھ آہلووالیہ کا مطلب ہے آہلووال کا رہنے والا۔

پنجاب کی اٹھارہویں صدی کی تاریخ سیاسی زوال، سماجی افراتفری اور مسلسل جنگ وجدل سے عبارت ہے۔ مغلیہ سلطنت کے زوال، افغان حملوں، اور سکھ طاقت کے ابھار نے اس خطے کو ایک مستقل میدانِ جنگ بنا دیا تھا۔ انھی حالات میں سکھ برادری نے نہ صرف اپنی بقا کی جنگ لڑی بلکہ علاقائی اقتدار کی جانب بھی پیش رفت کی۔ اس جدوجہد کا مقصد صرف سیاسی غلبہ نہیں تھا بلکہ مذہب و ثقافت کا تحفظ بھی اس کے پیشِ نظر تھا۔ تاہم، اس دور میں دونوں جانب سے اخلاقی اور دینی اصولوں کی پامالی کے واقعات بھی تاریخ کا حصہ ہیں۔

جسّا سنگھ رام گڑھیا کی پیدائش 1723ء میں گاؤں اچوگل (ضلع لاہور) میں گیانی بھگوان سنگھ کے ہاں ہوئی۔ ان کے دادا، بھائی ہرداس سنگھ، گرو گوبند سنگھ کے قریبی ساتھیوں میں شمار ہوتے تھے، جنھیں گرو جی نے دعا دی تھی کہ ان کی نسل ایک دن حکومت کرے گی۔ بھائی ہرداس سنگھ اور بعد ازاں گیانی بھگوان سنگھ نے بندہ سنگھ بہادر کے ساتھ مل کر مغلوں کے خلاف متعدد

معرکے سر کیے۔ گیانی بھگوان سنگھ نادر شاہ کے حملے کے دوران شہید ہو گئے، جو ان کے خاندان کی بہادری اور قربانی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔

یہ امر تاریخی طور پر اہم ہے کہ جسّا سنگھ کا خاندان ایک جانب مغل حکومت کے خلاف مزاحمت کرتا رہا، تو دوسری جانب بعض مواقع پر مغلیہ دربار سے وابستہ بھی رہا۔ یہی متنوع سیاسی پس منظر جسّا سنگھ کی عملی حکمت و تدبیر کی بنیاد بنا۔ 1740ء میں دل خالصہ کی منظوری سے جسّا سنگھ کو آدینہ بیگ کے دربار میں بطور سفارتی ایلچی بھیجا گیا۔ ان کی فہم و فراست سے متاثر ہو کر آدینہ بیگ نے ان کی عزت افزائی کی اور جاگیر و فوجی منصب عطا کیا۔ دل خالصہ نے اس فیصلے کو سکھ قوم کے اجتماعی مفاد میں قرار دیا، کیونکہ اس سے سکھوں کو وقتی تحفظ، عسکری تربیت اور سیاسی بصیرت حاصل ہوئی۔ اسی عرصے میں جسّا سنگھ نے جالندھر دوآب میں اپنی انتظامی صلاحیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے امن و امان قائم کیا۔ میر مَنّو کی وفات کے بعد پیدا ہونے والے سیاسی خلا میں، انھوں نے ایک خود مختار ریاست کی بنیاد رکھی اور سکھ اقتدار کو تنظیمی بنیادوں پر استوار کیا۔

1748ء میں جب میر مَنّو نے سکھوں کو پنجاب سے نکالنے کا حکم دیا اور رام رونی قلعے کا محاصرہ کیا، تو جسّا سنگھ نے مغل حکومت سے اپنی وفاداری ترک کر کے قلعے کے دفاع میں سکھوں کا ساتھ دیا۔ ان کی سفارتی حکمت عملی کے نتیجے میں سکھوں کی جانیں محفوظ رہیں اور میر مَنّو سے مالی امداد و اراضی حاصل کی گئی۔ اس واقعے نے ان کی قیادت، فہم و فراست، اور سکھ قوم سے وفاداری کی اعلیٰ مثال قائم کی۔ قلعہ رام رونی کو 'رام گڑھ' کا نام دیا گیا، اور جسّا سنگھ کو اس کا پہلا کمانڈر مقرر کیا گیا۔ اس بستی اور قلعے کی بار بار تعمیر و دفاع کے باعث ان کے پیروکار 'رام گڑھیا' کہلائے، اور یوں رام گڑھیا مِسل کی بنیاد پڑی۔ رام گڑھیا مِسل کے افراد عموماً فنی پیشوں سے وابستہ تھے، جیسے تعمیرات، اسلحہ سازی، اور جنگی فنون، جنھوں نے اس مِسل کو دیگر سکھ مِسلوں کے مقابلے میں ایک منفرد حیثیت عطا کی۔

جب میر مَنّو نے احمد شاہ ابدالی کی اطاعت قبول کرتے ہوئے سکھوں پر مظالم ڈھانے شروع کیے، تو سکھ برادری نے جنگلات اور پہاڑی علاقوں میں پناہ لی۔ جسّا سنگھ نے رام گڑھ قلعے

کو دوبارہ تعمیر کر کے اسے دفاعی مرکز بنا دیا۔ ان کی قیادت میں سکھوں نے احمد شاہ ابدالی کی لوٹ مار کے خلاف بھی موثر مزاحمت کی۔

جسّا سنگھ کی یادگار خدمات میں سب سے نمایاں 'رام گڑھیا برجی' ہے، جو امرتسر میں واقع ہے۔ یہ تین منزلہ عمارت گولڈن ٹیمپل کے نزدیک واقع ہے، اور اس میں تختِ طاؤس کی گرینائٹ سلیب محفوظ ہے، جو مغلیہ اقتدار پر سکھوں کی فتح کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ، امرتسر میں ان کا گھڑسوار مجسمہ نصب ہے، جو ان کی عسکری شجاعت اور تاریخی اہمیت کا مظہر ہے۔

جسّا سنگھ رام گڑھیا کی حیات و خدمات سکھ قوم کے لیے شجاعت، تدبر، اور سیاسی شعور کا روشن باب ہیں۔ ان کی جدوجہد نے نہ صرف ایک عسکری گروہ کو منظم سیاسی قوت میں بدلا بلکہ سکھ ریاست کے قیام کی راہ بھی ہموار کی۔ ان کا کردار آج بھی سکھ تاریخ، مزاحمتی فکر، اور قیادت کے اعلیٰ اصولوں کی علامت کے طور پر زندہ ہے۔ وہ آج بھی سکھ برادری میں بے حد قابلِ احترام سمجھے جاتے ہیں۔

بابا بگھیل سنگھ

بابا بگھیل سنگھ (1730-1802ء) جس نے دہلی پر قبضہ کیا لیکن تخت پر بیٹھنے سے انکار کیا۔

بابا بگھیل سنگھ اٹھارہویں صدی کے اُن ممتاز سکھ رہنماؤں میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے عسکری، سیاسی اور سفارتی میدان میں غیر معمولی بصیرت اور قیادت کا مظاہرہ کیا۔ ان کی زندگی کا مطالعہ صرف سکھ ریاستوں کی توسیع کا احاطہ نہیں کرتا بلکہ برصغیر کے بدلتے ہوئے سیاسی تناظر، مغلیہ زوال اور نوآبادیاتی قوتوں کی آمد کے سیاق و سباق میں ایک منفرد زاویہ فراہم کرتا ہے۔ دہلی پر سکھوں کی پیش قدمی اور بابا بگھیل سنگھ کی قیادت میں اس شہر میں مذہبی و ثقافتی شناخت کے قیام کا عمل ایک غیر معمولی تاریخی واقعہ ہے، جو عسکری طاقت کے ساتھ ساتھ مذہبی رواداری اور سیاسی بصیرت کی علامت بھی ہے۔ یہ مضمون بابا بگھیل سنگھ کی زندگی، کارناموں، مذاکراتی حکمتِ عملی اور ان کے عہد کی بین الاقوامی و علاقائی سیاست کے تناظر میں سکھ اقتدار کے ارتقاء کا ایک علمی تجزیہ

پیش کرتا ہے۔

بابا بگھیل سنگھ پر متعدد مضامین اور تحقیقی تحریریں دستیاب ہیں، جن سے ان کی شخصیت اور کارناموں کو جاننے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ خاص طور پر ایک تفصیلی مضمون سکھوں کی معروف ویب سائٹ سے حاصل ہوا، جب کہ مہندر رایس چوہدری کی تصنیف

Sikh Evolution to Revolution اور ہرکشن سنگھ سرجیت کے تحریر کردہ ایک مضمون نے بھی اس مطالعے کو وسعت بخشی۔[1] جو معلومات حاصل ہوئیں، ان کا خلاصہ درج ذیل ہے:

بابا بگھیل سنگھ کا تعلق جھبل کلاں (نزدیک امرتسر) سے تھا، جہاں وہ 1730ء کے قریب ڈھلوں جاٹ خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد چودھری بھائی لنگھا ڈھلوں ماجھا کے 84 دیہاتوں کے سردار تھے۔ لفظ ''بھائی'' کا استعمال سکھ برادری میں ایک دوسرے کے لیے عزت و تکریم کے اظہار کے طور پر ہوتا ہے، اور ہمارے خاندان میں بھی یہی روایت ریاست پٹیالہ (ایک سکھ ریاست) کے سرہند علاقے میں رہنے کی وجہ سے آج تک چلی آرہی ہے۔

بابا بگھیل سنگھ نے کروڑ سنگھیا مِسل کے تحت اپنے سیاسی اور عسکری سفر کا آغاز کیا، جس کی قیادت ابتدائی طور پر سردار کروڑا سنگھ کے ہاتھ میں تھی۔ ان کی وفات کے بعد 1765ء میں بابا بگھیل سنگھ کو اس مِسل کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ کروڑا سنگھ کی اولاد نہ ہونے کے باعث، انھوں نے بگھیل سنگھ کو اپنا جانشین نامزد کیا تھا۔

بابا بگھیل سنگھ کا سب سے نمایاں کارنامہ 1783ء میں دہلی کی فتح ہے۔ 8 مارچ کو انھوں نے جسا سنگھ اہلووالیہ کے ہمراہ 30 ہزار سکھ افواج کے ساتھ دہلی کے قریب پڑاؤ ڈالا، اس جگہ کو بعد میں ''تیس ہزاری'' کہا جانے لگا۔ 11 مارچ کو خالصہ افواج دہلی کے لال قلعہ میں داخل ہوئیں اور دیوانِ عام پر قبضہ کر لیا۔ اس موقع پر مغل بادشاہ شاہ عالم ثانی نے بابا بگھیل سنگھ سے معاہدہ کیا، جس کے تحت سکھوں کو دہلی میں اپنے تاریخی مقامات پر گوردوارے تعمیر کرنے کی اجازت دی گئی، نیز

[1] https//:jatchiefs.com/nawab-kap[ur-singh

سکھوں کو مغل ریاست سے حاصل ہونے والی محصولات کا 37.5 فیصد دینے کا وعدہ بھی کیا گیا۔

انھوں نے دہلی میں قیام کے دوران سات اہم گوردواروں کی تعمیر کی:

1- گوردوارہ ماتا سندری

2- گوردوارہ بنگلہ صاحب

3- گوردوارہ بالا صاحب

4- گوردوارہ رکاب گنج

5- گوردوارہ سیس گنج

6- گوردوارہ موتی باغ

7- گوردوارہ مجنو کا ٹلا

یہ نہ صرف ایک عسکری کامیابی تھی بلکہ ایک مذہبی و ثقافتی فتح بھی تھی، جس کے ذریعے سکھ شناخت کو مغل دارالحکومت میں دوام بخشا گیا۔

جب سکھ افواج نے 1783ء میں دہلی پر قبضہ کیا، تو بابا بگھیل سنگھ کی قیادت میں سکھ فوجیں لال قلعے میں داخل ہوئیں۔ اس وقت دہلی میں سیاسی کمزوری عروج پر تھی، اور سکھوں کے پاس مکمل اختیار تھا کہ وہ تخت پر قابض ہو جائیں۔ لیکن بابا بگھیل سنگھ نے تخت پر بیٹھنے کے بجائے مغل بادشاہ شاہ عالم ثانی سے صرف سکھ مذہبی مقامات کی تعمیر و بحالی کی اجازت لی اور دہلی میں گوردوارہ سیس گنج صاحب، رکاب گنج صاحب، اور بنگلہ صاحب جیسے متبرک مقامات کی تعمیر کروائی۔ یہ اقدام ان کے عاجزی، مذہبی وابستگی اور دور اندیشی کا مظہر تھا۔ وہ تخت و تاج کے خواہشمند نہیں تھے بلکہ اپنے مذہب کی شناخت، وقار، اور شعائر کے تحفظ و فروغ کو ترجیح دیتے تھے۔ یہ واقعہ سکھ تاریخ میں ایک اخلاقی بلندی اور روحانی ترجیحات کی علامت کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بابا بگھیل سنگھ کی نظر میں اصل فتح دلوں کی تھی، نہ کہ صرف تخت و تاج کی۔

بابا بگھیل سنگھ نہ صرف ایک عظیم جرنیل تھے بلکہ وہ ایک زیرک سفارت کار اور کامیاب سیاسی رہنما بھی تھے۔ ان کی شخصیت کی سب سے منفرد خوبی ان کا مذاکراتی تدبر تھا، جس کی بدولت

وہ مغلوں، روہیلوں، مراٹھوں اور انگریزوں جیسی مختلف طاقتوں کے ساتھ کامیاب معاہدے کرنے میں کامیاب رہے۔ ان کا تعلق ایک سادہ اور نچلے طبقے سے تھا، مگر ان کی بہادری، حکمت اور قیادت نے انھیں دریائے ستلج سے جمنا تک کے وسیع علاقے میں سکھ طاقت کا استعارہ بنا دیا۔

ان کی قیادت میں خالصہ افواج نے اودھ جیسے مشرقی علاقوں تک رسائی حاصل کی، جو اس وقت برطانوی اثر کے زیرِ اثر ایک ریاست تھی۔ یہی وہ دور تھا جب سکھوں کا سامنا براہ راست انگریزوں سے ہونے لگا۔ 1765ء سے 1802ء تک کے عرصے میں بابا بگھیل سنگھ نے دہلی کے گرد ونواح میں خالصہ اقتدار کو مستحکم کیا، اور برعکس دیگر مِسلوں کے، انھوں نے چھوٹے مقامی جھگڑوں سے اجتناب کرتے ہوئے اپنی توجہ مرکزی قوت کے قیام اور مذہبی ورثے کے تحفظ پر مرکوز رکھی۔ ایک اور نمایاں پہلو یہ ہے کہ انھوں نے سکھ قوم کے مذہبی مرکز ہرمندر صاحب، امرتسر کے لیے مسلسل مالی معاونت کو یقینی بنایا، جو ان کے انتظامی وژن کی عکاسی کرتا ہے۔

بابا بگھیل سنگھ کی وفات 1801ء یا 1802ء کے آس پاس ہوئی۔ تاہم، ان کی قیادت، دانش، اور دینی شعور آج بھی سکھ تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ وہ ان نایاب رہنماؤں میں شامل تھے جنھوں نے صرف تلوار کے زور پر نہیں بلکہ سیاست، سفارت اور تدبر سے تاریخ کا دھارا موڑا اور سکھ قوم کو ایک نئی سمت عطا کی۔

بابا بگھیل سنگھ اور سکھ دھرم کی پرداخت

بگھیل سنگھ کی قیادت میں دہلی پر سکھوں کا قبضہ ایک عسکری کامیابی تھی، تاہم اس واقعے کی اصل اہمیت اس وقت نمایاں ہوتی ہے جب ہم اسے مذہبی وتہذیبی شعور کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ دیگر سکھ سرداروں کے مقابلے میں بگھیل سنگھ وہ واحد شخصیت ہیں جنھوں نے محض فتح پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ مغل بادشاہ سے دہلی میں سکھ متبرک مقامات، بالخصوص گوردواروں کی تعمیر کی باقاعدہ اجازت حاصل کی۔ یہ ان کے مذہب سے گہری وابستگی اور دوراندیشی کا مظہر ہے۔ اس اقدام نے دہلی جیسے تاریخی اور سیاسی مرکز میں سکھ مذہبی شناخت کے ارتقا میں بنیادی کردار ادا کیا۔

دہلی کی فتح اس بات کا مظہر تھی کہ مغلیہ سلطنت اب زوال پذیر ہو چکی ہے اور اس کے نتیجے

میں سکھ اقتدار کے لیے راہیں ہموار ہوئیں۔ اس دور میں پنجاب کے مختلف علاقوں میں بارہ مسلوں کا قیام عمل میں آیا، جس سے سکھوں کی علاقائی گرفت مضبوط ہوئی۔ اگرچہ اس وقت تک کوئی متحدہ مرکزی سکھ حکومت موجود نہیں تھی، تاہم مغل اور افغان اثر و رسوخ کے زوال کے بعد، مہاراجہ رنجیت سنگھ نے 1799ء میں ایک منظم اور طاقتور سکھ سلطنت کی بنیاد رکھی۔

بگھیل سنگھ کا سب سے نمایاں کارنامہ دہلی میں گوردوارہ سیس گنج صاحب، رکاب گنج صاحب، اور بنگلہ صاحب جیسے مذہبی مقامات کی تعمیر ہے۔ یہ مقامات نہ صرف مغلیہ دارالحکومت میں سکھ موجودگی کی علامت بنے بلکہ آج بھی زیارت گاہوں کی حیثیت سے سکھ شناخت کی بنیاد کو تقویت دے رہے ہیں۔ ان فتوحات سے یہ بات بھی اجاگر ہوتی ہے کہ سکھ نہ صرف عسکری طور پر طاقتور تھے بلکہ وہ بڑی سلطنتوں کو چیلنج کرنے اور شکست دینے کی صلاحیت بھی رکھتے تھے، جو آنے والی نسلوں کے لیے حوصلہ افزا مثال بن گئی۔

اس فتح کے دوران سکھوں نے مغل شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر کے اس تخت کو الگ کر دیا جس پر بیٹھ کر اورنگزیب نے نویں سکھ گرو، گرو تیغ بہادر کے قتل کا حکم جاری کیا تھا۔ اس تخت کو بعد میں ہاتھیوں پر لاد کر گولڈن ٹیمپل (ہرمندر صاحب)، امرتسر منتقل کیا گیا، جہاں یہ آج بھی رام گڑھیا بنگا مینار میں محفوظ ہے۔ اورنگزیب کا تخت نہ صرف مغلیہ اقتدار کی علامت تھا بلکہ اس سے وابستہ تاریخی واقعات خاص طور پر گرو تیغ بہادر کی شہادت نے اسے سکھ تاریخ میں ایک انتقامی نشان بنا دیا۔

سکھ فوج کا لال قلعے میں داخلہ اور تخت کی ضبطی، مغلیہ طاقت کے زوال اور سکھ عسکری بالادستی کا واضح اعلان تھا۔ یہ تخت امرتسر لانے کا عمل سکھوں کے لیے مذہبی اور اخلاقی فتح کی حیثیت رکھتا ہے۔ دوسری طرف بعض مورخین کے نزدیک، یہ تخت دراصل دیوانِ خاص کا چبوترہ تھا، جہاں اورنگزیب بیٹھا کرتا تھا۔ ان تمام حقائق کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ سردار جسا سنگھ رام گڑھیا اور بگھیل سنگھ کی یہ کارروائی نہ صرف ایک فوجی مہم تھی بلکہ اس نے سکھ شناخت کو علامتی طور پر مستحکم کیا۔ تخت کی امرتسر میں موجودگی آج بھی سکھوں کو ان کی تاریخ اور قربانیوں کی یاد دلاتی ہے۔

بگھیل سنگھ کا مغل خزانے میں سے حصہ لینا نہ صرف ایک سیاسی چالاکی تھی بلکہ اس نے

سکھوں کو معاشی لحاظ سے مستحکم کرنے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ دہلی سے حاصل شدہ مال و دولت، لوٹ مار یا دیگر عسکری مہمات کے ذریعے، پنجاب لایا گیا، جس سے سکھ سرداروں اور عوام الناس دونوں کو فائدہ پہنچا۔ مغلیہ اور افغان حکومتوں کے کمزور ہونے کے بعد ٹیکسوں میں کمی واقع ہوئی، دیہی معاشرہ نسبتاً پُرامن ہوا، اور تجارتی راستے خصوصاً گرینڈ ٹرنک روڈ زیادہ محفوظ ہو گئے، جس سے پنجاب کی معیشت کو نئی زندگی ملی۔

بگھیل سنگھ کی عسکری کامیابیوں نے نہ صرف دہائیوں پر محیط ظلم وستم کا خاتمہ کیا بلکہ سکھوں کو شمالی ہندوستان میں ایک غالب قوت کے طور پر منوایا۔ اب وہ وقت گزر چکا تھا جب ان کے سروں کی قیمتیں مقرر کی جاتی تھیں یا انھیں قتل عام کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ سکھوں نے گوریلا جنگ کے طریقے متعارف کرائے، جو بعد میں ان کی عسکری حکمت عملی کا بنیادی ستون بنے۔

خالصہ مزاحمتی تحریک نے اس دور میں ایک نیا رُخ اختیار کیا۔ اس تحریک کے تحت حاصل ہونے والی فتوحات نے نہ صرف سکھوں کے اجتماعی جذبے کو زندہ رکھا بلکہ بالآخر سکھ سلطنت کی تشکیل میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ مختصراً، بگھیل سنگھ کی عسکری اور سفارتی فتوحات نے پنجاب کی سیاسی حرکیات کو یکسر تبدیل کر دیا، مغلیہ سلطنت کی باقیات کو کمزور کیا، اور سکھوں کے سیاسی غلبے کی بنیاد رکھی۔ ان کی شخصیت سکھ تاریخ کے مذہبی، عسکری اور ثقافتی ارتقا کا ایک روشن اور مستند حوالہ ہے۔

یہ بھی ایک اہم بات ہے کہ بابا بگھیل سنگھ کی وفات 1802ء میں ہوئی، اور رنجیت سنگھ نے لاہور پر قبضہ کر کے 1799ء میں اپنی ریاست کا اعلان کیا۔

❁ ❁ ❁

اٹھارہویں صدی میں پنجاب کے مسلمان حکمران جنھوں نے سکھوں سے جنگ کی

اب تک میں نے اُن سکھ رہنماؤں کا تفصیلی ذکر کیا ہے جنھوں نے اورنگزیب عالمگیر کے عہدِ حکومت کے دوران اور اس کے بعد، مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سلطنت کے قیام تک، شمالی ہندوستان، خصوصاً خطۂ پنجاب میں مغل افواج اور افغان حملہ آوروں کے خلاف جنگیں کیں۔ اب میں اس عہد کے اُن مسلمان گورنروں، مقامی حکمرانوں اور مسلم شخصیات کا جائزہ پیش کر رہا ہوں جو اسی صدی کے دوران پنجاب میں اقتدار کے مراکز پر فائز رہے اور جنھوں نے مختلف اوقات میں سکھوں کے ساتھ عسکری محاذ آرائی کی۔

اس سلسلے میں متعدد نام سامنے آتے ہیں، تاہم میں نے اُن شخصیات کا انتخاب کیا ہے جنھوں نے نہ صرف طویل مدت تک اقتدار سنبھالا، بلکہ جن کے ادوار میں سکھوں کے ساتھ تاریخی نوعیت کی کئی اہم اور فیصلہ کن جھڑپیں اور جنگیں وقوع پذیر ہوئیں۔ ان مسلم حکمرانوں کے کردار کا جائزہ سکھ-مسلم تعلقات کی تاریخی تفہیم کے لیے نہایت اہم ہے، بالخصوص اس صدی کے دوران پنجاب میں طاقت کے توازن اور سیاسی حرکیات کو سمجھنے کے ضمن میں۔

بہادر شاہ اول: پنجاب کا گورنر (اورنگزیب کی نامزدگی)

بہادر شاہ اول، جس کا اصل نام محمد معظم تھا، مغل شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر کا دوسرا بیٹا تھا۔ اس نے متعدد مواقع پر اپنے والد کے خلاف بغاوت کی، تاہم اورنگزیب کے طویل دورِ حکومت کے دوران وہ آگرہ، کابل اور لاہور جیسے اہم علاقوں کا گورنر بھی رہا۔ اس عرصے میں اسے راجپوتوں اور سکھوں کی

بغاوتوں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ اورنگزیب کی وفات کے بعد محمد معظم نے اپنے بھائیوں کے خلاف خانہ جنگی میں کامیابی حاصل کی اور مغلیہ سلطنت کے ساتویں شہنشاہ کے طور پر تخت نشین ہوا۔

زیرِ نظر مطالعے میں اُس دور کا تجزیہ مقصود ہے جب محمد معظم لاہور کے گورنر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہا تھا۔ اس حوالے سے ایک اہم سوال یہ بھی ابھرتا ہے کہ آیا وہ گرو تیغ بہادر کی سزائے موت میں کسی طور شریک تھا؟ اس ضمن میں کوئی قابلِ اعتماد تاریخی شواہد دستیاب نہیں ہیں۔ تاہم یہ بات تاریخی طور پر قابلِ ذکر ہے کہ بہادر شاہ اول سکھوں کے ساتھ نسبتاً نرم رویّہ رکھنے کے لیے مشہور رہا ہے، خاص طور پر اس کے گرو گوبند سنگھ کے ساتھ تعلقات ایک خوشگوار اور روادارانہ نوعیت کے تھے۔

سنہ 1707-1708ء کے دوران گرو گوبند سنگھ اور بہادر شاہ اول کے درمیان قریبی تعلقات کا ثبوت متعدد تاریخی ذرائع سے ملتا ہے۔ تاریخی بیانات کے مطابق، گرو گوبند سنگھ نے بہادر شاہ کی اُس کے بھائیوں کے خلاف جاری جانشینی کی لڑائی میں حمایت کی، جو دونوں کے درمیان سیاسی تعاون کا مظہر تھا۔

معروف مصنف پٹونت سنگھ اپنی کتاب *The Sikhs* میں لکھتے ہیں کہ بہادر شاہ اول کی تاج پوشی کے بعد، جولائی 1707ء میں گرو گوبند سنگھ سے اس کی پہلی ملاقات آگرہ میں ہوئی۔ یہ ملاقات ایک خوشگوار ماحول میں ہوئی، جہاں شہنشاہ نے گرو کو بھرپور عزت و تکریم دی۔ اس موقع پر شہنشاہ نے گرو کو ایک قیمتی چادر اور دیگر تحائف پیش کیے، جو اس وقت کے درباری آداب اور سیاسی مصالحت کی عکاسی کرتے ہیں۔ گرو گوبند سنگھ نے بھی ان تحائف کو خوش دلی سے قبول کیا، جو اس بات کا مظہر ہے کہ دونوں رہنماؤں کے مابین نہ صرف باہمی احترام موجود تھا بلکہ ایک حد تک باہمی مفاہمت بھی قائم تھی۔

گرو گوبند سنگھ اور بہادر شاہ اوّل کے تعلقات: ایک تجزیاتی مطالعہ

گرو گوبند سنگھ اور مغل شہنشاہ بہادر شاہ اوّل کے درمیان روابط کا ایک اہم حوالہ اُس خط سے

ملتا ہے جو گرو نے ''ڈھول کی سنگت'' کے نام ارسال کیا۔ اس خط میں گرو گوبند سنگھ نے بہادر شاہ کے ساتھ ہونے والی ملاقات کو اطمینان بخش قرار دیا اور اپنے پیروکاروں کو ہدایت کی کہ جب وہ کلہور (کلیر) پہنچیں تو مکمل مسلح خالصہ ان کی موجودگی میں حاضر ہو۔ اس ہدایت سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ گرو گوبند سنگھ وزیر خان کی ممکنہ سازشوں اور دھوکہ دہی سے مکمل طور پر باخبر تھے اور وہ ہر قسم کے خطرات سے بچنے کے لیے احتیاطی تدابیر اختیار کرنا چاہتے تھے۔

تاہم، سیاسی حالات نے جلد ہی ایک نیا رخ اختیار کر لیا۔ بہادر شاہ اوّل کے بھائی، شہزادہ کام بخش نے دکن کے علاقے میں بغاوت کر دی، جس کی سرکوبی کے لیے شہنشاہ کو ذاتی طور پر جنوبی ہند کی طرف لشکر کشی کرنی پڑی۔ گرو گوبند سنگھ نے شہنشاہ کا ساتھ دینے پر آمادگی ظاہر کی، اس امید کے ساتھ کہ مغل دربار سکھوں کے خلاف جاری مظالم اور پنجاب کی بدامنی کے مستقل اور پُرامن حل کی طرف متوجہ ہوگا۔

ناندر (Nanded) میں قیام کے دوران سکھ اور مغل افواج کا مشترکہ سفر جاری رہا۔ مگر وقت کے ساتھ ساتھ یہ امر واضح ہوتا گیا کہ شہنشاہ بہادر شاہ سکھوں کے لیے اہم اور بنیادی مسائل پر کوئی واضح مؤقف اختیار کرنے سے گریز کر رہا ہے۔ ان میں بالخصوص وہ مظالم شامل تھے جو سراج خان (وزیر خان) نے گرو گوبند سنگھ کے بیٹوں اور سکھ عوام کے ساتھ روا رکھے، نیز سکھوں کے مذہبی آزادی کے حق اور مغل حکام کے متعصّبانہ رویّے جیسے حساس موضوعات بھی شامل تھے۔

بہادر شاہ کی عدم دلچسپی اور ٹال مٹول کی پالیسی کے باعث گرو گوبند سنگھ نے شہنشاہ سے علیحدگی اختیار کر لی اور ناندر ہی کو اپنی مستقل قیام گاہ بنا لیا۔ وہاں انھوں نے سکھ مت کی تبلیغ اور خدمتِ خلق کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جنوبی ہند میں بہت سے افراد نے سکھ مت اختیار کیا، اور ناندر ایک نمایاں روحانی، مذہبی اور ثقافتی مرکز کی حیثیت سے ابھرا۔

پٹونت سنگھ اپنی کتاب *The Sikhs* میں اس امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ اورنگزیب کی وفات کے بعد، بہادر شاہ اوّل نے ایک فوجی مہم کے ذریعے پنجاب کی طرف پیش قدمی کی۔ اس مہم کا مقصد ان پہاڑی سرداروں کو تابع کرنا تھا جو سکھ گرو کے مذہبی نظریات اور ان کے بڑھتے ہوئے

سیاسی و عسکری اثر و رسوخ سے ناخوش تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ، گرو گوبند سنگھ کے ابھرتے ہوئے کردار کو محدود کرنا بھی اس مہم کا ایک اہم مقصد تھا۔

بہادر شاہ اوّل (محمد معظم) کی قیادت میں جب مغل افواج نے شمالی ہندوستان میں نظم و نسق کی بحالی اور بغاوتوں کے خاتمے کے لیے مہمات کا آغاز کیا، تو اس کا ایک مرکزی ہدف پنجاب اور اس سے ملحقہ پہاڑی علاقوں میں موجود مزاحمتی عناصر کو قابو میں لانا تھا۔ اس مہم میں بہادر شاہ کے نامور سپہ سالار مرزا بیگ نے پہاڑی راجاؤں کے خلاف فوجی کارروائیاں کیں، تاہم ان کارروائیوں کے دوران مغل افواج کو بھاری جانی اور مالی نقصان اٹھانا پڑا۔

اس صورتِ حال کے پیشِ نظر، بہادر شاہ اور اس کے مشیروں نے فیصلہ کیا کہ سکھوں سے براہِ راست تصادم سے گریز کرتے ہوئے فی الحال آنند پور صاحب کے قلعہ بند علاقے کو نظر انداز کیا جائے۔ اگرچہ اس وقت سکھ برملا مغلیہ اقتدار کو چیلنج کر رہے تھے اور اپنی سیاسی و مذہبی خودمختاری کا مطالبہ کر رہے تھے، تاہم بہادر شاہ کی حکمتِ عملی غالباً یہ تھی کہ پہلے پہاڑی سرداروں کو زیرِ اثر لایا جائے اور بعد ازاں سکھوں کے معاملے کو ترجیح دی جائے۔

اس محتاط رویے کی ایک اور ممکنہ توجیہ یہ بھی ہے کہ بہادر شاہ اوّل کے دل میں مذہبی شخصیات، بالخصوص گرو گوبند سنگھ کے لیے ذاتی احترام کا جذبہ موجود تھا۔ اس امکان کو اس حقیقت سے بھی تقویت ملتی ہے کہ اس نے سکھوں کے خلاف فوری عسکری اقدام سے گریز کیا، حالانکہ حالات اس نوعیت کے اقدامات کا تقاضا کر رہے تھے۔ بہادر شاہ اوّل کے بارے میں مزید جاننے کے لیے پٹونت سنگھ کی کتاب بے حد مفید ہے۔

پنجاب میں 1697ء سے 1700ء تک کا عرصہ نسبتاً پُرامن رہا۔ گرو گوبند سنگھ نے اس مہلت کو اپنی روحانی، فکری اور عسکری تنظیم نو کے لیے نہایت مؤثر طور پر استعمال کیا۔ اس دوران انھوں نے خالصہ کی تنظیم و تربیت پر توجہ مرکوز رکھی اور سکھ قوم کی نظریاتی اور عملی بنیادوں کو مستحکم کرنے کی کوشش کی۔

مؤرخین کے مطابق، جب تک محمد معظم پنجاب کا گورنر رہا، اُس نے سکھوں کے خلاف کسی

قسم کی جارحانہ یا سخت گیر پالیسی اختیار نہیں کی۔ تاہم، تخت نشینی کے بعد جب وہ بہادر شاہ اوّل کے لقب سے مغل سلطنت کا حکمران بنا، تو سرہند کے گورنر وزیر خان جیسے عناصر کے اثر ورسوخ میں آ گیا، جو سکھوں کے شدید مخالف تصور کیے جاتے تھے۔ وزیر خان کا کردار بعدازاں سکھوں کے خلاف ہونے والے اقدامات میں کلیدی رہا، بالخصوص گرو گوبند سنگھ کے بیٹوں کے ساتھ ظالمانہ سلوک اور سکھوں کے مذہبی وسیاسی حقوق کی پامالی میں۔

وزیر خان: سرہند کا گورنر جو سکھوں کے ہاتھوں مارا گیا

عالمگیر کے دورِ حکومت میں پنجاب کے تین بڑے اور مرکزی شہر سرہند، لاہور اور ملتان سیاسی وانتظامی لحاظ سے نمایاں اہمیت کے حامل تھے۔ اس دور میں، جب وزیر خان سرہند کے گورنر (صوبیدار) کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے تھے، اسی زمانے میں عبدالصمد خان انصاری جنھیں اختصاراً عبدالصمد خان بھی کہا جاتا ہے۔ 1713ء سے 1726ء تک لاہور صوبے کے مغل صوبیدار اور بعدازاں 1726ء سے ملتان کے صوبیدار مقرر کیے گئے۔ ان کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا۔

اکبر نامہ جیسے اہم تاریخی ماخذ میں، لاہور، ملتان، دہلی اور آگرہ کے بعد کابل (قندھار) کے صوبے کا بھی ذکر ملتا ہے۔ علاوہ ازیں، جنوبی اور مشرقی ہند میں بھی کئی مغل صوبے موجود تھے۔ اگرچہ سرہند کو علیحدہ صوبے کا درجہ حاصل نہ تھا، تاہم اس کی جغرافیائی اور سیاسی اہمیت مسلمہ تھی۔ دہلی اور لاہور کے درمیان سفر کے دوران، مغل حکمران اکثر سرہند میں قیام کیا کرتے تھے۔

سرہند سے میری ذاتی نسبت بھی ہے، کیونکہ میرے والدِ محترم کی جائے پیدائش یہی شہر ہے۔ قیامِ پاکستان کے موقع پر، وہ اسی شہر سے جان و مال کے تحفظ کے پیشِ نظر، انتہائی کٹھن حالات میں نقل مکانی کرتے ہوئے ٹوبہ ٹیک سنگھ منتقل ہوئے۔ اگرچہ وہ منزل تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے، مگر اس سفر میں بہت کچھ لٹا بیٹھے۔ یہی المیہ دوسری طرف کے افراد کا بھی تھا، اور یہ نقل مکانی لاکھوں افراد پر مشتمل تھی۔

ہم ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ایک ایسے گھر میں مقیم ہوئے، جو ایک ہندو نے تقسیمِ پنجاب سے تقریباً ایک دہائی قبل نہایت محبت سے تعمیر کیا تھا۔ یہیں میری پیدائش بھی ہوئی۔ مقامی لوگ ہمیں ''سرہندی'' کے لقب سے یاد کرتے تھے، جبکہ سرہند میں ہمارے آبائی مکان جسے میرے دادا نے تعمیر کروایا تھا میں ایک سکھ خاندان آباد ہو چکا تھا۔ وہاں کے باسی انھیں ''لائلپوری'' کہا کرتے تھے۔ دونوں مکانات آج بھی موجود ہیں، جنھیں مجھے ایک مرتبہ دیکھنے کا موقع بھی ملا۔

ان مکانات کی عمارتیں تو اپنی جگہ باقی رہیں، مگر مکین بدل دیے گئے۔ یہ تبدیلی کسی فطری یا پُرامن منتقلی کا نتیجہ نہ تھی، بلکہ ایک جبری ہجرت تھی، جسے لاکھوں افراد نے صرف اپنی جانوں کے تحفظ کے لیے برداشت کیا۔

یہ سوال آج بھی ذہن کو جھنجھوڑتا ہے کہ کیا اتنی وسیع پیمانے پر انسانی ہجرت کے بغیر پاکستان کا قیام ممکن نہ تھا؟ میری رائے میں ایسا ممکن تھا، لیکن کچھ عناصر نے ایسا ہونے نہ دیا۔ ان افراد نے اپنے ذاتی، سیاسی یا نظریاتی مقاصد کے حصول کے لیے ایک کروڑ سے زائد انسانوں کو بے گھر کیا، اور دس لاکھ سے زائد افراد کو موت کے منہ میں دھکیل دیا۔ ایسے افراد تاریخ میں اپنے سفاک اور غیر انسانی کردار کے باعث ہمیشہ کے لیے یاد رکھے جائیں گے۔ یہ لوگ کون تھے؟ وہ اس وقت کے سیاسی، مذہبی، عسکری اور انتظامی عہدوں پر فائز بااثر شخصیات تھیں۔

اب ہم ایک مرتبہ پھر وزیر خان کے ذکر کی جانب رجوع کرتے ہیں۔ ان کے بارے میں درست اور جامع معلومات حاصل کرنے کے لیے میں نے متعدد مستند ماخذات سے استفادہ کیا ہے، جن میں درج ذیل کتابیں شامل ہیں:

منتخب اللباب از خافی خان

Punjab: A History from Aurangzeb to Mountbatten 69-

History of the Sikhs, Vol. II: Evolution of Sikh Confederacies

(1707)- Mohan Gandhi

از ہری رام گپتا

اس کے علاوہ، میں نے کچھ آن لائن ذرائع سے بھی مدد حاصل کی، جن میں درج ذیل نمایاں ویب سائٹس شامل ہیں:

Wazir Khan SikhiWikia

Wazir Khan (Sirhind) Military History

یہ بات ذہن نشین رکھنا نہایت ضروری ہے کہ ایسی شخصیت پر قلم اٹھانا، جس کے بارے میں آراء شدید طور پر منقسم ہوں، تحقیق اور توازن کے اعلیٰ معیار کا متقاضی ہے۔ ایک طرف وہ افراد ہیں جو وزیر خان کو ایک نیک سیرت، باعمل مسلمان کی حیثیت سے سراہتے ہیں، اور دوسری طرف سکھ مؤرخین و محققین ہیں، جن کے نزدیک وزیر خان ظلم و جبر کی علامت بن چکے ہیں اور جن کے لیے ان کا تذکرہ بھی باعثِ اذیت ہے۔ ان متضاد رویّوں کے تناظر میں، میرے لیے ایک چیلنج یہ بھی رہا کہ میرا تعلق بھی کسی ایک گروہ سے ہے، جس کے باعث غیر جانب دار اور معروضی اندازِ تحریر اختیار کرنا میری ایک ذاتی اور علمی ذمہ داری بن گیا۔ اس تحریر میں میری بھرپور کوشش یہی رہی ہے کہ ذاتی آراء یا جذباتی وابستگیوں کے بجائے صرف مستند تاریخی حوالوں اور حقائق کی بنیاد پر گفتگو کی جائے۔

یہ کوشش کس حد تک کامیاب رہی؟ اس کا فیصلہ میں قارئین پر چھوڑتا ہوں۔

جب میں اس موضوع پر تحقیق کر رہا تھا تو ایک اہم نکتہ واضح کرنے میں خاصا وقت صرف ہوا، اور وہ یہ کہ ''وزیر خان'' کے نام سے دو مختلف تاریخی شخصیات کا ذکر ملتا ہے، جنھیں اکثر آپس میں خلط ملط کر دیا جاتا ہے۔

ایک جانب وہ وزیر خان ہے جو شاہ جہاں کے عہد میں دربار سے وابستہ تھا، اور دوسری جانب وہ وزیر خان جس کا تعلق شہنشاہ اورنگزیب اور بہادر شاہ اوّل کے دورِ حکومت سے تھا اور جو بعد ازاں سرہند کا فوجدار (گورنر) مقرر ہوا۔ سرہند کا وزیر خان، جس کی وفات 1710ء میں ہوئی، ایک مغل افسر تھا جو سکھ تاریخ میں ایک متنازع اور بدنام شخصیت کے طور پر جانا جاتا ہے۔ اس کی شہرت خصوصاً گرو گوبند سنگھ کے دو کم سن بیٹوں کو قتل کرانے اور بندہ سنگھ بہادر کے ہاتھوں

انجام کو پہنچنے کی بنا پر ہے۔ وہ ایک سخت گیر مذہبی پالیسی کا حامی اور اورنگزیب کے دور کی شدت پسند حکمرانی کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے۔اس کے برعکس، شاہ جہاں کے عہد کے جس وزیر خان کا ذکر ملتا ہے، اس کا اصل نام حکیم علم الدین انصاری تھا۔ وہ شاہی معالج کی حیثیت سے دربار سے وابستہ ہوئے اور بعدازاں انھیں ''وزیر خان'' کا لقب عطا کیا گیا۔ان کا شمار شاہ جہاں کے معتمد اور صاحبِ علم درباریوں میں ہوتا تھا۔

حکیم علم الدین انصاری کا تعلق موجودہ پاکستان کے علاقے چنیوٹ سے تھا، جو اس وقت بھی فنِ تعمیر، لکڑی کی کاریگری اور ہنرمندوں کے حوالے سے معروف تھا۔ یہی پس منظر بعد میں ان کے معماری ذوق اور سرپرستی پر بھی اثر انداز ہوا۔ انھوں نے نہ صرف لاہور میں واقع مشہور وزیر خان مسجد (جس کی تعمیر 1641ء میں مکمل ہوئی) کی بنیاد رکھی بلکہ شاہی گزرگاہ اور چاردیواری والے لاہور شہر کے کئی اہم حصوں کی تزئین و آرائش اور تعمیرِنو کی بھی نگرانی کی۔

دلچسپ امر یہ ہے کہ چنیوٹ میں بھی ایک تاریخی مسجد موجود ہے جو ''وزیر خان مسجد'' کے نام سے جانی جاتی ہے، اور تاریخی روایات کے مطابق اسے بھی حکیم علم الدین انصاری ہی نے تعمیر کروایا۔عموماً وزیر خان مسجد کے حوالے سے جو مشہور اور تاریخی شہرت پائی جاتی ہے، وہ لاہور کی مسجد سے منسوب ہے، جو 1641ء میں حکیم علم الدین انصاری المعروف وزیر خان نے تعمیر کروائی تھی۔لیکن یہ کم معروف حقیقت ہے کہ چنیوٹ میں بھی ایک مسجد اسی نام سے موجود ہے، جسے مقامی روایات کے مطابق اسی وزیر خان نے تعمیر کروایا تھا۔ چونکہ حکیم علم الدین انصاری کا تعلق چنیوٹ سے تھا، اس لیے قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ مسجد ان کی ذاتی دلچسپی یا سرپرستی میں تعمیر ہوئی۔

لاہور کی وزیر خان مسجد اپنی خوب صورت فارسی فریسکو پینٹنگز، خطاطی اور تعمیراتی حسن کی بنا پر مغلیہ فنِ تعمیر کا شاہکار تصور کی جاتی ہے۔

وزیر خان اور بابا بندہ سنگھ بہادر

وزیر خان، جو موجودہ ہندوستان کی ریاست ہریانہ کے ضلع کرنال کے قصبے کنج پورہ سے

تعلق رکھتا تھا، سلطنتِ مغلیہ کے زوال پذیر دور میں ایک بااثر اور کلیدی حکومتی شخصیت کے طور پر سامنے آیا۔ شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر کے عہدِ حکومت کے آخری برسوں میں اُسے صوبہ سرہند کا فوجدار (گورنر) مقرر کیا گیا۔ بعد ازاں، بہادر شاہ اوّل (شاہ عالم) کے دور میں بھی وہ اسی منصب پر فائز رہا، یہاں تک کہ 1710ء میں سکھ رہنما بندہ سنگھ بہادر کے ہاتھوں شکست کھا کر ہلاک ہوا۔ یہ امر ابھی تک تحقیق طلب ہے کہ آیا اُس دور میں لاہور کا علیحدہ گورنر موجود تھا یا لاہور بھی براہِ راست وزیر خان کے زیرِ انتظام تھا۔ اس بارے میں مستند تاریخی منابع خاموش دکھائی دیتے ہیں، اور اس پہلو پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔

وزیر خان نے سرہند میں ایک طویل مدت تک سیاسی، مالیاتی اور عسکری اُمور کی نگرانی کی۔ مؤرخ خفی خان کے مطابق، وہ ایک خودمختار اور مضبوط گورنر تھا، جس کے پاس نہ صرف اپنی افواج اور خزانہ تھا بلکہ اُسے اپنے مؤثر اور منظم انتظامی نظام کی وجہ سے شہرت حاصل ہوئی۔ مذہبی حوالوں سے وزیر خان کو ایک راسخ العقیدہ سُنّی مسلمان قرار دیا جاتا ہے، اور اس کی وابستگی اورنگزیب کی سخت گیر مذہبی پالیسیوں کے ساتھ واضح طور پر نظر آتی ہے۔

سرہند مغلیہ سلطنت کے دور میں ایک اہم انتظامی و جغرافیائی مرکز تھا، جس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ بعض مؤرخین اس کے نام کی وجہ تسمیہ "سرحدِ ہند" بتاتے ہیں۔ اس علاقے کو شمالی ہندوستان کی سیاسی سرحد کے طور پر بھی تصور کیا جاتا تھا۔

تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ آنند پور پر ہونے والی مغلوں کی آخری مہم کی قیادت بھی وزیر خان کے سپرد تھی۔ اس مہم میں، جب مغل افواج اور ان کے اتحادی پہاڑی راجے آنند پور کو فتح کرنے میں ناکام رہے، تو وزیر خان نے چالاکی سے ایک سید اور ایک برہمن کے ذریعے مقدس قسموں کا سہارا لے کر گرو گوبند سنگھ کو قلعہ خالی کرنے پر آمادہ کیا۔ تاہم، قلعہ خالی ہوتے ہی ان قسموں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مغل افواج نے سکھوں پر حملہ کیا، جس میں کئی جانیں ضائع ہوئیں اور خود گرو گوبند سنگھ کو چمکور میں گھیر لیا گیا۔ البتہ اس واقعے کے حوالے سے مختلف روایات اور بیانات دستیاب ہیں، جن میں باہمی تضاد بھی پایا جاتا ہے۔

یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ معروف مؤرخ سید محمد لطیف نے اس موضوع پر نہایت اختصار سے لکھا ہے، حالانکہ یہ واقعہ سکھ تاریخ اور مغل-سکھ تعلقات میں ایک فیصلہ کن موڑ رکھتا ہے۔ اس کے برعکس، متعدد مسلمان مؤرخین کی تحریروں میں سکھوں کو ایک ناپسندیدہ قوم کے طور پر پیش کیا گیا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے بیانیے میں مذہبی یا ثقافتی تعصب کا عنصر غالب تھا۔ اسی طرزِ عمل کا مشاہدہ بعض ہندو اور سکھ مؤرخین کی تحریروں میں بھی ہوتا ہے، جو مغلوں یا مسلم کرداروں کے خلاف سخت لب و لہجہ اختیار کرتے ہیں۔

ان متعصّبانہ رجحانات کی موجودگی میں ایک غیر جانب دار اور متوازن تاریخی فہم قائم کرنا ایک دشوار مگر ضروری عمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے مختلف النوع ذرائع، بشمول مسلم، سکھ، اور یورپی مؤرخین کی تحریریں، عوامی روایات، اور جدید تاریخی تحقیق پر انحصار کرنا پڑا تاکہ ایک جامع اور قدرے منصفانہ تصور قائم کیا جا سکے۔ تاہم، یہ کوشش محض ایک ابتدائی قدم ہے، جس کی کامیابی کا دعویٰ کرنا فی الحال مناسب نہیں۔ تاریخ کے اس پیچیدہ دور کے مکمل فہم کے لیے مزید تحقیق، تنقیدی مطالعے اور تقابلی تجزیے کی اشد ضرورت ہے۔

چمکور کی جنگ 1705ء: اسباب، نتائج اور تاریخی اثرات کا تحقیقی جائزہ

8 دسمبر 1705ء کو ہونے والی چمکور کی مشہور جنگ میں گرو گوبند سنگھ کے دو صاحبزادے اجیت سنگھ (16 برس) اور جوجھار سنگھ (14 برس) بہادری سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے، جب کہ گرو خود شب کی تاریکی میں نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس جنگ کے بعد سکھ افواج بڑی حد تک منتشر ہو گئیں۔ گرو کے قیمتی کتب و مخطوطات، اسلحہ و ساز و سامان، اور ساتھی بکھر گئے۔ اسی پس منظر میں گرو کی والدہ، ماتا گجری، اور ان کے دو کمسن صاحبزادے زورآور سنگھ (عمر تقریباً 9 برس) اور فتح سنگھ (عمر تقریباً 7 برس) راستے میں اپنے سابق ملازم گنگو برہمن کے پاس پہنچے۔ اگرچہ گنگو نے ابتدائی طور پر انھیں پناہ دی، لیکن بعد ازاں انھیں سرہند کے مغل حکام کے سپرد کر دیا گیا۔ ان بچوں کو وزیر خان کے دربار میں پیش کیا گیا اور بے رحمی سے قتل کر دیا گیا۔ ایک ایسا المیہ جس کے سیاسی و جذباتی اثرات آج تک پنجاب کی تاریخ اور ثقافت پر نمایاں ہیں۔

یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ کم عمر سکھ شہزادوں کی بہیمانہ موت نے سکھ عوام کی اجتماعی نفسیات پر گہرا اثر ڈالا، اور آنے والے وقت میں سکھ مزاحمت اور قوم پرستی کی تحریکوں کی بنیاد فراہم کی۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ یہ واقعہ بھی پنجاب کی طویل المیاتی تاریخ میں اُن اسباب میں شامل تھا جنھوں نے بعدازاں خطے کی تقسیم اور فرقہ وارانہ بنیادوں پر شناخت سازی میں اہم کردار ادا کیا۔

جب بہادر شاہ اول اور گرو گوبند سنگھ کے درمیان دوستانہ تعلقات قائم ہونا شروع ہوئے تو وزیر خان کو اندیشہ لاحق ہوا کہ مغل دربار میں اس کے سخت گیر اقدامات، خصوصاً گرو کے اہلِ خانہ کے ساتھ سلوک، پر باز پرس ہوسکتی ہے۔ چتر جوگی کے مطابق، وزیر خان نے دو ایجنٹ مقرر کیے تا کہ گرو کو شہنشاہ سے ملاقات سے قبل ہی قتل کیا جا سکے۔ ان میں سے ایک نے 7 دسمبر 1708ء کو گرو گوبند سنگھ پر قاتلانہ حملہ کرتے ہوئے ان کے پیٹ میں خنجر گھونپ دیا۔ گرو اگرچہ کچھ دنوں تک زندہ رہے، لیکن یہ زخم ان کے لیے جان لیوا ثابت ہوا۔

وزیر خان اور بندہ سنگھ بہادر کے درمیان ہونے والی آخری اور فیصلہ کن جنگ کا تفصیلی تذکرہ معروف مغل مؤرخ خافی خان نے اپنی اہم تصنیف منتخب الباب میں کیا ہے۔ اس معرکے کو مغل سلطنت اور سکھ مزاحمتی تحریک کے درمیان ایک نقطۂ عطف کی حیثیت حاصل ہے۔ دوسری جانب سید محمد لطیف اس تاریخی پس منظر میں ایک اور پہلو کا اضافہ کرتے ہیں۔ ان کے مطابق، گرو گوبند سنگھ پر ہونے والے قاتلانہ حملے کے اسباب میں صرف سیاسی محرکات ہی نہیں بلکہ ذاتی انتقام کا عنصر بھی شامل تھا۔ ان کے بیان کے مطابق، حملہ آور دو پٹھان ایسے افراد تھے جن کے والد کو مبینہ طور پر گرو گوبند سنگھ کے حکم پر قتل کیا گیا تھا۔

تاہم، اس واقعے کے بارے میں مختلف روایات اور متضاد بیانات موجود ہیں، جن کی بنیاد پر کسی ایک حتمی نتیجے تک پہنچنا مشکل ہے۔ اس حوالے سے تاریخی تجزیہ نگار عمومی طور پر احتیاط اور غیر جانب دارانہ تحقیق کو ترجیح دیتے ہیں، اور حقیقت کا مکمل علم صرف خدا تعالیٰ کے علم میں ہے۔ مگر اس واقعے بارے سب کا اتفاق ہے کہ گرو گوبند سنگھ اپنے خیمے میں قتل کیے گئے۔ کس نے کیے، کیوں کیے، کس کے کہنے پر کیے؟ ان باتوں میں اختلاف موجود ہے۔

12 مئی 1710ء کو بندہ سنگھ بہادر نے سرہند پر ایک بھرپور حملے کی قیادت کی۔وزیر خان نے اس خطرے کو مذہبی رنگ دیتے ہوئے اس حملے کو ''جہاد'' کا نام دیا اور ایک بڑی فوج ترتیب دی۔دونوں فریقین کے مابین چپڑ چِڑی (موجودہ ضلع چندی گڑھ کے نواح میں) ایک زبردست اور خونریز جنگ ہوئی، جو پورے دن جاری رہی۔اس معرکے میں وزیر خان مارا گیا، اور اس کی افواج کو فیصلہ کن شکست کا سامنا کرنا پڑا۔متعدد سکھ روایات کے مطابق، وزیر خان کو قتل کرنے کا کارنامہ سکھ جانباز فتح سنگھ نے انجام دیا، تاہم بعض دیگر تاریخی ماخذات اس حوالے سے خاموش یا مختلف زاویے پیش کرتے ہیں۔

وزیر خان کی موت کے پنجاب پر سماجی وسیاسی اثرات: ایک تحقیقی مطالعہ

1710ء میں مغل گورنر وزیر خان کی بندہ سنگھ بہادر کے ہاتھوں شکست و ہلاکت نہ صرف مغلیہ سلطنت کے زوال کی ایک علامت بنی، بلکہ اس واقعے نے پنجاب کے سیاسی، سماجی، ثقافتی اور مذہبی تناظر میں کئی سطحوں پر گہرے اور دیرپا اثرات مرتب کیے۔اس وقت دہلی میں مغل تخت پر بہادر شاہ اول متمکن تھا، مگر وزیر خان کی موت نے مرکز سے دور مشرقی پنجاب میں مغل اختیار کو شدید چیلنج سے دوچار کر دیا۔ذیل میں اس واقعے کے مختلف اثرات کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے:

1-مغل اختیار کا زوال اور سرہند کی علامتی اہمیت: سرہند مغل سلطنت کا ایک اہم انتظامی، سیاسی اور فوجی مرکز تھا۔وزیر خان کی شکست نہ صرف اس مرکز کے سقوط کی علامت بنی بلکہ اس سے پنجاب میں مغل اقتدار کے کمزور پڑنے کا آغاز بھی ہوا۔وزیر خان کی موت نے مغل حکام اور اشرافیہ میں عدم تحفظ پیدا کر دیا، اور متعدد چھوٹے درجے کے مغل عہدیدار اپنی حیثیت کھو بیٹھے۔دہلی کی مرکزی حکومت کی گرفت اس خطے پر ڈھیلی پڑتی گئی، اور مقامی سیاسی قوتیں ابھرنے لگیں۔

2-سکھ سیاسی طاقت کا ابھار اور ابتدائی خودمختاری: بندہ سنگھ بہادر کی قیادت میں سکھوں نے پہلی بار منظم عسکری قوت کے ذریعے ایک بڑی مغل فوج کو شکست دی اور سرہند جیسے کلیدی شہر پر قبضہ کر لیا۔اس کامیابی نے سکھ تحریک کو محض ایک مذہبی و اصلاحی تحریک کے بجائے ایک فعال

سیاسی اور عسکری قوت کے طور پر نمایاں کر دیا۔ بندہ سنگھ نے نہ صرف سکھ سکہ جاری کیا بلکہ زمینوں کی ازسرِ نو تقسیم، زرعی اصلاحات، اور مقامی حکومت کا قیام بھی عمل میں لایا۔ یہ اقدامات بعدازاں سکھ مشنری ریاست، سکھ کنفیڈریسی، اور بالآخر مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سلطنت کے لیے نظریاتی و ادارہ جاتی بنیاد بنے۔

3-سکھ شناخت کی تشکیل اور شہادت کا بیانیہ: وزیر خان کو گرو گوبند سنگھ کے کمسن صاحبزادوں کے قتل کا ذمہ دار سمجھا جاتا تھا، اس لیے سکھ روایات میں اس کی موت کو انصاف کی فتح اور ظلم کے خاتمے کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ چمکور، سرہند، اور ان سے وابستہ واقعات نے سکھ ثقافت میں شہادت، استقامت، اور مزاحمت کو مرکزی اقدار کی حیثیت دے دی۔ ان واقعات نے اجتماعی شعور میں ایک ایسی داستان کو جنم دیا جو صدیوں تک سکھ خودی اور اجتماعی تشخص کا حصہ بنی رہی۔

4-جاگیرداری نظام کا انہدام اور مقامی قوتوں کا ابھار: بندہ سنگھ بہادر کی حکومت نے سرہند کے سقوط کے بعد مغل وفادار زمینداروں اور اشرافیہ کے خلاف سخت اقدامات کیے۔ زمینوں کی ازسرِ نو تقسیم اور نئی تقرریوں کے ذریعے ایک نیا مقامی نظم وجود میں آیا، جس نے پرانے جاگیردارانہ ڈھانچے کو توڑ کر زیادہ جمہوری اور زرعی بنیادوں پر طاقت کی نئی اکائیاں پیدا کیں۔ اس تبدیلی نے پنجاب میں مقامی خودمختاری اور زمین سے وابستہ نئی سیاسی شناختوں کو فروغ دیا۔

5-فرقہ وارانہ بیانیے اور تاریخی تفریق: وزیر خان کی ہلاکت کے بعد سکھ اور مسلم مؤرخین کے بیانیے ایک دوسرے سے متصادم ہو گئے۔ مسلمان مؤرخین نے سکھوں کو عموماً ''باغی'' اور ''فتنہ پرور'' قرار دیا، جب کہ سکھ روایات میں اس معرکے کو ظلم کے خلاف عدل کی کامیابی کے طور پر پیش کیا گیا۔ یہ متضاد بیانیے وقت کے ساتھ ساتھ مذہبی فرقہ واریت میں بدل گئے، جن کے اثرات بعدازاں سکھ-مسلم تعلقات پر بھی گہرائی سے مرتب ہوئے۔

6-سکھ مزاحمتی ثقافت کا تسلسل: وزیر خان کی موت سکھ لوک ادب، وارث شاہ کی شاعری، اور بابا بندہ سنگھ کے سوانحی لٹریچر میں ایک علامت کے طور پر ابھری۔ یہ واقعہ سکھ نوجوانوں کے

لیے قربانی، حوصلے اور آزادی کے جذبے کی علامت بن گیا۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں سکھ عسکری روایت اور ''خالصہ'' مزاحمتی کلچر کی تشکیل میں اس واقعے نے بنیادی کردار ادا کیا۔

میرے نزدیک وزیر خان کی ہلاکت نہ صرف ایک عسکری واقعہ تھی بلکہ اس نے پورے خطے کی تاریخ کا دھارا موڑ دیا۔ یہ واقعہ پنجاب کی مقامی سیاست، معاشرتی ساخت، اور فرقہ وارانہ بیانیے کی تشکیل میں ایک فیصلہ کن لمحہ ثابت ہوا۔ اس کے اثرات صدیوں تک پنجاب کے سیاسی شعور اور تاریخی حافظے میں محفوظ رہے۔

جب کبھی سکھوں اور مسلمانوں کے مابین تاریخی تعلقات کا جائزہ لیا جائے، تو گرو گوبند سنگھ کے چار صاحبزادگان کی موت ایک ایسا واقعہ ہے جو دونوں اقوام کے درمیان ایک گہری اور الم ناک یاد کے طور پر حائل دکھائی دیتا ہے۔ یہ ایک ایسا سانحہ ہے جس نے نہ صرف سکھ تاریخ، بلکہ بین المذاہب تعلقات پر بھی دیرپا اثرات مرتب کیے۔

اگرچہ اس وقت کے حالات جنگی نوعیت اختیار کر چکے تھے، تاہم یہ توقع کی جاتی تھی کہ جنگ کے اصولوں اور اخلاقی حدود کا خیال رکھا جائے گا۔ خاص طور پر اسلامی تعلیمات میں بچوں، عورتوں اور غیر مسلح افراد کو نقصان نہ پہنچانے کا جو اصول واضح طور پر بیان کیا گیا ہے، وہ اس واقعے میں پامال ہوا۔ گرو گوبند سنگھ کے کم سن بیٹوں کا بہیمانہ قتل نہ صرف انسانی ضمیر کو جھنجھوڑنے والا ہے بلکہ اس دور کے بعض مسلم حکام کی ان حرکات پر بھی سوالیہ نشان اٹھاتا ہے جو دینِ اسلام کی روح کے منافی تھیں۔

اس تناظر میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ خواہ وہ اورنگزیب عالمگیر ہو یا وزیر خان، اگر کسی نے جنگی اصولوں کی خلاف ورزی کی، خاص طور پر معصوم جانوں کے خلاف جارحیت کی، تو اس کی حمایت نہ تو مذہبی اصولوں کی روشنی میں ممکن ہے اور نہ ہی انسانی اخلاقیات کے دائرے میں۔ تاریخ ہمیں صرف فتوحات اور شکستوں کا حساب نہیں سکھاتی، بلکہ یہ ہمیں انصاف، رحم، اور انسانیت کے اصولوں کو یاد رکھنے کا بھی سبق دیتی ہے۔

میں تو ایسا سوچتا ہوں۔۔۔

عبدالصمد خان: جس نے سکھوں کے سر کی قیمت مقرر کی

میں نے یہ بات بارہا پڑھی ہے کہ عبدالصمد خان نے مغلیہ دور کے اواخر میں شہنشاہ فرخ سیر اور بعدازاں محمد شاہ کے عہد میں پنجاب کے صوبیدار (گورنر) کے طور پر خدمات انجام دیں۔ وہ ایک اعلیٰ عہدے پر فائز قابلِ ذکر مغل رئیس تھا، اور غالباً 1713ء سے 1726ء کے درمیان لاہور (پنجاب) کا گورنر مقرر رہا۔ اس سے قبل وہ اورنگزیب عالمگیر کے دور میں بھی مغلیہ سلطنت کے لیے خدمات انجام دیتا رہا تھا۔

اس کی گورنری کا دور وہ زمانہ تھا جب سکھ طاقت پکڑ رہے تھے۔ عبدالصمد خان کی بنیادی ذمہ داری پنجاب میں مغلوں کا کنٹرول بحال کرنا اور بڑھتی ہوئی سکھ مزاحمت کا مقابلہ کرنا تھی۔ وہ ایک اچھے منتظم کے طور پر شہرت رکھتا تھا۔ ابتدا میں اس نے سکھوں کے خلاف نسبتاً اعتدال پسندانہ رویہ اپنایا، مگر بعدازاں بندہ سنگھ بہادر کے عروج اور سکھوں کی بڑھتی ہوئی مزاحمت کے باعث اس نے ان کے خلاف عسکری کارروائیاں شروع کیں۔

عبدالصمد خان نے بندہ سنگھ بہادر کو بالآخر 1715ء میں گورداسپور کے قریب گرفتار کیا، اور 1716ء میں دہلی میں اس کے سینکڑوں پیروکاروں سمیت پھانسی دے دی گئی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا زکریا خان پنجاب کا گورنر مقرر رہا، جس نے سکھوں کے خلاف سخت گیر پالیسی کو جاری رکھا۔ میں کوشش کے باوجود عبدالصمد خان پر کوئی مکمل کتاب تلاش نہ کر سکا۔ اس تحریر کے لیے میں نے انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا، انسائیکلو پیڈیا ایرانیکا، اور دی سکھ انسائیکلو پیڈیا سے مدد لی ہے۔

انسائیکلو پیڈیا ایرانیکا میں ایس مقبول احمد لکھتے ہیں کہ عبدالصمد خان، دلیر جنگ، سیف الدولہ، ایک ہندوستانی سیاست دان، منتظم، اور فنونِ لطیفہ کے سرپرست تھے۔ ان کا اصل نام حاذق عبدالرحیم بن عبدالکریم تھا۔ ان کا تعلق سمرقند سے تھا، اور وہ آگرہ میں اُس وقت پیدا ہوئے جب ان کے والدین مختصر وقت کے لیے ہندوستان آئے۔ بعدازاں انھیں سمرقند واپس

لے جایا گیا، جہاں ان کی تعلیم وتربیت ہوئی۔ انھوں نے اپنی آبائی سرزمین کو چھوڑ کر اورنگزیب عالمگیر کے دورِ حکومت میں ہندوستان کا رُخ کیا اور مغلیہ فوج میں اپنے شاہی کیریئر کا آغاز بطور کمانڈر (400 سپاہیوں کے دستے کا سالار) کیا۔ ایک اہم درباری کی بیٹی سے شادی نے ان کی حیثیت کو مستحکم کیا اور ان کے کیریئر میں اہم کردار ادا کیا۔

کئی دیگر عہدوں پر فائز رہنے کے بعد 1713ء میں شہنشاہ فرخ سیر کے تحت وہ پانچ ہزاری منصب کے ساتھ لاہور کے گورنر مقرر ہوئے۔ انھیں دلیر جنگ کا اعزازی خطاب بھی عطا کیا گیا۔ لگ بھگ دس سال بعد وہ ملتان کے گورنر بھی بنے۔ جولائی 1737ء میں ان کا انتقال ہوا اور وہ لاہور میں دفن ہوئے۔ عبدالصمد خان ایک ہوشیار سیاست دان، باصلاحیت منتظم، اور فیاض انسان تھے۔ لاہور اور بعد ازاں ملتان کے گورنر کی حیثیت سے انھوں نے سکھ بغاوتوں کو کچلا۔ مغل بادشاہت کے نزدیک ان کا سب سے بڑا کارنامہ بندہ سنگھ بہادر پر قابو پانا تصور کیا جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں وہ پنجاب، کشمیر، اور ملحقہ علاقوں میں امن وامان بحال کرنے میں کامیاب ہوئے۔

انھوں نے اپنے دربار میں ادیبوں اور فنکاروں کی دل کھول کر سرپرستی کی۔ اگرچہ ان کے خیالات میں بیک وقت مذہبی وسیکولر رجحانات موجود تھے، تاہم وہ بعض حوالوں سے عدم رواداری کا مظاہرہ بھی کرتے تھے۔ دی سکھ انسائیکلوپیڈیا کے مطابق، جب شہنشاہ فرخ سیر نے فروری 1713ء میں عبدالصمد خان کو لاہور کا گورنر مقرر کیا، تو اُسے بندہ سنگھ بہادر کی سرکوبی کا حکم بھی دیا۔ اسی کے ساتھ اُس نے عبدالصمد خان کے بیٹے زکریا خان کو جموں کا فوجدار مقرر کیا تاکہ وہ اپنے والد کی مدد کر سکے۔

عبدالصمد خان کی افواج کے حملوں کے نتیجے میں بندہ سنگھ اور اُس کے ساتھی میدانوں میں موجود اپنے مضبوط ٹھکانوں، سادھوڑہ اور لوہ گڑھ، سے نکل کر پہاڑوں کی طرف چلے گئے۔ ایک عرصے کے بعد، جب فروری 1715ء میں بندہ سنگھ پہاڑوں سے نیچے اترا، تو عبدالصمد خان نے مغلوں، پٹھانوں، بندیلا راجپوتوں، اور کٹوچ وجسروتہ کے راجپوتوں کی ایک مشترکہ فوج جمع کی اور

بندہ سنگھ پر حملے کے لیے شمال کی طرف پیش قدمی کی۔

عبدالصمد خان بارہ ہزار سواروں، اتنی ہی تعداد میں پیادہ فوج، اور توپ خانے کے ساتھ لاہور سے روانہ ہوا۔ اُس نے بندہ سنگھ پر اُس وقت حملہ کیا جب وہ بٹالہ کے قریب ایک گاؤں میں اپنی دفاعی قلعہ بندیوں میں مصروف تھا۔ توپ خانے کی شدید گولہ باری نے بندہ سنگھ کو میدان میں آنے پر مجبور کر دیا۔ اُس نے سخت مزاحمت کی، لیکن تعداد اور وسائل میں بہت بڑی مغل فوج کے سامنے وہ زیادہ دیر نہ ٹھہر سکا اور شمال کی طرف پسپا ہو گیا۔

وہ گورداس ننگل کے قریب واقع ایک گاؤں میں دونی چند کی حویلی یا قلعے میں جا پناہ گزیں ہوا، جو گورداسپور سے تقریباً 6 کلومیٹر مغرب میں واقع تھا۔ عبدالصمد خان نے اس حویلی کا اتنا سخت محاصرہ کیا کہ ''کوئی تنکا یا دانہ اندر داخل نہ ہو سکا۔''

قلعے کے محافظین نے آٹھ ماہ تک انتہائی سخت حالات میں محاصرے کا مقابلہ کیا۔ بالآخر، شاہی افواج نے قلعہ توڑ کر بندہ سنگھ اور اُس کے سکھ ساتھیوں کو گرفتار کر لیا (17 دسمبر 1715ء)۔ عبدالصمد خان کے حکم پر دو سو سے زائد قیدیوں کو قتل کر دیا گیا۔ باقی قیدیوں کو، جن میں بندہ سنگھ اور اُس کے اہلِ خانہ شامل تھے، زنجیروں میں جکڑ کر پہلے لاہور اور پھر دہلی بھیج دیا گیا، جہاں انھیں شدید اذیتیں دے کر قتل کر دیا گیا۔ 1726ء میں عبدالصمد خان کو ملتان بھیج دیا گیا اور اُس کا بیٹا زکریا خان لاہور کا گورنر مقرر ہوا۔

ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ جب بابا بندہ سنگھ بہادر کا یہ واقعہ پیش آیا، اُس وقت دہلی کے تخت پر فرخ سیر بیٹھا تھا، پنجاب کا گورنر عبدالصمد خان تھا، اور اُس کے ساتھ اس کا بیٹا زکریا خان بھی تھا۔ اس واقعے کے تینوں کردار بی فرخ سیر، عبدالصمد خان، اور زکریا خان بی اس ظلم وتشدد کے ذمہ دار ہیں۔ عبدالصمد خان 26 جولائی 1737ء کو وفات پا گیا۔

وہ دہلی کے بادشاہوں کا دو دہائیوں تک ایک قابلِ اعتماد اور بااثر شخص رہا، اور اُسے دربار کی طرف سے ''دلاور جنگ'' (جنگ میں بہادری دکھانے والا) اور ''سیف الدولہ'' (ریاست کی

تلوار) جیسے اعزازات سے نوازا گیا۔ اُسے سات ہزار کا منصب بھی عطا کیا گیا تھا۔

زکریا خان (گورنر لاہور: 1726-1745) سکھوں کے خلاف ریاستی جبر کا ایک سیاہ باب: زکریا خان، جنھیں مغل شہنشاہ محمد شاہ کے دورِ حکومت میں لاہور کا صوبیدار (گورنر) مقرر کیا گیا تھا جب کہ اُن کے والد عبدالصمد خان ابھی زندہ تھے سکھ-مغل تاریخ میں سخت آمریت اور مذہبی ظلم وستم کی علامت کے طور پر اُبھرے۔ بعدازاں انھیں ملتان کا گورنر بھی مقرر کیا گیا، جو اُن کے اہم انتظامی کردار اور مغل دربار سے قریبی تعلقات کی عکاسی کرتا ہے۔

پانی پت کے انصاری خاندان سے تعلق رکھنے والے زکریا خان نے نہ صرف اپنے والد کی سکھوں کے خلاف جبر کی پالیسیوں کو جاری رکھا بلکہ ان میں نمایاں اضافہ بھی کیا۔ اپنے دورِ حکومت (1726-1745) میں، اُس نے سکھوں کے بڑھتے ہوئے مذہبی اور عسکری اثر ورسوخ کو کچلنے کے لیے ریاستی کریک ڈاؤن کی ایک منظم مہم شروع کی۔ اس میں بندہ سنگھ بہادر کے پیروکاروں کی وسیع پیمانے پر گرفتاریاں اور سرِ عام پھانسیاں شامل تھیں۔

اُس کی بدنام زمانہ پالیسیوں میں سے ایک سکھوں کے سروں کی قیمت مقرر کرنا تھی۔ اس اقدام نے نہ صرف ریاستی افواج بلکہ عام شہریوں کو بھی سکھوں کے منظم قتل عام میں شریک ہونے پر اکسایا۔ ان پالیسیوں کے باعث پورے پنجاب میں خوف، بدامنی اور جبر کی فضا قائم ہوگئی۔ 1746ء کے ''چھوٹا گھلوگھارا'' جیسے سانحات، جن میں ہزاروں سکھ مارے گئے، زکریا خان کی حکومت کی بربریت کی ہولناک مثالیں ہیں۔

تاہم، اپنی تمام تر بے رحم پالیسیوں کے باوجود، زکریا خان سکھ تحریک کو ختم کرنے میں ناکام رہا۔ بلکہ اُس کے جبر نے سکھوں کے اندر مزاحمت کے نئے جذبے کو جنم دیا۔ سکھوں نے گوریلا حکمتِ عملی اختیار کی اور خود کو عسکری تنظیموں جیسے کہ مسل اور دل خالصہ کی صورت میں منظم کیا، جو بعد میں سکھ ریاست کے قیام کی بنیاد بنیں۔

میں نے زکریا خان کی پالیسیوں اور سکھ تاریخ پر ان کے اثرات کا جائزہ لینے کے لیے درج

ذیل علمی ماخذوں سے استفادہ کیا ہے:

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا[۱]، سکھ انسائیکلو پیڈیا[۲]، سکھ ازم کا جوہر از تاجندر کور آنند[۳]، دی سکھ آف پنجاب از جے ایس۔ گریوال[۴] دی میکنگ آف پنجاب جسے ہریش جین نے ایڈٹ کیا،[۵] ماجد شیخ کا مضمون: بارکنگ بیک: بھائی تارو سنگھ کی میراث میں المناک موڑ۔

تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ زکریا خان نے 1733ء میں سکھ مزاحمت کو ختم کرنے کے لیے وقتی طور پر کچھ مراعات دینے کی کوشش کی، مگر یہ اقدامات پائیدار ثابت نہ ہو سکے۔ اُس کے دور میں سکھوں کے خلاف منظم جبر کی ایک جھلک یہ بھی تھی کہ اُس نے کسی بھی سکھ کے بال کاٹنے پر ایک کمبل، سکھ کے بارے میں اطلاع دینے پر دس روپے اور سکھ کا سر لانے پر 50 روپے انعام مقرر کیا۔

میں نے ہندوستان کی تاریخ میں اس درجے کا ظلم شاذ و نادر ہی دیکھا ہے۔ یہ ایسا مظالم پر مبنی دور تھا جس کی جتنی مذمت کی جائے، کم ہے۔ اُس دور کے سکھوں کے پاس اپنی جان بچانے کے لیے پہاڑوں اور جنگلوں کی پناہ لینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ زکریا خان کے دور میں سکھوں کے گھروں کو لوٹنا قانونی طور پر درست قرار پایا، اور سکھوں کو پناہ دینا یا ان کے ٹھکانے چھپانا سنگین جرم بنا دیا گیا۔ اُس نے بھائی منی سنگھ اور بھائی تارو سنگھ جیسے معروف سکھ رہنماؤں کو سرعام عبرتناک

[۱] https//:www.britannica.com/place/India/Politics-and-the-economy

[۲] https//:www.thesikhencyclopedia.com/zakariya-khan

[۳] https//:www.google.com.pk/books/edition/Essence-of-Sikhism-7/Ru4uDAAAQBAJ?hl=en&gbpv=1

[۴] https//:www.google.com.pk/books/edition/The_Sikhs_of_the_Punjab nryFANsoYC?hl=en&gbpv=1&dq=zikria+khan+punjab+governor+?&pg=PA87&printsec=frontcover

[۵] https//:www.google.com.pk/books/edition/The_Making_of_Punjab/CLCBJiEHs4c?hl=en&gbpv=1&dq=zikria+khan+punjab+governor+?&pg=PA87&printsec=frontcover

انداز میں قتل کروایا۔ باوجود اس کے کہ اُس کے پاس 20,000 سپاہیوں پر مشتمل فوج تھی، وہ سکھوں کی گوریلا مزاحمت کو ختم کرنے میں ناکام رہا۔ زکریا خان کی موت 1 جولائی 1745ء کو لاہور میں ہوئی، جس کے بعد شہر میں شدید افراتفری اور بے یقینی کا دور شروع ہو گیا۔ اُس کے بعد چند ہی عرصے کے لیے اُس کا بیٹا یحییٰ خان پنجاب کا گورنر مقرر رہا۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ جب زکریا خان نے سکھوں کو وقتی رعایتیں دینے کی کوشش کی، تو اس سے مغل حکمرانوں کی بے بسی اور سیاسی مایوسی کا اظہار ہوتا ہے۔ اگرچہ سکھوں نے پہاڑوں اور جنگلوں میں پناہ لی، لیکن وہ اسی دور میں خود کو منظم گوریلا قوت کے طور پر مستحکم کرنے لگے، جو مستقبل میں خودمختار سکھ ریاست کی بنیاد بنی۔ شہید گنج میں سکھوں کی اذیت ناک شہادتوں نے سکھ عوام میں مغل حکومت کے خلاف شدید نفرت کو جنم دیا، جو بالآخر رنجیت سنگھ جیسے قائدین کی زیرِ قیادت ایک مضبوط سیاسی و عسکری تحریک میں ڈھل گئی اور سکھ سلطنت کے قیام پر منتج ہوئی۔

زکریا خان اور نادر شاہ کا حملہ: ایک تاریخی تجزیہ

جب 1739ء میں نادر شاہ نے ہندوستان پر حملہ کیا، اس وقت دہلی کے تخت پر مغل شہنشاہ مرزا ناصر الدین محمد شاہ، جو عرفِ عام میں ''رنگیلا'' کہلاتا تھا، متمکن تھا۔ محمد شاہ 1719ء میں محض سولہ برس کی عمر میں تخت نشین ہوا، اور حملے کے وقت وہ انیس برس کا ہو چکا تھا۔ نادر شاہ نے جنوری 1739ء میں ہندوستان کی سرزمین پر حملہ کیا۔ اُس وقت لاہور کے مغل گورنر، نواب زکریا خان، نے ابتدائی طور پر مزاحمت کی کوشش کی، تاہم دہلی دربار کی طرف سے کوئی خاطر خواہ کمک یا مدد فراہم نہ ہونے کے باعث زکریا خان کو بالآخر نادر شاہ کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہونا پڑا۔

ممتاز مؤرخ لاک ہارٹ کے مطابق، زکریا خان نے نادر شاہ کو بیس لاکھ اشرفیاں، متعدد ہاتھیوں اور دیگر قیمتی تحائف کے ذریعے راضی کیا۔ نادر شاہ تقریباً بارہ دن لاہور میں قیام پذیر رہا، اور اس دوران خود کو ہندوستان کا حکمران تصور کرنے لگا۔ اس کے بعد وہ دہلی کی جانب روانہ ہوا اور کرنال کے مقام پر محمد شاہ کی فوجوں کا سامنا کیا، مگر مغل افواج نادر شاہ کے سامنے بری طرح

شکست کھا گئیں۔ دہلی میں نادر شاہ کی خونریز کارروائیوں کا تفصیلی ذکر سابقہ صفحات میں پیش کیا جا چکا ہے؛ یہاں صرف لاہور کے تناظر میں زکریا خان کے کردار پر روشنی ڈالنا مقصود ہے۔

محقق خالد ہمایوں کے مطابق، دہلی کی لوٹ مار کے بعد جب نادر شاہ واپس لاہور آیا تو اس نے زکریا خان سے مزید دولت کا مطالبہ کیا۔[1] نواب نے اہلِ لاہور سے مشورے کے بعد تیس لاکھ اشرفیوں کے بدلے اپنی جان بخشی کروائی۔ تاہم، ظلم اور لوٹ مار کا یہ سلسلہ یہیں ختم نہ ہوا؛ ایرانی لشکر نے لاہور سے کابل تک راستے میں آنے والی تمام بستیوں کو لوٹا اور تباہ کیا۔ نواب زکریا خان نے خود دریائے چناب کے کنارے نادر شاہ کو الوداع کیا۔ روایت ہے کہ اس موقع پر نادر شاہ نے نواب سے دریافت کیا: ''کیا کوئی خدمت ہو سکتی ہے؟'' نواب نے عرض کیا: ''جو ہندوستانی معمار زبردستی آپ کے ہمراہ جا رہے ہیں، انھیں آزاد کر دیا جائے۔'' نادر شاہ نے فی الفور ان معماروں کو واپس جانے کی اجازت دے دی۔

یہ سوال اہمیت رکھتا ہے کہ کیا نادر شاہ کو لاہور میں روکنے کی ذمہ داری عام پنجابی عوام پر عائد ہوتی ہے، یا یہ نواب زکریا خان کی ذمہ داری تھی، جو نہ صرف لاہور کا حکمران تھا بلکہ سکھوں کی وسیع پیمانے پر قتل و غارت میں بھی ملوث رہا تھا؟

تاریخی انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ یہ بنیادی ذمہ داری زکریا خان پر عائد ہوتی تھی۔ یوں یہ کہنا کہ ''پنجابیوں نے حملہ آوروں کو دہلی کی طرف بڑھنے دیا'' درست معلوم نہیں ہوتا۔ زیادہ قرینِ حقیقت بیان یہ ہے کہ مغل حکام، بالخصوص لاہور کے گورنر، حملہ آوروں کو روکنے میں مکمل طور پر ناکام رہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انھوں نے روکنے کی پوری کوشش کی مگر اپنی کمزور فوج کی وجہ سے روک نہ سکے۔

جب نادر شاہ نے پنجاب پر حملہ کیا، اور پہلے لاہور، پھر دہلی کو تباہ کیا، تو اس کے ساتھ ساتھ کئی اور شہر بھی برباد کیے گئے۔ اس وقت پنجاب کی سیاسی و سماجی صورتِ حال کیسی تھی؟ اس

[1] https//:dailypakistan.com.pk/21-Aug-2013/50774

موضوع پر کچھ معلومات آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہوں گا۔اس حوالے سے ایک طویل مضمون جسپال سنگھ نے بی بی سی کی ویب سائٹ پر تحریر کیا ہے، جس کا عنوان ہے: ''ڈھائی پھٹ: سکھوں کی وہ جنگی حکمتِ عملی جس نے نادر شاہ کو پریشان کر دیا''۔اس مضمون کا خلاصہ ذیل میں پیش ہے۔[1]

مؤرخ ہری رام گپتا نے اپنی کتاب *History of the Sikhs Part 1* میں نادر شاہ کے حملے کے وقت پنجاب کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

نادر شاہ تقریباً پانچ ماہ ہندوستان میں مقیم رہے۔اس دوران پنجاب، سرہند اور ہندوستان کی دیگر ریاستوں پر حکومت کا کوئی مؤثر کنٹرول نہیں تھا۔صرف نام کی مغلیہ حکومت باقی رہ گئی تھی۔ ایسی صورتِ حال سکھوں کے لیے بے حد سازگار ثابت ہوئی۔ انھوں نے حالات سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا۔

وہ مزید لکھتے ہیں کہ:

نادر شاہ مئی کے مہینے میں واپسی کے لیے دہلی سے روانہ ہوئے۔اس وقت سکھ رہنماؤں نے اپنے لوگوں کو اکٹھا کیا اور اس بات پر زور دیا کہ نادر شاہ کے قافلے پر حملہ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔

پروفیسر اندو بنگا، جنھوں نے پنجاب اور سکھ تاریخ پر نمایاں تحقیقی کام کیا ہے، فرماتی ہیں:

پنجاب میں اس وقت حکومت نام کی ہی رہ گئی تھی۔ نادر شاہ کا قافلہ بہت طویل تھا۔سکھوں نے چھوٹے چھوٹے گروہ بنا کر اس قافلے پر حملے شروع کر دیے۔

نادر شاہ کا قافلہ اتنا بڑا تھا کہ ابتدائی طور پر اسے معلوم ہی نہ ہو سکا کہ ان حملوں کے پیچھے سکھ ہیں۔لیکن جب وہ لاہور پہنچا تو اسے سکھوں کی جانب سے ہونے والے حملوں کا مکمل ادراک ہو چکا تھا۔

---

[1] https//:www.bbc.com/urdu/articles/c72xedyy8y30:٪text

یحییٰ خان: جس کے دور میں ''چھوٹا گھلوگھارا'' پیش آیا(1745-1747ء)

سکھ ویکی پیڈیا پر یحییٰ خان کے بارے میں ایک مختصر مضمون دستیاب ہے، جس کا خلاصہ کچھ یوں ہے:

زکریا خان کی وفات کے بعد اُس کے بڑے بیٹے یحییٰ خان نے 1745ء میں، مغل شہنشاہ محمد شاہ کی ناراضی کے باوجود، خود کو لاہور کا گورنر مقرر کر لیا، گویا یہ منصب اُس کا موروثی حق ہو۔ یحییٰ خان نے سکھوں کے خلاف اپنے والد کی سخت گیر پالیسی کو جاری رکھا اور ظلم و جبر کی نئی داستانیں رقم کیں۔

اُس کے دورِ حکومت میں سکھ گھڑ سواروں اور ریاستی کانسٹیبلری کے مابین ایک تصادم ہوا، جس کے نتیجے میں جسپت رائے جو ایمن آباد کا فوجدار اور دیوان لکھپت رائے (وزیرِ محصولات) کا چھوٹا بھائی تھا، مارا گیا۔ جسپت رائے کی ہلاکت نے دیوان لکھپت رائے کو انتقام پر آمادہ کر دیا۔ اُس نے گورنر یحییٰ خان کی سرپرستی میں لاہور میں موجود متعدد سکھوں کو گرفتار کیا اور انھیں مقامی گھوڑوں کی منڈی میں قتل کروا دیا۔ بعد ازاں، یہی مقام ''شہید گنج'' کے نام سے سکھ تاریخ میں معروف ہوا۔ یحییٰ خان اور لکھپت رائے نے راوی کے شمالی کنارے پر مجتمع سکھوں کا تعاقب جاری رکھا۔ سکھ قبائل شمال کی طرف پسپا ہو گئے، مگر شمالی علاقوں سے آنے والے پہاڑی سپاہیوں نے اُن کے فرار کے راستے بند کر دیے۔

یہاں ایک اہم پہلو جسے اکثر نظر انداز کیا جاتا ہے، وہ سکھوں کے خلاف مغلوں اور ابدالیوں کی جنگوں میں بعض ہندو رہنماؤں کا کردار ہے۔ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ کئی ہندو قائدین نے ان مظالم میں مسلمان حکمرانوں کا ساتھ دیا، تاہم سکھ مؤرخین عموماً صرف مسلمان حکمرانوں (مغل یا ابدالی) کو ہی موردِ الزام ٹھہراتے ہیں۔

یکم مئی 1746ء کو ضلع گورداسپور کے مقام ''کاہنواں'' میں یحییٰ خان کی افواج اور سکھوں کے مابین ایک فیصلہ کن معرکہ پیش آیا، جس میں سات ہزار سے زائد سکھ قتل ہوئے (کچھ نے یہ

تعداد 1100 لکھی ہے)، جبکہ کئی سو سکھ قیدی بنا کر لاہور لائے گئے، جہاں بعدازاں انھیں پھانسی دے دی گئی۔ یہ قتلِ عام تاریخ میں ''چھوٹا گھلوگھارا'' (Minor Holocaust) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ بعدازاں 5 فروری 1762ء کو ''وڈا گھلوگھارا'' (Great Holocaust) کے نام سے ایک اور بڑا قتلِ عام بھی سکھوں پر گزرا۔

1746ء کے اواخر میں، یحییٰ خان کے سسر قمرالدین خان نے لاہور کا نظم و نسق سنبھال لیا۔ تاہم، یحییٰ خان کا چھوٹا بھائی، شاہ نواز خان جو اُس وقت ملتان کا گورنر تھا۔ اُسے دوبارہ اقتدار دلانے کی کوشش کرنے لگا۔ جلد ہی دونوں بھائیوں کے درمیان اقتدار کی جنگ چھڑ گئی، جو 1746ء تا موسمِ سرما 1747ء تک جاری رہی۔ بالآخر، مارچ 1747ء میں، شاہ نواز خان نے طاقت کے زور پر لاہور پر قبضہ کر لیا، یحییٰ خان کو قید کر دیا، اور خود کو پنجاب کا نیا گورنر مقرر کر لیا۔ یہ داخلی انتشار مغلیہ سلطنت کے زوال کی علامت ثابت ہوا، اور اسی خلاء میں سکھ قوتیں مزید اُبھر کر سامنے آئیں۔

❁❁❁

جنگِ لاہور

جس کے بعد احمد شاہ ابدالی کا لاہور پر قبضہ ہوا

تاریخ کی بڑی جنگوں میں سے ایک نمایاں معرکہ جنگِ لاہور ہے، جو 11 جنوری 1748ء کو احمد شاہ ابدالی کی قیادت میں افغان افواج اور شاہ نواز خان کی زیرِ کمان مغل افواج کے درمیان لڑی گئی۔ شاہ نواز نے اپنے قیدی بھائی یحییٰ خان کو دہلی حکومت سے اپنی گورنری کی باضابطہ منظوری حاصل کرنے کے لیے سودے بازی کے طور پر استعمال کیا۔ مگر جب یحییٰ خان قید سے فرار ہوکر دہلی پہنچ گیا، تو شاہ نواز نے بیرونی مدد حاصل کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ اسی پس منظر میں اس نے احمد شاہ ابدالی سے رجوع کیا، جو حال ہی میں کابل میں مغل اقتدار کا خاتمہ کر چکا تھا۔ احمد شاہ نے شاہ نواز کی درخواست قبول کرتے ہوئے دسمبر 1747ء میں پشاور سے ہندوستان کی طرف مارچ کیا۔ تاہم، جیسے ہی دہلی دربار نے شاہ نواز کی گورنری کو تسلیم کرلیا، شاہ نواز نے اپنے مؤقف میں تبدیلی کر لی اور دوبارہ مغل حکومت سے وفاداری اختیار کر لی۔ نتیجتاً، لاہور کے قریب احمد شاہ ابدالی اور شاہ نواز خان کے درمیان ایک جنگ ہوئی، جس میں افغان افواج نے فتح حاصل کی اور عارضی طور پر لاہور شہر پر قبضہ کرلیا۔

تاریخی اعتبار سے، شاہ نواز خان پہلا شخص تھا جس نے احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان پر حملے کی دعوت دی، مگر عملی طور پر جب حملہ ہوا تو وہ خود ہی اس کے خلاف صف آرا ہو گیا۔ یہ جنگ احمد شاہ ابدالی کی فتح پر منتج ہوئی اور اس نے پنجاب میں افغان اثر ورسوخ کی بنیاد رکھ دی۔

میرے نزدیک، جنگِ لاہور پنجاب کی تاریخ میں ایک انتہائی اہم موڑ تھا۔ اس جنگ کے نتیجے میں مغل سلطنت کا پنجاب پر اثر ورسوخ عملاً ختم ہو گیا اور افغانوں کا قبضہ مستحکم ہو گیا۔

بعد ازاں تقریباً پانچ دہائیوں تک پہلے احمد شاہ ابدالی، پھر اس کا بیٹا تیمور شاہ، اور بعد ازاں اس کا پوتا پنجاب پر افغان حکمرانی قائم رہی۔ یہ بھی اہم ہے کہ ان پچاس برسوں میں انھیں سکھوں کی جانب سے سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ بالآخر، مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنی سیاسی بصیرت اور عسکری مہارت سے پنجاب کو افغانوں کے تسلط سے آزاد کرایا۔

لہٰذا، میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہمیں جنگِ لاہور کے اسباب اور اثرات پر گہرائی سے تحقیق کرنی چاہیے، تاکہ ہم اس خطے کی تاریخ میں اس معرکے کے اہم مقام کو بہتر طور پر سمجھ سکیں۔

اسی تناظر میں، مجھے ایک اہم مضمون پڑھنے کا موقع ملا، جس کا عنوان ہے:

INVASIONS OF AHMED SHAH ABDALI IN PUNJAB AND THE SIKHS

اسے کرم جیت کور رومانہ اور ان کے ساتھیوں نے لکھا ہے۔[1] اس مضمون کا خلاصہ کچھ یوں ہے۔

احمد شاہ ابدالی کا پہلا حملہ برِصغیر پر: ایک تحقیقی جائزہ

احمد شاہ ابدالی، جو نادر شاہ کے ہمراہ ہندوستان آیا تھا، برصغیر کی زرخیزی، قدرتی وسائل اور دولت سے بخوبی واقف تھا۔ نادر شاہ کی وفات کے بعد، جون 1747ء میں احمد شاہ ابدالی افغانستان کا حکمران بنا۔ اس نے وسط ایشیا کے سخت جان قبائل پر مشتمل ایک منظم اور مضبوط فوج تیار کی اور تیزی سے کابل و پشاور پر قبضہ حاصل کیا۔ احمد شاہ ابدالی، نادر شاہ کا جانشین ہونے کی حیثیت سے، ہندوستان پر حملے کو اپنا جائز حق سمجھتا تھا۔ تاہم، بادی النظر میں اس کے حملے کی اصل وجہ معاشی مفاد اور برصغیر کی دولت پر قبضہ حاصل کرنا تھی۔ یہ بھی ایک درست بات ہے کہ ہندوستان پر اپنے پہلے حملے کے لیے، احمد شاہ کو دعوت بھی ملی۔ لاہور کے گورنر شاہ نواز خان، جو دہلی کی مغل حکومت سے ناراض تھا، نے اسے حملے کی دعوت دی۔ تاہم، جب احمد شاہ ابدالی کی

[1] https//:ijrar.org/papers/IJRAR1903795.pdf

افواج لاہور کے قریب پہنچیں تو سیاسی حالات میں اچانک تبدیلی آ گئی۔

ادینہ بیگ خان نے دہلی حکومت کو شاہ نواز کے ابدالی سے اتحاد کی اطلاع دی، جس پر وزیرِ اعظم قمر الدین خان نے شاہ نواز کو خط لکھ کر یہ پیشکش کی کہ اگر وہ افغان افواج کا مقابلہ کرے تو اس کی گورنری تسلیم کر لی جائے گی۔ شاہ نواز نے دہلی حکومت کی اس پیشکش کو قبول کرتے ہوئے احمد شاہ ابدالی کے خلاف مؤقف اختیار کر لیا۔ دریں اثنا، افغان کمانڈر جہان خان دریائے سندھ عبور کر چکا تھا، تاہم شاہ نواز کی مزاحمت کے نتیجے میں اسے پسپائی اختیار کرنی پڑی اور وہ پشاور واپس چلا گیا۔ اس کے بعد احمد شاہ ابدالی نے پنجاب میں داخل ہو کر روہتاس قلعہ پر قبضے کر لیا۔ اُسے توقع تھی کہ لاہور میں اس کا خیر مقدم کیا جائے گا، مگر جب اسے شاہ نواز کی بغاوت کی خبر ملی تو اس نے صابر شاہ اور محمد یار خان کو لاہور بھیجا۔ تاہم، شاہ نواز نے صابر شاہ کو توہین آمیز رویے کے الزام میں قتل کر دیا۔

صابر شاہ کے قتل کے بعد احمد شاہ ابدالی نے لاہور پر باقاعدہ لشکر کشی کا فیصلہ کیا۔ یوں ایک قتل پنجاب کی تباہی کا سبب بنا۔ احمد شاہ ابدالی نے 10 جنوری 1748ء کو شالامار باغ کے قریب کیمپ کیا، اور 11 جنوری کو افغان اور مغل افواج کے درمیان شدید جنگ چھڑ گئی۔ جنگ کے دوران مغل کمانڈر خواجہ عصمت اللہ خان اور لاچین بیگ نے غداری کرتے ہوئے احمد شاہ ابدالی سے جا ملے۔ ادینہ بیگ نے بروقت کمک نہ دی۔ اس صورتِ حال نے مغل افواج میں انتشار پیدا کر دیا، اور افغانوں نے خندقیں توڑ کر لاہور پر قبضہ کر لیا۔ شاہ نواز خان فرار ہو کر دہلی کی طرف روانہ ہو گیا، اور اس دوران خواجہ عصمت اللہ خان مارا گیا۔ لاہور پر قبضے کے بعد احمد شاہ ابدالی نے دہلی کی طرف پیش قدمی شروع کی۔ سرہند کے مقام پر مغل وزیر قمر الدین خان نے افواج کی قیادت کی، مگر وہ جنگ میں مارا گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا میر مَنّو قیادت سنبھالی اور افغان فوج کو شکست دی۔ اسی دوران احمد شاہ ابدالی کو قندھار میں اپنے بھتیجے لقمان خان کی بغاوت کی خبر ملی، جس کے باعث وہ ہندوستان سے واپس افغانستان لوٹ گیا۔ بعد

ازاں دہلی حکومت نے میر مَنّو کو لاہور اور ملتان کا گورنر مقرر کر دیا۔

یہ تمام واقعات ایک ایسے وقت میں رونما ہوئے جب مغل سلطنت شدید زوال کا شکار تھی۔ جب احمد شاہ ابدالی نے جنوری 1748ء میں حملہ کیا، دہلی کے تخت پر محمد شاہ عرف ''رنگیلا''، متمکن تھا، جس کا دورِ حکومت (1719ء تا 1748ء) بیرونی حملوں اور اندرونی بدانتظامی سے بھرپور تھا۔ محمد شاہ کی وفات اپریل 1748ء میں ہوئی، صرف تین ماہ بعد جب احمد شاہ ابدالی نے لاہور پر حملہ کیا تھا۔ اس کے بعد محمد شاہ کا بیٹا احمد شاہ بہادر مغل سلطنت کا حکمران بنا، مگر تب تک مغل اقتدار کی بنیادیں شدید کمزور ہو چکی تھیں۔

احمد شاہ ابدالی کا لاہور پر قبضہ (جنوری 1748ء) اور اس کے اثرات

میں یہاں اُن حالات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو احمد شاہ ابدالی کے حملے کے نتیجے میں پیدا ہوئے۔ یاد رہے کہ اس سے چند برس قبل نادر شاہ نے بھی لاہور کو شدید تباہی سے دوچار کیا تھا۔ اس موقع پر ایک افغان حملہ آور کا سامنا مغل گورنر شاہ نواز خان سے تھا، جس نے درحقیقت خود احمد شاہ ابدالی کو لاہور پر حملے کی دعوت دی تھی۔ بعد ازاں، مغل سلطنت سے معاملات طے ہونے کے بعد، اس نے احمد شاہ ابدالی کے خلاف جنگ کی، جس میں اسے شکست ہوئی۔ جنوری 1748ء میں احمد شاہ ابدالی اپنی افغان افواج کے ہمراہ لاہور میں داخل ہوا۔ اس نے اُن سرکاری اہلکاروں کو رہا کر دیا جو شاہ نواز خان کے عہد میں قید کیے گئے تھے، جن میں میر مومن خان، لکھپت رائے اور سورت سنگھ شامل تھے۔

لاہور کے معززین نے احمد شاہ ابدالی سے استدعا کی کہ شہر کو لوٹ مار سے محفوظ رکھا جائے اور اس کے بدلے ایک بڑی رقم بطور تاوان ادا کرنے کی پیشکش کی۔ احمد شاہ نے اس تجویز کو قبول کرتے ہوئے اپنے افسران کو حکم دیا کہ شہری املاک کو نقصان نہ پہنچایا جائے۔ تاہم، اس کے باوجود افغان افواج نے بعض علاقوں میں لوٹ مار کی اور بڑی مقدار میں اسلحہ، توپیں اور خزانہ اپنے قبضے میں لے لیا۔

یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ احمد شاہ ابدالی نے لاہور میں اپنے قیام کے دوران قلیل مدت میں

اپنے نام کے سکے جاری کروائے اور انتظامی ڈھانچے میں اہم تبدیلیاں کیں۔ جلہے خان قصوری کو گورنر، میر مومن خان کو نائب گورنر اور لکھپت رائے کو دیوان مقرر کیا۔ یہ تقرریاں مغلیہ سلطنت کے دور میں پنجاب پر کسی غیر مغل اقتدار کی ایک نمایاں علامت تھیں۔ احمد شاہ ابدالی نے تقریباً پانچ ہفتے لاہور میں قیام کیا، جس کے بعد وہ دہلی کی جانب روانہ ہوا۔ تاہم راستے میں منوپور کے مقام پر مغل افواج کے ساتھ معرکہ آرائی کے دوران اسے شکست ہوئی۔ اس جنگ میں مغل وزیر قمرالدین، جو احمد شاہ بہادر کا ایک اہم وزیر تھا، مارا گیا۔ اس جنگ کے بعد دہلی کی حکومت نے معین الملک کو لاہور کا نیا گورنر مقرر کر دیا۔

احمد شاہ ابدالی کے حملے کے نتیجے میں ہزاروں خواتین اور بچوں کو غلام بنا لیا گیا اور ہزاروں پنجابیوں کو زبردستی افغان فوج میں شامل کر لیا گیا۔ اس المیے کی تفصیلات سید محمد لطیف نے اپنی تصنیف میں نہایت محققانہ انداز میں بیان کی ہیں، جس کا مطالعہ تاریخ کے شائقین کے لیے نہایت مفید ہے۔

معین الملک عرف میر منو (گورنر لاہور: 1753ء-1748ء) اور سکھوں کے خلاف پالیسی

معین الملک، جو عام طور پر ''میر مَنّو'' کے نام سے معروف ہے اور 1753ء میں وفات پا گیا، کے بارے میں ایک تفصیلی مضمون سکھ وکی پیڈیا پر دستیاب ہے۔ اس کے علاوہ، کرم جیت کور رومانہ اور ان کے رفقا کی ایک علمی تحریر سے بھی اس موضوع پر اہم معلومات حاصل ہوئی ہیں۔[1] علاوہ ازیں، دیگر متعدد تحقیقی مضامین بھی اس موضوع پر نظر سے گزرے، تاہم سید محمد لطیف نے اس اہم دور پر خاطر خواہ تفصیل فراہم نہیں کی۔

احمد شاہ درّانی کو منوپور کی جنگ میں شکست کا سامنا کرنا پڑا، جس کے دوران میر مَنّو کا والد، قمرالدین، 18 مارچ 1747ء کو مارا گیا۔ اس واقعے کے بعد معین الملک کو پنجاب کا گورنر مقرر کیا گیا۔ بطور گورنر، میر مَنّو نے اپنے پیش رو عبدالصمد خان (1726ء-1713ء)، زکریا خان

[1] https//:ijrar.org/papers/IJRAR1903795.pdf

(1726ء-1745ء) اور یحییٰ خان (1745ء-1747ء) کی نسبت سکھوں کے خلاف زیادہ سخت گیر رویہ اختیار کیا اور ان کے خلاف بے رحمانہ کارروائیاں کیں۔

سید محمد لطیف کے مطابق، میر مَنّو نے اپنے دورِ حکومت کا آغاز امرتسر میں واقع رام راونی کے قلعے پر حملے سے کیا، جہاں سیکڑوں سکھوں نے پناہ لے رکھی تھی۔ اس حملے کے بعد سکھوں کو جان بچانے کے لیے پہاڑوں اور جنگلات کا رخ کرنا پڑا۔ میر مَنّو نے مقامی پہاڑی سرداروں کو حکم دیا کہ وہ سکھوں کو گرفتار کر کے لاہور روانہ کریں۔ نتیجتاً روزانہ سینکڑوں سکھ قیدیوں کو لاہور لایا جاتا، جہاں دہلی دروازے کے باہر، اس مقام پر جہاں پہلے گھوڑوں کی منڈی قائم ہوا کرتی تھی، انھیں تماشائیوں کی موجودگی میں پھانسی دی جاتی تھی۔

شہید گنج، میر منو کی پالیسی، اور سکھوں کے ساتھ وقتی صلح: ایک تاریخی جائزہ

لاہور کے نولکھا بازار میں واقع ''شہید گنج'' ایک ایسی تاریخی یادگار ہے جس کا تعلق ان مقامات سے ہے جہاں روزانہ کی بنیاد پر سکھوں کو پھانسی دی جاتی تھی۔ سکھ روایات کے مطابق، اس مقام پر ایک لاکھ سے زائد مرد و خواتین سکھوں کو شہید کیا گیا۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں بعد ازاں سکھوں نے ''گردوارہ شہید گنج'' تعمیر کیا، جو ''گردوارہ بھائی تارو سنگھ'' کے سامنے واقع ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ معروف سکھ رہنما، بھائی منی سنگھ، 14 جون 1738ء کو اسی مقام پر قتل کیے گئے تھے۔

سکھ مشنری سوسائٹی یو کے کی ویب سائٹ پر شائع ایک مضمون میں گردوارہ شہید گنج سے متعلق تفصیلات کے ساتھ ساتھ اس نازک تاریخی دور میں سکھ خواتین کے کردار کو بھی نمایاں کیا گیا ہے۔ مضمون کے مطابق، جب اٹھارہویں صدی میں سکھ برادری کو شدید ریاستی جبر، گرفتاریوں اور قتلِ عام کا سامنا تھا، تو ایسی صورتِ حال میں سکھ خواتین نے نہ صرف خالصہ جنگجوؤں کا ساتھ دیا بلکہ اپنے عزم و حوصلے سے روحانی اور عملی مزاحمت کی ایک نئی تاریخ رقم کی۔ یہ خواتین، گرو گوبند سنگھ کی معروف جنگجو ساتھی مائی بھاگ کور (یا مائی بھاگو) کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے، قید و بند، تشدد اور جسمانی مشقت کے باوجود اپنے نظریے پر قائم رہیں۔ تاریخی شواہد کے مطابق، سکھ قیدی

خواتین کوجیل میں ایک دن میں ایک من اور چوتھائی (تقریباً پچاس کلوگرام) اناج پیسنے کی سخت سزا دی جاتی تھی، اور تھکن یا سستی کی صورت میں ان پر وحشیانہ تشدد کیا جاتا تھا۔ مضمون میں بیان کردہ ایک جذباتی منظرنامہ کچھ یوں ہے:

پیاس اور بھوک سے نڈھال ہوکر ان خواتین نے پتھر کی چکیاں چلائیں، اور ساتھ ہی اپنے گرو کے بھجن گاتی رہیں۔ ان کے معصوم بچے بھوکے پیاسے زمین پر بلک رہے تھے، اور قید میں موجود مائیں سوائے دلاسہ دینے کے کچھ نہ کرسکیں۔ جب بچے روتے روتے تھک جاتے تو کبھی کبھار اپنی ماں کے قدموں میں ہی سو جاتے۔ اذیت دینے کے لیے ان خواتین کے گلے میں دھاگوں پر لٹکا ہوا بچوں کا گوشت ہاروں کی طرح ڈال دیا جاتا۔

یہ مظالم نہ صرف سکھ تاریخ بلکہ جنوبی ایشیائی تاریخ میں خواتین کی مزاحمت کی ایک منفرد مثال کے طور پر یاد کیے جاتے ہیں۔ سکھ روایات اور عبادات میں آج بھی ان بہادر خواتین کو عقیدت اور فخر کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے، جنھوں نے اپنے ایمان اور اپنی کمیونٹی کے تحفظ کی خاطر غیرمعمولی قربانیاں دیں۔

اسی دور میں ایک اہم سیاسی موڑ اس وقت آیا جب میر مَنّو نے اپنے ہندو وزیر، کوڑامل، کے مشورے پر سکھوں کے خلاف جارحانہ کارروائیاں عارضی طور پر روک دیں۔ کوڑامل نے، جو سکھوں کے ساتھ ہمدردی رکھتا تھا، صلح کی راہ ہموار کی۔ اس معاہدے کے تحت سکھوں کو پٹی کے علاقوں سے بارہ دیہات پر مشتمل جاگیر اور ایک لاکھ روپے سالانہ عطا کیے گئے، جس سے ایک وقتی مفاہمت ممکن ہوئی۔

دسمبر 1748ء میں احمد شاہ درّانی نے ایک مرتبہ پھر پنجاب پر حملہ کیا۔ اس موقع پر دہلی کی مرکزی حکومت نے میر مَنّو کو کوئی مدد فراہم نہ کی، جس کے نتیجے میں وہ احمد شاہ ابدالی سے صلح پر مجبور ہوا۔ اس معاہدے کے تحت دریائے سندھ کے مغرب میں واقع تمام علاقوں اور چار اہم اضلاع سیالکوٹ، اورنگ آباد (جس کی صحیح جغرافیائی شناخت ابھی غیر واضح ہے)، گجرات اور پسرور کی آمدنی احمد شاہ کو دینے کا وعدہ کیا گیا تاکہ میر مَنّو اپنی حکومت برقرار رکھ سکے۔

1750ء میں دہلی دربار نے شاہ نواز خان کو صوبہ ملتان کا گورنر مقرر کیا، جو میر مَنّو کے لیے ناقابلِ قبول تھا۔ اس نے کوڑا مل کی سربراہی میں ایک فوج روانہ کی، جس میں ادینہ بیگ خان کی افواج کے علاوہ سکھوں کے نئے بھرتی شدہ دستے بھی شامل تھے، جن کی قیادت جَسّا سنگھ اہلووالیہ کے پاس تھی۔ یہ بات کہ سکھ دستے میر مَنّو کی طرف سے شاہ نواز کے خلاف لڑنے کے لیے روانہ کیے گئے، بعض مؤرخین کے نزدیک مشکوک ہے۔ تاہم چونکہ یہ روایت سکھ وکی پیڈیا جیسے ماخذ میں درج ہے، لہٰذا اسے ایک تاریخی بیانیے کے طور پر شامل کیا گیا ہے، اگرچہ اس کی تاریخی صحت پر مزید تحقیق کی ضرورت باقی ہے۔

In 1750, Shah Nawaz Khan was appointed to the independent charge of the province of Multan by the Delhi rulers much to the chagrin of Mir Mannu, whose authority was thus severely curtailed. He dispatched Kaura Mall to Multan with an army including some forces of Adina Beg Khan and newly recruited contingents of Sikhs under the command of Jassa Singh Ahluwalia.[1]

میر مَنّو، کوڑا مل، سکھوں کی شمولیت، اور احمد شاہ ابدالی کی مداخلت: ایک تاریخی تجزیہ

سید محمد لطیف نے اپنی تاریخی تصنیف میں ملتان کی اُس جنگ کا ذکر کیا ہے جس میں میر مَنّو کے نمائندے، کوڑا مل، نے مغل گورنر شاہ نواز خان کے خلاف کامیابی حاصل کی۔ تاہم، انھوں نے اس حقیقت کا ذکر نہیں کیا کہ اس مہم میں سکھ دستے بھی شامل تھے۔ اگر واقعی سکھ میر مَنّو کے ساتھ مل کر جنگ میں شریک ہوئے تھے، تو یہ امر خاص توجہ کا متقاضی ہے، کیونکہ یہی میر مَنّو وہ شخص تھا جس نے پنجاب میں سکھوں پر بدترین مظالم ڈھائے اور ان کا منظم قتلِ عام کیا۔ اس تناظر میں یہ

[1] https://www.sikhiwiki.org/index.php/Muin_ul_Malik

سوال فطری طور پر اُٹھتا ہے کہ سکھ ایک ایسے شخص کی حمایت میں کیسے شامل ہو گئے جس کے مظالم کا نشانہ وہ خود بنے تھے؟ اس تضاد کی مکمل وضاحت کسی بھی تاریخی ماخذ میں دستیاب نہیں، جس کے باعث یہ ایک پیچیدہ اور محتاط تحقیق طلب سوال بن جاتا ہے۔

جنگ میں فتح حاصل کرنے کے بعد، کوڑا مل نے شکست خوردہ شاہنواز خان کا سر قلم کر کے بطورِ فتح علامت کے، میر مَنّو کے پاس روانہ کیا۔ اس سے متاثر ہو کر میر مَنّو نے اسے ''مہاراجہ بہادر'' کا خطاب عطا کیا اور اسے ملتان کا گورنر مقرر کر دیا۔ کوڑا مل، جو اپنی فتح کا سہرا سکھ سپاہیوں کے تعاون کو دیتا تھا، نے ان سپاہیوں کو کشادہ دلی سے انعامات دیے۔ یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ میر مَنّو، جو ایک طرف سکھوں کا سخت دشمن تھا، وہیں اُس نے ایک مسلم مغل گورنر (شاہنواز خان) کا سر بھی قلم کیا۔ یہ حقیقت اُس کے افعال اور فیصلوں میں موجود سیاسی و ذاتی تضادات کی جانب اشارہ کرتی ہے۔

دسمبر 1751ء میں احمد شاہ ابدالی نے ایک بار پھر پنجاب پر حملہ کیا۔ اس حملے کی بنیادی وجہ میر مَنّو کی طرف سے مالی ادائیگیوں کے متعلق احمد شاہ سے کی گئی وعدہ خلافی تھی۔ 5 مارچ 1752ء کو دونوں افواج کے درمیان جنگ کا آغاز ہوا۔ جنگ کے دوسرے دن کوڑا مل اور ادینہ بیگ اچانک میدانِ جنگ سے غائب ہو گئے، جس کے باعث میر مَنّو کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اگرچہ میر مَنّو نے سخت مزاحمت کی، لیکن بالآخر اُسے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہونا پڑا۔

فتح کے بعد، احمد شاہ ابدالی نے تیس لاکھ روپے بطورِ تاوان وصول کیے، اور 13 اپریل 1752ء کو مغل بادشاہ کی منظوری سے طے پانے والے معاہدے کے تحت لاہور اور ملتان کی باقاعدہ حکمرانی احمد شاہ ابدالی کو منتقل کر دی گئی۔ اس سے قبل وہ ان علاقوں پر محض بلواسطہ اثر و رسوخ رکھتا تھا، مگر اب یہ علاقے اس کی سلطنت کا باقاعدہ حصہ بن گئے۔ احمد شاہ نے میر مَنّو ہی کو لاہور کا گورنر مقرر کر دیا، جو اس بات کا غماز ہے کہ وہ میر مَنّو کی عسکری صلاحیتوں سے متاثر تھا۔

اس دن سے پنجاب پر ایک افغان کا قبضہ ہوا!

تاہم، اسی دوران کوڑا مل کے انتقال کے باعث سکھوں اور میر مَنّو کے درمیان رابطہ منقطع ہو گیا۔ نتیجتاً سکھوں نے مغل و افغان کشمکش سے فائدہ اٹھاتے ہوئے باری دوآب، جالندھر دوآب،

ستلج پار کے علاقے، جند، تھانیسر اور دہلی کے نواحی علاقوں پر اپنا کنٹرول قائم کرلیا۔

میر مَنّو کی احمد شاہ ابدالی کے ساتھ صلح، اور بعد ازاں گورنر کے طور پر تقرری کے بعد، سکھوں کے خلاف ایک مرتبہ پھر سخت کارروائیاں شروع ہو گئیں۔ ریاستی طاقت کو استعمال کرتے ہوئے میر مَنّو نے سکھ مردوں کو قتل کروایا، جبکہ خواتین، بچوں اور دیگر غیر جنگجو افراد کو زنجیروں میں جکڑ کر لاہور لایا گیا۔ ان قیدیوں کو دہلی دروازے کے باہر، سرِ عام، پھانسی دی گئی یا قتل کیا گیا۔ اس دور کو سکھ تاریخ میں جبر و استبداد کا ایک سیاہ باب سمجھا جاتا ہے۔

میر مَنّو کا انجام بھی جلد سامنے آ گیا۔ 4 نومبر 1753ء کو وہ ایک حادثے میں گھوڑے سے گر کر جاں بحق ہوا۔ اگرچہ بعض روایات اس حادثے کو اتفاقیہ قرار دیتی ہیں، تاہم بعض ذرائع کا دعویٰ ہے کہ اسے جان بوجھ کر گھوڑے سے گرا کر ہلاک کیا گیا۔ میر مَنّو کی موت کے ساتھ ہی سکھ طاقت کو دبانے کی ایک اور کوشش ناکام ہو گئی، اور یہ واقعہ سکھ مزاحمت کی تاریخ میں ایک اہم موڑ بن کر ابھرا۔

اسی دور میں ایک پنجابی میں ڈھولہ ہر سکھ کی زبان پر تھا۔ وہ کچھ یوں تھا؛

Mannu is our sickle, and we are his grass blades.

The more he cuts us down, the more we grow.

ਮੰਨੂ ਸਾਡੀ ਦਰਾਤੀ, ਅਸੀਂ ਮੰਨੂ ਦੇ ਚਾਰੇ।

ਜਿੰਨਾ ਮੰਨੂ ਸਾਨੂੰ ਵੱਢਦਾ, ਅਸੀਂ ਹੋਰ ਵੱਧਦੇ ਜਾਵਾਂ।

منو ہماری درانتی ہے،

ہم اس کے لیے چارہ کاٹتے ہیں،

جتنا وہ کاٹتا ہے،

اتنا ہم بڑھتے ہیں۔

تاریخی شواہد کا مطالعہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ وزیر خان، زکریا خان اور میر مَنّو جیسے حکمرانوں نے اپنے سیاسی مفادات اور اقتدار کی بقا کے لیے بارہا سخت اور جابرانہ پالیسیوں کو اختیار کیا۔ ان کے طرزِ حکمرانی میں مذہبی یا انسانی ہمدردی کا فقدان واضح نظر آتا ہے۔ ان کے فیصلے

زیادہ تر طاقت، دباؤ اور حکومتی استحکام پر مرکوز تھے، جن میں سکھوں، ہندوؤں اور دیگر اقلیتوں کے خلاف بے رحمانہ اقدامات شامل تھے۔

یہ بات بھی اہم ہے کہ ان میں سے اکثر حکمران خود مسلمان تھے، تاہم ان کے ظالمانہ اقدامات کو دینِ اسلام سے منسوب کرنا ایک غیر منصفانہ طرزِ فکر ہے۔ انفرادی اعمال کو کسی مذہب کا نمائندہ قرار دینا تاریخی اور دینی دونوں حوالوں سے درست نہیں۔ اسلام ایک امن، عدل اور رواداری کا دین ہے، اور وہ ہر قسم کے جبر و تشدد کی نہ صرف نفی کرتا ہے بلکہ مظلوم کا ساتھ دینے کی تلقین بھی کرتا ہے۔

ایک طالب علمِ تاریخ ہونے کے ناطے، میں اس بات کی شدید مذمت کرتا ہوں کہ کسی بھی حاکم کو مذہب کے پردے میں ظلم و استبداد کا جواز فراہم کیا جائے۔ اسی طرح اُن مؤرخین یا افراد کے طرزِ عمل پر بھی تنقید لازم ہے جو ایسے اقدامات پر خاموشی اختیار کرتے ہیں یا انھیں جائز قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک علمی و تحقیقی رویے کا تقاضا ہے کہ تاریخ کو غیر جانب دار، تنقیدی اور صداقت پر مبنی زاویے سے دیکھا جائے، تاکہ ہم ماضی سے سبق حاصل کر کے ایک بہتر اور انصاف پر مبنی معاشرہ قائم کر سکیں۔

ایک اور قابلِ ذکر پہلو میر مَنّو کے خاندانی پس منظر سے متعلق ہے، جس کا تعلق اُس کی اہلیہ مغلانی بیگم سے ہے۔ تاریخی حوالوں کے مطابق، مغلانی بیگم (جنھیں بعض اوقات مراد بیگم کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے) میر مَنّو کی زوجہ تھیں۔ میر مَنّو کی وفات کے بعد، چونکہ اس کا بیٹا کم عمر تھا، لہٰذا مغلانی بیگم نے عملاً لاہور کے انتظامی امور سنبھال لیے اور ایک عرصے تک سیاسی اثر و رسوخ کی حامل شخصیت کے طور پر فعال رہیں۔

مغلانی بیگم کی شخصیت اتنی نمایاں تھی کہ ان کے کردار کو بعد ازاں ثقافتی و فنی سطح پر بھی پیش کیا گیا۔ 1979ء میں بھارتی فلم ہدایت کار سرجیت سنگھ سیٹھی نے ان کی زندگی اور میر مَنّو کے ساتھ ان کے تعلق پر مبنی ایک پنجابی زبان کی فلم مغلانی بیگم بنائی۔ اس فلم میں مرکزی کردار پریت کنول

نے ادا کیا۔ یہ فلم نہ صرف تاریخی واقعات پر مبنی تھی بلکہ اس میں اس دور کے سیاسی و سماجی حالات کی جھلک بھی دکھائی گئی، جس نے اسے ایک یادگار ثقافتی کاوش بنا دیا۔

مغلانی بیگم اور احمد شاہ ابدالی کا چوتھا حملہ

اب تک کی بیان کردہ تفصیلات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ لاہور پر دہلی دربار کا کسی حد تک اثر ونفوذ قائم تھا۔ میر مَنّو کی وفات کے بعد اُس کے نابالغ بیٹے کو لاہور کا گورنر مقرر کیا گیا، اور اس کی والدہ مغلانی بیگم (جنھیں بعض مؤرخین مراد بیگم کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں) کو اس کا سرپرست بنایا گیا۔ اس کے بعد کے حالات کو سید محمد لطیف نے بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے، اور انھی کی تحریر کی روشنی میں جو کچھ میں نے سمجھا، وہ پیشِ خدمت ہے۔

میر مَنّو کی وفات (1753ء) کے بعد مغل بادشاہ نے اس کے کم سن بیٹے کو پنجاب کا صوبیدار مقرر کیا۔ چونکہ بچہ حکمرانی کے قابل نہ تھا، لہٰذا عملی اقتدار مغلانی بیگم کے ہاتھ میں آ گیا، جنھوں نے بحیثیت نگراں حکمران پنجاب کے امور سنبھالے۔ ان کا دورِ اقتدار سیاسی عدم استحکام، درباری سازشوں اور باہمی رقابتوں سے عبارت تھا۔ یہ بچہ محض دس ماہ کی عمر میں وفات پا گیا، اور مغلانی بیگم کا اقتدار بھی جلد ختم ہو گیا۔ افغان اثر ورسوخ کے بڑھنے کے ساتھ ہی وہ اقتدار سے محروم کر دی گئیں۔

مغلانی بیگم ایک دیدہ ور اور زیرک خاتون حکمران تھیں۔ میرے علم کے مطابق وہ لاہور پر حکمرانی کرنے والی دوسری مسلم خاتون تھیں۔ اس سے قبل برصغیر کی تاریخ میں پہلی مسلم خاتون حکمران کے طور پر رضیہ سلطانہ کو تسلیم کیا جاتا ہے، جن کا تعلق دہلی سلطنت سے تھا اور جن کا اقتدار پنجاب سمیت شمالی ہند کے اکثر علاقوں پر محیط تھا۔ وہ سلطان التمش کی صاحبزادی تھیں۔

اس دور میں دہلی میں مغلانی بیگم کے خلاف شکایت کی گئی، جس کے نتیجے میں اُنہوں نے احمد شاہ ابدالی کو خط لکھا اور اپنے حالات سے آگاہ کیا۔ بیگم کی اپیل پر احمد شاہ ابدالی نے چوتھی مرتبہ پنجاب پر حملہ کیا۔ یہ حملہ دراصل مقامی باہمی کشمکش اور سازشوں کا نتیجہ تھا۔ یاد رہے کہ نہ تو حملہ آور

پنجابی تھا اور نہ ہی دعوت دینے والا۔ البتہ تباہی، قتل و غارت اور ظلم کا شکار پنجاب کی سرزمین اور اس کے باشندے ہی بنے۔

آدینہ بیگ خان: ایک متنازع مگر اہم کردار

پنجاب کے گورنروں پر گفتگو کرتے ہوئے اب تک آدینہ بیگ خان کا ذکر نہیں کیا گیا تھا۔ میر منو کی وفات اور مغلانی بیگم کے زوال کے بعد لاہور کا نظم و نسق آدینہ بیگ خان کے ہاتھ میں آ گیا۔ میرے علم کے مطابق وہ مغل سلطنت کا آخری گورنر تھا جسے لاہور میں باضابطہ مقرر کیا گیا۔

یہ بات پہلے بھی بیان کی گئی ہے کہ احمد شاہ ابدالی، عملی طور پر، ملتان اور لاہور کے حاکم بن چکے تھے اور اب ان علاقوں کے فیصلے اُنہی کی صوابدید پر تھے۔

آدینہ بیگ ایک مغل مسلمان افسر تھے، جو مغل، افغان اور سکھ طاقتوں کے درمیان توازن برقرار رکھتے ہوئے اپنی سیاسی حیثیت کو قائم رکھنے میں کامیاب رہے۔ ان کا دورِ اقتدار 1748ء سے 1758ء تک رہا۔ اس سے قبل وہ صوبہ دوآبہ اور جالندھر کے فوجدار تھے اور میر منو کے ساتھ کئی فوجی مہمات میں شریک رہے۔ آدینہ بیگ نے سکھوں کے ساتھ بسا اوقات لڑائی کی، تو بعض مواقع پر ان سے اتحاد بھی قائم کیا۔ میر منو کے انتقال کے بعد سیاسی خلا کو پُر کرنے کے لیے انھوں نے جسا سنگھ آہلووالیہ سمیت دیگر سکھ سرداروں سے وقتی اتحاد کر لیا۔ ساتھ ہی انھوں نے احمد شاہ ابدالی سے بھی تعلقات برقرار رکھے، جبکہ مراٹھوں اور سکھوں سے بھی روابط استوار کیے۔ آدینہ بیگ کی وفات 1758ء میں ہوئی۔ ان کے بعد پنجاب میں طاقت کا توازن بگڑ گیا اور سکھوں نے تیزی سے اپنے اثر و رسوخ میں اضافہ کرنا شروع کر دیا۔

تاریخی بیانات کے مطابق، آدینہ بیگ ایک موقع شناس، زیرک اور عملیت پسند شخصیت تھے۔ وہ نہ مکمل طور پر مغلوں کے وفادار تھے، نہ ہی ابدالی کے حلیف؛ بلکہ انھوں نے اپنی خودمختاری اور سیاسی بقا کو ہمیشہ مقدم رکھا۔ اگرچہ وہ مستقل حکمران کے طور پر نہیں اُبھر سکے، لیکن ان کی سفارت کاری نے پنجاب کی سیاست اور عسکری حالات پر گہرا اثر ڈالا۔

پہلے بھی یہ ذکر کیا گیا ہے کہ آدینہ بیگ مغل حکومت کے تحت فیروز پور، دوآبہ اور جالندھر کے

علاقوں کے فوجدار تھے، جنھیں آج کے مفہوم میں ایک اعلیٰ فوجی جنرل کہا جا سکتا ہے۔ اُن کے دور میں مغل سلطنت کمزور ہو چکی تھی، احمد شاہ ابدالی کی یلغاریں جاری تھیں اور سکھوں کی طاقت روز بروز بڑھ رہی تھی۔ آدینہ بیگ نے سکھوں کی بڑھتی ہوئی قوت کو نظر انداز کرنے کے بجائے انھیں ایک حقیقت کے طور پر تسلیم کیا، اور موقع کی مناسبت سے ان کے ساتھ اتحاد کیا۔ خاص طور پر جب انھیں مغل مرکز یا افغان حملہ آوروں سے خطرہ محسوس ہوا، انھوں نے سکھوں کو اپنا اتحادی بنایا۔ میرے خیال میں یہ اُن کا نہایت دانشمندانہ اقدام تھا، اگرچہ یہ اتحاد طویل عرصہ قائم نہ رہ سکا۔

نتیجتاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ آدینہ بیگ کی شخصیت ایک لچکدار، سیاسی طور پر ہوشیار اور تاریخی لحاظ سے اہم کردار کی حامل تھی، جنھوں نے ایک انتشار زدہ دور میں مغل، افغان، سکھ اور مراٹھا قوتوں کے بیچ میں توازن قائم رکھنے کی بھرپور کوشش کی۔

کیا آدینہ بیگ ایک مقامی مسلمان تھے؟

اس موضوع پر کئی مضامین دیکھنے کو ملتے ہیں۔ سِکھ وِیکی کے مطابق، آدینہ بیگ صرف چند مہینوں کے لیے پنجاب کا گورنر رہا۔ آدینہ بیگ کا تعلق آرائیں برادری سے تھا۔ وہ لاہور کے قریب واقع گاؤں شرقپور میں پیدا ہوا، جو اب پاکستان کے ضلع شیخوپورہ میں واقع ہے۔ البتہ اس کی پرورش مغل درباروں میں ہوئی، اور وہ زیادہ تر جلال آباد، خان پور اور باجواڑہ (جالندھر دوآب) میں مقیم رہا۔

ایک سپاہی کے طور پر اپنے کیریئر کا آغاز کرتے ہوئے، وہ سلطان پور لودھی کے قریب لوہیاں کے علاقے کے گاؤں کانگ میں پٹواری کے عہدے پر فائز ہوا۔ یہ ایک طویل داستان ہے کہ کس طرح آدینہ بیگ ایک پٹواری سے ترقی کرتے ہوئے پنجاب کا گورنر بن گیا۔ مارچ 1753ء میں ہولی کے تہوار کے موقع پر، آدینہ بیگ نے آنند پور میں سکھ یاتریوں پر حملہ کیا اور ان کی ایک بڑی تعداد کو ہلاک کر دیا۔ اس کے جواب میں سکھوں نے جالندھر اور باری دوآب کے دیہات لوٹ کر جوابی کارروائی کی۔ ان حالات میں، آدینہ بیگ نے اپنے علاقے کی آمدنی کا کچھ حصہ سکھوں کو تفویض کیا، اور جسا سنگھ رام گڑھیا سمیت ان میں سے بہت سے افراد کو اپنی فوج میں شامل کر لیا۔

جب میر مَنّو کا انتقال ہوا، تو آدینہ بیگ نے اس کی بیوہ مراد بیگم (المعروف مغلانی بیگم) کے دور میں دوآبہ میں آزاد حکومت قائم کر لی، اور اس نے اپنا اثر و رسوخ سرہند تک پھیلا لیا۔ بعد ازاں، مئی 1756ء میں مغل حکومت دہلی نے اسے 30 لاکھ روپے سالانہ خراج کی ادائیگی پر لاہور اور ملتان کا گورنر مقرر کیا۔

اس دور میں گورنری حاصل کرنے کے لیے مال خرچ کیا جاتا تھا۔۔۔ اور یہ رواج آج بھی کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔

کیا یہ ممکن تھا کہ سکھ اپنے ازلی دشمن آدینہ بیگ کے ساتھی بن جائیں؟ ہاں، ایسا بھی ہوا۔

آدینہ بیگ خان اور پنجاب میں طاقت کی تشکیلِ نو

جب احمد شاہ ابدالی نے مغلانی بیگم کی درخواست پر پنجاب میں مداخلت کی، تو آدینہ بیگ خان نے شوالک کی پہاڑیوں میں عارضی پناہ اختیار کی۔ تاہم، افغانوں نے اسے دوبارہ جالندھر دوآب کا فوجدار مقرر کر دیا، مگر آدینہ بیگ اس فیصلے سے مطمئن نہ تھا۔ احمد شاہ کے چوتھے حملے کے بعد، جب اس نے اپنے بیٹے تیمور شاہ کو لاہور کا گورنر نامزد کیا، تو آدینہ بیگ نے یہ اقدام قبول نہ کیا۔ چنانچہ اس نے سکھوں سے اتحاد کر کے ہوشیار پور کے قریب محل پور میں افغانوں کو شکست دی۔

آدینہ بیگ نے سکھوں کے ساتھ اپنی شراکت داری کے اعتراف کے طور پر گرو گرنتھ صاحب کے حضور ایک ہزار روپے بطور نذرانہ اور جالندھر دوآب کے لیے ایک لاکھ چوتھائی روپے بطور تحفہ پیش کیے۔ تاہم، جلد ہی اسے اس بات کا ادراک ہو گیا کہ سکھوں کی طاقت خود اس کے اقتدار کے لیے خطرہ بن سکتی ہے۔ اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے، اس نے مراٹھوں کو پنجاب میں مداخلت کی دعوت دی، جو دہلی کو فتح کرنے کے بعد شمال کی جانب بڑھ رہے تھے۔ اس کا مقصد افغانوں کو لاہور سے نکالنا اور سکھوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو محدود کرنا تھا۔ آدینہ بیگ نے مراٹھوں کو مالی مراعات کی پیشکش بھی کی تاکہ وہ اس مہم میں اس کے ساتھ تعاون کریں۔

اپریل 1758ء میں، مراٹھا سالار رگھوناتھ راؤ کی قیادت میں ایک مشترکہ فوج جس

میں سکھ، مراٹھے اور آدینہ بیگ کے حامی شامل تھے۔ لاہور میں داخل ہوئی۔ آدینہ بیگ نے مراٹھوں کو پنجاب کی سالانہ حکمرانی 75 لاکھ روپے کے عوض سونپ دی۔ اس موقع پر، اگرچہ ظاہری طور پر پنجاب پر مغل، افغان اور مراٹھا طاقتیں موجود تھیں، مگر درحقیقت صرف دو قوتیں مؤثر تھیں: آدینہ بیگ اور سکھ۔

آدینہ بیگ نے سکھوں کے خلاف دوبارہ عسکری کارروائیاں شروع کیں۔ اس نے اپنے عسکری وسائل میں اضافہ کیا، اور سکھوں کی پناہ گاہیں تباہ کرنے کے لیے لکڑیاں کاٹنے والے مزدوروں کو بھی بھرتی کیا۔ اس نے امرتسر میں واقع رام رُنی کے قلعے کا محاصرہ کیا۔

یہ پہلا موقع تھا جب ایک مغل نواز مقامی حکمران آدینہ بیگ خان ایک ایسا وسیع اتحاد قائم کرنے میں کامیاب ہوا، جس میں سکھ، مراٹھے، مغلیہ ریاست کے نمائندے (جیسے امام الدولہ) اور پنجابی مسلمان شامل تھے۔ اس اتحاد کا مشترکہ ہدف احمد شاہ ابدالی کی بالادستی کا خاتمہ تھا۔ فروری 1758ء میں جب اس مشترکہ فوج نے سرہند پر قبضہ کیا، تو یہ بات واضح ہوگئی کہ افغان اس اتحاد کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اسی سال احمد شاہ ابدالی نے تیمور شاہ کو پنجاب کا گورنر مقرر کیا، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دہلی کو اپنی حکمرانی میں شامل کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا، بلکہ صرف پنجاب کو اپنی سلطنت کا حصہ بنانا چاہتا تھا کیونکہ یہ افغانستان سے متصل تھا۔ سرہند کی شکست کے بعد تیمور شاہ، اپنی زیادہ تر فوج کے ساتھ لاہور سے فرار ہوگیا۔ اگرچہ وہ خود بچ نکلا، لیکن اس کی افواج کے کئی افغان، خراسانی اور ازبک سپاہی چناب عبور کرنے سے قبل ہی مارے گئے۔

لاہور کی فتح کے بعد اتحادی افواج نے جشن منایا، لیکن جلد ہی اتحاد میں دراڑیں پڑنے لگیں۔ مراٹھے، جو زیادہ تر مالِ غنیمت کی امید پر شامل ہوئے تھے، مایوس ہو گئے کیونکہ نہ تو جنگی اخراجات پورے ہوئے اور نہ ہی خاطر خواہ فتوحات حاصل ہوئیں۔ سکھوں نے موقع کا فائدہ اٹھا کر مراٹھا افواج پر حملے شروع کر دیے، جس سے اتحاد مزید کمزور ہو گیا۔

صورت حال اس وقت بگڑ گئی جب آدینہ بیگ نے مراٹھوں سے کیے گئے مالی وعدے پورے نہ کیے، جس کے نتیجے میں مراٹھوں نے اُس کے کیمپ پر حملہ کر کے اُسے لوٹ لیا۔ رگھوناتھ

راؤ نے اپریل کے آخر میں اس اتحاد سے مایوس ہو کر آدینہ بیگ کی بالادستی تسلیم کر لی اور اپنی افواج کو واپس مہاراشٹر لے گیا۔ تاریخ دان ماجد شیخ کے مطابق، 2 اپریل 1758ء کو پہلی بار مراٹھا فوج لاہور میں داخل ہوئی۔ پونا میں بیٹھے پیشوا نے اسے جے پال کی شکست کا بدلہ قرار دیا، اور مراٹھا حکمران کو لاہور کا پہلا ہندو حکمران تسلیم کیا گیا۔ اگرچہ یہ اقتدار عارضی ثابت ہوا، تاہم مراٹھوں نے بعدازاں پشاور پر بھی قبضہ کر لیا۔

ادھر سکھوں نے آدینہ بیگ کے دوہرے طرزِ عمل سے ناراض ہو کر اس سے علیحدگی اختیار کر لی۔ انھی دنوں دتا جی شندے، ایک نیا مراٹھا کمانڈر، لاہور پہنچا اور وقتی طور پر امن قائم کیا، لیکن سکھوں نے اُس کی قیادت کو دل سے قبول نہ کیا۔ سکھ سردار جَسّا سنگھ اَہلو والیہ اور بابا آلا سنگھ نے حاصل شدہ دولت سے اپنے علیحدہ سیاسی راستے بنانے کا فیصلہ کیا۔ جلد ہی مراٹھوں کو اس حقیقت کا ادراک ہو گیا کہ پنجاب میں وہ متوقع آمدنی حاصل نہیں کر سکتے۔ اس ناکامی کے بعد انھوں نے واپسی کا فیصلہ کیا اور پونا کے پیشوا نے اس مہم کو ''لاہور پر قبضے کی پاگل پن سے بھرپور مراٹھا مہم'' قرار دیا۔ مراٹھوں کے لیے دہلی کے بعد پنجاب میں مغل طرز کی ریاست قائم کرنا ممکن نہ تھا۔

مراٹھوں کی واپسی کے بعد آدینہ بیگ تنہا رہ گیا۔ افغان ایک بار پھر لاہور پر حملہ آور ہوئے۔ ماجد شیخ کے مطابق، بعض افغان سردار پونا میں پیشوا سے ملے اور انھیں پنجاب میں حکومت کرنے کے بدلے خراج دینے کی پیشکش کی۔ تھکے ہوئے مراٹھے اس چال میں آ گئے۔ آدینہ بیگ کے لیے صورت حال شدید خطرناک ہو چکی تھی۔ وہ ایک طرف ابھرتی ہوئی سکھ طاقت، اور دوسری طرف افغان حملہ آوروں کے درمیان گھر چکا تھا۔ تاہم، وہ ان خطرات سے نمٹنے سے قبل ہی 15 ستمبر 1758ء کو وفات پا گیا۔

اس واقعے کا ذکر سکھی ویکیا پر بھی ملتا ہے۔[1] سکھی ویکیا کے مطابق تیمور شاہ (1746-1793)، احمد شاہ درانی کا بیٹا اور جانشین، دسمبر 1746ء میں مشہد، ایران میں پیدا

[1] https//:www.sikhiwikia.org/index.php/Taimur_Shah

ہوا۔ اس وقت اُس کے والد احمد شاہ ابدالی، ایران کے بادشاہ نادر شاہ کے پاس ملازم تھے۔ جب جنوری 1757ء میں احمد شاہ نے ہندوستان پر چوتھی بار حملہ کیا، تو تیمور اُس کے ساتھ دہلی میں موجود تھا۔ اس حملے میں فتح حاصل کرنے کے بعد احمد شاہ ابدالی نے 1757ء میں، تیمور [جس کی عمر صرف گیارہ سال تھی کی شادی مغل بادشاہ عالمگیر ثانی کی بیٹی سے کر دی۔

میرے خیال میں یہ شادی مغل بادشاہ کی مرضی سے نہیں ہوئی ہوگی، بلکہ ایک فاتح کے حکم پر عمل کیا گیا۔ یاد رہے کہ اس موقع پر احمد شاہ ابدالی نے خود بھی ایک مغل شہزادی سے شادی کی تھی۔

دہلی پر حملے کے بعد جب احمد شاہ ابدالی اُسی سال مارچ میں دہلی سے مالِ غنیمت لے کر واپس جا رہا تھا، تو اُسے پٹیالہ خاندان کے بانی، آلا سنگھ، اور سنور و مالیر کوٹلہ کے دیگر سکھ سرداروں نے سخت نقصان پہنچایا۔ یہی وہ سال ہے جب مئی 1757ء میں تیمور کو اُس کے والد نے پنجاب کا گورنر مقرر کیا اور جہاں خان کو کمانڈر ان چیف، بطور سرپرست اور نائب بھی نامزد کیا۔ ایک بار پھر احمد شاہ درانی کے جانے کے بعد، تیمور اور جہاں خان نے اپنی توجہ سکھوں کو سزا دینے پر مرکوز کی۔ اس دور میں انھوں نے امرتسر میں واقع رام راونی قلعے پر حملہ کر کے اُسے زمین بوس کر دیا، مقدس حوض کو گندگی سے بھر دیا گیا، اور ہرمندر و دیگر عبادت گاہوں کو ناپاک کر دیا گیا۔ یہ سب دیکھ کر مشتعل سکھوں نے لاہور کے گرد و نواح میں پورے علاقے کو تہس نہس کر دیا۔

اسی دور کا ایک اہم واقعہ، جس کا ذکر سید محمد لطیف نے بھی کیا ہے، وہ لاہور پر سکھوں کا قبضہ ہے۔ سید محمد لطیف لکھتے ہیں کہ سردار حبہ کلال نے لاہور کو فتح کیا۔ اُس وقت آدینہ بیگ لاہور میں موجود نہیں تھا، افغان واپس جا چکے تھے، اور لاہور کی حفاظت کرنے والا کوئی نہ تھا۔ فتح کے بعد حبہ کلال نے اپنے نام کا ایک سکہ بھی جاری کروایا، جس پر لکھا تھا:

''خالصہ کی مہربانی سے احمد کے ملک میں ایک سکہ ضرب دیا گیا، جسے حبہ سنگھ کلال نے فتح کیا تھا۔''

اس کے بعد ایک مرتبہ پھر کئی جنگیں ہوئیں۔ تیمور نے کئی مواقع پر سکھوں سے جنگ کی،

لیکن ہر بار اسے شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ میں پچھلے صفحات میں اس بات کا ذکر کر چکا ہوں کہ پنجاب میں ایک سال قیام کے بعد، بالآخر اپریل 1758ء میں سکھوں، مراٹھوں اور آدینہ بیگ خان کی مشترکہ فوجوں نے تیمور کو لاہور سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔

احمد شاہ ابدالی کی افواج کے واپس جانے کے کچھ ہی عرصے بعد آدینہ بیگ خان کا انتقال ہو گیا، جس کے بعد پنجاب ایک نئے اور پیچیدہ سیاسی مرحلے میں داخل ہوا۔ یہ ایک طویل دورِ افراتفری کا آغاز تھا، جو تقریباً چالیس برسوں پر محیط رہا۔ اسی عرصے میں سکھ مسلیں تدریجاً علاقائی سطح پر طاقت حاصل کرتی گئیں اور مختلف علاقوں میں اپنی حکمرانی قائم کرتی رہیں۔ اسی دور میں احمد شاہ ابدالی کا پوتا بھی پنجاب پر حملہ آور ہوا، جس سے خطے میں پہلے سے موجود عدم استحکام میں مزید اضافہ ہوا۔

یہ عہد پنجاب کی تاریخ کا ایک انتہائی اہم اور فیصلہ کن مرحلہ ہے، جسے سمجھے بغیر خطے کی سیاسی، سماجی اور عسکری تاریخ کا درست اور مکمل تجزیہ ممکن نہیں۔ اس دور کی تفہیم نہ صرف سکھ طاقت کے ابھار کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے، بلکہ مغلیہ سلطنت کے زوال اور مقامی اقتدار کی تشکیلِ نو کے تناظر میں بھی اس کی بنیادی حیثیت ہے۔

آدینہ بیگ کی وفات کے بعد اس کی فوجیں منظر نامے سے غائب ہو گئیں، اور صرف دو طاقتیں باقی رہ گئیں: سکھوں کی ابھرتی ہوئی قوت، اور افغانوں کی منتشر مگر خطرناک افواج۔ آنے والے چالیس برسوں تک سکھوں کو پنجاب پر مکمل کنٹرول حاصل کرنے کے لیے افغانوں کی یلغاروں اور طویل مزاحمت کا سامنا رہا۔ بالآخر 1799ء میں پہلی بار ایک مقامی پنجابی حکمران مہاراجہ رنجیت سنگھ نے لاہور میں خودمختار حکومت قائم کی، جو آٹھ صدیوں بعد ایک تاریخی سنگِ میل تھا۔

یہاں ایک اہم سوال جنم لیتا ہے کہ آخر کیوں محمود غزنوی کے دور (گیارہویں صدی) سے لے کر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد (انیسویں صدی) تک، یعنی تقریباً آٹھ سو سال کے طویل عرصے میں کوئی مقامی مسلمان لاہور کے تخت پر فائز نہ ہو سکا؟ اس سوال کا ممکنہ جواب

یہ ہوسکتا ہے کہ برصغیر سے باہر سے آنے والے فاتحین غیر معمولی طور پر بہادر، نڈر، اور سیاسی و عسکری لحاظ سے نہایت چالاک اور زیرک تھے، جب کہ وہ افراد، جو ان کے بعد مقامی طور پر اسلام میں داخل ہوئے، سیاسی قیادت اور اقتدار کے تقاضوں پر پورا نہ اتر سکے یا شاید انھیں اقتدار میں شریک ہونے کا موقع ہی نہ دیا گیا۔

میری رائے میں اگر ابتدائی ادوار ہی سے نومسلم مقامی آبادی کو اقتدار کے ڈھانچے میں مؤثر شراکت داری حاصل ہو جاتی، تو ممکن تھا کہ بعد ازاں سکھ اقتدار کو لاہور جیسے اہم سیاسی مرکز تک رسائی نہ ملتی۔ مقامی مسلمان جو مقامی سکھوں کی تہذیب، زبان اور سیاسی مزاج سے بہتر واقفیت رکھتے تھے۔ سکھوں کا مؤثر انداز میں مقابلہ کر سکتے تھے یا ان کے ساتھ اشتراکِ عمل کے ذریعے امورِ سلطنت میں بہتر کردار ادا کر سکتے تھے۔

یہ محض ایک قیاس ہے، جس کی صداقت کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ میری ذاتی فہم اور تاریخی مشاہدے پر مبنی رائے ہے، جسے قطعی یا حتمی تعبیر نہیں سمجھنا چاہیے۔

احمد شاہ ابدالی کا پانچواں حملہ
وڈا گھلوگھارا، اور بابا اعلیٰ سنگھ کی سیاسی حکمت عملی

سید محمد لطیف کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ آدینہ بیگ کے انتقال کے بعد لاہور پر ایک مراٹھا سردار نے عارضی طور پر اقتدار سنبھالا۔ اس دوران، مغربی سمت میں دریائے سندھ کے پار، احمد شاہ ابدالی کی سلطنت قائم تھی، جو بلوچستان، سندھ کے کئی علاقوں اور ملتان تک پھیلی ہوئی تھی۔ احمد شاہ کا بیٹا تیمور شاہ ایک اہم معرکے میں شکست کھا کر پشاور واپس لوٹ چکا تھا۔ انھی سیاسی و عسکری حالات کے تناظر میں احمد شاہ ابدالی نے ایک بار پھر پنجاب میں مداخلت کا فیصلہ کیا۔

ظاہر ہوتا ہے کہ اس حملے کے پیچھے دو بنیادی محرکات کارفرما تھے: اوّل، تیمور شاہ کی شکست کا بدلہ لینے کی ذاتی و خاندانی خواہش؛ دوم، لاہور جیسے اہم اور اقتصادی مرکز پر اپنی حاکمیت کے خاتمے کو سلطنت کے مالی و سیاسی مفادات کے لیے خطرہ سمجھنا۔ چنانچہ 1759ء میں احمد شاہ ابدالی نے سندھ اور بلوچستان کے راستے دوبارہ ہندوستان پر حملہ کیا، جس کے نتیجے میں اس نے پہلے لاہور پر قبضہ کیا اور بعد ازاں 1761ء میں پانی پت کے مقام پر مراٹھوں کو فیصلہ کن شکست دی۔

کرنجیت کور رومانہ اور ان کے رفقا کے مطابق اس پانچویں حملے میں مغل سلطنت سمیت متعدد مسلم ریاستوں نے ابدالی کا ساتھ دیا، جبکہ مراٹھوں کو اس بار کوئی خاطر خواہ اتحادی میسر نہ آ سکا۔ اس پس منظر میں بابا اعلیٰ سنگھ نے، جو ریاست پٹیالہ کے بانی تھے، بعض مواقع پر احمد شاہ ابدالی کی حمایت کی اور اس کی حاکمیت کو تسلیم کیا۔ (انھیں ''اعلیٰ سنگھ'' اور ''آلا سنگھ'' بھی لکھا جاتا ہے۔)

ایک اہم اور متنازع واقعہ جس کا ذکر سکھ تاریخ کی متعدد تحریروں میں ملتا ہے، اس وقت پیش آیا جب بابا اعلیٰ سنگھ نے احمد شاہ ابدالی کی اطاعت قبول کرتے ہوئے 1761ء میں سرہند کی

صوبیداری حاصل کی۔ پروفیسر پرنیمہ دھون (Purnima Dhavan) اپنی کتاب *When Sparrows Became Hawks: The Making of the Sikh Warrior Tradition*, 1699-1799 میں بیان کرتی ہیں کہ سکھ خالصہ کی قیادت نے بابا اعلیٰ سنگھ کے اس اقدام کو ایک غیر ملکی قابض سے مفاہمت قرار دیا۔ نتیجتاً، خالصہ نے 1762ء اور 1764ء میں بابا اعلیٰ سنگھ کے خلاف تادیبی کارروائیاں کیں، اور بالآخر 1765ء میں جرمانے کے بعد انھیں معاف کر دیا گیا۔

اسی دوران 1762ء کا المناک سانحہ، جسے "وڈا گھلوگھارا" یا "عظیم قتلِ عام" کہا جاتا ہے، پیش آیا۔ اس موقع پر بابا اعلیٰ سنگھ نے غیر جانب داری کا رویہ اختیار کیا، جس پر خود احمد شاہ ابدالی نے انھیں سزا دی۔ برنالہ شہر تباہ کر دیا گیا اور بابا اعلیٰ سنگھ کو بھوانی گڑھ میں محصور کر دیا گیا۔ رہائی کے لیے بابا اعلیٰ سنگھ نے پانچ لاکھ روپے تاوان ادا کیا، جبکہ اپنے مذہبی تشخص (داڑھی اور بال) کو محفوظ رکھنے کی اجازت کے لیے مزید ایک لاکھ پچیس ہزار روپے ادا کیے۔

بعض مورخین کے مطابق بابا اعلیٰ سنگھ نے اٹھارہویں صدی کی پیچیدہ سیاسی صورت حال میں ایک محتاط اور موقع شناس حکمت عملی اپنائی۔ ان کے لیے ابدالی کی حمایت، مراٹھا اثر و رسوخ کا توازن قائم رکھنے اور ریاست پٹیالہ کی خودمختاری کو محفوظ رکھنے کی ایک عملی کوشش تھی۔ ان کا یہ اتحاد وقتی اور حالات کے مطابق تھا، نہ کہ مستقل۔

بابا اعلیٰ سنگھ کے انھی اقدامات کی بنا پر انھیں خالصہ کی ناراضی کا سامنا بھی کرنا پڑا، جبکہ دوسری طرف احمد شاہ ابدالی نے ان کی وفاداری کا صلہ دیتے ہوئے انھیں متعدد شاہی اعزازات سے نوازا۔ ان اعزازات میں "راجہ" کا خطاب، شاہی ڈھول، جھنڈا اور سکہ جاری کرنے کی اجازت شامل تھی، جو کسی بھی مقامی حکمران کے لیے خودمختاری اور اقتدار کی علامت سمجھی جاتی تھیں۔

حال ہی میں *Times of India* میں شائع ہونے والے ایک مضمون میں یہاں تک دعویٰ کیا گیا ہے کہ بابا اعلیٰ سنگھ نے سکھوں کو احمد شاہ ابدالی کے ہاتھوں "فروخت" کر دیا تھا۔ اگرچہ یہ بیان مبالغہ آمیز محسوس ہوسکتا ہے، تاہم اس سے اس تاریخی تنازعے کی شدت اور اس پر

جاری مباحث کا اندازہ ضرور ہوتا ہے۔[1]

بالآخر، بابا اعلیٰ سنگھ کی شخصیت اس دور میں ایک ایسے سیاست دان کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے جس نے مروجہ اصولوں سے ہٹ کر، ایک عملی اور مفاہمتی حکمت عملی اختیار کی۔ ان کے اقدامات نے سکھ تاریخ میں ایک مستقل بحث کو جنم دیا کہ ریاستی بقا کی خاطر سیاسی لچک کہاں تک قابلِ قبول ہوسکتی ہے۔

احمد شاہ ابدالی کا پانچواں حملہ اور لاہور کی دوسری جنگ

1759ء میں احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر اپنا پانچواں حملہ اُس وقت کیا جب اُسے اطلاع ملی کہ سکھ افواج نے لاہور پر قبضہ جما لیا ہے۔ لاہور جیسے اہم سیاسی وجغرافیائی مرکز پر سکھوں کا غلبہ ابدالی کے لیے ناقابلِ برداشت تھا، کیونکہ وہ پنجاب کے متعدد علاقوں، بالخصوص لاہور اور ملتان کو اپنی سلطنت کا حصہ تصور کرتا تھا۔ اس پس منظر میں، ابدالی نے خود لاہور پر حملہ کرنے کے بجائے اپنے قابلِ اعتماد جرنیل جہان خان کو ایک منظم اور مضبوط لشکر کے ہمراہ سکھوں کو سبق سکھانے کے لیے روانہ کیا۔ اس فوج کی تعداد چالیس ہزار کے قریب بتائی جاتی ہے۔

اس جنگ کی تفصیلات کئی تاریخی ذرائع میں محفوظ ہیں، جن میں ڈاکٹر گنڈا سنگھ کی مستند تصنیف *Sardar Jassa Singh Ahluwalia* بھی شامل ہے۔ یہ کتاب سکھ تاریخ کے سنجیدہ قارئین کے لیے نہایت اہمیت رکھتی ہے۔ گنڈا سنگھ کے مطابق، لاہور کی دوسری جنگ نومبر 1759ء میں وقوع پذیر ہوئی، جس میں سکھ افواج کی قیادت جسا سنگھ اہلووالیہ کے ہاتھ میں تھی، جبکہ افغان فوج کی سربراہی جہان خان کر رہا تھا۔[2]

---

[1] https://timesofindia.indiatimes.com/city/chandigarh/captain-amarinder-singhs-ancestor-sold-sikhs-to-abdali-for-patiala-cm-bhagwant-mann/articleshow/109962752.cms

[2] https//:archive.org/details/SardarJassaSinghAhluwalia_651/page/n118/mode/1up

معرکہ آرائی کے دوران سکھوں نے مؤثر عسکری حکمتِ عملی اختیار کی۔ جسا سنگھ اور جے سنگھ نے افغان افواج پر دائیں سمت سے حملہ کیا، جبکہ باقی سکھ لشکر نے بائیں جانب سے دھاوا بولا۔ اگر افغان فوج دائیں سمت سے حملہ آور ہوتی تو سکھ لشکر بائیں جانب سے جوابی کارروائی کرتا۔ یہ ایک شدید معرکہ تھا، جس کا اختتام رات کے وقت دونوں افواج کی پسپائی پر ہوا۔ اس جنگ میں افغان فوج کے تقریباً دو ہزار سپاہی مارے گئے اور جہان خان خود بھی زخمی ہوا۔ اگرچہ سکھ افواج وقتی طور پر پسپا ہوئیں، لیکن اس معرکے نے افغانوں کو غیر معمولی نقصان پہنچایا۔

بعد ازاں کی تاریخی روایات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ جنگ میں افغانوں کو سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا، مگر لاہور پر ابدالی کی نامزد کردہ حکومت بدستور قائم رہی۔ کرن جیت کور رومانہ کے مطابق، افغان گورنر سکھوں کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ سے اس قدر خائف تھا کہ اُس نے لاہور کو ترک کر کے جالندھر کو اپنا عارضی صدر مقام بنالیا۔ جب سکھوں نے لاہور پر مکمل قبضے کا فیصلہ کیا اور اس مقصد کے لیے پیش قدمی کی، تو افغان گورنر نے صلح کی پیشکش کی، جسے سکھوں نے وقتی طور پر قبول کر لیا۔ صلح کے تحت افغان گورنر نے سکھوں کو ''پرشاد'' کے طور پر تیس ہزار روپے دیے، جسے قبول کرنے کے بعد سکھ افواج واپس چلی گئیں۔ [1]

تاہم، یہ صلح زیادہ دیر پا نہ رہی۔ جب احمد شاہ ابدالی 1761ء میں پانی پت کی تیسری جنگ میں فتح کے بعد واپس جا رہا تھا، تو سکھوں نے موقع پا کر اُس کے قافلے کو مختلف مقامات پر مسلسل ہراساں کیا۔ ان واقعات کی تفصیل آئندہ صفحات میں پیش کی جائے گی۔

پانی پت کی تیسری جنگ: ایک تجزیاتی مطالعہ

پانی پت کی تیسری جنگ 14 جنوری 1761ء کو مراٹھا سلطنت اور افغان حکمران احمد شاہ ابدالی (درّانی) کے درمیان لڑی گئی۔ یہ معرکہ دہلی کے شمال میں واقع پانی پت کے میدان میں پیش آیا، جو اُس وقت جی ٹی روڈ پر ایک اسٹریٹیجک مقام کی حیثیت رکھتا تھا۔ (راقم کو ذاتی طور پر

[1] https//:ijrar.org/papers/IJRAR1903795.pdf

اس تاریخی میدان کے مشاہدے کا موقع ملا۔)

اس جنگ میں ایک جانب مراٹھا افواج تھیں، جن کی قیادت سداشیوراؤ بھاؤ اور پیشوا کے فرزند وشواس راؤ کر رہے تھے، جبکہ دوسری جانب افغان لشکر کی قیادت خود احمد شاہ ابدالی کے ہاتھ میں تھی، جسے شمالی ہندوستان کے چند مسلم امراء، خصوصاً نجیب الدولہ (روہیلا سربراہ) اور شجاع الدولہ (نواب اودھ) کی مکمل حمایت حاصل تھی۔

اس جنگ کا بنیادی سبب مراٹھا سلطنت کا شمالی ہند کی جانب پھیلاؤ اور دہلی پر قبضہ تھا، جس سے مقامی مسلم حکمرانوں کو اپنے اقتدار اور مذہبی شناخت کے حوالے سے شدید خطرات محسوس ہونے لگے۔ انھی خطرات کے پیشِ نظر نجیب الدولہ نے احمد شاہ ابدالی کو دعوت دی کہ وہ مداخلت کرے اور مراٹھا طاقت کو روکے۔ اسی تناظر میں برصغیر کے جلیل القدر اسلامی مفکر اور مصلح، شاہ ولی اللہ دہلوی نے بھی احمد شاہ کو خطوط لکھ کر شمالی ہند میں مسلمانوں کی مذہبی، سماجی اور سیاسی بقا کے لیے مداخلت کی اپیل کی۔

ایک معروف یوٹیوبر، رفیق وڑائچ، کے بیان کے مطابق بعض راجپوت ہندو راجاؤں نے بھی احمد شاہ ابدالی کو مراٹھوں کے خلاف مداخلت کرنے اور ان کی پیش قدمی کو روکنے کے لیے خطوط ارسال کیے تھے۔ تاہم، موجودہ تحقیقی مطالعات اور معتبر تاریخی ماخذ میں اس دعوے کی کوئی مصدقہ شہادت دستیاب نہیں ہوسکی۔ میری ذاتی تحقیق کے مطابق، اس دور کی راجپوت اور جاٹ ریاستوں میں سے کسی نے بھی عملی طور پر مراٹھا افواج کا ساتھ نہیں دیا۔

اگرچہ جنگ کے بعد راجہ سورج مل کی جانب سے زخمی مراٹھا فوجیوں کی امداد اور پناہ دینے کے واقعات مختلف تاریخی مصادر میں ضرور ملتے ہیں، لیکن مجموعی طور پر خطے کی مقامی ہندو ریاستوں نے مراٹھا قوت کے ساتھ کوئی باقاعدہ اتحاد یا فوجی معاونت فراہم نہیں کی۔ اس رویّے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان کے متعدد مقامی راجے، بشمول راجپوت اور جاٹ حکمران، مراٹھا اقتدار کو اپنے علاقائی مفادات اور خودمختاری کے لیے ایک ممکنہ خطرہ تصور کرتے تھے۔ اس لیے یہ بعید از قیاس نہیں کہ وہ احمد شاہ ابدالی جیسے کسی طاقتور خارجی عنصر کی مداخلت کو اُس وقت مراٹھا طاقت کے تدارک کے طور پر دیکھتے ہوں۔

اس جنگ سے قبل بھی مراٹھوں اور ابدالی کے درمیان کئی جھڑپیں ہو چکی تھیں۔ ایک قابلِ ذکر واقعہ وہ جنگ تھی جو آدینہ بیگ کی قیادت میں سکھوں اور مراٹھوں نے مل کر احمد شاہ کے بیٹے تیمور شاہ کے خلاف لڑی اور کامیابی حاصل کی۔ تاہم، پانی پت کی تیسری جنگ ایک فیصلہ کن اور ہمہ گیر معرکہ تھا۔

مراٹھا افواج کی تعداد زیادہ تھی اوران کے سپاہیوں نے بے مثال بہادری کا مظاہرہ کیا، مگر ان کی سپلائی لائنز کمزور تھیں، داخلی ہم آہنگی کا فقدان تھا، اور وہ طویل محاصرے کے باعث تھک چکے تھے۔اس کے برعکس احمد شاہ ابدالی کے لشکر کو نہ صرف تجربہ کار کمانڈ حاصل تھی، بلکہ ان کی فوج میں گھڑسوار دستے، گولہ بارود اور منصوبہ بندی میں برتری نمایاں تھی۔ جنگ کے اختتام پر مراٹھا فوج کو فیصلہ کن شکست ہوئی، اور مورخین کے مطابق تقریباً ایک لاکھ افراد، جن میں فوجی اور عام شہری شامل تھے، ہلاک ہوئے۔ وشواس راؤ اور سداشیو راؤ بھاؤ بھی اسی جنگ میں مارے گئے۔

احمد شاہ ابدالی نے فتح کے کچھ عرصے بعد ہندوستان چھوڑ دیا اور واپس افغانستان چلے گئے۔ اگرچہ اس جنگ سے مغلیہ سلطنت کی وقتی حفاظت ممکن ہوئی، لیکن وہ اب بھی داخلی کمزوریوں کا شکار رہی۔ دوسری جانب، مراٹھے کچھ برسوں بعد دوبارہ منظم ہوئے، لیکن پانی پت کی اس شکست نے ان کے شمالی ہند پر تسلط کے خواب کو شدید نقصان پہنچایا۔

میں یہاں جنگ کی تفصیل بیان کرنا نہیں چاہتا۔ میرا مقصد جنگ کا پس منظر اور اس کے پنجاب کے سماج پر اثرات کے بارے میں جو کچھ میں جان سکا، وہ آپ کے سامنے رکھنا ہے۔ اس جنگ کے بارے میں درج ذیل تین کتابیں پڑھنے کے قابل ہیں:

Marathas and Panipat by Hari Ram Gupta

An Account Of The Last Battle Of Panipat And Of The Events Leading To It by H. G. Rawlinson

Advanced Study in the History of Modern India 1707-1813 by Jaswant Lal Mehta

پانی پت کی تیسری جنگ کے اسباب: ایک تحقیقی جائزہ

میں نے اپنی کتاب بھارت کے چار سفر لکھتے ہوئے مراٹھوں کے بارے میں بہت کچھ جاننے کا موقع پایا۔ اس کے بعد بھی مراٹھوں سے متعلق متعدد کتابیں دیکھنے اور پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ جو کچھ میں جان سکا، وہ پیشِ خدمت ہے۔

پانی پت کی تیسری جنگ (1761ء) کے اسباب کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اٹھارہویں صدی کے وسط میں برصغیر کی سیاسی و عسکری صورتِ حال کا جائزہ لیا جائے۔ مراٹھا سلطنت کی جنوبی ہند سے شمالی ہند کی جانب توسیع پسندی ایک کلیدی سبب تھی۔ دہلی، آگرہ اور پنجاب پر مراٹھا اقتدار کے قیام نے مقامی حکمرانوں، بشمول مسلمان، ہندو، جاٹ اور دیگر قومیتی طبقات کو تشویش میں مبتلا کر دیا۔ مراٹھوں کی مسلسل پیش قدمی نے شمالی ہند میں طاقت کا توازن بگاڑ دیا، اور کسی بھی مقامی ریاست کے لیے ان کا تنہا مقابلہ کرنا ممکن نہ رہا۔

اس دوران مغلیہ سلطنت زوال کی آخری حدوں کو چھو رہی تھی۔ دہلی کے تخت پر براجمان شاہ عالم ثانی محض ایک نمائشی بادشاہ رہ گیا تھا، جسے کوئی عملی سیاسی اختیار حاصل نہ تھا۔ اس خلا کو پُر کرنے کے لیے مختلف طاقتور مقامی قوتیں متحرک ہوئیں، جن میں روہیلہ سردار نجیب الدولہ نمایاں تھے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ مراٹھا طاقت کی پیش رفت شمالی ہند کے سیاسی و مذہبی توازن کے لیے خطرہ ہے، چنانچہ انھوں نے افغانستان کے حکمران احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان آ کر مراٹھوں کے خلاف فیصلہ کن کارروائی کی دعوت دی۔

احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان میں مداخلت پر آمادہ کرنے میں صرف سیاسی نہیں بلکہ مذہبی عوامل بھی کارفرما تھے۔ دہلی کے ممتاز اسلامی مفکر اور مصلح شاہ ولی اللہ دہلوی نے احمد شاہ کو خطوط ارسال کیے، جن میں انھوں نے مسلمانوں کے مذہبی، ثقافتی اور سیاسی وجود کے تحفظ کے لیے مدد کی اپیل کی۔ ان کے نزدیک، مراٹھا تسلط مسلمانوں کی اجتماعی شناخت کے لیے شدید خطرہ تھا۔

اس جنگ کے پس منظر میں ایک اور اہم واقعہ وہ شکست ہے جو احمد شاہ ابدالی کے بیٹے، تیمور شاہ کو 1758ء میں پنجاب میں آدینہ بیگ، سکھوں اور مراٹھوں کے اتحاد کے ہاتھوں ہوئی۔

یہ شکست نہ صرف عسکری بلکہ احمد شاہ ابدالی کے وقار کے لیے بھی ایک شدید ضرب تھی، جس کا بدلہ لینے کا ارادہ اُس کی ہندوستان کی طرف دوبارہ پیش قدمی کا ایک اہم سبب بنا۔

مزید برآں، مقامی ہندو ریاستوں، خصوصاً راجپوت اور جاٹ ریاستوں کا مراٹھوں پر عدم اعتماد بھی اس جنگ کا ایک غیر رسمی مگر اہم سبب سمجھا جا سکتا ہے۔ اگرچہ ان ریاستوں نے براہ راست احمد شاہ کی مدد نہیں کی، تاہم مراٹھا غلبے سے ان کی ناراضی اس حد تک تھی کہ وہ خاموشی سے ابدالی کی پیش قدمی پر رضامند دکھائی دیتی تھیں۔ مراٹھا اقتدار کو وہ اپنی آزادی کے لیے خطرہ تصور کرتی تھیں، اور ان کی طرزِ حکمرانی کو مقامی روایات کے منافی سمجھتی تھیں۔

آخرکار، مراٹھوں کی داخلی کمزوریاں ہی جیسے ناقص تنظیم، مقامی حمایت کا فقدان، اور زیرِ تسلط علاقوں میں سخت گیر رویہ ہی بھی ان کے خلاف عوامی نفرت کا باعث بنیں۔ اگرچہ کوئی دستاویزی ثبوت موجود نہیں کہ ہندو راجاؤں نے احمد شاہ کو مداخلت کی دعوت دی، لیکن ان کی خاموشی اور بعد ازاں زخمی مراٹھا سپاہیوں کی مشروط امداد سے یہ قیاس ضرور کیا جا سکتا ہے کہ وہ مراٹھا بالادستی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ پنجاب کی معیشت پر بھی اس جنگ اور اس کے بعد کی شورشوں کے تباہ کن اثرات مرتب ہوئے۔ مسلسل فوجی نقل وحرکت، حملوں اور لوٹ مار نے زرعی پیداوار کو متاثر کیا، تجارتی راستے غیر محفوظ ہو گئے، اور کسان و دستکار طبقہ شدید متاثر ہوا۔ نتیجتاً دیہی اور شہری معیشت دونوں زوال پذیر ہو گئیں، اور کئی علاقے ویران ہو گئے۔ اس عدم استحکام کے باعث نقل مکانی کا رجحان بڑھا اور معاشرتی ڈھانچہ عدم توازن کا شکار ہو گیا۔

مزید برآں، پانی پت کی جنگ کے بعد برصغیر میں سیاست کو مذہبی بنیادوں پر ترتیب دینے کا رجحان نمایاں ہوا۔ شاہ ولی اللہ دہلوی کی احمد شاہ ابدالی کو دعوت ایک مذہبی دفاع کے نقطۂ نظر سے دی گئی تھی، جس کا مقصد مسلمانوں کے مذہبی، تہذیبی اور سیاسی مفادات کا تحفظ تھا۔ یہی فکر پنجاب میں بھی منتقل ہوئی، جہاں مذہب محض انفرادی عقیدہ نہیں بلکہ سیاسی شناخت اور گروہی تقسیم کی بنیاد بنتا گیا۔ اس فکری اور عملی تبدیلی کے نتیجے میں سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان کشیدگی کو ایک مذہبی رنگ ملا، جس کا اثر آئندہ عشروں میں واضح طور پر محسوس ہوا۔

یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ پانی پت کی تیسری جنگ نے برصغیر کی تاریخ میں ایک ایسا رخ پیدا کیا جس نے مغلیہ زوال کو حتمی شکل دی، سکھ طاقت کو ابھرنے کا موقع دیا، اور برطانوی استعماری طاقت کی راہ ہموار کی۔ پنجاب، جو کبھی تہذیبی ہم آہنگی اور معاشی خود کفالت کا گہوارہ تھا، اس جنگ کے بعد مسلسل عدم استحکام، فرقہ واریت، اور معاشی زوال کا شکار ہو گیا۔

یہ بھی ایک قابلِ توجہ نکتہ ہے کہ احمد شاہ ابدالی کی جانب سے سکھوں کے خلاف کی جانے والی کاروائیاں دونوں برادریوں کے درمیان ایک ایسی خلیج پیدا کر گئیں، جسے بعد میں پاٹنا ممکن نہ رہا۔ اس خلیج کی گہرائی کا اظہار تقسیم ہند کے دوران پنجاب میں ہونے والے خونی فسادات سے بھی ہوتا ہے۔ اگر ماضی میں مذہبی بنیادوں پر سیاست اور جنگوں کی بنیاد نہ رکھی جاتی، تو ممکن ہے کہ برصغیر آزادی تو حاصل کرتا، مگر پنجاب کو تقسیم کی اذیت سے نہ گزرنا پڑتا۔ یہ ایک ذاتی قیاس ہے، جو حتمی نہیں، مگر تاریخی مشاہدے اور تناظر میں اسے نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔

وڈا گھلُو گھارا: جب محبت کی دھرتی پنجاب، پنجاب نہ رہی

احمد شاہ ابدالی نے اپنے پانچویں حملے کے دوران، 13 جنوری 1761ء کو پانی پت کی عظیم جنگ میں مراٹھوں کو فیصلہ کن شکست دی۔ اس جنگ کے بعد، 22 مارچ 1761ء کو وہ بھاری مالِ غنیمت اور ہزاروں مرد و زن قیدی بنا کر افغانستان کی طرف واپس روانہ ہوا۔ لاہور میں اس نے اپنے نمائندے مقرر کیے اور مطمئن تھا کہ اب درانی سلطنت کا یہ اہم صوبہ کسی خطرے سے محفوظ ہے۔ تاہم، زمینی حقائق اس کے اندازے کے برعکس نکلے۔

ابھی وہ راستے ہی میں تھا کہ اپریل 1761ء میں سکھوں نے اس کے قافلے پر تابڑ توڑ حملے کیے، قیدیوں کو رہا کر کے ان کے گھروں کو واپس بھیجا، اور مالِ غنیمت کا ایک بڑا حصہ ضبط کر لیا۔ ابدالی نے لاہور پہنچ کر سکھوں کو قابو میں لانے کی کوشش کی، لیکن اس کی افواج کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ جلد ہی اسے افغانستان میں اپنی پوزیشن مضبوط کرنے کے لیے واپس جانا پڑا، چنانچہ وہ مئی 1761ء میں کابل کی طرف روانہ ہو گیا۔ تاہم، سکھوں نے اس کا تعاقب جاری رکھا اور دریائے اٹک عبور کرنے سے قبل ہی بیشتر قیدیوں کو آزاد کروا لیا۔ احمد شاہ کی واپسی کے بعد، سکھوں

نے ان تمام افراد اور ریاستوں سے انتقام لینا شروع کیا جنھوں نے ابدالی کی فوجی مہمات میں اس کی حمایت کی تھی، خصوصاً گجرات، سیالکوٹ، سرہند اور مالیر کوٹلہ کے علاقوں سے۔

ان حالات کے سیاق وسباق کو سمجھنے کے لیے ایک اہم ماخذ طہماس نامہ ہے، جسے فارسی میں طہماس خان المعروف ''مسکین'' نے تحریر کیا۔ اس کا انگریزی ترجمہ پی۔ سیتو مدھاوراؤ نے کیا۔ یہ ایک ذاتی خودنوشت ہے جس میں مصنف نے میر مَنّو کے دربار، مغلانی بیگم کے ساتھ فرار، اور 1750ء تا 1782ء کے درمیانی عرصے کے اہم سیاسی وفوجی حالات کا آنکھوں دیکھا حال قلم بند کیا ہے۔ یہ تحریر پنجاب کی تاریخ کے لیے ایک قیمتی دستاویز ہے۔

پانی پت کی فتح کے بعد، سکھ پنجاب کے مختلف علاقوں میں پھیل گئے اور انھوں نے اپنی الگ الگ نیم خودمختار ریاستیں (مسلیں) قائم کرنا شروع کر دیں۔ ابدالی کو سکھوں کی مزاحمتی کارروائیوں کی خبر ملی تو اس نے جنرل نورالدین بامزئی کو بھیجا، جسے سکھوں نے شکست دی۔ اس کے بعد لاہور کے گورنر خواجہ عبید خان ایک بڑی فوج لے کر آیا، لیکن وہ بھی ناکام رہا، اور سکھوں نے نہ صرف افغان فوج کو شکست دی بلکہ لاہور پر قبضہ کر کے اپنی حکومت قائم کر لی۔ سردار جسّا سنگھ اہلووالیہ کو ''سلطان القوم'' کا لقب دیا گیا اور ان کے زیر انتظام گرونانک کے نام پر سکہ جاری کیا گیا، جو درانی اقتدار کے خاتمے کی علامت تھا۔

اسی سال دیوالی کے موقع پر، 1761ء میں، سکھوں نے امرتسر میں اجلاس منعقد کیا اور فیصلہ کیا کہ ابدالی کے تمام مقامی حمایتیوں پر حملے کیے جائیں۔ سردار جسّا سنگھ نے جنڈیالہ کے ہندو راجپوت سردار عاقل داس کو پیغام دیا کہ وہ خالصہ کے سامنے ہتھیار ڈال دے۔ لیکن عاقل داس نے خفیہ طور پر ابدالی سے مدد طلب کی، جو اس وقت واپسی کے سفر میں تھا۔ عاقل داس کی فریب کاری نے ابدالی کو دوبارہ پنجاب کی طرف لوٹنے پر مجبور کر دیا۔

فروری 1762ء میں، احمد شاہ ابدالی نے مالیر کوٹلہ کے قریب گاؤں ''کُپ'' پر حملہ کیا، جہاں بڑی تعداد میں سکھ اپنے خاندانوں کے ساتھ موجود تھے۔ سکھوں نے اپنے اہلِ خانہ کے گرد دفاعی حلقہ بنا کر بے جگری سے لڑائی کی، لیکن افغان افواج نے ان کا دفاع توڑ کر ہزاروں

سکھوں کو شہید کر دیا۔ اس دل دہلا دینے والے سانحے کو ''وڈا گھلُو گھارا'' یعنی ''عظیم قتل عام'' کہا جاتا ہے۔ اسی سال اپریل میں، بیساکھی کے موقع پر، احمد شاہ ابدالی نے گولڈن ٹیمپل (دربار صاحب) پر حملہ کیا، عمارت کو منہدم کیا اور روایت ہے کہ عمارت کی ایک اینٹ اڑ کر اس کی ناک پر لگی، جس کا زخم زندگی بھر باقی رہا۔

اس حملے کے بعد، سکھوں نے شدید ردِعمل ظاہر کیا اور زین خان کے خلاف ایک بڑی فوج کشی کی، جو اس وقت لاہور میں مقیم تھا۔ سکھوں نے اسے شکست دی اور لاہور کے گردونواح کے مزید علاقے فتح کیے۔ جب ابدالی کو افغانستان میں بغاوت کی اطلاع ملی تو وہ جلد پنجاب چھوڑ کر واپس روانہ ہوا۔ اس کے جانے کے بعد، سکھوں نے مکمل طاقت سے دوبارہ منظم ہو کر خالصہ کی قیادت میں پنجاب کے مختلف علاقوں میں اپنی حکومتیں قائم کر لیں۔

وڈا گھلُو گھارا: ایک اجتماعی سانحہ اور اس کے پنجاب پر سماجی و سیاسی اثرات

سکھ ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے مطابق ''وڈا گھلُو گھارا'' جو سکھوں کی عظیم نسل کشی کے طور پر جانا جاتا ہے۔ فروری 1762ء میں مالیرکوٹلہ کے قریب کپ رہیرا کے مقام پر وقوع پذیر ہوا۔ اس سانحے کا پس منظر احمد شاہ ابدالی کے برصغیر پر چھٹے حملے سے جڑا ہے، جس کا بنیادی مقصد سکھ قوت کو کچلنا اور ان کی ابھرتی ہوئی عسکری و سیاسی حیثیت کو ختم کرنا تھا۔ سکھ، جن میں جنگجو اور غیر جنگجو عوام دونوں شامل تھے، اس مقام پر افغان افواج کے نرغے میں آ گئے۔ سکھ جنگجوؤں نے جانثاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے عورتوں، بچوں اور بزرگوں کے گرد حفاظتی حصار قائم کیا اور ان کے تحفظ کی کوشش کی، لیکن افغان افواج کی عددی و عسکری برتری نے ان کوششوں کو ناکام بنا دیا۔ مؤرخین کے مطابق، اس قتلِ عام میں 25,000 سے 40,000 کے درمیان سکھ مارے گئے ہوئے جو سکھ تاریخ میں ایک دن کا سب سے بڑا جانی نقصان شمار کیا جاتا ہے۔

تاہم، اس عظیم المیے کے صرف سات ماہ بعد، 17 اکتوبر 1762ء کو دیوالی کے دن، سکھوں نے سردار جسا سنگھ اہلووالیہ کی قیادت میں امرتسر کی تیسری جنگ میں احمد شاہ ابدالی کی افواج کو فیصلہ کن شکست دے کر اپنی اجتماعی مزاحمتی طاقت کا عملی ثبوت دیا۔ یہ فتح ایک مکمل سورج گرہن کے

دوران حاصل کی گئی، جسے سکھ برادری نے ایک روحانی اور تاریخی انقلاب کے طور پر یاد رکھا۔ یہ دن وڈا گھلُو گھارا کے تباہ کن اثرات کے بعد سکھوں کی بحالی، اتحاد اور سیاسی عروج کا نقطۂ آغاز بن گیا۔

سکھ دانشوروں کے مطابق ''وڈا گھلُو گھارا'' اور دربار صاحب (ہرمندر صاحب) کی بے حرمتی محض المناک واقعات نہ تھے، بلکہ یہ وہ علامتی لمحے تھے جو سکھ قوم کی قربانی، استقامت اور روحانی پامردی کے مظہر بنے۔ یہی وہ سنگِ میل تھے جنھوں نے سکھ ریاست کے قیام کی راہ ہموار کی۔ ان واقعات کی کوکھ سے جنم لینے والی اجتماعی مزاحمت نے بالآخر مہاراجہ رنجیت سنگھ کی قیادت میں سکھ سلطنت کے قیام کی بنیاد رکھی، اور انیسویں صدی کے اوائل میں سکھ طاقت نے پنجاب میں مسلم اشرافیہ کی جگہ لے لی۔

''وڈا گھلُو گھارا'' کو سکھ تاریخ میں ایک منظم نسل کشی کی کوشش کے طور پر یاد کیا جاتا ہے، جس نے ''چڑھدی کلا'' (ابدی اُمید) اور ناانصافی کے خلاف غیر متزلزل مزاحمت کے سکھ تصور کو جِلا بخشی۔ جس لمحے سکھ قوم کو مکمل تباہی کا سامنا تھا، اسی لمحے اس نے نئی توانائی کے ساتھ خود کو منظم کیا، اپنی عسکری قوت کو دوبارہ استوار کیا، اور اپنے وجود کو ایک سیاسی قوت کے طور پر مستحکم کیا۔ یہ سانحہ ایک ایسا تاریخی موڑ تھا جس نے نہ صرف سکھوں کی قومی شناخت کو تشکیل دیا بلکہ پنجاب پر ان کے حتمی تسلط کی بنیاد بھی رکھی۔

آج بھی سکھ برادری ''وڈا گھلُو گھارا'' اور ہرمندر صاحب کی بے حرمتی کو اپنی قومی یادداشت میں قربانی، صبر اور روحانی وقار کی علامت کے طور پر محفوظ رکھتی ہے۔ اگرچہ ان واقعات نے ناقابلِ تصور جانی نقصان پہنچایا، تاہم سکھ برادری نہ صرف اپنی بقا کو ممکن بنانے میں کامیاب ہوئی بلکہ ایک مضبوط اور باوقار قوم کے طور پر ابھری۔ یہ واقعات سکھ تاریخی شعور، اجتماعی یکجہتی، اور آزادی کے حصول کے جذبے کو تقویت دینے میں مرکزی کردار رکھتے ہیں۔

یہ سانحہ صرف سکھوں کے لیے ہی نہیں بلکہ ہر ذی شعور انسان کے لیے ایک دردناک یاد ہے۔ ایک عام مسلمان قاری کی حیثیت سے، جو اس واقعے کو آج 265 برس بعد پڑھتا ہے، اس نتیجے پر پہنچنا ناگزیر ہے کہ ظلم و جبر سے کسی قوم کو، خواہ وہ اقلیت میں ہو، فنا نہیں کیا جاسکتا۔ اس جنگ میں، جس

میں معصوم بچوں اور عورتوں کو بھی نشانہ بنایا گیا، کسی صورت میں اخلاقی یا مذہبی تائید ممکن نہیں۔

یہی وہ واقعہ تھا جس نے پنجاب جو کبھی صوفی روایتوں اور باہمی محبت کا استعارہ تھا کو مستقل کشیدگی کے ماحول میں جھونک دیا۔ 1762ء کے بعد سے لے کر 1947ء تک، سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان متعدد خونریز جھڑپیں ہوئیں، جن کی جڑیں وڈا گھلو گھارا جیسے تاریخی سانحات میں پیوست نظر آتی ہیں۔ اگر جنگ ہوتی، تو میدانِ جنگ میں صرف ان کے خلاف ہوتی جو ہتھیاروں سے لیس ہوتے، نہ کہ نہتے عورتوں اور بچوں کے خلاف۔

اس قتلِ عام کے بعد پنجاب کے سماجی تانے بانے پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ جہاں ایک طرف سکھ برادری نے اجتماعی شعور، تنظیمِ نو، اور عسکریت میں خود کو مضبوط کیا، وہیں دوسری جانب مسلم اشرافیہ کی سیاسی بالادستی زوال پذیر ہونا شروع ہوئی۔ اس سانحے نے نہ صرف مذہبی اقلیتوں اور اکثریتی طبقات کے درمیان فاصلہ پیدا کیا بلکہ پنجاب کی ہم آہنگ تہذیب کو ایک مستقل تناؤ کا شکار کر دیا۔ اگرچہ دونوں جانب سے جنگی ضابطوں کی خلاف ورزی کی گئی، تاہم عام انسانی زاویے سے دیکھا جائے تو ''وڈا گھلو گھارا'' ایک ایسا ناقابلِ فراموش المیہ ہے جو آئندہ نسلوں کو ظلم و جبر کے خلاف کھڑے ہونے، اور انسانیت و اصولوں کو جنگی جنون پر فوقیت دینے کا پیغام دیتا ہے۔

اس جنگ کے بعد چالیس برس تک پنجاب میں جنگ و جدل کا ماحول قائم رہا۔ پنجاب کی تاریخ کو سمجھنے کے لیے اس دور کے چند اہم واقعات کا ذکر ضروری ہے۔

سرہند کی جنگ (1764ء): زین خان سِرہندی کی شکست و ہلاکت

احمد شاہ ابدالی نے اپنی واپسی سے قبل زین خان سِرہندی کو صوبہ سرہند کا فوجدار مقرر کیا تھا۔ اس سے اس بات کا پتا چلتا ہے کہ اب صوبیدار احمد شاہ ابدالی مقرر کرتا تھا۔ اس کا یہ واضح مطلب نکلتا ہے کہ اب سرہند جو پنجاب کا ایک اہم شہر تھا مغل سلطنت کے پاس نہیں تھا۔ جنوری 1764ء میں سکھ افواج نے سرہند پر ایک فیصلہ کن حملہ کیا، جس کے نتیجے میں زین خان مارا گیا اور افغان اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔ اس جنگ کے اسباب، واقعات اور نتائج کو کئی مورخین نے تفصیل سے

قلم بند کیا ہے، جن میں ہر کشن سنگھ سرجیت اور سید محمد لطیف کے بیانات بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔

1746ء کے خونریز واقعے ''وڈا گھلُو گھارا'' کے بعد سکھ قوم میں شدید غم و غصہ پایا جاتا تھا۔ اس قومی صدمے کی شدت صرف جانی نقصان تک محدود نہ تھی بلکہ سکھوں کے مذہبی و روحانی مراکز کی بے حرمتی نے اس ردِعمل کو مزید شدید کر دیا تھا۔ اسی پس منظر میں سکھوں نے انتقامی کارروائی کے طور پر سرہند پر حملے کی تیاری کی، جہاں زین خان کو نہ صرف احمد شاہ ابدالی کی افواج کی نمائندگی حاصل تھی بلکہ اس پر ظلم و ستم میں برابر کا شریک ہونے کا الزام بھی عائد کیا جاتا تھا۔

زین خان سرہندی کو صوبے کی گورنری کے دوران شدید داخلی چیلنجز کا سامنا تھا۔ بدعنوانی، ناقص انتظامیہ اور مالی بحران کے باعث وہ اپنی افواج اور ریاستی عملے کو باقاعدہ تنخواہیں دینے سے قاصر ہو چکا تھا۔ نتیجتاً، اس کی فوج کے کئی سپاہی اسے چھوڑ کر نجیب الدولہ جیسے دیگر افغان سرداروں سے جا ملے۔ اس کا سابق ملازم اور عینی شاہد، طہماس خان مسکین، جس نے 1763ء کے آغاز میں اس کی ملازمت ترک کی، زین خان کی حرص اور ناکارکردگی سے سخت نالاں تھا۔ بالآخر، زین خان کو یہ ادراک ہو چکا تھا کہ نہ صرف وہ سیاسی طور پر تنہا ہو چکا ہے، بلکہ عسکری طور پر بھی سکھوں کا سامنا اسے اپنی محدود قوت سے کرنا ہوگا۔

سکھوں کی چالیس ہزار پر مشتمل مسلح اور منظم فوج نے سرہند پر زبردست حملہ کیا۔ زین خان نے ابتدائی طور پر جوابی حملے کی کوشش کی اور ترنا دل کے کیمپ پر شب خون مارا، مگر سکھ افواج کی پیشگی منصوبہ بندی اور باہمی ہم آہنگی نے اسے فوراً چاروں جانب سے گھیر لیا۔ فرار کی کوشش کے دوران زین خان کو گولی ماردی گئی اور وہ موقع پر ہی ہلاک ہوگیا۔ اس کی فوج بدحواسی کے عالم میں منتشر ہوگئی، لیکن سکھوں نے ان کا تعاقب جاری رکھتے ہوئے بڑی تعداد میں سپاہیوں کو تہہ تیغ کر دیا۔ زین خان کی ہلاکت کے بعد سکھوں نے شہر سرہند پر قبضہ کرلیا۔ مورخین کے مطابق، شہر میں داخل ہوکر ہر گھر کو لوٹا گیا، قیمتی سامان، سونا، چاندی اور زیورات ضبط کیے گئے، اور مردوں کو قتل کر دیا گیا البتہ بچے، بوڑھے اور ہندو اس قتلِ عام سے مستثنیٰ رہے۔

شہر کو نذرِ آتش کر دیا گیا اور بیشتر عمارات، بالخصوص مساجد، کو منہدم کر دیا گیا۔ سکھوں نے

اس قلعے کی دیواریں بھی گرادیں، جہاں گرو گوبند سنگھ کے دو کم سن صاحبزادوں کو مغل حکام نے زندہ دیوار میں چنوایا تھا۔ اسی مقام پر ''فتح گڑھ صاحب'' کے نام سے ایک یادگار گردوارہ تعمیر کیا گیا۔

اگرچہ سکھ افواج کا آغاز میں سرہند پر قبضے کا ارادہ نہیں تھا، تاہم زین خان کی شکست اور شہر کی کمزور دفاعی حالت نے انھیں اس موقع سے فائدہ اٹھانے پر آمادہ کیا۔ یہ فتح سکھوں کی عسکری تاریخ میں ایک اہم سنگِ میل ثابت ہوئی، جس نے نہ صرف ان کے علاقائی اثر ورسوخ کو بڑھایا بلکہ درانی سلطنت کے زوال کو بھی نمایاں کر دیا۔

سرہند کی فتح کے بعد علاقائی سیاسی منظرنامہ اور کابلی مل کی تقرری

سرہند کی فیصلہ کن جنگ کے بعد یہ امر واضح ہو گیا کہ ستلج اور جمنا کے درمیانی علاقے میں سکھوں کا اقتدار قائم ہو چکا تھا۔ اگرچہ ملتان اور لاہور بدستور احمد شاہ ابدالی کی درانی سلطنت کے زیرِ اثر تھے، تاہم سکھوں کی عسکری قوت اور مقامی حمایت میں روز افزوں اضافہ ہو رہا تھا۔ اسی سیاق و سباق میں، 1763ء میں، احمد شاہ ابدالی نے ''کابلی مل'' نامی ایک ہندو کھتری کو لاہور کا فوجدار (گورنر) مقرر کیا۔ یہ تقرری ایک ایسے وقت میں کی گئی جب ابدالی قندھار واپس روانہ ہو چکا تھا اور خطۂ پنجاب داخلی خلفشار اور طاقت کے خلا کا شکار تھا۔

کابلی مل کی تقرری محض مذہبی شناخت کی بنیاد پر نہیں، بلکہ ایک مدبرانہ سیاسی و انتظامی حکمتِ عملی کے تحت عمل میں آئی۔ کابلی مل کا تعلق لاہور کے ایک بااثر کھتری خاندان سے تھا، جسے مقامی معاشرت، تجارتی حلقوں اور سماجی ڈھانچے میں نمایاں مقام حاصل تھا۔ احمد شاہ ابدالی کے لیے ایسے شخص کی ضرورت تھی جو مقامی سطح پر اثر و رسوخ رکھتا ہو، شہری نظم ونسق قائم رکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو، اور سکھوں کے ساتھ ممکنہ مفاہمت کی راہ بھی ہموار کر سکے۔

مراٹھوں، سکھوں اور مغلوں کے درمیان مسلسل کشمکش کے باعث پنجاب میں حکمرانی کا خلا پیدا ہو چکا تھا، جسے پُر کرنے کے لیے ابدالی کو ایک مقامی اور قابلِ اعتماد نمائندے کی ضرورت تھی۔ لاہور میں ہندو تاجروں اور بنیوں کی ایک بڑی اور منظم برادری موجود تھی۔ کابلی مل کی تقرری کے ذریعے درانی سلطنت اس طبقے کی حمایت حاصل کرنا چاہتی تھی تاکہ محصولات کی وصولی اور

مالیاتی نظام کو مستحکم کیا جا سکے۔ مغلیہ سلطنت میں بھی ہندو راجے اور وزراء (مثلاً راجہ مان سنگھ، راجہ ٹوڈر مل) اعلیٰ انتظامی عہدوں پر فائز رہے تھے۔ ابدالی نے بھی اسی طرزِ حکمرانی کو اپناتے ہوئے مذہب پر سیاست کو ترجیح دی۔ سابقہ عسکری ناکامیوں کے بعد، ابدالی اب سکھوں کو فوجی طاقت کے بجائے سیاسی مفاہمت کے ذریعے قابو میں لانے کی کوشش کر رہا تھا، جس میں کابلی مل ایک موزوں رابطہ کار ثابت ہو سکتا تھا۔

کابلی مل کے گورنر بننے کے بعد سکھوں نے ایک بار پھر لاہور پر حملہ کیا۔ اس دوران، جب کابلی مل شہر سے باہر ڈوگرہ سپاہیوں کی بھرتی میں مصروف تھا، سکھوں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور لاہور پر قبضہ جما لیا۔ ان کی اس کارروائی سے درانی سلطنت کو شدید دھچکا پہنچا۔ کابلی مل نے شہر پر اپنا تسلط برقرار رکھنے کی متعدد کوششیں کیں، مگر وہ سکھوں کی بڑھتی ہوئی عسکری قوت کے مقابلے میں ناکام رہا۔ کابلی مل کی تقرری بلاشبہ ایک غیر معمولی مگر دانشمندانہ فیصلہ تھا، جو اس وقت کے زمینی حقائق، انتظامی تقاضوں اور سیاسی ترجیحات کے عین مطابق تھا۔ تاہم، یہ تقرری درانی سلطنت کو درپیش بڑے چیلنجز کا مستقل حل نہ بن سکی۔ لاہور اور سرہند پر سکھوں کے قبضے نے احمد شاہ ابدالی کو ایک مرتبہ پھر فوجی کارروائی پر مجبور کیا، جو اس کے ساتویں حملے کا پیش خیمہ بنا۔

احمد شاہ ابدالی کا ساتواں حملہ:

سکھ مزاحمت، مذہبی بے حرمتی اور درانی زوال کی ابتدا: احمد شاہ ابدالی کے ہندوستان پر ساتویں حملے کا تنقیدی و تجزیاتی جائزہ متعدد مؤرخین نے پیش کیا ہے۔ ان میں سرِ فہرست سید محمد لطیف ہیں، جنھوں نے اپنی معروف تصنیف میں اس ناکام و تباہ کن حملے کی تفصیل بیان کی ہے۔ علاوہ ازیں، محقق "سمنا ورشنے" (Sumna Varshney) نے اپنے مضمون "The Myth of Afghan King Ahmad Shah Abdali and Triumph of the Sikhs" میں سکھ مزاحمت کو بیانیے کی صورت میں مؤثر انداز سے پیش کیا ہے۔ دیگر کتب اور تحقیقی ذرائع سے بھی

اس حملے کے اسباب، نتائج اور اثرات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔[1]

چھٹے حملے میں احمد شاہ ابدالی نے سکھوں کے خلاف شدید ظلم و جبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے وسیع پیمانے پر قتلِ عام کیا تھا۔ اسے یہ خام خیالی تھی کہ سکھ قوم اب دوبارہ سر نہ اٹھا سکے گی۔ مگر ابدالی کی واپسی کے بعد سکھوں نے خود کو منظم کیا اور تیزی سے طاقت حاصل کی، یہاں تک کہ انھوں نے سرہند اور لاہور جیسے اہم مقامات پر قبضہ کر لیا۔ سکھوں نے ابدالی کے نامزد کردہ متعدد افغان گورنروں (فوجداروں) کو قتل کر دیا اور اب ان کا اثر و رسوخ ستلج سے بڑھ کر راوی تک پھیل چکا تھا۔

ان حالات نے احمد شاہ ابدالی کو ایک بار پھر شمالی ہند پر حملے پر مجبور کیا، حالانکہ اس بار اسے مقامی سطح پر کسی نے بھی دعوت نہیں دی تھی۔ یہ اس کا ساتواں حملہ تھا، جو جنوری 1764ء میں عمل میں آیا۔ اس حملے کا بنیادی محرک اس کی گرتی ہوئی سیاسی ساکھ اور عسکری ناکامیوں کا ازالہ تھا۔ سرہند اور لاہور پر سکھوں کا قبضہ، اور کابلی مل (ابدالی کا مقرر کردہ گورنر) کی انتظامی ناکامی اس کے لیے باعثِ تشویش بن چکی تھی۔ مغربی پنجاب اور افغانستان میں اس کی دھاک کم ہو رہی تھی، جس کے پیشِ نظر اس نے طاقت کا مظاہرہ ضروری سمجھا۔

ابدالی نے لاہور پہنچ کر سکھوں کے خلاف فوجیں روانہ کیں، تاہم اب سکھ جنگِ آزادی کے ماہر گوریلا جنگجو بن چکے تھے۔ انھوں نے روایتی میدانِ جنگ کے بجائے چھاپہ مار حملوں اور تھکاؤ حکمتِ عملی کے ذریعے افغان فوج کو نقصان پہنچایا۔ غصے میں آ کر ابدالی نے سکھوں کے گھروں، دیہاتوں اور فصلوں کو نذرِ آتش کیا اور مذہبی مقامات کی شدید بے حرمتی کی۔ دو ماہ تک جنوبی لاہور میں قتل و غارت اور تباہی کے باوجود وہ سکھوں کو فیصلہ کن شکست دینے میں ناکام رہا۔

اسی دوران افغانستان میں نئی بغاوتوں کی اطلاعات موصول ہونے پر احمد شاہ ابدالی کو بغیر کسی قابلِ ذکر کامیابی کے واپس کابل لوٹنا پڑا۔ اس کی واپسی کے بعد سکھوں نے نہ صرف اپنی طاقت کو مستحکم کیا بلکہ خالصہ کی قومی میٹنگ میں خود کو پنجاب کی غالب سیاسی و عسکری قوت قرار دیا۔ کابلی مل جموں فرار ہو گیا، اور سکھوں نے لاہور کا محاصرہ کر کے مکمل قبضہ حاصل کر لیا۔

[1] https//:www.heritageuniversityofkerala.com/journalPDF/Volume6/60pdf

سید محمد لطیف کے مطابق، جیسے ہی ابدالی واپس ہوا، سکھوں نے تیزی سے حملے کیے اور لاہور پر قبضہ کرلیا۔ شہر کا گورنر کابلی مل رنجیت دیو کے پاس پناہ لینے پر مجبور ہوا۔ اس کے بھائی امیر سنگھ کو ایک محفل موسیقی کے دوران گرفتار کر کے زنجیروں میں جکڑ دیا گیا، اور اس کی جائیداد کو خالصہ کی ضبطی قرار دیا گیا۔ شہر کی لوٹ مار کے بعد اسے تین سرداروں کے درمیان تقسیم کر دیا گیا: جنوب میں نیاز بیگ سوبہ سنگھ کے سپرد ہوا، مشرقی حصہ بھنوں والی کابلی مل کو، جبکہ باقی علاقہ سودھا سنگھ کو عطا ہوا۔ لاہور کی بادشاہی مسجد کی سنگِ مرمر پر کندہ ایک فارسی شعر اس شکست کا گواہ ہے:

جہانے خراب شد
(ایک دنیا خراب ہوگئی ہے)

سکھوں کی بالادستی کے بعد دو سال تک انھوں نے باہم اتحاد، نظم اور سیاسی شعور کا مظاہرہ کیا۔ باوجود اس کے کہ ہر سردار آزاد اور خودمختار تھا، لیکن مذہب وملت کے دفاع کے لیے انھوں نے ایک دولتِ مشترکہ کی صورت اختیار کی۔ ہر سال امرتسر میں اجلاس منعقد ہوتا، جہاں حکمتِ عملی طے کی جاتی، اور مفتوحہ علاقوں کے باشندوں سے ''راکھی'' کے نام پر زرِ تحفظ وصول کیا جاتا۔

لطیف مزید لکھتے ہیں کہ سکھوں نے جہلم سے ستلج تک کے علاقے آپس میں تقسیم کر لیے۔ انھوں نے قصور کے پٹھانوں کا محاصرہ کیا، گجرات کے مغل حاکم جہاں خان کو بھاگنے پر مجبور کر دیا، اور سیالکوٹ کا محاصرہ کرلیا۔ مساجد کی بے حرمتی اور افغان قیدیوں کی تذلیل سکھ انتقام کی شدت کا مظہر تھیں۔

خالصہ کے حکم پر ایک سکہ جاری کیا گیا، جس پر تحریر تھا:
گرو گوبند نے نانک سے دیغ، تیغ اور فتح حاصل کی۔

یہ دراصل پنجاب میں مغل وابدالی اقتدار کے اختتام اور سکھ اقتدار کے آغاز کا رسمی اعلان تھا۔

ایک اہم نکتہ، جو سید محمد لطیف نے بیان کیا ہے، یہ ہے کہ احمد شاہ ابدالی نے اپنے وزیر ولی خان کے مشورے پر بابا اعلیٰ سنگھ کو اس کی ریاست کا حکمران تسلیم کیا اور اسے اس کی گدی پر برقرار رکھا۔ مؤرخین کے مطابق، احمد شاہ ابدالی کا ساتواں حملہ نہ صرف عسکری طور پر ناکام تھا، بلکہ اس

کے زوال کی ابتدا بھی ثابت ہوا۔ وہ جو کبھی فاتحِ پانی پت تھا، اب ایک مایوس، تھکا ہوا اور پسپا ہوتا ہوا حکمران بن چکا تھا، جو پنجاب میں اپنا تسلط برقرار رکھنے سے قاصر رہا۔

یہ سب جان کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ احمد شاہ ابدالی کے متواتر حملوں نے اٹھارھویں صدی کے شمالی ہندوستان کے سیاسی منظرنامے کو غیر معمولی حد تک متاثر کیا۔ تاہم، مؤرخین کی آرا اور مختلف معاصر شواہد کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ اس کے ساتویں اور نسبتاً ناکام حملے کے بعد نہ صرف درانی اقتدار کی گرفت کمزور پڑی، بلکہ مغل اور درانی دونوں سلسلے شمالی پنجاب میں کوئی پائیدار سیاسی ڈھانچہ قائم کرنے میں ناکام رہے۔ اگرچہ بعدازاں احمد شاہ ابدالی، اس کا بیٹا تیمور شاہ، اور پوتے نے اس خطے پر دوبارہ اقتدار حاصل کرنے کی سعی کی، لیکن یہ کوششیں عارضی اور غیر مؤثر ثابت ہوئیں۔ اس تحقیقی مطالعے میں ان تمام کوششوں کا تاریخی وتنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

یہ کہنا بھی درست ہے کہ احمد شاہ ابدالی کا ساتواں حملہ نہ صرف اس کی عسکری اور سیاسی کمزوری کا مظہر تھا، بلکہ یہ حملہ شمالی پنجاب میں مغل و درانی اقتدار کے زوال کا نقطۂ آغاز بھی ثابت ہوا۔ اس کے بعد کی تمام فوجی کارروائیاں، خواہ وہ خود احمد شاہ ابدالی کی ہوں یا اس کے جانشینوں کی، سیاسی استحکام یا علاقائی قبضے کے قیام میں ناکام رہیں۔

سید محمد لطیف لکھتے ہیں کہ اس بار سکھ یہ سمجھ گئے تھے کہ:

''عاقبت اندیشی، بہادری کا بہترین حصہ ہے۔''

میرے نزدیک یہ وہ بنیادی تبدیلی تھی جس نے سکھوں کو فتح سے ہمکنار کیا۔ اب وہ جوش کے ساتھ ساتھ ہوش سے بھی کام لے رہے تھے۔

برسبیلِ تذکرہ، ایک بات کا ذکر ضروری ہے:

کابل شاہی وہ پہلے لوگ تھے جنھوں نے شمالی ہندوستان جس میں شمالی پنجاب ایک اہم علاقہ تھا پر حکومت کی۔ اس سے پہلے مقامی راجپوت ریاستیں موجود تھیں، لیکن وہ رقبے میں چھوٹی

اورعسکری لحاظ سے کمزور تھیں۔اس کا ثبوت یہ ہے کہ جے پال کے بعد کوئی بھی ریاست محمود غزنوی اوراس کے بعد آنے والے افغانوں کو وسطی ہندوستان تک جانے سے نہ روک سکی۔

پنجاب پر 1001ء سے لے کر مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت (1799ء) تک، یعنی تقریباً 798 سال، وسطی ایشیا، ایران اور افغانستان سے آنے والے مسلمان ہی حکمران رہے۔ آٹھ صدیوں بعد، جب ابدالی کی اولاد اپنی سلطنت کی حفاظت کے قابل نہ رہی، تو ایک مقامی حکمران، رنجیت سنگھ، پنجاب کے ساتھ ساتھ شمالی ہندوستان پر بھی حکومت کرتا ہے۔ یہ سکھ ریاست بھی صرف پچاس سال کے بعد انگریزوں کے ہاتھوں ختم ہو جاتی ہے، اور اب شاہی قلعے کی بجائے گورنر ہاؤس بنتا ہے۔ ایک سات سمندر پار سے آیا ہوا گورا یہاں کا راجہ بن جاتا ہے۔ پھر یہ سلسلہ سو سال تک چلتا ہے۔

تقسیمِ ہند کے وقت پنجاب کو بھی تقسیم کر دیا جاتا ہے۔مغربی پنجاب میں، جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی، مسلمان ہی حکمران بنے۔ ان حکمرانوں کی فہرست میں اکثریت وسطی ایشیا، ایران اور افغانستان سے آنے والے مسلمان حملہ آوروں کی اولاد پر مشتمل تھی۔ بہت کم ایسے افراد کو تخت نشین ہونے کا موقع ملا، جن کے آباؤ اجداد کا تعلق ہندوستان سے تھا اور جنھوں نے اپنا دھرم (ہندو، بدھ یا سکھ) چھوڑ کر اسلام قبول کیا ہو، جیسے جاٹ، راجپوت، گجر، ڈوگرو غیرہ۔

میرے خیال میں پاکستان کے قیام کے بعد بھی، سیاسی، معاشی اور فوجی قیادت کے مناصب پر زیادہ تر مسلمان حملہ آوروں کی اولاد ہی فائز رہی ہے۔ بہت کم ایسے مسلمان قیادت میں نظر آئے ہیں جنھیں ہندوستان کی دھرتی کا سپوت کہا جا سکے۔ دوسری طرف، ہندوستان کی تمام تر قیادت وہاں کے مقامی ہندوؤں کے پاس ہی رہی ہے۔

تقسیمِ ہند کے وقت ہندوستان میں دو طرح کی مسلمان ریاستیں تھیں:

وہ علاقے جہاں مسلمان اکثریت میں تھے اور ان کے حکمران بھی مسلمان تھے (بہاولپور، مکران، بیلہ، قلات، گلگت، ہنزہ، چترال، سوات، دیر) اور وہ دو ریاستیں جہاں کی اکثریت ہندو تھی، لیکن حکمران مسلمان تھے (حیدرآباد، جوناگڑھ)۔

ان تمام ریاستوں کے حکمران ایران، افغانستان، وسطی ایشیا اور عرب سے آنے والے مسلمان حملہ آوروں کی اولاد میں سے تھے۔ اس فہرست میں کوئی بھی ایسا حکمران نہیں تھا جس نے ہندومت یا کوئی اور مذہب چھوڑ کر اسلام قبول کیا ہو یا وہ ان کی نسل سے تعلق رکھتا ہو۔ کیا اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ برصغیر کے وہ مقامی افراد جو مختلف ادوار میں اسلام قبول کرتے گئے، عموماً سماجی طور پر پسماندہ طبقات سے تعلق رکھتے تھے؟ اور اسی وجہ سے وہ اقتدار، زمین داری یا ریاستی مناصب کے حصول میں کامیاب نہ ہو سکے؟ برصغیر میں مسلم حکمرانی کے طویل دورانیے کے دوران مذہبی، سیاسی اور عسکری قیادت پر نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان مناصب پر اکثریتی طور پر وہ افراد فائز رہے جو باہر سے آنے والے حملہ آوروں یا ان کے رفقاء کی اولاد سے تعلق رکھتے تھے۔ مقامی نومسلم افراد کی اعلیٰ ریاستی مناصب پر موجودگی شاذ و نادر ہی نظر آتی ہے۔

یہ صورت حال آج بھی کسی حد تک برقرار دکھائی دیتی ہے، اگرچہ حالیہ چند برسوں میں اس میں معمولی مگر قابلِ توجہ تبدیلی کے آثار نمایاں ہونے لگے ہیں۔ اس تاریخی رجحان سے یہ سوال جنم لیتا ہے کہ آیا خارجی حملہ آور مسلمان مقامی نومسلموں سے زیادہ ذہین، بہادر یا نظم و نسق کے لحاظ سے بہتر تھے؟ بادی النظر میں یہ رائے قائم کی جا سکتی ہے، تاہم اس کی ایک اور توجیہہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ بیرونی حملہ آوروں نے اعتماد اور اختیار کا مرکز انھی افراد کو بنایا جو ان کے ساتھ آئے تھے یا ان کی ثقافت، زبان اور نسلی پس منظر میں شریک تھے۔

نتیجتاً ایک ایسی مسلمان اشرافیہ وجود میں آئی جو خارجی نسب کی حامل تھی اور بادشاہوں کی قربت، درباری تعلقات، اور ریاستی نوازشات کی بنیاد پر مقامی مسلم و غیر مسلم آبادی پر حکمرانی کی اہل ٹھہری۔ اس طبقے کو نہ صرف اعلیٰ عہدے اور جاگیریں عطا ہوئیں، بلکہ ان کے اختیارات نسل در نسل موروثی حیثیت اختیار کر گئے، جس نے مقامی مسلمانوں کی سیاسی اور سماجی حیثیت کو مزید محدود کر دیا۔ آج بھی ان ہی خاندانوں کہ اکثریت ہمیں برسرِ اقتدار نظر آتی ہے۔

احمد شاہ ابدالی کا آٹھواں اور آخری حملہ:

جنگ سے صلح کی طرف ایک تاریخی موڑ: احمد شاہ ابدالی کو اس کے ساتویں حملے (1764ء) میں کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ اس کے واپسی کے فوری بعد سکھوں نے بھرپور عسکری کارروائیاں شروع کردیں اور جمنا سے لے کر جہلم تک کے وسیع علاقوں پر عملاً قبضہ کرلیا۔ اس کے نتیجے میں نہ صرف احمد شاہ ابدالی کا کنٹرول ختم ہوگیا بلکہ پنجاب سے مالی وسائل کا حصول بھی اس کے لیے ناممکن ہوگیا۔ اس دوران پنجاب کا سیاسی، عسکری اور معاشرتی منظرنامہ بنیادی طور پر تبدیل ہو چکا تھا، جو درانی حکومت کے خاتمے اور سکھ ریاستوں کے قیام کی ابتدائی صورت میں دیکھا جاسکتا ہے۔

تاریخی شواہد سے ظاہر ہوتا ہے کہ ساتویں حملے میں احمد شاہ کی جانب سے سکھوں کے خلاف کی گئی کارروائیوں، جن میں دیہات جلانا، کھیت اجاڑنا، اور مذہبی مقامات کی توہین شامل تھی، وقتی اثر تو رکھتی تھیں، مگر سکھوں کی مزاحمتی قوت کو ختم نہ کرسکیں۔ ابدالی کے جاتے ہی اس کا نامزد کردہ گورنر "کابلی مل" لاہور چھوڑ کر جموں فرار ہوگیا، اور درانی اقتدار عملاً صرف کاغذی حیثیت میں باقی رہ گیا۔

دوسری جانب، سکھوں نے سیاسی اور عسکری لحاظ سے زبردست پیش رفت کی۔ انھوں نے لاہور پر قبضہ کر کے اسے تین حصوں میں تقسیم کردیا، جو مختلف سکھ سرداروں کو دے دیے گئے۔ اس سے پنجاب میں موجود چھوٹی مسلم ریاستیں، جیسے مغل، پٹھان اور درانی نمائندے، کمزور ہوگئیں اور سکھ اقتدار کے سامنے بے بس ہوگئیں۔ سکھوں نے قصور، گجرات، سیالکوٹ، اور جہلم کے درمیانی علاقوں پر بھی قبضہ کرلیا۔ مغل گورنر جہاں خان کو روہتاس چھوڑ کر سیالکوٹ فرار ہونا پڑا، جہاں بعد میں اس کا محاصرہ کیا گیا۔

سکھ سرداروں نے مفتوحہ علاقوں سے "راکھی" کے نام پر باقاعدہ مالی نظام متعارف کرایا، جس کے تحت مقامی تاجر و کسان محصول ادا کر کے سکھوں کی سرپرستی اور عسکری تحفظ حاصل کرتے تھے۔ یہ نظام انتظامی و مالی لحاظ سے سکھوں کی ایک باقاعدہ ریاستی حیثیت کی علامت تھا۔ ان

حالات میں احمد شاہ ابدالی کو افغانستان میں بھی داخلی شورشوں اور خطرات کا سامنا تھا۔ پنجاب میں اس کی مقرر کردہ اتھارٹی مکمل طور پر تحلیل ہو چکی تھی۔ اسی صورت حال میں اس نے 1766ء میں آٹھواں اور آخری حملہ کیا، مگر اس بار اس کی حکمتِ عملی مختلف تھی۔ وہ اب جنگ کی بجائے سکھوں سے مفاہمت اور دوستی کی راہ اختیار کرنا چاہتا تھا۔

اس حکمتِ عملی کی بنیاد اس احساس پر تھی کہ پچھلے سات حملوں کے باوجود سکھوں کو مستقل شکست دینا ممکن نہیں، اور اس کے نامزد گورنر سکھوں کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ لہٰذا اس بار احمد شاہ نے سکھوں کو دوست بنانے کی کوشش کی۔ اس ضمن میں پٹیالہ کے راجہ کو ''راجگن مہندر بہادر'' کا خطاب دیا گیا، اسے درانی سلطنت کا پرچم اور سکہ ڈھالنے کی اجازت دی گئی۔ سید محمد لطیف کے مطابق اس سکے پر درج تھا:

''حکم شد از قادر، یزدان، باجِر پادشاہ سکہ زن بر سیم و زر از اوج ماہ تا جاہ۔''

(''قادرِ مطلق، خداوند یزدان کے حکم سے جاہ و جلال والے بادشاہ کا سکہ چاندی اور سونے پر جاری ہوا، ماہتاب کی بلندی سے لے کر زمین کی وسعت تک۔'')

اور پشت پر لکھا تھا:

''سن جلوس میمنت مانوس ضرب سرہند''

(''بادشاہ کے تخت نشین ہونے کے مبارک سال میں، یہ سکہ سرہند میں جاری کیا گیا۔'')

اسی طرح، لاہور کے بھنگی سردار لہنا سنگھ کو بھی درانی شاہی اختیارات دینے کی کوشش کی گئی۔ اس کو پھل بھیجے گئے۔ مگر اس نے انکار کرتے ہوئے کہا، ''پھل بادشاہوں کے لیے ہوتے ہیں، ہمارے لیے چنے ہی کافی ہیں۔''

ہارتے ہوئے دشمن سے دوستی کون کرتا ہے؟

ایسا ہی سکھوں نے کیا۔

اس آٹھویں حملے کے دوران احمد شاہ کو ہر مقام پر شدید مزاحمت کا سامنا رہا۔ اس کی بارہ ہزار فوج کا بڑا حصہ واپس کابل روانہ ہو گیا۔ مجبوراً احمد شاہ نے واپسی کو بہتر سمجھا، مگر اس بار سکھوں

نے دریائے سندھ تک اس کا پیچھا کیا، اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دادا چڑت سنگھ کی قیادت میں اسے شدید نقصان پہنچایا۔ احمد شاہ نے عبیداللہ خان کو لاہور کا گورنر نامزد کیا، مگر جلد ہی سکھوں نے لاہور پر حملہ کر کے عبیداللہ خان کو معزول کر دیا اور شہر پر قبضہ کر لیا۔ اب سکھوں کی حکومت راولپنڈی تک پہنچ چکی تھی۔ معروف مؤرخ ''سمنا ورشنے'' اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ جس مقام پر دو ہزار سال قبل راجہ پورس نے سکندرِ اعظم کو شکست دے کر پسپائی پر مجبور کیا تھا، آج وہی خطہ احمد شاہ ابدالی جیسے جری افغان جرنیل کے لیے بھی ایک ناقابلِ تسخیر دیوار ثابت ہوا۔

❁❁❁

سکھ مسلیں: سکھوں کے اقتدار کی ایک ابتدائی شکل

تاریخی شواہد اس امر کی گواہی دیتے ہیں کہ بابا بندہ سنگھ بہادر کی موت کے بعد سکھوں کو طویل عرصے تک مغل حکمرانوں کے ظلم وستم کا سامنا کرنا پڑا۔ اگرچہ اس دور میں کہیں کہیں وقتی امن کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں، تاہم سکھ تاریخ میں اس عہد کو ''عظیم مصیبت'' (Great Calamity) کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ اس دوران کئی خالصہ سکھوں نے خصوصاً لاہور میں مغلیہ حکام کے خلاف غیر معمولی جرأت اور استقامت کا مظاہرہ کیا۔ ان سرداروں میں سے بعض کے کارناموں کا ذکر میں قبل ازیں صفحات میں کر چکا ہوں۔

اٹھارھویں صدی کے وسط میں، 1747ء سے احمد شاہ ابدالی نے متعدد بار پنجاب پر حملے کیے، جو تسلسل کے ساتھ جاری رہے۔ ان حملوں نے برصغیر میں مغلیہ اقتدار کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا۔ اس سیاسی انتشار اور عدم استحکام کے ماحول میں سکھوں نے مغل اقتدار کے کمزور پڑتے اثرات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پنجاب کے دیہی علاقوں میں مختلف خودمختار گروہوں کی صورت میں منظم ہونا شروع کیا۔ یہی گروہ آگے چل کر ''مسلیں'' کہلائے۔ ابتدا میں یہ گروہ نیم فوجی نوعیت کے تھے، مگر وقت کے ساتھ ساتھ انھوں نے وسیع علاقوں پر عملی کنٹرول حاصل کر لیا۔

اس تناظر میں جن چھوٹی خودمختار سیاسی اکائیوں کا ذکر ملتا ہے، ان کی تعداد بارہ بتائی جاتی ہے۔ اگرچہ ان کی فوجی صلاحیت اور علاقائی دائرۂ کار محدود تھا، اور بعض مؤرخین انھیں باقاعدہ ریاستوں کے بجائے غیر منظم جنگجو گروہوں کا درجہ دیتے ہیں، تاہم میرے نزدیک یہ اکائیاں محدود پیمانے پر ریاستی خصوصیات کی حامل تھیں۔ ان کی مخصوص قیادت، علاقائی مرکز، مالیاتی نظام (بالخصوص مقامی سطح پر ٹیکس وصولی کی انتظامیہ)، اور داخلی وخارجی معاملات میں خودمختاری نمایاں

تھی۔ ان کے مابین سفارتی روابط، جنگ و امن کے معاہدات، اور اتحادی تشکیلیں بھی موجود تھیں۔ یہ تمام خصائص انھیں ''محدود ریاستی نظام'' کے زمرے میں شامل کرنے کے لیے کافی دلیل فراہم کرتے ہیں۔

تاریخ کی مختلف کتب میں ان تمام مِسلوں کی تفصیل ملتی ہے، جنھیں یہاں بیان کرنا میرا مقصد نہیں۔ میرا مدعا صرف اس دور کے حالات کا اجمالی بیان اور پنجاب کے سماج میں وقوع پذیر تبدیلیوں کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ البتہ ان مِسلوں کی فہرست حسبِ ذیل ہے:

1. بنگھیوں کی مِسل
2. رام گڑھیوں کی مِسل
3. کہنیا کی مِسل
4. نکیوں کی مِسل
5. آلو والیوں کی مِسل
6. ڈلّی والوں کی مِسل
7. نشان والوں کی مِسل
8. فیض اللہ پوریوں کی مِسل
9. شہید بنگھیوں کی مِسل
10. پھلکیوں کی مِسل
11. ریاستِ نابھہ اور ریاستِ جِند
12. سکر چکیوں کی مِسل

یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ پانی پت کی تیسری جنگ 1761ء میں پیش آئی، جس کے بعد احمد شاہ ابدالی نے پنجاب پر عملاً قبضہ جما لیا۔ اس کا مرکز لاہور تھا، جبکہ دہلی پر مغل بادشاہ برائے نام حکمران تھے۔ لاہور اب درانی سلطنت کا حصہ بن چکا تھا۔ تاہم اسی دور میں پنجاب کا بیشتر علاقہ سکھ مِسلوں کے زیرِ اثر آ چکا تھا۔ لاہور پر کبھی سکھ قابض ہوتے اور کبھی درانی افواج۔

یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ 1767ء میں احمد شاہ ابدالی نے اپنے آخری حملے کے دوران ایک بار پھر پنجاب پر تسلط قائم کرنے کی کوشش کی، مگر اس وقت تک سکھ سردار خاصی حد تک منظم ہو چکے تھے اور پنجاب کے کئی حصوں پر قابض تھے۔ ابدالی نے اس بار سکھوں کی بڑھتی ہوئی قوت کو کچلنے کے ارادے سے حملہ کیا، مگر اسے شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ سکھوں نے چھاپہ مار حکمت عملی اختیار کرتے ہوئے درانی افواج کو تھکا دیا اور ان کے مکمل قبضے کی راہ میں بڑی رکاوٹ بنے۔ یہ صورت حال احمد شاہ ابدالی کی ایک عملی ناکامی کے مترادف تھی، اگرچہ اس کا لاہور پر وقتی قبضہ برقرار رہا۔ اس کے بعد وہ واپس افغانستان لوٹ گیا، اور یہ حملہ پنجاب پر اس کا آخری حملہ ثابت ہوا۔

1767ء کے بعد احمد شاہ ابدالی نے پنجاب کی طرف کوئی بڑی لشکر کشی نہیں کی۔ اس کی بنیادی وجہ سکھوں کی منظم اور مستحکم طاقت تھی، جو اب ایک بڑی سیاسی اور عسکری قوت بن چکے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ ابدالی کی صحت اور اس کی سلطنت کے اندرونی حالات بھی زوال پذیر ہو چکے تھے۔ اس کا انتقال 1772ء میں ہوا۔ لہٰذا سیاسی اور عملی طور پر احمد شاہ ابدالی کے بعد پنجاب میں اصل اقتدار سکھوں کے ہاتھ آیا، نہ کہ درانی خاندان کے پاس رہا۔

میرے نزدیک یہ دور پنجاب کی تاریخ کا سب سے زیادہ خون خرابے کا دور مانا جاتا ہے۔

یہ بات بھی اہم ہے کہ اُس وقت بھی ابدالی ایک طاقتور قوت تھے، اگرچہ اب انھیں مغل دربار کی سرپرستی حاصل نہیں رہی تھی۔ احمد شاہ ابدالی کی وفات کے بعد اُس کا بیٹا تیمور شاہ درانی 1772ء میں تخت نشین ہوا۔ اس وقت تک پنجاب میں سکھوں کی طاقت بہت بڑھ چکی تھی، اور وہ مختلف علاقوں میں مستقل بنیادوں پر اپنی خودمختار حیثیت قائم کر رہے تھے۔ تیمور شاہ نے کئی بار لاہور اور پنجاب کے دیگر علاقوں پر چڑھائی کی تاکہ درانی اقتدار کو بحال کیا جا سکے۔ 1779ء اور 1783ء کے درمیان وہ لاہور تک پہنچا اور عارضی طور پر قبضہ بھی کیا، لیکن وہ سکھ مزاحمت کو ختم نہ کر سکا۔ سکھ گروہوں (مسلوں) نے گوریلا جنگ، اچانک حملوں اور مقامی حمایت کے ذریعے اُس کے لیے پنجاب میں قیام کو ناقابلِ برداشت بنا دیا۔ تیمور شاہ کی لاہور آمد کے دوران کوئی مرکزی سکھ قیادت موجود نہ تھی، بلکہ بارہ مسلیں مختلف علاقوں میں فعال تھیں۔ ان میں ایک اہم مِسل

سکر چکیا مِسل تھی، جس کے سردار مہان سنگھ تھے جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے والد تھے۔

تیمور شاہ کی وفات 1793ء میں ہوئی، اس وقت رنجیت سنگھ کی عمر محض 13 سال تھی، لہٰذا اُن کا تیمور شاہ سے براہِ راست سامنا نہیں ہوا۔ تیمور شاہ کی وفات کے بعد افغانستان میں جانشینی کی جنگ چھڑ گئی۔ اس دوران رنجیت سنگھ نے مقامی سکھ سرداروں کو متحد کیا اور 1799ء میں لاہور پر قبضہ کر کے باقاعدہ سکھ سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اس وقت تک درانی سلطنت کی طاقت پنجاب میں تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ تیمور شاہ نے احمد شاہ ابدالی کے جانشین کی حیثیت سے پنجاب پر کنٹرول برقرار رکھنے کی بھرپور کوشش کی، لیکن سکھوں کی مزاحمت اور مقامی حمایت کے باعث وہ مکمل طور پر ناکام رہا۔

رنجیت سنگھ نے سیاسی تدبر، عسکری مہارت اور مقامی حمایت کے ذریعے پنجاب میں وہ سلطنت قائم کی جو درانی سلطنت کے زوال کی فطری جانشین بن گئی۔

میرے نزدیک پانی پت کی تیسری جنگ سے بہت پہلے سکھ مختلف گروہوں کی شکل میں ایک منظم طاقت کے طور پر موجود تھے۔ جب ابدالی نے ہرمندر صاحب پر حملہ کیا اور اُس کی بے حرمتی کی، تو ہر سکھ بدلہ لینے کے لیے تیار ہو گیا۔ ہر سکھ کسی نہ کسی مِسل کے ساتھ منسلک ہو گیا۔ ایک محدود علاقے میں بارہ گروہ وجود میں آئے۔

سکھ مِسلوں کے بارے میں ایک کتاب *Brief History of Sikh Misls* پڑھنے کو ملی، جسے Sikh Missionary College (Regd.) نے شائع کیا ہے۔ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ ایک مفید کتاب ہے۔ اس کے علاوہ سکھ انسائیکلوپیڈیا پر بھی مِسلوں کے بارے میں کافی تفصیل دستیاب ہے۔

یہاں یہ ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ جب 1769ء میں احمد شاہ کے حملے ختم ہوئے تو اس وقت تک پنجاب کا بیشتر حصہ بارہ مِسلوں کے قبضے میں آ چکا تھا۔ بیرونی خطرہ دور ہونے کے بعد، یہ مِسلیں آپس میں برسرِ پیکار ہو گئیں۔ ان جنگوں کے نتیجے میں رنجیت سنگھ نے، جو سکر چکیا مِسل کے کمانڈر تھے، لاہور کے شمالی اور مغربی علاقوں پر مکمل کنٹرول حاصل کر لیا۔ البتہ انھوں نے پنجاب

کی جنوب مشرقی سرحد پر واقع پھولکیان مسل کو، جو اپنے بانی پھول (شاگرد گرو ہر رائے) کے نام سے جانی جاتی ہے، چھیڑا نہیں کیونکہ اس وقت انگریز ایسٹ انڈیا کمپنی دریائے ستلج تک پہنچ چکی تھی، اور رنجیت سنگھ جانتے تھے کہ وہ ابھی تک انگریزی فوج سے لڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ دوسری جانب، انگریزوں نے بھی تسلیم کیا کہ رنجیت سنگھ ایک مضبوط سلطنت قائم کرنے کے عمل میں ہیں، اور جب تک وہ زندہ رہے، انگریز انھیں اپنے علاقوں اور اپنے حتمی ہدف افغانستان کے درمیان ایک بفر ریاست کے طور پر دیکھنے پر راضی رہے۔

اس تناظر میں مہاراجہ رنجیت سنگھ اور برطانوی استعمار کے درمیان دوستی کے آثار بھی نمایاں ہیں۔ تاہم، دریائے ستلج کی صورت میں ایک غیر اعلانیہ سرحد بھی موجود تھی۔ ستلج سے جمنا تک کا علاقہ انگریزوں کے زیر اثر تھا جب کہ ستلج سے اٹک تک مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت تھی۔ یہ اس وقت کے چڑھدا اور لہندا پنجاب تھے۔ میری رائے میں یہی واقعہ پنجاب کی پہلی تقسیم قرار دیا جا سکتا ہے۔

اگر پنجاب کی تقسیم کا جرم کرنے والوں کو جوابدہ ٹھہرایا جانا ضروری ہے، تو اس فیصلے بارے بھی کچھ کہنا ہوگا، جس کے تحت مہاراجہ رنجیت سنگھ نے 1799ء میں اپنے ریاستی مفاد کی خاطر اس ابتدائی تقسیم کو قبول کیا تھا۔

❁ ❁ ❁

پنجاب میں مقامی ریاستوں کی تشکیل

1707ء کے بعد کا ایک جائزہ

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بیان کیا جا چکا ہے، اورنگزیب عالمگیر کی وفات (1707ء) مغلیہ سلطنت کے زوال کا نقطۂ آغاز تھی۔ اس کے بعد سلطنت کے دور دراز علاقوں میں متعین مغل گورنروں نے مرکز کی کمزوری کو محسوس کرتے ہوئے خودمختاری کا اعلان کرنا شروع کر دیا، جس کے نتیجے میں مختلف مقامی ریاستوں کا قیام عمل میں آیا۔ مغل حکومت کی مرکزیت کا بتدریج خاتمہ اس سیاسی انتشار، عسکری محاذ آرائی، اور خودمختاری کی جدوجہد کا باعث بنا، جس نے اس دور کی عمومی فضا کو متعین کیا۔ یہی وہ تاریخی سیاق و سباق تھا، جس میں سکھ مِسلوں (Confederacies) کا ظہور بھی عمل میں آیا، جو بعد ازاں مغل اور افغان حکمرانوں کے خلاف مشترکہ مزاحمتی اتحاد کے طور پر نمایاں ہوئیں۔

مغل سلطنت کی کمزوری کے نتیجے میں احمد شاہ ابدالی نے 1748ء سے متعدد بار پنجاب پر حملے کیے اور اس خطے کو اپنی توسیع پسند سلطنت کا حصہ بنانے کی کوشش کی۔ لاہور، ملتان، اور پشاور جیسے اہم شہروں پر وقتی طور پر افغان تسلط قائم ہوا، اور افغان گورنروں، مثلاً جہان خان اور تیمور شاہ، کی تقرری بھی عمل میں آئی۔ تاہم مقامی مزاحمت، بالخصوص سکھوں کی ابھرتی ہوئی عسکری طاقت، افغان اقتدار کے دیرپا قیام میں رکاوٹ بنی۔ اس پس منظر میں کہا جا سکتا ہے کہ مغلیہ زوال کے بعد پنجاب عملی طور پر افغان اثر و رسوخ کے تحت آ چکا تھا، اگرچہ یہ تسلط مستقل نوعیت کا نہ بن سکا۔ اسی سیاسی غیر یقینی صورت حال کے دوران متعدد مقامی نوابوں، سرداروں، اور زمیندار خاندانوں نے خودمختار یا نیم خودمختار ریاستوں کی بنیاد رکھی۔ ان میں چند اہم ریاستوں کا ذکر درج

ذیل ہے:

ریاست بہاولپور:

1727ء میں نواب صادق محمد خان نے اس ریاست کی بنیاد رکھی۔ یہ ریاست برصغیر کی نمایاں مسلم ریاستوں میں شمار ہوتی تھی اور بعدازاں برطانوی راج کے تحت انگریزوں کی حلیف ریاست(Princely State) کا درجہ حاصل کیا۔

ملتان:

ملتان پر متعدد نوابوں نے وقتاً فوقتاً اقتدار قائم کیا۔ یہ علاقہ کبھی افغانوں اور کبھی سکھوں کے زیرِ اثر رہا۔اس کی سیاسی حیثیت وقت کے حالات سے متاثر ہوتی رہی۔

پھلکیہ ریاستیں(Phulkian States):

پھول سنگھ کے خاندان سے تعلق رکھنے والی یہ سکھ ریاستیں ایک منفرد طرزِ حکمرانی کی مظہر تھیں۔ ان میں پٹیالہ، نابھہ، اور جِند شامل تھیں۔ ابتدا میں انھوں نے مغلوں سے وفاداری کا اظہار کیا، بعد ازاں انگریزوں سے اتحاد قائم کر کے برطانوی ہندوستان میں ''مراعات یافتہ ریاستوں''(Privileged States) کا مقام حاصل کیا۔

پہاڑی ریاستیں(Hill States):

پنجاب کے شمال مشرقی حصے میں متعدد راجپوت ریاستیں قائم تھیں،جن کی تعداد بعض ذرائع کے مطابق تیس سے زائد تھی۔ ان میں کانگڑہ، چمبہ، اور منڈی جیسی ریاستیں زیادہ اہم سمجھی جاتی ہیں۔ اگرچہ یہ ریاستیں عمومی طور پر خودمختار رہیں، تاہم مختلف اوقات میں سکھ، افغان یا برطانوی قوتوں سے اتحاد کرتی رہی ہیں۔ چونکہ ان ریاستوں کی جغرافیائی حیثیت پنجاب کے میدانوں سے قدرے جدا تھی،لہٰذاان کا تفصیلی ذکراس کتاب کے دائرۂ موضوع سے خارج سمجھا جائے گا۔

البتہ، پنجاب کے میدانی علاقے میں واقع تین اہم ریاستوں بہاولپور، ملتان، اور پھلکیہ ریاستوں کے بارے میں کچھ معلومات آئندہ صفحات میں پیش کی جائیں گی، تاکہ اس خطے میں

مغل وافغان زوال کے بعد پیدا ہونے والی سیاسی تشکیل کی بہتر تفہیم ممکن ہو سکے۔

1707ء کے بعد کا پنجاب ایک سیاسی تجربہ گاہ بن چکا تھا، جہاں مختلف طاقتیں ابھریں اور زوال پذیر ہوئیں۔ سکھ مِسلیں، درانی حملے، مقامی نوابوں کی خودمختاری، اور پہاڑی راجوں کی پالیسیوں نے پنجاب کو ایک مسلسل تغیر پذیر خطہ بنا دیا۔ اس انتشار کے بطن سے بالآخر مہاراجہ رنجیت سنگھ کی زیرِ قیادت ایک متحد سکھ سلطنت ابھری، جو 1799ء میں قائم ہوئی اور 1849ء تک قائم رہی۔

پھولکیہ ریاستیں (پھولکیان): پنجاب کی شاہی خودمختاری کی ایک جھلک

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ میرے آباؤ اجداد ریاست پٹیالہ سے تعلق رکھتے تھے، لہٰذا مجھے اس ریاست اور اس سے منسلک تاریخی وسیاسی تناظر سے متعلق نسبتاً زیادہ آگاہی حاصل ہے۔

پھولکیہ ریاستوں کا پس منظر ایک جاٹ برار سکھ سردار، سردار پھول، سے جڑا ہے، جو سترھویں صدی کے دوران موجودہ بھارتی پنجاب کے علاقے میں آباد ہوئے۔ سردار پھول کو سکھوں کے آٹھویں گرو، گرو ہرکشن صاحب، کی دعائیں اور روحانی عنایات حاصل تھیں۔ انھی کی نسل نے بعد ازاں مختلف نیم خودمختار ریاستیں قائم کیں، جو اجتماعی طور پر ''پھولکیہ ریاستیں'' کہلائیں۔ ان ریاستوں میں درج ذیل تین نمایاں تھیں:

1۔ ریاست پٹیالہ: ریاست پٹیالہ، پھولکیہ ریاستوں میں سب سے بڑی اور سیاسی وعسکری طور پر سب سے زیادہ مؤثر تھی۔ اس کا قیام 1763ء میں بابا آلا سنگھ نے کیا، جو سردار پھول کے پوتے تھے۔ آلا سنگھ نے نہ صرف اس ریاست کی بنیاد رکھی بلکہ جلد ہی برطانوی حکومت سے تعلقات قائم کرتے ہوئے پٹیالہ کو ایک نیم خودمختار ریاست کی حیثیت دلائی۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ''پٹیالہ'' دراصل ''پٹی آلا'' یعنی ''آلا کی بستی'' سے ماخوذ ہے، جو وقت کے ساتھ موجودہ شکل اختیار کر گئی۔

2۔ ریاست نابھا: یہ ریاست ہمر سنگھ کی نسل سے تعلق رکھتی تھی، جو آلا سنگھ کے بھائی تھے۔

نابھا کا قیام تقریباً 1765ء میں ہوا، اور یہ ریاست بھی برطانوی سامراج کے زیرِ اثر داخلی خودمختاری قائم رکھنے میں کامیاب رہی۔

3- ریاست جِند: ریاست جِند کی بنیاد سردار سوکھا سنگھ نے رکھی، اور یہ بھی پھول خاندان ہی سے تعلق رکھتی تھی۔ اگرچہ یہ نسبتاً چھوٹی ریاست تھی، تاہم اپنے وقت میں اس کی سیاسی اور عسکری اہمیت مسلمہ تھی۔

ایک اہم تاریخی نکتہ یہ ہے کہ ان ریاستوں کی جغرافیائی حیثیت ستلج کے مشرق میں واقع ہونے کے باعث انھیں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی زیرِ قیادت متحدہ سکھ سلطنت میں شامل نہیں کیا گیا۔ جب رنجیت سنگھ نے لاہور میں اپنی سلطنت کی بنیاد رکھی، تو پھولکیہ ریاستوں نے خودمختاری برقرار رکھتے ہوئے سکھ سلطنت کا حصہ بننے کے بجائے انگریزوں سے الحاق کو ترجیح دی۔ اس دور میں ان کے ایک جانب رنجیت سنگھ کی طاقتور سلطنت تھی جبکہ دوسری جانب ایسٹ انڈیا کمپنی دہلی پر قبضہ جما چکی تھی۔ اس صورتِ حال میں پھولکیہ ریاستوں نے سیاسی حکمتِ عملی کے تحت انگریزوں کے ساتھ باقاعدہ معاہدات کیے، جن کے تحت انھیں داخلی خودمختاری حاصل رہی جبکہ خارجہ امور میں وہ برطانوی اثر کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہوئیں۔

یہ طرزِ عمل سکھ قوم پرست حلقوں کی تنقید کا باعث بھی بنا، جو ان ریاستوں کو سکھ اتحاد کے فروغ میں رکاوٹ تصور کرتے تھے۔ تاہم، اس کے باوجود ان ریاستوں نے سکھ مذہب، تعلیم، فنونِ لطیفہ اور خاص طور پر موسیقی کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ریاست پٹیالہ سے وابستہ ''پٹیالہ گھرانہ'' آج بھی ہندوستانی کلاسیکی موسیقی میں منفرد مقام رکھتا ہے۔ ان ریاستوں کے دور میں متعدد گردوارے اور تعلیمی ادارے بھی قائم کیے گئے۔

1947ء میں برصغیر کی تقسیم اور ہندوستان کی آزادی کے بعد یہ ریاستیں بھارتی یونین میں ضم ہوگئیں۔ ابتدائی طور پر انھیں مخصوص مراعات حاصل رہیں، تاہم بعدازاں ان کا شاہی درجہ ختم کر دیا گیا۔ یہاں یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ پھولکیہ ریاستوں میں مسلمان آبادی ایک بڑی اقلیت

کی حیثیت رکھتی تھی۔ تقسیم کے وقت یہاں کے مسلمانوں کو شدید ظلم وستم کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک زمانے میں مسلمان اس خطے کی کل آبادی کا تقریباً 20 فیصد تھے، لیکن آج ان کی تعداد ایک فیصد سے بھی کم رہ گئی ہے۔

جب احمد شاہ ابدالی واپس لوٹ گئے، مغل سلطنت دہلی تک محدود ہوگئی اور انگریزوں نے بالواسطہ طور پر مشرقی پنجاب پر اپنا اثر قائم کرلیا، تو ایک طویل عرصے بعد مشرقی پنجاب میں امن قائم ہوا۔ یہ وہ دور تھا جس میں پنجاب کی تاریخ نے ایک نئے سیاسی، ثقافتی اور سماجی باب میں قدم رکھا۔

پھولکیہ ریاستوں کے بارے میں ایک کتاب بھی دیکھنے کو ملی، جسے منسٹری آف کلچر، انڈیا نے شائع کیا ہے۔[1]

اس کتاب کا عنوان ہے:

Phulkian States: Patiala, Jind and Nabha-Punjab States Gazetteers 1:Jan 1909 with Maps (1904), Vol. XVII.

اس کتاب میں ان ریاستوں کے بارے میں کافی تفصیل ملتی ہے۔ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے افراد کے لیے یہ کتاب نہایت مفید ہے۔

ریاست بہاولپور: شمالی ہندوستان کی ایک اہم مسلم ریاست

ریاست بہاولپور کی بنیاد 1727ء میں نواب صادق محمد خان عباسی اوّل نے رکھی۔ 1955ء میں پاکستان کے ساتھ الحاق سے قبل یہ برطانوی ہند کے تحت ایک شاہی ریاست تھی۔ اس ریاست کی تاریخ، سیاسی ارتقاء اور ثقافتی پس منظر کو سمجھنے کے لیے متعدد تحقیقی کتب نہایت مفید ثابت ہوتی ہیں۔ ان میں سرفہرست Anabel Lloyd کی تصنیف *Bahawalpur: The Kingdom that Vanished* ہے، جو ریاست کے زوال کی داستان پیش کرتی ہے۔ اسی طرح نذیر علی شاہ کی کتاب *The History of Bahawalpur State:Sadiqnamah* بھی

[1] Punjab States Gazetteers-Phulkian States:Patiala, Jind and Nabha with Maps(1904) Vol.XVII A 1 Jan 1909

ایک مستند ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ علاوہ ازیں، دیگر تاریخی ذرائع سے حاصل کردہ معلومات بھی اس تحریر میں شامل کی جا رہی ہیں۔

نواب صادق محمد خان اوّل نے 1727ء میں ریاست بہاولپور کی بنیاد رکھی۔ یہ علاقہ دریائے ستلج سے لے کر صحرائے تھر تک پھیلا ہوا تھا اور اس میں بہاولپور کے گردونواح کے علاقے شامل تھے۔ شہر بہاولپور کی باضابطہ بنیاد 1748ء میں رکھی گئی۔ ''عباسی'' نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ خاندان حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی نسل سے تعلق رکھتا تھا اور ان کا اصل وطن عرب تھا۔ ہندوستان میں آ کر ایک آزاد مسلم ریاست کے قیام سے قبل عباسی سردار کون سے مناصب پر فائز تھے؟ یہ جاننا اس لیے ضروری ہے تاکہ مغلیہ سلطنت کے زوال اور ہندوستان میں متعدد خودمختار مسلم ریاستوں کے قیام کا تاریخی پس منظر بہتر طور پر سمجھا جا سکے، جن میں ریاست بہاولپور نمایاں مقام رکھتی ہے۔

اٹھارھویں صدی کے ابتدائی ایاّم میں جب مغل سلطنت انحطاط کا شکار ہو رہی تھی، نواب بہاول خان اوّل، جو عباسی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے، سندھ کے علاقے میں سکونت پذیر تھے۔ قبائلی تنازعات اور اقتدار کی کشمکش کے باعث عباسی قبائل نے سندھ کے شمالی علاقوں کی طرف ہجرت کی اور بالآخر جنوبی پنجاب میں آ کر آباد ہو گئے۔ اس وقت خطے میں قلعہ دراوڑ موجود تھا، جس پر عباسیوں نے قبضہ کر لیا اور یہی قلعہ بعدازاں ریاست کا صدر مقام بنا۔ آج بھی چولستان کے اس تاریخی قلعے میں سابق حکمرانوں کی قبریں موجود ہیں۔

نواب بہاول خان اوّل نے جنوبی پنجاب کے مقامی قبائل کو ساتھ ملا کر اپنی نوابی کا اعلان کیا۔ اس طرح بتدریج ایک ریاست کی بنیاد رکھی گئی، جو وقت کے ساتھ ساتھ مستحکم اور وسیع ہوتی گئی۔ بعدازاں، برطانوی راج کے دوران بہاولپور ہندوستان کی سب سے منظم اور بااختیار شاہی ریاستوں میں سے ایک شمار ہونے لگی۔

یہاں اس امر کا ذکر ضروری ہے کہ اگرچہ مغلیہ سلطنت سیاسی طور پر کمزور ہو چکی تھی، مگر سترھویں اور اٹھارھویں صدیوں میں وہ برصغیر میں اسلامی اقتدار کی نمائندہ تصور کی جاتی رہی۔

ریاست بہاولپور کے عباسی حکمرانوں نے خود کو نظریاتی طور پر اسی اسلامی اقتدار کا تسلسل سمجھا۔ انھوں نے مغلوں کی انتظامی روایات، عدالتی آداب، لباس، زبان (فارسی)، اور القابات کو اپنا کر ایک طرح سے مغل وراثت سے علامتی قانونی جواز حاصل کیا۔

عالمگیر کی وفات کے بعد، جب مغلیہ حکومت عملی طور پر ختم ہو رہی تھی، عباسی حکمرانوں نے دہلی کے مغل شہنشاہ کی محض نمائشی بالادستی تسلیم کی۔ یہ رسمی تعلق مقامی سطح پر حکمرانی کے جواز کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا، جیسا کہ برصغیر کی دیگر کئی ریاستوں نے بھی کیا۔ بہاولپور کے حکمرانوں نے مغل روایات کے مطابق ''نواب'' کا لقب اختیار کیا اور فارسی زبان و انتظامی طریقوں کو اپنائے رکھا، جو مغل دور میں معیار کی حیثیت رکھتے تھے۔

یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ برصغیر میں مسلم حکمرانوں کو ''نواب'' جبکہ ہندو حکمرانوں کو ''راجہ'' یا ''مہاراجہ'' کے القابات دیے جاتے تھے، جیسا کہ نوابِ حیدرآباد، نوابِ قلات، یا مہاراجہ رنجیت سنگھ وغیرہ۔

تاریخی تناظر میں ایک اور اہم پہلو بھی ہمارے سامنے آتا ہے۔ نادر شاہ کے حملے (1739ء) اور بعدازاں احمد شاہ ابدالی کی فتوحات کے باعث بہت سے مغل اشرافیہ، منتظمین، شعرا اور علما نے نسبتاً پرامن علاقوں، خصوصاً ریاست بہاولپور میں پناہ لی۔ اس صورت حال میں بہاولپور کے نواب، ان مہاجر اشرافیہ کے سرپرست بنے اور اعلیٰ مغلیہ ثقافت، خصوصاً فارسی روایات، فنِ تعمیر، اور اسلامی علمی روایت کو محفوظ رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔

یہ بھی مشاہدے میں آتا ہے کہ بہاولپور کے نوابوں اور مغل حکمرانوں، دونوں نے مساجد اور مدارس کے قیام کو فروغ دیا اور اہلِ علم و دانش کی سرپرستی کی۔ بہاولپور کے محلات اور مساجد (مثلاً نور محل) کے طرزِ تعمیر میں مغلیہ جمالیات، ثقافتی تسلسل اور فنکارانہ ہم آہنگی کی جھلک نمایاں ہے۔

میرے فہم کے مطابق، ریاست بہاولپور کا آغاز بطور خودمختار ریاست نہیں ہوا۔ تاہم، جب دہلی دربار سکھوں، مراٹھوں اور ابدالیوں کے حملوں کے باعث کمزور ہوا، تو 1760ء کے بعد ریاست

بہاولپور ایک نیم خودمختار سیاسی اکائی کے طور پر ابھری۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جنوبی پنجاب میں مغلیہ اقتدار کے خاتمے کے بعد عباسی خاندان نے پیدا ہونے والے سیاسی خلا کو پُر کیا اور اس خطے میں، جو کسی زمانے میں مغل سلطنت کا حصہ تھا، علاقائی جانشین کے طور پر سامنے آئے۔

یہ حقیقت مسلم ہے کہ مغل حکمران وسطی ایشیا سے آئے تھے، جبکہ عباسی خاندان کا تعلق عرب سے تھا۔ دونوں میں خاندانی طور پر کوئی تعلق نہ تھا، مگر بہاولپور کے عباسی نواب، مغل ثقافتی وسیاسی ورثے کے علامتی وارث بننے کے خواہاں تھے۔ انھوں نے اسلامی بادشاہت کے نظریے کو برقرار رکھتے ہوئے مغلیہ رسمی روایات، عدالتی آداب، زبان (فارسی)، القابات اور طرزِ حکومت کو عباسی شناخت کے ساتھ ہم آہنگ کر کے ایک نئی علاقائی خودمختاری کی بنیاد رکھی۔ تاہم قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ نوابوں نے کبھی اپنے آپ کو ''بادشاہ'' کہلوانا پسند نہیں کیا۔ ہندوستان بھر میں بادشاہ کا القاب صرف مغلوں کے لیے مخصوص تھا۔

یہ بھی ایک تاریخی سچائی ہے کہ کمزور ریاستوں کو اپنی بقا کے لیے کسی نہ کسی طاقتور قوت کا ساتھ درکار ہوتا ہے۔ ریاست بہاولپور نے بھی ایسا ہی کیا۔ جب اٹھارھویں صدی کے وسط میں احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر اپنی مہمات کا آغاز کیا تو بہاولپور کے نوابوں نے اس کی ابھرتی ہوئی طاقت کو تسلیم کیا اور اس کے ساتھ اتحاد قائم کیا۔ اس وقت مغلیہ سلطنت رو بہ زوال تھی، اور ابدالی پنجاب و شمالی ہندوستان میں اثر ورسوخ قائم کر رہا تھا۔

نواب محمد بہاول خان اول (دورِ حکومت 1757ء-1749ء) نے احمد شاہ ابدالی کی عسکری مہمات میں سیاسی وعسکری تعاون پیش کیا، جس کے بدلے میں نوابوں کو داخلی خودمختاری اور اپنے علاقوں پر مؤثر حکمرانی کا حق حاصل ہوا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ بہاولپور کے نوابوں نے ابدالی کی بالادستی کو علامتی طور پر تسلیم کیا، جیسا کہ اُس دور کے دیگر متعدد علاقائی حکمران کرتے رہے۔ اس سیاسی حکمت عملی کے نتیجے میں انھیں چولستان اور ملحقہ علاقوں پر اپنی حکمرانی برقرار رکھنے کی اجازت ملی اور وہ جنوبی پنجاب کے ایک وسیع حصے کے حاکم بن گئے۔ یوں ریاست بہاولپور کو ایک نیم خودمختار سیاسی اکائی کے طور پر مستحکم ہونے کا موقع ملا، جو بعدازاں برطانوی ہند

کے تحت ایک باضابطہ شاہی ریاست کی صورت اختیار کر گئی۔

ایک روایت کے مطابق، بہاولپور کے نوابوں نے احمد شاہ ابدالی کی مراٹھوں، سکھوں اور بغاوت کرنے والے مغل امراء کے خلاف متعدد عسکری مہمات میں عملی تعاون فراہم کیا۔ جغرافیائی لحاظ سے ریاست بہاولپور، ملتان، سندھ اور راجپوتانہ کے درمیان ایک بفرزون کی حیثیت رکھتی تھی، جو ابدالی سلطنت کے لیے اس کی اسٹریٹیجک اہمیت کو دوچند کر دیتی تھی۔

آخر کار، جب 1772ء میں احمد شاہ ابدالی کا انتقال ہوا اور درانی سلطنت رفتہ رفتہ کمزور ہونے لگی، تو بہاولپور کے نوابوں نے خود کو درانی اثر ورسوخ سے علیحدہ کر لیا اور اپنی داخلی خودمختاری کو مزید مستحکم کرنا شروع کیا۔ انیسویں صدی کے اوائل تک، بہاولپور ایک باقاعدہ آزاد ریاست کے طور پر سامنے آیا، جو نہ درانی سلطنت کے ماتحت تھا اور نہ ہی مغل سلطنت کے۔

یہ سب جان کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ احمد شاہ ابدالی اور بہاولپور کے حکمرانوں کا تعلق باہمی فائدے اور حقیقت پسندانہ سیاست پر مبنی تھا۔ نوابوں نے وفاداری اور تزویراتی تعاون فراہم کیا، اور بدلے میں انھوں نے سامراجی منتقلی کے دور میں شناخت، خودمختاری اور سیاسی بقا حاصل کی۔ اس تعلق نے بہاولپور کو قبائلی تسلط سے نکال کر مستقل اثر ورسوخ کے ساتھ ایک تسلیم شدہ شاہی ریاست میں تبدیل ہونے کا موقع دیا۔

آفتاب حسین گیلانی کا ایک مضمون دیکھنے کو ملا، جس کا عنوان ہے:

"History of Bahawalpur State and its Culture"

ان کے مطابق عباسی خاندان عباسی خلافت کے خاتمے کے بعد پہلے مکران اور بعد ازاں سندھ میں آباد ہوا۔ جب وہ سندھ میں مقیم ہوئے تو انھوں نے سندھ کے بالائی اور زیریں علاقوں میں پھیلے سیاسی انتشار سے فائدہ اٹھایا اور بالآخر سندھ کے حکمران بن گئے۔ ریاست بہاولپور 1727ء میں قائم ہوئی، اور امیر صادق محمد خان اول (1746ء تا 1727ء) کو اس کا پہلا حکمران تسلیم کیا گیا۔ وہ عباسی خلفائے بغداد کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے، جو عباسیوں کی ایک شاخ تھے اور طویل عرصے سے اس خطے میں مقیم تھے۔ میرے خیال میں انھوں نے خود کو عباسی خلافت

کے ایک تسلسل یا اس کی ایک علاقائی شاخ کے طور پر متعارف کروایا۔

یہاں میں ایک اور اہم نکتہ بھی بیان کرنا چاہوں گا، جس کا تعلق ریاست بہاولپور اور انگریزوں کے باہمی تعلق سے ہے۔

ریاست بہاولپور اور برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے درمیان پہلا باضابطہ معاہدہ 1833ء میں ہوا، جب نواب بہاول خان سوم حکمران تھے اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سلطنت اپنے عروج پر تھی۔ یہ معاہدہ دوستی اور اتحاد پر مبنی تھا، جیسا کہ انگریز اس سے پہلے بھی کئی مقامی ریاستوں سے اس نوعیت کے معاہدے کر چکے تھے۔

اس معاہدے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ میرے خیال میں اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ انگریز افغانستان پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہے تھے، اور ان کے راستے میں ریاست بہاولپور واقع تھی۔ انگریزوں کو بہاولپور کی حدود سے محفوظ گزرگاہ اور تجارتی راستے کی ضرورت تھی۔ ریاست نے ان کی یہ خواہش پوری کی، جس کے بدلے میں برطانیہ نے ریاست کی خودمختاری کو تسلیم کیا اور اسے بیرونی حملوں سے تحفظ دینے کا وعدہ کیا۔ اس طرح ریاست مہاراجہ رنجیت سنگھ کی توسیع پسندانہ پالیسیوں سے بھی محفوظ ہوگئی۔ یاد رہے کہ رنجیت سنگھ ملتان پر قبضہ کر چکا تھا اور اس کی پیش قدمی جاری تھی۔ بعد ازاں 1838ء میں ایک مزید جامع معاہدہ ہوا، جب برطانوی افواج نے پہلی اینگلو-افغان جنگ کے لیے افغانستان پر حملہ کیا۔ اس بار ریاست بہاولپور نے انگریزوں کو فوجی و لاجسٹک امداد فراہم کی۔ اس معاہدے کے تحت:

1- برطانیہ نے بہاولپور کی خودمختاری کو تسلیم کیا۔
2- برطانوی افواج کو ریاست میں آزادانہ نقل و حرکت کی اجازت دی گئی۔
3- ریاست کو بیرونی حملوں سے تحفظ فراہم کیا گیا۔
4- ریاست کو کسی دشمن طاقت سے روابط نہ رکھنے کا پابند بنایا گیا۔

اس معاہدے نے پنجاب کی سیاست پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ انگریزوں کو اس سے رنجیت سنگھ کی سکھ سلطنت کو ایک طرف سے گھیرنے میں مدد ملی۔ رنجیت سنگھ کی وفات (1839ء)

کے بعد برطانوی مداخلت میں مزید آسانی پیدا ہوگئی۔ یہ بھی دیکھا گیا کہ بہاولپور میں تجارت کو فروغ ملا کیونکہ راستے محفوظ ہو گئے تھے۔ خطے میں معاشی ترقی کے دروازے کھل گئے۔ جہاں پنجاب کے دیگر علاقے برطانوی تسلط میں آ گئے، بہاولپور نے اپنی اندرونی خودمختاری برقرار رکھی۔

یاد رہے کہ اُس دور کے ہندوستان میں دو طرح کے علاقے تھے:

وہ علاقے جن پر انگریزوں نے براہِ راست قبضہ کیا، انھیں برٹش انڈیا کہا جاتا تھا۔ دوسرے وہ علاقے جنھیں ریاستیں کہا جاتا تھا، جہاں مقامی حکمران اندرونی خودمختاری رکھتے تھےلیکن خارجہ امور میں انگریزوں کے تابع ہوتے تھے۔

تاریخی شواہد سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ریاست بہاولپور میں تعلیم، آبپاشی اور انتظامی اصلاحات کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ یہاں اسلامی روایات کے ساتھ ساتھ اقلیتوں کو مکمل مذہبی آزادی حاصل تھی۔ بہاولپور ایک ایسا ثقافتی پُل بن گیا تھا جو روایت اور جدیدیت کو آپس میں جوڑتا تھا۔ برطانوی تعلقات نے بہاولپور کی قیادت میں سیاسی بصیرت اور سفارتی مہارت پیدا کی، جس نے 1947ء میں پاکستان سے پرامن الحاق کو ممکن بنایا۔

ریاست کے قیام کے بعد اس کے حکمرانوں نے اپنی رعایا کی خدمت دل و جان سے کی۔ عباسی حکمران نہایت مہربان، فیاض اور وفادار تھے۔ کل بارہ نوابوں میں سے نواب بہاول خان دوم، نواب صادق محمد خان چہارم (صبح صادق)، نواب بہاول خان چہارم اور نواب صادق محمد خان پنجم رعایا سے محبت، شفقت اور حسنِ سلوک میں نمایاں رہے۔ ریاست بہاولپور وہ پہلی ریاست تھی جس نے 3 اکتوبر 1947ء کو بغیر کسی شرط کے پاکستان سے الحاق کیا۔

جب ہندو قیادت نے نواب صادق محمد خان پنجم پر بھارت سے الحاق کے لیے دباؤ ڈالا، تو پنڈت نہرو اور سردار پٹیل نے مشتاق احمد گورمانی کے ذریعے نواب سے ملاقات کی۔ اس موقع پر نواب نے ایک تاریخی جملہ کہا:

"میرا دروازہ پاکستان کی طرف سامنے سے کھلتا ہے اور پیچھے کا دروازہ بھارت کی طرف، اور ہر شریف آدمی اپنے گھر کے سامنے کے دروازے سے داخل ہوتا ہے۔"

ریاست بہاولپور کی تہذیب وتمدن بہت مالا مال تھی، جو چولستانی ثقافت سے گہری مماثلت رکھتی تھی۔ یہاں کے لوگ سادہ، بہادر، خوش اخلاق، وفادار اور محنتی تھے۔ نواب بہاولپور نے ریاست کے تمام شہریوں کو مکمل مذہبی آزادی دی تھی۔ مذہب، فرقہ، زبان یا ذات پات کی بنیاد پر کسی سے امتیازی سلوک روا نہ رکھا جاتا تھا۔ اسلامی تہواروں اور خاص مواقع پر خصوصی انتظامات کیے جاتے تھے۔ رمضان المبارک اور محرم الحرام کے دوران سینما بند کر دیے جاتے تھے۔ خواتین کو معاشرے میں مکمل احترام حاصل تھا۔ وہ پردہ کرتی تھیں اور جب تانگے میں سفر کرتیں تو تانگے کو کپڑے سے ڈھانپ دیا جاتا تھا۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ ریاست بہاولپور کی ثقافت مکمل طور پر اسلامی طرزِ زندگی کی عکاس تھی۔

میں نے جتنا بھی اس ریاست کے بارے میں پڑھا ہے اور لوگوں سے سنا ہے، اس کے مطابق یہ ایک فلاحی اور اسلامی ریاست تھی۔ اس میں کسی بھی غیر مسلم پر کبھی کوئی جبر نہیں کیا گیا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ اور پنجاب کی سیاسی تشکیلِ نو

مہاراجہ رنجیت سنگھ، جنھیں سکھ برادری ''شیرِ پنجاب'' کے لقب سے یاد کرتی ہے، اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے سنگم پر برصغیر کی تاریخ میں ایک مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر ہم انگریزوں کی پنجاب میں آمد سے قبل کے حالات کا تجزیہ کریں تو واضح ہوتا ہے کہ اس وقت پنجاب مختلف خودمختار اور نیم خودمختار خطوں میں منقسم تھا۔ اس خطے میں کئی چھوٹی بڑی ریاستیں قائم تھیں، جن میں تین اہم سیاسی قوتیں نمایاں تھیں۔

پہلا اور سب سے بڑا خطہ وہ تھا جس پر مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت قائم تھی۔ اس میں دریائے ستلج سے لے کر اٹک (بلکہ بعض مؤرخین کے مطابق پشاور تک) اور ملتان سے کشمیر تک کے علاقے شامل تھے۔ یہ رقبہ جغرافیائی لحاظ سے نہ صرف وسیع تھا بلکہ سیاسی اور عسکری طور پر بھی مستحکم تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی قیادت میں اس خطے نے سکھ سلطنت کی بنیاد پر ایک مربوط ریاست کی شکل اختیار کی۔

دوسرا خطہ جنوبی پنجاب پر مشتمل تھا، جہاں عباسی خاندان کی حکومت تھی۔ یہ ریاستیں انگریزوں کی حلیف تھیں اور بعدازاں برطانوی حکمتِ عملی میں معاون ثابت ہوئیں۔ عباسی حکمرانوں نے انگریزوں کے ساتھ سیاسی سمجھوتے کر کے اپنی خودمختاری کو برطانوی بالادستی کے تحت محفوظ رکھا۔ تیسرا خطہ ستلج اور دہلی کے درمیان واقع تھا، جہاں ''پھُلکیہ ریاستیں'' (جیسے پٹیالہ، نابھہ اور جِند) موجود تھیں۔ یہ ریاستیں بھی انگریزوں کی حلیف بن چکی تھیں اور برطانوی اثر و رسوخ کو خطے میں مضبوط کرنے میں اہم کردار ادا کر رہی تھیں۔ ان بڑی ریاستوں کے علاوہ کچھ اور مقامی ریاستیں بھی موجود تھیں، مثلاً مالیر کوٹلہ۔ اگرچہ ان کی سیاسی اہمیت نسبتاً کم تھی، لیکن مغلیہ

دور میں ان ریاستوں کوسلطنتِ مغلیہ کی مقامی نمائندگی حاصل تھی۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد، یہ ریاستیں خودمختار وجود اختیار کر گئیں۔

پیشِ نظر تحریر میں پھُلکیہ اور عباسی ریاستوں کا مختصر ذکر کیا جا چکا ہے۔ اب ہم مہاراجہ رنجیت سنگھ کی قائم کردہ سکھ سلطنت کے بارے میں چند بنیادی نکات پیش کریں گے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ پر بے شمار کتابیں اور تحقیقی مقالات تحریر کیے جا چکے ہیں۔ اس تحریر کی تیاری میں میں نے مختلف مآخذ سے استفادہ کیا ہے، جن میں انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا خصوصی طور پر قابلِ ذکر ہے۔ ذیل میں وہاں شائع شدہ ایک مضمون کا خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے۔

رنجیت سنگھ نومبر 1780ء میں گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے اور 27 جون 1839ء کو لاہور میں، پنجاب کی سکھ ریاست کے بانی کی حیثیت سے وفات پا گئے۔ رنجیت سنگھ سے تقریباً آٹھ سو سال قبل ایک ہندو راجہ، جے پال (آیا پال)، ہندوشاہی حکمران تھا، جس نے 964ء سے 1001ء تک حکومت کی۔ اس کی سلطنت مغرب میں لغمان (موجودہ افغانستان) سے مشرق میں کشمیر اور سرہند، نیز جنوب میں ملتان تک پھیلی ہوئی تھی۔ وہ 1001ء میں پشاور کی جنگ میں محمود غزنوی کی افواج کے ہاتھوں شکست کھا کر گرفتار ہوا، اور اس شکست کے بعد اس نے خودسوزی کی۔ اس کے بعد لاہور، جو پنجاب کا مرکزی شہر مانا جاتا ہے، مختلف مسلمان حکمرانوں کے زیرِ اقتدار رہا۔ ان میں وسطی ایشیا سے آنے والے ترک، ایرانی، مغل، ہن، اور پختون (افغان) شامل تھے۔

اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ آٹھ سو سال بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ پہلے ہندوستانی حکمران تھے، جنھوں نے ہندوستان کے روایتی فاتحین، یعنی پشتونوں (افغانوں) کو ان کے آبائی علاقوں میں واپس جانے پر مجبور کیا اور اسی بنا پر انھیں ''پنجاب کا شیر'' کہا جانے لگا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی ریاست کی حدود شمال مغرب میں درۂ خیبر سے لے کر مشرق میں دریائے ستلج تک، شمال میں ہمالیہ سے لے کر جنوب میں صحرائے تھر تک پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ خود پڑھا لکھا نہ تھا، مگر نہایت ہوشیار، معاملہ فہم اور مدبر حکمران تھا۔ اس کے دورِ حکومت میں مذہبی تعصب کم دکھائی دیتا ہے، اور وہ اپنے مخالفین کے ساتھ بھی عمومی طور پر نرم سلوک کرتا تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے مسلمانوں کے ساتھ

روپے کے بارے میں مختلف ومتضاد آرا پائی جاتی ہیں۔

میں یہاں وہ بات پیش کر رہا ہوں جو انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا میں درج ہے۔ جب میں کسی کا حوالہ دے کر کوئی بات لکھتا ہوں تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ میں اس سے لازماً متفق بھی ہوں۔ یہ بات اس صاحبِ حوالہ کی رائے ہے، اور یہی تحقیقی اصول ہے۔

میں نے پچھلے صفحات میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دادا، چڑت سنگھ، کے بارے میں قدرے تفصیل سے لکھا ہے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ، مہا سنگھ کا اکلوتا بیٹا تھا، اور اپنے والد کی وفات کے بعد 1792ء میں صرف بارہ برس کی عمر میں سُکر چکیہ مِسل کا سربراہ بن گیا۔ اس کی وراثت میں گوجرانوالہ شہر اور اس کے نواحی دیہات شامل تھے، جو اب پاکستان کا حصہ ہیں۔ پندرہ سال کی عمر میں اس کی شادی کنہیا مِسل کے ایک سردار کی بیٹی سے ہوئی، اور کئی سال تک امورِ سلطنت اس کی ساس، بیوہ سدا کور، چلاتی رہی۔

یہاں ایک دلچسپ نکتہ قابلِ ذکر ہے۔ میں نے قبل ازیں پنجاب میں بارہ مِسلوں کا ذکر کیا تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے کئی مِسلوں کو شکست دے کر جولائی 1799ء میں، انیس برس کی عمر میں، پنجاب کے دارالحکومت لاہور پر قبضہ کر لیا۔ یاد رہے کہ اس وقت افغان بادشاہ، زمان شاہ، کا اثر ورسوخ قائم تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا زمان شاہ نے لاہور رنجیت سنگھ کے حوالے کیا تھا؟ یا یہ کہ رنجیت سنگھ نے مقامی مسلمانوں کی مدد سے لاہور پر قبضہ کیا، جو اس وقت وہاں قابض سکھ گروہوں سے تنگ آ چکے تھے؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب تلاش کرنے کے لیے میں نے مختلف مآخذ سے استفادہ کیا۔

اس ضمن میں مجھے سید محمد لطیف کی کتاب سے بھی اہم معلومات حاصل ہوئیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب مہاراجہ رنجیت سنگھ دیگر مِسلوں کو شکست دے کر لاہور پر قبضے کی کوشش میں تھا، تو احمد شاہ ابدالی کے پوتے، شاہ زمان، نے ہندوستان پر حملہ کر کے ایک نئی سلطنت قائم کرنے کا خواب دیکھا، جو حقیقت سے بہت دور تھا۔ اب زمانہ بدل چکا تھا؛ وہ وقت گزر چکا تھا جب احمد شاہ ابدالی بار بار ہندوستان پر حملے کر کے کامیابی حاصل کرتا رہا تھا۔

شاہ زمان درانی کے حملے اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے اقتدار کا آغاز: ایک تاریخی تناظر

درانی سلطنت (موجودہ افغانستان) کے حکمران اور احمد شاہ ابدالی کے پوتے، شاہ زمان نے 1795ء سے 1798ء کے درمیانی عرصے میں پانچ مرتبہ لاہور پر لشکر کشی کی۔ ان حملوں کا مقصد مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد پیدا ہونے والے سیاسی خلا کو پُر کرنا اور شمالی ہندوستان میں افغان اقتدار کو دوبارہ بحال کرنا تھا۔ اس دوران، اگرچہ وہ دو مرتبہ کسی سنجیدہ مزاحمت کے بغیر لاہور میں داخل ہونے میں کامیاب رہا، تاہم داخلی خلفشار، سیاسی انتشار، اور مغربی سرحدوں پر دباؤ کے باعث وہ ہر بار واپسی پر مجبور ہو گیا، اور اس خطے پر پائیدار قبضہ قائم نہ کر سکا۔

اسی عرصے میں سکھ قوم ایک ابھرتی ہوئی عسکری اور سیاسی قوت کے طور پر منظرِ عام پر آ رہی تھی، جو مستقبل قریب میں پنجاب کے اقتدار میں کلیدی کردار ادا کرنے والی تھی۔ شاہ زمان کا پہلا حملہ 1795ء میں ہوا۔ اُس نے کابل سے اپنی افواج کی قیادت کی، دریائے سندھ عبور کیا، اور براہِ راست لاہور کا رُخ کیا۔ چونکہ مقامی حکمران اس حملے کے مقابلے کی تیاری نہ رکھتے تھے، لٰہذا وہ بلا مزاحمت شہر میں داخل ہو گیا۔ تاہم، افغانستان میں داخلی بغاوت اور شاہی دربار میں سیاسی عدم استحکام کی وجہ سے اُسے واپسی پر مجبور ہونا پڑا۔

دوسرا حملہ 1796ء تا 1797ء کے درمیان وقوع پذیر ہوا۔ اس مرتبہ اُسے لاہور پر جزوی مزاحمت کا سامنا ضرور کرنا پڑا، مگر وہ ایک بار پھر قبضہ جمانے میں کامیاب ہو گیا۔ تاہم، درانی سلطنت کی داخلی سیاست میں اُس کے بھائیوں کی جانب سے اقتدار کے دعووں نے کابل میں ایک بار پھر بحرانی کیفیت پیدا کر دی، جس کے باعث شاہ زمان کو اپنی افواج سمیت واپس لوٹنا پڑا۔ ان حملوں کے تناظر میں ایک اہم اور علمی سوال جنم لیتا ہے: کیا لاہور پر مہاراجہ رنجیت سنگھ کا قبضہ شاہ زمان کی حمایت یا منظوری سے عمل میں آیا؟ یا یہ محض اُس خلا کا فائدہ تھا جو شاہ زمان کی مسلسل پسپائی کے نتیجے میں پیدا ہوا؟ یا پھر رنجیت سنگھ نے محض اپنی عسکری و سیاسی مہارت کی بنیاد پر یہ کامیابی حاصل کی؟

اس موضوع پر متعدد محققین نے مختلف زاویوں سے روشنی ڈالی ہے۔ میری رائے میں،

جب افغان افواج نے لاہور سے انخلا کیا، تو ایک مقامی، مستحکم اور نظم وضبط سے آراستہ طاقت کی ضرورت محسوس کی گئی جو شہر میں امن وامان قائم رکھ سکے۔ 1799ء میں، جب شاہ زمان کا اقتدار عملی طور پر کمزور ہو چکا تھا، تو ایسے حالات میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے لاہور میں داخل ہو کر اس پر کنٹرول سنبھال لیا۔ اگرچہ کوئی باضابطہ تحریری ثبوت موجود نہیں کہ شاہ زمان نے رنجیت سنگھ کو باقاعدہ طور پر لاہور کا حکمران نامزد کیا ہو، تاہم قرائن وشواہد اس جانب اشارہ کرتے ہیں کہ درانی پسپائی نے سکھ سردار کے لیے اقتدار کے دروازے کھول دیے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ چند افغان حلقوں نے، سیاسی مصلحت کے تحت، رنجیت سنگھ کو ایک نسبتاً مستحکم شخصیت کے طور پر تسلیم کر لیا ہو۔

1799ء میں، بااثر مقامی عمائدین اور شہری اشرافیہ کی حمایت کے ساتھ، رنجیت سنگھ نے لاہور میں داخل ہو کر نظم ونسق سنبھالا۔ ابتدا میں اُس نے اپنے آپ کو محض ''راجہ'' کہلانا پسند کیا، مگر جلد ہی سیاسی مقام کو مستحکم کرتے ہوئے 1801ء میں رسمی طور پر اپنے آپ کو ''مہاراجہ پنجاب'' کے لقب سے متعارف کروایا۔ یہ لقب نہ صرف اُس کے اقتدار کی وسعت کی علامت تھا بلکہ پنجاب کی ایک نئی سیاسی تشکیل کا آغاز بھی تھا۔

شاہ زمان کے متواتر حملے، اُن کی ناکامی، اور درانی سلطنت کی داخلی کمزوری درحقیقت اُس خلا کا پیش خیمہ بنے، جس میں مہاراجہ رنجیت سنگھ جیسی شخصیت کے ابھرنے کے لیے زمین ہموار ہو چکی تھی۔

لاہور پر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے قبضے کا تاریخی و سیاسی سیاق و سباق: انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا اور روزنامہ ڈان کی روشنی میں

انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے لاہور پر قبضے کی وضاحت درج ذیل الفاظ میں کی گئی ہے:

In July 1799 he seized Lahore, the capital of the Punjab (now the capital of Punjab province, Pakistan.) The Afghan king, Zamān Shah, confirmed Ranjit Singh as governor of the

city, but in 1801 Ranjit Singh proclaimed himself maharaja of the Punjab.

یہ اقتباس اس تاثر کو تقویت دیتا ہے کہ رنجیت سنگھ کی جانب سے لاہور پر قبضہ محض ایک خودسرانہ اقدام نہیں تھا، بلکہ اُسے شاہ زمان درانی کی جانب سے باضابطہ طور پر ''حاکمِ لاہور'' تسلیم کیا گیا۔ گو کہ بعدازاں 1801ء میں رنجیت سنگھ نے خود کو 'مہاراجہ پنجاب'' قرار دے کر اقتدار کو ادارہ جاتی شکل دی، لیکن ابتدائی اقتدار کی جڑیں ایک سیاسی مفاہمت یا کم ازکم درانی افواج کی پسپائی اور مقامی اشرافیہ کی حمایت میں پیوست دکھائی دیتی ہیں۔

روزنامہ ڈان میں ماجد شیخ نے اس موضوع پر ایک تفصیلی اور تنقیدی مضمون رقم کیا ہے، جس میں اس تاریخی مرحلے کے سیاسی، عسکری اور سماجی پہلوؤں کا جامع تجزیہ کیا گیا ہے۔ اُن کے مطابق:

> ''ہم ہر روز سکھوں کے ہاتھوں لاہور کے زوال کے بارے میں پڑھتے ہیں، لیکن بہت کم لوگ اس بات کا ادراک رکھتے ہیں کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو پرانا لاہور وہ عظیم شہر نہ بنتا جو آج ہم دیکھتے ہیں۔''

ماجد شیخ کے مطابق، 1796ء میں شاہ زمان درانی نے جب تیسری بار دریائے سندھ عبور کر کے دہلی کی جانب پیش قدمی کی، تو اس کے ساتھ واحد مسلم حلیف نظام الدین خان، حکمرانِ قصور، تھا جو افغان النسل تھا۔ پنجاب کے دیگر مسلم حکمران یا تو غیر جانبدار رہے یا افغانوں کے ساتھ تعاون میں مصروف تھے، جیسا کہ پٹیالہ کا حکمران۔ شاہ زمان کے اس حملے سے سکھ سردار پہاڑوں کی طرف پسپا ہو گئے، سوائے دو 'مسلوں' کے، سکر چکیہ اور بھنگی جنھوں نے امرتسر پہنچ کر دیگر سکھ رہنماؤں کو متحد ہونے کی ترغیب دی۔ سکھوں نے ایک نئی جنگی حکمت عملی اختیار کی، جس میں چھوٹے گروہوں کے ذریعے افغان دستوں پر بار بار حملے کیے جاتے، یہاں تک کہ وہ دریائے سندھ عبور کر کے اٹک تک جا پہنچتے۔ یہی گوریلا طرز کی جنگ افغانوں کے خلاف مؤثر ثابت ہوئی۔ رنجیت سنگھ نے اسی تناظر میں لاہور پر قبضے کی حکمت عملی ترتیب دی۔

1799ء میں افغانوں کی جانب سے شدید فاقہ کشی، داخلی انتشار اور بارودی حملوں کے

باعث شاہ زمان کی افواج کابل واپس جانے پر مجبور ہو گئیں۔ اسی دوران، مقامی مسلم تاجروں اور اشرافیہ کی حمایت سے، رنجیت سنگھ نے لاہور کا محاصرہ کیا۔ 7 جولائی 1799ء کو شہر کے دروازے مسلمانوں کی مدد سے کھول دیے گئے، اور 18 سالہ رنجیت سنگھ فاتح کے طور پر قلعے میں داخل ہوا۔ یہ واقعہ لاہور کی نئی سیاسی تاریخ کے آغاز کا نقطۂ آغاز ثابت ہوا۔

ماجد شیخ کے مطابق، رنجیت سنگھ کی اس کامیابی کے پیچھے اس کی عسکری صلاحیت، سیاسی تدبر، انصاف پسندی اور سب سے بڑھ کر مذہبی رواداری جیسے اوصاف کارفرما تھے، جن کی وجہ سے پرانے لاہور کے مسلمان تاجر اور عوام اس کے حامی بنے۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ رنجیت سنگھ نے اقتدار سنبھالتے ہی باغی سکھ سرداروں کو زیر کیا، لاہور کی فصیلیں دوبارہ تعمیر کروائیں، قلعہ مضبوط کیا، اور سب سے پہلا علامتی دورہ بادشاہی مسجد اور وزیر خان مسجد کا کیا، جس سے اس کی مذہبی ہم آہنگی کی پالیسی کا اظہار ہوتا ہے۔

ایک اور اہم نکتہ یہ ہے کہ مقامی مسلمانوں نے، شاہ زمان کی مسلسل لوٹ مار اور جبر سے تنگ آ کر، سکھوں اور خاص طور پر رنجیت سنگھ کو متبادل قیادت کے طور پر قبول کیا۔ یہاں مذہب سے زیادہ امن، استحکام اور معاشی تحفظ اہم ہو گیا تھا۔ گویا کہ شاہ زمان کے پے در پے حملوں نے مقامی آبادی کو ایک نیا سیاسی اتحاد تشکیل دینے پر مجبور کر دیا، اور یہی اتحاد بالآخر سکھ سلطنت کے قیام کا پیش خیمہ بنا۔

لاہور کی فتح

مہاراجہ رنجیت سنگھ اور شاہ زمان کے تعلقات کا تجزیاتی جائزہ

مہاراجہ رنجیت سنگھ اور شاہ زمان کے باہمی تعلقات اور لاہور پر قبضے کے پس منظر کو سمجھنے کے لیے متعدد تاریخی ماخذ دستیاب ہیں۔ ان میں ایک اہم حوالہ ایل ایس بُکسی (Buxi.L.S) کی کتاب *Maharaja Ranjit Singh* ہے، جس کا انگریزی ترجمہ اجیت یا نیال نے کیا ہے۔ کتاب کے مطابق:

لاہور ایک کثیر الجہتی اہمیت کا حامل شہر تھا، جس پر قبضے کا ارادہ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اس وقت کیا جب یہ شہر تین مختلف سکھ سرداروں کی عمل داری میں منقسم تھا۔ ان سرداروں کا طرزِ حکمرانی جابرانہ تھا، جبکہ مقامی آبادی شاہ زمان کی افغان حکومت سے بھی نالاں تھی۔ چنانچہ شہریوں نے، دونوں قوتوں سے تنگ آ کر، رنجیت سنگھ کا ساتھ دیا۔ اس مقامی حمایت کی بدولت 7 جولائی 1799ء کو ایک نسبتاً مختصر جھڑپ کے بعد رنجیت سنگھ نے لاہور پر قبضہ کر لیا۔

قبضے کے فوراً بعد مہاراجہ نے اپنی فوج کے افسروں کو واضح ہدایات دیں، جن کا لبِ لباب یہ تھا:

لاہور ہمارے اپنے لوگوں کا شہر ہے۔ ان کے ساتھ عزت واحترام سے پیش آیا جائے۔ جو کوئی لوٹ مار، جبر یا بدسلوکی کا مرتکب پایا گیا، اسے سخت سزا دی جائے گی۔

یہ احکامات اس بات کا مظہر ہیں کہ رنجیت سنگھ کی حکمتِ عملی صرف عسکری برتری پر مبنی نہ تھی بلکہ اس میں نظم، انصاف اور مقامی حمایت کی اہمیت کو بھی تسلیم کیا گیا تھا۔ اسی موضوع پر ایک اور

مستند حوالہ سکھ انسائیکلوپیڈیا میں ملتا ہے، جہاں سکھ اور افغان افواج کے درمیان جھڑپوں اور سیاسی پیش رفت کا تفصیلی بیان موجود ہے۔ سکھ انسائیکلوپیڈیا کے مطابق:

سکھ افواج نے شاہ زمان کا تعاقب جہلم تک کیا۔ احمد خان، جو پیچھے سے سکھوں پر حملے کی کوشش میں تھا، رام نگر میں مارا گیا۔ رنجیت سنگھ نے گجرات کا رخ کیا، جبکہ شاہ زمان 27 نومبر 1798ء کو دوبارہ لاہور میں داخل ہوا۔ افغان دستے نے امرتسر کی جانب پیش قدمی کی، جسے روکنے کے لیے رنجیت سنگھ اور دیگر سکھ سرداروں نے شہر سے تقریباً دس کلومیٹر دور افواجِ افغان کا سامنا کیا اور انھیں پسپا کر دیا۔ نتیجتاً افغان دستوں کو لاہور کی فصیلوں تک پیچھے ہٹنا پڑا۔ ان شکستوں اور کابل میں شاہ زمان کے بھائی محمود کی بغاوت نے افغان بادشاہ کو واپس جانے پر مجبور کر دیا۔ بعد ازاں سکھ قیادت نے اپنی سابقہ جاگیروں پر دوبارہ قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ اس دوران رنجیت سنگھ نے گوجرانوالہ پر کنٹرول حاصل کیا اور افغانوں کو اٹک تک پیچھے دھکیل دیا۔

ایک خاص واقعہ جس کا ذکر اسی ماخذ میں موجود ہے، یہ ہے کہ شاہ زمان نے واپسی کے بعد رنجیت سنگھ کو گھوڑے اور قیمتی لباس بطور تحفہ روانہ کیے۔ اس عمل کی تاریخی تعبیرات مختلف ہو سکتی ہیں۔ ایک ممکنہ تجزیہ یہ ہے کہ یہ تحائف ایک غیر رسمی صلح یا دوستی کی پیش کش کی علامت تھے، جس کے ذریعے افغان بادشاہ نے رنجیت سنگھ کی برتری تسلیم کرتے ہوئے دشمنی کے خاتمے کا اشارہ دیا۔ تاہم یہ محض مفروضہ ہے، جس کی قطعی تصدیق ممکن نہیں۔

اس تاریخی تناظر میں ایک اور واقعہ نہایت اہم ہے: شاہ زمان کے بھائی محمود نے کابل پر قبضہ کر کے شاہ زمان کو معزول و معذور (نابینا) کر دیا۔ بعد ازاں شاہ زمان نے راولپنڈی میں پناہ لی، جہاں اس کی ملاقات رنجیت سنگھ سے ہوئی۔ رنجیت سنگھ نے نہ صرف انھیں لاہور آنے کی دعوت دی بلکہ 1500 روپے ماہوار وظیفہ مقرر کر کے ان کی عزت افزائی کی اور ان کا استقبال ان کے شاہی رتبے کے مطابق کیا۔ شاہ زمان کا بعد ازاں انتقال لدھیانہ میں ہوا۔

خوشونت سنگھ کی معروف کتاب *The Maharaja of Punjab:Ranjit Singh* میں بھی ان واقعات کا تفصیلی اور بصیرت افروز تجزیہ موجود ہے۔ ایک خاص واقعہ جس کا ذکر کتاب

میں ہے، مہاراجہ رنجیت سنگھ کی ذہانت اور حکمتِ عملی کی ایک بہترین مثال ہے:

رنجیت سنگھ نے لاہور پر قبضے کے لیے محرم کے آخری دن کا انتخاب کیا، جب شہر کے شیعہ مسلمان سڑکوں پر عزاداری میں مصروف ہوتے ہیں۔ اس دن عوام کی توجہ مذہبی سرگرمیوں میں ہوتی ہے اور سڑکیں سوگوار جلوسوں سے بھری ہوتی ہیں۔ جیسا کہ رنجیت سنگھ نے اندازہ لگایا تھا، تمام سکھ سردار اور شہری اپنی چھتوں پر آرام کر رہے تھے، اور شہر کی فضا عمومی طور پر خاموش تھی۔ اسی اثناء میں، رنجیت سنگھ کی 25,000 افواج خاموشی سے شہر کے گرد جمع ہو گئیں، اور طلوعِ آفتاب تک انھوں نے بغیر کسی بڑی مزاحمت کے شہر پر قبضہ جما لیا۔

یہ واقعہ رنجیت سنگھ کی عسکری مہارت کے ساتھ ساتھ اُس کی سوشیو-پولیٹیکل ذہانت کا ثبوت بھی فراہم کرتا ہے۔ اس طرح، لاہور کی فتح ایک خالص عسکری کارروائی نہیں، بلکہ مقامی حمایت، نفسیاتی حکمتِ عملی اور موقع شناسی کا مرکب تھی۔

مقامی مسلمان اور مہاراجہ رنجیت سنگھ: سیاسی و سماجی تعلقات کا تاریخی جائزہ

یہ سوال کہ آیا مقامی مسلمانوں نے افغانوں کے مظالم سے تنگ آ کر مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حمایت کی، ایک سنجیدہ تاریخی تجزیے کا متقاضی ہے۔ عمومی بیانیے کے برعکس، سید محمد لطیف نے اپنی کتاب تاریخِ پنجاب میں اس واقعے کو ایک مختلف زاویے سے پیش کیا ہے۔ ان کے مطابق، جب شاہ زمان اپنے آخری حملے کے دوران لاہور میں مصروف تھا، اسی وقت رنجیت سنگھ نے مختلف سکھ سرداروں کے ساتھ اپنے تعلقات کو مستحکم کیا۔ اس وقت لاہور پر تین سکھ سرداروں بی لہنا سنگھ، گجر سنگھ اور سوبھا سنگھ بی کی حکومت قائم تھی۔ ان سرداروں نے کسی حد تک خودساختہ طریقے سے شہر پر قبضہ جما رکھا تھا۔ لاہور میں آج بھی ''قلعہ گجر سنگھ'' اور دیگر مقامات ان حکمرانوں کی یادگار کے طور پر موجود ہیں۔ ان سرداروں کا طرزِ حکومت جابرانہ تھا، جس کے باعث مقامی آبادی، بالخصوص مسلمان، شدید اذیت اور عدم تحفظ کا شکار تھی۔

اس دور میں مسلمانوں کی قیادت عاشق محمد، میاں محکم الدین اور میاں بدرالدین جیسے بااثر شخصیات کے ہاتھ میں تھی۔ میاں بدرالدین کا ایک تنازعہ سردار چیت سنگھ سے ہوا، جس کے نتیجے

میں چیت سنگھ نے انھیں قید کر دیا۔ عاشق محمد اور میاں محکم الدین نے اس اقدام کے خلاف احتجاج کیا، لیکن جب ان کی فریاد سنی نہ گئی تو انھوں نے رنجیت سنگھ سے رجوع کرنے کا فیصلہ کیا۔

انھوں نے حاکم رائے کی وساطت سے رنجیت سنگھ کو ایک باقاعدہ درخواست بھیجی، جس پر شہر کے معززین محمد باقر، محمد طاہر، مکرم میر شادی اور دیگر کے دستخط موجود تھے۔ اس درخواست میں انھوں نے شہر میں جاری ظلم و ستم، معاشی بدحالی اور لاقانونیت کا ذکر کرتے ہوئے رنجیت سنگھ کو لاہور پر قبضہ کرنے کی دعوت دی۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ شہر کے دروازے کھول دیے جائیں گے اور مقامی حمایت فراہم کی جائے گی۔

رنجیت سنگھ نے اس دعوت پر اپنی ساس سے مشورہ کیا اور 7 جولائی 1799ء کو پانچ ہزار سپاہیوں کے ساتھ لاہور کی جانب پیش قدمی کی۔ اس نے تینوں سکھ سرداروں سے مقابلہ کیا، جو بدعنوان اور غیر منظم تھے۔ کچھ دروازے بند تھے، لیکن عاشق محمد اور محکم الدین کی اندرونی مدد سے شہر میں داخلے کی راہ ہموار ہوئی۔ ایک دروازے کے قریب موجود خلا سے فائدہ اٹھاتے ہوئے رنجیت سنگھ نے شہر میں داخلہ ممکن بنایا۔ اس مختصر معرکے میں صرف پانچ سکھ سپاہی مارے گئے۔ لاہوری دروازے سے داخل ہو کر رنجیت سنگھ نے شہر پر کنٹرول حاصل کر لیا۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مقامی مسلمانوں نے نہ صرف سکھ سرداروں کی مخالفت کی بلکہ فعال طور پر رنجیت سنگھ کی حمایت بھی کی۔ سید محمد لطیف کے مطابق، مسلمان معززین نے ہندو تاجروں (جنھیں وہ ''چھتری'' کہتے ہیں، جبکہ قرینِ قیاس ہے کہ یہاں مراد ''کھتری'' ہو) کے ساتھ ہونے والی چپقلش اور مظالم کے باعث ایک بہتر متبادل کے طور پر رنجیت سنگھ کو خوش آمدید کہا۔

شہر پر قبضے کے بعد مقامی آبادی نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کا خیر مقدم کیا۔ اس نے تاجروں کو تحفظ کی یقین دہانی کروائی اور عام شہریوں کے ساتھ نرم رویہ اختیار کیا، جس سے اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔

پنجاب میں سیاسی انتشار اور طاقت کا خلا

اس دور میں مجموعی طور پر پنجاب کا علاقہ سیاسی انتشار اور غیر مرکزیت کا شکار تھا۔ مختلف

خطّوں پر مختلف مقامی حکمرانوں کی عمل داری قائم تھی۔

قصور پر سردار نظام الدین خان کی حکومت تھی، جہاں پٹھانوں کی اکثریت آباد تھی، چک گرو (بعدازاں امرتسر) پر گلاب سنگھ کی قیادت میں بھنگی سردار قابض تھے، ملتان پر شجاع خان کے بیٹے مظفر خان، اور ڈیرہ پر عبدالصمد خان کی عمل داری تھی، لاہور، بنوں، اور ملحقہ علاقوں پر نواب محمد خان کے بیٹے محمد شاہ نواز قابض تھے، ٹانک پر سرور خان کٹھی خیل حاکم تھا،، جھنگ پر احمد خان سیال، شورکوٹ پر فتح خان، اور قلعہ اٹک پر جہانداد خان حکمران تھے۔ یہ تمام حکمران کسی نہ کسی حد تک افغان درّانی سلطنت سے وابستہ تھے۔ تاہم، جب کابل میں درّانی حکومت کمزور ہوئی، تو ان علاقوں نے خودمختار حیثیت اختیار کر لی۔ یوں اس وقت پورا پنجاب ایک سیاسی خلا کا شکار تھا، جس میں کسی مستحکم مرکزی حکومت کا وجود نہیں تھا۔ اس صورتِ حال نے مہاراجہ رنجیت سنگھ جیسے باصلاحیت حکمران کے لیے اپنی طاقت بڑھانے اور اقتدار کو وسعت دینے کی راہ ہموار کی۔

اٹھارھویں صدی کے اختتام پر پنجاب کی سیاسی صورتِ حال نہایت ابہام اور تقسیم کا شکار تھی۔ ایک طرف مشرقی پنجاب پر سکھ طاقت کا غلبہ نمایاں تھا، جبکہ دوسری طرف مغربی پنجاب میں مختلف مسلم زمینداروں اور قبائلی سرداروں کی عمل داری قائم تھی۔ اس وقت لاہور میں بھی سکھ اقتدار قائم ہو چکا تھا، جہاں ایک سکھ سربراہ تخت نشین تھا۔ یہ سیاسی نقشہ واضح طور پر اس امر کی عکاسی کرتا ہے کہ پنجاب میں کوئی مستحکم مرکزی حکومت موجود نہ تھی، بلکہ علاقائی خودمختاریوں کا غلبہ تھا۔

اس ضمن میں ہرکشن سنگھ سرجیت نے مہاراجہ رنجیت سنگھ اور شاہ زمان کے تعلقات پر ایک تحقیقی مضمون تحریر کیا ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ جب شاہ زمان اپنے آخری حملے کے بعد واپسی کے سفر پر تھا، تو دریائے جہلم میں آنے والی شدید طغیانی اور موسلا دھار بارش کے باعث اس کی بارہ توپیں دریا میں بہہ گئیں۔ ان حالات میں اس نے رنجیت سنگھ کو ایک مراسلہ ارسال کیا، جس میں درخواست کی گئی کہ وہ ان توپوں کو نکال کر واپس بھجوائے۔ اس خدمت کے بدلے شاہ زمان

نے رنجیت سنگھ کو صوبہ لاہور کی گورنری عطا کرنے کا وعدہ کیا۔

رنجیت سنگھ مارچ 1799ء تک آٹھ توپیں نکالنے میں کامیاب ہو گیا اور انھیں شاہ زمان تک پہنچا دیا۔ باقی چار توپوں کے بارے میں اس نے معذرت کی کہ وہ دریا کی گہرائی اور تیز دھار کے باعث نکالنا ممکن نہیں۔ اس عملی مدد پر شاہ زمان نے اظہارِ تشکر کے طور پر رنجیت سنگھ کو ایک خلعتِ شاہی اور ایک فرمان بھیجا، جس میں لاہور پر قبضے کی اجازت دی گئی تھی۔

ہرکشن سنگھ سرجیت اس واقعے کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ درحقیقت اس وقت شاہ زمان کا پنجاب پر کوئی فعال کنٹرول نہیں تھا، نہ ہی وہ سکھ سرداروں سے خراج وصول کرتا تھا۔ تاہم، احمد شاہ ابدالی کے پوتے ہونے کے ناطے وہ محض ایک علامتی حاکمیت کا دعویٰ رکھتا تھا۔

سیاسی حالات میں بڑی تبدیلی اس وقت آئی جب 1801ء میں شاہ زمان کو اندھا کر کے معزول کر دیا گیا اور اس کا بھائی محمود شاہ درّانی اقتدار میں آ گیا۔ شاہ زمان نے مجبوراً پنجاب میں پناہ لی، جہاں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے نہ صرف اس کا خیر مقدم کیا بلکہ اسے باقاعدہ ماہانہ وظیفہ (الاؤنس) بھی فراہم کیا۔ یہ عمل رنجیت سنگھ کی ابتدائی سفارتی فراست اور تزویراتی بصیرت کا مظہر تھا، جو آگے چل کر اسے لاہور کا حکمران اور سکھ سلطنت کا بانی بنانے میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔

پنجاب میں طاقت کے خلا کا بھرنا اور ریاستی مرکزیت کا قیام

ان تمام حقائق کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کرنا ممکن ہے کہ اٹھارھویں صدی کے اواخر میں پنجاب ایک شدید بحرانی کیفیت سے دوچار تھا۔ ایک طرف عوام سکھ سرداروں کے مظالم سے نالاں تھے، تو دوسری طرف شاہ زمان کے حملوں اور افغان انتظامیہ کی لوٹ مار سے عاجز آ چکے تھے۔ دہلی کی مرکزی سلطنت اپنی سیاسی موت مر چکی تھی اور اقتدار کا خلا روز بروز وسیع ہوتا جا رہا تھا۔

ایسے میں مہاراجہ رنجیت سنگھ ایک معقول اور قابلِ قبول متبادل قیادت کے طور پر سامنے آئے۔ ان کی شخصیت میں وہ توازن پایا جاتا تھا جس نے ہندو، سکھ اور مسلمان طبقات کو یکساں طور پر مطمئن کیا۔ یہی وجہ ہے کہ تمام قومیتوں اور طبقاتی نمائندوں نے ان کے لاہور پر قبضے میں نہ صرف خاموش حمایت فراہم کی بلکہ بعض مسلم معززین نے فعال طور پر ان کی مدد بھی کی۔

شاہ زمان کے محدود اختیارات اور رنجیت سنگھ کی عملی طاقت کے مابین فرق واضح تھا۔ آخر کار شاہ زمان نے کابل کی راہ لی اور رنجیت سنگھ سے دوستانہ تعلقات استوار کیے۔ اس کے بعد پنجاب میں، عرصۂ دراز کے بعد، پہلی بار ایک مستحکم اور طاقتور مرکزی ریاست کا قیام عمل میں آیا، جس کے زیرِ اثر پورے پنجاب کا نصف حصہ آ چکا تھا۔ یہی ریاست بعدازاں اپنی سرحدوں کو وسعت دیتے ہوئے افغانستان اور سندھ تک بڑھنے میں کامیاب ہوئی اور ایک منظم سیاسی و عسکری قوت کے طور پر ابھری۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کا دورِ حکومت: ایک تجزیاتی مطالعہ

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی شخصیت اور ان کے دورِ حکومت پر تاریخ نویسی کے میدان میں خاصا کام ہوا ہے۔ اس مضمون کی تیاری کے دوران میں نے متعدد مستند کتب اور تحقیقی مضامین سے استفادہ کیا، جن میں چند نمایاں مصادر درج ذیل ہیں:

سید محمد لطیف کی معروف تصنیف تاریخ پنجاب، جس میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بارے میں دو سو سے زائد صفحات پر مشتمل تفصیلی مواد شامل ہے؛

The Real Ranjit Singh از فقیر سید وحید الدین، جو فقیر خاندان کی ذاتی روایات اور مشاہدات پر مبنی ہے؛

Muslims Under Sikh Rule in the Nineteenth Century: Maharaja Ranjit Singh and Religious Tolerance

از ڈاکٹر روبینہ یاسمین، جو مہاراجہ کے دور میں مسلمانوں کے حالات کا تحقیقی تجزیہ پیش کرتی ہے؛

Empire of the Sikhs: The Life and Times of Maharaja Ranjit Singh

از پت ونت سنگھ اور جیوَتی رائے؛

Maharaja Ranjit Singh (Punjab Heritage Series)

از رشی سنگھ اور سون دیپ شنکر؛

Maharaja Ranjit Singh

از ژاں ماری لافوں (Jean Marie Lafont)؛

Emperor of the Five Rivers: The Life and Times of Maharajah Ranjit Singh

از محمد شیخ (2022)۔

ان مصادر کے علاوہ مختلف علمی مضامین اور تاریخی تجزیات سے بھی رہنمائی لی گئی تاکہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی شخصیت، سیاست، اور ان کے دور کے سماجی اثرات کا مکمل و منصفانہ جائزہ پیش کیا جا سکے۔ میں نے اپنی تحریر میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہدِ حکومت کو اُن موضوعات میں شامل کیا ہے جن پر لکھنا نسبتاً مشکل اور پیچیدہ رہا۔ ان کے بارے میں رائے عموماً دو انتہاؤں میں منقسم ہے ایک طرف وہ سکھ تاریخ میں ایک عظیم حکمران کے طور پر جانے جاتے ہیں، جبکہ دوسری جانب کئی مسلمان مؤرخین اور مذہبی حلقے انھیں برصغیر کے مسلمانوں کا دشمن قرار دیتے ہیں۔

حالیہ برسوں میں، جب لاہور میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے مجسمے کی تنصیب کا منصوبہ پیش کیا گیا تو اس پر مختلف مذہبی و سماجی طبقات کی جانب سے شدید ردِعمل دیکھنے میں آیا۔ ان تضادات اور متنازعہ آراء کو مدِنظر رکھتے ہوئے، میری تحقیق کا بنیادی مقصد مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور میں قائم سکھ ریاست کے سماجی و ثقافتی اثرات کا مطالعہ کرنا ہے۔

اگرچہ اس مضمون میں میں نے مہاراجہ کی فتوحات (جیسے کشمیر، ملتان، ڈیرہ جات، اور پشاور) کی تفصیل میں جانے کے بجائے ان کے دورِ حکومت کے سماجی و مذہبی پہلوؤں پر توجہ دی ہے، تاہم یہ سوالات میرے تجزیے کا مرکز رہے ہیں:

کیا مہاراجہ واقعی اسلام دشمن حکمران تھے؟

کیا پاکستانی مسلمانوں کے لیے ان کی شخصیت کا مثبت تجزیہ قابلِ اعتراض سمجھا جانا چاہیے؟

ان کی حکمرانی کے اثرات پنجاب کے عمومی معاشرتی ڈھانچے پر کس طرح مرتب ہوئے؟

ان سوالات کے جوابات تلاش کرنے کی کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں، اس کا فیصلہ میں قارئین پر چھوڑتا ہوں۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کا دورِ حکومت: ایک تحقیقی مطالعہ

سابقہ ابواب میں اس کتاب میں زمان شاہ ابدالی (احمد شاہ ابدالی کے پوتے) کی لاہور پر یلغار کا تفصیلی جائزہ پیش کیا جا چکا ہے، اور یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح مقامی مسلمانوں کی حمایت سے رنجیت سنگھ نے لاہور پر قبضہ کیا۔ لہٰذا، اس تفصیل کو یہاں دہرانا ضروری نہیں سمجھا گیا۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ 1801ء میں رنجیت سنگھ نے خود کو ''مہاراجہ پنجاب'' قرار دیا اور سکھ گروؤں کے نام پر سکے جاری کیے، جو ایک مذہبی اور سیاسی علامت تھے۔ انھوں نے سکھ دولتِ مشترکہ کے تصور کے تحت ریاست کا نظم و نسق سنبھالا۔ 1802ء میں انھوں نے امرتسر پر قبضہ کیا، جو نہ صرف شمالی ہندوستان کا ایک اہم تجارتی مرکز تھا بلکہ سکھ مت کے مقدس ترین شہروں میں شمار ہوتا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے پنجاب کے طول و عرض میں منتشر سکھ اور پشتون سرداروں کو مطیع کرنے کا عمل شروع کیا۔

میرے خیال میں، رنجیت سنگھ کی مشرقی فتوحات کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ریاست پٹیالہ بنی، جس نے انگریزوں کی حمایت حاصل کرتے ہوئے خود کو ان کا حلیف قرار دیا۔ نتیجتاً، جب رنجیت سنگھ نے دریائے ستلج کی سمت پیش قدمی کی تو انھیں انگریز مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے بعد 1806ء میں انگریزوں سے ایک ابتدائی معاہدہ ہوا، اور 1809ء میں رنجیت سنگھ کو ''معاہدۂ امرتسر'' پر دستخط کرنے پر مجبور کیا گیا، جس کے تحت دریائے ستلج کو ان کی ریاست کی مشرقی حد مقرر کر دیا گیا۔

یہاں ایک اہم سوال جنم لیتا ہے: آیا ستلج کو حدِ فاصل بنانا رنجیت سنگھ کی شکست تھی، یا انگریزوں سے معاہدہ کر کے انھوں نے اپنی مشرقی سرحد کو محفوظ بنا کر تمام توجہ کشمیر، ملتان، ڈیرہ جات، پشاور اور افغانستان کی جانب مرکوز کر دی؟ کیا یہی حکمتِ عملی ان کی مغربی فتوحات کا پیش خیمہ بنی؟

میرے نزدیک، یہ اقدام ان کی سیاسی بصیرت اور حقیقت پسندانہ حکمتِ عملی کا مظہر تھا۔

انھوں نے بروقت انگریزوں سے امن کا راستہ اختیار کر کے مشرقی سرحد کو غیر متحرک بنایا اور مغرب وشمال کی سمت ریاست کو وسعت دی، جو ان کے لیے نہایت سودمند ثابت ہوا۔

رنجیت سنگھ کی فوجی فتوحات، ساخت اور کابل سے متعلق حقیقت: ایک تجزیاتی جائزہ

انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا کے مطابق، مہاراجہ رنجیت سنگھ کی تمام فتوحات ایک منظم اور متنوع پنجابی فوج کے ذریعے حاصل کی گئیں، جس میں سکھوں کے ساتھ ساتھ مسلمان اور ہندو سپاہی بھی شامل تھے۔ اس کی فوجی قیادت بھی مذہبی اعتبار سے متنوع تھی، جس میں مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے جرنیل شامل تھے۔ یہی کثرت اور ہم آہنگی اس کی انتظامیہ میں بھی نظر آتی ہے، جہاں اس کی کابینہ میں سکھ وزرا کے ساتھ مسلمان اور ہندو وزرا بھی شامل تھے۔

سن 1820ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنی فوج کو جدید خطوط پر استوار کرنے کا آغاز کیا۔ اس مقصد کے تحت اس نے کئی یورپی افسران کی خدمات حاصل کیں، جن میں سے اکثر نپولین اول کی افواج میں خدمات انجام دے چکے تھے۔ ان افسران نے اس کی پیادہ فوج اور توپ خانے کو جدید تربیت فراہم کی، جس کے نتیجے میں ایک منظم اور جدید پنجابی فوج وجود میں آئی۔ اسی فوج نے شمال مغربی سرحدی علاقوں (موجودہ خیبر پختونخوا، پاکستان) میں کامیاب مہمات سرانجام دیں، جن میں 1831ء میں قبائلی بغاوت کو کچلنا اور 1837ء میں پشاور پر افغان حملے کو پسپا کرنا شامل ہیں۔

رنجیت سنگھ کی سفارتی بصیرت کا مظاہرہ 1831ء میں اس وقت ہوا جب اس نے برطانوی حکام سے سندھ کے مسئلے پر ملاقات کی۔ برطانوی سلطنت، جو پہلے ہی دریائے سندھ پر تجارتی و فوجی آمد و رفت شروع کر چکی تھی، سندھ پر بالادستی کی خواہاں تھی۔ اگرچہ برطانوی دباؤ کے نتیجے میں رنجیت سنگھ کو بعض معاملات میں پسپائی اختیار کرنا پڑی، لیکن وہ برطانوی عزائم سے باخبر رہا۔ اس نے اس صورت حال کے پیش نظر افغانوں سے سفارتی روابط قائم کیے اور ڈوگرہ کمانڈر زوراور سنگھ کی قیادت میں شمالی علاقوں کی جانب ایک مہم روانہ کی، جس کے نتیجے میں 1834ء میں لداخ سمیت کئی علاقے سکھ سلطنت کا حصہ بن گئے۔

1838ء میں افغانستان میں سیاسی تبدیلی اس وقت رونما ہوئی جب دوست محمد خان نے شاہ

شجاع کو اقتدار سے محروم کر دیا۔ شاہ شجاع نے انگریزوں سے مدد طلب کی، اور برطانوی حکومت، جو افغانستان میں روسی اثر و رسوخ سے خائف تھی، نے شاہ شجاع کی حمایت کا فیصلہ کیا۔ انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا کے مطابق، اسی تناظر میں برطانوی وائسرائے لارڈ آکلینڈ نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ساتھ ایک معاہدے پر اتفاق کیا تاکہ شاہ شجاع کو دوبارہ کابل کے تخت پر بحال کیا جا سکے۔ اس معاہدے کے تحت برطانوی افواج نے سندھ کی سمت سے افغانستان میں پیش قدمی کی، جبکہ سکھ فوجیں درۂ خیبر تک آئیں اور کابل میں ہونے والی فتح کی پریڈ میں شرکت کی۔

یہاں یہ وضاحت نہایت اہم ہے کہ بعض روایات کے مطابق سکھ افواج نے کابل فتح کیا، جو تاریخی طور پر درست نہیں۔ سکھ فوجیں یقیناً جمرود تک پہنچی تھیں اور انھوں نے وہاں ایک قلعہ بھی تعمیر کیا، جو آج بھی موجود ہے، لیکن مہاراجہ رنجیت سنگھ نے 1839ء میں براہِ راست اپنی فوج کو کابل پر قبضے کے لیے روانہ نہیں کیا۔ اس نے برطانوی افواج کو اپنے علاقوں، خصوصاً فیروز پور اور ملتان سے گزرنے کی اجازت دی اور محدود فوجی تعاون فراہم کیا۔ اس تعاون میں اس کے یورپی جرنیل، جیسے جنرل وینٹورا اور جنرل ایلارڈ، کلیدی کردار ادا کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ کابل شہر میں ان کی باقاعدہ جنگی تعیناتی کا کوئی ٹھوس ثبوت موجود نہیں۔

جولائی 1839ء میں شاہ شجاع کو برطانوی عسکری تعاون سے کابل میں بحال کیا گیا، جبکہ رنجیت سنگھ نے دانائی سے افغان سرزمین پر اپنی بڑی فوجی قوت تعینات کرنے سے گریز کیا۔ اس لیے یہ دعویٰ کہ سکھ فوجیں کابل پر قابض ہوئیں، تاریخی شواہد کی روشنی میں درست نہیں۔ تاہم، یہ حقیقت ضرور ہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے انگریزوں کے ساتھ محدود سطح پر تعاون کیا، اور اس کی نمائندگی فتح کی پریڈ میں سکھ فوجیوں اور یورپی جرنیلوں کے ذریعے ہوئی۔

رنجیت سنگھ کا انتقال جون 1839ء میں لاہور میں ہوا اسی شہر میں جس پر وہ چالیس برس قبل ایک فاتح کی حیثیت سے وارد ہوا تھا۔ اس کی وفات کے کچھ ہی عرصے بعد، وہ عظیم سکھ سلطنت، جو اس نے بڑی محنت، تدبر اور حکمت سے قائم کی تھی، داخلی خلفشار، قیادت کے فقدان اور اندرونی کشمکش کے باعث بکھر کر رہ گئی۔

افغان-سکھ جنگوں کے دوررس اثرات

سکھوں نے ایک صدی پر محیط طویل جدوجہد کے بعد بالآخر پنجاب پر قبضہ کرلیا۔ احمد شاہ ابدالی کی آمد سے قبل، سکھوں کی تمام تر عسکری سرگرمیاں مغلوں کے خلاف مرکوز تھیں۔ تاہم احمد شاہ ابدالی کی مداخلت کے بعد، یہ تنازعات افغان-سکھ جنگوں کی صورت اختیار کر گئے۔ یہ جنگیں محض عسکری تصادمات نہیں تھیں بلکہ ان کے نتیجے میں پنجاب کی سیاسی، ثقافتی اور سماجی ساخت میں گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ ان جنگوں کے دوران سکھ افواج کی مزاحمت اور حکمت عملی نے نہ صرف مغل اور درانی سلطنتوں کے زوال کو تیز کیا بلکہ ایک نئی طاقت کے طور پر سکھ سلطنت کے ابھار کی راہ ہموار کی۔

ان جنگوں کے نتیجے میں سکھ سلطنت نے ان علاقوں پر قبضہ کیا جہاں صدیوں سے مسلمان حکمران برسرِ اقتدار تھے، جن میں پنجاب، کشمیر اور خیبر پختونخوا کے وسیع علاقے شامل تھے۔ لاہور، جو گزشتہ آٹھ سو سال سے مسلمان حکمرانوں کا مرکز تھا، اب سکھوں کے زیرِ اقتدار آ گیا۔ اس تبدیلی نے خطے میں طاقت کے توازن کو بدل دیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی قیادت میں سکھ افواج نے ابدالی سلطنت کے اثر ورسوخ کو کمزور کیا، جس کا مظاہرہ 1837ء کی جنگِ جمرود میں ہوا، جہاں سکھ افواج نے افغان حملے کو مؤثر طریقے سے روکا۔

سکھ سلطنت کے قیام سے پنجاب میں طویل عرصے بعد نہ صرف سیاسی استحکام پیدا ہوا بلکہ ثقافتی اور سماجی سطح پر بھی نمایاں تبدیلیاں آئیں۔ عمومی طور پر، بعض استثناؤں کے ساتھ، سکھ حکمرانوں نے مذہبی رواداری، انصاف اور انتظامی اصلاحات کو فروغ دیا، جس سے ایک متنوع اور ہم آہنگ معاشرہ تشکیل پایا۔ یہ دور سکھ شناخت کے ارتقاء میں بھی اہم رہا، جس میں سکھ برادری نے خود کو ایک مضبوط اور منظم قوم کے طور پر منوایا۔

تاہم، سکھوں کی توسیع پسندی نے برطانوی سامراج کی توجہ بھی مبذول کی۔مہاراجہ رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد سکھ ریاست کو زوال کا سامنا کرنا پڑا۔ 1845ء سے 1849ء کے دوران ہونے والی اینگلو-سکھ جنگوں کے بعد، برطانوی حکومت نے پنجاب کو اپنی سلطنت میں شامل کرلیا، جس سے برصغیر میں نوآبادیاتی دور کا آغاز ہوا۔

میرے مشاہدے کے مطابق، افغان-سکھ جنگیں برصغیر کی تاریخ میں ایک اہم موڑ ثابت ہوئیں۔مہاراجہ رنجیت سنگھ کی ملتان، کشمیر، پشاور اور ڈیرہ جات پر قبضے کے لیے جنگوں کا احوال جان کر میں اگر یہ کہوں کہ ان جنگوں کو افغان۔سکھ وارز کی بجائے مسلمان۔سکھ وارز کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ان جنگوں کا اثر معاشرے میں ہر سطح پر پڑا، جو ایک فطری بات تھی۔ معاشرے میں ایک دراڑ پڑی جس بعد میں نظریہ پاکستان کی بنیاد بنی۔انھوں نے نہ صرف سکھ سلطنت کے قیام کی راہ ہموار کی بلکہ خطے میں سیاسی، ثقافتی اور سماجی تبدیلیوں کا پیش خیمہ بنیں۔ یہ جنگیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ عسکری طاقت، دوراندیش قیادت اور حکمتِ عملی کے امتزاج سے تاریخ کا رُخ بدلا جاسکتا ہے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی جنگیں: ایک تحقیقی مطالعہ

اس تحریر کا مقصد مہاراجہ رنجیت سنگھ کی جانب سے لاہور کی فتح کے بعد دیگر علاقوں میں کی جانے والی تمام عسکری مہمات کی تفصیل بیان کرنا نہیں، بلکہ ان اہم جنگوں کا مختصر مگر علمی تجزیہ پیش کرنا ہے جنھوں نے سکھ سلطنت کے سیاسی، جغرافیائی اور عسکری دائرۂ کار کو وسعت دی۔

امرتسر کی فتح (1802): لاہور پر قبضے کے بعد، مہاراجہ رنجیت سنگھ نے سکھوں کے روحانی و ثقافتی مرکز، امرتسر، کو سلطنت میں شامل کرنے کی ٹھانی۔ 1802ء میں اس شہر پر قبضے کے بعد نہ صرف مذہبی لحاظ سے اسے برتری حاصل ہوئی بلکہ سیاسی طور پر بھی اس کی حکومت کو اخلاقی جواز ملا۔امرتسر پر قبضہ سکھ اقتدار کی علامت بن گیا۔

قصور کی جنگ (1807): قصور، مغربی پنجاب کا ایک اہم مقام، اُس وقت افغان نواب مظفر

خان کے زیرِ اثر تھا۔ چونکہ یہ علاقہ درانی سلطنت کا حلیف تھا، اس لیے رنجیت سنگھ نے 1807ء میں فوج کشی کی۔ فتح کے بعد سکھ سلطنت نے مغربی سرحد پر ایک مضبوط دفاعی پوزیشن حاصل کی۔

ملتان کی مہمات (1818-1810): ملتان، برصغیر کا ایک تاریخی اور ثقافتی شہر، سکھ حکمرانی کے خواب کا مرکزی نقطہ تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اس پر متعدد حملے کیے، جو بالآخر 1818ء میں کامیاب ہوئے۔ افغان گورنر نواب مظفر خان کی شکست کے بعد ملتان سکھ سلطنت کا حصہ بن گیا، اور یوں جنوبی پنجاب سکھ اقتدار کے تحت آ گیا۔

کشمیر کی فتح (1819): 1819ء میں مہاراجہ نے ایک منظم مہم کے ذریعے کشمیر، جو اس وقت افغان گورنر کے زیرِ انتظام تھا، پر حملہ کیا۔ عسکری لحاظ سے کامیاب مہم کے بعد کشمیر سکھ سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔ اس فتح نے سکھ ریاست کی شمالی توسیع کو مستحکم کیا اور اسے ہمالیائی خطے تک رسائی دی۔

نوشہرہ کی جنگ (1823): پشاور اور خیبر پاس کی اہمیت کے پیشِ نظر، مہاراجہ رنجیت سنگھ نے 1823ء میں افغان سردار دوست محمد خان اور یوسف زئی قبائل کے خلاف نوشہرہ میں ایک فیصلہ کن جنگ لڑی۔ سکھ افواج کی کامیابی نے پشاور پر قبضے کی راہ ہموار کی۔ بعد ازاں، مقامی قبائلی حکمرانوں کو راج کا اختیار دے کر مہاراجہ واپس لاہور لوٹ آیا۔

جمرود کی جنگ (1837): رنجیت سنگھ کی حکمرانی کے اختتامی دور میں لڑی جانے والی اس جنگ میں افغان امیر دوست محمد خان نے پشاور پر دوبارہ قبضے کی کوشش کی۔ قلعۂ جمرود پر حملے کے دوران سکھ جرنیل ہری سنگھ نلوہ شہید ہو گئے، تاہم سکھ افواج نے قلعے کا دفاع کیا اور افغان حملہ ناکام بنا دیا۔

لداخ کی مہم (1834): ڈوگرہ کمانڈر جنرل زوراور سنگھ کی قیادت میں سکھ افواج نے 1834ء میں لداخ پر حملہ کیا۔ دشوار گزار پہاڑی علاقوں میں فوجی مہم کامیابی سے مکمل کی گئی، جو مہاراجہ کی عسکری منصوبہ بندی اور جغرافیائی حکمتِ عملی کی اعلیٰ مثال تھی۔

کابل کی مہم میں شرکت (1839): اگرچہ سکھ فوجوں نے کابل پر براہِ راست حملہ نہیں کیا، تاہم پہلی اینگلو-افغان جنگ (1842-1839) کے دوران مہاراجہ رنجیت سنگھ نے انگریزوں

کے ساتھ تعاون کیا۔اس کا مقصد شاہ شجاع کو دوبارہ تخت پر بٹھانا تھا۔سکھ سلطنت نے برطانوی افواج کو جنوبی پنجاب سے گزرنے کی اجازت دی، اور کچھ سکھ افسران نے لاجسٹک اور انٹیلیجنس امور میں بھی مدد فراہم کی۔تاہم سکھ فوجیں کابل میں بطور قابض طاقت شامل نہیں ہوئیں۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی جنگیں محض عسکری فتوحات نہ تھیں، بلکہ ایک مدبر حکمران کی سیاسی بصیرت، رواداری اور جدیدیت پسندی کا عملی اظہار تھیں۔ انھوں نے فرانسیسی و اطالوی ماہرینِ حرب کی مدد سے ایک جدید اور منظم فوج تیار کی، جو ہر قسم کی جغرافیائی وقبائلی مزاحمت کے سامنے ڈٹ سکتی تھی۔ان کی فتوحات نے پنجاب کو ایک متحد، مضبوط اور باوقار ریاست میں تبدیل کیا، جس کا زوال صرف داخلی کشمکش اور قیادت کے فقدان کے باعث اُن کی وفات کے بعد ممکن ہوا۔

ایک دلچسپ امر یہ بھی ہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ بذاتِ خود رسمی تعلیم یافتہ نہیں تھے، مگر ان کی سیاسی حکمتِ عملی، مذہبی رواداری اور تدبر نے انھیں برصغیر کے عظیم حکمرانوں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ان کے دور میں سکھ آبادی، پنجاب کی مجموعی آبادی کا صرف 8 فیصد تھی۔ 1881ء کی مردم شماری کے مطابق سکھ 8 فیصد، ہندو 43 فیصد اور مسلمان 48 فیصد تھے۔ 1941ء تک سکھ آبادی 15 فیصد، مسلمان 53 فیصد اور ہندو 29 فیصد ہو چکی تھی۔ان اعداد و شمار کی روشنی میں یہ کہنا درست ہے کہ ایک اقلیتی برادری کے سربراہ نے اکثریتی اقوام پر حکومت کی۔

Religious Composition of Population, 1881-1941

Percentage

Census Year	Muslims	Hindus	Sikhs	Christians	Others
1881	47.6	43.8	8.2	0.1	0.3
1891	47.8	43.6	8.2	0.2	0.2
1901	49.6	41.3	8.6	0.3	0.2
1911	51.1	35.8	12.1	0.8	0.2
1921	51.1	35.1	12.4	1.3	0.1
1931	52.4	30.2	14.3	1.5	1.6
1941	53.2	29.1	14.9	1.5	1.3

26728_1931_REB) (Https://censusindia.gove.in)

مہاراجہ رنجیت سنگھ

ایک متنازع حکمران یا روادار بادشاہ؟

اس مقام پر میں علمی دیانت کے ساتھ اس امر کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بارے میں مورخین کی آراء دو انتہاؤں پر منقسم نظر آتی ہیں۔ ایک طرف وہ مؤرخین ہیں جو اسے ایک عظیم، روشن خیال اور روادار حکمران قرار دیتے ہیں، جبکہ دوسری طرف ایسے محققین بھی موجود ہیں جو اس کی حکمرانی کو ظلم، جبر اور مذہبی تعصب سے عبارت گردانتے ہیں۔

اس تحقیق کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ ان دونوں نقطہ ہائے نظر کو مستند تاریخی مآخذ کی روشنی میں قارئین کے سامنے پیش کیا جائے، تاکہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی مذہبی رواداری اور ریاستی پالیسیوں کی حقیقت کو بہتر انداز میں سمجھا جا سکے۔ اس سلسلے میں ہم ان اقدامات کا بھی جائزہ لیں گے جن کے تحت مہاراجہ نے طاقت کے بل پر اپنے گردونواح کے راجگان، زمینداروں اور نوابوں کو زیر کیا، ان کے وسائل پر قبضہ کیا، اور بعض روایات کے مطابق ان کے خاندانوں کو بھی ظلم کا نشانہ بنایا۔

اس تجزیے میں ان تاریخی واقعات پر بھی روشنی ڈالی جائے گی جن میں لاہور کی بادشاہی مسجد اور سنہری مسجد کی بے حرمتی، اور سری نگر میں بعض مساجد میں نماز کی ادائیگی پر پابندی جیسے اقدامات شامل ہیں۔ یہ تمام واقعات مختلف تاریخی کتب، سیاحوں کی روایات، اور سرکاری دستاویزات میں محفوظ ہیں۔

میری تحقیق کا مرکزی سوال یہی ہے کہ ایسے تمام منفی پہلوؤں کے باوجود مہاراجہ رنجیت سنگھ کو ایک کامیاب حکمران کیوں اور کیسے تصور کیا جاتا ہے؟ ایک ایسا فرد، جس کا تعلق غیر شاہی اور نسبتاً

سادہ پس منظر سے تھا، کس طرح ایک منظم اور طاقتور ریاست کی بنیاد رکھنے میں کامیاب ہوا، جو ایک عرصے تک داخلی بغاوتوں سے محفوظ اور امن و استحکام کی علامت بنی رہی؟

ان سوالات کے جوابات کے لیے میں نے متعدد تاریخی منابع، تحقیقی کتب، اور مسلم و غیر مسلم مورخین کی تحریروں کا جائزہ لیا ہے۔ ان میں سے چند اہم اور قابلِ حوالہ ماخذات ذیل میں پیش کیے جائیں گے تاکہ اس موضوع کو علمی اور تحقیقی بنیاد پر سمجھا جا سکے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی کامیاب حکمرانی کے اسباب: ان کے ہم خیال مورخین کی نظر میں

جب میں نے سکھوں کی مغلوں اور ابدالیوں کے خلاف تقریباً ایک صدی پر محیط جدوجہد کا مطالعہ کیا تو ایک واضح حقیقت میرے سامنے آئی کہ اس طویل دور میں، عمومی طور پر، سکھ قیادت جہاں بھی گئی، خونریزی اور تباہی اس کے ہمراہ تھی۔ تاریخ کے بیشتر صفحات ان کے شدت پسندانہ اقدامات، مسلم بستیوں پر حملوں اور مساجد کی بے حرمتی سے بھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اگرچہ سکھ مؤرخین اس طرزِ عمل کو مسلمان حکمرانوں کی جانب سے اپنے مذہبی مقامات کی بے حرمتی کا ردِعمل قرار دیتے ہیں، تاہم میرے نزدیک دونوں طرف سے ایسے اقدامات قابلِ مذمت تھے، کیونکہ مذہبی رواداری ہر ریاست کے استحکام کی بنیاد ہوتی ہے۔ میں نے کہیں بھی یہ نہیں پڑھا کہ سکھوں نے کسی مندر کی بے حرمتی کی ہو یا کسی ہندو بستی کو تباہ کیا ہو۔

تاہم، اس عمومی شدت پسندی کے برعکس، مہاراجہ رنجیت سنگھ (1780-1839) کی شخصیت ایک نمایاں استثنا کے طور پر ابھرتی ہے۔ برصغیر کی سیاسی تاریخ میں انھیں ایک غیر معمولی اور کامیاب حکمران کے طور پر یاد کیا جاتا ہے، جس نے نہ صرف مختلف سکھ ریاستوں کو یکجا کیا بلکہ ایک منظم، خودمختار اور پائیدار سلطنت کی بنیاد رکھی۔ ان کی حکمرانی کے سیاسی، عسکری، انتظامی اور مذہبی پہلو ایسے ہیں جو انھیں ہم عصر حکمرانوں سے ممتاز کرتے ہیں۔

یہ بات بھی اہم ہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے بعض مواقع پر مساجد کی بے حرمتی کی، اور

متعدد واقعات میں مسلمان خواتین سے بدسلوکی کی اطلاعات بھی موجود ہیں۔ (ان باتوں کا تذکرہ آئندہ صفحات میں کیا جائے گا۔)

مہاراجہ رنجیت سنگھ کو پسند کرنے والے چند مورخین کے نظریات درج ذیل ہیں:

1- سیاسی بصیرت اور اتحاد کی پالیسی: لیفٹننٹ کرنل لیپل گرفن نے اپنی کتاب *The Rajas of the Punjab* میں لکھا ہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سب سے بڑی سیاسی کامیابی مختلف سکھ مثلوں (Misls) کو ایک متحد ریاست میں ضم کرنا تھا۔ اس عمل سے نہ صرف قبائلی، خاندانی اور علاقائی تعصّبات ختم ہوئے، بلکہ ایک مرکزی سیاسی نظام وجود میں آیا۔ خوشونت سنگھ نے بھی اپنی کتاب *A History of the Sikhs* Vol: 1 P:237 میں اس اتحاد کو رنجیت سنگھ کی سیاسی حکمت عملی کی بنیاد قرار دیا ہے۔

2-عسکری نظم اور یورپی طرزِ فوجی اصلاحات: مہاراجہ نے ایک منظم اور جدید فوج تشکیل دی، جو اُس وقت کے خطے میں منفرد حیثیت رکھتی تھی۔ اس کی فوجی اصلاحات میں یورپی ماہرین جیسے جنرل وینچورا، ایلون اور کورٹ کی مدد شامل تھی، جنھوں نے توپ خانے، پیادہ اور گھڑسوار دستوں کو یورپی انداز پر تربیت دی۔ ہری رام گپتا (*History of the Sikhs* Vol: IV) اور ژاں-ماری لافون *Maharaja Ranjit Singh: Lord of the Five Rivers* نے ان اصلاحات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔

3-مذہبی رواداری اور ہم آہنگی: مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکمرانی میں مذہبی رواداری کو نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ مسلمانوں، ہندوؤں اور دیگر اقلیتوں کو اہم فوجی و انتظامی عہدوں پر فائز کیا گیا۔ لاہور کی بادشاہی مسجد اور دیگر اسلامی عمارات کی مرمت و بحالی بھی انھی کی سرپرستی میں ہوئی۔ گنگا سنگھ (*Ranjit Singh and His Times*) اور خوشونت سنگھ دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ رنجیت سنگھ ایک ہم آہنگ اور انصاف پسند حکمران تھا۔

4-انتظامی اصلاحات اور انصاف پر مبنی نظم ونسق: مہاراجہ نے ایک منظم بیوروکریسی قائم کی، جس میں مالیات، عدلیہ اور زمین داری نظام کو مؤثر انداز میں منظم کیا گیا۔ ٹیکس کا نظام منصفانہ

تھا اور عدالتیں عوام کے لیے قابلِ رسائی تھیں۔ سوہن لال سوری اور ہری رام گپتا نے ان انتظامی پہلوؤں کو سراہا ہے۔

5- ثقافتی اور اقتصادی ترقی: ڈاکٹر فوجا سنگھ (*Historians and Historiography of the Sikhs*) اور گنڈا سنگھ (*Ranjit Singh and His Times*) کے مطابق، مہاراجہ کے دور میں پنجاب میں تعلیمی، تجارتی اور ثقافتی ترقی کا آغاز ہوا۔ لاہور، امرتسر اور دیگر شہروں میں تعمیرات، فنونِ لطیفہ اور تعلیمی ادارے فروغ پائے۔

6- ذاتی اوصاف اور عوام سے قربت: رنجیت سنگھ کی سادگی، انصاف پسندی، جرات اور رعایا سے قربت، ان کی شخصیت کے نمایاں پہلو تھے۔ وہ شاہانہ لباس سے اجتناب کرتا، عوامی دربار میں کھلے دل سے ملتا، اور خود کو "خادمِ رعیت" کہلاتا۔ ان اوصاف نے ان کے دورِ حکومت کو عوام میں مقبول اور مستحکم بنایا۔ فقیر خاندان کے آرکائیوز کی روشنی میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کا مطالعہ بھی کئی اہم پہلو سامنے لاتا ہے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ اور فقیر خاندان

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی شخصیت اور حکمرانی پر کی گئی تحقیقی کاوشوں میں ایچ ایس ورک کا مضمون بعنوان The Real Ranjit Singh: An account based on the Archive of Fakir Family (شائع کردہ: گورو نانک دیو یونیورسٹی، امرتسر) نہایت اہم اور منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ یہ مقالہ فقیر خاندان کی محفوظ کردہ تاریخی دستاویزات اور شخصی مشاہدات پر مبنی ہے۔ یاد رہے کہ فقیر خاندان نہ صرف مہاراجہ کی حکومت کا ایک اہم جزو تھا بلکہ فقیر عزیز الدین جیسی شخصیات نے انتظامی و سفارتی معاملات میں کلیدی کردار ادا کیا۔

ایچ ایس ورک لکھتے ہیں کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ ایک عظیم مدبر حکمران تھا، جس نے پنجاب کو افغان حملہ آوروں کے تسلط سے آزاد کرایا اور ہندوستان میں ایک مضبوط، خودمختار اور نظریاتی طور پر سیکولر ریاست کی بنیاد رکھی۔ تاہم، ورک اس بات کی نشان دہی بھی کرتے ہیں کہ مہاراجہ میں

قرونِ وسطیٰ کے حکمرانوں کی چند منفی عادات بھی موجود تھیں، جنھیں وہ ''vices'' کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی نجی زندگی اور ریاستی ترجیحات کو سمجھنے کے لیے سب سے معتبر ماخذ لاہور کے فقیر سید وحید الدین کی کتاب *The Real Ranjit Singh* ہے۔ یہ کتاب فقیر خاندان کے آرکائیوز پر مبنی ہے اور اس میں مہاراجہ کی انفرادی عادات، مذہبی وابستگی، اور حکومتی پالیسیوں پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب میں ایک اہم واقعے کا ذکر کیا گیا ہے کہ جب مہاراجہ رنجیت سنگھ 7 جولائی 1799ء کو ایک فاتح کے طور پر لاہور کے قلعے میں داخل ہوا تو اسے ایک روحانی ''آواز'' کے ذریعے چار اصولوں کی پیروی کا مشورہ دیا گیا، جنھیں اس نے بعد ازاں اپنی حکومتی پالیسیوں کی بنیاد بنایا:

1- ہر صبح بلا ناغہ دعاؤں کی ادائیگی؛
2- مغل شہنشاہوں کے تخت پر بیٹھ کر دربار منعقد نہ کرنا؛
3- تمام رعایا کے ساتھ مساوی سلوک روا رکھنا، خواہ وہ کسی بھی ذات یا مذہب سے تعلق رکھتے ہوں؛
4- فقیر خاندان کا احترام اور ان سے دوستانہ تعلق قائم رکھنا، کیونکہ یہ خاندان نئی ریاست کا روحانی محافظ ہوگا۔

تاریخی شواہد اور فقیر خاندان کے بیانات کے مطابق، مہاراجہ رنجیت سنگھ ان اصولوں کی مستقل پاسداری کرتا رہا۔ وہ ایک عملی سکھ تھا، جس کی روزمرہ زندگی کا آغاز عبادت اور گرو گرنتھ صاحب کی تلاوت سے ہوتا تھا۔ ان اصولوں پر عمل پیرا ہو کر اس نے ایک ایسی ریاست کی تشکیل کی جس میں مذہبی رواداری، سیاسی بصیرت، اور عوامی فلاح کو بنیادی اہمیت حاصل تھی۔

مندرجہ بالا تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکمرانی کی کامیابی کسی ایک شعبے کی مرہونِ منت نہ تھی، بلکہ یہ ایک جامع حکمتِ عملی، وسیع النظر

قیادت، اور رواداری رویے کا نتیجہ تھی۔ ان کی سلطنت طاقت، تحمل اور انصاف کے امتزاج سے قائم ہوئی، اور یہی عناصر کسی بھی ریاست کی پائیدار کامیابی کی کنجی ہوتے ہیں۔

کیا مہاراجہ رنجیت سنگھ کی قائم کردہ سکھ ریاست ایک مستحکم ریاست تھی؟

میری ذاتی رائے میں، ہر وہ ریاست جو وسعت اختیار کرتی ہے، اس کی مضبوطی کی بنیاد محض عسکری قوت نہیں بلکہ عوامی فلاح، رحم دلی، اور شفاف طرزِ حکمرانی پر ہوتی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ظلم پر مبنی نظام دیر پا نہیں ہوتے۔

میں نے تاریخی تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں یہ جانا ہے کہ کسی ریاست کی پائیدار ترقی اور پرامن توسیع کا انحصار صرف عسکری قوت پر نہیں بلکہ قیادت کے اعلیٰ اخلاقی اوصاف پر ہوتا ہے۔ جب کوئی ریاست نئے علاقوں کو اپنے دائرۂ اختیار میں شامل کرتی ہے، تو وہاں کے عوام کو ساتھ لے کر چلنے اور ان کے دل جیتنے کے لیے زورِ بازو سے زیادہ حسنِ سلوک اور عدل و انصاف کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک کامیاب حکمران کی خصوصیات میں ذاتی سادگی، جرات، انصاف پسندی اور رعایا سے قربت جیسے اوصاف بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔

تاریخ گواہ ہے کہ وہی ریاستیں دیر پا استحکام حاصل کر سکیں جن کی بنیاد ظلم و جبر کے بجائے رحم، رواداری اور انصاف پر رکھی گئی۔ یہی اصول نہ صرف ریاستی نظام بلکہ جدید کاروباری اداروں کی کامیابی میں بھی کارفرما نظر آتا ہے، جہاں قیادت کا نرم رویہ اور ہمدردی ادارے کی ترقی و بقا کو ممکن بناتا ہے۔

یہی تصور ہمیں مذہبی متون میں بھی ملتا ہے، جیسا کہ حضرت علیؓ سے منسوب قول ہے:

''معاشرہ کفر پر تو قائم رہ سکتا ہے، مگر ظلم پر نہیں۔''

اس قول سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ریاستی و معاشرتی نظام کی بقا عدل و انصاف پر موقوف ہے، نہ کہ طاقت پر۔

اس تناظر میں کہا جا سکتا ہے کہ:

جہاں رحم اور عدل کا غلبہ ہو، وہاں خدائی رحمت کا نزول یقینی ہوتا ہے،

اور جہاں ظلم و زیادتی عام ہو، وہاں تباہی اور زوال مقدر بن جاتے ہیں۔

سکھ ریاست کی نوعیت اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کا کردار: ایک تنقیدی جائزہ

مذکورہ اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے، یہ رائے پیش کی جا سکتی ہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی قائم کردہ سکھ ریاست کو ایک مکمل طور پر پائیدار یا مستحکم ریاست قرار دینا قدرے دشوار ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ تقریباً چالیس سال پر محیط اس ریاستی دور میں کوئی ایسا منظم ادارہ یا مستقل انتظامی ڈھانچہ قائم نہ کیا جا سکا، جس کی بنیاد پر یہ ریاست مہاراجہ کی وفات کے بعد بھی دیرپا استحکام حاصل کر سکتی۔ مہاراجہ کی وفات کے محض آٹھ سال بعد ہی سکھ ریاست زوال کا شکار ہوگئی، جو اس کے غیر مستحکم ڈھانچے کی غمازی کرتا ہے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے مختلف مقامی سرداروں اور طبقات کو عسکری قوت کے بل پر تابع کیا، لیکن جب خالصہ فوج اور دربار کے مابین طاقت کا تصادم شروع ہوا تو ریاست اپنے اندرونی تضادات کی نذر ہوگئی۔ مزید برآں، رنجیت سنگھ کے دور میں ہمیں پنجاب میں کوئی ایسی علمی، سماجی، ثقافتی یا تمدنی تحریک یا ادارہ نظر نہیں آتا جسے اُس کے عہد کا مستقل ورثہ یا علامتی یادگار قرار دیا جا سکے۔

اس صورتِ حال کی ایک ممکنہ توضیح یہ ہوسکتی ہے کہ اگرچہ مہاراجہ رنجیت سنگھ بطور فرد رحم دل اور مذہبی رواداری کے حامل حکمران تھے، لیکن ان کی عسکری حکمت عملیوں اور پالیسیوں میں اس رواداری کا عملی اظہار کم ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کی تمام تر توجہ ریاست کی توسیع اور جغرافیائی کنٹرول کے حصول پر مرکوز رہی۔ ان کے دور کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ وہ اکالی تخت کے تابع فرمان رہے اور سکھ مذہب کی نمائندگی اور خدمت کو ایک سیاسی عنصر کے طور پر بروئے کار لاتے رہے۔

اسی کے ساتھ ساتھ، انھوں نے برطانوی طاقت جو اُس وقت ایک ابھرتی ہوئی قوت تھی سے دوستانہ تعلقات بھی استوار کیے۔ یہ ان کی سیاسی بصیرت کا پہلو بھی ہوسکتا ہے، تاہم اسے ان کی خوش قسمتی بھی قرار دیا جا سکتا ہے کہ اُس زمانے میں مغل سلطنت کمزور ہو چکی تھی، افغان خطہ

داخلی خلفشار کا شکار تھا، اور مراٹھا طاقت پیچھے ہٹ چکی تھی۔

علاوہ ازیں، یورپی جنگوں کے اختتام کے نتیجے میں متعدد تجربہ کار یورپی فوجی جرنیل ان کی خدمات میں دستیاب ہو گئے، جن کی عسکری مہارت نے ریاست کی طاقت میں اضافہ کیا۔ ان تمام عوامل نے مہاراجہ کو ریاستی طاقت کے بھرپور استعمال اور استحکام کا موقع فراہم کیا، اور وہ اپنی زندگی کے آخری لمحے تک حکمرانی کرتے رہے۔

مسلم مؤرخین کے تنقیدی زاویے

یہاں میں دو ممتاز مسلم مؤرخین کا نقطۂ نظر پیش کرنا چاہوں گا، جن میں سے ایک مہاراجہ کے درباری خاندان یعنی فقیر سید خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس خاندان میں فقیر سید عزیزالدین مہاراجہ کے قریبی مشیروں میں شامل تھے۔ اسی خانوادے کے ایک فرد نے انگریزی میں *The Real Ranjit Singh* کے عنوان سے کتاب تحریر کی۔ مزید برآں، فقیر سید سیف الدین اور فقیر سید اعجاز الدین نے اپنے مختلف انٹرویوز میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کو ایک عظیم حکمران قرار دیا ہے۔ میں نے ذاتی طور پر یہ انٹرویوز سنے ہیں، اور ان کی روایت کردہ باتوں سے جو تصویر ابھرتی ہے، وہ رنجیت سنگھ کو پنجاب کا ایک طاقتور اور قابلِ فخر حکمران ثابت کرتی ہے۔

دوسری طرف، جب ہم سید محمد لطیف کی تصنیف تاریخِ پنجاب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں ایک مختلف زاویۂ نظر ملتا ہے۔ اس کتاب میں پیش کردہ بیانیہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی بعض پالیسیوں اور اقدامات پر تنقید کرتا ہے، جو سکھ ریاست کے بعض تلخ پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے۔ میں اس تناظر میں چند اہم اقتباسات پیش کرنا چاہوں گا تا کہ اس بیانیے کا تجزیہ ممکن ہو سکے۔

قصور کی فتح اور قطب الدین خان کی شکست

سید محمد لطیف کے مطابق، مہاراجہ رنجیت سنگھ نے 10 فروری 1807ء کو قصور پر حملہ کیا، جو افغان–سکھ جنگوں کا حصہ تھا۔ یہ حملہ اس لیے کیا گیا کیونکہ قصور، جو لاہور کے قریب واقع تھا، رنجیت سنگھ کی ابھرتی ہوئی سلطنت کے لیے ایک مستقل خطرہ بن چکا تھا۔ قصور کے حکمران، نواب

قطب الدین خان، نے سکھوں اور ہندوؤں پر اضافی ٹیکس عائد کیے تھے اور سکھ سلطنت کے خلاف جہاد کا اعلان کر رکھا تھا۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر، مہاراجہ رنجیت سنگھ نے جودھ سنگھ رام گڑھیا، ہری سنگھ نلوہ اور اکالی پھولا سنگھ کے ساتھ مل کر قصور پر زبردست حملہ کیا۔ سکھ فوج نے قصور کے قلعے کا محاصرہ کر لیا، جو تقریباً ایک ماہ تک جاری رہا۔

بالآخر، قلعے کی دیواروں کو توپوں سے نشانہ بنا کر اس میں شگاف ڈالا گیا، جس کے ذریعے سکھ فوج اندر داخل ہوئی۔ سخت ہاتھا پائی کے بعد سکھوں نے فتح حاصل کی۔ نواب قطب الدین خان کو گرفتار کر لیا گیا، لیکن مہاراجہ رنجیت سنگھ نے انھیں معاف کرتے ہوئے ماڈوٹ کے علاقے میں جاگیر عطا کی۔ اس فتح کے بعد، قصور کو سکھ سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔ اس جنگ میں ہری سنگھ نلوہ نے غیر معمولی شجاعت کا مظاہرہ کیا، جس کے اعتراف میں انھیں جاگیر عطا کی گئی۔ یہ واقعہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سلطنت کی توسیع اور استحکام کی جانب ایک اہم قدم ثابت ہوا۔

محاصرۂ قصور اور سکھ فوج کے مظالم

اس یک طرفہ جنگ کے بارے میں سید محمد لطیف لکھتے ہیں کہ مورخین کے مطابق، حملہ آوروں نے شہر کا محاصرہ کر کے اس کے تمام ذرائع رسل و رسائل منقطع کر دیے۔ یہ محاصرہ تقریباً ایک ماہ تک جاری رہا، جس کے دوران محصورین خوراک اور دیگر ضروریاتِ زندگی سے محروم ہو گئے۔ انھیں گھوڑوں اور مویشیوں کے گوشت پر گزارہ کرنا پڑا۔ انتقامی کارروائی کے طور پر حملہ آوروں نے پورے علاقے کو تہس نہس کر دیا، اور توپ خانے کی مدد سے قلعے کے بڑے حصے مسمار کر دیے۔ فتح کے بعد سکھ فوج نے وسیع پیمانے پر لوٹ مار کی اور شہریوں سے زبردستی ان کا سامانِ زندگی چھین لیا۔

محاصرے کے دوران محصورین کی حالت ناگفتہ بہ ہوگئی۔ متعدد عورتوں نے بے عزتی کے خوف سے خودکشی کر لی کسی نے گلے میں پھندہ ڈالا، تو کسی نے کنویں میں چھلانگ لگا دی۔ سینکڑوں عورتوں اور بچوں کو نہ صرف ان کے مال واسباب سے محروم کیا گیا، بلکہ انھیں ننگ دھڑنگ حالت میں چلنے پر مجبور کیا گیا۔

سید محمد لطیف رقم طراز ہیں کہ ان مظالم کی شدت عام جبر و ستم سے کہیں زیادہ سنگین تھی، اور لوگ آج بھی ان واقعات کو دردناک یادوں کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔ بالآخر محصورین نے قلعۂ قصور میں پناہ لی، لیکن اندرونی جھگڑوں اور خاندانی تنازعات نے ان کی تباہی کو مکمل کر دیا۔ وہ ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے اور ستلج کے پار جلاوطن کر دیے گئے۔

مذہبی و ثقافتی نقصان اور متنازعہ میراث

سید محمد لطیف مزید لکھتے ہیں کہ سکھ فوج نے قصور کی لوٹ مار سے بے پناہ مال و دولت حاصل کیا۔ اس کے علاوہ، قرآن پاک کے ہزاروں نسخے اور عربی و فارسی کی نادر کتابیں بھی لوٹ لی گئیں، جو بعد ازاں لاہور کے بازاروں میں انتہائی کم قیمت پر فروخت ہوئیں۔ ان واقعات کے بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ نے لاہور میں ایک عظیم الشان جشن بھی منایا۔

یہ تمام واقعات اس امر کی غمازی کرتے ہیں کہ اگرچہ بعض حلقوں میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کو مذہبی رواداری کا حامل حکمران تصور کیا جاتا ہے، لیکن جنگی مواقع پر انھوں نے کسی کو رعایت نہ دی۔ ان کی فوجی مہمات میں مذہبی اور ثقافتی ورثے کو شدید نقصان پہنچا، جو ان کے دور کی ایک متنازعہ میراث ہے۔

فتحِ ملتان: مہاراجہ رنجیت سنگھ کی عسکری کامیابی یا انسانی المیہ؟

پنجاب کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو انیسویں صدی کے آغاز میں تین اہم سیاسی و عسکری مراکز نمایاں دکھائی دیتے ہیں: سرہند، لاہور اور ملتان۔ ان میں سرہند پہلے ہی ایک سکھ سردار کے زیرِ تسلط آ چکا تھا، جسے برطانوی حکومت کی حمایت حاصل تھی۔ لہٰذا مہاراجہ رنجیت سنگھ کے لیے اگرچہ اس پر قبضے کی خواہش ممکن تھی، مگر عملی طور پر اس کے امکانات محدود تھے؛ چنانچہ اس نے اس جانب کوئی فوجی پیش رفت نہیں کی۔ لاہور پہلے ہی اس کے اقتدار کا مرکز بن چکا تھا۔ یوں صرف ملتان باقی رہ گیا تھا، جو درانی سلطنت کے تحت ایک نیم خودمختار ریاست کی حیثیت رکھتا تھا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ملتان پر متعدد بار فوجی کارروائیاں کیں، لیکن بالآخر 1818ء کی مہم

فیصلہ کن ثابت ہوئی۔ یہ معرکہ سکھ سلطنت کی جنوبی پنجاب میں توسیع اور اقتدار کے استحکام کا نقطۂ عروج بن گیا۔ اس وقت ملتان نہ صرف ایک قدیم تہذیبی و ثقافتی مرکز تھا بلکہ ایک اہم تجارتی، مذہبی اور انتظامی حیثیت بھی رکھتا تھا۔ اس پر قبضہ سکھ سلطنت کی سیاسی، مالی اور جغرافیائی تقویت کے لیے ناگزیر سمجھا جاتا تھا۔

نواب مظفر خان نے، جو احمد شاہ ابدالی کے خانوادے سے تعلق رکھتے تھے، مہاراجہ کی بالادستی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس انکار کے جواب میں، مارچ 1818ء میں، رنجیت سنگھ نے اپنے معتمد جرنیل مسر دیوان چند (ایک ہندو) کی قیادت میں ایک منظم فوجی مہم کا آغاز کیا۔ اس مہم میں مہاراجہ کا بیٹا کھڑک سنگھ اور مشہور سکھ سپہ سالار سردار ہری سنگھ نلوہ بھی شامل تھے۔ شدید مزاحمت کے بعد شہر پر قبضہ کیا گیا، اور نواب مظفر خان اپنے بیٹوں سمیت میدانِ جنگ میں جاں بحق ہو گئے۔ اس فتح کے نتیجے میں، ملتان کو مکمل طور پر سکھ سلطنت میں ضم کر دیا گیا۔

جہاں عسکری لحاظ سے فتحِ ملتان ایک تاریخی کامیابی شمار کی جاتی ہے، وہیں اس کے بعد پیش آنے والے واقعات ایک شدید انسانی المیے کی عکاسی کرتے ہیں۔ معروف مورخ سید محمد لطیف اپنی تصنیف تاریخ پنجاب میں لکھتے ہیں کہ فتح کے بعد قلعے اور شہر میں لوٹ مار، قتل و غارت اور ظلم و ستم کا بازار گرم کر دیا گیا۔ تقریباً پانچ سو گھروں کو منہدم کر دیا گیا، اور شہریوں کو ان کے گھروں سے محروم کر دیا گیا۔ نواب کے خزانے، قیمتی پتھر، زیورات، شالیں اور دیگر نوادرات سرکاری تحویل میں لے لیے گئے۔ متعدد مکانات کو آگ لگا دی گئی اور شہر کی نایاب اشیاء کو مکمل طور پر تلف کر دیا گیا۔ خاص طور پر خواتین کے ساتھ جو سلوک روا رکھا گیا، وہ نہایت دل خراش اور انسانیت سوز تھا۔ خواتین کی عصمت دری کے واقعات پیش آئے، اور متعدد عورتوں نے بے حرمتی سے بچنے کے لیے کنوؤں میں کود کر یا دیگر طریقوں سے خودکشی کر لی۔ سید محمد لطیف لکھتے ہیں کہ ان واقعات نے اہلِ ملتان کے دلوں پر ایسے زخم چھوڑے جو نسل در نسل حافظۂ عوام میں محفوظ رہے۔

بعض مورخین، جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کو ایک ترقی پسند، روادار اور اعلیٰ انتظامی صلاحیت رکھنے والے حکمران کے طور پر پیش کرتے ہیں، یہ مؤقف اختیار کرتے ہیں کہ ہر فاتح کے اقدامات کو اس

وقت کے سیاسی و سماجی سیاق و سباق میں سمجھنا چاہیے۔ بلاشبہ، رنجیت سنگھ کی حکمرانی مذہبی رواداری، عدل، اور انتظامی نظم و ضبط کے حوالے سے کئی مثبت پہلو رکھتی ہے۔ تاہم، ان کے دور کی بعض جنگی مہمات خصوصاً ملتان، پشاور اور کشمیر کی فتوحات کے تناظر میں بعض سنگین انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں بھی تاریخ کا حصہ ہیں، جنھیں نظر انداز کرنا علمی دیانت کے منافی ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا ان مظالم کو محض ''جنگی حالات'' کا نتیجہ سمجھ کر نظر انداز کر دینا چاہیے؟ کیا ان زیادتیوں کو صرف اس لیے معاف کر دیا جائے کہ وہ ایک ''مقبول حکمران'' سے منسوب ہیں؟ یا ہمیں یہ اصول اپنانا چاہیے کہ ظلم خواہ کسی بھی شخصیت سے سرزد ہو مہاراجہ رنجیت سنگھ ہو یا احمد شاہ ابدالی اس کی یکساں مذمت کی جائے؟

میرے نزدیک، ظلم کو صرف تاریخ کے صفحات پر محفوظ رکھنا کافی نہیں، بلکہ اس پر تنقیدی نگاہ ڈالنا، اس سے سبق حاصل کرنا، اور آئندہ کے لیے اس روش کی روک تھام کرنا بھی لازمی ہے۔

❋❋❋

کشمیر پر مہاراجہ رنجیت سنگھ کا حملہ
ایک تاریخی اور سیاسی تجزیہ

انیسویں صدی کے آغاز میں کشمیر، جو صدیوں سے ایک مسلم اکثریتی خطہ تھا، افغان درانی سلطنت کے زیرِ نگیں تھا۔ تاہم، اس دور میں افغان حکومت شدید سیاسی عدم استحکام، بدانتظامی اور عوامی ناراضی کا شکار تھی۔ انھی حالات نے سکھ سلطنت کو ایک سنہری موقع فراہم کیا کہ وہ اس خطے پر اپنی فتوحات کو وسعت دے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اسی سیاسی خلا سے فائدہ اٹھاتے ہوئے 1819ء میں کشمیر پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا، جو سکھ سلطنت کی شمالی و جنوبی سرحدوں کی توسیع کے ضمن میں ایک فیصلہ کن اقدام ثابت ہوا۔

کشمیر پر اس حملے کی قیادت جنرل دیوان چند (ہندو)، سردار ہری سنگھ نلوہ، اور مہاراجہ کے ولی عہد کھڑک سنگھ کے سپرد کی گئی۔ سکھ افواج نے پیر پنجال کے پہاڑی سلسلے کو عبور کیا اور شوپیاں (Shupiyan) کے مقام پر ایک فیصلہ کن معرکہ لڑا، جہاں افغان گورنر جبار خان کو شکست ہوئی۔ اس کے بعد سکھ افواج سری نگر میں داخل ہو گئیں اور یوں کشمیر کو باقاعدہ طور پر سکھ سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔ اس فوجی مہم سے قبل بھی مہاراجہ رنجیت سنگھ نے متعدد بار کشمیر پر فوجی کارروائیاں کیں۔ 1813ء اور 1814ء کی کوششیں ناکام رہیں۔ خصوصاً 1813ء کی مہم میں، جنرل دیوان موتی رام کی قیادت میں سکھ فوج کو سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا، جس کے نتیجے میں پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ تاہم، 1819ء کی مہم بہتر منصوبہ بندی، مقامی معاونت، اور وسیع فوجی تیاری کا نتیجہ تھی۔

اس مہم میں ایک اہم کردار کشمیر کے درانی وزیر بیربل دھر نے بھی ادا کیا، جنھوں نے سکھ حکام سے خفیہ روابط قائم کیے اور کشمیر میں درانی اقتدار کے خاتمے کے لیے ان کی رہنمائی کی۔ اس

تعاون نے سکھ افواج کو کشمیر کے جغرافیہ، دفاعی راستوں اور فوجی کمزوریوں سے آگاہی فراہم کی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنی فوج کو تین حصوں میں تقسیم کیا: جنرل دیوان چند کو ہراول دستے کی کمان دی گئی، کھڑک سنگھ نے عقب کی فوج کی قیادت کی، جبکہ مہاراجہ نے خود دس ہزار سپاہیوں پر مشتمل ایک ریزروفورس کو رسد اور کمک کی حفاظت کے لیے متعین کیا۔ سکھ فوج بھمبر سے روانہ ہو کر متعدد قلعوں پر قابض ہوئی اور آخر کار شوپیاں تک پہنچی، جہاں 3 جولائی 1819ء کو شدید معرکہ آرائی کے بعد فتح حاصل کی گئی۔

کشمیر پر سکھ افواج کی فتح محض ایک عسکری کامیابی نہ تھی بلکہ یہ ایک سیاسی، معاشی اور سماجی تبدیلی کا پیش خیمہ بھی بنی۔ کشمیر، جو صدیوں سے مسلم حکمرانی کا مرکز تھا، اب ایک غیر مسلم اقتدار کے تحت آ گیا۔ اس تبدیلی نے مقامی معاشرے پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ سکھ انتظامیہ کے ابتدائی اقدامات، ٹیکس نظام، اور طرزِ حکمرانی نے کشمیری مسلمانوں میں بے چینی کو جنم دیا، جس کا ذکر متعدد مورخین، بشمول پنڈت پرتاب سنگھ اور سید محمد لطیف نے اپنی تصانیف میں کیا ہے۔

سیاسی سطح پر، کشمیر پر سکھ قبضہ درانی سلطنت کے مکمل زوال اور سکھ اقتدار کے عروج کی علامت بن گیا۔ معاشی لحاظ سے، اگرچہ سکھ انتظامیہ نے نظم و نسق بہتر بنانے کی کوشش کی، لیکن محصولاتی بوجھ اور غیر مقامی حکمرانی نے عوام کو مایوسی میں مبتلا رکھا۔ سماجی و مذہبی اعتبار سے، مسلمانوں کی اکثریتی آبادی کو نئے نظام میں محدود حیثیت حاصل رہی، اور کئی مقامی رسوم و روایات کو خطرات لاحق ہوئے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اگرچہ کشمیر کو فتح کر لیا، مگر کشمیری عوام کے دل نہ جیت سکا۔ اس کی ایک بڑی وجہ وہ شہرت تھی جو وہ پہلے ہی قصور اور ملتان کی فتوحات کے دوران حاصل کر چکا تھا۔ اس موضوع پر کئی مورخین نے تفصیل سے لکھا ہے۔ مورخ سید محمد لطیف اور دیگر مسلم مؤرخین کے مطابق، سکھ فتح کے بعد مسلمانوں پر شدید مظالم ڈھائے گئے۔ کئی مساجد کو مسمار یا غیر فعال کر دیا گیا، مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں سے محروم کر دیا گیا، عبادات پر پابندیاں عائد کی گئیں اور مذہبی آزادی محدود کر دی گئی۔ کشمیری علماء، صوفیا اور مذہبی رہنماؤں کو سزا دی گئی۔

سید محمد لطیف کے مطابق، سکھوں کی فتح کے بعد شہر کا بڑا طبقہ، خصوصاً مسلمان، سخت مشکلات کا شکار ہو گیا۔ انھیں ان کے گھروں، زمینوں اور کاروبار سے بے دخل کیا گیا۔ عوام کو جزیہ اور دیگر بھاری ٹیکس ادا کرنے پر مجبور کیا گیا۔ اذان دینے پر پابندی لگائی گئی، جمعہ اور عیدین کی نمازوں سے روکا گیا، کئی مساجد کی بے حرمتی کی گئی، اور بعض کو گودام یا اصطبل میں تبدیل کر دیا گیا۔ کسانوں پر بھاری ٹیکس عائد کیے گئے، جس کا نشانہ بالخصوص مسلمان زمیندار اور کاریگر بنے۔ زعفران اور قالین سازی جیسے روایتی مسلمان پیشے سخت ریاستی کنٹرول میں لے لیے گئے۔ ہندو اور سکھ فوجی مسلمانوں کے گھروں میں گھس جاتے اور خواتین کے ساتھ بدسلوکی کرتے۔ بہت سے مسلم علماء، قاضی اور صوفیا کو یا تو قتل کر دیا گیا یا جلاوطن کر دیا گیا۔

مولانا غلام نبی خیال اپنی کتاب کشمیر کی تاریخ کے سیاہ اوراق میں لکھتے ہیں:

”کشمیر میں سکھ راج کا مطلب اذان کی خاموشی، نماز پر پابندی، اور قرآن کی بے حرمتی تھا۔“

برطانوی مؤرخ ولیم مورکرافٹ، جو کشمیر آئے، لکھتے ہیں:

”سکھ حکومت نے مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو اتنی بار پامال کیا کہ وہ اسے خدائی قہر سمجھنے لگے۔“

پنڈت کلہن کی راج ترنگنی کے بعد سب سے معتبر تاریخی بیانیہ خوشحال خان خٹک کے ذریعے بھی ملتا ہے، جو سکھوں کے مظالم کو افغانوں سے زیادہ سخت قرار دیتے ہیں۔

کیا یہ رنجیت سنگھ کی مذہبی رواداری کے خلاف ہے؟

یہ سوال نہایت اہم ہے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کو عمومی طور پر ایک روادار حکمران کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے لاہور میں کئی مساجد کی مرمت کروائی، مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کو دربار میں جگہ دی، اپنے وزیر فقیر عزیز الدین جیسے مسلمانوں کو اہم عہدوں پر فائز رکھا۔ تاہم، کشمیر میں پیش آنے والے واقعات اس عمومی تاثر سے متصادم دکھائی دیتے ہیں۔ بعض مورخین کے مطابق، کشمیر کی انتظامیہ اور فوج میں موجود مقامی سکھ افسروں نے انتقامی پالیسی

اپنائی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ بذاتِ خود ان پالیسیوں سے آگاہ ضرور تھا، مگر شاید اس نے مصلحتاً خاموشی اختیار کی۔

کیا مہاراجہ رنجیت سنگھ کی یہ خاموشی اس کے شریکِ جرم ہونے کا ثبوت نہیں؟ اگر خاموشی جرم نہیں، تو کوئی مغل بادشاہ بھی اس جرم سے بری کیسے جا سکتے ہیں۔ میرے خیال میں حاکم کی خاموشی کا مطلب جرم کرنے کی آزادی ہی سمجھی جانی چاہیے۔

کشمیری عوام نے سکھ راج کو "ظلم کے دور" کے نام سے یاد کیا۔ آج بھی کشمیری لوک کہانیوں، نظموں اور تاریخ میں "سکھوں کا دور" بطور ظلم و ستم کی علامت کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ ایک کشمیری ضرب المثل مشہور ہے:

"خدا کرے وہ دن نہ لوٹے، جب سکھوں نے اذان کو خاموش کیا تھا!"

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی شخصیت اور سکھ سلطنت کا جائزہ لیتے وقت ہمیں اس دور کے تمام پہلوؤں کو دیانت داری سے دیکھنا ہوگا۔ کشمیر کی فتح سیاسی کامیابی ضرور تھی، مگر اس کے نتیجے میں ہونے والے مظالم کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ایک طرف ہم سکھ سلطنت کی مرکزی حکومت کی رواداری کو تسلیم کرتے ہیں، تو دوسری طرف ہمیں اس کے مقامی افسروں کی زیادتیوں پر بھی سوال اٹھانا ہوگا۔

ظلم، ظلم ہی ہوتا ہے، چاہے وہ کسی بھی مذہب، قوم یا سلطنت کے نام پر ہو۔

کشمیر کی جنگ جیتنے کے بعد دیوان موتی رام کو کشمیر کا پہلا گورنر بنایا گیا۔ یاد رہے کہ دیوان موتی رام ایک کشمیری پنڈت تھے، اور اُن کا تعلق کشمیر کے ایک معزز ہندو خاندان سے تھا۔ وہ دیوان چند (جس نے سکھ فوج کی قیادت کی تھی) کے قریبی ساتھی اور مشیر بھی رہے، جو سکھ سلطنت کے اہم جرنیلوں میں سے تھے۔ کشمیر پر سکھوں کا قبضہ 27 سال تک قائم رہا (1846-1819)۔ اس کے بعد 1846ء میں عہد نامہ امرتسر کے تحت کشمیر ڈوگرہ گلاب سنگھ کو بیچا گیا، جس نے بعد میں جموں و کشمیر کی ڈوگرہ سلطنت قائم کی۔ یہ سب دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ کشمیر پر رنجیت سنگھ کا قبضہ سکھ سلطنت کے عروج کی علامت تھا، مگر دوسری طرف مقامی کشمیری مسلمانوں کے لیے یہ دور جبر، اقتصادی غلامی اور مذہبی پابندیوں کا دور ثابت ہوا۔

یہاں میں پھر اپنا سوال دہرانا چاہوں گا کہ:

کیا مہاراجہ رنجیت سنگھ کی مشہور ''رواداری'' صرف سیاسی مصلحت تھی، یا واقعی میں وہ تمام مذاہب کے لیے یکساں نظر رکھتا تھا؟

میرا جواب یہ ہے کہ وہ بھی اسی طرح کا ایک حاکم تھا جیسے اس سے پہلے مغل یا ابدالی تھے۔ ایک طرف وہ ضرورت پڑنے پر مذہبی رواداری کا بھیس اوڑھ لیتے تھے، لیکن جب ضرورت ہوتی تو نہ مسجد ہی چھوڑتے تھے، نہ گردوارہ اور نہ ہی مندر۔ دشمنی پر اتر آتے تو اپنے بچوں اور خاندان کو بھی معاف نہیں کرتے تھے۔

میرے نزدیک بیشتر راجے، مہاراجے، بادشاہ اور نواب اپنے اقتدار کے استحکام اور تخت و تاج کے تحفظ کے لیے مخالفین کے ساتھ جو رویہ اختیار کرتے تھے، وہ کم و بیش یکساں نوعیت کا ہوتا تھا۔ ان کے اقدامات کا بنیادی محرک ذاتی اقتدار کی توسیع اور سیاسی بالادستی کا تحفظ ہوتا تھا، نہ کہ اخلاقی اصول یا عوامی فلاح۔

سکھ۔ پختون جنگیں
جن کے بعد سب کچھ بدل گیا

ملتان اور کشمیر کی فتوحات کے دوران ہی مہاراجہ رنجیت سنگھ نے پشاور کی جانب توجہ دی اور 1818ء سے 1837ء کے درمیانی عرصے میں شمال مغربی سرحدوں کی توسیع کی ایک اہم مہم کا آغاز کیا، جو بالآخر پشاور کی فتح پر منتج ہوئی۔ یہ مہم اُن کی سب سے بڑی اور فیصلہ کن عسکری کارروائیوں میں شمار کی جاتی ہے۔ اس کا آغاز 1818ء میں پشاور پر ابتدائی قبضے سے ہوا اور 1834ء میں اس کے باقاعدہ الحاق پر مکمل ہوئی۔ اس عرصے کے دوران متعدد فوجی معرکے اور حکمتِ عملی کے مظاہرے سامنے آئے، جن میں 1837ء کی جنگِ جمرود نمایاں ہے۔

جنگِ جمرود سکھوں اور افغانوں کے درمیان ایک فیصلہ کن معرکہ تھی۔ چند سال بعد سکھوں کا پشاور پر قبضہ ختم ہو گیا اور انگریزوں نے وہاں اقتدار سنبھال لیا۔ اس سے پہلے کئی برسوں تک سکھ پشاور پر قابض رہے۔ اس دوران اُن کا طرزِ حکمرانی کیسا تھا؟ یہ ایک اہم سوال ہے، جس کا جواب تلاش کرنے کی کوشش میں مصروف ہوں۔ جو کچھ جان سکا ہوں، وہ پیشِ خدمت ہے۔

چند معروضی تاریخی حقائق:

1818ء: مہاراجہ رنجیت سنگھ کی افواج نے پشاور پر قبضہ کیا۔ ابتدائی طور پر شہر کو سکھ سلطنت کا باجگزار بنایا گیا (قبضہ نہیں کیا)۔

1819ء: رنجیت سنگھ نے کشمیر پر اپنا کنٹرول مستحکم کیا، جس کے نتیجے میں درانی حکمرانوں کا قبضہ ختم ہوا۔

1823ء: درانی حکمراں محمد اعظم خان نے پشاور پر دوبارہ قبضہ کیا اور سکھوں کے خلاف جہاد

کا اعلان کیا۔

1834ء: پشاور کو سکھ سلطنت میں باقاعدہ طور پر شامل کرلیا گیا۔

1837ء: جنگِ جمرود کے دوران سکھ اور افغان افواج کے درمیان شدید لڑائی ہوئی، جس میں سکھ جرنیل ہری سنگھ نلوہ مارے گئے۔ یہ جنگ بغیر کسی فیصلہ کن نتیجے کے ختم ہوئی اور دونوں اطراف کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ دو سال بعد، 1839ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی وفات واقع ہوئی، جس کے بعد سکھ سلطنت کا برقرار رہنا دشوار ہوتا چلا گیا۔

یہ ایک طویل اور اہم عسکری مہم تھی جس کے نتیجے میں نہ صرف سکھ سلطنت کی جغرافیائی حدود میں وسعت ہوئی، بلکہ پورے خطے میں طاقت کا توازن بھی تبدیل ہو گیا۔ پشاور اور اس کے مضافاتی علاقوں پر سکھ کنٹرول نے افغان درانی سلطنت کی پیش قدمی کو مؤثر انداز میں روک دیا اور برصغیر میں سکھوں کی سیاسی و عسکری برتری کو استحکام حاصل ہوا۔

اگرچہ جنگِ جمرود سکھوں کے لیے نہایت مہنگی ثابت ہوئی، لیکن اس نے اُن کی سرحدی دفاعی حکمت عملی کی کامیابی کو بھی ظاہر کیا۔ افغانوں کی مسلسل پیش رفت کو مؤثر انداز میں روکا گیا۔ تاہم، یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اس جزوی کامیابی کے باوجود سکھ طویل مدت تک پشاور پر اپنا قبضہ برقرار رکھنے میں ناکام رہے۔ یہاں جنگ کی تفصیلی روداد بیان کرنا مقصود نہیں، بلکہ اس کے تاریخی پس منظر، سکھوں کے کردار، اور ان کے دورِ حکومت میں پشاور کے مسلمان باشندوں کے ساتھ سلوک پر روشنی ڈالنا مطلوب ہے۔ اس مقصد کے لیے درج ذیل کتب اور مستند مضامین سے استفادہ کیا گیا ہے:

Battle of Peshawar by Hirkishan Singh Surjeet

(https//:jatchiefs.com/battle-of-peshawar-1835/

The Conquest of Peshawar by *Maharaja Ranjit Singh*, by Surender Pal Singh

(SHRINKHALA:VOL-1ISSUE-6FEBRUARY-2014)

Understanding the History of Peshawar under Sikh Rule, by M.

Waqas Mehsud

http//:awarepakistan.com/articles/95469/understanding-the-history-of-pershawar-under-sikh-rule/)

Pakhtun Resistance At Nowshera: Ranjit Singh's Costly Victor, by Farrukh Husain

(https://thefridaytime.com/15-Mar-2023/pakhtun-resistance-at-nowshera-ranjit-singh-s-costly-victory)

The Successors of Maharaja Ranjit Singh by Gulati S.P. Latif Syad Muhammed.

Royals and Rebels: The Rise and Fall of the Sikh Empire, By Priya Atwal-2021

Hari Singh Nalwa, "champion of the Khalsaji"(1791-1837) by Vanit Nalwa

Peshawar: An Integral Part of Competing Empires of Durranis, Sikhs and British by Razia Sultana

http//:nihcr.edu.pk/Latest_English_Journal

میں نے تاریخ سے یہی سیکھا ہے کہ اکثر نہیں، بلکہ تقریباً تمام ریاستیں اپنے ہی بوجھ تلے دب کر تاریخ کا حصہ بنی ہیں۔ جس ریاست نے جتنا کم بوجھ اٹھایا، وہ اتنی ہی دیرپا ثابت ہوئی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے کشمیر، امرتسر، ملتان اور ڈیرہ جات پر قبضہ کرنے کے بعد بھی رکنے کا نام نہ لیا۔ وہ اس بات سے بخوبی واقف تھا کہ اس کے بعد اُس کی اولاد اس قابل نہ ہوگی کہ ایک طاقتور فوج اور اس قدر پھیلی ہوئی سلطنت کو سنبھال سکے۔ اس کے باوجود اُس نے مغربی سرحد پر پختون قوم کے خلاف جنگی مہم کا فیصلہ کیا۔

رنجیت سنگھ یہ بھی جانتا تھا کہ پشاور ایک کمزور ریاست نہیں بلکہ اسے افغانستان سے ہر طرح کی عسکری اور سیاسی مدد حاصل ہوسکتی ہے۔ پشاور، ملتان کی طرح پنجاب کا تاریخی حصہ بھی نہیں تھا۔ ان حقائق کے باوجود، اُس نے پشاور پر قبضے کی خاطر متعدد جنگیں لڑیں۔ ان کا انجام یہی ہوا

کہ جیسے ہی مہاراجہ رنجیت سنگھ کا انتقال ہوا، سکھوں نے پشاور اور دیگر علاقوں سے خود ہی پسپائی اختیار کر لی، اور انگریزوں نے بغیر کسی بڑی جنگ کے سکھ سلطنت کو زیر کر لیا۔

پشاور میں سکھ افواج کی کارروائیاں انیسویں صدی کے اوائل میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی قیادت میں شروع ہوئیں۔ میری فہم کے مطابق، اس کی چند ممکنہ وجوہات درج ذیل ہوسکتی ہیں:

جغرافیائی و عسکری اہمیت: پشاور برصغیر اور وسطی ایشیا کے درمیان واقع ہونے کی وجہ سے نہایت اہم مقام رکھتا تھا۔ تاریخی طور پر اس شہر پر کنٹرول خیبر پختونخوا اور خیبر پاس پر غلبے کا مترادف تھا۔ یہ علاقہ تجارتی اور فوجی نقل و حرکت کا مرکزی راستہ تھا۔ ممکن ہے مہاراجہ رنجیت سنگھ نے پشاور پر قبضہ کر کے افغان حملوں سے بچاؤ اور اپنی شمال مغربی سرحدوں کو محفوظ بنانے کا منصوبہ بنایا ہو۔

افغانستان کے اندرونی خلفشار سے فائدہ: سب جانتے ہیں کہ احمد شاہ ابدالی کے پوتے شاہ زمان درانی نے آخری بار لاہور پر حملہ کیا تھا۔ اس کے بعد پشاور میں بارکزئی خاندان نے اُس کا تختہ الٹ دیا۔ افغان رہنماؤں ابدالی اور بارکزئی کے باہمی اختلافات نے سکھ سلطنت کو اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کا نادر موقع فراہم کیا۔ رنجیت سنگھ نے اس داخلی انتشار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بارکزئی سرداروں کو نشانہ بنایا۔ 1823ء میں نوشہرہ کی جنگ میں سکھوں کی فتح اور 1834ء میں جنرل ہری سنگھ نلوہ کی قیادت میں پشاور پر قبضہ، سکھوں کی علاقائی برتری کے اہم سنگِ میل تھے۔

تجارتی مفادات اور معاشی حکمتِ عملی: ممکن ہے مہاراجہ رنجیت سنگھ نے پشاور پر قبضے کو تجارتی راستوں کے کنٹرول، محصولات کی وصولی، اور اپنی سلطنت کی معاشی بنیاد کو مضبوط بنانے کے تناظر میں دیکھا ہو۔ کچھ مؤرخین کا خیال ہے کہ یہ اقدام محض عسکری برتری نہیں بلکہ معاشی منفعت کے لیے بھی اٹھایا گیا تھا۔

ذاتی تعلقات یا سیاسی فائدہ؟: کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ رنجیت سنگھ نے اپنے دیرینہ دوست شاہ زمان کی خاطر پشاور پر حملہ کیا ہو؟ وہی شاہ زمان، جس کی توپوں کو دریا سے نکالنے میں رنجیت سنگھ نے مدد کی تھی۔ یہ امکان بھی خارج از بحث نہیں، اگرچہ غالب خیال یہی ہے کہ یہ قدم زیادہ تر سیاسی حکمتِ عملی کے تحت اٹھایا گیا تھا۔

مذہبی مزاحمت کا ردِعمل: پشاور میں اکثریتی مسلم آبادی سکھ فتوحات سے خائف تھی۔ اسی دور میں افغان رہنما دوست محمد خان کی جانب سے سکھوں کے خلاف جہاد کے اعلان نے اس تنازعے کو مذہبی رنگ دے دیا۔ رنجیت سنگھ نے شاید اسی خطرے کے پیشِ نظر فیصلہ کیا کہ نئے دشمن کو سنبھلنے سے پہلے ہی ختم کر دیا جائے۔

اس سب کا نتیجہ یہ نکلا کہ سکھ سلطنت نے عارضی طور پر پشاور اور اس کے نواحی علاقوں پر قبضہ حاصل کیا، لیکن مقامی آبادی کی مزاحمت اور افغان رہنماؤں کی مسلسل جنگی کارروائیوں کے باعث یہ قبضہ دیرپا ثابت نہ ہوسکا۔ مختصر عرصے میں ہی سکھ سلطنت کی گرفت کمزور پڑ گئی اور بالآخر انگریزوں نے خطے کا کنٹرول سنبھال لیا۔

❁ ❁ ❁

پشاور پر سکھ سلطنت کا قبضہ (1834ء)

ایک تاریخی واسٹریٹیجک تجزیہ

کوئی سولہ برس تک مختلف جنگوں کے بعد، 1834ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے حکم پر سکھ سلطنت کی جانب سے پشاور کی فتح افغان-سکھ تنازعات میں ایک نازک موڑ اور دوررس نتائج کی حامل ثابت ہوئی۔ اس جنگ نے نہ صرف خطے کی جغرافیائی سیاست کو تبدیل کیا، بلکہ جنوبی ایشیا میں طاقت کے توازن کو بھی نئے سرے سے تشکیل دیا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اس بار ایک بھرپور جنگ کی تیاری کی، اور 6 مئی 1834ء کو جنرل ہری سنگھ نلوہ کی قیادت میں سکھ افواج نے پشاور پر حملہ کیا۔ اس وقت ابدالی اقتدار ختم ہو چکا تھا، اور شہر بارکزئی حکمرانوں کے زیر انتظام تھا۔ اس بار سکھوں کا مقابلہ ابدالیوں سے نہیں، بلکہ انھی پختونوں سے تھا جو ایک مختلف قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ بارکزئی سردار، درانی سلطنت کے زوال کے بعد نیم خودمختار حیثیت حاصل کر چکے تھے۔ ایک مختصر مگر شدید جنگ کے بعد سکھ افواج نے شہر پر قبضہ کر لیا، جس کے نتیجے میں مقامی حکمران سلطان محمد خان کو پسپا ہونا پڑا۔ فتح کے بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ہری سنگھ نلوہ کو پشاور کا گورنر مقرر کیا، اور یوں یہ علاقہ براہِ راست سکھ انتظامیہ کے تحت آ گیا۔

پشاور پر سکھ حکمرانی کے اثرات: ایک تجزیہ

اب میں اپنے اصل سوال کی طرف آتا ہوں: پشاور پر قبضے کے بعد کیا ہوا؟ سکھوں نے یہاں کس طرح حکومت کی، اور اس کے نتیجے میں مقامی معاشرت پر کیا اثرات مرتب ہوئے؟

غزنوی دور کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ ساڑھے آٹھ سو سال بعد پشاور کا حکمران کوئی غیر مسلم تھا

اور مزید یہ کہ وہ اہلِ کتاب بھی نہیں تھا۔ (جے پال کے بعد) سوال یہ ہے کہ مقامی آبادی نے اس تبدیلی کو کیسے دیکھا؟ ان کا رویہ کیسا تھا؟ یہی وہ بنیادی سوالات ہیں جن پر میں بات کرنا چاہتا ہوں۔

یہ درست ہے کہ پشاور کا سکھ سلطنت میں شامل ہونا شمال مغربی سرحدوں کی توسیع کا ایک اہم سنگ میل تھا۔ اس فوجی کامیابی نے افغانستان کی جانب سے ممکنہ جارحیت کو مؤثر طریقے سے روکا۔ تاہم، یہ تبدیلی نہ صرف سابق حکمرانوں بلکہ عوام کے لیے بھی قابل قبول نہ تھی۔ متعدد افغان رہنماؤں، بالخصوص امیر دوست محمد خان نے اس علاقائی نقصان کو اپنی خودمختاری کے لیے ایک سنگین خطرہ قرار دیا۔ سکھ انتظامیہ کی جانب سے نیا مالیاتی نظام نافذ کیا گیا، اور روایتی تجارتی راستوں میں رکاوٹیں پیدا ہوئیں، جس کے نتیجے میں خطے کی معاشی و سماجی ساخت پر منفی اور دیرپا اثرات مرتب ہوئے۔

یہ فتح اپنے اثرات کے اعتبار سے انتہائی اہم تھی۔ نہ صرف سکھ سلطنت کی جغرافیائی حدود میں اضافہ ہوا، بلکہ خطے کی سیاسی حرکیات اور پشاور کی سماجی و اقتصادی تاریخ پر بھی اس کے اثرات پڑے۔ یہ فتح سکھ عسکری طاقت کے عروج کی علامت تھی، لیکن اس نے افغان-سکھ تعلقات کو ایک نئے مرحلے میں داخل کر دیا وہ تنازع جس کے اثرات بعدازاں برطانوی نوآبادیاتی دور میں بھی محسوس کیے گئے۔

اس مہم کے بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ ایک وسیع و عریض سلطنت کے حکمران بن گئے اور پنجاب پر ان کی گرفت مزید مضبوط ہوئی۔ ان کے دور میں پشاور کے مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا گیا، یہ موضوع میری اس تحریر کے دائرہ کار سے باہر ہے۔ تاہم، اس کا سرسری ذکر اس لیے ضروری سمجھتا ہوں تاکہ ہم یہ جان سکیں کہ آیا مہاراجہ رنجیت سنگھ واقعی ایک روادار حکمران تھے یا وہ بھی اپنے پیش رو اور جانشینوں کی طرح ایک روایتی اقتدار پسند فرماں روا تھے۔

ابوطبیلہ: مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فوج کا اطالوی کمانڈر جو پشاور کا حاکم بنا اور ظلم کی انتہا کر گیا

مجھے بی بی سی پر شائع ہونے والے ایک مضمون کے مطالعے کا موقع ملا جس کا عنوان تھا: ''ابوطبیلہ: مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فوج کا اطالوی کمانڈر جو پشاور کا حاکم بنا''۔ میں اس

مضمون کا خلاصہ پیش کر رہا ہوں۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے پشاور فتح کرنے کے بعد ایک اطالوی سپاہی پاؤلو ایویٹیبل (جسے مقامی طور پر ابوطبیلہ کہا جاتا تھا) کو پشاور کا گورنر مقرر کیا۔ یہ ایک غیر معمولی اقدام تھا، جس میں مہاراجہ نے اپنے سکھ افسروں کے بجائے ایک غیر ملکی فوجی پر اعتماد کیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مہاراجہ کو ابوطبیلہ کی صلاحیتوں پر غیر معمولی یقین تھا۔

سوانح نگاروں کے مطابق، ابوطبیلہ 25 اکتوبر 1791ء کو اٹلی کے ایک چھوٹے سے گاؤں ایگرولا میں ایک کسان کے گھر پیدا ہوا۔ محض سولہ سال کی عمر میں اُس نے نپولین بوناپارٹ کی فرانسیسی فوج کے توپ خانے میں شمولیت اختیار کر لی۔ 1810ء میں شامل ہونے کے بعد وہ صرف پانچ برس کے مختصر عرصے میں لیفٹیننٹ کے عہدے تک پہنچ گیا۔ تاہم، 1816ء میں نپولین کی شکست کے بعد اس کا عہدہ ختم کر دیا گیا، اور وہ ریزرو انفنٹری میں آدھی تنخواہ پر کام کرنے پر مجبور ہوا۔

فوجی کیریئر میں رکاوٹوں کے بعد، وہ 1817ء میں قسطنطنیہ پہنچا، جہاں ایرانی بادشاہ فتح علی شاہ نے اسے اپنا ایلچی مقرر کیا۔ 1818ء سے 1826ء تک وہ ایران میں فوجی انسٹرکٹر کے طور پر خدمات انجام دیتا رہا۔ بعد ازاں، مختصر قیام کے لیے اٹلی واپس گیا، مگر 1827ء میں دوبارہ ایشیا کا رخ کیا۔

ایران میں اپنے دو ساتھیوں جین فرانکوئس ایلارڈ اور جین بپٹسٹ وینٹورا کی تجویز پر، جو اس وقت مہاراجہ رنجیت سنگھ کے فوجی کمانڈر تھے، وہ ہندوستان آ گیا۔ پنجاب میں وہ مہاراجہ کی فوج میں بطور کرائے کے کمانڈر اور توپ خانہ انسٹرکٹر شامل ہوا۔ اس کی عسکری و انتظامی صلاحیتوں نے مہاراجہ کو جلد ہی متاثر کیا، جس کے نتیجے میں اُسے پشاور کا گورنر مقرر کیا گیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فوج میں متعدد غیر ملکی افسران شامل تھے۔ ابوطبیلہ نے توپ خانے کو مؤثر انداز میں منظم کیا اور پیادہ فوج کو یورپی ماڈل پر جدید خطوط پر استوار کیا۔ دسمبر 1829ء میں مہاراجہ نے اُسے وزیر آباد کا گورنر مقرر کر دیا۔

بطور گورنر، اس کا بنیادی کام یورپی اصولوں پر فوجی اصلاحات نافذ کرنا تھا۔ اس نے یورپی

نظام کو مقامی روایات سے ہم آہنگ کرتے ہوئے محصولات اور تجارت کا جدید نظام رائج کیا، شہر کی ازسرِنو تعمیر کرائی، چوڑی گلیاں اور بازار بنوائے۔ اس کی حکمرانی عملیت پسندی پر مبنی تھی۔ اُس کے دور میں وزیرآباد میں امن وامان اور اقتصادی ترقی میں نمایاں بہتری آئی، جسے برطانوی اور ہندوستانی مبصرین نے سراہا۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اپنے وسیع اختیارات کے باوجود اُس نے مقامی مذہبی، ثقافتی اور روایتی رسوم ورواج میں مداخلت نہ کی۔

بعدازاں، جب مہاراجہ نے پشاور فتح کیا تو ابتدا میں سردار ہری سنگھ نلوہ کو گورنر مقرر کیا گیا۔ تاہم 1835ء میں ابوطبیلہ کو پشاور کا گورنر بنایا گیا، اور ہری سنگھ نلوہ کو افسرِ مال تعینات کیا گیا۔ اپریل 1837ء میں جب جمرود کے قلعے میں ہری سنگھ نلوہ قتل ہوگیا، جو مہاراجہ کے لیے ایک بڑا صدمہ تھا، تو مہاراجہ نے پشتونوں کو سزا دینے کی غرض سے ابوطبیلہ کو وسیع اختیارات دے کر دوبارہ پشاور کا گورنر مقرر کیا۔

محکمہ آثارِ قدیمہ کے سب ریجنل آفیسر نوازالدین کے مطابق، ابوطبیلہ نے خیبر پختونخوا کے وسیع علاقوں پر سخت گیرانہ طرزِ حکومت قائم رکھا۔ سکھ حکومت کے ظلم وستم سے قبائلی عوام میں شدید نفرت پیدا ہوگئی۔ ابوطبیلہ نے اپنے اقتدار کو مضبوط کرنے اور سکھوں پر حملے روکنے کے لیے سخت قوانین نافذ کیے۔ اس کا عدالتی نظام دنیا کے سخت ترین نظاموں میں شمار ہوتا ہے۔ اس نے شہر کی فصیل تعمیر کرائی اور فصیل کے باہر پھانسی گھاٹ قائم کیے۔

میں نے خود گورکھٹری کا دورہ کیا، جہاں ابوطبیلہ کا دربار ہوتا تھا۔ روایات کے مطابق، روزانہ 50 سے 60 افراد کو پھانسی دی جاتی تھی، اور اُن کی لاشیں باغیوں کے لیے نشانِ عبرت بنائی جاتیں۔

سرہنری لورنس کے مطابق، ابوطبیلہ روزانہ متعدد قبائلیوں کو مسجد مہابت خان (تعمیر 1630ء) کے میناروں سے پھینک کر یا پھانسی دے کر قتل کروا دیتا تھا۔ یہ منظر یورپی سیاحوں کے لیے بھی وحشت کی علامت تھا۔

ابوطبیلہ جھوٹ بولنے والوں کی زبان کاٹ دیا کرتا تھا۔ ایک مشہور مقولہ تھا:

''بچو! سو جاؤ، ورنہ ابوطبیلہ آجائے گا۔''

گورنر بننے سے قبل وہ ٹیکس افسر بھی رہ چکا تھا اور اس لحاظ سے ٹیکس وصولی میں نہایت سخت گیر تھا۔ مشہور ہے کہ جو لوگ ٹیکس ادا نہ کرتے، انھیں دیوار میں چنوا دیا جاتا تھا۔

ضلع پشاور کے گزٹ کے مطابق، ابوطبیلہ نے ریکارڈ بُک کا نظام متعارف کرایا اور مقررہ شرح پر ٹیکس نافذ کیا۔ اس نظام سے اگرچہ آمدنی کئی گنا بڑھ گئی، لیکن دوسری طرف مقامی آبادی کی عزتِ نفس مجروح ہوتی رہی۔

کولن مکینزی اپنی کتاب ''Storm and Sunshine of a Soldier's Life'' میں لکھتے ہیں کہ ابوطبیلہ کے دورِ حکومت میں معمولی جرائم پر بھی سرِ عام کوڑوں اور جوتوں سے مارنا ایک عام سزا تھی۔ تاریخی روایات کے مطابق 1842ء میں جب آفریدی قبائل کے ہاتھوں سکھ فوج کو شکست ہوئی، تو ابوطبیلہ نے ان شکست خوردہ فوجیوں کو پشاور کے بازاروں میں جوتوں سے مارنے کی سزا دی۔

اس ظالمانہ دور کا ایک اور المناک واقعہ فارسی میں تحریر کردہ ''فرمان بنام قمر الدین خان مہمند'' سے معلوم ہوتا ہے، جس کے مطابق گھڑی چندن اور شمشتوں کے دو گاؤں کی جاگیر قمر الدین خان کو اس شرط پر دی گئی کہ وہ ہر سال پچاس آفریدیوں کے سر کاٹ کر دربار میں پیش کرے گا، بصورتِ دیگر اُسے بھاری جرمانہ ادا کرنا پڑے گا۔

کولن مکینزی اور سر ہنری لارنس اپنی تحریروں میں لکھتے ہیں کہ ابوطبیلہ نے مغل دور کی تعمیر کردہ مسجد مہابت خان کو دہشت کی علامت بنا دیا تھا۔ مسلمانوں کو، جو سکھوں پر حملے کرتے، اس کے مینار سے کئی کئی دن تک لٹکایا جاتا۔ بعض باغیوں کو الٹا لٹکا کر پھانسی دی جاتی، اور بعض کو دہکتے ہوئے تنور میں پھینک دیا جاتا۔ پشاور میں داخل ہونے والے غیر مقامی قبائلیوں کو بھی بلا تمیز پھانسی دی جاتی۔ ان تمام اقدامات کا مقصد قبائلی علاقوں کے لوگوں میں خوف اور ہیبت پیدا کرنا تھا۔

اپنے قوانین کے نفاذ میں وہ کسی کو رعایت نہیں دیتا تھا، خواہ متاثرہ فریق سکھ ہی کیوں نہ ہو۔ متعدد تاریخی ذرائع میں ابوطبیلہ کا نام ہمیشہ ظلم، سخت گیری، اور بے رحمی کے ساتھ وابستہ پایا گیا ہے۔

28 مارچ 1850ء کو ابوطبیلہ کا انتقال ہوا۔ اگرچہ ان کی وفات کے بارے میں مختلف آرا موجود ہیں، تاہم سب سے قابلِ قبول روایت یہ ہے کہ اُن کی جوان بیوی نے مال و دولت کی لالچ میں انھیں زہر دے کر ہلاک کر دیا۔ ان کی وفات کے بعد اٹلی کے شہر ایجرولا میں اُن کا مقبرہ تعمیر کیا گیا اور نیپلز میں ایک چوک کو ان کے نام سے منسوب کیا گیا۔ پشاور کے گورکھٹری علاقے میں واقع اُن کا محل، عدالت اور دربار اب آثارِ قدیمہ کے طور پر محفوظ کر لیے گئے ہیں۔

تاریخ دانوں کے مطابق ابوطبیلہ نے اپنی عسکری صلاحیتوں اور قیادت کے جوہر سے ایک شاندار مگر متنازعہ زندگی گزاری۔ جنگ، جدوجہد اور مہم جوئی اُن کی فطرت کا حصہ تھی۔ انھوں نے متعدد جنگیں لڑیں اور کئی راجاؤں اور پشتون خوانین کو زیر کیا، مگر آخر کار وہ اپنی ہی محبت کے ہاتھوں شکست کھا گئے۔

یہ تمام نکات اس لیے بیان کیے گئے ہیں تاکہ یہ واضح کیا جا سکے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے مقرر کردہ کسی بھی گورنر کے اقدامات کی حتمی اخلاقی اور سیاسی ذمہ داری خود مہاراجہ پر عائد ہوتی ہے۔ یہ ایک اہم اصول ہے، جیسا کہ ماضی میں مغل دربار کی جانب سے لاہور میں تعینات کیے گئے عبدالصمد اور آدینہ بیگ کے مظالم کی ذمہ داری دہلی کے تخت پر بیٹھے مغل شہنشاہ پر ڈالی جاتی ہے۔ لہٰذا ایسے حالات میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت کو مذہبی رواداری کی مثال قرار دینا قرینِ انصاف نہیں ہوسکتا۔

میرے نزدیک، ہر ریاست میں گورنروں، نوابوں یا دیگر مقامی حکام کے اقدامات بالعموم مرکزی حکومت کی پالیسی اور طرزِ حکمرانی کا عکس ہوتے ہیں۔ اسی بنیاد پر یہ کہنا مناسب ہوگا کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت کے تحت بعض مسلم اکثریتی علاقوں میں کیے گئے اقدامات مذہبی رواداری کے عمومی اصولوں سے ہم آہنگ نہیں تھے۔

یہاں ایک نہایت اہم سوال پیدا ہوتا ہے: کیا مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ابوطبیلہ کے اُن مبینہ اقدامات کے بعد جن میں بے گناہ مسلمانوں کا قتل بھی شامل تھا اسے اس کے منصب سے ہٹایا یا اس کے خلاف کوئی تادیبی کارروائی کی؟ کیا مظلوم مسلمانوں کی دادرسی اور ان کے دکھ کا کوئی مؤثر

ازالہ کیا گیا؟ اگر یہ دلیل دی جاتی ہے کہ مہاراجہ نے ذاتی طور پر کسی کو موت کی سزا نہیں دی، اور اسی بنیاد پر انھیں مذہبی رواداری کا نمائندہ قرار دیا جاتا ہے، تو اس صورت میں لاہور کی حکومت کے زیرِ اثر ملتان، قصور، کشمیر اور پشاور جیسے شہروں میں ہونے والے مظالم کی اخلاقی ذمہ داری سے انھیں بری الذمہ نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

اس تناظر میں میرا مؤقف یہ ہے کہ حکمران خواہ راجے ہوں یا مہاراجے، بادشاہ ہوں یا شہنشاہ، ان کے القابات یا مذہبی وابستگیاں کچھ بھی ہوں، عمومی طور پر اکثر و بیشتر کا طرزِ عمل عموماً ایک سا ہوتا ہے، جسے سیاسی مفادات، اقتدار کے تحفظ، اور مخالفین کی سرکوبی کے اصولوں سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

فرخ حسین اس دور بارے ایک نظم لکھی ہے۔ جو انگریزی میں ہے۔۔ مجھے بے حد پسند آئی۔آپ بھی اسے پڑھیں۔

With the arrival of the King’s messenger, the Yousufzai exclaimed

"Go to Nowshera for‘jihad’ and sacrifice thy life”
The King’s messenger, sent by Azim Khan
Called a‘jirga’ of the mullahs and‘maliks’
He promised provision of ordnance and expense of war.
The inspiring words of the messenger roused them
The messengers’ sweet words had won over the Yousufzi
People joined the‘jihad’ in groups, without rest.
As if their house were in fire, a catastrophe had befallen them.
After prayers for success, and trust in God they proceeded like a flood.
Amongst these God believers, were thousands of the Akozi
Along the riverbank came their elders, steadfast like a rock
Harnessed in armour and silken turbans on their heads.

So eye catching that the kings could not find words in their praise.
So graceful that I shall eulogise them for years

The were roses that had been withered by the autumn, loved by their mothers and sisters, nature lured them to meet their end.

They grew up to meet their end on the battlefield.

The Ashirzi fought well and met their fate on the battlefield.

The Salarzi were fortunate, they also got their martyrdom on the battlefield.

The brave Gadzi are not the one to turn their face from the enemy.

O God! When did the Khadin Khel shirk from the fight
If pestered the Nurizi are like a phantom.
They are the warriors when they are in the battlefield.
On hearing their name the Sikhs used to flee.
The reputation of their marksmanship overawed Ranjit Singh
While fighting on the battlefield Pir Khan attained martyrdom
Along with their men Faiz Talib and Lataf Khan were martyred.
With the martyrdom of his other sons Sarwar Khan became issueless

War Is Not A High School Brawl; It Is Tedious, Costly And Often Fails To Achieve Its Objectives

The Ismailzai with their chief mullah, were martyred
The prolonged battle was fought with gallantry
On their martyrdom the angels in the sky also wept.
The earth and the angels on the sky lament

A generation has been destroyed and Akhund Khels imprisoned.

Hazrat Din's father laments.

His whole family has been annihilated.

The beds are empty

The mothers and sisters are bewailing

The big turbans have been buried in the ground to eulogise their martyrdom Mawezai is emotional like red-hot steel

Bravado! The Yousufzai have sacrificed their lives.

With them all the Pirs, mullahs, and Sahibzadas have disappeared.

The infidels would be in hell and the 'Ghazis' in Paradise.

Each verse of Mawezai is valuable like a pearl

(quoted on page100-101Volume 2 of *History of the Pathans* by Haroon Rashid)

❁❁❁

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار میں غیر سکھوں کی موجودگی

مذہبی رواداری یا انتظامی ضرورت

اس موضوع پر ایک تحقیقی مضمون پڑھنے کو ملا جسے روبینہ یاسمین اور فخر بلال نے لکھا ہے۔[1] اس کا عنوان ہے:

Sarkar-e-Khalsa: Status and Role of Muslim Courtiers (1799-1849)

ان کے مطابق، جب مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اقتدار سنبھالا تو ان کی خواہش تھی کہ ان کے تمام رعایا، بشمول ہندوؤں اور مسلمانوں، خود کو سکھ سلطنت کا ایک اہم اور فعال حصہ سمجھیں۔(میرے نزدیک اس کی ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ اس دور میں سکھ ریاست جس میں کشمیر بھی شامل تھا، سکھوں آبادی کا دس فیصد کے قریب تھے۔وہ اقلیت میں تھے۔) اس مقصد کے لیے انھوں نے مختلف مذاہب اور برادریوں سے تعلق رکھنے والے باصلاحیت اور قابل افراد کو اپنے دربار میں شامل کیا۔اس طرح، انھوں نے اپنے گردونواح میں ہر مذہب اور قومیت کے اہل افراد کو جمع کیا۔

اگر اس پہلو سے دیکھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ ان کا دربار ایک حد تک سیکولر نوعیت کا تھا، جہاں میرٹ اور ذاتی صلاحیت کو عہدے اور مرتبے میں ترقی کے لیے بنیادی معیار سمجھا جاتا تھا، نہ کہ مذہب۔البتہ، وہ کسی شخص کو مناسب ذمہ داری سونپنے سے پہلے اس کے پس منظر، برادری،

---

[1] https://pjhc.niher.edu.pk/wp-content/uploads/2020/09/6-FINAL-20-07-20-Sarkar-e-Khalsa-Robina-and-Bilal-formed.pdf

عادات واطوار، اور ثقافتی روایات کو بھی مدنظر رکھتے تھے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ مالیات اور محصولات کے محکمے ان ہندوؤں کے سپرد کیے گئے جو پہلے سے مغلیہ سلطنت کے مالیاتی نظام سے وابستہ تھے۔ اسی طرح، خالصہ فوج میں بھرتی کے لیے جٹ برادری کو سب سے زیادہ موزوں تصور کیا جاتا تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اُن افراد کو، جو جاگیردار اور اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور جن کے ذاتی مفادات انھیں اپنے فرائض کو جوش اور دیانت سے ادا کرنے پر آمادہ کرتے تھے، عموماً سفارتی مشنوں کے لیے منتخب کیا۔

اگرچہ کئی سکھ ان فیصلوں کے مخالف تھے، مہاراجہ رنجیت سنگھ نے فقیر برادران کو بھی اہم سرکاری عہدوں پر فائز کیا۔ یہ فیصلے اس امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ رنجیت سنگھ کے نزدیک مذہب، ریاستی معاملات یا پالیسی سازی میں کوئی فیصلہ کن حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ ان کی سلطنت کی حکمرانی اہل، تجربہ کار اور باصلاحیت افراد کے ذریعے ہو۔ یہی وہ افراد تھے جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کی 1839ء میں وفات کے بعد بھی خالصہ ریاست کے وفادار رہے۔ یہ تجزیہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ سکھ حکمرانی کے دوران مسلمان افراد نے سول اور فوجی انتظامیہ میں اہم کردار ادا کیا، اور ریاستی پالیسیوں کی تشکیل و نفاذ میں سرگرم شرکت کی۔ اس تمام تجزیے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے نہ صرف سکھوں کو اہمیت دی بلکہ مسلمانوں اور ہندوؤں کو بھی ساتھ لے کر چلے۔

اسی موضوع پر گرداشن سنگھ ڈھلوں کا ایک اور مضمون بھی قابلِ ذکر ہے، جس میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکمرانی کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ڈھلوں لکھتے ہیں کہ رنجیت سنگھ کی سیاست کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ ان کے دور میں اظہارِ رائے اور عبادت کی مکمل آزادی حاصل تھی۔ اگرچہ وہ خود سکھ تھے اور روزانہ سکھوں کی مقدس کتاب کا پاٹھ سنتے تھے، لیکن انھوں نے سکھ مذہب کو ریاستی مذہب قرار نہیں دیا۔ یہ امر بھی اہم ہے کہ انھوں نے سکھ دھرم کی تبلیغ یا توسیع کے لیے کوئی شعوری کوشش نہیں کی۔ ان کا یہ طرزِ عمل ان کے وسیع النظر اور روادار مذہبی رویے کی عکاسی کرتا ہے، جو مغل حکمرانوں کے سخت گیر، استحصالی اور جبر پر مبنی طرزِ عمل سے یکسر مختلف تھا۔

ڈھلوں مزید لکھتے ہیں کہ سکھ گروؤں کے مطابق، ایک ترقی یافتہ اور مہذب معاشرہ وہی ہوتا ہے جس میں ہر فرد کو اپنی مکمل صلاحیتوں کے اظہار کا موقع میسر ہو۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ کسی خاص مذہبی عقیدے کو جبر کے ذریعے مسلط کرنا انسانی فطرت کی آزادی کے منافی ہے۔ ان کا یہ بھی یقین تھا کہ ایک مستحکم سماجی اور سیاسی نظام صرف اخلاقی اصولوں، جیسے رواداری، انکساری، خیرات اور ہمدردی کی پائیدار اقدار کی بنیاد پر قائم اور محفوظ رکھا جا سکتا ہے، جو کہ ''دھرم'' کا جوہر ہیں۔

یہ بھی ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ ایک طاقتور ریاست کے حکمران تھے، جو تبت سے سندھ اور درۂ خیبر سے ستلج تک پھیلی ہوئی تھی۔ تاریخی طور پر، سلطنتیں عموماً طاقت اور اسلحے کے بل پر قائم ہوتی ہیں، اور رنجیت سنگھ بھی اس حقیقت سے بے خبر نہ تھے۔ تاہم، یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ انھوں نے اپنے سیاسی اور فوجی اہداف کے حصول کے لیے کم سے کم طاقت کا استعمال کیا۔

بیرن چارلس ہیوگل نے لکھا ہے:

''شاید انسانی تاریخ میں اتنی بڑی سلطنت کبھی کسی ایک فرد نے اتنی کم خونریزی سے قائم نہیں کی ہو۔''

رنجیت سنگھ نے قلیل مدت میں اپنی ذہانت، تدبر، ہمت اور بہادری سے پنجاب کو امن، خوشحالی اور ترقی کی چار دہائیاں عطا کیں۔ اس کے ثمرات تمام برادریوں بی مسلمان، ہندو اور سکھ بی کو یکساں طور پر حاصل ہوئے۔ تینوں بڑے مذہبی گروہوں کو ایک مشترکہ نظام میں ضم کرنا اور انھیں لبرل طرزِ حکمرانی سے ہم آہنگ کرنا کوئی معمولی کارنامہ نہیں تھا۔

یہ تمام خیالات گرداشن سنگھ ڈھلوں کے ہیں، جنھیں میں نے یہاں پیش کیا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ:

کیا یہ طرزِ عمل مہاراجہ رنجیت سنگھ کی مذہبی رواداری کا ثبوت ہے یا محض ایک دانشمندانہ انتظامی پالیسی؟

اس سوال کا جواب سکھوں، ہندوؤں اور مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے مختلف ہوسکتا ہے۔
میں نے حالات وواقعات ایک چراغ کی مدھم لو میں آپ کے سامنے رکھے ہیں۔
فیصلہ آپ کا ہے۔۔۔آپ کیا سوچتے ہیں، یہ آپ ہی بہتر جانتے ہیں۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کا مجسمہ اور پاکستانی بیانیے میں اس کا مقام

کیا ایک پاکستانی شناخت، پنجابی شناخت سے متصادم ہوسکتی ہے؟ کیا ان دونوں کے درمیان کوئی ہم آہنگی ممکن ہے؟ کیا میں بطور ایک پنجابی، بیک وقت ان دونوں شناختوں کا حامل ہو سکتا ہوں؟ یہ اور اس نوعیت کے دیگر سوالات کچھ عرصہ قبل تک عام فکری مباحث کا حصہ نہیں تھے، لیکن اب ان پر سوالات اٹھائے جارہے ہیں، جن کے جوابات آسان نہیں۔

اسی موضوع پر علی عثمان قاسمی نے روزنامہ ڈان میں ایک مضمون تحریر کیا، جو لاہور میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کا مجسمہ نصب کیے جانے پر پیدا ہونے والے سوالات کے تناظر میں لکھا گیا۔ اس مضمون کا عنوان ہے:

Is Ranjit Singh’s statue in Lahore worth celebrating

قاسمی لکھتے ہیں کہ پنجابی شناخت کا احساس ایک وسیع تر پاکستانی قوم پرستی میں جذب ہو چکا ہے، جو اسلام، مسلم اور اردو کو ایک دوسرے کا مترادف تصور کرتی ہے۔ اس قومی بیانیے نے نہ صرف پنجابی زبان اور ثقافت کو حاشیے پر دھکیل دیا، بلکہ مارکسسٹ نظریات سے وابستہ دانشوروں کے لیے بھی یہ تقریباً ناممکن بنا دیا کہ وہ ایسی پنجابی قومیت کا تصور پیش کرسکیں جو زبان کی بنیاد پر تشکیل پائے، طبقاتی مسائل کو اجاگر کرے، اور ایک ترقی پسند معاشرتی ڈھانچے کی طرف پیش رفت کرے۔ دوسرے الفاظ میں، اسلام پر مبنی ریاستی شناخت اور اردو کی مرکزیت اس قدر گہرائی سے ذہنوں میں پیوست ہوچکی ہے کہ نئی نسل کے پنجابی کارکن بھی اس بیانیے کا مؤثر توڑ کرنے میں ناکام رہے ہیں۔

ایسے ماحول میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کا مجسمہ اُن افراد کے لیے تازہ ہوا کا جھونکا ثابت ہو سکتا ہے، جو اس اقدام کو ماضی کی بازیافت اور مستقبل کے لیے ایک علامتی پیش رفت تصور کرتے

ہیں۔ ان کارکنوں کے نزدیک یہ نہایت اہم ہے کہ دُلہ بھٹی یا بھگت سنگھ جیسے تاریخی کرداروں کو ریاستی سطح پر تسلیم کیا جائے، کیونکہ اس عمل سے ریاستی پالیسی میں علامتی تبدیلی کی جھلک ملتی ہے۔ پاکستانی لبرل طبقے کی نظر میں بھی یہ ایک خوش آئند اقدام ہے، کیونکہ یہ اسکولوں اور عوامی بیانیے میں رائج مسلم تاریخ کے واحد، سرکاری نقطۂ نظر کو چیلنج کرتا ہے۔ اس تنقیدی زاویے میں کسی حد تک صداقت بھی پائی جاتی ہے۔

مزید یہ کہ، مہاراجہ رنجیت سنگھ کی شمولیت اس تاریخی بیانیے میں ایک الجھن پیدا کرتی ہے جو ایک ہی وقت میں احمد شاہ ابدالی جیسے کردار کو ہیرو کے طور پر پیش کرتا ہے۔ احمد شاہ ابدالی کو عمومی طور پر پنجاب کے مسلمانوں کو سکھوں اور مراٹھوں کے مظالم سے نجات دلانے والا نجات دہندہ تصور کیا جاتا ہے، اور پاکستانی نصاب میں ان کے فوجی کارناموں اور اسلام کے لیے خدمات کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا جاتا ہے یہاں تک کہ پاکستان کے ایک بیلسٹک میزائل کو بھی اُن کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ اسی طرح، سید احمد شہید کی سکھ راج کے خلاف جہاد کو بھی پاکستانی نصاب میں شان وشوکت سے پیش کیا جاتا ہے۔ اس عسکری تحریک کا مقصد بھی یہی بیان کیا جاتا ہے کہ پنجاب کے مسلمانوں کو ''آزادی'' دلائی جائے۔

ریاستی بیانیہ خواہ وہ عجائب گھروں کی اشیاء کے ذریعے ہو یا درسی کتب کے ذریعے ہمیشہ اُن پہلوؤں کو حذف کرتا ہے جو غالب نظریے سے مطابقت نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ ریاستی تاریخی بیانیے اپنے اندر تنقید اور مزاحمت کے بیج بھی رکھتے ہیں۔ ان بیانیوں میں کئی آوازوں کو خاموش کر دیا جاتا ہے اور کسی ایک خاص حقیقت پر اصرار کیا جاتا ہے۔ اب تک، پاکستان کے غیر مسلم ماضی کو عمومی طور پر نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن حالیہ اقدامات جیسا کہ رنجیت سنگھ کے مجسمے کی تنصیب ان خاموش آوازوں کو زبان فراہم کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستانی لبرل طبقہ اسے خوش آئند قدم تصور کرتا ہے۔

قاسمی کے تجزیے سے یہ نکتہ نمایاں طور پر سامنے آتا ہے کہ پاکستانی معاشرے میں تاریخی

کرداروں کے حوالے سے دو متضاد نقطہ ہائے نظر موجود ہیں۔ ایک طرف وہ طبقہ ہے جو احمد شاہ ابدالی کو "مسلمان فاتح" اور اسلام کی سربلندی کا علمبردار تصور کرتا ہے؛ جبکہ دوسری جانب ایک ایسا نقطۂ نظر بھی موجود ہے جو احمد شاہ ابدالی کو پنجاب کے عوام پر مظالم ڈھانے والا بیرونی حملہ آور سمجھتا ہے، اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کو ان مظالم سے نجات دلانے والا مقامی رہنما قرار دیتا ہے۔

عمومی طور پر، ریاستی سرپرستی کے باعث پہلا بیانیہ غالب نظر آتا ہے، اور اس کی جھلک ہمیں پاکستان کے عسکری نظام کی علامتوں میں بھی دکھائی دیتی ہے جیسے کہ میزائلوں کو غوری، غزنوی اور ابدالی جیسے مسلم فاتحین کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ اس کے برعکس، اُن تاریخی شخصیات کو سرکاری سطح پر کوئی علامتی حیثیت نہیں دی گئی جو ان حملہ آوروں کے خلاف مزاحمت کی علامت تھیں، چاہے وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم۔ مثال کے طور پر، دُلہ بھٹی، رائے احمد خان کھرل اور دیگر مسلم مزاحمت کاروں کو وہ سرکاری اہمیت نہیں دی گئی جو ان کی تاریخی حیثیت کے مطابق ہونی چاہیے تھی۔

اسی تناظر میں ایک مؤقف یہ بھی سامنے آیا ہے کہ اگر لاہور میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کا مجسمہ نصب کیا جا سکتا ہے، تو قصور کے مسلم حاکم یا ملتان کے مسلم نواب جیسے مقامی مسلم رہنماؤں کے مجسمے بھی لگائے جانے چاہئیں، تاکہ تاریخی تنوع کو متوازن طور پر پیش کیا جا سکے۔ یہ بحث نہ صرف تاریخی تعبیرات کے حوالے سے ایک نیا زاویہ فراہم کرتی ہے، بلکہ اس امر کا بھی اشارہ ہے کہ مستقبل قریب میں یہ مکالمہ علمی اور عوامی سطح پر مزید شدت اختیار کر سکتا ہے۔

میرے فہم کے مطابق، ہمارے معاشرے میں اکثر افراد اپنی زبان، نسل، مسلک اور وطن سے جذباتی وابستگی رکھتے ہیں۔ ہم اکثر معاملات میں سچائی کو بنیادی قدر کے طور پر تسلیم نہیں کرتے اور نہ ہی سچ تک رسائی کی سنجیدہ جستجو کرتے ہیں۔ نتیجتاً، لوگ وہی بیانیہ قبول کرتے ہیں جو انھیں سننے کو ملا ہو، اور اس کی صداقت پر تنقیدی غور و فکر کے بجائے محض جذباتی سطح پر اس کی تائید کرتے ہیں، حتیٰ کہ اس کی حفاظت کے لیے کسی بھی حد تک جانے کو تیار ہو جاتے ہیں۔

تاریخ نہ تو مکمل طور پر سفید ہوتی ہے اور نہ ہی سراسر سیاہ۔ بلکہ یہ حقیقت کی ان دو انتہاؤں کے درمیان ایک پیچیدہ، متنوع اور تہ دار مظہر ہے، جسے اکثر افراد قبول کرنے سے گریز کرتے

ہیں۔ ہمارے ہاں عمومی رجحان یہ ہے کہ ہم کسی ایک انتہا کو اختیار کر لیتے ہیں اور اسی کو مطلق سچ تصور کرتے ہیں، حالانکہ علمی دیانت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم تاریخی بیانیے کو اس کی پوری گہرائی، پیچیدگی اور تنوع کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کریں۔ جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ پاکستان کا سرکاری تاریخی بیانیہ پنجاب کے تاریخی شعور سے اس قدر مختلف کیوں ہے، تو یہ ایک علیحدہ اور تفصیلی تجزیے کا متقاضی موضوع ہے، جس پر میں آئندہ کبھی گفتگو کروں گا۔

سنہری مسجد: لاہور کے قلب میں ایک تاریخی اور تہذیبی مظہر

کیا یہ سچ ہے کہ لاہور کی ایک تاریخی مسجد پر سکھوں نے قبضہ کرکے اسے ایک گردوارے میں تبدیل کر دیا تھا؟ جی ہاں، یہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔ اسی واقعے کی مدد سے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بعض حامی مسلمان انھیں ایک روادار حکمران کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ حال ہی میں اس موضوع پر ماجد شیخ کا ایک مضمون پڑھنے کو ملا، جس کا خلاصہ پیشِ خدمت ہے۔

ماجد شیخ لکھتے ہیں کہ اندرونِ لاہور میں چند تاریخی عمارتیں ایسی ہیں جو اپنے پس منظر اور طرزِ تعمیر کے لحاظ سے نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ ان میں سے ایک مسجد، کشمیری بازار کے قریب، کسیرہ بازار اور کوچہ چابکسوراں کے سنگم پر واقع ہے۔ یہ ایک خوب صورت اور نسبتاً بلند مقام پر تعمیر شدہ مسجد ہے جسے عام طور پر ''سنہری مسجد'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس کی گنبدیں اصلی سونے کے ورق سے مزین ہیں، اور اس کا طرزِ تعمیر مقامی روایات کا حسین امتزاج ہے۔ تاہم چونکہ یہ کسی مخصوص معیاری طرزِ تعمیر میں نہیں آتی، اس لیے بعض ماہرینِ فنِ تعمیر اسے مستند نہیں مانتے، جبکہ بعض اسے لاہور کے کثیر الثقافتی اور آزاد مزاج کی علامت سمجھتے ہیں۔

تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسجد 1753ء میں مغلیہ سلطنت کے زوال کے دور میں تعمیر ہوئی، یعنی شہنشاہ اورنگزیب کے انتقال کے نصف صدی بعد اور سکھ دور کے آغاز سے بارہ سال قبل۔ اس کی تعمیر کے خلاف مقامی تاجروں اور مذہبی علماء دونوں نے مخالفت کی۔ تاجروں کا مؤقف تھا کہ مسجد کی تعمیر بازار کی تنگی کو مزید بڑھا دے گی، جبکہ علماء پر تاجروں نے دباؤ ڈالا کہ اگر وہ اس منصوبے کی حمایت کریں گے تو ان کی مالی معاونت بند کر دی جائے گی۔ تاہم ایک حکمتِ عملی

کے تحت اس تنازعے کو سلجھایا گیا۔

اس مسجد کے معمار نواب بخاری خان تھے، جو میر منّو کے دور میں لاہور کے نائب گورنر تھے۔ نواب بخاری خان نے تاجروں کو یقین دلایا کہ مسجد کی تعمیر کے لیے ان سے چندہ نہیں لیا جائے گا، بلکہ اس کے نچلے حصے میں دکانیں بنائی جائیں گی جن کے کرایے سے مسجد کے اخراجات پورے کیے جائیں گے۔ جب تاجروں کو اطمینان ہوا تو انھوں نے علماء سے مسجد کی تعمیر کو اسلامی فریضہ قرار دینے کے لیے فتویٰ حاصل کیا۔ یوں یہ مسجد تعمیر ہوئی۔

1765ء میں لاہور پر بھنگی مِسل کے سکھ سرداروں گجر سنگھ، سوبھا سنگھ اور لہنا سنگھ نے قبضہ کر لیا۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ ان سکھوں کو شہر فتح کرنے میں انھی آرائیں تاجروں کی مدد حاصل تھی، جو بعد ازاں 1799ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی مدد سے انھی سکھ حکمرانوں کے خلاف ہو گئے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا اسے مذہبی رواداری کہا جائے یا دربار کے اہم افراد کی سفارش پر کیا گیا عمل؟ کیا یہ کہنا درست ہوگا کہ اگر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور میں سب کو اپنے اپنے مذہب کے مطابق جینے کی مکمل آزادی حاصل تھی، تو پھر یہ واقعہ کیسے رونما ہوا؟ اگر یہ چند سکھوں کا انفرادی فیصلہ تھا، تو مہاراجہ کی خاموشی اس میں اس کی رضامندی کی علامت نہیں؟

محکمہ اوقاف پنجاب اور دیگر معتبر ذرائع کے مطابق، سنہری مسجد کی تاریخ میں ایک اہم اور متنازعہ باب اس وقت رقم ہوا جب 1767ء میں سکھ حکمرانوں کے دور میں اس مسجد کو گوردوارے میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس وقت لاہور سکھ سیاسی تسلط کے تحت تھا، اور مسجد کو گرو گرنتھ صاحب کے قیام کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔ اس تبدیلی کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ مسجد سے اذان کی آواز سکھ عبادات میں خلل ڈالتی تھی۔

یہ صورتِ حال تقریباً 53 برس تک قائم رہی۔ 1820ء میں، مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت کے دوران، مسلمانوں کی جانب سے کی گئی ایک باضابطہ درخواست پر مہاراجہ کے وزیر خارجہ فقیر عزیز الدین نے اس مسئلے پر توجہ دی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اس شرط پر مسجد واپس کرنے کی منظوری دی کہ مسجد سے اذان کی آواز کم رکھی جائے گی اور اس سے منسلک دکانوں کا کرایہ سرکار کو ادا

کیا جائے گا۔ یوں مسجد دوبارہ مسلمانوں کے حوالے کر دی گئی اور اس کی مذہبی حیثیت بحال ہوئی۔

یہ واقعہ نہ صرف سنہری مسجد کی مذہبی تاریخ کا اہم باب ہے، بلکہ لاہور کی بین المذاہب اور سیاسی تاریخ میں بھی ایک موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ظاہر کرتا ہے کہ کس طرح مذہبی حساسیتیں اور سیاسی ضرورتیں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی رہی ہیں۔

اگر تاریخی سیاق و سباق کا تجزیہ کیا جائے تو یہ دلچسپ امر سامنے آتا ہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے لاہور پر قبضے کے بعد اکیس برس تک اس مسجد کی اصل حیثیت بحال نہیں کی۔ یہ بات اُس مذہبی رواداری کے بیانیے کا مزید گہرائی سے جائزہ لینے پر مجبور کرتی ہے، جو اکثر سکھ سلطنت سے منسوب کیا جاتا ہے۔

اگر میں یہ کہوں کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے لاہور فتح کرنے کے اکیس سال بعد، محض ایک درخواست پر سنہری مسجد کو سکھوں سے خالی کروایا گیا، تو کیا یہ کہنا غلط ہوگا؟ اکیس برس تک یہ مسجد اپنی مذہبی شناخت سے محروم رہی، اور مہاراجہ رنجیت سنگھ اس صورتِ حال سے بخوبی واقف تھا۔ جبکہ لاہور ایک ایسا شہر تھا جہاں کی اکثریت مسلمان تھی اور جو اس شہر پر پچھلے آٹھ سو سال سے قابض تھے۔ کیا یہ سب کچھ سکھ اپنے ساتھ ہونے والے مظالم کا بدلہ تو نہیں لے رہے تھے؟

کیا یہی ہے مذہبی رواداری؟ یا مجھے اس معاملے کو کسی اور زاویے سے دیکھنا چاہیے؟

فیصلہ صادر کرنے کی ضرورت نہیں۔ حالات کا جائزہ پیش کرنا میرا مقصد تھا۔ فیصلہ تو آپ کو ہی صادر کرنا پڑے گا۔

جب ضرورت پیش آئی، تو رواداری دکھائی گئی؛ اور جب مفاد نے تقاضا کیا، تو تلوار اٹھالی گئی۔

میرے خیال میں صدیوں سے یہی دستور رہا ہے، ہر دور کے سامراج کا۔

سنہری مسجد لاہور: ایک ثقافتی و معمارانہ جائزہ، سکھ طرزِ تعمیر سے مماثلت

ماجد شیخ کے مطابق، سنہری مسجد لاہور کے طرزِ تعمیر میں مختلف تہذیبی و ثقافتی اثرات کی جھلک نمایاں طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ ان کے بقول، مسجد کا گنبد ہندووانہ طرزِ تعمیر سے متاثر ہے، جبکہ

اس کے ستونوں میں سکھ طرزِ تعمیر کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ اندرونی تزئین و آرائش اور نقاشی اسلامی فنِ تعمیر کا مظہر ہیں۔ بعض روایت پسند حلقے اس امتزاج کو مسترد کرتے ہیں اور اسے غیر روایتی سمجھتے ہیں، تاہم متعدد ماہرینِ فن و ثقافت کے نزدیک یہ مسجد برصغیر کی مشترکہ تہذیبی روایت اور فنِ تعمیر کے ہم آہنگ امتزاج کی ایک حسین مثال ہے۔

قیامِ پاکستان سے قبل، یہ مسجد خستہ حالی کا شکار ہو چکی تھی۔ آزادی کے بعد مقامی باشندوں نے اس کی محدود سطح پر مرمت و نگہداشت کی کوششیں کیں، تاہم مسجد کی بحالی کے لیے کوئی جامع منصوبہ تشکیل نہ دیا جا سکا۔ سنہ 2011ء میں امریکی سفیر نے مسجد کا دورہ کیا اور اس کی خستہ حالت پر افسوس کا اظہار کیا۔ اسی تناظر میں امریکی حکومت کے Ambassadors Fund for Cultural Preservation کے تحت 35,000 امریکی ڈالر کی امداد جاری کی گئی، جس کے نتیجے میں مسجد کے گنبدوں پر دوبارہ سونے کی پرت چڑھائی گئی، میناروں کی سطح بحال کی گئی اور فرش پر نئے سنگِ مرمر نصب کیے گئے۔ اس اقدام نے مسجد کو نہ صرف دوبارہ جِلا بخشی بلکہ اسے ایک محفوظ تاریخی ورثے کے طور پر بھی تسلیم کروایا۔

میں نے مشاہدہ کیا ہے کہ سنہری مسجد لاہور اور امرتسر کے دربار صاحب (گولڈن ٹیمپل) کے گنبدوں میں نمایاں مشابہت موجود ہے۔ یہ سوال ابھرتا ہے کہ آیا یہ مماثلت کسی بین المذاہب ہم آہنگی یا سکھ دھرم اور اسلام کو قریب لانے کی شعوری کوشش کا نتیجہ تھی یا محض علاقائی طرزِ تعمیر کا مظہر؟ مصنف کے مطابق، یہ مماثلت مذہبی تقلید کا نتیجہ نہیں بلکہ پنجاب کی مشترکہ علاقائی و ثقافتی جمالیات کی عکاس ہے۔ اس دور میں فنِ تعمیر نے فرقہ وارانہ حدود سے بالاتر ہو کر مقامی شناخت، فنّی عظمت، اور جمالیاتی توازن کو فروغ دیا، جو برصغیر کی فنونِ لطیفہ میں تہذیبی ہم آہنگی کا تسلسل ثابت کرتا ہے۔

تاریخی ریکارڈ کے مطابق، سنہری مسجد کی تعمیر 1753ء میں نواب سید بخاری خان کے زیرِ نگرانی عمل میں آئی، جو اُس وقت میر منّو کے دورِ حکومت میں لاہور کے نائب گورنر تھے۔ مسجد کے گنبدوں پر سونے کی پرت چڑھانے کا ابتدائی فیصلہ بھی انھی کا تھا، جو ایک جانب دینی عقیدت کا

مظہر تھا تو دوسری طرف فنِ تعمیر میں شاہانہ وقار اور حسن کی نمائندگی کرتا تھا۔ قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ یہی وہ دور تھا جب امرتسر میں دربار صاحب کی تعمیر و توسیع بھی جاری تھی؛ چنانچہ امکان ہے کہ نواب بخاری خان نے گولڈن ٹیمپل سے متاثر ہو کر سونے کے پتے چڑھوانے کا فیصلہ کیا ہو۔

یہ حقیقت بھی اہم ہے کہ ہندوستان بھر میں سنہری مسجد جیسی مثالیں نایاب ہیں، جہاں مسجد کے گنبدوں پر خالص سونے کی پرت استعمال کی گئی ہو۔ یوں سنہری مسجد صرف ایک مذہبی عبادت گاہ ہی نہیں بلکہ جنوبی ایشیا کی معمارانہ تاریخ کا ایک منفرد اور نادر نمونہ بھی ہے۔

❁❁❁

مہاراجہ رنجیت سنگھ اور مساجد کی بے حرمتی
ایک تحقیقی و تاریخی جائزہ

میں نے یہ جاننے کی حد تک معقول کوشش کی کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کا مسلمانوں اور ہندوؤں کے ساتھ برتاؤ کیسا تھا؟ اس بارے میں جو کچھ بھی معلوم ہو سکا، اس کی بنیاد پر کوئی حتمی رائے قائم کرنا مشکل ہے۔ مجھے توقع تھی کہ سید محمد لطیف جیسے مؤرخ اس پہلو پر روشنی ڈالیں گے، مگر انھوں نے بھی اس بارے میں تفصیل سے کچھ نہیں لکھا۔

یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے جن ریاستوں کو فتح کیا، ان میں اکثریت مسلم ریاستوں کی تھی۔ چونکہ اس زمانے میں پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریت تھی، اس لیے کشمیری، ملتانی، پشاوری اور ڈیرہ جات کی فتوحات بنیادی طور پر مسلمانوں کے خلاف جنگوں کا نتیجہ تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی بڑی تعداد کے لیے رنجیت سنگھ کا تاثر ہمیشہ خوشگوار نہیں رہا۔

کچھ لوگ یہ مؤقف رکھتے ہیں کہ چونکہ ابدالی اور مغل غیر ملکی حکمران تھے، اس لیے ایک مقامی پنجابی حکمران کی ان کے خلاف جدوجہد کی حمایت کی جانی چاہیے۔ اس نکتے میں بعض حلقے وزن محسوس کرتے ہیں۔ چنانچہ جہاں سکھ برادری رنجیت سنگھ کو ایک عظیم رہنما اور روادار حکمران سمجھتی ہے، وہیں بعض مسلمان حلقے انھیں مسلم ریاستوں کی تباہی کا ذمہ دار بھی ٹھہراتے ہیں۔ ان جنگوں میں مسلمانوں کی بڑی تعداد شہید ہوئی، اور سید احمد شہید کے خلاف بھی رنجیت سنگھ نے جنگ لڑی، جس میں وہ اور ان کے کئی ساتھی شہید ہوئے۔ پشاور میں ان کے ایک گورنر کے ہاتھوں بھی بڑی تعداد میں لوگ مارے گئے۔

برصغیر کی تاریخ میں مہاراجہ رنجیت سنگھ (1839-1780) ایک غیر معمولی حکمران کے

طور پر جانے جاتے ہیں، جنھوں نے سکھ سلطنت کو مضبوط اور منظم شکل دی۔ ان کی حکمرانی کی ایک خاص جہت، جو اکثر زیرِ بحث آتی ہے، وہ ہے ان کا طرزِ عمل مساجد اور اسلامی عبادت گاہوں کے حوالے سے۔

جب 1799ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے لاہور پر قبضہ کیا، تو شہر کی کئی تاریخی عمارتیں، بشمول بادشاہی مسجد، کو عارضی طور پر فوجی مقاصد کے لیے استعمال کیا گیا۔ بادشاہی مسجد کو اسلحہ خانہ اور گھوڑوں کا اصطبل بنایا گیا، لیکن بعد ازاں اس کی مرمت کے لیے فنڈز بھی فراہم کیے گئے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی مذہبی رواداری

رنجیت سنگھ کے طرزِ حکمرانی کے حوالے سے یہ سوال اکثر اٹھایا جاتا ہے کہ آیا وہ مذہبی تعصب کے حامل تھے یا سیکولر سوچ رکھتے تھے؟ سکھ مؤرخین انھیں روادار حکمران کے طور پر پیش کرتے ہیں، جبکہ بعض مسلم حلقے انھیں متعصب تصور کرتے ہیں۔ کے ایس دگل کی کتاب *A Secular Sikh Sovereign:Ranjit Singh* میں مؤلف اس نکتے پر زور دیتے ہیں کہ رنجیت سنگھ ایک عملی سیکولر حکمران تھے، جو اپنی مذہبی وابستگی کے باوجود دیگر مذاہب کے ساتھ احترام کا رویہ رکھتے تھے۔ وہ دربار صاحب (گولڈن ٹیمپل) کی تزئین و آرائش کے علاوہ مساجد اور مندروں کی بحالی میں بھی دلچسپی لیتے تھے۔ ان کی مسلمان بیوی "موراں سرکار" کے لیے "مائی موراں مسجد" کی تعمیر اسی پالیسی کی عکاسی کرتی ہے۔ انھوں نے صوفی مزارات پر حاضری دی اور مسلمانوں کے جذبات کا احترام کیا۔ انھوں نے ہندو عقیدے کا احترام کرتے ہوئے گائے کے ذبیحے پر پابندی عائد کی، جو اگرچہ مسلمانوں کے لیے ناپسندیدہ تھا، لیکن اس کا مقصد فرقہ وارانہ ہم آہنگی قائم رکھنا تھا۔

مساجد کے حوالے سے تنازع:

اگرچہ ان کی بین المذاہب رواداری کے کئی شواہد موجود ہیں، تاہم بعض مساجد کے ساتھ ہونے والے سلوک کو تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ سکھ افواج نے بادشاہی مسجد کو فوجی مرکز بنایا، موتی

مسجد کو ''موتی مندر'' میں تبدیل کیا، اور سنہری مسجد کو گردوارے میں بدل دیا گیا (یہ عمل رنجیت سنگھ کے ابتدائی دور سے پہلے ہوا تھا)۔ تاہم بعد ازاں انھوں نے مسجد مسلمانوں کو واپس کی۔ بیگم شاہی مسجد کو بارود خانے میں تبدیل کیے جانے کے باعث ''بارود خانے والی مسجد'' کہا جانے لگا۔ کچھ لوگوں کا یہ ماننا ہے کہ یہ تمام اقدامات عمومی طور پر فوجی ضرورت کے تحت کیے گئے اور انھیں مذہبی تعصب کے تناظر میں دیکھنا شاید تاریخی حقائق سے انحراف ہوگا۔ میرے خیال میں ایسا صرف جنگ کے دنوں میں ہوتا تو اس بات میں وزن تھا۔ مگر یہ سلسلہ تو کئی دہائیوں تک چلتا رہا۔ اس لیے اسے ایک وقتی ضرورت کہنا مناسب نہیں۔

کثیر المذاہب حکومت:

رنجیت سنگھ کے دربار میں ہندو، مسلمان، اور سکھ شامل تھے۔ دھیان سنگھ (ڈوگرہ ہندو) وزیرِ اعظم، فقیر عزیز الدین (مسلمان) وزیرِ خارجہ، راجہ دینا ناتھ (ہندو) وزیرِ مالیات، میاں غوث (مسلمان) توپ خانے کے سربراہ۔ یہ تنوع اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کی حکومت ایک کثیر المذاہب ریاست تھی۔ جبری مذہبی تبدیلی کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ ان کی مسلمان بیویوں موراں بی بی اور گل بہار بیگم نے اپنا دین ترک نہیں کیا، نہ ہی ہندو بیویوں نے مذہب تبدیل کیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مذہب کی جبری تبدیلی ان کی پالیسی کا حصہ نہیں تھی۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کا تاریخی تشخص

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے مجسمے کی تنصیب کے موقع پر مختلف آراء سامنے آئیں۔ سکھ برادری نے ان کی شخصیت کو رواداری کی علامت قرار دیا، جبکہ بعض مسلم حلقوں نے انھیں متنازع تصور کیا۔ تاہم کئی مسلمان اور پنجابی دانشوران کی شخصیت کو ثقافتی اور تاریخی ورثہ مانتے ہیں۔

IndiaFacts.org پر شائع ایک تجزیاتی مضمون میں اشارہ کیا گیا کہ پاکستان میں تاریخ نویسی میں ہندو اور سکھ ماضی کو اکثر نظر انداز کیا جاتا ہے، اور سکھ حکمرانی کو مغل و انگریز دور کے درمیان کے ایک مختصر وقفے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، حالانکہ وہ ایک اہم تاریخی باب ہے۔ یہ

روش علمی دیانت اور تاریخی انصاف کے تقاضوں کے منافی ہے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نہ صرف سکھ تاریخ کی ایک مرکزی شخصیت ہیں بلکہ برصغیر کی سیاسی اور تہذیبی تاریخ میں بھی ان کا کردار غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بارے میں سکھ مؤرخین اور ماہرین تاریخ کی عمومی رائے یہ ہے کہ وہ ایک فیاض، وسیع النظر اور مضبوط حکمران تھے۔ تاہم، بعض یورپی مشاہدین کی تحریریں اس دور میں مذہبی پالیسیوں کے سخت پہلوؤں کو بھی آشکار کرتی ہیں۔ ان میں برطانوی سیاح جی ٹی وگنے (G.T. Vigne) کی 1843ء کی تحریریں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔

وگنے کے مطابق، سکھ مذہب میں گائے کو نہایت مقدس تصور کیا جاتا تھا، حتیٰ کہ بعض مواقع پر اس کے قتل کو اتنا سنگین جرم سمجھا جاتا تھا کہ اس پر اجتماعی سزا دی گئی۔ دریائے سندھ کے کنارے ایک قلعے کے محاصرے کے دوران جب اطلاع ملی کہ قلعے کے اندر موجود پٹھانوں نے ایک گائے کو ذبح کیا ہے، تو قلعے کی فتح کے بعد تمام محافظوں کو قتل کر دیا گیا۔ پشاور میں بھی ایک ایسا واقعہ پیش آیا جہاں ایک مسلمان کو گائے کا گوشت کھانے کے الزام میں زندہ جلا دیا گیا۔ یہ واقعات اس دور کی مذہبی شدت پسندی کی نشان دہی کرتے ہیں، جس میں بعض اوقات مذہبی جذبات قانون اور عدل پر فوقیت اختیار کر لیتے تھے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے مذہبی رجحانات صرف داخلی پالیسیوں تک محدود نہ تھے، بلکہ ان کا اظہار خارجہ تعلقات میں بھی ہوا۔ 1831ء میں جب افغان گورنر شاہ شجاع درانی نے رنجیت سنگھ سے افغانستان کا بادشاہ بننے کے لیے مدد طلب کی، تو مہاراجہ نے دو مذہبی نوعیت کی شرائط پیش کیں:

سومنات مندر کے وہ دروازے، جنھیں محمود غزنوی 1024ء میں غزنی لے گیا تھا، واپس اصل مقام پر نصب کیے جائیں۔ یہ مطالبات ظاہر کرتے ہیں کہ مہاراجہ کی سوچ میں مذہبی و تہذیبی یادداشت کا اثر گہرا تھا، اور وہ مسلم حملہ آوروں کے تاریخی اقدامات کا جواب دینا چاہتے تھے ایسی ہی سوچ مراٹھا حکمرانوں کے ہاں بھی پائی جاتی ہے۔ 1838ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ، شاہ شجاع درانی اور برطانوی حکومت کے مابین لاہور میں ایک سہ فریقی معاہدہ طے پایا، جس کا عنوان تھا:

" Treaty of Alliance and Friendship Between Maharaja

Runjeet Singh and Shah Shooja-ool-Moolk, with the Approbation of, and in concert with the British Government"

اس معاہدے کی دفعہ 10 میں واضح طور پر درج ہے کہ:

''جب بھی دونوں ریاستوں کی افواج ایک ہی مقام پر موجود ہوں گی، کسی بھی حالت میں گائے کا ذبیحہ نہیں کیا جائے گا۔''

یہ دفعہ اس امر کی غمازی کرتی ہے کہ گائے کا تحفظ صرف سکھ ریاست تک محدود نہ تھا بلکہ جنوبی ہند کی ریاستوں جیسے ٹراونکور میں بھی گائے کے ذبیحے پر موت کی سزا دی جاتی تھی۔

مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی شخصیت نہ صرف ایک سیاسی و عسکری رہنما کی تھی بلکہ ان کے فیصلوں میں مذہبی و تہذیبی عوامل نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ ان کی پالیسیوں میں ایک طرف مذہبی اقلیتوں کے لیے رواداری کی مثالیں موجود ہیں، تو دوسری طرف بعض مواقع پر مذہبی سخت گیری بھی دکھائی دیتی ہے۔ ان تضادات کو سمجھنے کے لیے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دورِ حکومت کو ایک کثیر جہتی تاریخی، سیاسی اور سماجی تجزیے کے تحت دیکھنا ضروری ہے۔ ان کی شخصیت سکھ روایت، برصغیر کی مشترکہ تہذیب، اور اس دور کی مذہبی و سیاسی حساسیت کا عکس ہے، جس کا مطالعہ آج بھی نہایت اہم اور موزوں ہے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی شخصیت محض سکھ برادری تک محدود نہیں رہی، بلکہ اُن کے کردار اور طرزِ حکمرانی کی تحسین متعدد ہندو مفکرین اور دانشوروں کی جانب سے بھی کی گئی ہے۔ دی ٹربیون (انڈیا) میں شائع ہونے والے ایک مضمون میں، جو گرداشن سنگھ ڈھلوں کی تحریر ہے، اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ رنجیت سنگھ کی شخصیت ہندوستان کی بین المذاہب تاریخ میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔ ڈھلوں اس مضمون میں پنڈت جواہر لال نہرو کا حوالہ دیتے ہیں، جنھوں نے اپنی معروف تصنیف *Discovery of India* میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کو ایک اعلیٰ اخلاقی اقدار کا حامل حکمران قرار دیا ہے۔

پنڈت نہرو کے مطابق:

''رنجیت سنگھ ایک ایسے عہد میں انسانیت کا مظہر تھا جب ہندوستان اور دنیا سفاکیت اور بے حسی کی گرفت میں تھی۔ اُس نے ایک طاقتور سلطنت اور فوج تشکیل دی، لیکن خونریزی سے اجتناب کو ہمیشہ مقدم رکھا۔ اُس نے تمام جرائم، خواہ وہ کتنے ہی سنگین کیوں نہ ہوں، کے لیے سزائے موت کو منسوخ کر دیا، جب کہ اسی زمانے میں برطانیہ میں معمولی چوری پر بھی مجرموں کو پھانسی دی جاتی تھی۔''

یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ جب مہاراجہ رنجیت سنگھ پر حملہ کیا گیا، تب بھی حملہ آور کو سزائے موت نہ دی گئی۔ مطلق العنان بادشاہتوں کی تاریخ میں اس قسم کی رواداری اور رحم دلی کی مثال شاذ و نادر ہی ملتی ہے، یہاں تک کہ جدید ہندوستان میں بھی مہاتما گاندھی کے قاتل کو عدالتی طور پر پھانسی دی گئی۔

گرداشن سنگھ ڈھلوں مزید تحریر کرتے ہیں کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے نہ کبھی رسمی طور پر تاج پہنا اور نہ ہی تخت نشینی اختیار کی، جو اُن کی ذاتی عاجزی اور انکساری کا مظہر ہے۔ وہ سلطنت کے عروج پر بھی فروتنی کا نمونہ رہے۔ شکست خوردہ دشمنوں کے ساتھ ہمدردی، جانوروں کے حقوق کا احترام، اور پرندوں جیسی بے زبان مخلوقات کے تحفظ کے لیے سخت احکامات ان کی انسان دوستی کا مظہر ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک کوئل کو محض اُس وقت مار دینے پر، جب وہ گنگنا رہی تھی، ایک جنرل کو سزا دی گئی۔ اسی طرح ہنس، طوطا، چڑیا جیسے پرندوں کو نقصان پہنچانے پر پابندی عائد تھی۔ ہندو رعایا کے مذہبی جذبات کے احترام میں گائے کے ذبیحے پر سلطنت بھر میں مکمل پابندی تھی۔

گرداشن سنگھ ڈھلوں کے بقول مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکمرانی مذہبی رواداری، سماجی ہم آہنگی، اور عدل و انصاف کے اصولوں پر مبنی تھی، جس کی بنا پر اُس وقت کی ہندوستانی ریاستوں میں اُن کی سلطنت کو سب سے زیادہ ترقی یافتہ سمجھا جاتا ہے۔ پنڈت نہرو کی تحریر اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ ایک مدبر اور انسان دوست حکمران تھے، جن کی شخصیت میں رحم، عدل، بین المذاہب رواداری اور تہذیبی بصیرت نمایاں تھی۔

یہ تمام حقائق اس امر کی غمازی کرتے ہیں کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ نہ صرف سکھوں کے لیے ایک عظیم قومی راہنما کی حیثیت رکھتے ہیں، بلکہ ہندو دانشور طبقے کی طرف سے بھی انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

اگرچہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی ذات بین المذاہب احترام کی علامت ہے، تاہم موجودہ دور میں زمینی حقائق کچھ مختلف نظر آتے ہیں۔ ذاتی مشاہدے کی بنیاد پر یہ دیکھا گیا ہے کہ جب ہندو زائرین پاکستان میں اپنے مقدس مقامات کی زیارت کے لیے آتے ہیں تو وہ عمومی طور پر صرف مندروں تک محدود رہتے ہیں۔ شاذ و نادر ہی کوئی ہندو زائر مہاراجہ رنجیت سنگھ کی یادگار یا کسی گردوارے کی زیارت کرتا ہے۔ دوسری طرف، سکھ زائرین بھی عموماً صرف اپنے مذہبی مقامات، جیسے کہ گردواروں، کی زیارت تک محدود رہتے ہیں۔ اگرچہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی شخصیت کو برصغیر کے مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے افراد بالعموم مثبت نگاہ سے دیکھتے ہیں، تاہم زمینی سطح پر مذہبی ہم آہنگی اور مشترکہ تاریخی شعور کے عملی اظہار میں نمایاں تفاوت اور فاصلہ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ سکھ اور ہندو زائرین اپنے اپنے مقدس مقامات تک محدود رہتے ہیں، اور مہاراجہ رنجیت سنگھ جیسے تاریخی شخصیات کی یادگاروں کو مشترکہ ثقافتی ورثہ کے طور پر تسلیم کرنے کی روایت بہت کمزور نظر آتی ہے۔

بعض جدید فکر رکھنے والے مسلمان، جنھیں عمومی طور پر ''لبرل مسلمان'' کے نام سے شناخت کیا جاتا ہے، اس صورت حال پر تنقید کرتے ہوئے یہ موقف اختیار کرتے ہیں کہ ایسی ہمہ گیر تاریخی شخصیات کو صرف مذہبی زاویے سے دیکھنے کی بجائے انھیں برصغیر کی مشترکہ تہذیبی تاریخ کا جزو تسلیم کیا جانا چاہیے۔ ان کے بقول، رنجیت سنگھ جیسی شخصیات نہ صرف ایک مذہب بلکہ پورے خطے کی تہذیبی شناخت کی نمائندگی کرتی ہیں، اس لیے ان کی یادگاروں کو سب مذاہب کے افراد کی طرف سے یکساں احترام ملنا چاہیے۔

تاہم یہ تصور پاکستانی ریاستی بیانیے سے ہم آہنگ نظر نہیں آتا۔ پاکستان کے قیام کا جو نظریاتی پس منظر پیش کیا گیا، وہ برصغیر کے مسلمانوں اور ہندوؤں کو دو الگ قوموں کے طور پر

متعارف کرواتا ہے، جن کے درمیان مذہبی، ثقافتی اور سیاسی اختلافات اس حد تک بڑھے کہ مسلمانوں کو ایک علیحدہ ریاست کا مطالبہ کرنا پڑا۔ اس تناظر میں ہندو یا سکھ شخصیات کو قومی ہیرو یا مثبت تاریخی کردار کے طور پر تسلیم کرنا ریاستی سطح پر ایک فکری تضاد کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔

یہی فکری کشمکش جنوبی ایشیا میں نہ صرف تاریخی بیانیوں کی تشکیل میں رکاوٹ بنتی ہے بلکہ بھارت اور پاکستان کے مابین بار بار ہونے والی سیاسی و عسکری کشیدگی کا ایک بنیادی سبب بھی ہے۔ دونوں ممالک اپنے اپنے قومی بیانیے میں تاریخ کو مخصوص مذہبی و قومی زاویوں سے دیکھتے ہیں، جس سے ایک ہم آہنگ اور متوازن تاریخ نویسی ممکن نہیں ہو پاتی۔ بھارت پرتھوی راج کو ہیرو سمجھتا ہے اور ان کے نام پر میزائل بناتا ہے۔ دوسری طرف، پاکستان میں محمد غوری، جس نے پرتھوی راج کو شکست دی اور اسے اس کی ریاست سے بے دخل کیا، ہیرو کے طور پر جانا جاتا ہے۔

ترائن میں لڑی گئی جنگ محض ایک تاریخی واقعہ نہیں، بلکہ اس کے اثرات آج بھی دونوں ممالک کے قومی بیانیے اور اجتماعی شعور میں موجود ہیں۔

یہ تاریخ کا وہ باب ہے جس کی باقیات آج بھی برصغیر کے ذہنوں پر چھائی ہوئی ہیں، اور شاید یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی تاریخ میں ہم آہنگی اور باہمی مفاہمت کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔

مجھے تو آج بھی یوں محسوس ہوتا ہے جیسے پانی پت کی جنگ آج بھی ذہنی، تہذیبی اور نظریاتی سطح پر جاری ہے۔

اس سوال کا جواب کہ آیا کبھی دونوں ممالک کے مابین ایک ایسا فکری پل قائم ہو سکے گا جو مشترکہ تاریخی شعور اور ثقافتی ہم آہنگی کو فروغ دے، فی الحال یقین سے نہیں دیا جا سکتا۔ تاہم اس کی خواہش اور دعا ضرور کی جا سکتی ہے کہ خطے کے عوام ایسے فکری و تہذیبی ماحول کی طرف بڑھیں جہاں تاریخ کو تعصب سے بالاتر ہو کر مشترکہ میراث کے طور پر تسلیم کیا جائے۔

میں یہاں ایک اور اہم نکتہ بیان کرنا چاہوں گا، اور وہ ہے مہاراجہ رنجیت سنگھ کا پنجاب کی مشترکہ شناخت میں کردار۔ میں لاہور میں ایک طویل عرصے سے مقیم ہوں۔ میرے آباؤ اجداد ریاست پٹیالہ، جو ایک سکھ ریاست تھی، سے ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے۔ میں نے نہ صرف

لاہور بلکہ پنجاب کے دیگر شہروں میں بھی کہیں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور کی کوئی قابلِ ذکر عمارت نہیں دیکھی، اور نہ ہی مجھے علمی یا فلاحی میدان میں ان کی کسی نمایاں خدمات کا علم ہو سکا ہے۔ یہ بات درست ہے کہ سکھ سلطنت پنجاب کی طویل تاریخ کا ایک نہایت مختصر دورانیہ رکھتی ہے۔ یہ سلطنت بمشکل پچاس برس پر محیط تھی، اور اس کا عروج و زوال دونوں ہی ایک محدود زمانی دائرے میں وقوع پذیر ہوئے۔

جہاں تک لاہور شہر میں سکھ سلطنت کے معمارانہ اثرات کا تعلق ہے، یہ بات تحقیق کے دائرے میں آتی ہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ اور ان کے جانشینوں نے اس تاریخی شہر میں کوئی ایسی نمایاں یا منفرد عمارت تعمیر نہیں کی، جو ان کے عہد کی شناخت بن سکتی۔ اس کے برعکس، لاہور میں مغلیہ اور برطانوی ادوار کی تعمیرات آج بھی واضح طور پر پہچانی جاتی ہیں، جنھوں نے شہر کی تاریخی و ثقافتی شناخت پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔

مثال کے طور پر، مہاراجہ رنجیت سنگھ نے لاہور قلعے کو اپنی رہائش گاہ کے طور پر استعمال کیا، لیکن یہ قلعہ مغلوں کا تعمیر کردہ تھا۔ سکھ عہد میں مخصوص طرزِ تعمیر کا فقدان اس بات کا مظہر ہے کہ اس سلطنت کی ثقافتی میراث میں فنِ تعمیر کا پہلو نسبتاً کمزور تھا۔ برطانوی دور کی بے شمار عمارات آج بھی لاہور کے شہریوں کو فوراً برطانوی اقتدار کی یاد دلاتی ہیں۔

اس تجزیے سے واضح ہوتا ہے کہ اگرچہ سکھ سلطنت نے سیاسی اور عسکری میدان میں کچھ اہم کامیابیاں ضرور حاصل کیں، تاہم ثقافتی اور مادی ورثے، خصوصاً فنِ تعمیر کے حوالے سے، اس کے اثرات لاہور جیسے تاریخی شہر میں محدود اور غیر نمایاں رہے۔ اس کی ایک ممکنہ وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنے دورِ حکومت میں ریاست کی توسیع پر سب سے زیادہ توجہ مرکوز رکھی۔ انھوں نے لاہور کے شمال میں کشمیر، مغرب میں پشاور، جنوب میں ملتان اور مشرق میں امرتسر کو فتح کرنے میں زیادہ دلچسپی لی، جب کہ علمی، فلاحی، تعمیراتی اور عوامی بہبود کے شعبوں کو وہ اہمیت نہ دے سکے جس کی ایسے حکمران سے توقع کی جاتی ہے۔ اسی لیے مہاراجہ رنجیت سنگھ کا پنجاب کی سماجی ترقی میں کوئی نمایاں کردار نظر نہیں آتا۔ انفرادی نوعیت کے اقدامات یا اکا دکا کام کبھی بھی کسی

منظم اور وسیع سطح کے سماجی وثقافتی منصوبوں کا نعم البدل نہیں ہو سکتے۔

ان شواہد کی روشنی میں میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر ''سیکولرازم'' کو اس کے جدید مفہوم یعنی ریاست اور مذہب کی مکمل علیحدگی کے تناظر میں جانچا جائے، تو مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکمرانی کو مکمل طور پر سیکولر قرار دینا تاریخی اعتبار سے درست نہ ہوگا۔ تاہم، اگر ہم سیکولرازم کو اس کے عملی مظاہر جیسے کہ سماجی انصاف، مذہبی رواداری، اور ریاستی غیر جانبداری کے تناظر میں سمجھیں، تو رنجیت سنگھ کی شخصیت ایک ایسے حکمران کے طور پر سامنے آتی ہے جو مذہبی اعتدال اور سیاسی فراخ دلی کا حامل تھا۔ ان کے طرزِ حکمرانی میں ایک طرف مذہب سے ذاتی وابستگی نظر آتی ہے، تو دوسری جانب مختلف مذاہب اور اقوام کے ساتھ برابری کا سلوک بھی نمایاں ہے۔

اس کے باوجود، یہ حقیقت نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ مہاراجہ کے بعض اقدامات، خصوصاً مسلمانوں سے متعلق، تنقید کی زد میں رہے۔ ان کی حکومت میں چند مذہبی مقامات کے استعمال اور بعض سخت فیصلے ایسے تھے جو مسلم برادری کے جذبات کے برخلاف سمجھے گئے۔ تاہم، ایسے اقدامات کو مکمل مذہبی تعصب پر محمول کرنا تاریخ کی پیچیدگیوں کو نظر انداز کرنے کے مترادف ہوگا۔

یہ تضاد دراصل جنوبی ایشیا کے اکثر حکمرانوں میں پایا جاتا ہے۔ مثلاً کئی مسلم حکمران، باوجود اس کے کہ وہ اسلام کی رواداری پر مبنی تعلیمات کے پیروکار تھے، سکھوں اور ہندوؤں پر بعض اوقات مذہبی دباؤ ڈالتے رہے اور ان کے مقدس مقامات کو نشانہ بنایا۔ اسی طرح، مہاراجہ رنجیت سنگھ بھی، باوجود اپنی بین المذاہب ہم آہنگی کی پالیسیوں کے، مکمل طور پر مذہبی غیر جانبداری کا مظاہرہ نہ کر سکے۔ اس تناظر میں رنجیت سنگھ کو نہ تو ایک مثالی سیکولر حکمران قرار دیا جا سکتا ہے، اور نہ ہی مکمل طور پر متعصب۔ وہ ایک تاریخی شخصیت تھے، جن کے اقدامات میں مذہبی عقیدت، سیاسی بصیرت، اور وقت کی ضروریات کا ایک پیچیدہ امتزاج پایا جاتا ہے۔

❁ ❁ ❁

قصہ بادشاہی مسجد لاہور کی بے حرمتی کا

لاہور کی چند اہم عمارتوں میں ایک بادشاہی مسجد بھی ہے۔ یہ مسجد مغلیہ سلطنت کے چھٹے بادشاہ اورنگزیب عالمگیر کے حکم پر تعمیر کی گئی۔ اس کی تعمیر 1671ء میں شروع ہوئی اور 1673ء میں مکمل ہوئی۔ تعمیر کے وقت یہ دنیا کی سب سے بڑی مسجد تھی، جبکہ آج بھی یہ پاکستان کی دوسری اور دنیا کی پانچویں سب سے بڑی مسجد شمار کی جاتی ہے۔ یہ مسجد نہ صرف لاہور کی سب سے نمایاں علامت ہے بلکہ ملکی اور بین الاقوامی سیاحت کا اہم مرکز بھی ہے۔ اس کا نقشہ جامع مسجد دہلی سے مشابہت رکھتا ہے، جسے اورنگزیب کے والد شاہجہان نے تعمیر کرایا تھا، تاہم بادشاہی مسجد رقبے اور وسعت میں کہیں زیادہ بڑی ہے۔ مسجد کی ساخت اور فنِ تعمیر مغلیہ جمالیات کی بہترین مثال ہے۔

اس مسجد سے متعلق ایک اہم واقعہ کا تعلق مہاراجہ رنجیت سنگھ سے ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے اس مسجد کو ایک اصطبل کے طور پر استعمال کیا تھا۔ یہ جان کر مجھے بے حد حیرت ہوئی کہ ایک سکھ راجہ، جس کے بارے میں سکھوں کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ ایک مذہبی طور پر رواداد بادشاہ تھا، نے ایسا کیوں کیا؟ میں نے اس بارے میں مزید تحقیق کی، اور جو کچھ جانا وہ افسوسناک تھا، کیونکہ ایسا ایک بار نہیں بلکہ متعدد مرتبہ ہوا۔

حکومتِ پاکستان کی ایک ویب سائٹ پر اس حوالے سے ایک تفصیلی مضمون پڑھنے کو ملا۔[1] اس کے مطابق، جب 1799ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی قیادت میں سکھوں نے لاہور پر قبضہ کیا، تو انھوں نے مسجد کے وسیع صحن کو اپنے لشکر کے گھوڑوں کے اصطبل کے طور پر استعمال کیا،

[1] https://www.pakistanembassytokyo.com/content/badshahi-mosque-lahore-punjab

جبکہ صحن کے اردگرد موجود 80 حجرے سپاہیوں کی رہائش اور اسلحہ خانوں میں تبدیل کر دیے گئے۔ اسی کے ساتھ، مسجد سے متصل حضوری باغ کو مہاراجہ نے اپنی سرکاری دربارگاہ میں بدل دیا، اور 1818ء میں مسجد کے سامنے سنگِ مرمر کا ایک شاندار ڈھانچہ تعمیر کروایا۔ یاد رہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے لاہور پر 1799ء میں قبضہ کیا تھا، اور انیس سال بعد یہ کام انجام دیا۔

اسی طرح ایک اور واقعہ بھی ریکارڈ پر ہے کہ 1841ء میں انگریز-سکھ جنگ کے دوران، رنجیت سنگھ کے بیٹے شیر سنگھ نے مسجد کے میناروں پر توپیں نصب کروائیں، جن سے قلعہ لاہور میں موجود چند کور کی حامی قوتوں پر گولہ باری کی گئی، جس کے نتیجے میں قلعے کے دیوانِ عام کو شدید نقصان پہنچا۔ اگرچہ بعد ازاں برطانوی حکومت نے اسے دوبارہ تعمیر کروایا، لیکن اصل حالت بحال نہ ہو سکی۔ ان دنوں فرانسیسی افسر ہنری ڈی لا روش نے مسجد اور قلعے کو جوڑنے والی سرنگ کو بارود ذخیرہ کرنے کے لیے استعمال کیا۔ یہ صاحب سکھ فوج میں ملازم تھے۔

تیسری مرتبہ 1849ء میں، جب پنجاب پر برطانوی قبضہ ہوا، مسجد کو ایک بار پھر فوجی چھاؤنی کے طور پر استعمال کیا گیا۔ مسجد کے حجرے، جو سکھ دور میں فوجی مقاصد کے لیے استعمال ہو رہے تھے، انگریزوں نے منہدم کر کے کھلی برآمدوں (دالانوں) میں تبدیل کر دیے، تاکہ ان کا دوبارہ سیاسی مقاصد کے لیے استعمال روکا جا سکے۔ تاہم مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی ناراضی اور احتجاج کے پیشِ نظر 1852ء میں ''بادشاہی مسجد اتھارٹی'' قائم کی گئی تاکہ مسجد کو دوبارہ عبادت گاہ کی حیثیت میں بحال کیا جا سکے۔

اس طرح، دو مرتبہ سکھوں اور ایک مرتبہ انگریزوں کے ہاتھوں اس عظیم مسجد کی بے حرمتی کی گئی۔ البتہ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مسجد کو منہدم نہیں کیا گیا۔ 1939ء میں اُس وقت کے وزیراعلیٰ پنجاب سر سکندر حیات خان نے مسجد کی جامع مرمت کے لیے مالی وسائل فراہم کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ ان مرمتی کاموں کی نگرانی معروف معمار نواب زین یار جنگ بہادر نے کی، اور یہ سلسلہ 1960ء تک جاری رہا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی موت کے بعد دس سال

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی موت کے بعد، انگریزوں کے لاہور پر قبضے سے پہلے کے دس سال (1839–1849) کا عرصہ پنجاب میں ایک مرتبہ پھر قتل و غارت گری کے دور کے طور پر مانا جاتا ہے۔ اس عرصے میں سکھوں اور مسلمانوں کے باہمی تعلقات کی نوعیت پر ایک مضمون پڑھنے کو ملا، جس کا عنوان ہے:

Sikh-Muslim Relations in the Post-Ranjit Singh Period, 1839-1849: A Reappraisal

جسے روبینہ شعیب، انعم افتخار، محمد حمید، اور سید ماہناز حسن نے تحریر کیا ہے۔[1]

مصنفین لکھتے ہیں کہ سکھ سلطنت کا عروج اس قدر تیز اور ڈرامائی تھا کہ مؤرخین نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کو ان کی غیر معمولی عسکری بصیرت اور پُراسرار قیادت کی وجہ سے نپولین سے تشبیہ دی ہے۔ تاہم، یہ تقابل ان کی شخصیت کی مکمل عکاسی نہیں کرتا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ ایک چوکنا سپاہی تھا جسے جنگی معاملات میں گہری بصیرت حاصل تھی۔ وہ کبھی کسی ایسے دشمن کو مشتعل نہ کرتا جسے شکست دینا دشوار ہوتا۔ یہ ایک اہم بات ہے جو کم ہی بیان کی جاتی ہے۔

یہ بھی ایک عظیم کارنامہ ہے کہ رنجیت سنگھ نے بدنظمی کا شکار مختلف سکھ گروہوں کو منظم کر کے ایک مضبوط فوج تشکیل دی۔ اگرچہ وہ میدانِ جنگ میں سخت گیر تھا، مگر مختلف العقیدہ اور کثیر المذاہب رعایا کے ساتھ اس کا سلوک نہایت منصفانہ اور پُرامن تھا۔ اس کے بعد آنے والے حکمران، رنجیت سنگھ کی دور اندیشی اور فہم و فراست سے عاری تھے، چنانچہ انھوں نے وہ سب کچھ

---

[1] Pakistan Vision Vol. 20 No: 1

کھو دیا جو رنجیت سنگھ نے محنت اور حکمت سے قائم کیا تھا۔ انھوں نے خالصہ ریاست کو برباد کر دیا، جسے رنجیت سنگھ نے انتھک محنت سے استوار کیا تھا۔

مہاراجہ کی وفات کے بعد، سکھ حکمران سلطنت کو مضبوط بنانے کے بجائے آپس کی سازشوں اور قتل و غارت گری میں مصروف ہو گئے۔ ان کی توانائیاں تخت کے حصول کی داخلی جنگ میں ضائع ہو گئیں۔ نتیجتاً سکھ ریاست برطانوی سامراج کے ہاتھوں بدقسمتی سے اور اچانک ختم ہو گئی۔ تاہم، اس زوال کی جزوی ذمہ داری خود رنجیت سنگھ پر بھی عائد ہوتی ہے، کیونکہ وہ نہ تو کسی جانشین کے تقرر کا واضح منصوبہ چھوڑ کر گیا، اور نہ ہی کسی کو سلطنت یا فوج کی قیادت کے لیے تیار کیا۔ اس کوتاہی کا نتیجہ ناتجربہ کار اور نااہل حکمرانوں کی صورت میں سامنے آیا، جس نے پنجاب میں خالصہ راج کے خاتمے کی راہ ہموار کی۔

اس کے باوجود، تمام تر خلفشار اور ابتری کے باوجود، مہاراجہ کے جانشینوں نے غیر سکھ برادریوں، خصوصاً مسلمانوں کے ساتھ منصفانہ اور ہمدردانہ رویے کو کسی حد تک قائم رکھا۔ رنجیت سنگھ کے عہد میں ریاستی پالیسیوں کی بنیاد مذہب یا نسل پر نہیں تھی، اور یہی طرزِ حکمرانی 1839ء سے 1849ء کے درمیانی عرصے میں بھی کسی حد تک قائم رہا۔ اس دوران لاہور دربار میں تمام مسلم اُمراء اپنے عہدوں اور مراعات سے لطف اندوز ہوتے رہے، اور حتیٰ کہ بدنظمی کا شکار فوج بھی بیشتر مسلم عمائدین، خصوصاً فقیر برادران، کا بے حد احترام کرتی تھی۔

❀ ❀ ❀

مہاراجہ رنجیت سنگھ اور انگریزوں سے تعلقات اور اس کے پنجاب کے سماج پر اثرات

اب تک جو کچھ بیان کیا گیا، اس کا تعلق براہِ راست مہاراجہ رنجیت سنگھ اور اُس کی قائم کردہ ریاست کے سیاسی و انتظامی نظام سے تھا۔ اس بحث سے قاری کو مہاراجہ رنجیت سنگھ کی شخصیت اور طرزِ حکمرانی کے حوالے سے ایک بنیادی فہم حاصل ہو چکی ہوگی۔ اسی دورانیے کا ایک اہم پہلو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے برطانوی استعمار کے ساتھ تعلقات کا بھی ہے۔ مہاراجہ نے انگریزوں کے ساتھ نہ صرف دوستانہ مراسم قائم رکھے بلکہ متعدد سیاسی معاہدات بھی کیے، جن کا بنیادی مقصد باہمی امن، سرحدی استحکام، اور تجارتی مفادات کا تحفظ تھا۔ ان تعلقات کا سب سے نمایاں نتیجہ یہ نکلا کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ اور انگریزوں کے درمیان براہِ راست کسی بھی نوع کی جنگ نہیں ہوئی۔ تاہم، تاریخی شواہد یہ بھی ظاہر کرتے ہیں کہ انھی معاہدات کی بدولت برطانوی حکومت کو مہاراجہ کی وفات (1839ء) کے بعد پنجاب میں مداخلت کا مؤثر موقع میسر آیا، جو بالآخر 1849ء میں پنجاب کی مکمل فتح پر منتج ہوا۔

قبل اس کے کہ ہم مہاراجہ رنجیت سنگھ کی وفات اور اس کے بعد کے سیاسی حالات کا تجزیہ کریں، ضروری ہے کہ ان معاہدات پر مختصراً روشنی ڈالی جائے جو مہاراجہ رنجیت سنگھ اور برطانوی حکومت کے درمیان طے پائے، تاکہ آئندہ پیش آمدہ تاریخی واقعات کا پس منظر واضح ہو سکے۔ اس موضوع پر کئی کتابوں میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ مجھے ایک جامع مضمون بی بی سی کی ویب سائٹ پر ملا، جسے صحافی اور محقق وقار مصطفیٰ نے لکھا ہے۔ میں نے درج ذیل تحریر اسی مضمون

کی مدد سے مرتب کی ہے۔[1]

جب پنجاب میں مہاراجہ رنجیت سنگھ گزشتہ آٹھ سو سال میں پہلے ہندوستانی حکمران کی حیثیت سے ہندوستان کے روایتی فاتحین پشتونوں (افغانوں) کی یلغار کو پسپا کرنے میں کامیاب ہوئے، تو اس کے بعد افغانستان کی جانب سے دوبارہ کوئی حملہ آور ہندوستان پر حملہ نہ کر سکا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ان غیر ملکی حملہ آوروں کو شکست دینے کے بعد مقامی علاقوں کو بھی زیرِ نگیں کیا۔

ان کی سلطنت شمال مغرب میں درۂ خیبر سے لے کر مشرق میں دریائے ستلج تک، اور برصغیر کی شمالی سرحد سے جنوب میں صحرائے تھر تک پھیلی ہوئی تھی۔ لاہور ان کا صدر مقام تھا۔ جب 27 جون 1839ء کو مہاراجہ رنجیت سنگھ کا انتقال ہوا تو سکھ ریاست کا رقبہ دو لاکھ مربع میل سے کچھ زیادہ تھا۔ اس کے پاس سکھوں، مسلمانوں اور ہندوؤں پر مشتمل تنخواہ دار، منظم اور یورپی جرنیلوں کی تربیت یافتہ ایک باقاعدہ فوج موجود تھی۔

مہاراجہ اور انگریزوں کے درمیان پہلا اہم معاہدہ 25 اپریل 1809ء کو ہوا، جسے ''معاہدۂ امرتسر'' کہا جاتا ہے۔ اس کے تحت انگریزوں نے ستمبر 1808ء تک مہاراجہ کے فتح کردہ علاقوں پر اس کی حاکمیت کو تسلیم کیا، جبکہ مہاراجہ نے خود کو دریائے ستلج کے دائیں کنارے تک محدود رکھنے کا وعدہ کیا۔ تاہم، اس کا مطلب یہ ہرگز نہ تھا کہ انگریز پنجاب سے لاتعلق ہو گئے تھے۔ درحقیقت، ایسٹ انڈیا کمپنی پنجاب پر قبضے کی خواہاں تھی، مگر وہ صرف مناسب وقت کی منتظر تھی۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ، انگریزوں سے تعلقات اور اس کے پنجاب کے سماج پر اثرات

مؤرخ ہری رام گپتا کے مطابق، انیسویں صدی کی دوسری دہائی میں برطانوی حکومت مشرق اور شمال مغرب دونوں سمتوں میں اپنی سلطنت کی توسیع کی منصوبہ بندی کر رہی تھی۔ شمال مغربی توسیع کے لیے 1828ء میں کلکتہ کے بعد شملہ کو دوسرا دارالحکومت بنایا گیا۔ اس اقدام سے یہ واضح ہو گیا

[1] https//:www.bbc.com/urdu/regional-59706981

کہ اب ان کی نظریں بنگال اور بہار کے بعد پنجاب پر مرکوز تھیں۔ اسی عرصے میں، اکتوبر 1831ء میں ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ ولیم بینٹک نے روپڑ میں مہاراجہ رنجیت سنگھ سے ملاقات کی۔ اسے سکھ ریاست کے ساتھ برطانوی حکومت کے دوستانہ تعلقات کا مظہر سمجھا جاتا ہے۔

لیکن حقیقت کچھ اور تھی۔ بظاہر دوستی کا مظاہرہ کیا گیا، مگر درحقیقت یہ ایک پیش رفت کی چال تھی۔

تاریخ کے استاد کرنیل سنگھ لکھتے ہیں کہ:

''روپڑ میں ہونے والے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے انگریزوں نے 1832ء میں سندھ کے امیروں کے ساتھ جہازرانی کا تجارتی معاہدہ کیا۔ یہ پہلی خلاف ورزی تھی، جو دراصل 1843ء میں سندھ کی فتح کے لیے ایک بہانہ ثابت ہوئی۔'' اسی نوعیت کا ایک اور واقعہ بھی پیش آیا۔ انگریزوں نے لاہور سے بمشکل چالیس میل کے فاصلے پر واقع قصبہ فیروزپور مہاراجہ رنجیت سنگھ کی عملداری میں تسلیم کیا تھا، لیکن 1835ء میں سردارنی لچھمن کور کی وفات کے بعد اس اہم قصبے پر قبضہ کرلیا اور اسے ایک چھاؤنی میں تبدیل کر دیا۔ یاد رہے کہ یہی وہ مقام تھا جہاں سے 1838ء میں انگریز فوج کو جمع کیا گیا، جس نے کابل پر حملہ کرنا تھا۔ مؤرخ ڈاکٹر گنڈا سنگھ اپنی کتاب پنجاب میں تحریکِ آزادی کی تاریخ میں بھی اس موضوع پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ان کے بقول، ایسی سازشوں اور دوغلے رویّے نے رنجیت سنگھ کے انگریزوں پر اعتماد کو متزلزل کر دیا تھا۔ انھوں نے دوٹوک انداز میں اپنی ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے ایک مسیحی مبلغ، ریورنڈ ڈاکٹر جوزف وولف سے کہا:

''آپ کہتے ہیں کہ آپ مذہب کی خاطر سفر کرتے ہیں؛ پھر آپ انگریزوں کو کیوں تبلیغ نہیں کرتے، جن کا کوئی مذہب ہی نہیں؟''

جب مبلغ نے موضوع کو سیاست سے ہٹا کر مذہب کی طرف موڑنے کی کوشش کی اور پوچھا کہ:

''کوئی خدا کے قریب کیسے آ سکتا ہے؟''

تو مہاراجہ نے طنزیہ انداز میں جواب دیا:

''برطانوی حکومت سے ویسا ہی اتحاد کر کے جیسا میں نے حال ہی میں روپڑ میں لارڈ نواب صاحب (گورنر جنرل) سے کیا تھا۔''

یوں، اگرچہ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے انگریزوں سے معاہدات کیے تھے، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ان پر سے ان کا اعتبار اٹھ گیا تھا۔

رنجیت سنگھ جب تک زندہ رہے، سکھ ریاست متحد اور مستحکم رہی۔ مگر ان کی وفات کے بعد ان کے جانشین ریاست سنبھالنے کی صلاحیت سے محروم تھے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بعد ان کی اہلیہ مہارانی دتار کور سے پیدا ہونے والے بیٹے اور ولی عہد، کھڑک سنگھ نے تخت سنبھالا۔ انھیں 20 جون 1839ء کو ولی عہد نامزد کیا گیا تھا، مگر وہ ایک بڑی ریاست کو چلانے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے۔ رنجیت سنگھ نے مرتے وقت وصیت کی تھی کہ وزارتِ عظمیٰ دھیان سنگھ ڈوگرا کو دی جائے، لیکن کھڑک سنگھ نے اپنے ایک قریبی دوست چیت سنگھ کو اپنا مقربِ خاص بنالیا اور ڈوگرا سرداروں دھیان سنگھ، سوچیت سنگھ، اور گلاب سنگھ کو نظر انداز کر دیا۔

میرے خیال میں یہ وہ وقت تھا جس نے سکھ ریاست کو تباہی کے دہانے پر پہنچا دیا اور انگریزوں کے لیے راہ ہموار کی۔ ڈوگرا سازشوں اور سیاسی چالوں کے ماہر تھے۔ خالصہ فوج ان کے اثر میں آ چکی تھی، لہٰذا انھوں نے سازشوں کا جال بچھا دیا۔ اس کے بعد مہاراجہ کے امراء اور شاہی خاندان میں پھوٹ پڑ گئی۔ اس تفصیل کا ذکر یہاں مناسب نہیں۔

کھڑک سنگھ کو ایک مکان میں عملاً نظر بند کر دیا گیا اور نونہال سنگھ کی حکومت کا اعلان کیا گیا۔ تاہم، حکومت کے تمام اختیارات وزیرِ اعظم دھیان سنگھ کے ہاتھ میں تھے اور نونہال صرف ایک کٹھ پتلی حکمران بن کر رہ گئے۔ اُن میں سیاسی تدبر اور حکمرانی کی صلاحیت کا فقدان تھا، اور سیر و شکار کے سوا کسی چیز میں دلچسپی نہ تھی۔ معزولی کے بعد کھڑک سنگھ تقریباً دس ماہ تک ایک حویلی میں نظر بند رہے۔ اُن کے بار بار بلانے پر نونہال سنگھ صرف ایک مرتبہ ان سے ملاقات کے لیے

آئے، لیکن گفتگو میں سخت بے ادبی کا مظاہرہ کیا۔ نونہال نے اپنے والد کو سکھ قوم کا غدار اور انگریزوں کا وفادار قرار دیا۔ بعض روایات کے مطابق، ایک حکیم، جوالا سنگھ، نے معزول مہاراجہ کو زہر دے دیا، جس کے باعث وہ پیٹ کی بیماریوں میں مبتلا ہو کر 5 نومبر 1840ء کو وفات پا گئے۔ یہ ایک الم ناک حقیقت ہے کہ اُسی روز، جب والد کا انتقال ہوا، بیٹا نونہال سنگھ قلعہ لاہور کی ایک دیوار گرنے سے زخمی ہوا اور جانبر نہ ہو سکا۔

کہا جاتا ہے کہ روشنائی دروازے کی پرانی اور خستہ حال عمارت نونہال سنگھ پر آ گری، جس کے ملبے تلے وہ اور اُدھم سنگھ (گلاب سنگھ کا بیٹا) دب گئے۔ اُدھم سنگھ موقع پر ہی جان بحق ہو گئے، مگر نونہال سنگھ نیم بے ہوش حالت میں زندہ تھے۔ وزیرِ اعظم دھیان سنگھ نے انھیں پالکی میں ڈال کر قلعہ منتقل کیا، جہاں حکیموں اور ویدوں نے بھرپور علاج کیا، لیکن اہلِ لاہور نے تیسرے روز اُن کی وفات کی خبر سنی۔

یہ بات آج تک واضح نہیں ہو سکی کہ یہ موت وزیرِ اعظم دھیان سنگھ کی کسی سازش کا نتیجہ تھی یا محض ایک اتفاقی حادثہ۔ ان واقعات نے ایک ایسی سلطنت کو مزید دھچکا پہنچایا جو پہلے ہی داخلی انتشار کا شکار تھی۔ نونہال سنگھ کی کوئی اولاد نہ تھی۔ ان کی والدہ، چاند کور، نے افواہ پھیلائی کہ اُن کی بہو صاحب کور المعروف بی بی نانکی امید سے ہیں، اور آنے والے بچے کے نام پر خود اقتدار سنبھال لیا۔ انھوں نے اپنے لیے ''ملکہ مقدس'' کا لقب اختیار کیا۔ دوسری طرف، مہاراجہ رنجیت سنگھ کے سب سے کم عمر بیٹے، دلیپ سنگھ، کو راجہ نامزد کر دیا گیا۔ اس کے بعد ریاست میں اقتدار کی کشمکش اور خانہ جنگی کا آغاز ہوا، جس کی تفصیل سید محمد لطیف نے بھی بیان کی ہے۔ دلیپ سنگھ سکھ سلطنت کے آخری مہاراجہ ثابت ہوئے۔ اس وقت تک خالصہ فوج بہت طاقتور ہو چکی تھی، اور اُس کے افسروں و جرنیلوں کے سامنے کسی بھی قسم کی مخالفت کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔

وٹو اپنی کتاب چراگاہوں سے چاہوں تک میں لکھتے ہیں کہ رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد پیدا ہونے والی افراتفری اور سازشوں کے ماحول میں خالصہ فوج نے بہت سی طاقت حاصل کر لی اور سیاسی معاملات میں مداخلت شروع کر دی۔ اس مقصد کے لیے اس نے پانچ افراد پر مشتمل

ایک پنچایت تشکیل دی۔ پنچایت کی مخالفت کرنے پر دلیپ سنگھ کے وزیر، ہیرا سنگھ، کو قتل کر دیا گیا اور اُن کی جگہ جواہر سنگھ کو وزیر مقرر کیا گیا۔ امر پال سنگھ لکھتے ہیں کہ رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد، نہ صرف انتشار پھیلتا گیا بلکہ خالصہ فوج کا اثر ورسوخ بھی بڑھتا گیا، اور اقتدار پُرتشدد طریقوں سے ایک سے دوسرے کے ہاتھوں منتقل ہوتا رہا۔ ہر حکمران فوج کی حمایت حاصل کرنے کے لیے رشوت دیتا، لیکن اگر کوئی دوسرا زیادہ مراعات دینے کا وعدہ کرتا، تو پہلا ہٹا دیا جاتا۔ پھر وہی کچھ ہوتا رہا جو پہلے ہو چکا تھا۔

1844ء میں ایک تجربہ کار انگریز جرنیل، سر ہنری ہارڈنج، کو گورنر جنرل مقرر کیا گیا۔ جنگ سے پہلے اگلے 16 ماہ کے دوران انھوں نے پنجاب کی سرحد پر افواج اور اسلحے کی تیاری میں اضافہ کیا۔ اُس وقت انگریزوں کے کمانڈر اِن چیف، سر ہیوگف، تھے۔ اس کے بعد انگریزوں اور سکھوں کے درمیان براہِ راست جنگوں کا آغاز ہوا۔ کئی بڑی اور چھوٹی لڑائیوں کے بعد، بالآخر 31 مارچ 1849ء کو ایک حکم نامے کے تحت پنجاب کا علاقہ باقاعدہ طور پر انگریزوں کے قبضے میں آ گیا۔

سکھوں اور انگریزوں کے درمیان ہونے والی ان جنگوں کو اینگلو-سکھ جنگیں کہا جاتا ہے۔ ان جنگوں میں ایک طرف انگریز تھے اور دوسری طرف سکھ۔ یہاں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب سکھ کل آبادی کا صرف پندرہ فیصد تھے، جبکہ ہندو تقریباً تیس فیصد اور مسلمان پچاس فیصد سے زیادہ تھے، تو پھر ان جنگوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا کیا کردار تھا؟

یہ ایک نہایت اہم سوال ہے جس پر میں گفتگو کرنے کی کوشش کروں گا۔ جن موضوعات پر میں نے لکھنے کا ارادہ کیا ہے، اُن میں یہ موضوع بھی شامل ہے۔ تاہم، پہلے اینگلو-سکھ جنگوں کا مختصر تذکرہ ضروری ہے، کیونکہ یہ پنجاب کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ ان جنگوں کی تفصیلات بیان کرنا میرا مقصد نہیں، بلکہ ان کی وجوہات اور اثرات پر روشنی ڈالنا میرا مدعا ہے۔

اینگلو-سکھ جنگیں: اسباب، نتائج اور اثرات

پنجاب کی تاریخ کے وہ اہم ترین واقعات جنھوں نے یہاں کے سماج پر گہرا اور دیرپا اثر چھوڑا، اُن میں اینگلو-سکھ جنگیں نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔ ان جنگوں کے نتیجے میں پنجاب کی

حکمرانی کا نقشہ تبدیل ہوا، اور وہ وقت بھی آیا جب سکھ سپاہی انگریز فوج میں شامل ہو کر اپنے ہی ہم وطنوں پر گولیاں برسانے لگے۔ مقامی تعلیم یافتہ طبقہ انگریزوں کی انتظامیہ کا حصہ بن گیا اور آزادی کے متوالوں کو تختۂ دار تک پہنچانے میں کردار ادا کرتا رہا۔ یہ سب کیسے ہوا؟ یہ ایک دلچسپ مگر تلخ تاریخی داستان ہے۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مطابق، اینگلو-سکھ جنگیں دو بڑی جنگوں پر مشتمل تھیں: 46-1845 اور 49-1848، جو سکھ سلطنت اور برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے مابین لڑی گئیں۔ ان کے نتیجے میں شمال مغربی ہندوستان کا علاقہ پنجاب برطانوی سلطنت کا حصہ بنا۔

پہلی سکھ جنگ اس وقت شروع ہوئی جب سکھ دربار اور انگریز حکومت کے درمیان بداعتمادی اپنے عروج پر پہنچ گئی، اور سکھ فوج کے اندر بے چینی و خلفشار پھیلنے لگا۔ پنجاب میں سکھ ریاست کی بنیاد مہاراجہ رنجیت سنگھ نے رکھی تھی، جنھوں نے 1801 سے 1839ء تک حکومت کی۔ لیکن ان کی وفات کے بعد صرف چھ برس میں ریاست میں انارکی، سازشوں اور سیاسی قتل و غارت نے نظامِ حکومت کو مفلوج کر دیا۔ 1843ء تک ایک کمسن شہزادہ (دلیپ سنگھ) تخت نشین تھا اور اس کی والدہ ملکہ چاند کور نائب السلطنت کے طور پر حکومت چلا رہی تھیں۔ دربار اور خالصہ فوج کے درمیان کشمکش شروع ہو چکی تھی۔

انگریزوں کے ساتھ تعلقات پہلے ہی کشیدہ تھے، خاص طور پر جب پہلی اینگلو-افغان جنگ (42-1838) کے دوران سکھوں نے آغاز میں برطانوی افواج کو اپنی ریاستی حدود سے گزرنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا۔ بعد میں جنوبی پنجاب سے گزرنے کی اجازت دے دی تھی۔ دسمبر 1845ء میں سکھوں نے برطانوی حملے کو روکنے کے نام پر دریائے ستلج عبور کر کے حملہ کیا، جس کے بعد مشرقی پنجاب میں کئی خونی جنگیں ہوئیں جن میں سکھوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

برطانویوں نے سکھ دربار سے تعلقات بحال کرتے ہوئے ستلج کے مشرقی علاقے، نیز ستلج اور بیاس کے درمیانی خطے کو سکھوں سے چھین لیا۔ کشمیر اور جموں کو سکھ سلطنت سے جدا کر دیا گیا۔

سکھ فوج کو محدود کر کے 20,000 پیادہ اور 12,000 سوار تک محدود کر دیا گیا۔ لاہور میں ایک برطانوی ریزیڈنٹ تعینات ہوا اور برطانوی افواج کو شہر میں قیام کی اجازت مل گئی، یوں ایک بالواسطہ قبضے کی بنیاد رکھی گئی۔

اپریل 1848ء میں ملتان کے گورنر، دیوان مولراج کی بغاوت سے دوسری اینگلو-سکھ جنگ کا آغاز ہوا۔ سکھ فوج نے بغاوت کی حمایت کی۔ رام نگر (22 نومبر) اور چلیانوالہ (13 جنوری 1849ء) میں شدید جنگیں ہوئیں جن کا کوئی واضح نتیجہ نہ نکلا۔ بالآخر 21 فروری کو گجرات کے مقام پر فیصلہ کن معرکہ ہوا، جہاں سکھوں کو مکمل شکست ہوئی۔ 12 مارچ کو سکھ فوج نے ہتھیار ڈال دیے اور 31 مارچ 1849ء کو پنجاب کو باقاعدہ طور پر برطانوی سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔ یوں ایک مضبوط اور منظم سکھ ریاست کا خاتمہ ہو گیا۔ سید محمد لطیف نے اپنی تصنیف میں لکھا ہے کہ یہ جنگ سکھوں کی طرف سے شروع کی گئی تھی، اور انھیں اس کے سنگین نتائج کا اندازہ نہ تھا۔

سکھ مذہب اور تاریخ پر میری نظر سے جتنی بھی کتب گزری ہیں، ان میں سب سے جامع، معتبر اور تحقیقی کتاب Sikh: History, Concepts ہے، جسے کئی ممتاز سکھ محققین نے مشترکہ طور پر تحریر کیا ہے۔ اس میں سکھ مذہب، تاریخ، سماجی اور سیاسی امور پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کتاب میں کرنیل سنگھ کا تحریر کردہ مضمون اینگلو-سکھ جنگیں نہایت معلوماتی ہے، جس سے اس تحریر میں خاص طور پر استفادہ کیا گیا ہے۔

کرنیل سنگھ لکھتے ہیں کہ 1820ء میں ناگپور کے بھونسلے راجہ، پھر نیپال اور بعد ازاں بھرت پور کے مہاراجہ نے مہاراجہ رنجیت سنگھ سے عسکری تعاون کی درخواست کی، لیکن انھوں نے ''معاہدۂ امرتسر'' کی پاسداری کو اپنا اخلاقی و سیاسی فریضہ سمجھتے ہوئے یہ تمام درخواستیں شائستگی سے مسترد کر دیں۔ اس کے برعکس، انگریزوں نے معاہدے کی پاسداری میں ہمیشہ بددیانتی برتی۔ ان کے نزدیک سکھوں سے تعلقات محض وقتی ضرورت اور سیاسی چال تھی۔ جب تک ان کے قدم ہندوستان میں مضبوط نہ ہو گئے، انھوں نے سکھوں سے ظاہری دوستی قائم رکھی۔ مگر جیسے ہی حالات سازگار ہوئے، انھوں نے اپنی توجہ پنجاب کی طرف مبذول کر لی۔ وہ سمجھ چکے تھے کہ

رنجیت سنگھ کے بعد ریاست کا کوئی بھی وارث سکھ سلطنت کو سنبھالنے کے قابل نہ ہوگا۔ یہی سوچ انھیں دریائے ستلج کے پار لے گئی، اور یوں سکھوں اور انگریزوں کے درمیان براہِ راست جنگوں کا آغاز ہوا۔

لاہور: سکھ ریاست پر برطانوی حملے کی وجوہات

میں نے جتنا بھی انگریزوں کی ہندوستان میں آمد اور ان کی حکومت سے متعلق مطالعہ کیا ہے، اس سے ایک بات واضح ہوتی ہے کہ برطانوی ابتدا ہی سے ہندوستان کی سرحد کو افغانستان تک توسیع دینا چاہتے تھے۔ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ افغانستان میں ان کا ہم خیال فرد تخت نشین ہو۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انھیں سب سے پہلے پنجاب کو فتح کرنا تھا، پھر اس کے بعد پشاور کو، جہاں اُس وقت سکھوں کی حکومت قائم تھی۔

اس لیے میرے نزدیک برطانوی حملے کے درج ذیل اسباب ہو سکتے ہیں:

1-سکھ ریاست کی جغرافیائی اور سیاسی اہمیت: مراٹھوں کی شکست اور ہندوستان کے وسیع علاقوں پر قبضے کے بعد، برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی نے شمالی و مغربی علاقوں پر بھی اپنا تسلط قائم کرنے کا منصوبہ بنایا۔ مگر ان کے سامنے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی قیادت میں قائم سکھ سلطنت شمالی ہندوستان کی واحد بڑی خود مختار طاقت تھی جو برطانوی مفادات اور وسطی ایشیا کے درمیان حائل تھی۔ جیسے ہی مہاراجہ رنجیت سنگھ کا انتقال ہوا، سکھ دربار میں سیاسی انتشار، درباری سازشوں اور جانشینی کے جھگڑوں نے ریاست کو کمزور کر دیا۔ یہ صورتِ حال برطانوی مفاد کے عین مطابق تھی، اور انھوں نے اس موقع کو ضائع نہیں ہونے دیا۔

2-خالصہ فوج کی طاقت اور برطانوی خوف: سکھ خالصہ فوج شمالی ہندوستان کی سب سے منظم اور جدید افواج میں شمار ہوتی تھی۔ برطانوی حکام کو یہ خدشہ تھا کہ مستقبل میں یہی فوج شمال مغربی علاقوں میں ان کے اقتدار کے لیے خطرہ بن سکتی ہے۔ چنانچہ وہ کسی بھی ممکنہ مزاحمت سے پہلے سکھ عسکری طاقت کو کمزور یا ختم کرنا چاہتے تھے۔ اس کا مظاہرہ وہ پہلے ہی پشاور پر سکھ قبضے کی

صورت میں دیکھ چکے تھے۔

3- لاہور کی جغرافیائی اہمیت: یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ لاہور پر قبضہ دراصل پنجاب پر قبضے کے مترادف تھا۔ اپنی جغرافیائی حیثیت کے باعث برطانوی اسے اپنے شمال مغربی مفادات کے تحفظ کے لیے ضروری سمجھتے تھے، کیونکہ یہ علاقہ افغانستان اور وسطی ایشیا کے سنگم پر واقع تھا۔

4- معاہدۂ امرتسر کی خلاف ورزی: رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد معاہدہ امرتسر پر عمل درآمد میں دشواریاں پیش آنے لگیں۔ برطانوی حکومت نے اس معاہدے کی روح کے برخلاف پنجاب کے داخلی معاملات میں مداخلت شروع کر دی، جس سے دونوں طاقتوں کے درمیان تعلقات بگڑ گئے۔ اس کا نتیجہ پہلی اینگلو-سکھ جنگ (1845–46) اور بالآخر لاہور پر برطانوی قبضے کی صورت میں سامنے آیا۔

5- مقامی مسلمانوں کی ناراضی اور حمایت: اس وقت پنجاب کے مسلمان، سکھ حکمرانوں کی جابرانہ پالیسیوں سے سخت نالاں تھے۔ رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد امن وامان کی صورتحال مزید بگڑ گئی۔ برطانوی حکام نے مقامی مسلمانوں کی اس ناراضی کو اپنے حق میں استعمال کرنے کی خفیہ کوششیں کیں۔

6- سیاسی خلا اور قیادت کا فقدان: رنجیت سنگھ کے انتقال کے بعد پنجاب میں ایسی کوئی مضبوط قیادت باقی نہ رہی جو سکھ سلطنت کو متحد رکھ سکتی۔ مغل سلطنت زوال پذیر ہو چکی تھی، احمد شاہ ابدالی کے جانشین پشاور سے بے دخل کر دیے گئے تھے، کشمیر میں ایک کمزور راجہ حکمران تھا، اور نوابِ ملتان بھی مارے جا چکے تھے۔ اس سیاسی خلا کو انگریزوں نے ایک موقع کے طور پر لیا۔

یہ درست ہے کہ سندھ پر قبضے کے بعد برطانوی سرگرمیوں کا بظاہر مقصد روس کے ممکنہ خطرے کا سدِ باب تھا، لیکن اس حقیقت سے چشم پوشی ممکن نہیں کہ ان کے کئی اقدامات براہِ راست پنجاب کی سکھ ریاست کو کمزور کرنے کے لیے تھے۔ افغانستان میں تجارتی رسوخ بڑھا کر، وہ ایک مؤثر بفرزون قائم کرنا چاہتے تھے، جو نہ صرف روس بلکہ سکھ طاقت کے خلاف بھی استعمال ہو سکتا۔

1830ء کی دہائی میں جب کابل میں ایک روسی ایجنٹ کا خیرمقدم کیا گیا، تو کلکتہ میں برطانوی حکام میں شدید تشویش پیدا ہوئی۔اس صورت حال کو اُس وقت مزید سنگین بنادیا گیا جب پشاور کے نواح میں سکھ افواج کی متواتر کامیابیوں نے حکومتِ برطانیہ کو فوری اور فیصلہ کن اقدامات پر مجبور کردیا۔اگرچہ رنجیت سنگھ کے دور میں سکھ سلطنت اور برطانیہ کے درمیان براہِ راست دشمنی کا کوئی امکان نہ تھا، تاہم ایسٹ انڈیا کمپنی رنجیت سنگھ کے بعد آنے والی قیادت پر کسی صورت اعتماد کرنے کو تیار نہ تھی۔یہی عدم اعتماد برطانوی خارجہ پالیسی کی بنیاد بن گیا، جس نے پنجاب کے سیاسی مستقبل پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

ان تمام نکات کو مدِنظر رکھتے ہوئے، میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ انگریزوں نے سکھ ریاست یا لاہور پر اس لیے حملہ نہیں کیا کہ سکھ کوئی فوری خطرہ تھے، بلکہ اس لیے کہ وہ ایک کمزور ہوتی ہوئی ریاست کو ختم کر کے اپنی توسیع پسندانہ حکمت عملی کے تحت ہندوستان میں اپنے مفادات کو محفوظ بنانا چاہتے تھے۔

یہ حملہ ایک سوچا سمجھا، مکمل طور پر منصوبہ بند اقدام تھا محض دفاعی تدبیر ہرگز نہ تھا۔

یہ سب کچھ برطانوی ''فارورڈ پالیسی'' کا حصہ تھا!

❁ ❁ ❁

سکھوں اور انگریزوں کے درمیان آخری جنگیں

چیلیانوالہ اور گجرات

کوئی دو ماہ کے وقفے سے سکھوں اور انگریزوں کے درمیان آخری دو جنگیں ہوئیں۔ پہلی جنگ ''چیلیانوالہ کی جنگ''(Battle of Chillianwala) 13 جنوری 1849ء کو لڑی گئی، اور اس کے بعد گجرات کے مقام پر چناب کے کنارے ایک اور جنگ 21 فروری کو ہوئی، جو اسی سلسلے کا حصہ سمجھی جاتی ہے۔ یہ جنگ دراصل سکھوں اور انگریزوں کے درمیان آخری معرکہ تھا۔ اس جنگ کے بارے میں بی بی سی پر وقار مصطفیٰ کا ایک مضمون موجود ہے، جس کا عنوان ہے:

'چیلیاں والا' کی غیر فیصلہ کُن لیکن خونیں جنگ: برطانوی قبضے کے خلاف پنجاب کی آخری مزاحمت، جس میں انگریز فوج سکھ توپوں کا شکار ہوئی۔

اگرچہ اس جنگ کی مکمل تفصیل یہاں موضوع نہیں، تاہم اس کا مختصر ذکر مناسب ہوگا۔

اس جنگ میں سکھ فوج کی قیادت جنرل شیر سنگھ اٹاری والا کے پاس تھی، جبکہ برطانوی فوج کی کمان جنرل سر ہیو گف (Sir Hugh Gough) کے سپرد تھی۔ یہ جنگ نہایت خونریز اور بے ترتیب ثابت ہوئی۔ سکھ فوج نے شجاعت اور منظم مزاحمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے برطانوی فوج کو بھاری جانی نقصان پہنچایا۔ حتیٰ کہ برطانوی سپاہ کی کئی توپیں بھی سکھوں کے قبضے میں آ گئیں۔ اگرچہ جنگ کا کوئی واضح فیصلہ سامنے نہ آیا، لیکن برطانوی فوج کا مورال بری طرح متاثر ہوا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ چیلیانوالہ کی جنگ میں سکھوں نے انگریزوں کو شدید نقصان پہنچایا، لیکن بالآخر مارچ 1849ء میں گجرات کی جنگ (Battle of Gujrat) میں سکھ فوج کو فیصلہ کن شکست ہوئی۔ 12 مارچ 1849ء کو سکھ سلطنت کو باضابطہ طور پر ختم کر کے پنجاب کو برطانوی ہندوستان میں شامل کر دیا گیا۔ یوں تقریباً پچاس سال تک ایک مقامی حکمران کے زیرِ اقتدار

رہنے والا پنجاب، ایک غیر ملکی سامراج کے قبضے میں آ گیا (مجھے چیلیانوالہ کا وہ میدان دیکھنے کا موقع ملا، جہاں یہ جنگ لڑی گئی)۔

گجرات کی شکست کے بعد سکھ فوج نے پسپائی اختیار کی اور ہتھیار ڈال دیے۔ جنرل شیر سنگھ اور دیگر جرنیل گرفتار کر لیے گئے۔ سکھ مہاراجہ دلیپ سنگھ، جو اس وقت کم عمر لڑکا تھا، کو معزول کر کے انگلستان بھیج دیا گیا۔ مشہور کوہِ نور ہیرا بھی انگریزوں کے قبضے میں چلا گیا۔ جنگِ گجرات وہ معرکہ تھا جس کے بعد سکھ سلطنت ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ یہ ''فارورڈ پالیسی'' کا کامیاب اختتام تھا، اور پنجاب برطانوی ہند کا حصہ بن گیا۔ بی بی سی کے مطابق اگلے ماہ دریائے سواں کے بائیں کنارے پر جنرل شیر سنگھ، چتر سنگھ، دیگر سکھ سرداروں اور افسران نے باضابطہ طور پر ہتھیار ڈال دیے۔ اس موقع پر 17 توپیں اور ہزاروں ہتھیار انگریزوں کے سپرد کیے گئے۔ دو روز بعد شیر سنگھ کی فوج کے سپاہی بٹالین کی صورت میں ایک میدان سے گزرے اور ہر سپاہی نے اپنے ہتھیار زمین پر رکھتے ہوئے آنکھوں میں آنسو بھر لیے۔

مجموعی طور پر تقریباً 20,000 بندوقیں اور 41 توپیں برطانویوں کو حوالے کی گئیں۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کے لائق ہے کہ گجرات کی جنگ کے بعد شیر سنگھ دریائے جہلم عبور کر کے دریائے سواں تک پہنچا، جہاں اُس نے انگریز جنرل کے سامنے ہتھیار ڈالے۔ روایت ہے کہ اس موقع پر ایک سکھ سپاہی نے باآوازِ بلند کہا:

''آج مہاراجہ رنجیت سنگھ مر گیا!''

تمام سرداروں اور افسران کو جنگی قیدی بنایا گیا، جبکہ سپاہیوں کو ایک روپیہ دے کر اپنے اپنے گاؤں لوٹنے کی اجازت دی گئی۔ چتر سنگھ اور شیر سنگھ کو دیگر قیدیوں کے ساتھ فتح گڑھ میں قید کیا گیا۔ کچھ عرصے بعد انھیں ضمانت پر رہا کیا گیا، لیکن سورج گرہن کے موقع پر برہمنوں کو کھانا کھلانے کو لاہور کی برطانوی انتظامیہ نے ضمانت کی خلاف ورزی تصور کیا اور انھیں دوبارہ گرفتار کر کے جلاوطن کر دیا گیا۔ دونوں باپ بیٹا 1848ء میں جلاوطنی کے دوران انتقال کر گئے۔

یوں ایک ایسا دور، جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کی تخت نشینی سے شروع ہوا تھا، سکھ فوج کی توہین

آمیز انداز میں ہتھیار ڈالنے پر ختم ہوا۔

میرے نزدیک، اس انجام کی بنیادی وجہ پنجاب کے عوام میں اتحاد کا فقدان تھا۔ اگر اس وقت اتحاد ہوتا، تو شاید یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔

بقول شاہ محمد (شاہ نامہ):

''جیہڑے خالصے نے تیغاں موڑیاں نیں،

شاہ محمداں، اک سرکار باجوں،

فوجاں جت کے انّت نوں ہاریاں نیں۔''

اس جنگ بارے ایک انگریز George Meredith کی ایک نظم پڑھنے کو ملی۔

Chillianwallah, Chillianwallah!
When the night set in with rain,
Came the savage plundering devils
To their work among the slain
And the wounded and the dying
In cold blood did share the doom
Of their comrades round them lying,
Stiff in, the dead skyless gloom.

لاہور پر برطانوی قبضہ: سیاسی، فوجی اور داخلی عوامل کا تنقیدی جائزہ

جب لاہور پر انگریزوں کا قبضہ مکمل ہوا، تو اُس وقت کی صورتِ حال کئی پہلوؤں سے نہایت پیچیدہ اور متضاد مفادات سے بھرپور تھی۔ ایک طرف خالصہ فوج تھی، جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی افواج سے برسرِ پیکار تھی، تو دوسری جانب سکھ دربار خود انگریزوں سے مفاہمت کے امکانات تلاش کر رہا تھا۔ سوال یہ ہے کہ ایسا کیونکر ممکن ہوا؟ کس طرح برطانوی سلطنت، جو اس خطے میں ایک بیرونی طاقت تھی، پنجاب جیسے وسیع اور عسکری طور پر مستحکم خطے پر نسبتاً آسانی سے قابض ہوگئی؟

اس موضوع پر ممتاز مؤرخ سید محمد لطیف نے اپنی تصنیف تاریخِ لاہور میں نہایت وقیع

تجزیہ پیش کیا ہے۔ کرنل سنگھ کے مضامین، اور امر پال سنگھ کی تصانیف خصوصاً پہلی اور دوسری اینگلو-سکھ جنگوں پر مبنی کتب بھی اس سلسلے میں نہایت مفید ثابت ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں، رچرڈ گاٹ کی تصنیف "Britain's Empire: Resistance, Repression and Revolt" اور آیان ٹالبوٹ و طاہر کامران کی مشترکہ تحریر "Colonial Lahore: A History of the City and Beyond" بھی اس موضوع کے تفہیمی پس منظر میں قابلِ قدر اضافہ کرتی ہیں۔

میری اس تحقیق کا بڑا انحصار Lotus Arise کے مضمون "British Conquest of Punjab (1849)" پر رہا ہے، البتہ دیگر ذرائع سے بھی تقابلی جائزہ اور تصدیق کی گئی ہے۔

جغرافیائی خطرات اور سفارتی حکمتِ عملی: رنجیت سنگھ کا ابتدائی رویّہ

جیسا کہ پیشتر ذکر ہو چکا ہے، 1808ء کے وسط تک برطانوی حلقوں میں یہ شدید اندیشہ پایا جاتا تھا کہ فرانس، روس اور ایران کی مدد سے شمال مغربی سرحد کے راستے ہندوستان پر حملہ آور ہو سکتا ہے۔ اس ممکنہ خطرے کے پیشِ نظر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے لیے ناگزیر ہو گیا تھا کہ وہ برطانیہ سے دوستانہ تعلقات قائم رکھے، تاکہ ایسی کسی فرانسیسی یلغار کی صورت میں مؤثر دفاعی بندوبست کیا جا سکے۔

تاہم، 1809ء میں ایران اور برطانیہ کے مابین "معاہدۂ تہران" طے پایا، جس کے بعد فرانسیسی خطرہ وقتی طور پر ختم ہو گیا۔ اس سفارتی تبدیلی کے فوراً بعد برطانوی پالیسی میں بھی واضح تبدیلی آ گئی، اور اسی سال مہاراجہ رنجیت سنگھ سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ ستلج کے مشرقی جانب واقع خالی کر دے۔ رنجیت سنگھ نے برطانوی عسکری برتری کو تسلیم کرتے ہوئے ان ریاستوں پر اپنا دعویٰ واپس لے لیا، اور یوں وہ علاقے برطانوی حلیف ریاستیں قرار پائیں۔

❀ ❀ ❀

معاہدہ امرتسر

دوستی کی بنیاد یا مستقبل کی غلامی کا آغاز؟

1809ء ہی میں طے پانے والے معاہدۂ امرتسر کے مطابق، دریا ستلج کو سکھ سلطنت اور برطانوی اثر ورسوخ کے مابین سرحد قرار دیا گیا۔ اگرچہ یہ معاہدہ رنجیت سنگھ کو مشرقی پنجاب میں توسیع سے روک دیتا تھا، لیکن مغربی محاذ، مثلاً کشمیر، ملتان اور پشاور، پر فتوحات کی راہ کھلی رہتی تھی۔ برطانیہ کو رنجیت سنگھ کی حمایت حاصل ہوئی، اور شمال مغربی سرحد کو محفوظ تصور کیا جانے لگا۔

سکھ سلطنت کا انحطاط: داخلی خلفشار اور فوجی بغاوت

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی وفات (جون 1839ء) کے بعد سکھ سلطنت تیزی سے انتشار کا شکار ہوگئی۔ ایک طرف ایک وسیع و عریض مملکت تھی، تو دوسری جانب اس کی محافظ خالصہ فوج، جو اپنی تعداد اور وسائل کے لحاظ سے خود ریاست کے لیے بوجھ بنتی جا رہی تھی۔ جب فوج کے اخراجات پورے نہ ہو سکے تو وہ بے قابو ہوگئی اور دربار کی سیاست میں مداخلت کرنے لگی۔ تخت پر نابالغ دلیپ سنگھ کی تقرری اور رانی جنداں کی سرپرستی نے سیاسی پیچیدگیاں مزید بڑھا دیں۔

ادھر انگریز بھی 1839ء میں افغانستان کی پہلی جنگ میں شکست کھا چکے تھے۔ کابل اور جلال آباد میں ان کی افواج کی تباہی نے ان کی ساکھ کو بری طرح مجروح کیا۔ سندھ (1843ء) پر قبضہ کر کے انگریز اس نقصان کی تلافی چاہتے تھے، لیکن اس اقدام نے پنجاب میں ان کے عزائم پر شکوک پیدا کیے۔ اسی سال میجر براڈفٹ کو لاہور میں سیاسی ایجنٹ مقرر کیا گیا، جس نے سکھ دربار کی بدانتظامی کو مبالغے سے پیش کیا۔

پہلی اینگلو-سکھ جنگ (1845-46): سازش، غداری اور شکست: خالصہ فوج نے 11 دسمبر 1845ء کو ستلج عبور کر کے جنگ کا آغاز کیا۔ اس جنگ کے دوران پانچ بڑی لڑائیاں ہوئیں: مدکی، فیروز شاہ، بدراوَل، علی وال اور سبراں۔ 10 فروری 1846ء کو سبراں کی جنگ میں لال سنگھ اور تیجا سنگھ کی غداری کے نتیجے میں انگریزوں کو فیصلہ کن کامیابی حاصل ہوئی، اور لاہور پر قبضہ کر لیا گیا۔ معاہدۂ لاہور (9 مارچ 1846ء) کے مطابق ستلج کے جنوب کے تمام علاقے انگریزوں کے حوالے کر دیے گئے، اور سکھوں پر ڈیڑھ کروڑ روپے کا تاوان جنگ عائد کیا گیا۔ چونکہ یہ رقم ادا نہ کی جا سکی، اس لیے کشمیر اور ہزارہ کے علاقے انگریزوں کو دے دیے گئے۔ بعد ازاں معاہدۂ امرتسر (16 مارچ 1846ء) کے تحت راجہ گلاب سنگھ نے 75 لاکھ روپے ادا کر کے کشمیر کو خریدا، اور یوں ڈوگرہ حکومت کا آغاز ہوا۔

1846ء کے اختتام پر معاہدہ بھیروال کے تحت رانی جنداں کو لاہور دربار سے علیحدہ کر کے شیخوپورہ اور بعد ازاں بنارس بھیج دیا گیا۔ ریاستی امور کی نگرانی کے لیے ایک کونسل قائم کی گئی، جس کا صدر انگریز ریذیڈنٹ تھا۔ عملی طور پر پنجاب ایک برطانوی ریاست بن چکا تھا، گو کہ رسمی الحاق ابھی باقی تھا۔

دوسری اینگلو-سکھ جنگ (1848-49): برطانوی تسلط کی تکمیل: 1848ء میں دوسری اینگلو-سکھ جنگ شروع ہوئی، جس کی تفصیل پہلے بیان کی جا چکی ہے۔ اس جنگ کے اختتام پر، 29 مارچ 1849ء کو پنجاب کو باقاعدہ طور پر برطانوی سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔ دلیپ سنگھ کو انگلستان روانہ کر دیا گیا جہاں اس نے عیسائیت قبول کی، البتہ بعد میں دوبارہ سکھ مذہب اختیار کیا۔ کوہِ نور ہیرے کو برطانوی شاہی تاج کا حصہ بنا دیا گیا۔

پنجاب کے نظم و نسق کے لیے 1849ء میں بورڈ آف ایڈمنسٹریشن تشکیل دیا گیا، جو 1853ء میں چیف کمشنر کے عہدے سے تبدیل ہوا، اور بالآخر 1859ء میں لیفٹیننٹ گورنر کا عہدہ قائم کیا گیا۔ اس انتظامی ڈھانچے میں لارنس برادران کا کردار نمایاں رہا۔ جان لارنس اور ہنری لارنس، دونوں اس دوران پنجاب کی بیوروکریسی میں کلیدی مناصب پر فائز رہے۔ لاہور کا لارنس

گارڈن (موجودہ جناح باغ) ان کی یادگار ہے۔

اس تمام عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک منظم، خودمختار اور ثقافتی طور پر زرخیز خطہ پنجاب داخلی کمزوریوں، قیادت کی نااہلی، فوجی مداخلت، اور برطانوی سامراجی حکمتِ عملی کے نتیجے میں ایک بار پھر سامراجی غلامی کی زنجیروں میں جکڑا گیا۔

اس تاریخی لمحے کی عکاسی شاعر شاہ محمد یوں کرتے ہیں:

''رنجیت سنگھ دی رہ گئی خالی کرسی

ایس ملک تے پھر آئی فرنگی ورسی''

یہاں ایک سوال پھر سے ذہن میں اُٹھ رہا ہے کہ جب انگریزوں نے پنجاب پر قبضے کی خاطر سکھوں سے کئی بار جنگ کی، تو یہاں کی مسلمان اشرافیہ نے سکھوں کی بجائے انگریزوں کا ساتھ کیوں دیا؟ یا خاموشی کیوں اختیار کی؟

قدیم برطانوی گزٹوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انیسویں صدی کے اوائل میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زیرِ نگیں آنے والے مسلمان قبائل خاص طور پر بھٹی، تارڑ اور چٹھہ برادریاں اپنی سابقہ شکستوں کا بدلہ لینے کے لیے بےتاب تھیں۔ ان قبائل کا تعلق وزیرآباد اور حافظ آباد کے علاقوں سے تھا اور وہ انگریزوں کی آمد کو اپنی کھوئی ہوئی طاقت اور حیثیت کی بحالی کا ایک موقع تصور کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان قبائل نے نہ صرف انگریزوں کے ساتھ وفاداری کا اعلان کیا بلکہ فوجی اور عسکری سطح پر بھرپور تعاون بھی فراہم کیا۔ یہ قبائل برطانوی لشکر کے لیے رسد مہیا کرنے، دشمن کی نقل و حرکت کی اطلاع دینے، اور میدانِ جنگ میں شرکت جیسے اقدامات میں پیش پیش رہے۔ ان کی معاونت خاص طور پر رام نگر، چلیانوالہ اور گجرات کی لڑائیوں میں نمایاں رہی، جہاں انھوں نے انگریز فوج کے ہمراہ سکھ افواج کے خلاف صف آرا ہو کر عملی حصہ لیا۔

1849ء میں پنجاب کا برطانوی سلطنت میں الحاق، جہاں ایک طرف سکھ سلطنت اور اس سے وابستہ اشرافیہ کی مکمل زوال پذیری یا عارضی معدومی کا باعث بنا، وہیں اسے عوام کی ایک بڑی اکثریت بالخصوص زرعی طبقات کی جانب سے خیر مقدم بھی حاصل ہوا۔ یہ عوامی پذیرائی سکھ دور

کے جبر و استبداد کے خلاف ردِعمل کے طور پر بھی سامنے آئی، اور انگریز انتظامیہ کی طرف سے متعارف کردہ قانونی، مالیاتی، اور زرعی اصلاحات کی امید بھی اس قبولیت کا سبب بنی۔

ہندوستان میں پہلی مردم شماری

انگریزوں کے دورِ حکومت سے پہلے ہندوستان میں کبھی کسی مردم شماری کا کوئی باقاعدہ ذکر نہیں ملتا۔ پہلی مردم شماری فروری 1881ء میں کی گئی۔ اس بارے میں ایک مفصل رپورٹ W.Chichele Plowden نے مرتب کی، جو شائع بھی ہوئی۔ اس کے بعد یہ قانون بنا کہ ہر دس سال بعد مردم شماری کا عمل دہرایا جائے گا۔[1]

ہندوستان کی پہلی مردم شماری کے مطابق پنجاب کی آبادی 22 ملین تھی، جبکہ اس وقت پورے ہندوستان کی آبادی تقریباً 225 ملین تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ کل ہندوستانی آبادی کا تقریباً دس فیصد پنجاب میں آباد تھا۔ یہ مردم شماری صرف عددی معلومات کے لیے نہ تھی بلکہ لوگوں سے ان کے مذہب، پیشے، اور ذات (نسل) کے بارے میں بھی دریافت کیا گیا۔ میرے خیال میں یہ مردم شماری بظاہر ہندوستان کی ترقی کے لیے کی گئی، لیکن اس کی اصل ضرورت انگریزوں کی سیاسی و انتظامی حکمتِ عملی کا حصہ تھی۔ اگروال کے مطابق اس مردم شماری میں پیشوں کے لحاظ سے پنجاب کی تقریباً نصف آبادی کاشتکاروں پر مشتمل تھی (اگرچہ یہ شرح کچھ کم محسوس ہوتی ہے کیونکہ آج بھی یہ 60 فیصد سے زائد ہے)۔

ذات برادری کے نقطۂ نظر سے جاٹ سب سے بڑی برادری تھے، جو کل کاشتکاروں کا تقریباً 45 فیصد تھے۔ ان کے بعد راجپوت تھے، جو کل آبادی کا 16 فیصد تھے اور زیادہ تر زمیندار طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ پٹھان اور بلوچ مجموعی طور پر زمین کے 8 فیصد سے بھی کم حصے کے مالک تھے۔ دیگر اہم قبائل میں گکھڑ، اعوان، جنجوعہ، کھرل، سیال، گوجر، ارائیں اور کمبوہ شامل تھے۔ کاشتکاروں کے بعد مختلف پیشہ ورانہ طبقات جیسے موچی، نائی، کمہار، جولاہے، لوہار، ترکھان

---

[1] W. Chichele Plowden,(1883), Report on the Census of British India taken on the 17th February 1881, London, Eyre and Spottiswoode, p.

وغیرہ کل آبادی کا ایک چوتھائی سے زیادہ تھے۔

کل آبادی کا چھٹا حصہ تجارتی اور مذہبی طبقوں پر مشتمل تھا۔ ہندو بنیا، کھتّری اور اروڑا (تینوں تاجر برادریاں) مناسب تعداد میں آباد تھیں۔ یہ لوگ پہلے جمنا اور ستلج کے درمیانی علاقوں میں آباد ہوئے، بعدازاں پنجاب کے شمال مغربی علاقوں تک پہنچے۔ آج بھی ہندو پشاور، کوہاٹ، اور کوئٹہ میں آباد ہیں۔ میرے خیال میں اسی دور میں یہ لوگ افغانستان بھی پہنچے۔

مسلمان تاجروں میں کھوجے (خواجہ)، پراچے، اور دیگر برادریاں شامل تھیں، جو تجارتی طبقے کا محض 5 فیصد تھیں۔ مذہبی طبقوں میں براہمن سب سے زیادہ (کل آبادی کا 4.5 فیصد) تھے، جبکہ سید اور شیخ (مسلمان مذہبی رہنما) کل کا صرف 1 فیصد تھے۔

مردم شماری سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بلوچ، شاہ پور، مظفرآباد، جھنگ، ملتان، اور منٹگمری میں بڑی تعداد میں آباد تھے۔ پٹھان زیادہ تر ملتان اور لاہور میں مقیم تھے، نیز امرتسر، گورداسپور، جالندھر، ہوشیار پور، امبالہ، روہتک، کرنال، گڑگاؤں، دہلی، اور پٹیالہ ریاست میں بھی ان کی موجودگی تھی۔ راجپوت دہلی، کرنال، راولپنڈی، جھنگ، اور دیگر مقامات میں کثرت سے موجود تھے۔ جاٹ پنجاب کے میدانی علاقوں میں جہلم سے جمنا تک پھیلے ہوئے تھے۔ گوجر اکثر جاٹ علاقوں میں تھے، مگر نسبتاً کم تعداد میں۔ راجپوت پہاڑوں کے ساتھ ساتھ راجپوتانہ ریگستان کے کنارے علاقوں میں آباد تھے۔ سندھ ساگر اور بالائی چج دوآب میں گکھڑ، اعوان، اور جنجوعہ، جبکہ نچلے رچنا اور باری دوآب میں کھرل اور سیال غالب تھے۔ یہ تقسیم اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ اکثر علاقوں میں ایک ہی برادری کے لوگ بڑی تعداد میں آباد تھے۔ میرے خیال میں، ایسا ہونے کی ایک بنیادی وجہ ان علاقوں کا مخصوص تاریخی، ثقافتی، اور زرعی پس منظر تھا۔ یہ لوگ دوسرے علاقوں سے آ کر پنجاب میں آباد ہوئے۔ اس طرح نئے آنے والے لوگ پہلے سے آباد اپنی نسل کے لوگوں کے پاس ہی کر آباد ہوئے۔ اگروال نے پنجاب میں دیگر علاقوں سے آنے والے افراد بارے کہا ہے کہ جب پنجاب میں آبادکاری کا عمل شروع ہوتو افغانستان کی طرف سے

بلوچ، پختون اور افغان، جو پہلے بڑے پیمانے پر جانور لے کر یہاں چروانے کے لیے آتے تھے ، پہلے حکمرانوں کے طور پر اور پھر زمین کے مالکان اور تاجروں کے طور پر پنجاب پر قابض ہوئے۔

اسی دور میں آٹھویں صدی کے آس پاس گجر اور جاٹ سندھ پر عربوں کے حملے کے بعد بڑی تعداد میں پنجاب آنا شروع ہوئے۔ میرے علم کے مطابق ایک بڑی تعداد میں سندھ سے جاٹ محمود غزنوی کے حملوں کے بعد پنجاب میں آ بسے۔ سندھ میں ابھی بھی انھیں جت کہا جاتا ہے۔ اس دور میں پنجاب میں جاٹوں، گجروں اور راجپوتوں کے درمیان زمین پر قبضے کے لیے جنگیں بھی ہوتی رہیں۔ اسی طرح اس بات کا بھی قوی امکان ہے کہ آریاؤں کی براہ راست یا مخلوط اولاد کھتری اور اروڑا تھے، جنھوں نے پنجاب کے قصبوں اور شہروں کی معیشت پر قبضہ جمایا۔ بنیا، جو بڑے تھے، یہ شاید سندھ کے تاجروں کی اولاد تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ لوگ آریاؤں کے ساتھ بھی مل جل گئے ہوں گے۔

پنجاب: برطانوی دورِ حکومت کا آغاز اور اس کے اثرات

جیسا کہ پچھلے صفحات میں وضاحت کی گئی ہے، برطانوی حکومت نے 29 مارچ 1849ء کے اعلامیے کے ذریعے، جو ہنری ایم ایلیٹ اور مہاراجہ دلیپ سنگھ کے مابین طے پایا، پنجاب کو باقاعدہ طور پر اپنی ہندوستانی سلطنت کا حصہ بنا لیا۔ یہ پیش رفت دو برطانوی-سکھ جنگوں میں سکھوں کی شکست کے نتیجے میں ممکن ہوئی، جس کے بعد پنجاب پر قابض ہونے والی برطانوی سلطنت نے اس خطے پر حکومت قائم کی۔ پنجاب پر قبضے کے فوراً بعد، گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی کی سفارش پر پنجاب میں ''بورڈ آف ایڈمنسٹریشن'' کے نام سے ایک نئی انتظامی مجلس قائم کی گئی، جس میں سول اور فوجی برطانوی افسران شامل کیے گئے۔ اس بورڈ کی سربراہی سر ہنری لارنس (1857-1806) کو سونپی گئی، جبکہ دیگر ارکان میں جان لارنس (1879-1811) اور چارلس مینزل (1886-1806) شامل تھے۔ اگرچہ یہ انتظامی ڈھانچہ عارضی نوعیت کا تھا، تاہم اسے نہ صرف عدالتی بلکہ انتظامی اختیارات بھی تفویض کیے گئے تھے۔ کسی بھی پالیسی کے نفاذ کے لیے تمام ارکان کی متفقہ منظوری ضروری تھی۔ یہ پورا نظام گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی کے

براہِ راست کنٹرول میں تھا۔

پنجاب میں اس نئی نوآبادیاتی حکومت کے قیام کے ساتھ ہی ایک ایسے دورِ جدید کا آغاز ہوا جو اس وقت برصغیر کے کسی اور صوبے کو نصیب نہ ہوا۔ تاہم اس ظاہری ترقی کے پردے میں پنجابی عوام کو ان کی زبان، مقامی خودمختاری، اور تہذیبی و نفسیاتی برتری سے محروم کر دیا گیا۔ اگرچہ پنجاب صدیوں سے غیر ملکی حملہ آوروں کا مرکز رہا تھا، لیکن برطانوی نوآبادیاتی نظام نے پہلی مرتبہ باقاعدہ اور منظم انداز میں مقامی شناخت کو کمزور کرنے کا عمل شروع کیا۔

لارڈ ڈلہوزی نے بورڈ سے منسلک افسران کے لیے مثالی اور تجربہ کار افراد کا انتخاب کیا۔ جیسا کہ معروف مؤرخ ولیم کے کے مطابق:

''شاید ہی کسی صوبائی انتظامیہ کو اتنے باصلاحیت افسران کا روشن دماغ جھرمٹ میسر آیا ہو۔''

یہ تمام افسران بالخصوص شمال مغربی سرحدی علاقوں سے منتخب کیے گئے تھے تاکہ پنجاب جیسے حساس خطے کو، جو افغان سرحد سے متصل تھا، مستقبل میں ''راج کی تلوار'' (Sword Arm of the Raj) میں تبدیل کیا جا سکے۔ مارچ 1849ء سے اگست 1947ء تک برطانوی حکومت کا دورانیہ تقریباً ایک صدی پر محیط ہے۔ اس طویل عرصے میں پنجاب میں گہری سیاسی، سماجی، معاشی اور تہذیبی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ان تبدیلیوں کا تجزیہ محض انتظامی اقدامات کی فہرست سے ممکن نہیں، بلکہ ان کے اثرات کا گہرائی سے جائزہ لینا ناگزیر ہے۔ مثال کے طور پر، وہی سکھ جنھوں نے برطانوی اقتدار کے خلاف متعدد جنگیں لڑیں، رفتہ رفتہ انھی کی فوجی قوت کا حصہ بنے۔ سکھ رجمنٹوں کی تشکیل اور ان کی برطانوی وفاداری اس قدر مضبوط ہو گئی کہ وہ اپنے ہی ہم وطنوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے لگے۔

اس تاریخی مطالعے کے آغاز میں یہ امر واضح کرنا نہایت اہم ہے کہ زیرِ بحث دور کو صرف ''انگریزوں کا دورِ حکومت'' کہہ کر محدود نہیں کیا جا سکتا۔ اگرچہ برطانوی سلطنت نے پنجاب کو اپنی نوآبادیاتی سلطنت میں شامل کیا، تاہم اقتدار کی تمام باگ ڈور صرف انگریز حکام

تک محدود نہ رہی۔ متعدد مقامی عناصر جن میں راجے، مہاراجے، نواب، اور تعلیم یافتہ اشرافیہ شامل تھے برطانوی نوآبادیاتی نظام کا حصہ بن چکے تھے۔ ان طبقات نے نہ صرف برطانوی حکمرانی کو عملی معاونت فراہم کی بلکہ مکمل وفاداری کے ساتھ سامراجی نظام کے استحکام میں بھی کلیدی کردار ادا کیا۔

اس مطالعے میں ہم برطانوی دورِ حکومت کو مختلف ادوار میں تقسیم کرتے ہوئے اس کے نمایاں انتظامی، سیاسی، سماجی اور معاشی اقدامات کا اختصاری جائزہ لیں گے۔ ساتھ ہی، ان اقدامات کے نتیجے میں وقوع پذیر ہونے والی ساختی تبدیلیوں کا تفصیلی تجزیہ بھی پیش کیا جائے گا، تاکہ پنجاب میں نوآبادیاتی نظام کے اثرات کو ایک جامع اور تنقیدی زاویے سے سمجھا جا سکے۔

اس طرح، سو سال کا تجزیہ دو جہتوں سے کیا جائے گا:

برطانوی دور میں ہونے والی اصلاحات اور منصوبہ جات کو سامنے رکھ کر

اس دور میں ہونے والی سیاسی تبدیلیوں پر گفتگو کرتے ہوئے، جن کے نتیجے میں ایک دن ہندوستان آزاد ہوا۔

جس کے بارے میں بہت سے لوگوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ مجھے جو سب سے زیادہ پسند ہے، وہ فیض احمد فیض نے کہا تھا:

یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں

میں نے اپنی اس تحریر کے لیے درج ذیل کتب سے مدد لی ہے:

1-*Punjab Under the British Rule*: 1849-1947

Author: J.S. Grewal

2- *A History of the Sikhs*(Vol. 2):1839-2004

Author: Khushwant Singh

3- *The Punjab: A History from Aurangzeb to Mountbatten*

Author: Ian Talbot

4- *The Construction of Religious Boundaries: Culture, Identity, and Diversity in the Sikh Tradition.*

Author: Harjot Oberoi

5- *Pan-Islam in British Indian Politics: A Study of the Khilafat Movement,* 1918-1924

Author: M. Naeem Qureshi

6- *Peasants in Revolt: Tenants, Landlords, Congress, and the Raj in Orissa and Punjab,* c.1920-1950

Author: Kapil Kumar

7- *The Lion and the Tiger: The Rise and Fall of the British*

Sub Continent Census 1881

ABSTRACT III.

	Area in Square Miles	Density	Population.
Bombay	197875	118	23395663
Bengal	193198	360	69536861
Punjab	142449	159	22712120
Madras	141001	221	31170631
Rajputana	129750	79	10268392
Central Provinces	113279	102	11548511
North-West and Oudh	111236	403	44849619
Burmah	87220	43	3736771
Hyderabad (Nizam's dominions)	81807	120	9845594
Central India	75079	123	9261907
Assam	46341	105	4881426
Mysore	24723	169	4186188
Berar	17711	151	2672673
Baroda	8570	255	2185005
Travancore	6730	357	2401158
Ajmere	2711	170	460722
Coorg	1583	113	178302
Cochin	1361	441	600278
All India	1382624	184	253891821

Report published by: W.Chichele Plowden),1883, Report on the Census of British India taken on the 17th February 1881

London,Eyre and Spottiswoode

Raj, 1600-1947

Author: Denis Judd

8- *The Colonial State and Forms of Knowledge: The British in India.*

Author: Bernard Cohn

9- *The Political Economy of the Punjab: The Colonial Experience.*

Author: S. Gopal

10- *Land and Local Kingship in Eighteenth-Century (Bengal relevant for comparison)*

Author: John McLane

11- *Punjab under Imperialism*, 1885-1947

Author: Imran Ali

12- *Punjab: A History from Aurangzeb to Mountbatten.*

Author: Rajmohan Gandhi

13- *The Lion and the Tiger: The Rise and Fall of the British Raj,* 1600-1947.

Author: Denis Judd

14- *The British in India: A Social History of the Raj.*

Author: David Gilmour

15- *Shameful Flight: The Last Years of the British Empire in India.*

Author: Stanley Wolpert

برطانوی دور میں انتظامی بندوبست اور اس کے اثرات

میں نے جس قدر بھی برطانوی دور کے متعلق مطالعہ کیا ہے، میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ انگریز جہاں بھی قابض ہوئے، وہاں سب سے پہلے کئی ایسی انتظامی اصلاحات نافذ کیں جو ایک طرف تو ان کے اقتدار کو مضبوط بناتی تھیں، اور دوسری طرف عام لوگوں کے لیے بھی بے حد مفید ثابت ہوتی تھیں۔ میں یہی صورتِ حال پنجاب میں بھی دیکھتا ہوں، اس لیے سب سے پہلے انھی اصلاحات کا ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ برطانوی دور میں پنجاب میں درج ذیل علاقے شامل تھے:[1]

موجودہ پاکستانی پنجاب (مغربی پنجاب)

ہریانہ (جواب بھارت کی ایک علیحدہ ریاست ہے)

ہماچل پردیش کا کچھ حصہ (جواب بھارت کی ایک علیحدہ ریاست ہے)

دہلی (جواب ایک مرکزی زیرِ انتظام علاقہ ہے)

چنڈی گڑھ (جو پنجاب اور ہریانہ دونوں کا دارالحکومت ہے)

خیبر پختونخوا کے کچھ علاقے (خصوصاً ہزارہ ڈویژن)

اس کے علاوہ اس وقت کئی مقامی ریاستیں بھی پنجاب کا حصہ تھیں، جن میں کچھ بہت چھوٹی اور کچھ بڑی ریاستیں شامل تھیں۔ ان میں سے چند کے نام درج ذیل ہیں: پھلکیاں ریاستیں (پنجاب کے علاقے کی سب سے بڑی اور نمایاں ریاستیں)، جن میں پٹیالہ، جِند اور نابھہ شامل تھیں۔

اس کے علاوہ: فرید کوٹ، کپورتھلہ، مالیر کوٹلہ (یہ ایک مسلم نواب کی زیرِ حکومت ریاست

[1] *Imperial Gazetteer of India* (1908–1931)

تھی، جو تقسیمِ ہند کے دوران پُرامن رہی)

چمبہ (جواب ہماچل پردیش میں ہے)، پہاڑی ریاستیں: پنجاب ہمالیہ (شملہ اور اس کے نواحی علاقے)؛ یہ ریاستیں اکثر ''شملہ ہل اسٹیٹس ایجنسی'' کے تحت آتی تھیں۔

بہاولپور (1849ء کے بعد پنجاب ایجنسی کا حصہ، مگر ثقافتی اور سیاسی لحاظ سے نیم خودمختار؛ اب پاکستان میں واقع ہے)

اس طرح بڑی اور چھوٹی ملا کر ایسی ریاستوں کی تعداد تیس سے بھی زائد تھی۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اُس وقت ہندوستان دو حصوں میں منقسم تھا: برٹش انڈیا اور مقامی ریاستیں۔ برطانوی دور میں ہندوستان کا کل رقبہ تقریباً 4.9 ملین مربع کلومیٹر تھا۔ اس میں سے برٹش انڈیا کا رقبہ تقریباً 3.3 ملین مربع کلومیٹر تھا، جو کل رقبے کا تقریباً 67 فیصد بنتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ باقی 33 فیصد حصہ مقامی ریاستوں کے زیرِ انتظام تھا۔ تقسیمِ ہند سے قبل، 1941ء میں ہندوستان کی کل آبادی 380 ملین تھی، جس میں سے 292 ملین لوگ برٹش انڈیا میں رہائش پذیر تھے، یعنی کل آبادی کا تقریباً 77 فیصد۔ ایک وقت میں ہندوستان میں مقامی ریاستوں کی تعداد 565 تک جا پہنچی تھی، اگرچہ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں کمی بیشی ہوتی رہی۔ یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ برطانوی حکومت نے ان ریاستوں کا براہِ راست نظم ونسق نہیں سنبھالا، لیکن ان کے خارجہ امور، دفاع، اور مواصلات پر مکمل کنٹرول رکھا۔ جب برصغیر کو آزادی ملی تو ان نوابی ریاستوں کو اختیار دیا گیا کہ وہ بھارت یا پاکستان کے ساتھ الحاق کریں، یا اپنی خودمختاری برقرار رکھیں اگرچہ مکمل آزادی کا امکان عملی طور پر نہایت محدود اور غیر حقیقی تھا۔ اس اہم موضوع پر آگے چل کر مزید گفتگو کی جائے گی۔ متحدہ پنجاب کا کل رقبہ 3,57000 مربع کلومیٹر تھا، جس کی کل آبادی تقریباً ایک کروڑ تیس لاکھ نفوس پر مشتمل تھی۔

برطانوی دور میں پنجاب کی انتظامی تقسیم

برطانوی دور میں پنجاب کو پانچ ڈویژنوں میں تقسیم کیا گیا: لاہور، راولپنڈی، ملتان،

جالندھر اور دہلی۔ یاد رہے کہ اس تقسیم میں وقتاً فوقتاً تبدیلیاں بھی آتی رہیں۔ ہر ڈویژن کے لیے ایک کمشنر مقرر کیا جاتا تھا، اور ہر ڈویژن کو مزید اضلاع میں تقسیم کیا گیا، جن میں ہر ضلع کا انتظام ایک ڈپٹی کمشنر کے سپرد ہوتا۔ اس کی معاونت کے لیے ایک سپرنٹنڈنٹ پولیس (ایس پی) بھی مقرر کیا جاتا، جبکہ عدالتی نظام کے لیے ایک ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج بھی تعینات کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ، مختلف محکمے قائم کیے گئے اور ہر محکمے کے لیے ضلعی سطح پر سربراہ مقرر کیا گیا۔ برطانوی دور میں پہلی بار پنجاب میں اضلاع اور تحصیلوں کی حدود کا باقاعدہ تعین کیا گیا۔

برطانوی دور میں پنجاب کا نہری نظام: تاریخی پس منظر اور سماجی و معاشی اثرات

اکثر کہا جاتا ہے کہ پنجاب میں نہری نظام کا آغاز برطانوی دور میں ہوا، لیکن تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے قبل بھی، تغلق دور میں (چودھویں صدی عیسوی)، غیاث الدین تغلق اور محمد بن تغلق نے شمالی ہندوستان بشمول پنجاب میں ابتدائی آبپاشی نظام قائم کرنے کی کوششیں کی تھیں۔ اگرچہ یہ نظام محدود نوعیت کے تھے اور برطانوی دور کے وسیع و منظم نظام کے مقابلے میں کمزور تھے، تاہم ان کوششوں نے بعد میں آنے والے انفراسٹرکچر کی بنیاد ضرور فراہم کی۔

اسی ضمن میں ٹیپو سلطان کے حوالے سے کوئی ٹھوس تاریخی ثبوت دستیاب نہیں کہ انھوں نے پنجاب میں برطانوی طرز کی نہری کالونیاں قائم کی ہوں، البتہ یہ ضرور معلوم ہے کہ انھوں نے میسور (موجودہ کرناٹک) میں مقامی سطح پر آبپاشی کے نظام کی بہتری کے لیے مؤثر اقدامات کیے، جو وہاں کے جغرافیائی حالات کے مطابق تھے۔ تاہم یہ بات درست ہے کہ جس بڑے پیمانے پر برطانوی دور میں پنجاب میں نہری نظام تعمیر کیا گیا، اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس نظام کے تاریخی پس منظر اور اس کے سماجی و معاشی اثرات پر جو کچھ معلومات دستیاب ہوئیں، وہ قارئین کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہیں۔

اس حوالے سے زیادہ تر معلومات محترم Ian Stone کی کتاب *Canal Irrigation in British India: Perspective on Technology Change in the Peasant Economy.* Cambridge University Press, 1984 سے لی گئی ہیں۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ 1849ء میں پنجاب کے انضمام سے قبل ہی، ستلج کے مشرقی علاقوں میں انگریزوں کا اثر و رسوخ قائم ہو چکا تھا۔ پنجاب پر مکمل قبضے کے بعد، برطانوی نوآبادیاتی انتظامیہ نے اس خطے کو ایک زرخیز زرعی علاقہ بنانے کے لیے آبپاشی کے جامع نظام کی منصوبہ بندی شروع کی۔ اگرچہ ظاہری طور پر مقصد زمین کی پیداوار میں اضافہ اور مالی وسائل کا حصول تھا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ خطے کو سیاسی اور عسکری لحاظ سے مستحکم رکھنا بھی ایک اہم ہدف تھا۔

برطانوی حکومت نے جدید انجینئرنگ تکنیکوں اور منصوبہ بندی کے ذریعے بڑے نہری منصوبے شروع کیے، جن کے نتیجے میں انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں ایک شاندار ''کینال کالونی'' نظام وجود میں آیا۔ اس دور میں تعمیر کی گئی نمایاں نہریں اور ان سے منسلک کالونیاں درج ذیل ہیں:

اپر باری دوآب کینال (1859ء): دریائے راوی سے نکالی گئی۔

لوئر چناب کینال (1887ء): ایک عظیم منصوبہ، جس نے چناب کالونی کو سیراب کیا، جس میں فیصل آباد (سابقہ لائل پور) شامل تھا۔

اپر جہلم اور اپر چناب نہریں: وسطی پنجاب میں آبپاشی کے دائرہ کار کو وسعت دی۔

لوئر جہلم، لوئر باری دوآب اور سِدھنائی نہریں بھی اس سلسلے کی کڑیاں تھیں۔

ان نہری نظاموں کو کنٹرول کرنے کے لیے کئی اہم ہیڈ ورکس تعمیر کیے گئے، جن میں بلوکی، خانکی اور تریموں شامل بھی ہیں۔

نہر سرہند (جس کے کنارے ہماری زمین واقع تھی) بھی پنجاب کی قدیم اور اہم نہروں میں شامل تھی۔ اس نہر سے پہلے کاشت کاری کا انحصار زیادہ تر کنوؤں پر تھا۔ یہ نہر 1882ء میں تعمیر کی گئی، اور اس کا ماخذ بھاکڑا ندی کے قریب تھا (جو پہلے دریائے ستلج کا حصہ تھی)۔ اس نہر کا مقصد مشرقی پنجاب (جو اب بھارت میں واقع ہے) میں زراعت کو فروغ دینا تھا۔

برطانوی دور میں پنجاب کا نہری نظام اور اس کے اثرات

اس نہری نظام کی بدولت پنجاب کی بنجر اور نیم بنجر زمینوں کو زرخیز اور قابلِ کاشت بنایا گیا۔

فصلوں کی پیداوار ممکن ہوئی اور گندم، کپاس اور گنا جیسی نقد آور فصلوں کو فروغ حاصل ہوا۔ پنجاب کو "ہندوستان کی اناج گاہ" کا درجہ ملا، اور یہ خطہ برصغیر کی غذائی ضروریات کو پورا کرنے میں مرکزی کردار ادا کرنے لگا۔ بعد میں لائل پور (موجودہ فیصل آباد) میں آٹے کی ملیں قائم کی گئیں، جو برطانوی فوج کی غذائی ضروریات پوری کرنے کے منصوبے کا ایک اہم حصہ تھیں۔

اسی دور میں برطانوی حکومت نے اپنے وفادار کاشتکاروں کو بسانے کے لیے نئی نہری کالونیاں قائم کیں، جیسے: لائل پور، منٹگمری (موجودہ ساہیوال) اور شاہپور۔ زمینوں کی الاٹمنٹ ایک مخصوص نظام کے تحت کی گئی، جس میں زیادہ تر زمینیں اونچی ذاتوں، سابقہ فوجیوں، اور سیاسی طور پر وفادار افراد کو دی گئیں۔ اس سے زمین کی ملکیت کا ڈھانچہ تبدیل ہوا، اور ایک نیا جاگیردار طبقہ وجود میں آیا، جو انگریز حکومت کا وفادار تھا۔ یہ طبقہ برطانوی دور میں نہ صرف حکومت کے ساتھ وفادار رہا بلکہ پاکستان کے قیام کے بعد بھی ملکی سیاست میں نمایاں حیثیت حاصل کرتا گیا۔ یہ اشرافیہ آج بھی اقتدار کے ایوانوں میں اثر و رسوخ رکھتی ہے۔ برطانوی دور میں ان جاگیرداروں کے لیے ایچیسن کالج اور کوئینز کالج جیسے تعلیمی ادارے بھی قائم کیے گئے، جو ان کی سماجی برتری کو مزید مستحکم کرنے کا ذریعہ بنے۔

نہری زمینوں سے حاصل شدہ آمدنی میں بے پناہ اضافہ ہوا، جس سے برطانوی خزانے کو براہِ راست فائدہ پہنچا۔ تاہم، اس کے ساتھ ساتھ چھوٹے کسانوں پر آبیانہ (پانی کا ٹیکس) اور زمین کا محصول مالی بوجھ بن کر پڑا۔ اگرچہ معیشت مجموعی طور پر ترقی کر رہی تھی، لیکن دولت کی غیر مساوی تقسیم نے معاشرتی ناہمواری کو جنم دیا، جو ایک ایسا المیہ ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ نہری زمینوں کی آبادکاری کے نتیجے میں نئے شہر اور ریلوے لائنیں قائم ہوئیں، جیسے کہ فیصل آباد۔ ان علاقوں میں منڈیاں، اجناس کے بازار، عدالتیں اور تعلیمی ادارے بھی قائم کیے گئے، جو ترقی کے مراکز بن گئے۔ تاہم، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ زیادہ آبپاشی کی وجہ سے زمینوں میں پانی کی زیادتی (واٹرلاگنگ) اور سیم وتھور جیسے مسائل پیدا ہوئے۔ نہری آبپاشی پر حد سے زیادہ انحصار نے زرعی تنوع کو محدود کر دیا۔

ان تمام پہلوؤں کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ برطانوی دور میں پنجاب کا نہری نظام ایک عظیم انجینئرنگ اور سماجی منصوبہ تھا، جس نے اس خطے کو ایک زرعی مرکز میں تبدیل کر دیا۔ یہ منصوبہ اپنے اندر ایک تاریخی ورثہ رکھتا ہے، جس نے پنجاب کی معیشت، آبادی، اور سماجی ساخت کو گہرائی سے متاثر کیا۔ اگرچہ اس نظام سے بیش بہا فوائد حاصل ہوئے، لیکن یہی نظام نئی ناہمواریوں، طاقت کے نئے توازن اور نوآبادیاتی دور کے آخری مراحل میں پیدا ہونے والے زرعی اضطراب کی بنیاد بھی بن گیا۔

ہر ترقیاتی منصوبے کی طرح، برطانوی دور کے نہری نظام کے بھی مثبت اور منفی اثرات یکساں طور پر محسوس کیے گئے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس دور میں پنجاب میں صنعتی ترقی کی بجائے زرعی معیشت کو ترجیح دی گئی، تو یہ مبالغہ نہ ہوگا۔ برطانوی حکمتِ عملی کا جھکاؤ زرعی پیداوار میں اضافے کی جانب تھا، کیونکہ نوآبادیاتی حکومت کے لیے خوراک کی پیداوار اور خام مال (خصوصاً کپاس اور گندم) کی فراہمی زیادہ اہم تھی۔ اگرچہ صنعتی ترقی طویل المدتی معاشی فوائد اور روزگار کے بہتر مواقع فراہم کر سکتی تھی، لیکن اس کو نظر انداز کر کے زراعت پر انحصار کو فروغ دیا گیا۔ اس پالیسی کا ایک دیرپا اثر یہ بھی ہے کہ آج بھی پنجاب صنعتی ترقی کے اعتبار سے جنوبی ہند جیسے خطوں سے پیچھے ہے۔

برطانوی دور میں پنجاب کا نظامِ تعلیم: ایک تجزیاتی مطالعہ

برطانوی حکومت نے پنجاب میں ایک نیا تعلیمی نظام متعارف کروایا، جس نے نہ صرف تعلیمی ڈھانچے میں بنیادی تبدیلیاں پیدا کیں، بلکہ اس کے سماجی، سیاسی اور ثقافتی اثرات بھی نہایت گہرے تھے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہر ریاست کو اپنے انتظامی ڈھانچے کو چلانے کے لیے قابل، تعلیم یافتہ اور وفادار افراد کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی رجحان برطانوی دور حکومت میں بھی نظر آتا ہے، جب انھوں نے پنجاب پر تقریباً ایک صدی تک حکمرانی کی۔

انگریزوں نے تعلیم کو ایک آلہ کار کے طور پر استعمال کیا تاکہ ایک وفادار اور مطیع مقامی اشرافیہ تیار کی جا سکے۔ ان کا مقصد قائدانہ صلاحیتوں کے حامل رہنما پیدا کرنا نہیں تھا، کیونکہ یہ

کردار وہ خود ادا کر رہے تھے۔ ان کا ہدف کلرک، زمینی ریکارڈ کے منتظمین، اساتذہ، اور نچلے درجے کے سرکاری اہلکاروں کی تیاری تھا، جو نوآبادیاتی نظام کو چلانے میں مددگار ثابت ہوں۔

تعلیم کے ذریعے مقامی روایات، ثقافت اور زبانوں کی جگہ انگریزی زبان اور مغربی اقدار کو فروغ دینا بھی ان کے مقاصد میں شامل تھا۔ اس مقصد کے لیے 1854ء کا مشہور "وڈ ڈسپیچ" (Wood's Despatch) برطانوی ہندوستان میں جدید تعلیم کی بنیاد تصور کیا جاتا ہے، جس کا اطلاق پنجاب پر بھی کیا گیا۔ اسی منصوبے کے تحت لاہور میں گورنمنٹ کالج (1864ء) اور پنجاب یونیورسٹی (1882ء) قائم ہوئیں، جب کہ ایچی سن کالج (1886ء) خاص طور پر نوابوں، زمینداروں اور رؤسا کے بچوں کے لیے بنایا گیا تاکہ انھیں "مہذب" (یعنی برطانوی تہذیب سے ہم آہنگ) اور وفادار شہری بنایا جا سکے۔ اسکول کی سطح پر پرائمری، مڈل، ہائی اور نارمل اسکولوں کا قیام عمل میں آیا۔ اسلامی علوم اور مقامی زبانوں کی تعلیم کو محدود کر کے انگریزی، ریاضی، سائنس اور مغربی فلسفہ کو ترجیح دی گئی۔ مدارس کی سرکاری سرپرستی ختم کر دی گئی، جبکہ جدید تعلیمی ادارے ریاستی سرپرستی میں پھلنے پھولنے لگے۔

اس تعلیمی نظام کے نتیجے میں ایک نیا تعلیم یافتہ متوسط طبقہ ابھرا، جو بعد ازاں قومی تحریکوں میں پیش پیش رہا۔ اردو، فارسی اور پنجابی زبانوں کی حیثیت کمزور ہوئی، جبکہ انگریزی کو سماجی ترقی کی علامت بنا دیا گیا۔ تعلیم کی بدولت ذات پات اور صنفی امتیاز میں کسی حد تک کمی واقع ہوئی، تاہم تعلیمی ڈھانچہ خود طبقاتی تفریق پر مبنی تھا۔ بعض مؤرخین کے مطابق اسی دور میں برصغیر میں متوسط طبقے کا باقاعدہ ظہور ہوا، کیونکہ اس سے پہلے سماج بادشاہوں اور محکوم رعایا کے درمیان منقسم تھا۔ اگرچہ برطانوی تعلیمی نظام نے خواندگی کی شرح میں اضافہ کیا، لیکن یہ زیادہ تر نوآبادیاتی مفادات کے تابع تھا، نہ کہ مقامی خودمختاری یا ترقی کے لیے۔

جدید تعلیمی اداروں نے جہاں عوامی شعور کو بیدار کیا، وہیں استعماری ذہنیت کو بھی فروغ دیا۔ ان تمام پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہنا بجا ہوگا کہ برطانوی دور کا تعلیمی نظام ایک منظم، طبقاتی اور مقصدی ڈھانچہ تھا، جس کا بنیادی ہدف نوآبادیاتی نظام حکومت کو مضبوط بنانے کے لیے مطلوبہ

انسانی وسائل کی فراہمی تھا۔ تاہم، اسی نظام سے قومی بیداری کی وہ چنگاریاں بھی پھوٹیں جنھوں نے آگے چل کر آزادی کی تحریکوں کو نئی روح بخشی۔

اس موضوع پر کئی کتابیں اور مضامین دیکھنے کو ملے۔ ان میں سب سے مفید ڈاکٹر خلیل احمد، علی احمد اور حارث کبیر کا ایک تحقیقی مضمون:

Historical Significance of the British Education System in Colonial Punjab: A Study in Perspective of its Consequences on the Native Society and Education

پڑھنے کو ملا۔

وہ لکھتے ہیں (اردو ترجمہ):

"کوئی بھی اصلاح سماجی شعور کے بغیر ممکن نہیں، اور سماجی شعور ہمیشہ تعلیم سے جنم لیتا ہے۔ لیکن برطانوی حکومت نے یہ نظام اپنے سیاسی مفادات کے لیے قائم کیا۔ ان کا مقصد تعلیم کو عام کرنا نہیں تھا، کیونکہ یہ حقیقت پہلے ہی واضح ہو چکی تھی کہ تعلیم انسان میں حکومت کے کاموں میں شمولیت اور اقتدار کی خواہش پیدا کرتی ہے، جو کہ وہ کبھی نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ہندوستان میں ایسا تعلیمی نظام رائج کیا جو صرف ماتحت ملازمین اور کلرک تیار کرے تاکہ انتظامی مشینری چلائی جا سکے۔

اس تعلیمی نظام کے مزید کئی ہمہ گیر مقاصد بھی تھے۔ ایک مقصد یہ تھا کہ عوام کو ان کے اپنے معاشرے، مذہب، ثقافت اور اخلاقی روایات سے دور رکھا جائے۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ یورپی طور طریقے، جیسے زبان، لباس، گھریلو سامان اور طرزِ تعمیر سکھائے جائیں، کیونکہ وہ اس نئے تعلیمی نظام کے ذریعے عیسائیت کی جانب ایک وسیع تر ذہنی تبدیلی کی امید لگائے بیٹھے تھے۔

درحقیقت، ایک نئے تعلیمی نظام کی ضرورت تھی جو درست مقاصد، اہداف اور نظریات پر مبنی ہوتا اور جو افراد اور قوم کی اجتماعی خواہشات و ضروریات کو پورا کرتا۔ مگر برطانوی حکومت نے اس معاملے کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔

اسی طرح شریا گوتم (Shriya Gautam) کا ایک مضمون پڑھنے کو ملا، جس کا عنوان

ہے:

"Education in Punjab under the British Rule from 1849 to 1947"

وہ ایک طویل تجزیے کے بعد اس نتیجے پر پہنچتی ہیں کہ ایک طرف برطانوی دور کے نظامِ تعلیم نے کئی وجوہات کی بنا پر قابلِ قدر خدمات سرانجام دیں، تو دوسری طرف اس نے یہاں کی روایتی اقدار کو بھی بدلا۔ یہ سب کچھ انگریزوں کی اپنی انتظامی ضروریات کے تحت کیا گیا، نہ کہ مقامی لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے۔ ان کے بیانیے کا اردو ترجمہ کچھ یوں ہے:

''اگرچہ یہ دلیل دی جاتی رہی ہے کہ ہندوستان میں تعلیم کے فروغ کا سہرا برطانوی حکومت کے سر نہیں باندھا جانا چاہیے، کیونکہ یہاں پہلے ہی فنِ تعمیر، جیومیٹری اور ریاضی سمیت روایتی طب کے نظام میں سائنسی تعلیم ایک ترقی یافتہ مرحلے پر تھی، تاہم برطانوی دورِ حکومت کے متعارف کردہ تعلیمی نظام کی بدولت جو یکسانیت اور مساوات وجود میں آئی، اسے تسلیم کرنا ضروری ہے۔

قدیم اور قرونِ وسطیٰ کے ادوار میں ہندوستان میں تعلیم مذہبی اور سماجی عوامل، جیسے ذات پات کے نظام، کے زیرِ اثر تھی۔ ذات پات کے اس نظام کو پیشہ ورانہ تعلیم یا ٹیکسلا اور نالندہ کی روایتی مذہبی درسگاہوں کے ساتھ موازنہ کرنا، جن کا مقصد تعلیم سے زیادہ خانقاہی تربیت ہوتا تھا، اور اسے برطانوی دور کی جدید یونیورسٹیوں یا آزادی کے بعد کے تعلیمی اداروں کے برابر ٹھہرانا، ایک کمزور اور ادھوری دلیل ہے۔

اس حوالے سے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ روایتی علم کے نظامات کی نوعیت کچھ بھی رہی ہو، مگر 1000 عیسوی کے بعد مقامی تعلیمی ڈھانچہ اتنا بکھر چکا تھا کہ تعلیم مکمل طور پر ذات پات پر مبنی ہو چکی تھی۔ تعلیمی آغاز سے لے کر نصاب تک، ہر چیز افراد کی ذات اور معاشرتی حیثیت کے مطابق مختلف ہوتی تھی۔ برطانوی تعلیمی نظام نے اگرچہ غیر ارادی طور پر ان ذات پات پر مبنی پابندیوں کو ختم کر کے اس صورتِ حال میں ایک بنیادی تبدیلی پیدا کی۔

ایک اور اہم نکتہ جسے ہندوستان میں خواتین کی تعلیم کے ضمن میں یاد رکھنا چاہیے، یہ ہے کہ

خواتین کی تعلیم کا انکار گپتا عہد سے ہی شروع ہو چکا تھا، جب بلوغت سے قبل شادیوں کا رواج عام ہوا (چوپڑا، پوری، داس؛ 1974)۔ نیز، یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ ویدک دور میں بھی عورتوں کا کردار صرف ویدک بَھجنوں کی تخلیق یا مذہبی و فلسفیانہ مکالمات تک محدود تھا۔ اسی طرح، ہنر یا روایتی علم کی پیشہ ورانہ مہارت کا انحصار بھی طالب علم کی قابلیت کی بجائے اس کی ذات پر ہوتا تھا۔

1849 سے 1947 تک برطانوی دور میں پنجاب میں تعلیم کے اثرات کا غیر جانب دار اور گہرا تجزیہ، جیسا کہ اس مقدمہ مطالعہ (case study) میں پیش کیا گیا ہے، یہ ظاہر کرتا ہے کہ اگرچہ اس نئے نظام کے باعث کئی اہم روایتی علمی نظام زوال پذیر ہوئے اور ثقافتی لحاظ سے اہم معلومات ضائع ہوئیں، لیکن اس کے باوجود یہ نظام ایک زیادہ غیر مذہبی (سیکولر) اور برابری پر مبنی تعلیمی تصور کو فروغ دینے میں کامیاب ہوا، جس پر آج کے ہندوستان کا تعلیمی نظام استوار ہے۔

یہ جامع اور سب کو شامل کرنے والا نظام، اگرچہ انتظامی مجبوریوں کے تحت وجود میں آیا، اصلاحات کی نیت سے نہیں، تاہم اسے تسلیم کیا جانا چاہیے۔ یہ نظام سائنسی طرزِ فکر کے ساتھ مل کر روایتی علمی ورثے کی بحالی کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے، تاکہ آج کے ہندوستان کے لیے ایک ہمہ جہت اور متوازن تعلیمی ڈھانچہ تیار کیا جا سکے۔"

پنجاب کا تعلیمی و ثقافتی ورثہ: ایک تاریخی جائزہ

جو کچھ میں جان سکا، اُس کے مطابق پنجاب ایک قدیم ثقافتی اور تاریخی ورثے کا حامل علاقہ ہے۔ قدیم دور سے یہاں تعلیمی ترقی، ثقافتی تنوع، مذہبی ورثے اور تاریخی تجربات کے بارے میں جاننے کو ملتا ہے۔ اس ورثے کو پروان چڑھانے میں ہر طبقے نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ البتہ، برطانوی راج کے دوران، پنجاب کی اہمیت کے پیشِ نظر اس خطے میں ایک واضح تعلیمی اور ادارہ جاتی ترقی نظر آتی ہے۔

تاریخ سے یہ بات ثابت ہے کہ پنجاب، جو وادی سندھ کی تہذیب کا اہم حصہ تھا، دنیا کی ابتدائی تہذیبوں میں سے ایک کا گہوارہ رہا ہے۔ ہڑپہ اور موہنجوداڑو (جواب پاکستان میں واقع

ہیں) اس تہذیب کے نمایاں شہر تھے۔ ان شہروں کے آثارِ قدیمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں بھی ایک تحریری نظام موجود تھا، جسے وادیِ سندھ کا رسم الخط کہا جاتا ہے، اور ایک ترقی یافتہ ثقافت موجود تھی، جس میں تجارت، شہری منصوبہ بندی، اور ممکنہ طور پر تعلیم پر زور دیا جاتا تھا۔

اگرچہ اس دور میں باضابطہ تعلیمی اداروں کے ٹھوس شواہد موجود نہیں، لیکن امکان یہی ہے کہ تعلیم کا عمل خاندانی نظام، شاگردی، اور معاشرتی تجربات کے ذریعے جاری تھا۔ اسی طرح، ویدک دور میں پنجاب (جسے اُس وقت ''سپت سندھو'' کہا جاتا تھا) ویدک تہذیب کے ارتقاء میں مرکزی کردار ادا کر رہا تھا۔ اس دور میں مذہبی اور فلسفیانہ تعلیم کو فروغ حاصل ہوا، اور ''رِگ وید'' جیسے قدیم ترین متون منظرِ عام پر آئے۔ برصغیر کے دیگر حصوں کی طرح پنجاب میں بھی مخصوص قسم کے تعلیمی ادارے موجود تھے، جو زیادہ تر برہمنوں کے زیرِ انتظام تھے، جہاں سنسکرت، ویدک متون، اور رسومات کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اسی دور میں ''گرو-شِشیہ'' (استاد-شاگرد) روایت کی بنیاد رکھی گئی، جس میں شاگرد براہِ راست استاد سے علم حاصل کرتا تھا۔ میری معلومات کے مطابق، اُس وقت تعلیمی ادارے کوئی سند جاری نہیں کرتے تھے، بلکہ استاد ہی شاگرد کو پاس ہونے کی سند دیا کرتا تھا۔

مسلمانوں کے دور میں مساجد اور مدارس کی صورت میں تعلیمی ادارے قائم ہوئے۔ غیر رسمی تعلیم عموماً گھروں کی سطح پر دی جاتی تھی۔ مغلیہ سلطنت (1857-1526) نے بھی پنجاب کے تعلیمی منظرنامے پر گہرا اثر ڈالا۔ خاص طور پر بادشاہ اکبر نے تعلیمِ عام کے تصور کو فروغ دیا۔ اسی دور میں فارسی کو سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا اور فارسی و عربی کی تعلیم کو فروغ ملا۔ مدارس قائم کیے گئے جہاں اسلامیات، ادب، اور سائنسی مضامین پڑھائے جاتے تھے۔ مغلیہ قلعے اور محلات علم و فن کے مراکز بن گئے، جہاں فنِ تعمیر، مصوری، اور سائنسی علوم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ تاہم، اس وقت بھی رسمی تعلیم زیادہ تر اشرافیہ اور مذہبی طبقے تک محدود تھی۔

پندرھویں صدی میں سکھ مت کے بانی، گرو نانک دیو جی، اور بعدازاں دیگر گرو صاحبان نے پنجاب میں تعلیم کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا۔ سکھ مت نے مساوات، خودانحصاری، اور

روحانی تربیت پر زور دیا۔اس دور میں گردوارے نہ صرف عبادت گاہیں تھے، بلکہ سماجی و تعلیمی مراکز کا کردار بھی ادا کرتے تھے، جہاں عوام کو مذہبی اصول، فلسفہ، اور اخلاقیات کی تعلیم دی جاتی تھی۔ دسویں گرو، گرو گوبند سنگھ جی، نے تعلیم کے فروغ اور جنگی تربیت پر خاص زور دیا۔انھوں نے ''خالصہ'' کی بنیاد رکھی، جو مساوات، علم، اور روحانی و جسمانی تربیت کا نمائندہ گروہ تھا۔اسی طرح ہندوؤں نے بھی تعلیم کے میدان میں کئی کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔آریہ سماج تحریک نے بھی تعلیم کے فروغ کے لیے قابلِ قدر کوشش کی۔

برطانوی نوآبادیاتی دور میں انگریزی نظامِ تعلیم نے پنجاب کی تعلیمی فضا کو مکمل طور پر بدل دیا۔ یہاں ایک بڑی اور نمایاں تبدیلی دیکھنے کو ملی، جس نے ہندوستانی سماج پر گہرا اور دیرپا اثر ڈالا، جو آج بھی موجود ہے، بلکہ بعض پہلوؤں میں پہلے سے کہیں زیادہ اثر پذیر ہے۔مغربی طرز پر مبنی اسکول، کالج، اور یونیورسٹیاں قائم ہوئیں۔ پنجاب کے ابتدائی اسکول عیسائی مشنریوں نے قائم کیے، جنھوں نے انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنایا۔ لاہور، امرتسر، اور شملہ جیسے شہروں کے مشنری اسکولوں نے خواندگی کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا، خاص طور پر شہری اشرافیہ میں۔

پنجاب پر قبضہ کرنے کے بعد انگریزوں کا پہلا اہم اقدام تعلیمی اداروں کا قیام تھا۔ 1882ء میں لاہور میں یونیورسٹی آف دی پنجاب قائم ہوئی (جو اب پاکستان میں واقع ہے)، جو فنون، سائنس، اور قانون میں اعلیٰ تعلیم کا مرکز بنی۔ انیسویں صدی میں عیسائی مشنریوں نے خواتین کی تعلیم میں بھی قائدانہ کردار ادا کیا۔ پنجاب میں پہلا لڑکیوں کا اسکول امرتسر میں مس ملڈرڈ اوبرائن، ایک برطانوی مشنری، نے قائم کیا۔ یہ ایک انقلابی قدم تھا، کیونکہ اُس دور میں خواتین کی تعلیم کو عام طور پر نظرانداز کیا جاتا تھی۔

میرے مشاہدے کے مطابق، جب انگریزوں نے اپنے اسکول اور کالج قائم کیے، تو ان میں عیسائیت کی تعلیم بھی شامل کی گئی۔اس اندیشے کے پیشِ نظر کہ کہیں بچے عیسائی نہ بن جائیں، ہندو، سکھ، اور مسلمان برادریوں نے اپنے اپنے تعلیمی ادارے قائم کیے۔اسی کے نتیجے میں علی گڑھ

مسلم یونیورسٹی، خالصہ کالجز، دیوبند مدرسہ، اور ہندو سماجی و مذہبی تحریکوں جیسے آریہ سماج، برہمو سماج، اور تھیوسوفیکل سوسائٹی جیسے ادارے وجود میں آئے۔ ان اداروں نے نہ صرف تعلیم، بلکہ سماجی شعور، خواتین کی تعلیم، اور ذات پات کے خلاف بیداری پیدا کی۔ اس کے نتیجے میں پنجاب کا سماج رفتہ رفتہ تقسیم در تقسیم ہوتا چلا گیا۔ یہی، سماجی تقسیم آخرکار پنجاب کی جغرافیائی اور سماجی تقسیم کا سبب بنی۔ غیر یکساں نظامِ تعلیم نے ایسی متنوع شناختیں پیدا کیں، جو باہمی محبت پر نہیں بلکہ نفرت پر مبنی تھیں۔

یہ محض میرا ذاتی مشاہدہ اور استدلال ہے، جو حتمی یا قطعی رائے کے طور پر نہیں لیا جانا چاہیے۔ البتہ دستیاب شواہد اور مشاہدات کی روشنی میں جو کچھ میری فہم میں آیا، وہی پیش کیا گیا ہے۔

برطانوی دور میں زمینوں کی پیمائش اور اس کا بندوبست

یہ بات ہم سنتے آئے ہیں کہ برطانوی دورِ حکومت سے قبل زمین اُس وقت کے بادشاہ کی ملکیت ہوا کرتی تھی۔ وہ جب چاہتے، کسی کو بھی کئی دیہات کا مالک مقرر کر دیتے تھے۔ اس سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اُس وقت پورے ہندوستان، بشمول خطہ پنجاب، میں زمینوں کے ریکارڈ کا کوئی منظم نظام قائم نہیں ہوا تھا۔ مگر ایسا نہیں تھا۔ این ڈی ایم اے پاکستان (NDMA Pakistan) نے اس موضوع پر لکھتے ہوئے بتایا ہے کہ پاکستان میں زمینی محصول کے نظام کی تاریخی ارتقاء کی بنیاد برصغیر میں ابتدائی مسلم حکمرانی کے دور، یعنی تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی، میں رکھی گئی۔ سلطان علاء الدین خلجی (1316ء-1255ء) پہلے ہندوستانی حکمران تھے جنھوں نے زمین کے نظم و نسق کا باقاعدہ نظام متعارف کروایا۔ مغل بادشاہ اکبر کے وزیر برائے مالیات، راجہ ٹوڈر مل (وفات: 1589ء)، کو اس زمینی محصول اور زمین داری کے نظام کی بنیاد رکھنے کا سہرا دیا جاتا ہے، جو آج بھارت، پاکستان، اور بنگلہ دیش میں رائج ہے۔ یہ بات بھی درست ہے کہ برطانوی دورِ حکومت میں اس نظام کو مزید بہتر بنایا گیا اور اسے ایک منظم اور رسمی شکل دی گئی۔

مغل بادشاہ اکبر اعظم کے دورِ حکومت (1605ء-1556ء) میں برصغیر میں جو زمین

داری و مالیاتی اصلاحات نافذ کی گئیں، وہ نہ صرف اس عہد کی زراعت و معیشت میں انقلاب کا باعث بنیں، بلکہ بعد کے ادوار میں بھی ان کی اہمیت مسلمہ رہی۔ اکبر کے اس مربوط نظام کا سب سے اہم پہلو زمین کی باقاعدہ پیمائش (ضبط) اور محصول کی شرح کے تعین کا تھا۔ اس نظام کو ترتیب دینے میں اس کے وزیر خزانہ راجہ ٹوڈرمل کا کلیدی کردار تھا۔

اکبر کے وضع کردہ نظام کا مقصد زمین کی اقسام، پیداوار کی اوسط، اور قیمتوں کے تجزیے پر مشتمل تھا، جس کے نتیجے میں ایک منصفانہ اور منظم زمینی محصولات کا نظام قائم ہوا۔ اس نظام کے تحت زمین کو تین بنیادی اقسام میں تقسیم کیا گیا تھا۔ اس سب کے نتیجے میں اکبر نے فیاضی اور انصاف پر مبنی نظام قائم کیا، جس میں کاشتکاروں کو زمین کی پیمائش، پیداوار، اور محصول سے متعلق معلومات فراہم کی جاتیں، اور کسانوں کو استحصال سے بچانے کے لیے ریاستی نگرانی کا مؤثر انتظام موجود تھا۔

اس نظام کی تفصیل میں نے ابوالفضل ابن مبارک کی تصنیف آئین اکبری، جو اکبر کے عہد کی سب سے معتبر تاریخی دستاویز ہے، میں پڑھی ہے۔ اس کے علاوہ پروفیسر عرفان حبیب اپنی معروف کتاب *The Agrarian System of Mughal India* (1556-1707) میں اکبر کے زرعی نظام کا گہرائی سے تجزیہ پیش کرتے ہیں، جس میں پیمائش، اوسط پیداوار، نرخ بندی، اور محصولات کی شرح کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے۔

این ڈی ایم اے پاکستان نے برطانوی دور کے نظام کی وضاحت کرتے ہوئے جو لکھا ہے، اس کا خلاصہ کچھ یوں ہے:

یاد رہے کہ انیسویں صدی میں پنجاب میں معیشت کا انحصار صرف زراعت پر تھا۔ زراعت کی اہمیت کے پیشِ نظر برطانوی دور میں زمین کے نظم و نسق کے نظام کو بہتر بنانے کو ترجیح دی گئی۔ اس کام کو باقاعدہ قانونی شکل دی گئی۔ اس نئے نظم و نسق کے نتیجے میں زمین کے مالکان اور ریاست کے درمیان ایک گہرا تعلق قائم ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ زمین داروں اور مزارعین کے باہمی روابط، مختلف اقسام کے مزارعین کے حقوق و فرائض، اور زمین سے

متعلق تنازعات کے حل کے لیے عدالتی نظام کے ساتھ ساتھ محصولات کے افسران کی اقسام اوران کے اختیارات وذمہ داریوں کوتفصیل سے قانونی طور پرواضح کیا گیا۔

یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ برطانوی دورِحکومت میں زمین سے متعلق جوقوانین نافذ کیے گئے، ان میں سے اکثر آج بھی نافذ العمل ہیں، جیسے ٹرانسفر آف پراپرٹی ایکٹ 1882ء، پنجاب ٹینیسی ایکٹ 1887ء، اور پنجاب لینڈ ریونیو ایکٹ 1967ء، جو اصل میں 1887ء کے لینڈ ریونیو ایکٹ پر مبنی ہے اور پاکستان وجموں وکشمیر میں مقامی رسم ورواج کی مطابقت سے اب بھی نافذ ہے۔ برطانوی دور میں ہی محصولات سے متعلق عہدیداران مقرر کیے گئے، جن میں پٹواری، مقامی نمبردار، اور ضلعی لینڈ کلیکٹر شامل تھے۔ ان افراد کوکئی انتظامی وعدالتی اختیارات حاصل تھے۔ پولیس ان کی مدد کے لیے ہروقت دستیاب ہوتی تھی۔

برطانوی دور میں ڈپٹی کمشنر کا نظام بھی برطانوی حکومت نے متعارف کروایا۔ اب پاکستان میں اسے ڈیوالوشن پلان کے تحت جزوی طور پر ضلعی رابطہ افسر (District Coordination Officer) سے تبدیل کردیا گیا ہے۔ تاہم یہ نظام اب ایک نئے تغیر کے عمل سے گزر رہا ہے؛ بعض صوبے پرانے نظام کی طرف واپس جاچکے ہیں جبکہ کچھ تاحال عبوری مرحلے میں ہیں۔ اگرچہ ڈی سی اوضلع کا سربراہ ہوتا ہے، مگر اسے محصولات کے اختیارات حاصل نہیں ہوتے۔ یہ اختیارات ''ڈسٹرکٹ آفیسر (ریونیو)'' کو حاصل ہوتے ہیں، جو ''ضلعی کلیکٹر ریونیو'' بھی کہلاتا ہے۔ یہ ایک نمایاں تبدیلی ہے جو برطانوی اور موجودہ نظام کے فرق کوظاہر کرتی ہے۔

میرا تعلق بھی ایک زمیندار گھرانے سے ہے۔ کھیتی باڑی ہی میرے آباؤ اجداد کا پیشہ رہا ہے۔ پاکستان آنے کے بعد خاندان کے کچھ افراد نے کاشتکاری چھوڑ کر مزدوری اختیار کی، اور بعد میں آنے والی نسلوں نے کاروبار شروع کیے، جن میں مَیں خود بھی شامل ہوں۔ ایک زمیندار گھرانے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے مجھے اُس محکمے، جسے عام طور پر ''محکمہ مال'' کہا جاتا ہے، سے واسطہ پڑتا رہا ہے۔ لہٰذا جب میں یہ تحریر لکھ رہا ہوں تو کئی باتیں اپنے ذاتی مشاہدے کی بنیاد پر بھی بیان کررہا ہوں۔

میرے مشاہدے کے مطابق، برطانوی دور میں زمین کے ریکارڈ کا ایک منظم اور باقاعدہ نظام متعارف کروایا گیا،جس کے اہم اجزاء درج ذیل تھے:

1- زمین کی پیمائش اور بندوبست

2- مستقل ریکارڈز (مثلاً: جمع بندی،خسرہ گرداوری رجسٹر)

3- پٹواری،تحصیلدار اور ریونیو افسران کی تقرری

میری معلومات کے مطابق برطانوی حکومت نے زمین کی ملکیت کو قانونی حیثیت دے دی،جس سے کئی دیہی علاقوں میں رائج اجتماعی یا زبانی ملکیت کا تصور ختم ہوتا چلا گیا۔اس کے نتیجے میں ایک زمیندار طبقہ ابھرا، جبکہ اصل کاشتکار پس منظر میں چلے گئے۔ یہ عمل اس طور ممکن ہوا کہ جو افراد حکومت کے قریب تھے، وہی سب سے زیادہ فائدہ اٹھانے میں کامیاب ہوئے۔اس دور میں زمین پر عائد مالیہ کو پیمائش اور تخمینے کے ذریعے منظم کیا گیا۔کسانوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ مالیہ نقد ادا کریں،جس کے باعث انھیں نقدی فصلیں (جیسے گندم، کپاس،نیل) اگانی پڑیں۔اس سے قبل حکمران فصل کا حصہ خود لے لیا کرتے تھے۔لیکن جب نقد ادائیگی لازمی ہوئی،تو کسانوں کو قرض لینا پڑا اور بعض کو زمین فروخت کرنا پڑی۔ یوں زمین ایک قابلِ فروخت اور تجارتی اثاثہ بن گئی۔اس بندوبست کے نتیجے میں ایک بااثر زمیندار اشرافیہ پیدا ہوئی، جسے برطانوی حکومت کی سرپرستی حاصل تھی۔وفادار زمیندار مسلم اور غیر مسلم دونوں طبقات سے تعلق رکھتے تھے اور رفتہ رفتہ وہ سامراجی نظام کے حامی بن گئے۔اس کے برعکس، چھوٹے کاشتکار اور مزدور زمین سے محروم ہو کر مزارع یا ٹھیکیدار بن گئے۔اس سے دیہی معیشت کا توازن بگڑ گیا اور کئی روایتی پیشے معدوم ہونے لگے۔اس نئے نظام نے معاشرتی درجہ بندی کو ذات پات اور برادریوں کی بنیاد پر مزید مضبوط کیا۔زمیندار ذاتیں، جیسے جٹ، آرائیں اور راجپوت، فائدے میں رہیں جبکہ دیگر طبقات مزید پسماندگی کا شکار ہوئے۔

انتظامی لحاظ سے ایک دیہی بیوروکریسی قائم کی گئی،جس میں پٹواری،نمبردار اور ذیلدار جیسے عہدے شامل تھے۔ یہ عموماً موروثی ہوتے اور حکومت کے وفادار تصور کیے جاتے تھے۔ان کے

ذریعے حکومت نے دیہی آبادی پر مؤثر کنٹرول قائم کیا۔ زمین اور آبادی کا مکمل ریکارڈ محصول، بھرتی اور سماجی نگرانی کے لیے استعمال ہوتا رہا۔ پنجاب کی نظم ونسق میں عمدگی کے باعث برطانوی حکام نے اسے ''ماڈل صوبہ'' قرار دیا۔ تاریخی شواہد یہ بھی ظاہر کرتے ہیں کہ اس استحصالی نظام کے خلاف کسانوں میں بے چینی پیدا ہوئی، جس کا اظہار ''پگڑی سنبھال تحریک'' (1907)، ''غدر تحریک'' اور دیگر عوامی تحریکوں کی صورت میں ہوا۔

یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ قیامِ پاکستان اور بھارت کے بعد بھی برطانوی دور کا زمین کا ریکارڈ سسٹم بدستور جاری رہا، اگرچہ وقتاً فوقتاً کچھ اصلاحات کی گئیں۔ آج بھی پٹواری نظام رائج ہے۔ زمین کے تنازعات اور عدم مساوات کی جڑیں اسی نظام میں پیوستہ ہیں۔ تاہم اب پنجاب میں اس نظام کو جدید بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے، اور زمینوں کا ریکارڈ کمپیوٹرائز کیا جا رہا ہے، جس سے کچھ بہتری دیکھنے میں آئی ہے۔ میرے ذاتی مشاہدے کے مطابق، برطانوی دور میں متعارف کردہ زمین کے ریکارڈ کا نظام پنجاب کی زرعی معیشت، سماجی ساخت اور سیاسی منظرنامے پر گہرے اثرات مرتب کر گیا۔ اس نے اگرچہ انتظامی بہتری اور آمدنی میں اضافہ کیا، لیکن ساتھ ہی زمین کی غیر منصفانہ تقسیم، کسانوں کے استحصال اور سماجی نابرابری کو بھی جنم دیا۔ یہ نظام آج بھی ہمارے دیہی ڈھانچے اور زمین سے متعلق مسائل کو متاثر کر رہا ہے۔

زمینوں کی مسلسل تقسیم کے باعث اب لوگ کاشتکاری سے ہٹ کر کاروبار یا ملازمت کی طرف آ رہے ہیں، جو ایک خوش آئند تبدیلی ہے۔

❁❁❁

برطانوی دور میں پنجاب کی معاشی ترقی
ایک تحقیقی جائزہ

پنجاب کی تاریخ میں اٹھارھویں صدی اور انیسویں صدی کے پہلے نصف کا زمانہ سیاسی ابتری اور مسلسل جنگوں سے عبارت رہا۔ مختلف سیاسی و عسکری قوتیں، جن میں مغل، ابدالی، سکھ اور مراٹھے شامل تھے، اس خطے کے اقتدار کے لیے باہم برسرِ پیکار رہیں۔ ان ریشہ دوانیوں نے نہ صرف ریاستی استحکام کو نقصان پہنچایا بلکہ معاشی، علمی اور سماجی ترقی کو بھی شدید متاثر کیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دورِ حکومت کو اگرچہ ایک مربوط سکھ سلطنت کے قیام کا زمانہ قرار دیا جاتا ہے، تاہم اس عہد میں بھی ریاستی توجہ زیادہ تر عسکری فتوحات اور سلطنت کی توسیع پر مرکوز رہی۔ نتیجتاً، اس دور میں بھی پنجاب میں کوئی دیرپا یا منظم معاشی یا تعلیمی ترقی دیکھنے میں نہ آسکی۔

1849ء میں جب برطانیہ نے پنجاب کو باضابطہ طور پر اپنی نوآبادی بنا لیا، تو اس خطے میں ایک نئے سیاسی اور اقتصادی عہد کا آغاز ہوا۔ برطانوی نوآبادیاتی حکمرانی نے، جو 1947ء تک جاری رہی، پنجاب کی معیشت پر گہرے اور پیچیدہ اثرات مرتب کیے۔ اس تبدیلی کے پیچھے چند بنیادی عوامل کارفرما تھے: برطانوی انتظامیہ کی علمی و انتظامی مہارت، صنعتی انقلاب کے نتیجے میں حاصل شدہ معاشی تجربات، اور اس خطے میں نسبتاً امن و امان کا قیام۔

برطانوی دورِ حکومت میں پنجاب میں ایک منظم اور جدید نہری نظام قائم کیا گیا، جس نے اس خطے کو دنیا کے سیراب ترین زرعی علاقوں میں بدل دیا۔ اس نظام کے باعث زرعی پیداوار میں نمایاں اضافہ ہوا اور پنجاب ایک اہم زرعی مرکز بن کر ابھرا۔ علاوہ ازیں، انگریزوں نے گندم، کپاس اور نیل جیسی نقدی فصلوں کو فروغ دیا، اور جدید زرعی اوزاروں و طریقوں کو متعارف کروایا،

جس سے زرعی معیشت میں معقول بہتری آئی۔

انگریزوں کی جانب سے سڑکوں، ریلوے لائنوں اور پلوں کی تعمیر نے نقل وحمل اور مواصلاتی ڈھانچے کو منظم ومضبوط بنایا، جس سے نہ صرف مقامی بلکہ بین الاقوامی تجارت کو بھی فروغ ملا۔ یہ مربوط انفراسٹرکچر پنجاب کو برصغیر اور بیرونی دنیا سے جوڑنے کا ذریعہ بنا اور ایک منڈی پر مبنی زرعی معیشت کے آغاز کا موجب بنا، جس نے خطے میں معاشی سرگرمیوں اور آمدنی میں اضافہ کیا۔

تاہم، ان ترقیاتی منصوبوں کی ایک قیمت بھی تھی، جو بالآخر پنجاب کے عام لوگوں کو چکانی پڑی۔ برطانوی پالیسیوں کے تحت زمین سے بے دخلی، کسانوں کا معاشی استحصال، بھاری ٹیکسوں کا نفاذ، اور ساہوکاروں کے معاشی تسلط جیسے مسائل دیہی معیشت کے لیے نقصان دہ ثابت ہوئے۔ مزید برآں، نقدی فصلوں پر انحصار نے پنجاب کی معیشت کو عالمی منڈی کی قیمتوں کے اتار چڑھاؤ کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا۔

ان تمام حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ برطانوی نوآبادیاتی دور نے پنجاب کی معیشت پر متضاد اثرات مرتب کیے۔ ایک طرف یہ دور ترقی، جدیدیت اور زرعی اصلاحات کا علمبردار رہا، تو دوسری طرف اس نے معاشی اور سماجی ناہمواریوں کو جنم دیا۔ میری رائے میں یہ تضاد سرمایہ دارانہ نظام کی ایک فطری خصوصیت کے طور پر سامنے آتا ہے، جہاں ترقی کے ثمرات اور نقصانات دونوں ہمہ وقت ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ برطانوی دور میں ہونے والی اس ترقی کا اصل فائدہ کس کو ہوا؟ کیا واقعی ایک خطیر دولت ہندوستان سے برطانیہ منتقل ہوئی؟ اس موضوع پر متعدد مورخین اور محققین نے قلم اٹھایا ہے۔ اس ضمن میں دو نقطہ ہائے نظر سامنے آتے ہیں: ایک وہ طبقہ ہے جو انگریزوں کو جدیدیت کے علمبردار کے طور پر پیش کرتا ہے، اور دعویٰ کرتا ہے کہ اگر وہ نہ آتے تو یہاں ترقی ممکن نہ ہوتی؛ دوسری طرف وہ مؤرخین ہیں جو کہتے ہیں کہ اس تمام ترقی کا فائدہ صرف برطانیہ نے اٹھایا اور مقامی آبادی کو استحصال اور محرومی کا سامنا رہا۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا دونوں نقطہ ہائے نظر میں کچھ صداقت ہے؟ یا ایک مکمل سچ ہے اور دوسرا محض مفروضہ؟ یا شاید سچائی ان دونوں کے درمیان کہیں موجود ہے؟

حال ہی میں مجھے اس موضوع پر ایک مضمون پڑھنے کا موقع ملا، جسے چین کے دو اسکالرز نے تحریر کیا ہے۔ اس مضمون کا عنوان تھا:

"Technology and Colonialism: Public Infrastructure Development in the Punjab during British India"

(ٹیکنالوجی اور نوآبادیات: برطانوی ہندوستان کے دوران پنجاب میں عوامی بنیادی ڈھانچے کی ترقی)۔

یہ مضمون اس بات کا عکاس ہے کہ ترقی اور استحصال کی کہانی ایک ہی سکے کے دو رخ ہو سکتے ہیں۔

اس مضمون میں بتایا گیا ہے کہ انیسویں صدی میں برطانیہ یورپ کی ایک بالادست طاقت بن چکا تھا، اور اس نے سمندر پار علاقوں کو نوآبادیات میں تبدیل کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ 1757ء میں برصغیر پر برطانوی تسلط کا آغاز طاقت کے استعمال سے ہوا، اور فروری 1858ء میں ''گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ'' کے نفاذ کے بعد برطانیہ نے ہندوستان پر براہِ راست حکمرانی کا آغاز کیا۔ اس سے قبل یہاں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت قائم تھی۔ بعدازاں یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ برطانیہ نے نوآبادیاتی توسیع کے عمل میں جدید ٹیکنالوجی کا استعمال کرتے ہوئے بیرونِ ملک نوآبادیات کے قیام اور ان کے انتظام کو ممکن بنایا۔ اپنے قومی مفادات کے حصول کے لیے برطانیہ نے نوآبادیاتی علاقوں میں ترقیاتی تعمیرات کا وسیع منصوبہ شروع کیا، اور یہی طرزِ عمل ہمیں پنجاب میں بھی نظر آتا ہے۔

پنجاب کی مخصوص جغرافیائی ساخت کے باعث یہ خطہ اناج کی پیداوار کا ایک قدرتی مرکز بن سکتا تھا، جبکہ اس کی وسیع زرعی زمینیں اور بڑی آبادی برطانوی مصنوعات کے لیے منافع بخش منڈی کی حیثیت رکھتی تھیں۔ صنعتی خام مال کی فراہمی اور نوآبادیاتی حکمرانی کے تقاضوں کو مدِنظر

رکھتے ہوئے برطانیہ نے برصغیر بھر میں، اور بالخصوص بعد ازاں پنجاب میں، وسیع پیمانے پر ترقیاتی منصوبوں کا آغاز کیا۔ اگرچہ یہ عمل جنوبی ہندوستان سے شروع ہوا، پنجاب کی باری قدرے تاخیر سے آئی۔

پنجاب ایک زرخیز دریائی میدان تھا، جو زرعی پیداوار کے لیے نہایت موزوں تھا۔ اسی سبب مغلیہ اور سکھ ادوار میں آبی وسائل اور آبپاشی کے نظام کو نہایت اہم سمجھا جاتا تھا۔ برطانوی دور میں اس ضمن میں مزید پیش رفت ہوئی، اور آبپاشی، آبی نظام اور ریلوے کی تعمیر میں جدید ٹیکنالوجی کا استعمال کیا گیا۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اٹھارھویں صدی میں مشینی پیداوار کا آغاز ہوا اور صنعت کا انقلاب برپا ہوا، جس نے معیشت، پیداوار اور ٹیکنالوجی کے میدان میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کیں۔ یہ انقلاب برطانیہ کو دنیا کی پہلی صنعتی طاقت بنانے کا سبب بنا۔ کوئلے اور لوہے کے وسیع ذخائر، خصوصاً شمالی انگلینڈ میں، اس تبدیلی میں کلیدی کردار ادا کرتے رہے۔

ان ہی ترقیات کے باعث برطانوی دور میں پنجاب میں متعدد اہم منصوبے مکمل ہوئے۔ جیسا کہ پہلے صفحات میں ذکر کیا گیا ہے، نہری نظام کی ترقی نمایاں رہی۔ نہری کالونیوں کے قیام کے ابتدائی دور میں نہ تو ریلوے تھی اور نہ سڑکیں۔ فصلوں کی کٹائی کے بعد نقل و حمل کی سہولت نہ ہونے کے باعث قیمتوں پر منفی اثر پڑتا تھا۔ اسی دوران 1846ء میں امریکہ میں ''کپاس کا بحران'' آیا، جس کے باعث مانچسٹر کے تاجروں نے برصغیر کو کپاس کی فراہمی کا متبادل ذریعہ بنایا۔

مزید برآں، بغاوتوں اور شورش زدہ علاقوں تک فوری رسائی کی ضرورت نے برطانوی حکام کو مجبور کیا کہ وہ پنجاب میں ریلوے اور سڑکوں کی تعمیر کو ناگزیر سمجھیں۔ اس وقت تک برصغیر میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت قائم تھی، جو برطانوی مفادات کی تکمیل کے لیے سرگرم عمل تھی۔ 1853ء میں لارڈ ڈلہوزی نے ریلوے کو سماجی ترقی کا ذریعہ قرار دیا اور اس کے قیام کے اصول و مقاصد واضح کیے۔ ان کے مطابق، ریلوے تجارتی رابطوں کو مضبوط بنانے کے ساتھ ساتھ برطانوی اور ہندوستانی معیشت کے باہمی تبادلے کو فروغ دے گی۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ریلوے کی تعمیر کا مقصد صرف تجارتی تھا یا اس میں سیاسی

مفادات بھی شامل تھے؟ میرے خیال میں اس منصوبے کی نوعیت دفاعی زیادہ تھی۔ اس نئے نظام نے برطانوی حکام اور افواج کو نقل وحرکت کی تیز سہولت دی، جس سے ان کی اقتدار پر گرفت مضبوط رہی۔ ریلوے کی بدولت پنجاب کے سماجی، اقتصادی، انسانی اور سیاسی شعبوں پر دیرپا اثرات مرتب ہوئے۔ برطانوی ایجادات نے پورے برصغیر میں ایک معاشی انقلاب کی بنیاد رکھی۔ اسی دور میں برطانوی سرمایہ کار تیزی سے ہندوستانی ریلوے منصوبوں میں شامل ہوئے، جس سے نہ صرف ریلوے کی تعمیر میں تیزی آئی بلکہ متعلقہ علاقوں میں معاشی سرگرمیوں میں بھی اضافہ ہوا۔ ریلوے کی تعمیر نے نوآبادیاتی بنیادی ڈھانچے کو مضبوط بنایا، اور ایک مربوط نیٹ ورک نے پورے برصغیر کو جوڑ دیا۔ اس سے سامان کی ترسیل میں اضافہ ہوا، جس نے نوآبادیاتی معیشت کو مستحکم کیا۔ دوسری طرف، ریلوے کی ترقی نے خود برطانیہ کی خوشحالی میں بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ریل کے نظام نے برطانیہ کو عالمی سیاسی واقتصادی منظرنامے میں مزید طاقتور بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔

اس مضمون میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ برطانوی حکومت کے دور میں ریلوے کی تعمیر کو خصوصی اہمیت دی گئی، اور اس سے جڑے علاقوں میں اقتصادی ترقی اور نقل وحمل کے شعبے میں وسعت پیدا ہوئی۔ 1880ء تک برطانوی ہندوستان میں ایک مکمل ریلوے نظام قائم ہو چکا تھا، اور ریلوے لائن کی لمبائی کے لحاظ سے یہ نظام ایشیا میں سرفہرست تھا، جو برطانوی سرمایہ کاری کی مرہونِ منت تھا۔

یہاں ایک بات کا تذکرہ کرنا بے حد ضروری ہے۔ یہ بات سب ہی جانتے تھے کہ اس دور میں برطانوی ہندوستان میں مقامی سرمائے کی شدید کمی تھی۔ چنانچہ ریلوے میں سرمایہ کاری کا انحصار زیادہ تر برطانیہ سے آنے والے سرمائے پر تھا، جو دراصل ایک قسم کی غیر ملکی سرمایہ کاری تھی۔ جب یہ منصوبے مکمل ہوئے تو ان سرمایوں پر سود کی ادائیگی کے لیے ہندوستانی حکام کو نہ صرف مالی بوجھ برداشت کرنا پڑا بلکہ ریلوے سے حاصل ہونے والے بیشتر فوائد بھی برطانیہ کو منتقل کرنا پڑے۔ مجموعی طور پر، اگرچہ اس دور میں برطانوی سرمائے نے ہندوستان میں ریلوے کی تعمیر کو تیز

کیا، لیکن اسی سرمایہ کاری سے برطانوی تاجروں اور حکومت نے مستحکم منافع اور سیاسی فوائد بھی حاصل کیے۔ یعنی جو سرمایہ کاری یہاں کی گئی، وہ کئی گنا منافع کے ساتھ واپس برطانیہ چلی گئی، جس کے نتیجے میں ہندوستان میں سرمائے کی ایک نئی کمی پیدا ہو گئی۔

پچھلے صفحات میں بیان کردہ نکات کے پس منظر میں یہ کہنا بجا ہوگا کہ برطانوی دور میں جدید آبپاشی، نہری نظام، ریلوے اور سڑکوں کی ٹیکنالوجی کے استعمال سے نہ صرف برصغیر بلکہ خود برطانیہ پر بھی گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ اسی طرح جدید ٹیکنالوجی کی بدولت ہندوستان کی سماجی، سیاسی اور معاشی ترقی میں ایک نیا موڑ آیا۔

اس مضمون میں مزید یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ جدید نہری آبپاشی کا نظام اور ریلوے ٹیکنالوجی نہ صرف پنجاب کی جدت (modernization) کی علامت بنے بلکہ اس کی ترقی کا محرک بھی ثابت ہوئے۔ زراعت کے فروغ کے ساتھ ساتھ پنجاب میں شہری آبادی میں بھی تیزی سے اضافہ ہوا۔ زرعی پیداوار کی بڑے پیمانے پر تجارت، اور صارف اشیاء کی تیاری و فروخت نے کئی تجارتی مراکز اور کاروباری اداروں کو جنم دیا۔ دیہی اور زرعی خوشحالی نے برطانیہ اور برطانوی ہندوستان کے دیگر علاقوں سے آنے والی مصنوعات کے لیے ایک وسیع منڈی مہیا کی۔ اسی دوران، پنجاب کی منڈیاں برطانوی ہندوستان کے دیگر علاقوں اور عالمی منڈیوں سے بھی منسلک ہوتی چلی گئیں، کیونکہ نارتھ ویسٹرن ریلوے (North-Western Railway) کا نیٹ ورک تیزی سے وسعت اختیار کر رہا تھا۔

اگر مجھ سے یہ سوال کیا جائے کہ برطانوی استعمار کی کون سی خصوصیت نے پنجاب کے سماجی و تہذیبی ڈھانچے پر سب سے گہرا اثر ڈالا، تو میرا جواب ہوگا کہ انگریزی زبان کو سرکاری، تعلیمی اور عدالتی شعبوں میں نافذ کرنے، ریل اور نہری نظام کی تشکیل، جدید مغربی طرز کے تعلیمی اداروں کا قیام، پارلیمانی طرزِ حکومت، نوآبادیاتی طرز کا دفتری نظم و نسق، اور عدالتی قواعد و ضوابط وہ بنیادی عوامل تھے جنھوں نے پنجاب کے معاشرتی ڈھانچے کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔

تاہم، برطانوی حکمتِ عملی اور سیاسی فیصلوں نے نہ صرف برصغیر کی وحدت کو پارہ پارہ کیا

بلکہ دو نئے ممالک بھارت اور پاکستان کے مابین ایک مستقل مخاصمت، تقسیم، فسادات، مسئلہ کشمیر اور جنگوں کی بنیاد رکھ دی۔ اس کے ساتھ ساتھ، نوآبادیاتی نظام نے مصنوعی سرحدوں، نسلی ولسانی تنازعات، معاشی استحصال، سماجی ناہمواری، تعلیم کے محدود و استحصالی ڈھانچے، جاگیردارانہ وراثت، اور ترقی کے بجائے صرف استحصال پر مبنی بنیادی ڈھانچے کو جنم دیا۔ کرپشن، آمریت پسندی، فرقہ وارانہ سیاست، ثقافتی بیگانگی اور قومی شناخت کے بحران بھی اسی نوآبادیاتی ورثے کی باقیات ہیں۔ برطانوی استعمار نے ایسے سیاسی طبقات کی پرورش کی جو اس نظام کے نہ صرف حامی تھے بلکہ آزادی کے بعد بھی اسی طرزِ فکر کے علمبردار رہے۔

برطانوی تسلط کا سب سے افسوسناک پہلو یہ ہے کہ جب وہ یہاں موجود تھے، ہم ان کے محکوم تھے؛ اور جب وہ رخصت ہو گئے، تو ہم میں سے ایک بڑی تعداد نے ان کے دیس جا کر رضا کارانہ طور پر اسی غلامی کو قبول کرنا پسند کیا۔ آج بھی ہزاروں لوگ مغربی ممالک کی جانب ہجرت کو فخر اور نجات کی علامت سمجھتے ہیں۔

اس تاریخی تسلسل کو میں ''جسمانی غلامی سے ذہنی غلامی تک کے سفر'' کا نام دیتا ہوں ایک ایسا سفر جس نے ہمیں اپنی زبان، ثقافت، اور خودی سے دور کر دیا۔

اگرچہ پنجاب نے 1947ء سے پہلے برطانوی راج کے خلاف مزاحمت کی، لیکن آزادی کے بعد کے دانشوروں اور حکمرانوں نے مغربی اداروں، ثقافت اور ہجرت کو غیر تنقیدی طور پر اپنانا شروع کر دیا۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ ہم ظاہری آزادی کے باوجود ذہنی طور پر ابھی تک مکمل طور پر آزاد نہیں ہو سکے۔ برطانوی راج نے پنجاب کے معاشرتی، سیاسی اور معاشی ڈھانچے کو ایسے تبدیل کیا کہ اس کے اثرات آج بھی محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ شاید اس کا سب سے بڑا نقصان غلامی کی ذہنیت کا تسلسل ہے، جس میں ترقی کا مطلب مغرب کی تقلید سمجھا جاتا ہے۔ حقیقی آزادی صرف سیاسی نہیں بلکہ اداروں، سوچ اور شناخت کو نوآبادیاتی اثرات سے مکمل نجات دلانے کا نام ہے۔

بقول ممتاز شاعر درشن سنگھ آوارہ؛

اوہ ویلے دے زخماں توں اجے تک ساہ وی زخمی اے،

ساڈی بولی، ساڈی سوچ، اجے تک قیدی اے۔

یہاں میں ایک بات کا ذکر کرنا چاہوں گا، اس کا تعلق حکمرانوں کا عوام سے مال و دولت حاصل کرنا ہے۔

تاریخ میں کئی حملہ آوروں یا قابض گروہوں یا بادشاہوں جنھوں نے پنجاب پر حملے کیے کو ڈاکو کہا گیا ہے۔ جیسے ہمارے دوست امجد وڑائچ نے احمد شاہ ابدالی کو ڈاکو کہا ہے۔ اسی طرح سکھ مِسلوں بارے کہا جاتا ہے کہ وہ بھی لوگوں سے زبردستی مال وصول کرتے تھے۔ اسی طرح نادر شاہ نے بھی دہلی کو لوٹا۔ مغل دور میں کئی طرح کے ٹیکس وصول کیے جاتے تھے۔ برطانوی دور میں باقاعدہ ٹیکس کا محکمہ قائم کیا گیا۔

یہ بات تو ہم سب ہی جانتے ہیں کہ ہر ریاست کو کام کرنے کے لیے وسائل کی ضرورت ہوتی ہے، چاہے وہ انتظامیہ، دفاع، یا عوامی بہبود کے لیے ہو۔ منظم ریاستوں میں، یہ منظم ٹیکس کے ذریعے حاصل کیا جاتا ہے، جہاں شہری اپنی آمدنی یا تجارتی آمدنی کا ایک حصہ گورننس، سیکورٹی اور انفراسٹرکچر کے بدلے میں دیتے ہیں۔ ٹیکس باضابطہ قوانین کے تحت جمع کیے جاتے ہیں۔ اس کام کے لیے ایک مکمل نظام وضع کیا جاتا ہے۔ اس کے بدلے ریاست عوام کو سہولیات کے ساتھ ساتھ تحفظ فراہم کرتی ہے۔

دوسری طرف حملوں، بغاوتوں کے دوران بادشاہ یا سربراہ اپنی مالی ضروریات جبری وصولیوں سے پوری کرتے ہیں۔ اس میں لوٹ (غارتگری)، چھاپوں کے ذریعے دولت پر قبضہ کرنا، اکثر جنگ کے دوران، خراج وصول کرنا، پروٹیکشن منی جسے راکھی بھی کہا جاتا ہے وصول کرنا (جیسے اٹھارہویں صدی میں پنجاب میں سکھوں نے مغلوں کے ساتھ کیا) شامل ہیں۔ یہ بات درست ہے کہ ٹیکس حکمرانوں اور شہریوں کے درمیان ایک سماجی معاہدے کی عکاسی کرتا ہے، جبری وصولی طاقت کے عدم توازن اور عدم استحکام سے ہوتی ہے۔ تاریخی طور پر، رنجیت سنگھ کے

تحت سکھ سلطنت جیسی منظم ریاستوں نے سیاسی ارتقاء کا مظاہرہ کرتے ہوئے لوٹ پر مبنی نظام سے رسمی ٹیکس کی طرف منتقلی کی۔

ان دونوں میں کلیدی فرق جو نظر آتا ہے، اس کے مطابق ٹیکس ایک باقاعدہ نظام کے تحت خاص مقدار میں اکٹھا کیا جاتا ہے۔اس میں بھی زبردستی کا عنصر شامل ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں جب انگریزوں نے چونگی کا نظام رائج کیا تو کسی کو بھی استثنا حاصل نہیں تھا۔ چونگی نہ ادا کرنے پر گیارہ گنا جرمانہ کیا جاتا ہے۔ آج بھی دنیا بھر میں ٹیکس نہ دینا ایک بہت بڑا جرم سمجھا جاتا ہے۔ دوسری طرف جب کوئی باقاعدہ نظام میں ہوتا، تو مالی ضروریات زبردستی جمع کی جاتی ہیں۔ یہ ایک بے قاعدہ، اور غیر مستحکم نظام ہوتا ہے۔

یہ سب بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہر ریاست کو اپنے نظم و نسق، دفاع، عدلیہ اور دیگر عوامی خدمات کی انجام دہی کے لیے مالی وسائل درکار ہوتے ہیں۔ یہ وسائل عموماً ٹیکس کی صورت میں حاصل کیے جاتے ہیں، جو شہریوں سے ایک منظم نظام کے تحت وصول کیے جاتے ہیں۔ جب ریاست مضبوط، منظم اور باقاعدہ اداروں پر مشتمل ہوتی ہے، تو محصول (ٹیکس) کی وصولی قانون اور اصولوں کے تحت کی جاتی ہے۔ تاہم، جب ریاست غیر منظم ہو یا عبوری دور سے گزر رہی ہو، تو وسائل کا حصول اکثر زبردستی، لوٹ مار یا جبری وصولیوں کے ذریعے کیا جاتا ہے، جسے معاشرتی، معاشی اور اخلاقی لحاظ سے غیر مستحکم عمل سمجھا جاتا ہے۔ اس فرق سے ریاستی ڈھانچے کی پختگی اور حکمرانی کے معیار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہی کام پنجاب پر ملکی وغیر ملکی حکمرانوں نے کیا۔ اس لیے کسی ایک کو ڈاکو یا لٹیرا نہیں کہا جا سکتا۔ جو بھی پنجاب پر حملہ آور ہوا، اس نے یہاں عوام سے مال و دولت حاصل کرنے کے لیے اپنی ضرورت کے مطابق طریقے استعمال کیا۔ کسی سے تلوار کے زور پر اور کسی نے جزیے کے نام پر اور کسی نے ٹیکس کے نام پر۔

❀❀❀

برطانوی دور میں پنجاب کی سیاسی سرگرمیاں
ایک تحقیقی وتنقیدی جائزہ

برطانوی استعمار کا دور، جو کم و بیش ایک صدی پر محیط تھا، پنجاب کی سیاسی، سماجی اور فکری تاریخ میں غیر معمولی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ اس دور پر مختلف پس منظر رکھنے والے مورخین نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، جنھیں عمومی طور پر تین نمایاں گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: برصغیر کے مقامی مؤرخین (ہندو، مسلمان اور سکھ)، برطانوی مورخین، اور قیامِ پاکستان کے بعد پاکستان میں بسنے والے مسلمان محققین۔ ان کے علاوہ بعض یورپی اسکالرز نے بھی اس موضوع پر کام کیا ہے، تاہم مؤرخانہ روایت میں زیادہ نمایاں اور مؤثر انھی تین گروہوں کو سمجھا جاتا ہے۔

جب اس عہد کی سیاسی تبدیلیوں اور تحریکی سرگرمیوں کا مطالعہ کیا جائے تو ایک پیچیدہ، متضاد اور بعض اوقات مبہم بیانیہ سامنے آتا ہے، جو قاری کو حقائق کی تلاش میں الجھن میں ڈال دیتا ہے۔ اسی تضاد کو مدنظر رکھتے ہوئے، اس مضمون میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ مکمل تاریخی تفصیل میں جانے کے بجائے برطانوی دور میں پیش آنے والے چند نمایاں اور مرکزی سیاسی واقعات کا انتخاب کر کے ان کا تنقیدی جائزہ لیا جائے، تاکہ قاری کو اس دور کی عمومی سیاسی فضا اور اس کے سماجی اثرات کا ایک جامع اور بامعنی خاکہ فراہم کیا جا سکے۔

اگرچہ ان واقعات کی مکمل تفصیل سے گریز کیا گیا ہے، تاہم ان واقعات کے پنجاب کی سماجی ساخت اور عوامی ذہنیت پر پڑنے والے اثرات کا تجزیاتی انداز میں جائزہ ضرور پیش کیا گیا ہے۔ میرے مشاہدے اور مطالعے کے مطابق، اس دور میں پنجاب کے معاشرے میں جو تہذیبی و فکری تبدیلیاں رونما ہوئیں، ان کی بنیادی نوعیت پر مؤرخین کا عمومی اتفاق موجود ہے، اگرچہ

تفصیلات اور ترجیحات میں فرق ضرور پایا جاتا ہے۔

یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ برطانوی حکمرانی کے دوران پنجاب مختلف سیاسی مراحل سے گزرا۔سکھ سلطنت کے خاتمے کے بعد انگریزوں نے اس خطے کو نہ صرف ایک فوجی وزرعی مرکز کے طور پر استعمال کیا، بلکہ یہاں کی انتظامی، تعلیمی اور معاشی ساخت کو بھی نوآبادیاتی مفادات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی۔تاہم رفتہ رفتہ پنجاب کے مختلف طبقات میں سیاسی شعور بیدار ہوا اور عوام آزادی کی قومی تحریکوں میں فعال کردار ادا کرنے لگے۔یہاں یہ تجزیہ پیش کیا جارہا ہے کہ یہ سیاسی شرکت کب، کیوں، کن محرکات کے تحت، اور کس قیادت کے تحت عمل میں آئی؟ اور ان سرگرمیوں کے پنجاب اور برصغیر کی سیاست پر کیا اثرات مرتب ہوئے؟

1857ء کی جنگِ آزادی میں پنجاب کا کردار: ایک تحقیقی جائزہ

1857ء کی جنگِ آزادی، جسے بعد میں ہندوستان کی پہلی آزادی کی تحریک کہا گیا، پنجاب میں برطانوی قبضے کے محض آٹھ سال بعد پھوٹ پڑی۔اس بغاوت نے پورے ملک میں شدید اثرات مرتب کیے، اور اس کے بارے میں مختلف نظریات پائے جاتے ہیں۔سر سید احمد خان نے اس واقعے کو ''بغاوت'' قرار دیا اور اسبابِ بغاوت کے عنوان سے ایک کتابچہ بھی تصنیف کیا۔لیکن اس جنگ میں پنجاب کے کردار کا جائزہ ایک پیچیدہ موضوع ہے، جس پر ذیل میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

1849ء میں سکھ سلطنت کے خاتمے کے بعد پنجاب پر انگریزوں کی گرفت مضبوط ہو چکی تھی۔اس وقت پنجاب میں کوئی طاقتور خودمختار ریاست موجود نہ تھی۔سکھوں کی شکست کے بعد مسلم طبقات نے ایک عارضی سکون محسوس کیا، کیونکہ ان کے نزدیک سکھوں سے نجات ایک مثبت تبدیلی تھی۔دوسری جانب، پنجاب کی بیشتر ریاستوں اور سرداروں نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی بڑھتی ہوئی طاقت سے آزادی حاصل کر کے انگریزوں سے دوستی کا رشتہ قائم کیا۔اس لیے جنگِ آزادی کے دوران زیادہ تر سکھ سرداروں اور ریاستوں نے انگریزوں کے ساتھ تعاون کیا، کیونکہ وہ مغلوں اور مسلمانوں کے خلاف برطانوی حمایت کو اپنی سیاسی بقا کے لیے مفید سمجھتے تھے۔اگرچہ پنجاب میں وسیع پیمانے پر بغاوت یا قومی تحریک کا کوئی بڑا مرکز نہیں تھا، لیکن کچھ محدود اور مقامی مزاحمتی

کارروائیاں ضرور ہوئیں، جنھیں برطانوی فورسز نے سختی سے کچل دیا۔

اس موضوع پر ڈاکٹر تراب الحسن سرگانا نے

Punjab and the War of Independence 1857-1858: From Collaboration to Resistance.

کے عنوان سے تحقیقی کام کیا ہے۔ انھوں نے اس روایت کو چیلنج کیا کہ پنجاب نے مکمل طور پر برطانوی حکومت کا ساتھ دیا تھا۔ سرگانا کے مطابق اگرچہ پنجاب کے حکمران طبقے نے انگریزوں کی حمایت کی، لیکن عام عوام اور مقامی فوجیوں نے کئی جگہوں پر برطانوی تسلط کے خلاف مزاحمت کی، جسے اکثر نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ میں ذاتی طور پر ان کے مؤقف سے جزوی اتفاق رکھتا ہوں اور اسے تاریخی حقائق کے قریب سمجھتا ہوں۔

برطانوی جنرل فریڈرک سلیگ رابرٹس نے، جنھوں نے 41 سال ہندوستان میں فوجی خدمات سرانجام دیں، اپنی سوانح عمری

Forty-One years in India: From Subaltern to Commander-in-Chief.

میں 1857ء کی جنگِ آزادی کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب 1897ء میں شائع ہوئی اور برطانوی دور میں فوجی و سیاسی حالات کا ایک معتبر دستاویز شمار ہوتی ہے۔ (میں نے یہ کتاب قدرے تفصیل سے پڑھی ہے۔ برطانوی دور کو سمجھنے کے لیے یہ ایک مفید کتاب ہے۔) رابرٹس نے اپنی اس کتاب میں پنجاب سمیت مختلف علاقوں میں جنگِ آزادی کی صورتِ حال بیان کی ہے، مگر ان کی روایت میں کہیں بھی عوامی سطح پر کوئی وسیع یا منظم مزاحمت نظر نہیں آئی۔ ان کے مطابق یہ بغاوت محدود گروہوں کی کارروائیوں تک محدود رہی اور پنجاب میں عوامی بغاوت کا کوئی واضح سرکردہ لیڈر بھی سامنے نہیں آیا۔

1857ء کی جنگِ آزادی میں پنجاب کے کردار کو یکسر برطانوی حمایت کے طور پر دیکھنا ایک عام تاثر ہے، لیکن جدید تحقیقی جائزے اس تاثر کو مکمل طور پر درست نہیں سمجھتے۔ اگرچہ سیاسی اور حکومتی سطح پر پنجاب کے سرداروں نے برطانوی راج کا ساتھ دیا، تاہم مقامی سطح پر بعض مزاحمتی

تحریکیں اور عوامی احتجاج ضرور ہوئے جنھیں عموماً نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ اس لیے پنجاب کے سیاسی اور سماجی کردار کو ایک متوازن اور تحقیقی نظر سے دیکھنا ضروری ہے۔

عمومی تاثر یہ پایا جاتا ہے کہ رائے احمد خان کھرل نے 1857ء کی جنگِ آزادی میں ایک اہم اور فعال کردار ادا کیا۔ اگرچہ ان کی شرکت کو مکمل طور پر رد نہیں کیا جا سکتا، تاہم اس ضمن میں مستند دستاویزی شواہد اور تحقیقی مواد نسبتاً کم دستیاب ہیں۔ میرے مطالعے کے مطابق، رائے احمد خان کھرل کی مزاحمت کو عموماً ایک مقامی سطح کی بغاوت یا گوریلا جنگ کے طور پر دیکھا جاتا ہے، جس نے انگریزی حکمرانی کے خلاف عوامی ردعمل کی ایک مخصوص صورت اختیار کی۔

یہ سوال کہ آیا یہ مقامی مزاحمت 1857ء کی جنگِ آزادی کا وہی حصہ تھی، جس کا آغاز 10 مئی 1857ء کو میرٹھ میں فوجیوں کی بغاوت سے ہوا اور جس کی قیادت بہادر شاہ ظفر نے کی، ایک پیچیدہ مسئلہ ہے۔ میرے خیال میں رائے احمد خان کھرل کی جدوجہد بلاشبہ قابلِ احترام اور اہم تھی، مگر اسے اس بڑے قومی تاریخی تناظر کا حصہ قرار دینا، محدود شواہد کی بنیاد پر مشکل ہے۔

ڈاکٹر تراب الحسن سرگانا اپنی تحقیق میں برطانوی سرکاری دستاویزات، جیسے ''بغاوت کی رپورٹس'' (*Mutiny Reports*) اور ''بغاوت کی خط و کتابت'' (*Mutiny Correspondence*) کا حوالہ دیتے ہیں۔ ان کے مطابق پنجاب کے مختلف علاقوں مثلاً گوگیرہ، مری، جھجر اور ہریانہ میں عوامی بغاوتیں اور مسلح مزاحمت کے واقعات رونما ہوئے۔ ان بغاوتوں میں شامل نمایاں شخصیات میں رائے احمد خان کھرل کے علاوہ سرنگ کھرل، بہاول فتیانہ، مراد فتیانہ، ولیدادمردانہ، موکھا ویہنیوال اور نادر شاہ قریشی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

سرگانا اس بات پر زور دیتے ہیں کہ روایتی مورخین نے عموماً 'بالائی سطحی نقطۂ نظر' (Top-down Approach) اختیار کیا ہے، جس میں اشرافیہ اور حکومتی سطح کے کردار کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے، جبکہ عوامی سطح پر ہونے والی مزاحمت کو نظرانداز کیا گیا ہے۔ ان کا موقف ہے کہ پنجاب کے عام عوام نے بھی آزادی کی اس جدوجہد میں نمایاں حصہ لیا، لیکن ان کی قربانیوں اور جدوجہد کو تاریخی بیانیے میں مناسب مقام نہیں دیا گیا۔

یہ تحقیقاتی تجزیہ واضح کرتا ہے کہ 1857ء کی جنگِ آزادی میں پنجاب کا کردار صرف برطانوی راج کی وفاداری تک محدود نہیں تھا، بلکہ عوامی سطح پر بھی برطانوی حکمرانی کے خلاف مزاحمت موجود تھی۔ تاہم، اس مزاحمت کو تاریخی روایت میں کم اہمیت دی گئی، جسے حالیہ تحقیقی جائزوں کی روشنی میں ازسرِ نو اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی سے تاجِ برطانیہ تک: پنجاب پر اثرات کا ایک تجزیاتی مطالعہ

1857ء کی جنگِ آزادی کے وقت ہندوستان میں اقتدار ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ میں تھا، لیکن اس خونی بغاوت کے نتیجے میں 1858ء میں کمپنی کی حکمرانی کا خاتمہ کر دیا گیا اور برطانوی حکومت نے ہندوستان کا انتظام براہِ راست اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس تبدیلی کی وجوہات سے قطع نظر، زیرِ نظر مضمون میں اس اقدام کے پنجاب پر مرتب ہونے والے سیاسی، عسکری، معاشی اور سماجی اثرات کا جائزہ لیا جائے گا۔ یہ منتقلی محض ادارہ جاتی یا انتظامی اصلاح نہ تھی، بلکہ اس نے پنجاب کی ساخت کو ہمہ جہت انداز میں تبدیل کر دیا۔

1۔ بیوروکریٹک مرکزیت اور نوآبادیاتی طرزِ حکمرانی: برطانوی تاج کے تحت پنجاب میں ایک سخت مرکزی بیوروکریسی قائم کی گئی۔ لیفٹیننٹ گورنر کو تمام انتظامی، عدالتی اور فوجی اختیارات سونپے گئے۔ مقامی سطح پر ڈپٹی کمشنرز اور مجسٹریٹس کے ذریعے ضلع وار نظم و نسق کا نیا نظام رائج کیا گیا۔ عوامی سرگرمیوں پر گہری نظر رکھنے کے لیے ایک مربوط انٹیلی جنس نظام تشکیل دیا گیا، جس نے کسی بھی مزاحمتی آواز کو آغاز ہی میں دبا دیا۔

2۔ عسکری مرکزیت اور "مارشل ریس" کا تصور: برطانوی حکومت نے پنجاب کو ایک وفادار صوبے کے طور پر تسلیم کرتے ہوئے یہاں کے بعض نسلی گروہوں کو "مارشل ریس" (یعنی جنگجو قومیں) قرار دیا: سکھ، مسلمان راجپوت، جٹ اور ڈوگرہ افراد کو فوج میں بھرتی کیا گیا۔ یہ عمل صرف داخلی نظم و نسق کے لیے نہ تھا، بلکہ انھیں افغانستان، برما اور افریقی نوآبادیات میں لڑنے کے لیے استعمال کیا گیا۔ یوں پنجاب، تاجِ برطانیہ کی ایک فوجی تجربہ گاہ میں تبدیل ہو گیا۔

3- زرعی اصلاحات، نہری کالونیاں اور جاگیردار طبقے کی تشکیل: برطانوی حکومت نے پنجاب کو زرعی استحکام کا مرکز بنانے کے لیے نہری کالونیوں (چناب، جہلم، لوئر بار) کا قیام عمل میں لایا، جہاں زرخیز زمینیں مخصوص طبقات کو عطا کی گئیں۔ وفادار فوجیوں، زمینداروں اور اشرافیہ کو جاگیریں دی گئیں، جس سے ایک نیا مراعات یافتہ طبقہ ابھرا۔ ایک مربوط محصولی نظام متعارف کرایا گیا، جس نے اگرچہ زراعت کو ترقی دی، مگر اس کے نتیجے میں سماجی ناہمواری اور طبقاتی استحصال کو بھی فروغ ملا۔

4- وفادار اشرافیہ کی سرپرستی اور استعماری اتحاد: برطانوی حکام نے ایک خاص طبقے کو اپنے اقتدار کا مقامی محافظ بنانے کے لیے نوابوں، وڈیروں اور مذہبی رہنماؤں کو خطابات، جاگیریں اور سیاسی مراعات دیں۔ یہ طبقہ نہ صرف سیاسی فیصلوں میں شریک رہا، بلکہ عوامی مزاحمت کو دبانے میں حکومت کا معاون بھی ثابت ہوا۔ یوں ایک ایسی وفادار اشرافیہ وجود میں آئی، جو استعماری نظام کی پشت پناہ بن گئی۔

5- مزاحمتی تحریکات کا قلع قمع: برطانوی حکومت نے اقتدار کی مرکزیت کے ساتھ ساتھ پنجاب میں کسی بھی مزاحمتی رجحان کو فوجی طاقت، جاسوسی اور گرفتاریوں کے ذریعے ختم کیا۔ گوگیرہ، جھنگ، مری اور ہریانہ جیسے علاقوں میں مقامی بغاوتوں کو کچلا گیا۔ ایسے رہنماؤں کو ''غدار'' اور ''مجرم'' قرار دیا گیا، جو عوامی ہیروز تھے۔ جیسے رائے احمد خان کھرل۔

6- تعلیم اور عدالتی اصلاحات کے ذریعے ذہنی استعمار: تاجِ برطانیہ نے جدید تعلیم اور عدالتی نظام کے ذریعے انگریزی زبان، قانون اور اقدار پر مبنی نظامِ تعلیم رائج کیا (مثلاً گورنمنٹ کالج لاہور)۔ ایک وفادار تعلیمی اشرافیہ تیار کی گئی، جو انتظامیہ اور عدلیہ میں کلیدی کردار ادا کرے۔ عدالتی نظام میں موت، اپیل اور سزا کے اصول انگریزی قوانین سے ہم آہنگ کر دیے گئے۔

میرے نزدیک اس کا ایک اہم نتیجہ یہ نکلا کہ پنجاب مکمل نوآبادیاتی گرفت میں آ گیا۔ 1858ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی سے برطانوی تاج کو اقتدار کی منتقلی، پنجاب میں نوآبادیاتی

اقتدار کے ایک نئے اور مضبوط دور کا آغاز ثابت ہوئی۔ ایک جانب مخصوص طبقات کو فائدہ پہنچا، جن میں فوجی، زمیندار اور اشرافیہ شامل تھے، تو دوسری جانب عام عوام کو سیاسی آزادی، معاشی مساوات، اور سماجی انصاف سے محروم کر دیا گیا۔ اگرچہ ترقیاتی منصوبے، نہری نظام، اور تعلیم کا فروغ دکھائی دیا، لیکن ان سب کا اصل مقصد استعماری مفادات کا تحفظ اور پنجاب کو برطانوی سلطنت کا وفادار فوجی و اقتصادی اڈہ بنانا تھا۔

یہ امر بھی قابلِ اعتراف ہے کہ برطانوی اقدامات کے نتیجے میں پنجاب میں بعض شعبوں میں معاشی اور سماجی ترقی کے آثار نمایاں ہوئے۔ نہری نظام، زرعی اصلاحات، اور تعلیمی اداروں کا قیام اس ضمن میں اہم اقدامات تھے۔ تاہم، ان فوائد کے مقابلے میں جو نقصانات قوم کو برداشت کرنا پڑے، ان کا سنجیدہ تجزیہ بھی نہایت ضروری ہے۔ درحقیقت، اس دور کو بجا طور پر پنجاب کی مکمل ذہنی، سیاسی اور معاشی غلامی کا زمانہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس سے بھی زیادہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اس نوآبادیاتی نظام نے جو تہذیبی و فکری تبدیلیاں متعارف کروائیں، جن میں زبان، لباس، طرزِ فکر، طرزِ عمل اور اپنی روایات سے تدریجی لاتعلقی شامل ہے۔ وہ اثرات آج بھی ہماری معاشرت میں پوری شدت سے موجود ہیں۔ اگرچہ اب حکمران طبقہ بیرونِ ملک سے نہیں، بلکہ مقامی افراد پر مشتمل ہے، تاہم ان کی طرزِ حکمرانی، رویے اور ذہنی ساخت میں وہی استعماری مزاج غالب ہے جو کبھی برطانوی افسران کا خاصہ تھا۔

پنجاب میں سیاسی، مذہبی اور فلاحی تنظیمیں

برطانوی دور کا جائزہ

برطانوی استعمار کے دور میں پنجاب ایسی سرزمین بن گیا جہاں مختلف سیاسی، مذہبی اور فلاحی تنظیموں نے جنم لیا۔ ان میں بعض جماعتیں وہ تھیں جن کی بنیاد برصغیر کے دیگر علاقوں میں رکھی گئی، مگر بعدازاں ان کے اثرات پنجاب تک بھی پھیل گئے۔ ذیل میں چند اہم تنظیموں کا تعارف پیش کیا جا رہا ہے۔

انجمن حمایتِ اسلام: قیام، کردار اور اثرات

انجمن حمایتِ اسلام کا قیام ستمبر 1884ء میں عمل میں آیا۔ 1849ء میں جب انگریزوں نے سکھ ریاست کا خاتمہ کر کے پنجاب کو برطانوی سلطنت میں شامل کیا، تو یہاں ایک نیا تعلیمی نظام متعارف کرایا گیا، جس کے تحت لاہور میں متعدد اسکول اور کالج قائم کیے گئے۔ اگرچہ یہ ادارے تعلیمی ترقی کا ذریعہ تھے، لیکن مسلمانوں نے بعض تاریخی، سیاسی اور سماجی وجوہات کی بنا پر ان سے بھرپور استفادہ نہ کیا۔ نتیجتاً، مسلم معاشرہ علمی و تعلیمی زوال کا شکار ہونے لگا۔

یہ زوال اس وقت مزید نمایاں ہوا جب لاہور میں 1883ء میں ایک سید خاندان کی خاتون نے اپنے تین بچوں سمیت عیسائیت قبول کر لی۔ اگرچہ بعدازاں انھوں نے اسلام کی طرف رجوع کیا اور توبہ کی، تاہم یہ واقعہ پنجاب کے مسلمانوں کے لیے ایک گہرا صدمہ ثابت ہوا، جس نے ان میں فکری بیداری کو جنم دیا۔ انھی حالات میں مولانا قاضی حمید الدین نے چند ہم خیال

افراد کو ساتھ ملا کر انجمن حمایتِ اسلام کی بنیاد رکھی۔[1]

انجمن کے قیام کے مقاصد درج ذیل تھے:

1- مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے دینی وعصری تعلیم کا انتظام؛

2- عیسائی مشنریوں اور ہندو احیائی تحریکوں کی اسلام دشمن سرگرمیوں کا ردّ؛

3- تقاریر، مضامین اور مطبوعات کے ذریعے اسلامی اقدار کا تحفظ اور فروغ۔

قاضی حمید الدین کو انجمن کا پہلا صدر اور غلام اللہ قصوری کو سیکریٹری منتخب کیا گیا۔ ابتدا میں انجمن کے وسائل نہایت محدود تھے۔ خواتین سے روزانہ ایک مٹھی آٹا جمع کیا جاتا تھا تاکہ مالی ضروریات پوری کی جاسکیں۔ پہلے سال کی آمدنی 754 روپے اور اخراجات 344 روپے تھے۔ عوامی شعور کی بیداری کے نتیجے میں 1885ء تک انجمن کے ارکان کی تعداد 200 سے بڑھ کر 600 ہوگئی۔

انجمن نے مبلغین کی ایک جماعت تشکیل دی، جنھوں نے دیہات میں جا کر عیسائی مشنریوں کے پروپیگنڈے کا جواب دیا۔ ان مبلغین میں مولوی سید احمد علی، منشی شمس الدین، مولانا عبدالمجید دہلوی اور محمد مبارک شامل تھے۔ تعلیمی سرگرمیوں کا آغاز ایک کرایے کے مکان میں دو روپے پچاس آنے ماہانہ کرایہ پر ایک اسکول سے کیا گیا۔ 1886ء میں ایک بورڈنگ اسکول قائم ہوا جو 1887ء میں ایک بڑی حویلی میں منتقل ہو کر مڈل اسکول میں تبدیل ہوگیا۔ خواتین کی تعلیم پر بھی خصوصی توجہ دی گئی اور چند سالوں میں لڑکیوں کے اسکول قائم ہوئے۔ انجمن نے یتیم بچوں اور بیواؤں کے لیے دارالامان اور دارالشفقت جیسے فلاحی ادارے قائم کیے۔

1885ء میں انجمن کا ماہنامہ حمایتِ اسلام جاری ہوا، جو 1926ء میں ہفت روزہ میں تبدیل ہوگیا۔ انجمن نے اسلامی تاریخ، سیرت، تہذیب وتمدن اور ثقافت پر متعدد کتب شائع کیں۔ قرآنِ مجید کا مستند نسخہ شائع کرنا بھی انجمن کی اہم علمی خدمات میں شامل ہے۔ 1889ء

[1] https//:ahislam.org/about-us//https//:historypak.com/anjuman-himayat-i-islam

میں اسلامیہ اسکول لاہور اور 1892ء میں اسلامیہ کالج لاہور کا قیام اسی انجمن کا مرہونِ منت ہے، جو آج بھی علمی میدان میں مؤثر ادارے ہیں۔

انجمن حمایتِ اسلام نے برصغیر میں مسلمانوں کی علمی و دینی بیداری میں کلیدی کردار ادا کیا۔ اس نے سر سید احمد خان کے تعلیمی نظریات سے متاثر ہوکر پنجاب میں جدید تعلیم کو فروغ دیا۔ کئی اہم علمی و ادبی شخصیات نے اسی انجمن کے پلیٹ فارم سے اپنے فکری سفر کا آغاز کیا، جن میں علامہ محمد اقبال بطور خاص قابل ذکر ہیں، جنھوں نے انجمن کے سالانہ جلسوں میں اپنی ابتدائی نظمیں پیش کیں۔

انجمن حمایتِ اسلام زوال پذیر مسلم معاشرے میں ایک مینارِ نور ثابت ہوئی۔ اس نے نہ صرف مسلمانوں کو تعلیمی، فکری، دینی اور ثقافتی سطح پر بیدار کیا، بلکہ انھیں ایک نئی خودی اور پہچان بھی عطا کی۔ تحریکِ پاکستان کے فکری پس منظر کی تعمیر میں بھی اس انجمن کا نمایاں کردار رہا۔ یہ بھی قابلِ ذکر حقیقت ہے کہ مغل و ابدالی دور کے زوال کے تقریباً ڈیڑھ صدی بعد یہ مسلمانوں کی پہلی ایسی اجتماعی تحریک تھی جو عام مسلمانوں نے از خود شروع کی اس میں کسی نواب یا جاگیردار کا عمل دخل نہ تھا۔

آج بھی انجمن حمایتِ اسلام اپنے تعلیمی و فلاحی اداروں کے ذریعے اسی مشن کو جاری رکھے ہوئے ہے، جو اس نے غلامی، جہالت اور زوال کے اندھیروں میں مسلمانوں کی رہنمائی کے لیے شروع کیا تھا۔

آریہ سماج اور پنجاب کے سماج پر اس کے اثرات: ایک تجزیاتی مطالعہ

ہندوستان کی تاریخ میں انیسویں اور بیسویں صدی کے دوران جو اہم سماجی و مذہبی تحریکیں ظہور پذیر ہوئیں، ان میں آریہ سماج کو ایک منفرد اور مؤثر تحریک کے طور پر شناخت حاصل ہوئی۔ خصوصاً پنجاب کے خطے میں آریہ سماج نے معاشرتی تبدیلیوں، تعلیمی ترقی، اور مذہبی اصلاحات کے میدان میں نمایاں کردار ادا کیا۔

تحقیق کے دوران ایک دلچسپ اور تاریخی حقیقت میرے علم میں آئی کہ موجودہ گورنمنٹ اسلامیہ کالج، سول لائنز، لاہور دراصل وہی ادارہ ہے جو کبھی ''ڈی اے وی کالج'' (دیانند اینگلو ویدک) کے نام سے جانا جاتا تھا، اور جسے آریہ سماج کے قائدین نے 1886ء میں قائم کیا تھا۔ اسی

طرز پر ایک کالج کراچی میں بھی قائم کیا گیا تھا۔ تقسیمِ ہند کے بعد ان اداروں کے نام بھی تبدیل کر دیے گئے تھے۔ آریہ سماج کے افکار و نظریات کو سمجھنے کے لیے میں نے متعدد کتابوں اور تحقیقی حوالہ جات کا مطالعہ کیا۔ اس مطالعے کے دوران مجھے یہ احساس ہوا کہ آریہ سماج جیسی ہمہ گیر تحریک کے بارے میں عمومی سطح پر آگاہی نہایت محدود ہے، حالانکہ اس تحریک نے ہندوستانی سماج کو جدید خطوط پر استوار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا کے مطابق، آریہ سماج جدید ہندومت کی ایک فعال اصلاحی تحریک تھی، جس کی بنیاد 1875ء میں سوامی دیانند سرسوتی نے رکھی۔ اس تحریک کا بنیادی مقصد ویدوں، یعنی ہندومت کے قدیم ترین صحیفوں، کو ازسرِ نو واحد اور حتمی سچائی کے طور پر منوانا تھا۔ سوامی دیانند نے ان تمام بدعات اور رسوم و رواج کو مسترد کر دیا جو ویدوں کے بعد ہندومت میں داخل ہو گئے تھے اور جنھیں وہ غیر مستند اور انحرافی قرار دیتے تھے۔ تاہم ان کی فکر میں بعض بعداز ویدی نظریات کو بھی جزوی طور پر قبولیت دی گئی تھی۔

اگرچہ آریہ سماج کا آغاز ممبئی سے ہوا، تاہم اس کی سب سے زیادہ پذیرائی اور اثر پذیری شمالی اور مغربی ہندوستان، خصوصاً پنجاب میں دیکھی گئی۔ یہ تحریک مقامی سطح پر منظم ''سماجوں'' کے ذریعے چلائی جاتی تھی، جن میں جمہوری اصولوں کے تحت نمائندے منتخب کیے جاتے تھے۔

آریہ سماج نے متعدد مذہبی اور سماجی رسوم و عقائد کی مخالفت کی، جن میں مورتی پوجا (بت پرستی)، حیوانی قربانی، شرادھ، ذات پات کی بنیاد پر معاشرتی تفریق، چھوت چھات، کم عمری کی شادی، تِرتھ یاترا، پنڈتوں کی اجارہ داری، اور مندروں میں نذرانے چڑھانے کی روایات شامل تھیں۔ اس کے برخلاف، تحریک نے ویدوں کی مطلق صداقت، کرم اور سمسار جیسے بنیادی عقائد، گاؤ ماتا کی تقدیس، ویدک یگیہ (آتش نذری)، اور سماجی اصلاحات کی حمایت کی۔

پنجاب میں آریہ سماج نے تعلیم، خاص طور پر خواتین کی تعلیم، بین الطبقاتی شادیوں، بیوگان اور یتیموں کی فلاح، طبی امداد، قحط زدگان کی امداد و آبادکاری، اور مشنری سرگرمیوں کے ذریعے معاشرتی تبدیلیوں میں نمایاں کردار ادا کیا۔ علاوہ ازیں، یہ تحریک قوم پرستی کے فروغ میں بھی ایک

فکری و تنظیمی قوت بن کرا بھری۔ تاہم، آریہ سماج پر بعض حلقوں کی جانب سے یہ تنقید بھی کی گئی کہ اس کی فکری ساخت میں سخت گیر رویے، مذہبی عدم رواداری، اور اسلام و عیسائیت کے خلاف جارحانہ مؤقف اختیار کیے گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض ماہرین کے مطابق، اس تحریک نے ہندو مسلم تعلقات میں خلیج پیدا کرنے میں بھی ایک حد تک کردار ادا کیا۔

زیرِ نظر تحریر میں میری کوشش ہے کہ آریہ سماج تحریک کے پنجاب میں سماجی اثرات کا ایک تجزیاتی جائزہ پیش کیا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ یہ تحریک کہاں تک معاشرتی اصلاحات کی داعی رہی اور کہاں اس نے بین المذاہب ہم آہنگی کو متاثر کیا۔

آریہ سماج تحریک بارے صوبے سنگھ کا ایک مضمون پڑھنے کو ملا۔ [1]

صوبے سنگھ (انگلش میں اسے Sube Singh لکھا ہوا ہے۔ اس کا ترجمہ میں نے صوبے سنگھ سے کیا ہے۔ اسے سبھے سنگھ بھی لکھا جا سکتا ہے۔) کے مطابق، آریہ سماج ایک اصلاحی تنظیم کے طور پر اپنی نوع کی دیگر معاصر سماجی و مذہبی تحریکوں کے مقابلے میں زیادہ مؤثر اور کامیاب نظر آتی ہے۔ اس تحریک کی نمایاں کامیابی کی ایک اہم وجہ پنجاب میں برہمنوں کی نسبتاً کمزور سماجی حیثیت تھی، جس نے آریہ سماج کے اصلاحی ایجنڈے کو سماجی قبولیت فراہم کی۔ بعض محققین کے نزدیک، آریہ سماج کی اصل کامیابی اس کی اس حکمت عملی میں مضمر تھی، جس کے ذریعے اس نے خود کو ہندو معاشرے کے مرکزی دھارے میں ایک فعال اور قابلِ قبول اصلاحی قوت کے طور پر منوایا۔

یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ آریہ سماج نے اپنی شناخت ایک خالص ہندوستانی تحریک کے طور پر قائم کرنے کی شعوری کوشش کی، جس کا منبع و ماخذ خود ہندوستانی سماج کے اندر سے ابھرتا تھا اور جو بیرونی (خصوصاً مغربی یا عیسائی) اثرات سے مبرا ہو۔ آریہ سماج نے دیگر اصلاحی تحریکوں پر اس بنا پر شدید تنقید کی کہ وہ ویدوں کی غیر مشروط اور بالا دست حیثیت کو تسلیم نہیں کرتیں، اور ان کی فکری بنیادوں پر مغربی اور عیسائی فلسفے کی چھاپ نمایاں ہے۔ تاہم آریہ سماج ہر صورت میں ہندو

[1] The Arya Samaj: Emergence of Caste Consciousness 236 *INDIAN JOURNAL OF APPLIED RESEARCH* in Punjab

عقائد کی ترویج واستحکام کو اپنی بنیادی ذمہ داری تصور کرتا تھا۔

تحریک کا ایک منفرد پہلو یہ بھی تھا کہ اس نے روایتی جمود سے انحراف کرتے ہوئے ہندو مذہب کے اندر واضح اور جرات مندانہ اصلاحات کی وکالت کی۔ آریہ سماج نے اپنے سماجی اور تعلیمی اقدامات کے ذریعے نہ صرف مشنری اثر ورسوخ کو چیلنج کیا بلکہ ہندو معاشرے میں تبدیلیِ مذہب کے رجحانات کو بھی قابلِ ذکر حد تک محدود کر دیا۔ اس حوالے سے یہ سوال بجا طور پر اٹھتا ہے کہ آیا آریہ سماج کی اصلاحات صرف سماجی بہتری کے لیے تھیں یا وہ دیگر مذاہب کی تبلیغ کے خلاف ایک منظم فکری اور عملی ردِعمل بھی تھیں؟ میری تحقیق کے مطابق آریہ سماج نے خود کو اصلاح اور روایت کے درمیان ایک متوازن مقام پر قائم کیا۔ یہی معتدل موقف اسے ان افراد کے لیے قابلِ قبول بناتا تھا جو معاشرتی تبدیلی کے خواہاں تھے، جبکہ روایت پسند حلقے بھی اسے ہندو مت کے محافظ کے طور پر جزوی احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

سیما پریہار اور بھارت بھوشن کے مطابق، آریہ سماج تحریک، جس کی بنیاد 1875ء میں سوامی دیانند سرسوتی نے رکھی، انیسویں اور بیسویں صدی میں ہندوستان کی ایک اہم سماجی و مذہبی اصلاحی تحریک بن کر ابھری۔ اس تحریک کا قیام برطانوی نوآبادیاتی حکمرانی کے دوران پیدا ہونے والی سماجی، ثقافتی اور معاشی تبدیلیوں کے ایک منظم ردِعمل کے طور پر ہوا۔ شمال مغربی ہندوستان میں واقع پنجاب کا خطہ آریہ سماج کی سرگرمیوں کا اہم ترین مرکز بن گیا، اور یہاں کے سماجی وثقافتی ڈھانچے پر اس تحریک نے گہرے اثرات مرتب کیے۔

میرے تجزیے کے مطابق، آریہ سماج تحریک کی پیدائش و پیش رفت محض داخلی سماجی و اقتصادی عوامل کا نتیجہ نہیں تھی، بلکہ یہ عیسائی مشنریوں کی بڑھتی ہوئی تبلیغی سرگرمیوں اور مذہبی تبدیلی کی کوششوں کے خلاف ایک فکری و عملی مزاحمت بھی تھی۔ اس تناظر میں آریہ سماج کا کردار کچھ کچھ اسی نوعیت کا دکھائی دیتا ہے، جیسا کہ لاہور میں قائم ہونے والی انجمن حمایتِ اسلام کا تھا، جو انگریزی اثرات اور عیسائی مشنریوں کے اثر ونفوذ کو محدود کرنے کے لیے سرگرم عمل تھی۔ آریہ سماج تحریک کے بارے میں تفصیل سے جاننے کے لیے لالہ لاجپت رائے کی کتاب آریہ سماج کی

تاریخ ایک مفید ماخذ ہے۔

میرا یہاں مقصد آریہ سماج تحریک کے پنجاب کے سماج پر اثرات کا جائزہ لینا ہے۔

پنجاب کے معاشرے پر آریہ سماج تحریک کے اثرات

سوامی دیانند سرسوتی کی قائم کردہ آریہ سماج تحریک، اور جس کی بنیاد 1875ء میں رکھی گئی، برصغیر کی ان نمایاں سماجی و مذہبی تحریکوں میں شامل ہے جنھوں نے انیسویں اور بیسویں صدی کے دوران، خاص طور پر پنجاب کے معاشرتی، تعلیمی، اور مذہبی ڈھانچے پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اس تحریر میں آریہ سماج کے ان مختلف پہلوؤں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے جو پنجاب کے سماج پر اثر انداز ہوئے۔

1- سماجی اصلاحات اور ذات پات کے نظام کی مخالفت: آریہ سماج نے ہندو معاشرے میں رائج ذات پات کے غیر مساوی اور جابرانہ نظام، بالخصوص برہمنوں کی اجارہ داری کے خلاف آواز بلند کی۔ چھوت چھات، ستی، بچپن کی شادی، اور بت پرستی جیسے فرسودہ رسوم و رواج کی مخالفت کرتے ہوئے، اس تحریک نے ویدی اصولوں پر مبنی ایک ''خالص'' ہندو مذہب کی بازیافت کی کوشش کی۔ اس سے یہ تاثر پیدا ہوا کہ اس وقت کے ہندو سماجی و مذہبی رویے ویدی تعلیمات سے انحراف پر مبنی تھے۔

2- تعلیم کے میدان میں اصلاحات: آریہ سماج کا ایک بڑا کارنامہ تعلیمی اداروں کے قیام کی صورت میں سامنے آیا۔ پنجاب اور دیگر علاقوں میں دیانند اینگلو ویدک (DAV) اسکولوں اور کالجوں کا قیام اس تحریک کی نمایاں کامیابی تھی۔ ان اداروں میں مغربی سائنسی علوم کے ساتھ ساتھ ویدی تعلیمات کی تدریس کی جاتی تھی، جو قوم پرستی اور اصلاحی سوچ کو فروغ دیتی تھی۔ تاہم، تعلیمی نصاب کی تشکیل کے مسئلے پر تحریک کے اندر اختلافات بھی دیکھنے میں آئے، جہاں ایک گروہ انگریزی زبان اور جدید تعلیم کا حامی تھا جبکہ دوسرا اس کا مخالف تھا۔

3- ہندو مذہبی شناخت اور احیاء: آریہ سماج نے ہندو مذہب کو ایک خالص اور متحد

شناخت دینے کی شعوری کوشش کی۔ ویدوں کو واحد اور ابدی علم کا ذریعہ مانتے ہوئے، اس تحریک نے ہندو معاشرے میں مذہبی بیداری پیدا کی۔ پنجاب جیسے خطے میں، جہاں مسلم حکمرانی نے آٹھ سو سال تک ہندو معاشرتی شناخت کو دبا کر رکھا، وہاں آریہ سماج کی سرگرمیاں ہندوؤں میں مذہبی احیاء کی تحریک بن کر ابھریں۔

4- اسلامی اور مسیحی تبلیغ کے خلاف ردعمل: برطانوی دورِ حکومت میں مسیحی مشنری سرگرمیوں کے بڑھتے ہوئے اثرات کے مقابلے میں آریہ سماج نے ''شدھی تحریک'' کے ذریعے تبدیلیِ مذہب کے حامل افراد کو دوبارہ ہندو مذہب میں واپس لانے کی مہم کا آغاز کیا۔ اس عمل نے بعض مواقع پر فرقہ وارانہ کشیدگی کو جنم دیا، بالخصوص مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان تعلقات میں تناؤ پیدا ہوا۔

5-خواتین کی فلاح و بہبود: آریہ سماج تحریک نے خواتین کے مسائل بالخصوص تعلیم، بیوگان کی شادی، اور صنفی مساوات جیسے موضوعات پر عملی اقدامات کیے۔ ان اصلاحات نے پنجاب کی روایتی پدرشاہی معاشرتی ساخت کو چیلنج کیا اور خواتین کو بہتر سماجی حیثیت دلانے میں کردار ادا کیا، اگرچہ ان پر مکمل عمل درآمد آج بھی محدود پیمانے پر ہے۔

6-ہندو قوم پرستی کا فروغ: ویدی اقدار کی ترویج، قدیم ہندو ثقافت پر فخر، اور ہندو شناخت کے احیاء کے نتیجے میں آریہ سماج نے ہندو قوم پرستی کے تصور کو فروغ دیا۔ اس کا ایک پہلو تحریکِ آزادیِ ہند کی حمایت کی صورت میں سامنے آیا، جبکہ دوسرا پہلو بعض مسلم اکثریتی علاقوں میں فرقہ وارانہ کشیدگی کی شکل میں ظاہر ہوا۔

7-تنقید اور نظریاتی اختلافات: جہاں آریہ سماج نے سماجی و مذہبی اصلاحات کا بیڑہ اٹھایا، وہیں اس پر دیگر مذاہب، خصوصاً اسلام اور عیسائیت، کے حوالے سے سخت گیر رویہ اپنانے کا الزام بھی عائد کیا گیا۔ تاہم، اس بات کی عمومی تائید ممکن نہیں کہ تحریک نے دانستہ طور پر مذہبی تفریق کو ہوا دی۔ زیادہ قرینِ قیاس یہ ہے کہ آریہ سماج ہندو برادری کو ایک متحد آواز دینے کی کوشش تھی،

جس کا نتیجہ بعض حلقوں میں حساس ردعمل کی صورت میں ظاہر ہوا۔

یہ سب باتیں اس بات کی غمازی کرتی ہیں۔ کہ آریہ سماج تحریک نے پنجاب کے سماج میں ایک طرف سماجی، تعلیمی، اور مذہبی بیداری کی نئی راہیں کھولیں، اور دوسری طرف فرقہ وارانہ حساسیت میں بھی کسی حد تک اضافہ کیا۔ اس تحریک نے ہندو معاشرے کو ازسرِ نو تشکیل دینے اور اس کی شناخت کو مستحکم کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ تاہم، آریہ سماج کے اثرات کو صرف ایک اصلاحی تحریک کے دائرے تک محدود کرنا درست نہ ہوگا، بلکہ اسے نوآبادیاتی دور کے سیاسی، مذہبی، اور ثقافتی تناظر میں سمجھنا زیادہ موزوں ہے۔

آریہ سماج تحریک پر تنقید
تنازعات اور فرقہ ورانہ کشیدگی کا تناظر

اگرچہ آریہ سماج تحریک نے ہندو معاشرے میں اصلاحات کا ایک اہم کردار ادا کیا، خصوصاً ذات پات کے نظام کی مخالفت، خواتین کی تعلیم و فلاح، اور تعلیمی اداروں کے قیام میں، تاہم اس پر یہ اعتراض بھی کیا گیا کہ اس کا رویہ دیگر مذاہب، بالخصوص اسلام اور عیسائیت کے بارے میں سخت گیر تھا۔ ''شدھی تحریک'' کے تحت غیر ہندوؤں کو ہندو دھرم میں واپس لانے کی کوششوں کو بعض اوقات دیگر مذاہب کے پیروکاروں کی توہین یا مذہبی آزادی میں مداخلت کے طور پر دیکھا گیا، جس سے پنجاب میں فرقہ ورانہ تناؤ پیدا ہونے لگا۔

آریہ سماج تحریک کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس نے اپنی فکری اور تہذیبی بنیاد ''آریہ'' شناخت پر استوار کی۔ ''آریہ'' ایک سنسکرتی اصطلاح ہے جس کے لغوی معنی ''معزز'' یا ''بلند مرتبہ رکھنے والے'' افراد کے ہیں۔ تحریک کے بانی سوامی دیانند سرسوتی نے اس اصطلاح کو ایک اخلاقی و روحانی معیار کے طور پر اپنایا، جس کا مقصد ویدی اصولوں پر مبنی ایک خالص اور مساوی ہندو معاشرے کا قیام تھا۔

تاہم ''آریہ'' شناخت کے تاریخی استعمال اور اس کے اثرات کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں قدیم ہندوستان کی سماجی ساخت میں واضح طبقاتی تقسیم نظر آتی ہے۔ بعض مؤرخین کے مطابق، جب آریہ قبائل وسط ایشیا سے برصغیر میں داخل ہوئے تو ان کا ٹکراؤ مقامی دراوڑی اقوام سے ہوا۔ اس تصادم کے نتیجے میں مقامی آبادی یا تو پیچھے ہٹ کر جنگلات اور پہاڑوں میں آباد ہوئی یا آریاؤں کے قائم کردہ سماجی نظام میں نچلے درجے کے طبقات میں شامل ہو گئی جنھیں ''داس''، ''دسا''

(غلام)، ''تشا'' (حقیر) جیسے القابات دیے گئے۔

یہی وہ مرحلہ تھا جب ہندو معاشرت میں ''ورن آشرم'' یعنی ذات پات پر مبنی نظام نے ایک منظم شکل اختیار کی، جس کے تحت ''شودر'' یا ''اچھوت'' طبقہ وجود میں آیا۔ اس طبقے کو نہ صرف مذہبی عبادات تک محدود رسائی حاصل تھی بلکہ ان کے سماجی، تعلیمی اور معاشی حقوق بھی سختی سے محدود کر دیے گئے۔ آریہ سماج تحریک نے اس تاریخی تفریق کو تسلیم کرتے ہوئے اس کے خاتمے کے لیے آواز بلند کی اور ویدی تعلیمات کی روشنی میں مساوات، ذات پات کے خاتمے، اور سماجی انصاف پر زور دیا۔ تاہم تحریک کی ''آریہ'' شناخت نے ناقدین کو یہ سوال اٹھانے کا موقع بھی فراہم کیا کہ آیا اس اصطلاح کا استعمال قدیم سماجی برتری کے تصور کو بحال کرنے کی کوشش تھی یا اس کا مقصد محض اخلاقی اصلاحات کو فروغ دینا تھا۔ یہ بحث نہ صرف آریہ سماج کی فکری بنیادوں کے تجزیے کے لیے اہم ہے بلکہ برصغیر کی سماجی تاریخ کے ارتقائی مراحل کو سمجھنے کے لیے بھی کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔

یہ امر واضح ہے کہ آریہ سماج نے ایک طرف سماجی اور تعلیمی اصلاحات متعارف کروائیں، وہیں دوسری طرف ہندو مذہبی شناخت کی بازیافت اور احیاء کی تحریک کو بھی فروغ دیا۔ اس سے ہندو برادری میں ایک نیا مذہبی شعور پیدا ہوا، جسے بعض حلقوں نے ایک منظم ''مذہبی بیداری'' کے طور پر دیکھا۔ تاہم اس بیداری کا ایک ممکنہ نتیجہ یہ بھی نکلا کہ پنجاب جیسے متنوع مذہبی خطے میں فرقہ ورانہ خلیج گہری ہونے لگی۔

یہ بات بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ آریہ سماج تحریک کو محض فرقہ ورانہ کشیدگی کی بنیاد قرار دینا حقیقت کے ایک ہی پہلو کو اجاگر کرنے کے مترادف ہوگا۔ تاریخی طور پر دیکھا جائے تو ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد ہندو راج ختم ہوا اور کئی صدیوں تک مسلمان حکمرانوں کا اقتدار قائم رہا۔ اس عرصے میں بعض ادوار میں جزیہ جیسی پالیسیاں نافذ ہوئیں، جن کے باعث ہندو معاشرہ سیاسی و معاشی دباؤ کا شکار رہا۔ آریہ سماج تحریک کے ذریعے جب ہندو معاشرہ ایک بار پھر بیدار ہوا اور اپنی شناخت و حقوق کے حصول کے لیے منظم ہونے لگا تو اس عمل کو بعض حلقوں نے مذہبی

ردعمل کے طور پر دیکھا، حالانکہ اس کے پسِ پردہ سیاسی، سماجی اور نفسیاتی عوامل بھی کارفرما تھے۔

امتیاز حسین سبزواری کے مطابق، آریہ سماج کے اندر ایک کٹر بنیاد پرست گروہ بھی موجود تھا، جس کا رویہ دیگر مذہبی گروہوں کے حوالے سے کافی حد تک جارحانہ تھا۔[1] اس گروہ میں پنڈت گرو دتہ، لالہ درگا پرشاد، اور لالہ منشی رام جیسے شدت پسند مذہبی ہندو شامل تھے۔ میرے نزدیک یہ بات زیادہ قرینِ قیاس ہے، کیونکہ کسی بھی تنظیم کے اندر اس نوع کی فکری تفریق ایک فطری امر ہے۔

اس حوالے سے یہ کہنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب میں ابھرنے والی فرقہ وارانہ کشیدگی محض مذہبی بنیادوں پر نہیں تھی، بلکہ اس کے پس منظر میں اقتدار، وسائل کی تقسیم، اور نوآبادیاتی سیاسی ماحول جیسے عناصر بھی شامل تھے۔ مذہب کو اس کشمکش میں ایک شناختی عنصر کے طور پر ضرور استعمال کیا گیا، لیکن اس کے تمام تر اسباب مذہب تک محدود نہیں تھے۔

اگر اس دور کے سماجی اور مذہبی رجحانات کا غیر جانب دارانہ جائزہ لیا جائے تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ انیسویں اور بیسویں صدی کے دوران پنجاب میں جہاں ایک طرف بعض مسلمان علما اور تحریکیں اسلامی شعور اور دینی شناخت کو بیدار کرنے کی کوشش کر رہی تھیں، وہیں دوسری طرف ہندو مذہبی و سماجی تحریکیں بھی اسی نوعیت کی سرگرمیوں میں مصروف تھیں۔ ان دونوں دھاروں میں اپنی اپنی مذہبی اور سماجی شناخت کو مستحکم کرنے اور اپنے گروہی مفادات کو تحفظ دینے کا رجحان واضح طور پر نظر آتا ہے۔ اس تناظر میں اسے محض مذہبی کشمکش کے بجائے ایک قسم کی ''شناخت کی جدوجہد'' یا ''ذات و گروہ کی سیاسی بازیافت'' کا عمل قرار دینا زیادہ مناسب ہوگا، جس کے ذریعے ہر گروہ اپنی سماجی، سیاسی اور ثقافتی بالادستی قائم کرنے کی سعی میں مصروف تھا۔

یہ تجزیہ محض ایک فکری قیاس ہے، جس کی بنیاد تاریخی مشاہدات اور مطالعے پر ہے۔ یہ کوئی حتمی نتیجہ نہیں، بلکہ ایک زاویۂ نظر ہے جو بحث و تحقیق کے لیے مزید امکانات فراہم کرتا ہے۔

اگر آپ آریہ سماج تحریک کے بارے میں مزید جاننا چاہتے ہیں تو زمانہ کے نام سے شائع ہونے والے ایک رسالے میں حق پرست کے عنوان سے ایک مضمون دستیاب ہے، جو

---

[1] https//:dunya.com.pk/index.php/special-feature/2018-06-25.21753

انٹرنیٹ پر موجود ہے۔[1] اس سے آپ کو آریہ سماج تحریک کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں مفید معلومات حاصل ہوں گی۔

لالہ لجپت رائے:

پنجاب کا قومی شعور، ابتدائی تقسیمِ ہند کا تصور، اور آزادی کی جدوجہد میں کردار

لالہ لجپت رائے برصغیر کی قومی تحریک کے ان ابتدائی رہنماؤں میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے نہ صرف قوم پرستی کے نظریات کو فروغ دیا بلکہ سیاسی، تعلیمی اور سماجی سطح پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ ان کا تعلق ایک تعلیم یافتہ اور خدمتِ خلق سے وابستہ گھرانے سے تھا۔ آپ کے والد منشی رادھا کرشن اگروال سرکاری اسکول میں اردو اور فارسی کے استاد تھے اور سرسید احمد خان کے مداحین میں شمار ہوتے تھے، جبکہ والدہ گلاب دیوی اپنی سماجی خدمات کے باعث مقبول تھیں۔

بی بی سی نے لالہ لجپت رائے پر شاہد صدیقی کا ایک مضمون شائع کیا ہے، جس میں وہ لکھتے ہیں کہ لالہ لجپت رائے نے گورنمنٹ کالج لاہور سے تعلیم مکمل کی اور وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ تاہم، والد کی سیاسی وابستگیوں سے متاثر ہو کر جلد ہی قومی سیاست میں قدم رکھا۔ 1892ء میں وہ لاہور منتقل ہوئے، جہاں انھوں نے دیانند اینگلو ویدک اسکول (بعد میں جو گورنمنٹ اسلامیہ کالج بنا) کے قیام میں کلیدی کردار ادا کیا اور آریہ سماج تحریک سے وابستہ ہو گئے، جو اس وقت ہندو مت کی اصلاحات اور نوآبادیاتی اقتدار کے خلاف ایک فکری محاذ کی صورت میں سرگرم تھی۔ لالہ جی تعلیم کو قومی بیداری کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ وہ انگریزی زبان کو استعماری غلامی کی علامت تصور کرتے تھے اور اردو اور ہندی کے فروغ کے حامی تھے۔ اپنی تصنیف غلامی کی علامتیں اور غلامی کے نتائج میں انھوں نے زور دیا کہ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو انگریزی کے استعمال سے گریز کرتے ہوئے قومی زبانوں کو فروغ دینا چاہیے۔ ان کے نزدیک قومی تشخص کی بحالی کا راستہ مادری زبان کی ترویج سے ہو کر گزرتا ہے۔

---

[1] https//:www.scribd.com/doc/236671785/آریہ-سماج-اور-اسلام

اسی نظریے کے تحت 1921ء میں لاہور کے بریڈلا ہال (واقع ریٹیگن روڈ) میں نیشنل کالج کی بنیاد رکھی گئی۔ یہ کالج تحریکِ عدم تعاون کے پس منظر میں ایک متبادل قومی تعلیمی ادارہ تھا، جہاں مذہب، ذات پات اور طبقاتی تفریق سے بالاتر ہوکر ایسے نوجوان تیار کیے گئے جن میں سیاسی، سماجی اور فکری بیداری پیدا کی جاسکے۔ اساتذہ میں بھائی پرمانند (منتظمِ اعلیٰ)، جگل کشور (پرنسپل)، چھبیل داس، پروفیسر جے چند ودیالنکر، پروفیسر سوندھی، اور پروفیسر غلام حسین شامل تھے۔ ان تمام شخصیات نے طلبہ میں حب الوطنی اور آزادی کی روح پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

یہی وہ ادارہ تھا جہاں بھگت سنگھ اور سکھ دیو جیسے انقلابی رہنما پروان چڑھے۔ اس کالج میں اردو، ہندی اور پنجابی میں سے کسی ایک زبان کا پڑھنا لازم تھا، اور طلبہ کو اختیار حاصل تھا کہ وہ اردو یا گورمکھی رسم الخط کا انتخاب کریں۔ نصاب کے انتخاب میں اساتذہ کو مکمل آزادی حاصل تھی اور وہ خود منتخب کتب کے ذریعے تعلیم دیا کرتے تھے۔ علمی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ فکری لیکچرز اور خطابات کا باقاعدہ اہتمام بھی کیا جاتا تھا۔

تاریخ دان زاہد چوہدری اپنی کتاب پاکستان کی سیاسی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ لالہ لجپت رائے نے 1924ء میں لاہور کے روزنامہ ٹریبون میں ایک مضمون شائع کیا، جس میں برصغیر کی مذہبی بنیادوں پر تقسیم کی ابتدائی خاکہ بندی کی گئی۔ انھوں نے تجویز پیش کی کہ مسلمانوں کو چار خودمختار ریاستوں میں منقسم ہونا چاہیے: صوبہ سرحد، مغربی پنجاب، سندھ، اور مشرقی بنگال (بلوچستان اس میں شامل نہیں تھا)۔ ان کا مؤقف تھا کہ اگر کسی اور خطے میں مسلمانوں کی بڑی تعداد موجود ہو، تو وہاں بھی اسی طرز کی سیاسی تشکیل کی جائے؛ تاہم، یہ تصور مجموعی طور پر ''متحدہ ہندوستان'' کے نظریے کی نفی تھا۔

مزید برآں، حسن جعفر زیدی کے مطابق، بانی پاکستان محمد علی جناح نے 1940ء کے لاہور اجلاس میں لالہ لجپت رائے کا ایک خط پیش کیا، جو 16 جون 1925ء کو کانگریس کے صدر سی آر داس کو لکھا گیا تھا۔ اس خط میں لالہ جی نے واضح کیا کہ ہندو اور مسلمان دو جداگانہ اقوام ہیں جو ایک ساتھ نہیں رہ سکتیں، اور اس مسئلے کا کوئی قابلِ عمل حل تلاش کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ یہ

فکری مقدمہ قیامِ پاکستان کے نظریاتی خدوخال میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

لالہ لجپت رائے 17 نومبر 1928ء کو اُس وقت انتقال کر گئے جب انھوں نے لاہور میں سائمن کمیشن کے خلاف ایک مظاہرے کی قیادت کی۔ پولیس کے لاٹھی چارج سے وہ شدید زخمی ہوئے، اور چند روز بعد زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے وفات پا گئے۔ بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں نے لالہ جی کی موت کا بدلہ لینے کے لیے پولیس افسر جے پی سانڈرز کو قتل کیا، جس واقعے نے ہندوستان کی انقلابی سیاست کو ایک نیا رخ دیا۔

لالہ لجپت رائے کی سب سے بڑی سماجی خدمت گلاب دیوی ہسپتال کا قیام ہے، جسے انھوں نے اپنی والدہ کی 1927ء میں تپ دق سے وفات کے بعد ان کی یاد میں شروع کیا۔ 1930ء میں ٹرسٹ نے حکومت سے 40 ایکڑ زمین خریدی، جبکہ 10 ایکڑ زمین بطور عطیہ دی گئی۔ تعمیر کا آغاز 1931ء میں ہوا، اور 1934ء میں یہ ہسپتال مہاتما گاندھی کے افتتاح کے ساتھ عوام کے لیے کھول دیا گیا۔ تقسیم کے بعد نومبر 1947ء میں قائداعظم محمد علی جناح اور محترمہ فاطمہ جناح نے بھی اس ہسپتال کا دورہ کیا، اور مہاجرین کو فراہم کی جانے والی طبی سہولیات کو سراہا۔

لالہ لجپت رائے کا مجسمہ، جو پہلے لاہور کے ناصر باغ (سابقہ گول باغ) میں نصب تھا، آزادی کے بعد شملہ منتقل کر دیا گیا۔ ان کے نام پر لاہور کے علاقے دھرم پورہ میں ایک گلی آج بھی موجود ہے، تاہم ان کی سب سے بڑی یادگار گلاب دیوی ہسپتال ہے، جو آج بھی ان کی انسان دوستی اور قومی خدمت کی زندہ گواہی دیتا ہے۔

❁ ❁ ❁

پنجاب میں مذہبی احیاء کی سکھ صورت

سنگھ سبھا تحریک کے ارتقائی خدوخال

1849ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی قائم کردہ خالصہ ریاست کے خاتمے کے بعد جب پنجاب برطانوی حکومت کے زیرِ اقتدار آیا، تو اس خطے کو نہ صرف سیاسی بلکہ مذہبی اور ثقافتی سطح پر بھی کئی چیلنجز کا سامنا کرنا پڑا۔ برطانوی دورِ حکومت میں عیسائیت کی تبلیغ و ترویج کے لیے منظم اور مربوط کوششیں کی گئیں، جن میں سب سے اہم کردار عیسائی مشنری تنظیموں کا تھا۔ ان مشنری اداروں نے پنجاب کو مذہبی تبلیغ کے لیے ایک موزوں خطہ قرار دیتے ہوئے متعدد تعلیمی ادارے اور اسکول قائم کیے، جن کا مقصد مقامی آبادی کے مذہبی رجحانات میں تبدیلی لانا تھا۔

برطانوی دور میں نہ صرف عیسائی مشنری سرگرمیوں میں اضافہ ہوا، بلکہ اسی تناظر میں ہندو اور مسلم برادریوں نے بھی اپنے مذہبی و تہذیبی تشخص کے تحفظ کے لیے تنظیمیں قائم کیں۔ انھی حالات نے سکھ برادری میں بھی اپنی شناخت کے تحفظ کا احساس بیدار کیا۔ اس تناظر میں ایک اہم واقعہ مہاراجہ دلیپ سنگھ کا 1853ء میں عیسائیت قبول کرنا تھا، جس کے بعد کپورتھلہ کے ممتاز سکھ رئیس ہرنام سنگھ نے بھی عیسائی مذہب اختیار کیا۔ ان واقعات نے سکھ اشرافیہ میں تشویش کی لہر دوڑا دی۔ مزید برآں، معاشرے کے نچلے طبقات میں بھی عیسائیت کی طرف رجحان بڑھنے لگا، جس کی بڑی وجہ اس دور میں عیسائی حکمرانوں کی سرپرستی تھی۔

ان حالات میں سکھ قوم کی مذہبی شناخت کے تحفظ کے لیے جس تحریک نے جنم لیا، اسے ''سنگھ سبھا تحریک'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔

اس تحریک کے حوالے سے ایک جامع مضمون انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں موجود

ہے، جس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

انیسویں صدی کے اواخر میں جب آریہ سماج تحریک نے زور پکڑا اور دوسری طرف مسلمانوں نے بھی اپنی تہذیبی و مذہبی شناخت کے تحفظ کے لیے اقدامات کیے جن میں 1869ء میں لاہور میں انجمن اسلامیہ کا قیام اور 1884ء میں انجمن حمایتِ اسلام کا قیام قابلِ ذکر ہیں تو سکھوں نے بھی اپنے مذہب اور تہذیب کے تحفظ کی خاطر ایک منظم تحریک کا آغاز کیا۔ چنانچہ 1873ء میں امرتسر میں سنگھ سبھا کی پہلی شاخ قائم ہوئی، جس کے بعد لاہور میں اس کی دوسری شاخ کا قیام عمل میں آیا، تاکہ دیگر مذہبی تحریکوں کے مقابلے میں سکھ مذہب کی علیحدہ حیثیت کو اجاگر کیا جا سکے۔

سنگھ سبھا تحریک کا بنیادی مؤقف یہ تھا کہ سکھ مذہب ایک علیحدہ اور منفرد شناخت رکھتا ہے، اور اسے ہندو دھرم کا ذیلی حصہ سمجھنا ایک تاریخی و مذہبی غلطی ہے۔ انیسویں صدی کے اختتام تک سنگھ سبھا کی شاخوں کی تعداد سو سے تجاوز کر چکی تھی، جو اس تحریک کی غیر معمولی مقبولیت کا مظہر ہے۔

سنگھ سبھا تحریک کے تحت اٹھارھویں صدی کے اوائل میں جنم لینے والے ''سنگھ'' کے مثالی سکھ تشخص کو ازسرِ نو اجاگر کرنے اور ''خالص سکھ عقائد و اعمال'' کی تبلیغ کے لیے منظم کوششیں کی گئیں۔ اس مقصد کے تحت جدید پرنٹنگ کی سہولیات کا استعمال کرتے ہوئے سکھ تاریخ، مذہبی احکامات، اور ادب پر مشتمل کتب و رسائل شائع کیے گئے۔ اس تحریک نے گورمکھی رسم الخط میں پنجابی زبان کی تعلیم کو مذہبی اہمیت دی، جو سکھ متون کی تفہیم کے لیے نہایت ضروری تھی۔ ساتھ ہی ساتھ جدید مغربی تعلیم کے حصول کی بھی حوصلہ افزائی کی گئی، تاکہ سکھ نوجوانوں کو نئے دور کے تقاضوں کے مطابق تیار کیا جا سکے۔

سنگھ سبھا تحریک: آغاز اور تاریخی تناظر

سنگھ سبھا تحریک کے قائدین نے برطانوی حکومت سے قریبی روابط قائم کیے اور سکھوں کو ایک علیحدہ مذہبی و سیاسی قوم کے طور پر تسلیم کرانے کی جدوجہد کی۔ ان اقدامات نے نہ صرف سکھ مذہب کی بقا کو یقینی بنایا بلکہ سکھ قوم کی جدید تشخص سازی میں بھی کلیدی کردار ادا کیا۔

اس موضوع پر دویندر سنگھ مانگٹ کی کتاب *Origin of the Singh Sabha Movement and Its Legacy* بے حد مفید ہے۔[1] مانگٹ اپنی تصنیف کے مقدمے میں اس نکتے کو اجاگر کرتے ہیں کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد سے قبل، پنجاب کی تاریخ میں متعدد ملکی و غیر ملکی حملہ آوروں کی یلغار دیکھی گئی، جنھوں نے اس خطے کو سیاسی عدم استحکام، معاشی تباہی، اور سماجی بے چینی سے دوچار کیا۔ تاہم، مصنف کے مطابق برطانوی دورِ حکومت کو ان حملہ آوروں کے تناظر میں نسبتاً ایک پُرامن اور ترقی یافتہ دور تصور کیا جاتا ہے۔ اُن کے بقول، جب کسی معاشرے میں امن قائم ہوتا ہے تو اس کے نتیجے میں سماجی، ثقافتی، اور مذہبی سطح پر نئی تحریکات جنم لیتی ہیں۔ جنگوں اور بدامنی کے تسلسل سے باہر نکلنے کے بعد، عوام کی توجہ فلاحی، تعلیمی اور مذہبی سرگرمیوں کی طرف مبذول ہو جاتی ہے۔

اس تبدیلی کا آغاز کہاں اور کیسے ہوا؟ اس حوالے سے مصنف کوئی قطعی مؤقف اختیار نہیں کرتے، تاہم وہ اس امر کی طرف اشارہ ضرور کرتے ہیں کہ ممکنہ طور پر یہ عمل عیسائی مشنریوں کی جانب سے نچلی ذاتوں سے تعلق رکھنے والے طبقات کو عیسائیت میں شامل کرنے کی کوششوں سے شروع ہوا۔ ان مشنری سرگرمیوں کے تحت اسکول، ہسپتال، اور دیگر فلاحی ادارے قائم کیے گئے، جو تبلیغ کے ساتھ ساتھ سماجی خدمت کا بھی ذریعہ تھے۔

عیسائیت کی ان منظم تبلیغی سرگرمیوں کے ردِعمل میں مسلم اور ہندو طبقات نے بھی اپنے اپنے مذہبی تشخص کے تحفظ اور فروغ کے لیے تبلیغی و تنظیمی اقدامات کا آغاز کیا۔ اس کی بنیاد دراصل مذہبی بقا اور تہذیبی شناخت کے تحفظ کی فطری انسانی جبلت پر تھی۔ اسی نوعیت کی سرگرمیوں اور مذہبی دباؤ کے اثرات سکھ برادری پر بھی مرتب ہوئے، خاص طور پر جب عیسائی مشنری اور ہندو تنظیموں کی جانب سے سکھ مذہب کو نظریاتی اور عملی سطح پر چیلنج کا سامنا ہونے لگا۔

ان خطرات کے جواب میں، سکھوں نے اپنے مذہب اور شناخت کے تحفظ کے لیے اجتماعی

[1] https://www.google.com.pk/books/edition/ORIGIN_OF_THE_SINGH_SABHA_MOVEMENT_AND_1

طور پر تنظیم سازی کی طرف توجہ دی،جس کے نتیجے میں 1873ء میں ''سنگھ سبھا تحریک'' کا آغاز ہوا۔ یہ تحریک نہ صرف سکھ مذہب کی نظریاتی بنیادوں کو از سرِ نو استوار کرنے کی کوشش تھی، بلکہ اس کا مقصد سکھ قوم کو ایک واضح،مربوط اور جداگانہ مذہبی وثقافتی شناخت فراہم کرنا بھی تھا۔

سنگھ سبھا تحریک کے بارے میں مزید تفصیلات Sikhi Wiki سے حاصل کی گئیں۔[1]

اس سے حاصل کردہ معلومات کا خلاصہ کچھ یوں ہے:

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی وفات (1839ء) کے بعد سکھ سلطنت شدید داخلی خلفشار کا شکار ہو گئی۔ جانشینوں کے مابین اقتدار کی کشمکش، درباری سازشیں، اور انتظامی کمزوریاں ریاست کی وحدت کو پارہ پارہ کر گئیں،جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انگریز سامراج کے لیے پنجاب کو فتح کرنا نسبتاً آسان ہو گیا۔ بالآخر 1849ء میں سکھ سلطنت کا خاتمہ ہوا اور اس کے آخری وارث، مہاراجہ دلیپ سنگھ، کو محض ایک علامتی حیثیت دے کر انگلستان منتقل کر دیا گیا، جہاں اس نے عیسائیت اختیار کر لی۔

دلیپ سنگھ کی بیٹی، بمبا سوفیا جنڈن دلیپ سنگھ (Bamba Sofia Jindan Duleep Singh) نے، جو بعد از اں ''بمبا سدرلینڈ'' کے نام سے معروف ہوئیں، اپنی زندگی کے آخری ایام لاہور میں گزارے اور وہیں ایک مسیحی قبرستان میں دفن ہوئیں۔ دلیپ سنگھ کی والدہ، مہارانی جند کور، کو بھی پنجاب سے رخصت ہونا پڑا۔ یوں سکھ سلطنت کی آخری نشانیاں بھی منظرِ تاریخ سے غائب ہو گئیں۔

ان واقعات نے خالصہ اقدار کے زوال اور سکھ شناخت کی تحلیل کو مہمیز دی۔ اس دور میں سکھوں کے طرزِ زندگی اور فکری رویوں پر ہندو عقائد و رسومات کا اثر نمایاں ہونے لگا، جس سے سکھ مذہب کی انفرادیت کو شدید خطرات لاحق ہو گئے۔

اس فکری اور تہذیبی بحران کا ادراک کرتے ہوئے، چند باشعور سکھ رہنماؤں نے 1873ء میں ''سنگھ سبھا تحریک'' (Singh Sabha Movement) کی بنیاد رکھی۔ اس تحریک کا بنیادی

[1] https//:www.sikhiwiki.org/index.php/Singh_Sabha

مقصد سکھ قوم میں مذہبی شعور، اخلاقی اصلاح، اور تعلیمی بیداری پیدا کرنا تھا۔ بانیانِ تحریک نے سکھ نوجوانوں کو خالصہ ورثے، گرونانک کی تعلیمات، اور سکھ اقدار سے روشناس کرانے کے ساتھ ساتھ ان میں اعلیٰ اخلاقی معیارات اور سماجی خدمت کے جذبے کو پروان چڑھانے پر بھی زور دیا۔

سنگھ سبھا تحریک نے ابتدا میں جن چار اہم میدانوں پر توجہ مرکوز کی، وہ درج ذیل ہیں:

1- سکھ تعلیمی اداروں (اسکولوں اور کالجوں) کا قیام؛

2- گوردواروں میں منظم سنگت اور مؤثر انتظام؛

3- سکھ ضابطۂ حیات (ریہت مریادا) کا احیاء؛

4- سکھوں کے انفرادی و اجتماعی سیاسی و مذہبی حقوق کی ترویج۔

اس تحریک نے پنجابی زبان میں مذہبی و ادبی مواد، اخبارات اور رسائل کی اشاعت کے ذریعے سکھ عوام میں بیداری پیدا کی۔ رضا کار کارکنان دیہات و قصبات میں جا کر عوام کو سکھ مت کی اصل تعلیمات سے آگاہ کرتے اور ان میں مذہبی حمیت اور روایتی شناخت کی تجدید کی کوشش کرتے۔ ان کارکنان نے بت پرستی، برہمن واد، ذات پات، اور ممنوعہ غذاؤں کی تفریق کے خلاف واضح اور مضبوط مؤقف اپنایا۔ شراب، منشیات اور تمباکو کے مضر استعمال کی بھی سخت مذمت کی گئی۔

تحریک کے مختلف مراحل میں فکری اختلافات کے باعث اس کے اندر مختلف دھڑے بھی وجود میں آئے، جو اس بات کا ثبوت تھے کہ تحریک میں داخلی تنوع بھی پایا جاتا تھا۔ تاہم اس کے باوجود کئی نمایاں کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ مثال کے طور پر 1883ء میں مختلف سنگھ سبھاؤں اور دیوانوں کے نمائندہ ادارے کے طور پر چیف خالصہ دیوان (Chief Khalsa Diwan) قائم کیا گیا۔ 1892ء میں امرتسر میں خالصہ کالج کی بنیاد رکھی گئی، اور خالصہ ٹریکٹ سوسائٹی (Khalsa Tract Society) بھی وجود میں آئی جس کا مقصد سکھ مذہب سے متعلق کتابیں، مضامین، نظموں اور اخبارات کی اشاعت تھا۔ ان اشاعتوں نے نہ صرف مذہبی شعور اجاگر کیا بلکہ سماجی ہم آہنگی، قربانی، اور خدمتِ خلق جیسے اوصاف کو فروغ دیا۔ ایک ایسا ہی تعلیمی ادارہ (خالصہ

کالج) موجودہ فیصل آباد میں بھی قائم کیا گیا تھا۔

تحریک کے نمایاں رہنما بھائی ویر سنگھ نے ''خالصہ سماچار'' کے نام سے ایک اصلاحی اخبار جاری کیا۔اس دوران مہنتوں کی بدعنوانی کے خلاف آواز بلند کرنے والے سکھ کارکنوں نے انگریز حکومت کے حمایت یافتہ عناصر کے خلاف پُرامن احتجاجی تحریکیں چلائیں، جن میں کئی افراد نے جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ بالآخر عوامی دباؤ کے تحت 1925ء میں گوردوارہ ایکٹ منظور ہوا، جس کے ذریعے گوردواروں اور ان کی اراضی و مالیات کا نظم و نسق عوامی نمائندہ اداروں کے سپرد کیا گیا۔ امرتسر کے خالصہ کالج کو بھی عوامی اختیار میں لایا گیا۔

1950ء میں ہندوستان کے آئین کے تحت مذہبی اقلیتوں کو اپنے اداروں کا انتظام خود کرنے کا حق دیا گیا، اور سکھ برادری کے نمائندہ ادارے شیرومانی گوردوارہ پربندھک کمیٹی (SGPC) کو گوردواروں کے انتظام، مذہبی پاکیزگی اور خالصہ اقدار کی ترویج کی باقاعدہ ذمہ داری سونپی گئی۔

برطانوی ہندوستان کے دورِ حکومت میں سکھ برادری نے طویل جدوجہد کے بعد نہ صرف اپنے سیاسی حقوق حاصل کیے بلکہ اپنی مذہبی شناخت اور ثقافتی ورثے کی حفاظت کے لیے بھی قابلِ ذکر اقدامات کیے۔ سکھ پریس نے انگریز حکومت کی جانب سے ملازمتوں، سرکاری اداروں اور عوامی مقامات پر سکھوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے امتیازی سلوک کو بے نقاب کیا۔ اسی ضمن میں سنگھ سبھا تحریک نے نہ صرف پنجابی زبان (بالخصوص گُرمُکھی رسم الخط) کے استعمال کے حق کے لیے جدوجہد کی، بلکہ سکھ عقائد اور رسوم و رواج کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے شعور بھی پیدا کیا۔ مسلسل تحریکوں اور عوامی دباؤ کے نتیجے میں سکھوں کو ان کا مذہبی نشان، یعنی ''کرپان'' (چاہے کسی بھی لمبائی کی ہو)، ساتھ رکھنے کا قانونی حق بھی حاصل ہوا۔

یہ مضمون بنیادی طور پر سنگھ سبھا تحریک کے پنجاب کے سماجی ڈھانچے پر پڑنے والے اثرات کا جائزہ لینے کے لیے تحریر کیا گیا ہے۔ اسی تناظر میں تحریک کے اثرات کو درج ذیل پانچ اہم شعبوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

1- مذہبی احیاء اور سکھ شناخت کی تشکیل: سنگھ سبھا تحریک کا سب سے پہلا اور نمایاں اثر سکھ مذہب کی نشاۃِ ثانیہ کی صورت میں سامنے آیا۔ اس تحریک نے سکھ دھرم کی گمشدہ روح کو زندہ کیا اور سکھ برادری میں ایک علیحدہ مذہبی شناخت کا شعور پیدا کیا۔ ہندوانہ رسومات، بت پرستی اور ذات پات جیسے رجحانات کے خلاف باقاعدہ مہم چلائی گئی، جس کے نتیجے میں مذہبی تطہیر کا عمل ممکن ہوا۔

2- تعلیمی اصلاحات: سنگھ سبھا تحریک نے تعلیم کو اپنی سرگرمیوں کا مرکزی ستون بنایا۔ سکھوں کو جدید اور مذہبی تعلیم کی طرف راغب کرنے کے لیے خالصہ کالج امرتسر (1892ء) سمیت کئی تعلیمی ادارے قائم کیے گئے۔ پنجابی زبان کو گُرمکھی رسم الخط میں فروغ دیا گیا، اور دیہی علاقوں میں بالغوں کی تعلیم کے لیے باقاعدہ تعلیمی پروگرام شروع کیے گئے، تاکہ عام لوگ سکھ مقدس متون اور تاریخ کا براہِ راست مطالعہ کر سکیں۔

3- سماجی اصلاحات: تحریک کا تیسرا نمایاں اثر سماجی اصلاحات کے میدان میں ظاہر ہوا۔ سکھ معاشرے میں چھوت چھات، ذات پات اور طبقاتی امتیازات کے خلاف بھرپور مہم چلائی گئی۔ شراب، تمباکو اور دیگر نشہ آور اشیاء کے خلاف سخت مؤقف اختیار کیا گیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ خواتین کی تعلیم و تربیت اور ان کے سماجی مقام سے متعلق ابتدائی سطح پر بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔

4- سیاسی بیداری اور مذہبی خودمختاری: سنگھ سبھا تحریک نے سکھ عوام میں سیاسی شعور بیدار کیا اور مہنتوں کی بدعنوانیوں کے خلاف مؤثر آواز بلند کی۔ نتیجتاً 1925ء میں ''گوردوارہ ایکٹ'' منظور ہوا، جس کے تحت گوردواروں اور ان کی املاک کا انتظام ایک عوامی نمائندہ ادارے کے سپرد کر دیا گیا۔ سکھ مذہبی علامات، خصوصاً کرپان، کے تحفظ اور پنجابی زبان و ثقافت کے دفاع کے لیے بھی مسلسل سیاسی کوششیں کی گئیں۔

5- ادبی اور ثقافتی احیاء: اس تحریک کا پانچواں اثر ادبی و ثقافتی احیاء کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اصلاحی اخبارات، بالخصوص خالصہ سماچار کا اجراء کیا گیا، جس کے ذریعے تحریک کا

پیغام عوام تک پہنچایا گیا۔ بھائی ویر سنگھ، کرم سنگھ اور دیگر دانشوروں نے سکھ تاریخ، سوانح عمری اور نثری و شعری ادب کے ذریعے ایک ہمہ جہت فکری و ادبی تحریک کی بنیاد رکھی، جس نے سکھ معاشرے کو نظریاتی طور پر منظم کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔

آخر میں کہا جا سکتا ہے کہ سنگھ سبھا تحریک بجا طور پر سکھ قوم کی نشاۃِ ثانیہ کا محرک قرار دی جا سکتی ہے۔ جس طرح برصغیر میں مسلمان اور ہندو اپنی مذہبی شناخت اور ثقافت کے تحفظ کے لیے سرگرم تھے، ویسے ہی سنگھ سبھا تحریک نے سکھ مذہب کو ہندووانہ اثرات، مذہبی بگاڑ اور عوامی لاعلمی سے نکال کر ایک منظم، تعلیم یافتہ، باشعور اور سماجی طور پر متحرک قوم میں ڈھالنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

برطانوی عہد میں لاہور کی شہری وتمدنی تشکیلِ نو
ایک تجزیاتی جائزہ

برطانوی دورِ حکومت کے دوران لاہور میں وقوع پذیر ہونے والی شہری اور انتظامی تبدیلیاں نہ صرف اس خطے کی تاریخ کا ایک نیا باب تھیں، بلکہ برصغیر میں نوآبادیاتی حکمرانی کی نوعیت کو بھی واضح کرتی ہیں۔اس ضمن میں ممتاز مصور اور محقق ڈاکٹر اعجاز انور کی تحریر خاص اہمیت رکھتی ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ اگرچہ ماضی میں کئی بیرونی اقوام نے لاہور پر تسلط قائم کیا اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے، تاہم جب انگریز اس شہر میں وارد ہوئے تو وہ محض ایک طاقتور فوج ہی نہیں لائے، بلکہ اپنے ساتھ ایک نیا نظامِ حکمرانی، قانونی وانتظامی ڈھانچہ اور شہری ترقی کا ایک جامع تصور بھی لے کر آئے۔

برطانوی راج کے ابتدائی برسوں میں، جب انگریزی فوج نے قلعہ لاہور اور حضوری باغ میں اپنے قدم جمائے، تو وہاں سے تعمیر وترقی کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا۔تاریخی عمارات کی مرمت کی گئی، شہر کے گرد موجود خندق کو بند کر کے اُسے ''کمپنی باغ'' (Company Bagh) کی صورت میں تبدیل کیا گیا۔اسی دوران لاہور میں پہلی باقاعدہ چھاؤنی قائم ہوئی، جسے بعدازاں ''صدر بازار'' کے نام سے جانا گیا۔گول باغ بھی، جسے انگریزوں کے ابتدائی دور میں ''گورا باغ'' کہا جاتا تھا، اسی دور میں تعمیر ہوا۔علاوہ ازیں، ہارٹی کلچرل سوسائٹی کے قیام نے نہ صرف لاہور کے باغات کی تنظیمِ نو میں اہم کردار ادا کیا، بلکہ بعدازاں لارنس گارڈن (موجودہ باغِ جناح) اور لاہور چڑیا گھر کے قیام میں بھی مدد فراہم کی۔

چھاؤنی کو بعدازاں میاں میر کے نواحی علاقے میں منتقل کر دیا گیا۔اس کے ساتھ ساتھ کئی

مذہبی و انتظامی فیصلے بھی کیے گئے، جن میں بادشاہی مسجد کی مسلم کمیونٹی کو واگزاری اور قلعہ لاہور میں سیکرٹریٹ کے قیام جیسے اقدامات شامل تھے۔ برطانوی عہد میں لاہور کی فصیل کو غیر ضروری قرار دے کر شہر سے باہر جدید شہری آبادیاں قائم کی گئیں۔ ان نئے علاقوں کی منصوبہ بندی کے تحت بھاٹی دروازے کے بالمقابل لوئر مال، لوہاری کے سامنے انارکلی، شاہ عالمی کے بالمقابل بانسانوالہ بازار، موچی دروازے کے قریب فلیمنگ روڈ، اور دلی دروازے کے سامنے لنڈا بازار جیسے علاقے وجود میں آئے۔

ان سب علاقوں کو بعد ازاں ''ڈونلڈ ٹاؤن'' کے اجتماعی نام سے جانا گیا، جسے اس وقت کے لیفٹیننٹ گورنر پنجاب، سر ڈونلڈ میکلوڈ (1870–1865ء) کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اس ٹاؤن میں کئی اہم عمارات تعمیر ہوئیں، جن میں لیڈی میکلیگن اسکول (1859ء)، منٹگمری ہال، لارنس ہال اور ٹولنٹن مارکیٹ شامل ہیں۔ ٹولنٹن مارکیٹ کا ابتدائی استعمال 1864ء میں منعقد ہونے والی بین الاقوامی نمائش کے لیے ''ایگزیبیشن ہال'' کے طور پر ہوا، جس کی بازگشت یورپی اخبارات تک سنائی دی۔ اس نمائش نے برصغیر کی قبل از نوآبادیاتی صنعتی و ثقافتی ترقی کو عالمی سطح پر اجاگر کیا۔

اسی دور میں لاہور کا پہلا باقاعدہ بینک، آگرہ بینک، پرانی انارکلی اور سیکرٹریٹ کے سنگم پر قائم ہوا، اور یوں اس راستے کو بینک روڈ کا نام دیا گیا۔ ان تمام تعمیراتی سرگرمیوں میں یونانی و رومی طرزِ تعمیر کے اثرات واضح طور پر نظر آتے ہیں، خصوصاً بلند ستونوں، چونے اور سرخ اینٹوں کی نفیس کاریگری میں۔ لیڈی میکلیگن اسکول اپنی خوبصورتی اور تاریخی اہمیت کے باعث آج بھی ایک ثقافتی ورثے کی حیثیت رکھتا ہے، جس کی حفاظت وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اسی طرح ٹولنٹن مارکیٹ کو بھی قومی ورثہ قرار دے کر اس کے تحفظ کے لیے صدارتی سطح پر خصوصی اقدامات کیے گئے۔

مزید مطالعہ کے لیے اہم کتب:

Harjot Oberoi, The Construction of Religious Boundaries: Culture, Identity, and Diversity in the Sikh Tradition

W.H. McLeod, *The Sikhs: History, Religion, and Society*

J.S. Grewal, *The Sikhs of the Punjab*

Fauja Singh, *A History of the Sikh People*(1469-1988)

Khushwant Singh, *A History of the Sikhs.*

Grewal, J.S. *The Sikhs of the Punjab*(The New Cambridge *History of India*, Cambridge University Press, 1990.)

Singh, Khushwant. *A History of the Sikhs*, Vol. 2)Oxford University Press, 2006.)

McLeod, W.H. *The Evolution of the Sikh Community* (Oxford University Press, 1975.)

Oberoi, Harjot. *The Construction of Religious Boundaries: Culture, Identity, and Diversity in the Sikh Tradition* (University of Chicago Press, 1994.)

Singha, H.S. *The Encyclopedia of Sikhism*(Hemkunt Publishers, 2000.)

Noorani, A.G. *The Gurdwara Reform Movement and the Sikh Struggle for Religious Identity Frontline Magazine*, The Hindu Group.

برطانوی دورِ حکومت میں پنجاب کے مدارس
ایک تاریخی و تعلیمی جائزہ

اٹھارھویں صدی برصغیر کی تاریخ میں ایک پُرآشوب دور کے طور پر جانی جاتی ہے، جو مسلسل جنگ وجدل اور سیاسی انقلابات کا مظہر تھی۔ اس صدی میں احمد شاہ ابدالی کے متعدد حملے، نادر شاہ کی یلغار، مغلیہ سلطنت کا زوال، مراٹھوں کے ساتھ شدید معرکے، اور سکھوں کا تدریجی عروج جیسے اہم واقعات وقوع پذیر ہوئے۔ انھی تاریخی حالات کے بطن سے سکھ ریاست کا قیام بھی عمل میں آیا، جو اس دور کی اہم سیاسی تبدیلیوں کی علامت تھا۔

انیسویں صدی کے اوائل میں برصغیر ایک نئے عہد میں داخل ہوا۔ اس دور میں مغلیہ سلطنت کا باضابطہ خاتمہ، سکھ حکومت کا زوال، اور بالآخر 1849ء میں پنجاب پر برطانوی قبضہ جیسے اہم واقعات نے خطے کی سیاسی، سماجی اور تعلیمی ساخت کو مکمل طور پر تبدیل کر دیا۔ انگریزوں کے اقتدار کے قیام کے بعد، پنجاب میں طویل جنگوں کے بعد پہلی مرتبہ ایک منظم اور نسبتاً پُرامن فضا پیدا ہوئی، جسے برطانوی حکمرانوں نے اپنے سیاسی استحکام کے لیے استعمال کیا۔ برطانوی دورِ حکومت میں متعدد فلاحی، تعلیمی اور انفراسٹرکچر سے متعلق منصوبے متعارف کرائے گئے۔ اسی دوران پنجاب میں بسنے والے مختلف مذہبی گروہوں نے، مسلمان، ہندو، سکھ، اور عیسائی اپنی مذہبی شناخت اور بقاء کے لیے نئی جدوجہد کا آغاز کیا۔ ان کوششوں کی جھلک بعض گزشتہ صفحات میں بیان کی جا چکی ہے۔

برطانوی تسلط کے بعد ہندوستان بھر کے دینی مدارس، جو قبل ازیں اسلامی تعلیم وتربیت کا بنیادی ذریعہ تھے، ایک شدید بحران سے دوچار ہو گئے۔ ان اداروں کو مغلیہ عہد میں ریاستی

سرپرستی حاصل تھی، جن کے تحت مدارس کو وقف شدہ جاگیریں، عطیات اور مالی امداد مہیا کی جاتی تھیں۔ ان مدارس میں قرآن، حدیث، فقہ، منطق، فلسفہ، ادب، عربی اور فارسی زبان کی تعلیم دی جاتی تھی۔ تاہم، برطانوی حکومت نے اقتدار سنبھالتے ہی ان ذرائع آمدن پر پابندی عائد کر دی، اور مدارس کی مالی خودمختاری کو ختم کر دیا، جس کے باعث کئی ادارے بند ہو گئے یا محدود پیمانے پر کام کرنے پر مجبور ہو گئے۔ نوآبادیاتی حکومت کی تعلیمی پالیسیوں کا جھکاؤ مکمل طور پر مغربی اور سیکولر تعلیم کی جانب تھا۔ حکومتی مالی وسائل صرف انھی اداروں کو فراہم کیے جاتے تھے جہاں انگریزی زبان اور مغربی علوم پڑھائے جاتے۔ اس کے برعکس دینی مدارس کو حکومتی پالیسیوں کے تحت مکمل طور پر نظرانداز کیا گیا۔

دینی مدارس محض تعلیم کا ذریعہ نہ تھے بلکہ یہ اسلامی تہذیب، مذہبی تشخص اور ثقافتی ورثے کے تحفظ کا اہم مرکز بھی تھے۔ نوآبادیاتی تعلیمی پالیسیوں، بالخصوص انگریزی زبان کے فروغ اور سیکولر تعلیم کے خلاف ان مدارس نے خاموش مگر مؤثر مزاحمت کی۔ بعض اوقات یہ مزاحمت مسلح جدوجہد کی صورت بھی اختیار کر گئی، جس کے نتیجے میں متعدد علماء کو سخت سزاؤں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔

برطانوی راج کے دوران پنجاب میں متعدد دینی مدارس نے نہ صرف علمی وروحانی حیثیت اختیار کی، بلکہ مذہبی وفکری شناخت کے استحکام میں بھی کلیدی کردار ادا کیا۔ ان میں نمایاں اداروں میں جامعہ نعمانیہ (لاہور)، مدرسہ خلیلیہ (گوجرانوالہ)، اور جامعہ مظاہر العلوم شامل ہیں۔ لاہور میں جامعہ نعیمیہ بھی موجود ہے جس کی بنیاد قیامِ پاکستان کے بعد رکھی گئی۔ جامعہ نعمانیہ لاہور اہلسنت و جماعت کی قدیم اور دینی تعلیم کی معیاری درسگاہ جس نے تحریک پاکستان میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ یہ امام ابوحنیفہ کی نسبت نعمانیہ کہلاتا ہے، انجمن نعمانیہ نے 1887ء بمطابق 1305ھ میں بنیاد رکھی۔ یہ درسگاہ اس وقت بالمقابل ٹبی تھانہ اندرون ٹیکسالی گیٹ لاہور میں موجود ہے پہلے اس نے شہنشاہ عالمگیر کی بادشاہی مسجد لاہور میں کام شروع کیا اور پچیس سال تک شاہی مسجد کے حجرہ جات طلبہ کی رہائش گاہ ہوا کرتے تھے۔ اس انجمن کے بانیوں میں مولانا محرم علی چشتی، مفتی سلیم اللہ، مولوی سراج الدین، ڈپٹی غلام حسین، خلیفہ تاج الدین، شیخ چراغ دین اور مولانا نور بخش توکلی

شامل ہیں۔ اس کے علاوہ، برصغیر کے دو بڑے مکتبہ ہائے فکر، دیوبند اور بریلوی سے وابستہ علماء نے بھی پنجاب میں مدارس کا قیام عمل میں لایا۔ اسی طرح، خانوادہ چشتیہ، نقشبندیہ اور قادریہ جیسے صوفی سلسلوں سے وابستہ مدارس نے بھی اپنے اپنے علاقوں میں دینی خدمات انجام دیں۔

یہ مدارس محض تعلیمی ادارے نہ تھے بلکہ مذہبی شناخت، فکری مزاحمت اور ثقافتی تسلسل کے مراکز بن گئے۔ اہلِ حدیث، دیوبندی، بریلوی اور دیگر مکاتبِ فکر سے وابستہ علماء نے اپنے نظریات کی تبلیغ، تحفظ اور فروغ کے لیے نہ صرف مناظرات منعقد کیے بلکہ علمی تصنیفات کے ذریعے بھی فکری سرگرمی جاری رکھی۔ بعض مدارس نے تحریکِ آزادی کے غیر رسمی محاذ پر بھی حصہ لیا، جہاں ان کے علماء نے طلبہ میں قومی اور دینی شعور بیدار کیا۔ اگرچہ براہِ راست مزاحمت کی صورت میں ان مدارس کو برطانوی حکومت کی سختیوں کا سامنا کرنا پڑا، لیکن نظریاتی اور فکری سطح پر ان کا کردار مستقل اور مؤثر رہا۔

ان دینی اداروں کے اثرات دو پہلوؤں میں نمایاں تھے: ایک طرف انھوں نے اسلامی تعلیمات، فقہی روایت اور مذہبی شناخت کو برقرار رکھا، تو دوسری طرف جدید سائنسی وعصری تعلیم سے ایک واضح کٹاؤ بھی پیدا ہوا، جو بعد ازاں ایک تعلیمی خلا اور فرقہ وارانہ تقسیم کی صورت میں ظاہر ہوا۔ مختلف فقہی مکاتبِ فکر کے تحت مدارس کے قیام نے اگرچہ علمی تنوع کو جنم دیا، مگر اس تنوع نے بعض اوقات فرقہ واریت کو فروغ دینے میں بھی غیر رسمی کردار ادا کیا۔ تاہم، چند مدارس نے محدود پیمانے پر عصری تعلیم کو بھی نصاب میں شامل کرنے کی کوشش کی، مثلاً اردو، ریاضی اور انگریزی کے ابتدائی مضامین کو متعارف کرایا، مگر یہ رجحان عمومی نہ بن سکا۔

اس موضوع پر ممتاز محقق علی ریاض کے ایک مضمون سے یہ جاننے کو ملتا ہے کہ "مدرسہ" بطور تصور اور ادارہ برصغیر میں مسلمان حکمرانوں کے ابتدائی دور سے وجود میں آ چکا تھا، جب سندھ میں اسلامی حکومت کا آغاز ہوا۔ ابتدا میں یہ ادارہ مسجد کے ساتھ منسلک ایک دینی شعبہ ہوتا تھا، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی ساخت، افعال اور دائرۂ عمل میں تبدیلی آتی رہی۔ علی ریاض کے مطابق، برصغیر کی ایک ہزار سالہ اسلامی تاریخ میں مدارس نے مسلم معاشرے کی تعلیمی، فکری اور روحانی

ضروریات کی تکمیل میں اہم کردار ادا کیا۔ تاہم، مدرسہ اور ریاست کے درمیان تعلق ہمیشہ یکساں نہ رہا، کبھی مدرسہ ریاستی سرپرستی سے فیض یاب رہا اور کبھی ریاستی جبر و نگرانی کا نشانہ بھی بنا۔ [1]

تاریخی تناظر میں یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ مدارس کے قیام میں بانی علماء کا تعلق مختلف فقہی و مسلکی پس منظر سے تھا، جس کی وجہ سے ان اداروں میں فقہی اختلافات اور فکری تنوع ہمیشہ موجود رہا۔ اسی بنیاد پر ہر مکتبِ فکر نے اپنے نظریاتی تشخص کو محفوظ رکھنے کے لیے علیحدہ ادارے قائم کیے۔ برطانوی دور میں صرف پنجاب ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستان میں دینی مدارس نے نہ صرف عیسائی مشنری سرگرمیوں اور آریہ سماج کی تبلیغی مہمات کا علمی و فکری سطح پر مقابلہ کیا، بلکہ بعض مواقع پر سیاسی جدوجہد میں بھی مؤثر کردار ادا کیا۔ یوں یہ مدارس محض تعلیم کے ادارے نہ رہے بلکہ مزاحمت، بقاء اور شناخت کی تحریکات کے فعال مراکز بن کر ابھرے۔

پنجاب میں دینی مدارس اور ان کے فاضل علما کی سیاسی سرگرمیاں بنیادی طور پر مسلم شناخت کی تشکیلِ نو اور اس کے تحفظ سے مربوط رہی ہیں، بالخصوص ان ادوار میں جب یہ شناخت نوآبادیاتی دباؤ یا فکری چیلنجز سے دوچار تھی۔ تاریخی جائزہ لینے سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ پنجاب کے مدارس محض مذہبی تعلیم کے مراکز نہیں رہے بلکہ انھوں نے صدیوں تک معاشرتی، فکری اور سیاسی سطح پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے۔

برصغیر کے دیگر حصوں کی طرح، پنجاب میں مدارس نے اسلامی علوم کے تحفظ، قرآن و حدیث کے فہم و تدریس، اور دینی شعور کی بیداری میں کلیدی کردار ادا کیا۔ ان اداروں نے ایسے علما، خطبا اور دینی رہنما تیار کیے جنھوں نے نہ صرف مذہبی تربیت کا فریضہ انجام دیا بلکہ نوآبادیاتی نظام کے خلاف مزاحمت، سماجی اصلاحات، اور تعلیمی بیداری میں بھی فعال شرکت کی۔ ان مدارس

---

[1] Riaz, A.(2010. (Madrassah Education in Pre-colonial and Colonial South Asia Journal of Asian and African Studies, 46(1),69–86. https//:doi.org/10.1177/0021909610387758
Original work published (2011)

نے دیہی وشہری معاشروں میں مذہبی اقدار، اخلاقی اصولوں اور معاشرتی ہم آہنگی کو فروغ دینے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

مدارس کا دائرۂ عمل صرف مذہبی تعلیمات تک محدود نہیں رہا۔نوآبادیاتی عہد میں جب مغرب سے متاثر جدید تعلیمی ادارے ابھرنے لگے تو مدارس نے اپنی علمی وفکری بقا کے لیے نئے نصاب، منظم تنظیمی ڈھانچے، اور نظریاتی بیانیے تشکیل دیے۔یہی مدارس بعد ازاں تحریکِ آزادی کے فکری مراکز کے طور پر سامنے آئے، جہاں سے مسلم معاشرتی شعور اور قومی خودی کو تقویت ملی۔موجودہ دور میں بھی پنجاب کے مدارس مذہبی تعلیم کے بنیادی مراکز کے طور پر قائم ہیں۔اگرچہ وہ جدیدیت، سائنسی علوم اور عالمی فکری تبدیلیوں کے چیلنجز سے دوچار ہیں، تاہم ان کی معاشرتی جڑیں اور اثرات بدستور قائم ہیں۔ان اداروں کی اہمیت اس پہلو سے بھی برقرار ہے کہ یہ مذہبی واخلاقی رہنمائی، سماجی نظم وضبط، اور باہمی رواداری کے فروغ میں مثبت کردار ادا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، بشرطیکہ ان میں مسلسل اصلاحات، تدریسی تنوع اور فکری وسعت کا رجحان اپنایا جائے۔

تاریخی تناظر میں دیکھا جائے تو مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد بیشتر مدارس ریاستی سرپرستی سے محروم ہو گئے تھے اور ان کے مالی وسائل کا انحصار مقامی آبادی، عوامی چندوں اور مذہبی وابستگیوں پر رہا۔یہی وجہ ہے کہ ان مدارس نے اپنے داخلی نظم اور فکری خودمختاری کو برقرار رکھا۔تاہم، برطانوی دور میں مذہبی سیاسی جماعتوں نے اپنے مخصوص نظریاتی مقاصد کے تحت مدارس قائم کیے، جنھیں مختلف سیاسی فوائد کے لیے استعمال کیا گیا۔یہ پہلو مدارس کی فکری وسیاسی تاریخ کا ایک اہم مگر پیچیدہ باب ہے، جو ان کے تعلیمی کردار کے ساتھ ساتھ ان کے نظریاتی اثرات کو بھی واضح کرتا ہے۔

❁❁❁

برطانوی دور میں پنجاب کی سیاسی و مذہبی تحریکیں
ایک تحقیقی جائزہ

یہ بات درست ہے کہ مغل دور اور اس کے بعد سکھ دور میں کسی بھی قسم کی سیاسی جماعت کے قیام کا تصور موجود نہیں تھا۔ یہ عہد نہ صرف پنجاب بلکہ پورے ہندوستان میں آمرانہ طرزِ حکومت کا زمانہ مانا جاتا ہے۔ اُس وقت دنیا کے دیگر کئی ممالک میں بھی اسی نوعیت کے نظام رائج تھے۔ تاریخی حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی اولین سیاسی جماعتوں میں سے ایک برطانیہ کی ٹوری پارٹی (Tory Party) کو مانا جاتا ہے، جو سترھویں صدی کے اواخر میں قائم ہوئی۔ اس کے بعد، جدید طرز کی انتخابی سیاست کے سیاق میں امریکی فیڈرلسٹ پارٹی (Federalist Party 1789) اور ڈیموکریٹک-ریپبلکن پارٹی (Democratic-Republican Party 1792) کو ابتدائی جماعتیں تصور کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اس امر میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اُس دور میں ہندوستان میں کوئی باقاعدہ سیاسی جماعت موجود نہ تھی۔ جب دنیا بھر میں سیاسی بیداری کی ایک نئی لہر اٹھی تو برصغیر میں بھی، خاص طور پر برطانوی دور میں، مسلمانوں نے مختلف سیاسی، مذہبی اور فکری تحریکوں کی بنیاد رکھی۔ ان تحریکوں نے نہ صرف اپنی شناخت کا دفاع کیا بلکہ قومی آزادی کی جدوجہد میں بھی مؤثر کردار ادا کیا۔ پنجاب میں، جو ایک مسلم اکثریتی علاقہ تھا، مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندو اور سکھ بھی بڑی تعداد میں آباد تھے۔ اس خطے میں ان تینوں مذاہب کے مقدس مقامات موجود تھے۔

میں ان صفحات میں چند اہم سیاسی جماعتوں کا مختصر تعارف پیش کروں گا جنھوں نے پنجاب

کی سیاست میں نمایاں کردار ادا کیا۔ یہ بھی درست ہے کہ ان میں سے کئی جماعتیں صرف پنجاب ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے دیگر علاقوں میں بھی سرگرمِ عمل تھیں۔میں یہاں اُن تحریکوں کا بھی جائزہ لینے کی کوشش کروں گا جو قومی دھارے کا حصہ تھیں، اور اُن کا بھی جو بعض اوقات مرکزی دھارے سے الگ نظر آتی ہیں، لیکن انھوں نے برطانوی تسلط کے خلاف رائے سازی اور تحریکِ آزادی میں اہم خدمات انجام دیں۔

اس بارے دو مقالے پڑھنے کو ملے۔

ایک مقالہ عذرا اصغر اور ساجد محمود اعوان نے لکھا ہے۔اس کا عنوان ہے؛

Political Development and the Political Parties in Punjab: 1849-1947

دوسرا مقالہ مقبول احمد اعوان کا ملا، جس کا عنوان ہے:[1]

Comparative Study of the Party Politics in the British Punjab: A Discourse of the Major Political Parties(1885-1937)

میں نے ان دو مضامین کی مدد سے پنجاب میں قائم ہونے والی سیاسی جماعتوں اور تحریکوں کے بارے میں جو کچھ جان سکا ہوں، وہ پیشِ خدمت ہے:

1-تحریکِ خاکسار(Khaksar Tehrik 1931): اس کے بانی علامہ عنایت اللہ مشرقی تھے۔اس کا قیام 1931ء میں لاہور میں ہوا۔

مقصد: قومی خود انحصاری، نظم وضبط، اور مسلمانوں میں عسکری وقومی شعور پیدا کرنا۔خاکسار تحریک نے یونیفارم، بیلچے، اور نظم وضبط کے اصولوں کے ذریعے ایک نیم فوجی تنظیم کی شکل اختیار کی اور خود انحصاری کی علامت بن گئی۔ برطانوی حکومت نے اسے خطرہ سمجھتے ہوئے کئی بار پابندیاں عائد کیں۔

[1] Pakistan Journal of Social Science(PJSS) Vol.29,No. 1 (June 2009) pp. 65-78. Pakistan Vision Vol. 19 No 2

2-مجلسِ احرارِ اسلام (Majlis-e-Ahrar-e-Islam 1929): یہ جماعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری، حبیب الرحمٰن لدھیانوی، اور مظفر علی ہانسوی نے 1929ء میں لاہور میں قائم کی۔

مقاصد: قادیانیت کے خلاف تحریک، خلافت کا احیاء، اور انگریز مخالف سیاست۔ یہ جماعت کانگریس نواز تھی اور قیامِ پاکستان کی مخالفت کرتی رہی۔

3- جماعتِ اسلامی (Jamaat-e-Islami 1941): اس کے بانی سید ابوالاعلیٰ مودودی تھے، جنھوں نے 1941ء میں اسے لاہور میں قائم کیا۔ مقصد: ایک اسلامی ریاست کا قیام اور اسلامی نظام کا نفاذ۔

4-تحریکِ خلافت (Khilafat Movement-1919-1924): یہ تحریک خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے کے خلاف برپا کی گئی۔ اس کے رہنما مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، اور مولانا ظفر علی خان تھے۔

اس تحریک نے برصغیر میں مسلمانوں کو سیاسی طور پر متحرک کیا۔

5- آریہ سماج: آریہ سماج ایک مذہبی و سماجی اصلاحی تحریک تھی، جس کا تفصیلی ذکر پچھلے صفحات میں آچکا ہے۔

مقصد: ہندو سماج کی اصلاح اور قدیم ویدک تعلیمات کی طرف واپسی۔

6- انڈین نیشنل کانگریس (Indian National Congress-1885): کانگریس کا قیام 1885ء میں بمبئی میں عمل میں آیا، تاہم پنجاب اس میں قدرے تاخیر سے شامل ہوا۔ تعلیم یافتہ ہندو طبقہ، خصوصاً آریہ سماج کے اثرات رکھنے والے افراد، کانگریس میں متحرک رہے۔ مسلمانوں نے کانگریس پر ہندو بالادستی کا الزام لگا کر اس سے فاصلہ اختیار کیا۔ لالہ لاجپت رائے (1865-1928، جالندھر) پنجاب کے نمایاں ہندو سیاسی رہنما تھے، جو کانگریس، آریہ سماج، اور سوشلسٹ نظریات سے متاثر تھے۔

7- یونینسٹ پارٹی: یونینسٹ پارٹی کی قیادت میں سر فضل حسین (1877-1936)،

چوہدری سر ظفر اللہ خان، سر سکندر حیات، اور نواب ممدوٹ شامل تھے۔

مقصد: مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کو متحد رکھنا، خصوصاً دیہی زمیندار طبقے کی نمائندگی کرنا۔ یونینسٹ پارٹی کا قیام 1923ء میں عمل میں آیا۔ یہ ایک اعتدال پسند، بین المذاہب سیاسی جماعت تھی۔

8۔ مسلم لیگ پنجاب میں (جس کی بنیاد ڈھاکہ میں رکھی گئی تھی)، قراردادِ لاہور، اور آزادی: 23 مارچ 1940ء کو لاہور میں قراردادِ پاکستان منظور ہوئی، جس کا مسودہ چوہدری ظفر اللہ خان نے تیار کیا۔ اس کے بعد پنجاب میں مسلم لیگ کا اثر بڑھنے لگا، خاص طور پر شہری علاقوں میں۔ 1946ء کے انتخابات میں مسلم لیگ نے تاریخی کامیابی حاصل کی، جس نے قیامِ پاکستان کی راہ ہموار کی۔ برطانوی دور میں پنجاب میں سیاسی سرگرمیاں ابتدا میں دباؤ، مذہبی تقسیم، اور وفادار طبقات کی سرپرستی کی وجہ سے محدود رہیں، مگر وقت کے ساتھ یہ خطہ تحریکِ آزادی کا مرکز بنتا چلا گیا۔ پنجاب کے مسلمانوں نے نہ صرف قومی تحریکوں میں بھرپور حصہ لیا بلکہ قیامِ پاکستان میں بھی فیصلہ کن کردار ادا کیا۔

میں پنجاب میں سیاسی سرگرمیوں کے بارے میں جان کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جب دنیا بھر میں سیاسی جماعتوں کی تشکیل کا عمل شروع ہوا، تو اسی دور میں ہندوستان میں بھی کئی سیاسی جماعتیں وجود میں آئیں۔ البتہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ سیاسی بیداری کی لہر پنجاب میں قدرے تاخیر سے اٹھی۔ جب پنجاب میں سیاسی میدان میں سرگرمیاں شروع ہوئیں تو یہ جلد ہی فرقہ ورانہ خطوط پر تقسیم ہونے لگا۔ اس دوران یونینسٹ پارٹی نے ایک مختلف طرزِ سیاست اپنایا اور فرقہ ورانہ تقسیم کے عمل میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی، لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔

بعد ازاں جب دو بڑی سیاسی جماعتیں مسلم لیگ اور کانگریس کے ساتھ ساتھ بعض شدت پسند فرقہ ورانہ جماعتیں بھی پنجاب کی سیاست میں داخل ہوئیں، تو پنجاب کی سیاسی فضا مکمل طور پر فرقہ ورانہ طرزِ سیاست میں تبدیل ہو گئی۔ اس کی جھلک ہمیں 46-1945ء کے انتخابات میں نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہے، جنھوں نے معاشرے کو دو واضح گروہوں مسلمانوں اور غیر مسلموں

میں تقسیم کر دیا۔ اس تقسیم کا نتیجہ بالآخر پنجاب کی فرقہ ورانہ بنیادوں پر تقسیم کی صورت میں سامنے آیا، جو 1947ء میں ہندوستان کی مجموعی تقسیم کے ساتھ وقوع پذیر ہوئی۔

یہاں اس امر کا ذکر ضروری ہے کہ 1946ء کے انتخابات متحدہ ہندوستان میں ہونے والے آخری انتخابات تھے، جن کے فوراً بعد پاکستان نے آزادی حاصل کی۔ ان انتخابات میں آل انڈیا مسلم لیگ کی مہم کا مرکزی نکتہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ ریاست کا مطالبہ تھا۔ ان انتخابات میں مسلم لیگ نے پنجاب کی قانون ساز اسمبلی میں مسلمانوں کے لیے مختص 84 میں سے 73 نشستیں جیتیں، جس سے اس کے اس دعوے کو تقویت ملی کہ وہ برصغیر کے مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہے۔ یہی کامیابی پنجاب کی تقسیم کی راہ ہموار کرنے کا سبب بنی۔ لہٰذا وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان اور پنجاب دونوں کی تقسیم ایک انتخابی عمل کا نتیجہ تھیں، جو بنیادی طور پر وسیع پیمانے پر فرقہ ورانہ بنیادوں پر ہونے والی سیاسی شرکت سے متاثر ہوا۔

❁ ❁ ❁

کیا برصغیر کی آزادی تقسیم کے بغیر ممکن تھی؟

ایک تنقیدی جائزہ

برصغیر کی آزادی اور اس کے ساتھ وقوع پذیر ہونے والی تقسیم کے تعلق سے ایک اہم سوال ابھرتا ہے: کیا آزادی کا حصول بغیر تقسیم کے ممکن تھا؟ اگر اس سوال کا تجزیہ تاریخی شواہد، سیاسی حالات اور معاصر بیانیوں کی روشنی میں کیا جائے تو یہ کہنا ممکن ہے کہ متبادل سیاسی انتظامات کے تحت تقسیم سے بچتے ہوئے آزادی حاصل کی جا سکتی تھی۔ خاص طور پر، اگر برطانوی نوآبادیاتی پالیسی، ہندو مسلم قیادتوں کے باہمی تعلقات، اور مختلف قومیتی بیانیوں کو زیادہ مفاہمانہ انداز میں مربوط کیا جاتا، تو ایک متحدہ، وفاقی یا کنفیڈریٹ ہندوستان کا تصور قابلِ عمل رہتا۔

تاہم، داخلی اختلافات، سیاسی قیادت کے درمیان بڑھتی ہوئی خلیج، اور برطانوی سامراج کی ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' کی پالیسی نے ایسی فضا پیدا کی جس میں تقسیم کو رفتہ رفتہ ایک ''ناگزیر حقیقت'' کے طور پر پیش کیا گیا۔ برطانوی حکومت نے اقتدار کی منتقلی کے لیے جو فریم ورک اپنایا، اُس نے واضح طور پر دو قومی شناختوں کے نظریے کو عملی شکل دینے میں مدد دی۔ نتیجتاً، 1947ء میں نہ صرف ایک خطہ جغرافیائی لحاظ سے منقسم ہوا بلکہ ایک ایسا معاشرہ جو صدیوں سے ثقافتی، معاشی اور سماجی اشتراکات پر قائم تھا، شدید عدم اعتماد، تشدد اور خونریزی کی بھینٹ چڑھ گیا۔

تقسیم کے نتیجے میں تقریباً 20 لاکھ انسانی جانیں ضائع ہوئیں، کروڑوں افراد کو ہجرت کرنی پڑی، اور ہزاروں سال پر مشتمل باہمی رہائش کے رشتے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئے۔ یہ صورت حال صرف سیاسی فیصلوں کا نتیجہ نہ تھی بلکہ اس کے پس منظر میں ہندو- مسلم، سکھ- مسلم کشمکش کی تاریخ، مذہبی حساسیتوں، اور نوآبادیاتی ریاست کے طرزِ حکمرانی کا بھی اہم کردار تھا۔

یہ کہنا کہ تقسیمِ ہند سے قبل ہندوستان، بالخصوص پنجاب میں، معاشرتی ہم آہنگی اپنے عروج پر تھی، ایک تاریخی حقیقت کے بجائے ایک رومانوی تصور معلوم ہوتا ہے۔ مصنف کے ذاتی مطالعے اور تاریخی شواہد کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ برصغیر میں مسلمانوں کی آمد (712ء میں محمد بن قاسم کے حملے سے) لے کر شاہ زمان درانی کے آخری حملے (1798ء) تک، اور اس کے بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فتوحات (جس میں قصور، کشمیر، ملتان اور پشاور کی جنگیں شامل ہیں)، نیز 1849ء میں پنجاب پر انگریزوں کے مکمل قبضے تک، ایک طویل عرصہ جو 1137ء سالوں پر محیط ہے ایسا گزرا جس میں بین المذاہب کشمکش، تصادم اور مسلح جھڑپیں تقریباً مستقل بنیادوں پر جاری رہیں۔

اس پورے عرصے میں کوئی ایسا دور نظر نہیں آتا جب ہندوستان میں ہندوؤں، مسلمانوں اور بعد ازاں سکھوں کے درمیان کوئی بڑا تنازع یا جنگی صورت حال موجود نہ رہی ہو۔ اس تناظر میں یہ مفروضہ محلِ نظر ہے کہ میدانِ جنگ میں فریقین ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوں اور دیہی یا شہری معاشروں میں مکمل سکون و اعتماد کے ساتھ باہم زندگی گزار رہے ہوں۔ اگر کسی حد تک پرامن بقائے باہمی موجود بھی تھی، تو وہ بھی ایک گہرے عدم اعتماد، خوف اور احتیاط کے ماحول میں قائم تھی۔

برطانوی دورِ حکومت میں اگرچہ براہِ راست جنگی تصادم میں کمی واقع ہوئی، تاہم اس کی جگہ فرقہ وارانہ کشیدگی اور فسادات کی صورت میں سامنے آئی۔ اسی زمانے میں مختلف مذہبی و سیاسی جماعتوں کی بنیاد رکھی گئی، جن میں اکثر جماعتیں کسی نہ کسی مخصوص مذہبی یا مسلکی شناخت کی نمائندہ تھیں۔ صرف ہندوستانی نیشنل کانگریس اور یونینسٹ پارٹی دو ایسی سیاسی تنظیمیں تھیں جن میں مختلف مذاہب کے افراد کسی مشترکہ سیاسی پلیٹ فارم پر جمع ہوئے، جبکہ دیگر بیشتر جماعتیں اپنے مذہبی و نظریاتی ایجنڈے پر مرکوز رہیں۔

یہ تاریخی حقیقت واضح کرتی ہے کہ برصغیر کے سماجی تانے بانے میں ایک داخلی تقسیم صدیوں سے موجود تھی، جو وقت کے ساتھ ساتھ گہری ہوتی گئی۔ بالآخر 1947ء میں اس دباؤ نے ایک غیر

معمولی صورت اختیار کر لی، جس کا نتیجہ قیامِ پاکستان، خونریز فسادات، اور بیس لاکھ سے زائد جانوں کے ضیاع کی صورت میں نکلا۔ یوں تقسیمِ ہند، اور بالخصوص پنجاب کی تقسیم، درحقیقت برصغیر میں ایک طویل تاریخی عمل اور مسلسل بین المذاہب کشمکش کا فطری نتیجہ تھی، جس کی جڑیں کئی صدیوں پر محیط تاریخی واقعات میں پیوست ہیں۔

یہ تجزیہ مصنف کی ذاتی علمی رائے پر مبنی ہے، جو تاریخی مطالعے، مشاہدے اور فکری مکالمے کی بنیاد پر پیش کیا گیا ہے۔ اس کا مقصد کسی قطعی یا حتمی مؤقف کی ترویج نہیں، بلکہ قاری کو تحریک دینا ہے کہ وہ تاریخ کے مختلف امکانات اور متبادل راستوں پر سنجیدگی سے غور کرے۔ ایسی بحث نہ صرف ماضی کو بہتر سمجھنے میں مدد دیتی ہے، بلکہ موجودہ دور کے لیے بھی ہم آہنگی اور فہم و فراست کے نئے دروازے کھول سکتی ہے۔

لالی اکھیاں دی پئی دسدی اے
روئے تسی وی او، روئے اسی وی آں

استاد دامن کا یہ شعر میرے جذبات کی عکاسی کے لیے کافی ہے۔

علی اور اعوان نے برطانوی دور میں قائم ہونے والی سیاسی جماعتوں اور مذہبی تحریکوں کی ایک فہرست بھی دی ہے۔ اس فہرست کے مطابق برطانوی دور میں 63 سیاسی جماعتیں قائم کی گئیں تھیں۔

پنجاب میں انتخابی سیاست
جو آخر کار تقسیمِ ہند کا پیش خیمہ بنی

جب برطانیہ میں جمہوریت کی جڑیں مضبوط ہو رہی تھیں، تو برطانوی حکومت پر ان کے نوآبادیاتی علاقوں میں بھی یہ دباؤ بڑھتا جا رہا تھا کہ اگر وہ اپنے ملک میں جمہوری اصولوں کے قائل ہیں، تو انھیں اپنے زیرِ نگیں ممالک میں بھی اسی طرزِ سیاست کو فروغ دینا چاہیے۔ غالباً اسی پسِ منظر میں برطانوی حکومت نے بیسویں صدی کے آغاز میں ہندوستان میں مرحلہ وار اور محدود پیمانے پر انتخابی عمل کا آغاز کیا، جو وقت کے ساتھ ساتھ ترقی کرتا رہا۔ چونکہ زیرِ بحث موضوع ''پنجاب میں انتخابات'' ہے، اس لیے ذیل میں برطانوی دور کے پنجاب میں انتخابی عمل کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔

بیسویں صدی سے قبل تقریباً دو صدیوں تک انگریز ہندوستان پر حکومت کرتے رہے، لیکن انھوں نے مقامی عوام کو اقتدار میں شریک کرنے کی سنجیدہ کوشش نہیں کی۔ البتہ چند مخصوص علاقوں میں عوام کو محدود سیاسی شرکت کی اجازت دی گئی۔ پہلی جنگِ عظیم (1914–1918) کے بعد برصغیر میں سیاسی بیداری میں اضافہ ہوا، جس کے باعث برطانوی حکومت اصلاحات لانے پر مجبور ہوئی۔ اس سلسلے کا پہلا قدم 1909ء کی منٹو-مارلے اصلاحات تھیں، جن کے تحت قانون ساز کونسلز میں غیر سرکاری نمائندوں کو محدود طور پر منتخب کرنے کی اجازت دی گئی۔ البتہ ان انتخابات میں صرف جاگیردار، زمیندار، تعلیمی ادارے اور تاجر شامل ہو سکتے تھے۔ اس طرح پنجاب میں صرف بااثر طبقے کو ہی ووٹ دینے اور منتخب ہونے کا حق حاصل تھا۔

مونٹیگو-چیمسفورڈ اصلاحات 1919ء ایک نمایاں تبدیلی لے کر آئیں۔ ان کے تحت بعض

محکمے مقامی وزراء کے ماتحت کر دیے گئے جبکہ باقی محکمے گورنر کے اختیار میں رہے۔ پنجاب میں پہلا صوبائی انتخاب 1920ء میں ہوا، جس سے منتخب نمائندوں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ یونینسٹ پارٹی نے اس دور میں کلیدی کردار ادا کیا۔ تاہم، ووٹ کا حق بدستور صرف جائیداد رکھنے والے، تعلیم یافتہ اور ٹیکس دہندگان کو حاصل تھا۔

1935ء کا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ایک بڑی سیاسی اصلاح کے طور پر سامنے آیا، جس کے تحت صوبوں کو محدود خودمختاری دی گئی۔ اگرچہ بالغ رائے دہی ابھی بھی مکمل طور پر نافذ نہ ہو سکی، تاہم ووٹروں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہوا۔ اس قانون کے تحت 1937ء اور 1946ء میں انتخابات منعقد ہوئے، جنھوں نے پنجاب کے سیاسی منظرنامے کو یکسر بدل دیا۔ 1937ء کے انتخابات میں یونینسٹ پارٹی نے اکثریت حاصل کی جبکہ مسلم لیگ پنجاب میں ناکام رہی۔ کانگریس کو محدود کامیابی ملی، اور سردار سکندر حیات خان یونینسٹ پارٹی کی طرف سے وزیر اعلیٰ بنے۔

1946ء کے انتخابات برصغیر کی تاریخ کے ایک فیصلہ کن موڑ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پنجاب کی 84 مسلم نشستوں میں سے 73 پر مسلم لیگ کامیاب ہوئی، جبکہ کانگریس اور اکالی دل نے بالترتیب ہندو اور سکھ ووٹ بینک کی نمائندگی کی۔ اس انتخاب نے مذہبی بنیادوں پر قطعی صف بندی کو اجاگر کیا، جس کے نتیجے میں پنجاب مذہبی لحاظ سے دو واضح گروہوں میں تقسیم ہو گیا۔

یہاں انتخابی تفصیلات سے قطع نظر، بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا ان انتخابات نے پنجاب کے سماج کو فرقہ واریت کی طرف مزید دھکیل دیا؟ کیا ان انتخابات ہی کو تقسیمِ پنجاب کا اہم سبب قرار دیا جا سکتا ہے؟ کیا انتخابی نتائج کو تبدیل کرنے یا مخصوص نتائج حاصل کرنے کی کوشش کی گئی؟ میرے مشاہدے کے مطابق، پنجاب میں انتخابی سیاست کا باقاعدہ آغاز 1919ء کی اصلاحات کے بعد ہوا، جس نے فرقہ ورانہ تقسیم کو مزید گہرا کر دیا۔

یہ تقسیم دراصل اورنگزیب کے دور میں شروع ہو چکی تھی، اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور میں اس نے سیاسی صورت اختیار کی۔ انتخابی حلقوں کی شہری و دیہی تقسیم، ووٹنگ کے محدود معیار، اور مخصوص طبقوں کو سیاسی عمل میں فوقیت دینے سے قومی یکجہتی کو نقصان پہنچا۔ یونینسٹ پارٹی نے

اگرچہ متحدہ پنجاب کی سیاست کو مستحکم رکھنے کی کوشش کی، تاہم مذہبی سیاست کے بڑھتے ہوئے رجحانات اسے بے اثر کرتے گئے۔ 1937ء کے سکندر۔جناح معاہدے کے بعد مسلم لیگ کی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔ اس دوران کانگریس نے ''عوامی رابطہ تحریک'' شروع کی، اور سردار سکندر حیات نے لیگ سے اتحاد کر کے پنجاب کی سیاست کا رُخ موڑ دیا۔ یہ تمام عوامل آخرکار 1947ء کی تقسیمِ پنجاب کا پیش خیمہ بنے۔

اس کے جواب میں قائدِ اعظم نے کانگریس کا مقابلہ کرنے کے لیے شہری اور دیہی علاقوں کی مسلم آبادی کو عوامی رابطہ مہم میں شامل کرنے کا آغاز کیا، جس کے نتیجے میں پنجاب کے طلبہ، خواتین، علما، مشائخ، پیروں اور سجادہ نشینوں کو متحرک کیا گیا۔ تاریخ سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ جب کانگریس نے وزارتوں سے استعفیٰ دیا، تو جناب محمد علی جناح نے ''یومِ نجات'' منایا اور آل انڈیا مسلم لیگ کو برصغیر کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت قرار دیا۔ یہ حیثیت 1946ء کے انتخابات تک برقرار رہی۔

پھر 1946ء کے انتخابات کا مرحلہ آیا۔ ان انتخابات میں مسلم لیگ نے ''پاکستان'' کے نعرے کے تحت بھرپور حصہ لیا، جبکہ کانگریس متحدہ مگر آزاد ہندوستان کی علمبردار تھی۔ آل انڈیا مسلم لیگ، جو 1937ء کے انتخابات میں پنجاب میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے میں ناکام رہی تھی، اب اکثریتی نشستوں پر کامیاب ہوئی۔ (انتخابی عمل 1936ء کے آخر میں شروع ہوا اور 1937ء کے اوائل میں مکمل ہوا۔) اس طرح مسلم لیگ کا نظریہ یعنی قیامِ پاکستان 1946ء کی انتخابی مہم کا محور بن کر پنجاب کے عوام کے لیے واحد قابلِ قبول تصور کے طور پر سامنے آیا۔ چنانچہ برطانوی حکومت کو 3 جون 1947ء کا منصوبہ پیش کرنا پڑا، جس کے تحت ہندوستان کی تقسیم اور دونئی ریاستوں پاکستان اور بھارت کا قیام عمل میں آیا۔

اگر ہم انتخابات کے مجموعی اثرات کا جائزہ لیں تو یہ کہنا بجا ہوگا کہ پنجاب میں انتخابی عمل کا سب سے نمایاں اثر فرقہ ورانہ شناختوں کے گہرے ہونے کی صورت میں ظاہر ہوا۔ حکومتِ ہند ایکٹ 1935ء کے بعد انتخابی سیاست کو فرقہ ورانہ بنیادوں پر تشکیل دیا گیا، جس میں مسلمانوں،

ہندوؤں اور سکھوں کے لیے علیحدہ حلقہ جات مخصوص کیے گئے۔ اس کے نتیجے میں: یہ وہ دور تھا جب سیاسی جماعتیں فرقہ ورانہ شناخت کی نمائندہ بن گئیں۔ مسلم لیگ، کانگریس، اور اکالی دل جیسی جماعتیں اپنی اپنی مذہبی برادریوں پر مرکوز ہوگئیں، جس کے باعث باہمی اعتماد میں کمی اور تقسیم میں اضافہ ہوا، جو بالآخر فرقہ ورانہ فسادات کی صورت میں ظاہر ہوا۔ 1946ء کے انتخابات تک پنجاب کا سیاسی منظرنامہ مکمل طور پر فرقہ وارانہ رنگ اختیار کر چکا تھا۔

اسی عرصے میں یونینسٹ پارٹی کے عروج و زوال کا بھی مشاہدہ کیا گیا۔ یونینسٹ پارٹی (1923ء-1946ء) نے مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں بالخصوص زمیندار طبقے کے درمیان بین المذاہب ہم آہنگی قائم کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ ابتدا میں اس جماعت کو خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی، تاہم جب فرقہ واریت کی شدت میں اضافہ ہوا تو اس کا زوال بھی ناگزیر ہوگیا۔ یونینسٹ پارٹی کی ناکامی دراصل پنجاب میں سیکولر اور بین المذاہب سیاسی نظام کی ناکامی کی علامت تھی۔ اس کے نتیجے میں جو سیاسی خلا پیدا ہوا، اسے جلد ہی مسلم لیگ اور اکالی دل جیسی جماعتوں نے پُر کردیا، جن کی سیاست مکمل طور پر مذہبی خطوط پر استوار تھی، اور ان کی سرگرمیوں نے بعدازاں تباہ کن اثرات مرتب کیے۔

انتخابات کے نتیجے میں سیاسی شعور خصوصاً شہری علاقوں اور دیہی اشرافیہ میں فروغ پایا۔ ایک نیا سیاسی طبقہ، جس میں رہنما، کارکن، اور ووٹر شامل تھے، وجود میں آیا۔ اسی عرصے میں پہلی مرتبہ پنجاب میں ووٹنگ، مہم سازی، اور عوامی شرکت جیسے تصورات متعارف ہوئے، جو آزادی کے بعد کی سیاست کی بنیاد بنے۔ البتہ ایک اور فرق بھی نمایاں طور پر سامنے آیا کہ انتخابات نے دیہی اور شہری علاقوں کے درمیان خلیج کو مزید گہرا کردیا۔ انتخابی نظام نے دیہی حلقوں کو فوقیت دی، جہاں یونینسٹ پارٹی اور زمیندار طبقے کو زیادہ کنٹرول حاصل تھا۔ شہری حلقے، اس کے برعکس، سیاسی احتجاج اور تحریکات کے مراکز بنے، بالخصوص کانگریس اور مسلم لیگ کے لیے۔

مختلف انتخابات کے دوران جب انتخابی مہمات نے زور پکڑا تو مذہبی منافرت کو بھی بڑھاوا ملا، جو بعدازاں فرقہ ورانہ تشدد کی صورت میں ظاہر ہوا۔ پنجاب کا معاشرہ، جو کبھی بین المذاہب ہم

آہنگی اور مشترکہ ثقافت کے لیے معروف تھا، تیزی سے فرقہ ورانہ دشمنی کی طرف مائل ہو گیا۔ اس صورتِ حال نے 1947ء میں پنجاب کی خونی تقسیم کے لیے نفسیاتی اور سماجی بنیادیں فراہم کیں۔

ایک اور اہم پہلو یہ تھا کہ انتخابات نے سیاسی وفاداریوں اور اتحادوں میں تبدیلی کا رجحان پیدا کیا۔ خاص طور پر 1937ء کے سکندر۔ جناح معاہدے کے بعد، کئی مسلم اشرافیہ مسلم لیگ کی طرف مائل ہو گئیں۔ کانگریس دیہی مسلمانوں کو اپنی طرف مائل کرنے میں ناکام رہی، اور اس کا جھکاؤ ہندو مفادات کی طرف سمجھا گیا، جس نے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو بدظن کر دیا۔

اگر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ 1946ء کے انتخابات مطالبۂ پاکستان کے لیے ایک قسم کے ریفرنڈم میں تبدیل ہو گئے۔ مسلم لیگ نے پنجاب میں مسلمانوں

Political Parties during 1849-1947 in Punjab (Ali & Awan)

1. Indian National Congress (Punjab)	33. Hindustani Workers of the Pacific Coast
2. Kuka Movement	34. Hindu Mahasabah
3. Brahmu Samaj of Punjab	35. United India League
4. Anjuman-i-Punjab	36. Jamiat-e-Ulema-e-Hind
5. Anjuman-i-Islamia	37. Central Sikh League
6. Singh Sabha	38. Akali Dal,
7. Lahore Indian Association	39. Gurdwara Reform Movement
8. Hindustan Socialist Republic Army	40. Communist Party of India (Lahore)
9. Arya Samaj (Punjab)	41. Sanghtan
10. Central National Muhammadan Association	42. Shudhi
11. Punjab Riyasti Parja Mandal	43. Tabligh & Tanzim
12. Anjuman-e-Himayat-e-Islam	44. Swaraj Party
13. Muhammadan Educational Conference	45. Punjab National Unionist Party
14. Young Men Muhammadan Association	46. Rashtarya Swami Siwak Sang RSSS
15. Nojawan Bharat Sabha	47. All India Muslim Conference
16. Babbar Akali Movement	48. All India Muslim Nationalist Party
17. Khilafat Movement	49. Pseudo Riyasti Parja Mandal
18. Jamat-e-Ahmadia	50. Kisan Movement
19. Chief Khalsa Dewan	51. All India Majlis-e-Ahrar-e-Islam
20. Muslim League	52. Khaksar Tehriq
21. Punjab Muslim League	53. Muzara Movement
22. Bharat Mata	54. Kirti Kisan Party
23. Panch Khalsa Dewan	55. Muslim Unity Board
24. Punjab Chief Association	56. All India Kisan Sabha
25. Muslim Association	57. Majlis-e-Ittehad-e-Millat
26. Punjab Provincial Muslim League	58. Punjab Muslim League Assembly Party
27. Khalsa Dewan Society	59. Central Zamindara League
28. Ghadar Party (Punjab)	60. Jamat-e-Islami
29. Sikh Educational Conference	61. Jamiat-e-Ulema-e-Islam.
30. Indian Independence League	62. National Progressive Party
31. Hindustani Association	63. Congress Nationalist Part
32. Ahmadia Anjuman-e-Ashaat-e-Islam	

Pdf of Political Development and the Political Parties in Punjab: 1849-1947

Caption

Indian Political Parties Established out of India[1]

Sr. No.	Party	Year	City
1	Khalsa Dewan Society	1907	Vancouver
2	Ghadar Party (Punjab)	1908	California
3	Indian Independence League	1908	California
4	Hindustani Association	1914	Vancouver
5	Hindustani Workers of the Pacific Coast	1914	California
6	United India League	1915	Vancouver
7	Communist Party of India	1921	Tashkent

Source: Ralhan, O. P. (2002). *Encyclopedia of Political Parties.*

کے حلقوں میں شاندار کامیابی حاصل کی، جس نے قائداعظم محمد علی جناح کے اس دعوے کو تقویت دی کہ وہ برصغیر کے تمام مسلمانوں کے واحد نمائندہ ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پنجاب، تحریکِ پاکستان کا سیاسی اور علامتی مرکز بن گیا۔

یہ سب جان کر اگر میں یہ کہوں کہ برطانوی دور کے دوران پنجاب میں ہونے والے انتخابات ایک دودھاری تلوار ثابت ہوئے، تو غلط نہ ہوگا: ایک طرف انھوں نے سیاسی شعور کو فروغ دیا، تو دوسری طرف فرقہ ورانہ تقسیم کی بنیاد بھی رکھ دی۔ سیاسی قیادت کا مذہبی شناختوں سے اوپر نہ اٹھ سکنا بالآخر پنجاب کی خونی تقسیم، نقل مکانی، اور مشترکہ ثقافتی ورثے کی تباہی پر منتج ہوا۔

علی اور اعوان نے ان سیاسی جماعتوں کا ذکر بھی کیا ہے جو ہندوستان سے باہر قائم کی گئی۔

❋❋❋

تقسیمِ ہند اور تقسیمِ پنجاب

ایک ذاتی مشاہدہ اور تاثرات

یہ وہ موضوع ہے جس پر الگ سے ایک کتاب لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ یہاں اس موضوع پر بہت ہی مختصر بات کی جائے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس موضوع کے تحت پنجاب کا تذکرہ تو کیا جا سکتا ہے، مگر اس عنوان کا تعلق ہندوستان کے ہر فرد اور ہر علاقے سے ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز پر دنیا بھر میں کئی سلطنتیں موجود تھیں جنھوں نے اپنی اپنی کالونیاں قائم کر رکھی تھیں۔ ان میں برطانیہ، فرانس، اسپین، ہالینڈ وغیرہ سرِفہرست تھیں۔ کالونی ایک انگریزی اصطلاح ہے، مگر میں انھیں غلام ملک کہنا چاہوں گا۔ ٹیکنالوجی، تعلیم، میڈیا، ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کی آزادی، اور دیگر کئی عوامل نے دنیا بھر میں غلامی سے نجات کی کوششوں کو جنم دیا۔ ایسی تحریکیں مشرقِ بعید سے لے کر جنوبی امریکہ اور افریقہ تک نظر آتی ہیں۔ یہی کچھ ہندوستان میں بھی ہوا۔ یہاں بھی آزادی کی خواہش پیدا ہوئی، اور ایک دن ایسا آیا جب یہ خطہ غلامی سے نجات حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔

مغل سلطنت اور اس کے بعد قائم ہونے والی مقامی ریاستوں کی انگریزوں سے دوستی کے نتیجے میں ہندوستان پر حکومت ایک تجارتی کمپنی سے براہِ راست تاجِ برطانیہ کو منتقل ہوئی۔ انڈین نیشنل کانگریس اور آل انڈیا مسلم لیگ کی تشکیل عمل میں آئی۔ ان میں سے مسلم لیگ صرف شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کی نمائندہ جماعت تھی، جبکہ کانگریس پورے ہندوستان کے تمام باشندوں کے لیے کھلی تھی۔ جنوبی ہند میں بھی کہیں کہیں مسلم لیگ کے دفاتر موجود تھے۔

آزادی کی تحریک کا آغاز ہوتا ہے، جس میں مہاتما گاندھی کی عدم تشدد پر مبنی جدوجہد،

تحریکِ خلافت کا پرچار، عدم تعاون تحریک، سول نافرمانی، اور 'بھارت چھوڑو' تحریکیں شامل تھیں۔ مسلمانوں کی مخصوص شناخت کے ابھار اور علامہ اقبال کے تصورِ پاکستان جیسے موضوعات بھی زیرِ بحث آئے۔ ایک طویل عرصے تک صرف آزادی ہی مرکزِ نگاہ رہی۔ پھر مسلمانوں کے مطالبات اور دوقومی نظریے کا نعرہ سامنے آتا ہے۔ 1930ء میں علامہ اقبال کے خطبہٗ الٰہ آباد کو بنیاد بنایا جاتا ہے، اور 1940ء کی قراردادِ لاہور کے ذریعے یہ بات واضح کی جاتی ہے کہ ہندوستان کی آزادی کے ساتھ ساتھ اس کی تقسیم بھی ضروری ہے۔ اس پر کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان نظریاتی اختلافات شدت اختیار کر جاتے ہیں۔ اس تقسیم میں دو بڑے صوبوں کا کردار خاص طور پر قابلِ ذکر ہے: بنگال اور پنجاب۔

پنجاب میں 1946ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کی کامیابی ایک ریفرنڈم کی حیثیت رکھتی تھی، جس سے واضح ہوا کہ مسلمانوں کی اکثریت نے مسلم لیگ پر اعتماد کا اظہار کیا۔ اس کے بعد ہندوستان کی آزادی اور تقسیم کا اعلان کیا گیا۔ مقامی ریاستوں کو اپنی مرضی سے الحاق یا آزادی کا حق دیا گیا۔ صوبوں کو بھی فیصلے کا اختیار ملا۔ پنجاب میں متفقہ فیصلہ نہ ہو سکا، چنانچہ اسے تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا گیا، اور 3 جون 1947ء کو باقاعدہ اعلان کر دیا گیا۔ اس کے نتیجے میں پنجاب کی تقسیم عمل میں آئی، جسے میں ایک بڑا انسانی المیہ سمجھتا ہوں۔

تقسیم کے بعد خونی فسادات، نقل مکانی، اور لاکھوں جانوں کا ضیاع ایک ایسا واقعہ ہے جس نے میرے خاندان کو بھی شدید متاثر کیا۔ تقسیمِ پنجاب تک تو معاملہ کسی حد تک قابلِ فہم تھا، مگر نقل مکانی کا کوئی واضح جواز نہ تھا۔ پنجاب کی تقسیم کے باعث جو نقصان ہوا، وہ اپنی جگہ موجود ہے، مگر اس کے بعد جو کچھ ہوا: لاکھوں انسانوں کا قتل، ایک کروڑ سے زیادہ لوگوں کی جبری نقل مکانی، اور ایک خوشحال صوبے کی معاشی تباہی: یہ سب کچھ ناقابلِ تصور تھا۔

تقسیم کے سماجی، سیاسی، اور تہذیبی اثرات، مہاجرین کی آبادکاری، مشترکہ تہذیب کا زوال، مذہبی بنیادوں پر ابھرنے والی قوم پرستی، اور نسل در نسل منتقل ہونے والا درد، ایک ایسا موضوع ہے جس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ میں اسے ''آزادی کا جشن یا انسانیت کا

المیہ'' کہوں، یا بقولِ فیض:

یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں

یا پھر امریتا کے الفاظ میں یوں کہوں:

اج آکھاں وارث شاہ نوں، کتھوں قبراں وچوں بول
تے اج کتابِ عشق دا کوئی اگلا ورقہ پَھول
اک روئی سی دھی پنجاب دی، تُوں لکھ لکھ مارے بین
اج لکھاں دھیاں روندیاں، تینوں وارث شاہ نوں کہن

❁❁❁

تقسیمِ پنجاب، فسادات، نقل مکانی

صدیوں سے قائم سماج کا خاتمہ

یہ سب کیسے ہوا؟ کس نے کیا؟ کیوں کیا؟ اس کے نتائج کیا نکلے؟ کون اس کا ذمہ دار ہے؟ یہ اور ایسے ہی کئی سوالات ہیں جن کے جوابات تلاش کرنے کی کوشش میں ہوں۔ اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ میں اس اندوہناک واقعے کے اسباب اور اس کے نتائج پر بات کرنا چاہوں گا، مگر اس سے قبل اس ناقابلِ بیان سانحے کا ایک مختصر تذکرہ ضروری ہے۔

تقسیمِ پنجاب کا تصور کبھی بھی موجود نہ تھا، لیکن یہ بھی درست ہے کہ انتظامی نقطۂ نظر سے پنجاب کو پانچ بار تقسیم کیا گیا۔ پہلی مرتبہ انگریزوں نے اس وقت تقسیم کیا جب انھوں نے مہاراجہ رنجیت سنگھ سے معاہدہ کیا۔ ستلج کے مشرق میں انگریز اور سکھ ریاستیں قائم ہوئیں، جبکہ ستلج کے مغرب میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت برقرار رہی۔ اس کے بعد دوسری مرتبہ، 1901ء میں، ہزارہ کا علاقہ پنجاب سے الگ کر کے صوبہ سرحد کا حصہ بنایا گیا۔ تیسری مرتبہ تقسیم اس وقت واقع ہوئی جب دہلی کو پنجاب سے الگ کر کے ایک وفاقی علاقہ قرار دیا گیا۔ چوتھی مرتبہ مذہبی بنیادوں پر تقسیم 1947ء میں عمل میں آئی، اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس کے نتیجے میں پنجاب کو دو علیحدہ حصوں میں بانٹ دیا گیا: مشرقی پنجاب (بھارت کا حصہ) اور مغربی پنجاب (پاکستان کا حصہ)۔ پانچویں بار اس کے بعد 1966ء میں بھارت کی حکومت نے لسانی بنیادوں پر ریاستوں کی نئی حد بندیاں کیں (The Punjab Reorganisation Act 1966)، جس کے نتیجے میں ہماچل پردیش میں پنجاب سے ملحقہ پہاڑی علاقوں کو شامل کیا گیا، اور ہریانہ کو بھی پنجاب سے الگ کر کے ایک نیا صوبہ بنایا گیا۔

مذہبی بنیادوں پر تقسیم اُس فیصلے کا نتیجہ تھا جس کے تحت برصغیر کو دو خود مختار ممالک بھارت اور پاکستان میں تقسیم کیا گیا۔ یہ تقسیم مذہبی بنیادوں پر ہوئی۔ کیا یہ فیصلہ ہندو، سکھ، اور مسلمان برادریوں کے درمیان عشروں سے جاری فرقہ ورانہ کشیدگی کے پس منظر میں کیا گیا تھا؟ یہ ایک اہم سوال ہے، اور ہر مؤرخ اس کا جواب مختلف انداز میں دیتا ہے۔

پنجاب میں مختلف مذہبی اور ثقافتی گروہ صدیوں سے آباد تھے۔ تقسیم کے وقت شدید تشدد اور اجتماعی جبری ہجرت کے باعث دونوں اطراف سے لاکھوں افراد کو اپنے گھر بار چھوڑنے پڑے۔ بڑے پیمانے پر خونریزی، جلاوطنی، اور جانوں کا ضیاع ہوا۔ مغربی پنجاب سے ہندو اور سکھ مشرقی پنجاب کی طرف ہجرت کر گئے، جبکہ مشرقی پنجاب سے مسلمان مغربی پنجاب کی طرف منتقل ہوئے۔ مشرقی اور مغربی پنجاب کے درمیان سرحدی حد بندی کا فریضہ ریڈکلف نے انجام دیا، جو ایک برطانوی قانون دان تھا اور اس سے قبل کبھی ہندوستان نہیں آیا تھا۔ تقسیم کا عمل انتہائی عجلت میں مکمل کیا گیا، جس کے باعث علاقوں، اثاثوں، اور وسائل کی تقسیم میں شدید ابہام اور تنازعات پیدا ہوئے۔ پنجاب کی تقسیم کے سماجی، ثقافتی اور معاشی اثرات دونوں طرف بہت گہرے تھے۔ روایتی برادریاں بکھر گئیں، لاکھوں لوگ بے گھر ہو گئے، اور خاندان ٹوٹ گئے۔ تقسیم کے دوران ہونے والے تشدد اور صدمات نے دونوں ملکوں کی اجتماعی یادداشت پر انمٹ نقوش چھوڑے۔ برصغیر کی تاریخ میں تقسیمِ پنجاب ایک نہایت حساس اور تاریخی لحاظ سے اہم باب ہے، جو آج بھی بھارت اور پاکستان کے باہمی تعلقات اور ان کی ترقی پر اثر انداز ہو رہا ہے۔

میں یہاں اس دوران پیش آنے والے چند واقعات کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ اگر آپ اس موضوع پر مزید جاننا چاہیں تو درج ذیل کتب بے حد مفید ہیں:

ٹوٹا ہوا تارا۔ عبدالسلام خورشید
(تقسیمِ پنجاب کی تاریخی، سماجی و ثقافتی تصویر)

شاہراہوں کے مسافر۔ قمر رئیس
(تقسیم اور ہجرت کا ادبی تجزیہ)

زندہ رود۔اشتیاق حسین قریشی

(قائداعظم، مسلم لیگ اور تقسیم کا تاریخی پس منظر)

پاکستان: نظریہ و قیام۔ڈاکٹر صفدر محمود

(تحقیقی بنیاد پر تقسیم ہندو پنجاب پر بحث)

Freedom at Midnight. Larry Collins Dominique Lapierre

(مغربی مصنفین، مگر سکھوں پر تفصیلی باب؛ سکھ زاویہ اجاگر کیا گیا)

The Sikhs of Punjab. Joyce Pettigrew

(سکھوں کی قومیتی شناخت اور تقسیم کا اثر)

When a Tree Shook Delhi. Manoj Mitta & H.S. Phoolka

(اگرچہ 1984 پر ہے، مگر اس میں تقسیم کے اثرات کی جھلک ہے)

Gurbakhsh Singh Kala Afghana's Writings (متعدد کتابیں)

(سکھ زاویہ نگاہ سے تاریخی و نظریاتی تجزیہ)

Train to Pakistan-Khushwant Singh

(افسانوی مگر تاریخی حقیقت پر مبنی، تقسیم کے المیے پر نقطۂ نظر)

Tamas-Bhisham Sahni

(تقسیم پر ہندو نقطہ نظر سے لکھا گیا طاقتور ناول)

Partition: The Story of Indian Independence and the Creation of Pakistan in 1947- Barney White-Spunner

(غیر ہندو مصنف مگر ہندو قیادت کی روشنی میں)

Partion of India: Legend and Reality-H.M. Seervai

(ایک ہندو وکیل کا قانونی و تاریخی تجزیہ)

The Great Partition: The Making of India and Pakistan-

Yasmin Khan

Borders and Boundaries-Ritu Menon & Kamla Bhasin

(خواتین کی نظر سے تقسیم اور جنسی تشدد کی کہانی)

From the Ashes of 1947:Reimagining Punjab-Pippa Virdee

(پنجاب کی مشترکہ یادیں اور تقسیم کے اثرات)

حال ہی میں شائع ہونے والی ڈاکٹر اشتیاق احمد کی کتاب پنجاب کا بٹوارہ: 1947ء ایک المیہ، ہزار داستانیں، تقسیمِ پنجاب کے موضوع پر ایک جامع اور تحقیقی تصنیف ہے۔ میں بمشکل اس کے چند صفحات ہی پڑھ سکا، اور جو کچھ پڑھا، اسے یاد کر کے ہی بدن پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ پوری داستانِ غم پڑھنے کا حوصلہ نہ پایا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں خود بھی ایک مہاجر اور ظلم وستم سہنے والے خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔

ان کتابوں کی مدد سے جو کچھ جان سکا، وہ پیشِ خدمت ہے۔

سب سے پہلے میں یہ بات آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں کہ پنجاب میں ہونے والے فسادات کسی ایک واقعے کا نتیجہ نہ تھے، نہ ہی یہ کسی ایک دن یا مقام پر شروع ہوئے۔ میرے مطالعے اور غور وفکر کے بعد جو نتیجہ سامنے آیا، وہ یہ ہے کہ پنجاب میں تین بڑے مذاہب کے لوگ بستے تھے: ہندو، سکھ اور مسلمان۔ یہ سب ایک ہی گاؤں، محلے یا شہر میں رہتے تھے، مگر ایک دوسرے سے الگ۔ ان کی زبان مشترک تھی، مگر لباس مختلف۔ خوراک ایک جیسی تھی، مگر الگ الگ کھاتے تھے۔ پانی ایک جیسا پیتے تھے، مگر ایک ہی برتن میں نہیں۔ ایک شہر میں رہتے تھے، مگر محلّے جدا جدا تھے۔ یہ سب ہندوستانی کہلاتے تھے، مگر ان کی تاریخ، رسوم ورواج اور تہذیب جدا جدا تھی۔ یہ سب پنجاب کی ثقافت کے وارث تھے، مگر اسے منانے کے طریقے مختلف تھے۔ گویا وہ ایک ہی دریا میں بہہ رہے تھے، مگر ان کے دھارے الگ الگ تھے۔

پنجاب میں 1001ء کے لے کر 1947ء تک 946 سال تک ایک اقلیت، جو زیادہ تر ہندوستان سے باہر سے آئی تھی سوائے سکھوں کے، طاقت کے زور پر اکثریت سے اقتدار چھین کر

ان پر حکمرانی کرتی رہی۔ اس اقلیت نے مقامی آبادی کا مذہب تبدیل کیا، تہذیب میں تبدیلی لائی، ایک نئی زبان (فارسی، ترکی، عربی) متعارف کروائی، اور صدیوں سے قابلِ احترام سمجھی جانے والی گائے کو قربانی کے لیے استعمال کیا۔ یہ سب کچھ ہوتا رہا، اور کوئی ایک دہائی بھی ایسی نہ گزری جب اکثریت نے اقلیت کے خلاف بغاوت نہ کی ہو۔ مگر ہر بار اقلیت ہی غالب آئی؛ کبھی طاقت کے زور پر اور کبھی اخلاقی برتری کے ذریعے۔

اقلیت کو اپنے ساتھ لانے والوں کے علاوہ مقامی حمایت بھی حاصل ہوئی۔ صوفیائے کرام کے ایک باوقار گروہ نے ذات پات کے نظام میں پسے ہوئے طبقات کو نئی شناخت دی، اور یوں اقلیت کو مقامی سطح پر انسانی وسائل میسر آئے۔ جب بھی اقلیت کو اکثریت سے خطرہ محسوس ہوا، مذہب کو بطورِ ہتھیار استعمال کیا گیا، حالانکہ ان میں سے بیشتر افراد خود بھی اسلام کے بنیادی اصولوں سے کہیں دور تھے۔ یہ سلسلہ لگ بھگ ایک ہزار سال تک جاری رہا۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ برصغیر کے ایک حصے سندھ، جنوبی پنجاب اور بلوچستان میں یہ عمل آٹھویں صدی کے آغاز ہی سے شروع ہو چکا تھا، تو غلط نہ ہوگا۔ سندھ کا آخری مقامی حکمران راجہ داہر تھا، اور ملتان بھی آٹھویں صدی سے ہی مسلم حکمرانوں کے زیرِ اثر رہا۔

جب دنیا بھر میں جمہوریت، عوامی شعور، قومی شناخت، تعلیم، اور آزادی کی باتیں عام ہوئیں، تو اس کا اثر پنجاب پر بھی پڑا۔ وہ دن آ گیا جب طاقت کے بل پر حکومت کرنے والی اقلیت کمزور ہونے لگی، اور رعایا طاقت پکڑنے لگی۔ اقلیت اور اکثریت کی کشمکش کبھی ختم نہیں ہوئی تھی، مگر اکثریت بارہ سو سال تک کامیاب نہ ہو سکی۔ اب ایک پرانی اقلیت کی جگہ ایک نئی اقلیت نے لے لی، جو طاقت کے بل پر تخت نشین ہوئی تھی۔

یوں سماج میں تین طاقتیں موجود تھیں:

وہ جن کی تعداد ہندوستان بھر میں اسی فیصد سے زائد تھی (ہندو، سکھ، بدھ، اور دیگر مذاہب)،

دوسری طاقت (مسلمان) جن کی تعداد بیس سے پچیس فیصد کے درمیان تھی،

تیسری طاقت (انگریز)، جن کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی، مگر عسکری برتری کے باعث پورے ہندوستان پر راج کر رہے تھے۔

وقت نے کروٹ لی، اور تین بڑی قوتیں (ہندو، سکھ اور مسلمان) متحد ہو گئیں اور فیصلہ کیا کہ تیسری طاقت (انگریز) کو ہندوستان سے نکالا جائے۔ انگریز بھی اقتدار چھوڑنے پر آمادہ ہو گئے۔ اب سوال یہ تھا کہ اقتدار کس کے حوالے کیا جائے؟ یہی سوال نئے تصادم کا پیش خیمہ بنا، جس کا سب سے ہولناک مظاہرہ پنجاب میں دیکھنے کو ملا۔ وہی خونی فسادات، جنھیں ہم آج تک یاد کرتے ہیں۔

پنجاب کے فسادات: ایک صدیوں پرانے درد کا لاوا

ان فسادات کی اصل وجہ وہ صدیوں پرانا درد تھا، جس کا اظہار طویل عرصے تک دبا رہا۔ مگر اب وہ شدت سے اُبھرا۔

اورنگزیب عالمگیر کی وفات سے لے کر مہاراجہ رنجیت سنگھ کی وفات تک، لگ بھگ ڈیڑھ صدی تک پنجاب مسلسل جنگ وجدل کی لپیٹ میں رہا، جسے انگریزوں نے آ کر کچھ عرصے کے لیے دبا تو دیا، لیکن جب وہ بھی کمزور پڑے، تو وہی پرانی کشمکش دوبارہ بھڑک اٹھی۔ ایک ایسی اقلیت (سکھ، جو محض دس فیصد کے قریب تھے) نے پنجاب کی اکثریت پر حکومت کی۔ ملتان، کشمیر، ہزارہ اور پشاور تک خونریز جنگوں کے ذریعے قبضہ کیا گیا، اور طاقت کے زور پر حکمرانی قائم رکھی گئی۔

اس پورے پس منظر نے پنجاب کے معاشرے کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا، جو بالآخر پنجاب کے فسادات کا سبب بنا۔ یہ چنگاری پہلے بھی کئی بار بھڑکی، کبھی مدھم، کبھی شدید اور بالآخر مارچ 1947ء میں ایک شعلۂ جوالہ بن گئی۔ اس آگ نے صدیوں سے قائم پنجاب کے معاشرتی توازن کو جلا کر خاک کر دیا۔ وہ دریا، جس میں کئی دھارے بہتے تھے، وہ معاشرہ، جس میں اختلافات کے باوجود زندگی رواں دواں تھی، سب کچھ اس آگ کی نذر ہو گیا۔

تین نسلوں نے ایک ایسا دکھ دیکھا، جس کی ٹیس آج بھی محسوس کی جا سکتی ہے۔

میں یہ سب کچھ اس لیے لکھ رہا ہوں کہ یہ درد، جو ہماری اجتماعی یادداشت کا حصہ ہے، محض

ماضی کا افسانہ نہ بنے، بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے ایک سبق بنے۔

یہ سوال آج بھی تحقیق طلب ہے کہ اس خونریز آگ کو سب سے پہلے کس نے بھڑکایا؟ اس کے پھیلاؤ کا آغاز کہاں سے ہوا؟ کن عناصر نے اسے ہوا دے کر پورے خطے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا؟ اس موضوع پر مختلف گروہوں نے اپنے اپنے مؤقف اور مفروضات پیش کیے ہیں، جن میں اکثر تعصّبات اور سیاسی مفادات کی آمیزش ہے۔ نتیجتاً، صداقت اور تاریخی حقیقت دھندلا کر رہ گئی ہے۔

تاہم، ایک بات ایسی ہے جس پر کسی کو اختلاف نہیں وہ یہ کہ پنجاب اجڑ گیا، اور اس کے ساتھ صدیوں پر محیط سماجی و ثقافتی ہم آہنگی کا خواب بکھر کر رہ گیا۔ اس المیے کی شدت کو ملک زادہ منظور احمد کے ان اشعار میں بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے:

دیکھو گے تو ہر موڑ پہ مل جائیں گی لاشیں
ڈھونڈو گے تو اس شہر میں قاتل نہ ملے گا

تقریباً بیس لاکھ انسانوں کا قتل، اور اس کے باوجود کسی ایک قاتل کا بھی نام نہ لیا جانا، محض ایک سانحہ نہیں بلکہ انسانی ضمیر کے لیے ایک گہرا سوال بن چکا ہے۔ قاتل اگر بظاہر نظروں سے اوجھل ہو بھی گیا ہو، تو وہ تاریخ کے صفحات میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو چکا ہے اور ایک نہ ایک دن، کوئی مؤرخ، کوئی محقق ضرور اس کی شناخت تک پہنچنے کی کوشش کرے گا۔

تقسیم کا المیہ: ایک ذاتی مشاہدہ اور اس کے سماجی اثرات

یہاں میں ایک ایسا واقعہ بیان کرنا چاہوں گا، جو تقسیمِ ہند کے انسانی پہلو کو اُجاگر کرتا ہے۔ ایک بار میں نے اپنے ایک بزرگ رشتہ دار (جنھیں ہم چچا جان کہتے تھے) سے تقسیم کے دوران پیش آنے والے حالات کے بارے میں ایک نہایت دردناک قصہ سنا۔ وہ تقسیم کو ''اجاڑا'' کہا کرتے تھے، اور ان کے لہجے میں آج بھی وہ صدمہ جھلکتا تھا، جو وہ بچپن میں سہہ چکے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ کس طرح ان کے والد اور والدہ کو گھر میں گھس کر شہید کر دیا گیا، اور وہ خود محض دس برس سے بھی کم عمر میں پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ ان کی داستان میں ذاتی کرب، بچھڑنے کا دکھ، اور بے یقینی کی کیفیات نمایاں تھیں۔

جب انھوں نے اپنی بات مکمل کی، تو میں نے عرض کیا:

''چچا جان، یہ بات بھی تو حقیقت ہے کہ تقسیم کے وقت مسلمانوں نے بھی سکھوں پر ظلم کیے، ان کے افراد کو قتل کیا، ان کی جائیدادیں لوٹیں، اور ان کی خواتین کو اغوا کیا۔''

میری یہ بات سن کر وہ غصے سے بولے:

تواںہاں دے نال ایں یا ساڈے نال ایں؟

(تم اُن کے ساتھ ہو یا ہمارے ساتھ؟)

میں خاموش رہا، کیونکہ یہی مناسب تھا۔

یہ واقعہ صرف ایک ذاتی تجربہ نہیں، بلکہ اس دور کی اجتماعی نفسیات کو بھی بیان کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مظالم دونوں جانب ہوئے۔ انسانی جانوں کی حرمت پامال ہوئی، اور دونوں برادریاں ناقابلِ بیان تکالیف سے گزریں۔ ان فسادات کو ہوا دینے والے عناصر اکثر وہ لوگ تھے، جو خود تصادم سے محفوظ فاصلے پر بیٹھے، اپنے سیاسی یا مذہبی مقاصد کی تکمیل دیکھ رہے تھے۔

ساحر نے بھی کیا خوب کہا ہے؛

ظلم پھر ظلم ہے بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے
خون پھر خون ہے ٹپکے گا تو جم جائے گا
خاک صحرا پہ جمے یا کف قاتل پہ جمے
فرق انصاف پہ یا پائے سلاسل پہ جمے
تیغ بیداد پہ یا لاشۂ بسمل پہ جمے
خون پھر خون ہے ٹپکے گا تو جم جائے گا

***

لاکھ بیٹھے کوئی چھپ چھپ کے کمیں گاہوں میں
خون خود دیتا ہے جلادوں کے مسکن کا سراغ
سازشیں لاکھ اڑاتی رہیں ظلمت کی نقاب
لے کے ہر بوند نکلتی ہے ہتھیلی پہ چراغ

ظلم کی قسمت ناکارہ و رسوا سے کہو
جبر کی حکمت پرکار کے ایما سے کہو
محمل مجلس اقوام کی لیلیٰ سے کہو
خون دیوانہ ہے دامن پہ لپک سکتا ہے
شعلۂ تند ہے خرمن پہ لپک سکتا ہے
تم نے جس خون کو مقتل میں دبانا چاہا
آج وہ کوچہ و بازار میں آ نکلا ہے
کہیں شعلہ کہیں نعرہ کہیں پتھر بن کر
خون چلتا ہے تو رکتا نہیں سنگینوں سے
سر اٹھاتا ہے تو دبتا نہیں آئینوں سے
ظلم کی بات ہی کیا ظلم کی اوقات ہی کیا
ظلم بس ظلم ہے آغاز سے انجام تلک
خون پھر خون ہے سو شکل بدل سکتا ہے
ایسی شکلیں کہ مٹاؤ تو مٹائے نہ بنے
ایسے شعلے کہ بجھاؤ تو بجھائے نہ بنے
ایسے نعرے کہ دباؤ تو دبائے نہ بنے

بقول قابل اجمیری؛

راستہ ہے کہ کٹتا جاتا ہے
فاصلہ ہے کہ کم نہیں ہوتا
وقت کرتا ہے پرورش برسوں
حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

آزادی کی صبح تک جب پنجاب، پنجاب نہ رہا
پھر اس کی داستان کیسی؟

میں نے اس کتاب میں صرف اُس تاریخی تسلسل کو بیان کیا ہے جو اگست 1947ء تک، یعنی متحدہ پنجاب کے وجود تک محدود ہے۔ اس کے بعد جو حالات و واقعات پیش آئے، وہ اب دو مختلف ریاستوں پاکستان اور بھارت کے الگ الگ بیانیوں کا حصہ ہیں اور اُس وقت کے پنجاب کی وحدت کا مظہر نہیں رہے۔

اگست 1947ء میں تقسیمِ ہند کے بعد متحدہ پنجاب (برطانوی پنجاب) دو حصوں میں بٹ گیا: مشرقی پنجاب (بھارت) اور مغربی پنجاب (پاکستان)۔ اس تقسیم کے ساتھ ہی متحدہ پنجاب کی تاریخی، ثقافتی اور انتظامی یکجہتی ختم ہوگئی۔ اس کے بعد کے حالات دو الگ خطوں کی کہانی ہیں، جو اب ایک دوسرے سے جدا ہو چکے ہیں۔ تقسیمِ پنجاب نے نہ صرف جغرافیائی سرحدیں بدلیں بلکہ اس خطے کے مشترکہ تہذیبی ورثے کو بھی گہرا صدمہ پہنچایا۔ 1947ء کے بعد کے واقعات اب متحدہ پنجاب کے نہیں، بلکہ دو نئی سیاسی اکائیوں کی تاریخ کا حصہ ہیں۔

یہاں تک پنجاب کی جو داستان بیان ہوئی، وہ اسی متحدہ پنجاب کی تھی جو اب تاریخ کے اوراق میں دفن ہو چکا ہے۔ 1947ء کی تقسیم نے پنجاب کو دو لخت کر دیا۔ لاکھوں لوگوں کی ہجرت، خون کی ندیاں، اور اجڑے ہوئے گھر یہ سب متحدہ پنجاب کے آخری باب کی داستان تھی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ دو نئے پنجابوں کی کہانی ہے، جن کے راستے جدا ہو چکے ہیں۔

متحدہ پنجاب کی داستان یہیں ختم ہوتی ہے، مگر اس کی یادوں کا سلسلہ نہیں ٹوٹا۔

اگست 1947ء میں پنجاب کے سینے پر جو زخم لگا، وہ آج بھی تازہ ہے۔ وقت نے بس

دھندلا دیا ہے، مٹایا نہیں۔

تقسیمِ پنجاب کے ساتھ ہی ایک زمانہ اختتام کو پہنچا۔

آج بھی لاہور اور امرتسر کی گلیوں میں اُس کھوئے ہوئے پنجاب کی خوشبو بسی ہے۔

چنانچہ ان بعد کے حالات کو اس تحریر میں شامل کرنا میرے مقصد کے دائرے سے باہر ہے۔ یہاں میں اپنا بیان ختم کرتا ہوں، کہ اگلا باب ایک نئی تحقیق، نئے تناظر، اور جداگانہ پس منظر کا متقاضی ہے۔

پنجاب بارے میرے خیالات کی ترجمانی غالب کے الفاظ میں:

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے

اس تمنا کے ساتھ اختتام کرتا ہوں کہ ایک دن وہ وقت بھی آئے، جب پاکستان اور بھارت اپنی اپنی جگہ قائم رہیں، مگر کوئی ایسا بندوبست ضرور ہو کہ میں آزادی کے ساتھ اُن گلیوں اور کوچوں کو دیکھ سکوں، جہاں میرے والدِ محترم نے جنم لیا، جہاں میرے اجداد کی قبریں واقع ہیں۔

جہاں اُس سکھ خاندان کا مسکن ہے جس نے قیامِ پاکستان کے ہنگاموں میں میری والدہ اور ننھیال کو پناہ دی، جہاں وہ مسجد واقع ہے جس میں میرے بزرگ نماز ادا کیا کرتے تھے،

اور جہاں اُن صوفیائے کرام کے مزارات ہیں، جنھوں نے برصغیر کی سرزمین پر دینِ اسلام کی شمع روشن کی۔

یہ دل کی گہرائیوں سے اُبھرنے والی آرزو ہے کہ ایک ایسا دن آئے جب سرحدوں پر کھنچی لکیریں انسانوں کے بیچ دیوار نہ بنیں،

اور مجھے آمد و رفت کے لیے کسی ویزے کی پابندی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

بھارت اور پاکستان کے درمیان سرحد کی موجودگی پر کوئی اعتراض نہیں،

مگر خواہش محض اتنی ہے کہ اس سرحد میں ایک دروازہ کھلا ہو

ایک ایسا دروازہ جو لوگوں کو ملانے کا ذریعہ بنے، جدائی کا نشان نہ ہو۔

خواہش ہے کہ میں بھی اُس دروازے سے گزر سکوں، اور وہاں کے لوگ بھی اِدھر آ سکیں آزاد، محفوظ، اور احترام کے ساتھ۔ کاش، وہ دن میری زندگی میں آ جائے۔ اسی اُمید اور تمنا کے سہارے زندہ ہوں نہ صرف میں، بلکہ میرے جیسے لاکھوں لوگ۔

جو سرحد کے دونوں جانب بستے ہیں اور جو دلوں کی قربت کو جغرافیائی فاصلوں پر فوقیت دیتے ہیں۔

یہاں آپ ایک سوال کر سکتے ہیں کہ میں نے تقسیمِ ہند کے بعد کے پنجاب کی داستان کیوں نہیں لکھی؟

میرا جواب سادہ ہے، مگر زخموں سے بھرا ہوا:

1947ء کے بعد جو بچا...... وہ پنجاب نہیں تھا۔

وہ سرزمین جہاں صدیوں سے صوفیوں کی نعت، گرنتھیوں کی بانی اور اللہ والے درویشوں کی آوازیں گونجتی تھیں۔

وہ تہذیب، وہ محبت، وہ بھائی چارہ، سب کچھ بہا دیا گیا۔

محبت کے دریاؤں میں نفرت گھول دی گئی۔

جو دیس کبھی مسکراہٹوں سے مہکتا تھا، وہاں اب خاموشی بولتی ہے۔

رشتے، گھر، گاؤں، سڑکیں سب کچھ اجڑ گیا،

اور ایک پوری تہذیب معاشی، معاشرتی اور روحانی لحاظ سے مفلوج کر دی گئی۔

ایسے پنجاب پر کیا لکھوں؟ جس کے لفظوں سے خون رسنے لگے، جس کی زمین سے چیخیں سنائی دیں، جس کی فضا سے اجنبیت ٹپکتی ہو؟

میں نے قلم روک لیا، کیونکہ میرے اندر کا پنجاب آج بھی بارڈر کے دونوں طرف اپنے آپ کو ڈھونڈ رہا ہے۔ اپنے بزرگوں کے مزار پر جانا چاہتا ہوں، اپنے والد کی جنم بھومی دیکھنا چاہتا

ہوں، عظیم صوفیا کی درگاہوں پر جانا چاہتا ہوں، اور جب تک وہ پنجاب واپس نہیں آتا، میری تحریر ادھوری ہی رہے گی۔

؎ مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

یہ صرف فیض کا ایک شعر نہیں، بلکہ میرا دل ہے جو اپنے پنجاب سے مخاطب ہے۔

وہ پنجاب، جو صدیوں سے میری روح میں بستا تھا دریا کے پانیوں میں بہتا، میلوں کی رونقوں میں گونجتا، اور صوفیوں کے کلام میں جھلکتا۔

مگر 1947ء کے بعد سب کچھ بدل گیا۔ وہ زمین، جہاں کبھی سنگیت، سچائی، اور سادہ دل لوگ بستے تھے، اب تقسیم کی لکیر کے آر پار روتی نظر آئی۔

وہ گیت، وہ لہجے، وہ بولی سب کچھ جیسے چھن گیا۔ اسی لیے میں کہتا ہوں:

اُس پہلی سی محبت کو اب نہ مانگو،\
کیونکہ وہ محبت اب فقط یاد بن چکی ہے،\
ایک ایسی یاد جسے قلمبند کرنے کے لیے دل کو کئی بار توڑنا پڑتا ہے۔

میرے دل کے بہت قریب ایک عظیم شاعر فیض کی نظم:

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ\
میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات\
تیرا غم ہے تو غم دہر کا جھگڑا کیا ہے\
تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات\
تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے\
تو جو مل جائے تو تقدیر نگوں ہوجائے\
یوں نہ تھا، میں نے فقط چاہا تھا یوں ہوجائے\
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا

راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخاب سے بنوائے ہوئے
جابجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے
جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے
لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجیے
اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجیے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

میں نے یہ داستان صرف تاریخ کی کتابوں سے نہیں لکھی، بلکہ اپنے دل سے لکھی ہے۔اس دل سے جو پنجاب کی مٹی سے جُڑا ہوا ہے، اُس مٹی سے جس میں میرے بزرگوں کے خواب دفن ہیں۔میں خود ایک پنجابی ہوں، مگر اُس نسل سے تعلق رکھتا ہوں جو ہجرت کے زخم اپنے جسم اور روح پر لے کر اس پار آبسی۔میرے والدین کی آنکھوں میں وہ بستیاں آج بھی آباد تھیں، جنھیں وہ پیچھے چھوڑ آئے۔میرے لہجے میں آج بھی دونوں طرف کے پنجاب کی گونج سنائی دیتی ہے، اور میری دعا میں آج بھی لاہور کے ساتھ امرتسر کا نام آتا ہے۔

میں نہیں جانتا کہ تاریخ کبھی ہمیں دوبارہ ملنے دے گی یا نہیں، مگر یہ ضرور جانتا ہوں کہ زبان، ثقافت، خوشبو، اور یادیں کبھی سرحدوں کی محتاج نہیں ہوتیں۔یہ کتاب میرا ایک خاموش سلام ہے اُس پنجاب کو، جو بٹ تو گیا، مگر بکھرا نہیں جو آج بھی دلوں میں زندہ ہے، اور جس کی گلیوں میں میری شناخت کی خوشبو بسی ہے۔

اگر کسی دن حالات بدلیں، اور کوئی دروازہ کھلے......تو میں صرف دیکھنے نہیں جاؤں گا، ان سے پیار کرنے جاؤں گا، ان کے پاس بیٹھنے جاؤں گا۔ اُن قبروں پر، اُن درختوں تلے، اُن دریا کناروں پر، جہاں میرے ماضی کا چہرہ چمکتا ہے۔

حلقہ کیے بیٹھے رہو اِک شمع کو یارو
کچھ روشنی باقی تو ہے، ہر چند کہ کم ہے

(فیض احمد فیض)